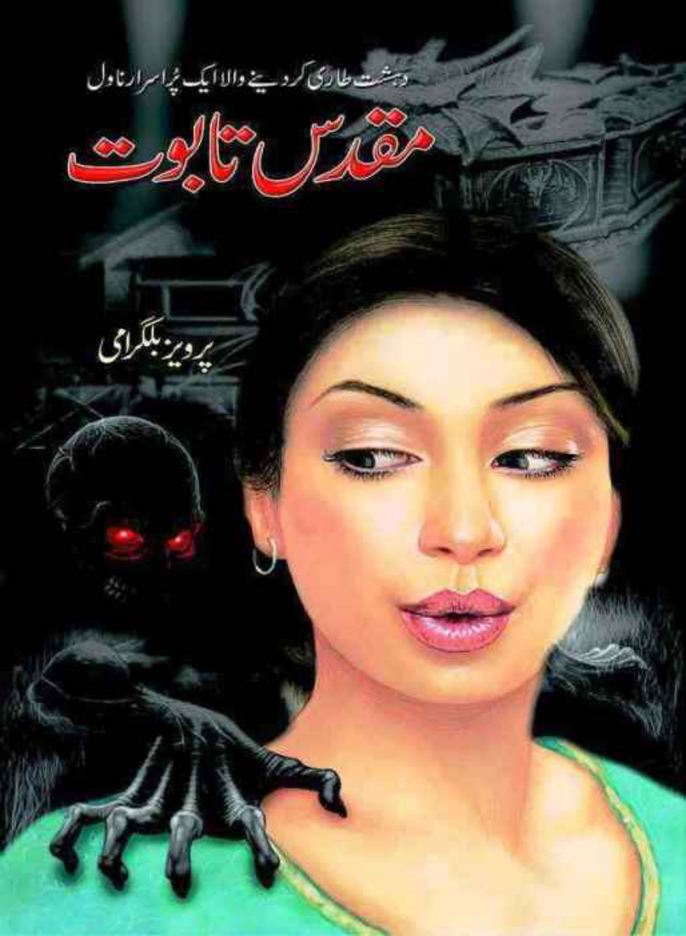

دہشت طاری کر دینے والا ایک پُراسرار ناول
مقدس تابوت
پرویز بلگرامی

ہمیں بھی کچھ کہنا ہے

میں نے جب پڑھنا شروع کیا اور مطالعہ نے ذہن کو وسعت عطا کیا، کشادگی بخشی۔ سوچنے سمجھنے کی کسوٹی پر ہر تحریر کو پرکھنا شروع کیا تو اپنے اندر بھی کچھ ہلچل پیدا ہوئی اور قلم کو تحریک ملی۔ یہ وہ دور تھا جب ادبی پرچے خود میں سمٹ کر گروہ میں بٹ رہے تھے۔ اشاعت گنتی تک محدود ہو گئی تھی۔ جبکہ مطالعہ کے شوقین گھر گھر میں تھے۔ بکثرت پڑھنے والے تھے اور وہ خوب خوب پڑھنا چاہتے تھے۔ ایسے وقت میں رئیس امروہی، جون ایلیا اور شکیل عادل زادہ نے ایک نیا تجربہ کیا۔ اس تجربہ نے پڑھنے والوں کو متوجہ کر لیا۔ گویا انقلاب آ گیا۔ ایک نئے انداز کی کہانیوں کا سیلاب آ گیا۔ وہ دور ناول اور افسانوں کا تھا۔ مگر انگریزی طرز کی کہانیوں نے خاص کر دیومالائی کہانیوں نے پڑھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ بنا لیا تھا۔ شعور اور تخیل نے جذبے میں گہرائی جو پیدا کر دی تھی۔ شعور، احساس، تخیل اور جذبات کائنات کی ہر چیز کی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی تبدیلی نے جون ایلیا اور شکیل عادل زادہ کے تجربے میں تبدیلی پیدا کی جو آج کے ڈائجسٹوں میں نظر آتا ہے۔

میں نے بھی اسی راہ کو اپنایا اور اسی طرز پر لکھنا شروع کیا جو بہت کامیاب ٹھہرا۔ میری طویل کہانیاں ہر ریڈر کو پسند آتیں۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسی ہی دیومالائی کہانی ہے جسے میں نے بنگال کے پسِ منظر میں لکھا ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی مرکزی کردار ایک حقیقت ہے اور اس کا مزار آج بھی مراجع خلائق ہے۔ اس نے کتنا دکھ اٹھایا یہ بات تاریخِ بنگال میں محفوظ ہے۔ بس میں نے اس میں کہانی کے لوازمات شامل کر دیئے ہیں تاکہ پڑھنے والا بوریت محسوس نہ کرے۔ امید ہے کہ میرا یہ ناول بھی آپ کو میرے گزشتہ ناولوں کی طرح پسند آئے گا۔

پرویز بلگرامی

''اُف دادی اماں! اب بس بھی کریں۔'' میری پوتی حنا نے کمرے کے دروازے پر آ کر کہا تو میں نے اسے منع کرنے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ خاموش رہنے کی تلقین کے بعد بھی وہ بڑبڑاتی رہی۔

میرے ہاتھ میں تسبیح گردش کر رہی تھی۔ میں پورے خشوع وخضوع سے اوراد میں مصروف تھی پھر بھی اس کی بڑبڑاہٹ سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

''لگتا ہے پوری جنت خرید کر دم لیں گی۔ نماز، نماز کے انداز میں پڑھیں۔ یہ کیا کہ عصر کی نماز شروع کی تو عشاء پڑھ کر مصلہ لپیٹا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

اب میں اسے کیسے سمجھاتی کہ یہ سب کچھ بہت ضروری ہے۔ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر میں نماز اور دعائیں نہ پڑھوں تو میری زندگی جہنم بن جائے۔ یہ گھر تباہ ہو جائے۔ گھر کے ہر فرد کی زندگی پر سوالیہ نشان کھنچ جائے۔ موت کا ظالم پنجہ جکڑ لے۔ مگر میں یہ بات کسی کو بتا نہیں سکتی۔ کیونکہ ہر ایک میری حقیقت سے بے خبر ہے۔ میرا اکلوتا بیٹا بھی میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے شوہر بھی میری حقیقت سے انجان تھے۔

مگر اب کچھ کچھ لوگ میرے بارے میں اندازہ لگانے لگے ہیں اسی لیے میرے پاس مشکلات کا حل طلب کرنے والوں کی بھیڑ لگنے لگی ہے۔ میں خود بھی لوگوں کے کام آنا پسند کرنے لگی ہوں، صرف اس امید پر کہ میری پیشانی کا داغ ڈھل جائے۔ میرے گناہوں کا بوجھ کم ہو جائے۔ میرے گھر والے حفظ و امان میں رہیں۔

بس اسی وجہ سے آج میں اپنی زندگی کے تاریک باب کو کھول رہی ہوں۔ شاید میری زندگی سے کوئی سبق حاصل کر لے۔ میرے گھر والے اپنی جانب بڑھتے خطرے کو بھانپ لیں۔ اپنے تحفظ کا انتظام کر لیں۔

اسی خیال کے تحت تو میں اپنے گھر میں ٹی وی چلنے نہیں دیتی۔ یہ کہہ کر روک دیتی ہوں کہ غناء (گانے) گناہِ صغیرہ کا آخری باب ہے۔ یہیں سے گناہِ کبیرہ کی ابتدا ہوتی ہے شیطان ایمان کے قلعہ میں سینده لگانا شروع کرتا ہے۔ آیاتِ قرآنی اور احادیث سے مدد لے کر ڈراتی ہوں کیونکہ یہ ضروری ہے۔ اگر میرے گھر میں بھی گانے بجنے لگیں تو میری دعائیں رد ہونے لگیں گی اور میرے گھر کے گرد جو خطرات منڈلا رہے ہیں وہ اندر آ جائیں گے۔

یہ خطرات میں نے خود مول لیے ہیں کیونکہ حقیقت میں، میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتی ہوں۔ میں جو آج پردے کی سخت پابند ہوں۔ ہفتے میں صرف ایک دن گھر سے نکلتی ہوں وہ بھی صرف اس لیے کہ عبداللہ شاہ غازیؒ کے مزار پر حاضری دے آؤں، کبھی بے پردہ پھرا کرتی تھی۔ خوب فلمیں دیکھتی تھی۔ ہر وہ کام کرتی تھی جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

لیکن تب میں یہاں نہیں تھی۔ کراچی سے ہزار میل دور مشرقی بنگال کے قلب ڈھاکا میں رہتی تھی۔

ڈھاکا جو مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے۔ جسے جہانگیر آباد بھی کہتے ہیں کیونکہ اسے مغل شہنشاہ جہانگیر نے دوبارہ آباد کیا تھا۔ جہاں مسلم لیگ کی بنیاد

پڑی تھی۔ مسلمانوں کے حالاتِ زار کی تڑپ نے نواب آف ڈھاکا سر سلیم اللہ کو مسلم لیگ بنانے پر مجبور کیا تھا۔ اسی نواب کے شہر میں، میں رہتی تھی۔

ڈھاکا دراصل ڈھاکیشوری کے پجاریوں کا شہر تھا۔ کئی سو سال پہلے وہاں صرف ڈھاکیشوری دیوی کا مندر تھا۔ مندر کے پجاری اور اس کے "بھگت" وہاں رہتے تھے۔ پھر اس علاقے میں "شُدر" بھی آ کر بس گئے۔ شدروں کو براہمنوں نے اپنی غلامی کے لیے بلایا تھا۔ غلاموں کی بستی میں سات درویشوں کا ایک جتھا آیا اور آتے ہی اپنی دینی و اخلاقی قوت سے چھا گیا۔ انہیں بھگانے کے لیے مندر کے پجاریوں نے، بھگتوں نے ہر داؤ آزما لیا۔ اپنے منتروں کے زور پر آگ کا دریا بہایا جواب میں درویشوں کے سالار شاہ علی بغدادیؒ جن کا مزار آج بھی ڈھاکا شہر کے میرپور میں مراجع خلائق عالم ہے، انہوں نے زمین پر عصاء مار کر پانی کا دریا بہا دیا جس نے آگ کو بجھا دیا۔ آگ کا نام و نشان نہیں ہے مگر وہ وسیع و عریض تالاب آج بھی وہاں موجود ہے۔

اسی تالاب کے کنارے جو آگے جا کر سانبھر ندی سے ملتا ہے، وہیں ہمارا گھر تھا۔ لیکن یہ گھر ابتداء سے ہمارے پاس نہ تھا۔ ہمارے والدین مشرقی ہند کے صوبے بہار سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ آپ نے ایک خاص علاقے کا نام سنا ہوگا۔ یہ علاقہ بہار کے دارالحکومت عظیم آباد جسے پٹنہ بھی کہتے ہیں اس ضلع سے متصل ہے۔ اس علاقے کا نام بہار شریف ہے۔ یہاں حضرت مخدومؒ کا مزار ہے۔ حضرت مخدومؒ کی آمد سے پیشتر یہاں اہل ہنود کی بہت بڑی درس گاہ تھی جسے نالندہ وہار کہا جاتا تھا۔ اس درس گاہ میں بدھ مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حضرت مخدومؒ نے آ کر یہاں اسلام کی تعلیمات عام کیں اور پورا علاقہ اسلام کے نور سے منور ہو گیا۔ اس پورے علاقے میں صوفی حضرات کی تعداد زیادہ ہے۔ ہر ایک کسی نہ کسی سلسلہ تصوف سے وابستہ ہے۔ میرا گھرانہ بھی خانقاہی گھرانہ ہے۔ میرے والد حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ سے وابستہ تھے۔ اللہ نے انہیں دل کھول کر اولاد کی دولت سے نوازا تھا۔ ہم کل آٹھ بہن بھائی تھے۔ جب تحریکِ پاکستان نے زور پکڑا تو میرے والد کو حکم ہوا کہ ہجرت کر جاؤ۔ میرے والد تمام بچوں کے ساتھ مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکا آ گئے اور شہر سے دور میرپور کے اس گھر میں پناہ لے لی۔ یہ گھر کسی ہندو زمیندار کا تھا۔ ابا نے اس میں رہائش اختیار کر لی اور پاس میں ہی حضرت شاہ علی بغدادیؒ کا مزار تھا۔ اس مزار سے منسلک ہو گئے۔

اس گھر میں ہمیں آئے دوسرا روز تھا کہ رات کے وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں سمجھ نہ پائی کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ تبھی کہیں دور دو گجر بجا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ رات کے اس پہر آنکھ کیوں کھلی میں اس پر غور کر رہی تھی کہ باہر کسی کا سایہ نظر آیا۔ کمرے میں لالٹین کی دھیمی روشنی تھی۔ باہر گھپ اندھیرا۔ اس اندھیرے میں کوئی سامنے والے کمرے میں گھسا تھا۔ کون ہو سکتا ہے یقیناً چور ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھر میں کوئی قیمتی چیز نہ تھی۔ مگر غریبوں کے لیے چھوٹی ہنڈیا بھی قیمتی ہوتی ہے۔ وہ اس کی حفاظت بھی جی جان سے کرتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی پھر دھیرے دھیرے نیچے اتری۔ ہوائی چپل پہنی اور دبے پاؤں باہر کی جانب بڑھی۔ عام حالت میں دیگر لڑکیوں کی طرح مجھے بھی اندھیرے سے خوف آتا تھا مگر اس وقت خوف کا نام و نشان نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے اندر سے مجھے اُکسا رہا ہو کہ میں اس سائے کا پیچھا کروں، دیکھوں کہ وہ کون ہے۔ کیا چرا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ برآمدے میں پہنچی مگر کوئی نظر نہ آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، متلاشی نظروں نے دائرہ پورا کیا تبھی کونے والے کمرے کے دروازے پر وہ نظر آیا۔ بس ایک پل کے لیے اس کی جھلک دکھائی دی اور میں اُدھر بڑھتی

چلی گئی۔ وہ کمرا خالی پڑا تھا۔ تمام بھائی بہن ایک کمرے میں سوتے تھے۔ امی ابو دوسرے کمرے میں۔ یہ کمرا فالتو تھا۔ اس کا مصرف سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ گھر میں اسباب بھی نہ تھا کہ اس میں رکھا جاتا اسی لیے وہ کسی مفلس کی جیب یا عاشق کے دل کی طرح خالی پڑا تھا۔ میں بے دھڑک اس کمرے میں داخل ہوگئی۔ مگر یہ کیا؟ خالی کمرا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میں سمجھ گئی کہ اب تک میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ واہمہ تھا، نظروں کا دھوکا تھا۔ میں واپس ہونا چاہتی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ نظریں دیوار میں بنے طاق میں ٹک گئیں۔

اس دور میں دیواریں موٹی بنتی تھیں۔ موٹی دیواروں میں طاق بنانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کمرے میں بھی ایک طاق تھا۔ اس طاق میں ایک کٹورا رکھا تھا۔ پیتل کا کٹورا، نہایت چمکدار بالکل نیا جس پہ خوبصورت میناکاری تھی۔ انتہائی دیدہ زیب نقاشی تھی۔ ایسا کٹورا کہاں سے آیا اسی تجسس نے مجھے مہمیز کیا تھا اور میں طاق کی جانب بڑھی تھی۔ نزدیک پہنچتے ہی حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس میں ایک ڈیڑھ بالشت کا سانپ تھا، کڑیالہ سانپ جو کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اگر اس کی آنکھوں میں چمک نہ ہوتی تو میں اسے مردہ سمجھتی۔ چمک بھی اتنی تیز تھی کہ ادھر سے نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ چمپک کی طرح چپک گئی تھیں۔ میں کلی طور پر مسحور ہوگئی تھی۔ ہپناٹائز ہوگئی تھی۔ قدم جم کر رہ گئے تھے۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے دماغ میں سرسراہٹ ہو رہی ہو۔ کچھ رینگ رہا ہو یا انگلیاں چل رہی ہوں پھر وہ سرسراہٹ سرگوشی میں بدل گئی۔ ایسی عجیب سی سرگوشی جو سماعت کی بجائے ڈائریکٹ دماغ میں سنی جا رہی ہو۔ کوئی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”تمہیں دولت چاہیے، میرے پاس بہت دولت ہے لوگی؟“

میری مفلسی، بدحالی، ترستی ہوئی زندگی نے مجھے مجبور کر دیا۔ زبان کی جگہ سر نے اثبات میں اشارہ دے دیا۔

ہاں، میں جواب دیتے ہی کٹورا غائب ہوگیا۔ پورا منظر بدل گیا۔ طاق بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

شاید واہمہ تھا، نظروں کا دھوکا تھا، نیند کا کرشمہ تھا، یہی کچھ سوچتی ہوئی میں مڑ گئی۔ کمرے سے باہر آ گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے خود کو بستر پر گرا لیا۔ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ نیند کی دیوی نے تھپکی دی تو آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور میں بے خبر ہوگئی۔

میری آنکھ کھلی تھی اس آواز سے جسے سننے کے لیے کراچی آ کر ترس گئی ہوں۔

ڈھاکا میں سپیدیٔ سحر نمودار ہوتے ہی ہر گھر سے مرغ کی بانگ سنائی دینے لگتی تھی۔ بانگ تو کراچی کے مرغے بھی دیتے ہیں مگر کبھی رات کے دو بجے تو کبھی سرِشام ہی۔ بانگ سن کر جاگنے کی عادت ہی ختم ہوگئی ہے مگر وہاں ادھر مرغ اذان دیتا اُدھر لوگ اٹھ جاتے۔ میں بھی بستر سے اٹھ گئی تھی۔ اٹھتے وقت تکیہ اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا۔ تکیہ ہٹتے ہی میں چونک گئی تھی۔ حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں، جڑاؤ کنگن، مگر اس کی جوڑی نہ تھی۔ اس میں جڑے قیمتی پتھر للچا رہے تھے۔ لبھا رہے تھے۔ وہ کنگن ایسا تھا جیسا نوابین کی بیگمات پہنتی ہیں۔

میں نے کنگن کو دوپٹے کے آنچل میں باندھا اور منہ ہاتھ دھو کر باورچی خانے میں آ گئی۔ نورالنہار کی ماں ناشتہ بنا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں یہ عورت شروع دن سے مجھے پسند نہ تھی۔ عجیب پُراسرار عورت تھی۔ بنگلہ کے علاوہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شوہر مر چکا تھا۔ اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایک ٹوٹی ہوئی جھونپڑی میں رہتی تھی۔ ترس کھا کر اماں نے اسے گھر کے کاموں پر رکھ لیا تھا۔ مسالہ پیسنا، برتن دھونا، کھانا پکانا اسی کے ذمے تھا مگر وہ کبھی جھاڑو نہیں

دیتی تھی۔ کہتی تھی میں سب کچھ کرلوں گی مگر جھاڑو نہیں دوں گی۔ اس کی رنگت ایسی تھی جیسے اندھیری رات میں کسی نے کالا کپڑا پھیلا دیا ہو۔ چہرے پر رونق نام کو نہ تھی۔ پھر سامنے کے چار دانت بھی اتنے بڑے بڑے تھے کہ ہونٹوں سے باہر نکل آئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل میں نفرت اُبلنے لگتی۔ خواہ مخواہ میں اس سے اُلجھنے لگتی۔ آج بھی جب میں باورچی خانے میں داخل ہوئی تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرادی۔ اس کی ہنسی مجھے زہر لگتی تھی۔ اس وقت بھی مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ بس میرا پارا چڑھ گیا۔ میں نے موڑھی (مُرمُرے) کے کنستر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

''یہ نرم نہیں ہوگا۔ اس طرح رکھتے ہیں؟''

وہ اردو بہت کم سمجھتی تھی پھر بھی میں اسے جلانے کے لیے ہمیشہ اردو بولتی۔ وہ جلدی سے اٹھی ایک پیالے میں مُرمُرے نکالے اور اس میں سرسوں کا تیل، نمک اور مرچ ڈال کر میرے لیے لے آئی۔ میں نے بے دلی سے پیالہ لیا اور باہر آ گئی۔ موڑھی سے پیٹ بھر کر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ ذہن میں اس وقت بھی ایک ہی سوال تھا کہ وہ کنگن کہاں سے آیا؟ کافی دیر غور کرنے کے بعد بھی جب کوئی سرا نہ ملا تو میں نے سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا چھڑا لیا اور ذہن کو خالی کرلیا۔ تبھی میری نظر چھپر (چھت) سے لٹکتے چھینکے پر پڑی۔ اس وقت گھر کی چھت میں چھینکا لٹکانا عام سی بات تھی۔ چھینکے پر دودھ یا ایسے کھانوں کی پتیلی رکھی جاتی تھی جسے بلی سے بچانا مقصود ہوتا تھا۔ خالی چھینکے میں دوسری چیزیں بھی رکھ دی جاتی تھیں۔ میں نے کل چھینکے پر کشیدہ کاری کا فریم رکھ دیا تھا۔

ان دنوں لڑکیوں کا ایک ہی شوق ہوا کرتا تھا۔ تکیے کے غلاف، میز پوش، چادر، دوپٹے وغیرہ پر پھول پتیاں کاڑھنا۔ نئے نئے شعر کاڑھنا۔ شعر بھی ایسے کہ آج انہیں یاد کرکے ہنسی آتی ہے۔ ''پڑھ کے کلمہ سر کو رکھے ناز سے، آئے گی نیند آنکھوں میں اک نئے انداز سے۔'' میں بھی اسی قسم کے شعر کاڑھتی اور خوش ہوتی تھی۔

ابھی میں نے میز پوش پر دو تین الٹے بخیے لگائے تھے کہ بُری طرح چونک پڑی اور خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ باہر سے کسی کی تیز چیخ ہوا کے دوش پر سوار ہوکر آئی تھی۔ میں بری طرح سہم گئی تھی۔ امی، ابو باہر کی طرف دوڑے تھے۔ باہر زور زور سے باتیں ہورہی تھی۔ جب کوئی پلٹ کر نہ آیا تو میں اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر نکل آئی۔ دیگر گھروں کی طرح ہمارے گھر کے سامنے بھی کٹھل کے پیڑ تھے۔ کافی بڑے بڑے اور گھنے پیڑ۔ بنگال کی روایت ہے کہ گھرانے کی شرافت کا اندازہ اس کے گھر کے تالاب اور آم، کٹھل کے پیڑوں سے لگایا جاتا ہے۔ یہاں تالاب بنانا ممکن نہ تھا کیونکہ زمین ناکافی تھی پھر یہ علاقہ مہاجروں کا تھا اور مہاجر تالاب کی جگہ کنواں بنانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہاں پھلوں کے لیے آم، کٹھل، لیچی کے درخت ضرور لگا لیتے ہیں۔ پہلے جن کے پاس یہ حویلی تھی، کافی شوقین تھے کیونکہ حویلی کے چاروں طرف آم، کٹھل اور جامن کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ تالاب بھی تھا مگر اس پر ایک دوسری فیملی نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ہم حویلی پا کر ہی خوش تھے۔

میں حویلی سے باہر آئی تو وہ دردناک منظر نظر آیا۔ میری چھوٹی بہن جو سارا دن محلے کے بچوں کے ساتھ باہر کھیلتی رہتی تھی آج وہ پیڑ پر چڑھ گئی تھی۔

چڑھنے کو تو چڑھ گئی تھی مگر اترنا بھول گئی اور اُوپر سے پھسل کر ایسا نیچے گری تھی کہ ہر طرف خون ہی خون نظر آ رہا تھا۔ اس بُری طرح زخمی تھی

کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

ان دنوں ڈھاکا شہر نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ صرف ایک اسپتال تھا۔ میڈ فورڈ اسپتال۔ وہ بھی شہر کے مرکزی حصے میں۔ وہاں تک جانے کے لیے سواری کی ضرورت تھی اور سواری کے لیے پیسوں کی۔ پھر دوا وغیرہ کے لیے بھی رقم چاہیے تھی۔

شاید ابو کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ سر پکڑے ایک جانب بیٹھے تھے اور ان کے سامنے زخموں سے چُور کراہتی ہوئی چھوٹی رقیہ پڑی تھی۔

پڑوس کے احمد صاحب نے ابو کو ٹوکا۔ ''مولوی صاحب! دیر مت کیجئے۔ اسے فوراً اسپتال لے چلیے۔ میں بے بی ٹیکسی لے آتا ہوں۔''

''مگر میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔'' ابو نے مایوسی سے جواب دیا۔

''یہ لیجیے بیس روپے رکھ لیجیے۔'' انہوں نے پانچ پانچ کے چار نوٹ بڑھا دیئے۔ اس دور میں بیس روپے اچھی خاصی رقم سمجھی جاتی تھی۔ ابا نے روپے لے لیے۔ احمد صاحب بے بی ٹیکسی لانے چلے گئے۔

میں نے جلدی سے آنچل میں بندھا کنگن کھولا اور ابو کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''اسے بیچ دیجیے گا۔''

''مگر یہ تمہیں ملا کہاں؟'' ابو نے پوچھا۔

''گھر کی صفائی کرتے ہوئے ملا ہے، دو چھتی پر پڑا تھا مگر ایک ہی ملا ہے، ایسے بھی یہ کسی کام کا نہیں ہے۔''

''یہ ایک ہی بہت قیمتی ہے۔ ہندو زیورات خوب پسند کرتے ہیں۔ لگتا ہے گھر والے جاتے وقت بھول گئے ہوں گے۔'' کہہ کر انہوں نے کنگن لے لیا۔ ابو نے کنگن کو اسلام پور کے صرافہ بازار میں پورے دو ہزار روپے میں فروخت کیا۔ یہ دو ہزار آج کے دو لاکھ جتنے سمجھ لیں۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے پیسا پانی کی طرح بہایا مگر رقیہ بچ نہ سکی۔ وہ ایک ہفتے تک زندگی اور موت کے درمیان جھولتی رہی، بازار سے خریدا ہوا خون نسوں کے ذریعہ پیتی رہی۔ بہت بڑی مقدار میں خون چڑھانے کے باوجود مرگئی۔

جب اس کی لاش گھر آئی تو پتا نہیں کیوں میرا ضمیر باغی ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ میں ہی اس معصوم بچی کی قاتل ہوں۔ میں نے ہی اسے قتل کیا ہے۔ لیکن صحیح توجیہہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ایسا خیال کیوں آرہا ہے۔ بس یہ احساس تھا جو لگاتار کچوکے لگا رہا تھا۔ ہر انسان کے اندر دو متزاد قوتیں ہوتی ہیں۔ ایک اچھائی کی تو دوسری برائی کی۔ دونوں قوتیں الگ الگ انداز میں ہوشیار کرتی ہیں۔ اچھائی کی قوت برائی سے روکنے کے لیے احساس کو بیدار کرتی ہے تو برائی کی قوت برائی پر راغب کرتی ہے۔ شاید یہ اچھائی کی قوت تھی جو مجھے لگاتار ہوشیار کر رہی تھی۔ میں گم صم بیٹھی تھی کہ ٹیٹین صاحب کی بیوی نے چونکا دیا۔

''لے بیٹی تُو بھی کچھ کھالے۔'' رسم کے مطابق وہ کھانا لے کر آئی تھیں، کالا کھانا۔ میں نے دو چار لقمے زہر مار کیے اور رکابی کو سامنے سے کھسکا دیا۔

وقت کا کام ہے گزرنا وہ گزرتا رہتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہر زخم مندمل ہوتا رہتا ہے۔ ایک ہفتے میں بہن کی موت کا غم بھی کم ہو گیا۔ ابو بھی اس غم سے ابھر آئے تھے۔ اس روز میں نماز کی تیاری کر رہی تھی کہ ابو نے کہا۔ ''بیٹی میرے لیے بھی دعا کر لینا۔''

''ابو آپ تو خود عالم ہیں۔ کتاب وسنت کا علم رکھتے ہیں۔ ساری ساری رات دعا و درود کا ورد کرتے ہیں پھر ایسی بات؟''

''بیٹی یقین کروگی۔ اب میرا عبادت میں بالکل دل نہیں لگتا۔ دعائیں پڑھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے صرف زبان ہل رہی ہے۔ قلب پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مجھے روک رہا ہے۔ پڑھنے سے منع کر رہا ہے۔''

''آپ نے رقیہ کا غم خود پر طاری کرلیا ہے۔ موت برحق ہے۔ اس غم کو بھلانے کی کوشش کریں۔''

''نہیں بیٹی ایسی بات نہیں ہے کوئی اور چکر ہے۔ مجھے تو ایسا لگنے لگا ہے جیسے میں نے کوئی گناہ کیا ہے یہ اسی کی سزا ہے۔ حضرت یونسؑ برگزیدہ پیغمبر تھے۔ انہوں نے ذرا سا غرور کیا تو ان سے خدا نے قوت چھین لی، سزا کا مستحق قرار دے دیا۔ میں نے بھی کوئی غلط کام کیا ہے۔ اُسی کی یہ سزا ہے۔ ورنہ مجھ جیسا بندہ عبادت سے جی چرائے؟''

میں نے اپنے ابو کی ڈھارس بندھائی اور نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ یہی حال میرا ہے۔ میرے لیے بھی نماز پڑھنا دوبھر ہوگیا ہے۔ نماز کے لیے کھڑی ہوتی ہوں تو فاسد خیالات آنے لگتے ہیں۔ بار بار غلطی کر بیٹھتی ہوں۔ کبھی قرت بھول جاتی ہوں تو کبھی رکوع و سجود۔

اس رات کی بات ہے کہ میں بستر پر لیٹی انہی باتوں پر غور کر رہی تھی کہ ایسا لگا جیسے ایک سایہ میرے بستر کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا ہے۔ اس نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا، اشارہ پاتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ سایہ رکا، آنگن کی طرف نظر ڈالی تو برابر والے کمرے میں داخل ہوگیا۔

یہ وہی کمرا تھا جس میں اس دن میں نے کٹورا اور کٹورے میں سانپ دیکھا تھا۔ اس کمرے میں پہنچ کر میں نے اس دیوار کو دیکھا جس میں طاق تھا مگر اس وقت وہ دیوار سپاٹ تھی۔ بالکل ایسے جیسے وہاں کبھی طاق بنا ہی نہ ہو میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر دوبارہ اسی سائے کی طرف دیکھا جس کے اشارے پر میں اس کمرے میں آئی تھی لیکن اب وہ سایہ بھی غائب تھا۔ کہیں یہ سب میرا واہمہ تو نہیں یہ سوچ کر میں مڑی۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ مڑتے ہوئے میری اچٹتی ہوئی نظر اسی دیوار پر پڑی اور میں چونک اٹھی دیوار میں طاق اور طاق میں کٹورا نظر آ رہا تھا۔ کٹورا بھی ایسا کہ اس پر نظر نہ ٹھہرے۔ مراد آبادی نقاشی والا کٹورا۔ میں اس کٹورے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ کچھ نزدیک پہنچی تو کٹورے میں پڑا سانپ بھی نظر آ گیا۔ اس دن جب میں نے اس سانپ کو دیکھا تھا تو وہ بالکل ایسے پڑا تھا جیسے مرا ہوا ہو صرف اس کی آنکھوں میں جان تھی مگر آج اس کا آدھا دھڑ زندہ لگ رہا تھا۔ اس میں جان آ گئی تھی۔ وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان آنکھوں سے نکلتی شعاعیں میرے دماغ میں اندر تک گھستی جا رہی ہیں۔ نہ صرف گھس رہی ہیں بلکہ رینگ رہی ہیں۔ دماغ میں سرسراہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے دماغ میں سرگوشی سنائی دی ہو۔ 'اور دولت چاہیے؟''

''نہیں!'' پتا نہیں میں کس جھونک میں یہ کہہ گئی۔

''نہیں تمہیں لینی ہوگی۔ تمہیں دولت چاہیے اور مجھے جان۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔''

”نہیں ایک کنگن لیا تو میری بہن مرگئی۔ میں اور کچھ نہیں لوں گی۔“

”تیری بہن مری اور مجھے جان ملی۔ مردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ مجھے ابھی اور جان چاہیے۔ باقی دھڑ ابھی بھی بے جان ہے۔ تیرے باپ نے مجھے جگایا ہے اب مجھے چلانا تیرا کام ہے۔ بول اب تجھے اور کتنی دولت چاہیے۔“

”نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ میں انکار کرتی ہوئی دروازے کی طرف دوڑی مگر یہ کیا۔ کمرے کا پاٹوں پاٹ کھلا دروازہ غائب تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید مجھ سے اندازے کی غلطی ہوگئی ہے مگر نہیں۔ واقعی وہاں دروازہ نہیں تھا۔ چاروں جانب سپاٹ دیواریں تھیں۔ میں کسی ایسے چوہے دان میں پھنس گئی جہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں تھا۔ تبھی وہی سرگوشی پھر سنائی دی۔ ”جوڑی کا کنگن نہیں لوگی۔ یہ تو تمہیں لینا ہی ہوگا۔“

شاید میں نے زندگی میں کوئی اچھا کام بھی کیا تھا کہ ماؤف دماغ کے روزن سے ایک اسم ورآیا۔ اور میں زور زور سے یا حافظ یا حفیظ کا ورد کرنے لگی۔ شاید یہ اس اسمِ مبارک کا کمال تھا کہ میری نظروں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ مجھے دروازہ نظر آنے لگا۔ میں دوڑتے ہوئے باہر آ گئی۔

باہر وہی اندھیرا تھا۔ سناٹا تھا۔ ہواؤں کی سائیں سائیں تھی اور گھر کے پچھواڑے سے آتی ہوئی سانبھر ندی کی چھپاک چھپاک تھی۔ کنارے سے ٹکراتی موجوں کی آواز تھی۔ میں اس طرح ہانپ رہی تھی جیسے میلوں کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کر کے آ رہی ہوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی اندھیرے کا راج تھا۔ اب اپنے کمرے کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہ تھی کیونکہ برابر والا کمرا ابو کا تھا۔ امی بھی اسی کمرے میں سوتی تھیں مگر میں بھی اپنے کمرے میں اکیلی نہ تھی۔ میرے ساتھ میری بہنیں سوتی تھیں۔ رقیہ زندہ تھی تو وہ بھی اسی کمرے میں سوتی تھی مگر اب صرف سلونی رہ گئی تھی وہی میرے ساتھ سوتی تھی۔ میں اس کے برابر جا کر لیٹ گئی۔

☆=======☆=======☆

میں جس اسکول میں پڑھتی تھی وہ بنگلہ میڈیم تھا۔ اردو میڈیم اسکول کافی دور تھا۔ وہاں جانا میرے لیے دشوار تھا اس لیے ابو نے مجھے اسی اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ جو نسبتاً نزدیک تھا بعد میں دو نمبر سیکشن میں اردو اسکول بھی کھل گیا، نیشنل ہائی اسکول کے نام سے مگر میں نے وہاں پڑھنے سے انکار کر دیا اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ مجھے نئے سرے سے پڑھنا پڑتا۔ پورا کورس بدل جاتا۔ بنگلہ کی جگہ اردو کی کتابیں پڑھنی پڑتیں۔ اردو میڈیم میں ڈھاکا بورڈ کی صرف انگلش چلتی تھی باقی کتابیں لاہور بورڈ کی ہوتیں پھر یہاں کی تمام لڑکیاں جانی پہچانی تھیں۔ کئی بنگالی لڑکیاں پکی سہیلیاں بن چکی تھیں۔ انہی میں ایک لڑکی سندھیا تھی۔ وہ ہندو تھی مگر میری سب سے عزیز سہیلی تھی۔ مجھ سے اپنی ہر بات کہہ دیتی تھی۔ ہم لوگ ٹفن ٹائم میں ایک گھنے پیڑ کے سائے میں بیٹھ جاتے اور وہ مجھے اپنی ایک ایک بات بتاتی چلی جاتی۔ اس روز بھی ہم لنچ باکس لے کر اسی پیڑ کے سائے میں آ گئے تھے۔ باتوں کے دوران اس نے ایک عجیب بات بتائی۔ اس کے ہاں ایک عزیز میمن سنگھ سے آیا ہوا تھا۔ عمر یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال ہو گی۔ اس کا نام کارتک تھا۔ وہ اس کے ہاں تقریباً ایک سال سے رہ رہا تھا۔ دراصل وہ اپنی پڑھائی مکمل کرنے آیا تھا۔ اس نے جگناتھ کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ وہ اس کا پھوپی زاد تھا۔ ہندوؤں میں رشتے داروں میں شادیاں نہیں ہوتی ہیں اس لیے وہ اس سے دور دور رہتی تھی۔ ادھر کچھ دن سے کارتک کے رویے میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ رات کے بارہ ایک بجے گھر سے نکل جاتا ہے۔ ایک دن اس نے چھت پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ لڑکی کون ہے یہ جاننے کے لیے اس نے کارتک کو کریدنے کی کوشش کی تھی اور تب کارتک نے اسے اپنا ہمراز بنا لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ کوئی ہندو لڑکی ہے جو صرف رات کے اندھیرے میں اس اس سے ملنے آتی ہے۔ دیکھنے میں انتہائی درجے کی خوبصورت ہے۔

سندھیا حیران تھی کہ اس علاقے میں جتنے بھی گھرانے ہندوؤں کے تھے اور وہ ان سب کو پہچانتی تھی۔ ان میں سے ایک بھی گھرانے میں خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ تمام گھرانے رنگت کے اعتبار سے کالے تھے اور ان میں ایک بھی جوان لڑکی نہیں تھی۔ پھر وہ لڑکی کون ہے۔ یہ بات ایک راز سے کم نہ تھی۔ میں خود بھی چکرا گئی تھی۔ میں بھی اس بات پر غور کر رہی تھی۔

''واقعی یہ حیرت کی بات ہے، اس علاقے میں جتنی بھی ہندو لڑکیاں ہیں ان میں سے ایک بھی خوبصورت کہلانے کے لائق نہیں سب کی سب کالی کلوٹی، ٹیڑھے ناک نقشوں والی ہیں۔ پتا کرو ایسی جھوٹی، مکار لڑکی کون ہے۔ وہ کیوں ہندو بن کر ایک پردیسی کو ستا رہی ہے۔''

''آج میں کارتک بھیا سے ایک بات کہوں گی۔''

''کیا، یہی کہ وہ کوئی مسلمان لڑکی ہے؟''

''یہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔''

''پھر کیا کہو گی؟ یہی کہ اس کا امتحان لے کر دیکھیں؟''

''یہ بھی وہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس لڑکی سے پوچھا تھا کہ بتاؤ پاربتی شیو اور گنیش میں کیا رشتہ ہے تو اس نے پوری تاریخ بتا دی تھی۔ وہ باتیں بتائیں جن کا علم ایک عام مسلمان کو ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف وہی جانتے ہیں جنہیں ہندو میتھلوجی سے دلچسپی ہے۔''

''اس نے ایسی کون سی گہری بات کہی تھی؟''

''اس نے کہا، کیلاش پربت (ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی) نے پرارتھنا (دعا) کی کہ مجھے اولاد چاہیے۔ بس بھگوان نے اسے ایک بیٹی دے دی۔ اس کا نام پاربتی یعنی پربت کی بیٹی رکھا گیا۔ اس کیلاش پربت پر ایک تپسوی (عابد) رہتا تھا اس کا نام شیو تھا۔ پاربتی کی شادی اس سے کرادی گئی۔

کافی دن گزر گئے اولاد نہ ہوئی۔ ایک دن وہ نہانے جارہی تھی۔ اس کے دل میں یہ ڈر سمایا کہ کہیں کوئی آ نہ جائے۔ اس نے دروازے پر ایک پتلا بنا کر رکھ دیا تاکہ وہ کسی کو اندر نہ آنے دے۔ اتفاق سے شیو شنکر آ گئے۔ اسے بھی پتلے نے روک دیا۔ شیو کو غصہ آ گیا اور انہوں نے پتلے کی گردن اڑا دی۔ پاربتی چیخ سن کر باہر آئی تو اس نے پتلے کی گردن کٹی دیکھی بس اس نے رونا شروع کر دیا کہ اسے پھر سے زندہ کردو۔ شیو نے چھوٹے بچے کی تلاش شروع کردی۔ نزدیک کے جنگل میں انہیں ہاتھی کا بچہ نظر آ گیا۔ انہوں نے اس کی گردن کاٹی اور پتلے پر لگادی اسی پتلے کا نام گنیش ہے۔''
سندھیا نے پوری کہانی سنا کر کہا۔ ''اب بتاؤ اتنی گہری بات کوئی مسلمان لڑکی بتا سکتی ہے؟ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دونوں کی ملاقات کالی مندر کی سیڑھیوں پر ہوتی ہے۔ لڑکی وہاں پوجا کرنے آتی ہے۔ کوئی خاص جاپ (عمل) کررہی ہے۔ اسی لیے رات میں آتی ہے۔ کوئی مسلمان لڑکی کبھی پوجا کر ہی نہیں سکتی جب کہ وہ لڑکی کالی آرادھنا، شیو استوتی اور گائتری منتر زبانی پڑھتی ہے۔''

''واقعی یہ تو حیرت کی بات ہے۔ اس علاقے میں ایسی کون لڑکی ہے جسے اتنے بڑے بڑے اشلوک یاد ہیں۔ میں نے تمہارے ہی پاس شیو استوتی دیکھا تھا۔ وہ تو کافی بڑا منتر ہے۔''

''ہاں، اتنے دنوں سے میں پڑھ رہی ہوں مگر مجھے بھی زبانی یاد نہیں ہے۔'' سندھیا نے بتایا۔

''چلو گھنٹی بج گئی۔ کلاس لگنے والی ہے پھر کبھی اس مسئلے پر غور کریں گے۔'' کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆=======☆=======☆

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مگر میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ میں سمجھ نہیں پارہی تھی کہ اتنی رات ہو جانے پر بھی مجھے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ عام حالات میں دس بجتے بجتے میں سو جاتی تھی۔ شاید یہ گزشتہ رات کا اثر تھا۔ کل رات میں نے کٹورے میں جس سانپ کو دیکھا تھا بار بار اسی کی شبیہ آنکھوں میں آ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے بلا رہا ہو۔ رہ رہ کر میری آنکھیں اسی خالی کمرے کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ پتا نہیں ہم سے پہلے جو لوگ اس گھر میں رہتے تھے۔ وہ اس کمرے کو کس طرح استعمال کرتے تھے۔ اس کمرے میں ایسا کون سا راز ہے۔ جس کی وجہ سے اس کمرے کی دیوار میں طاق بن جاتا ہے اور اس طاق میں کٹورا اور کٹورے میں سانپ آ جاتا ہے۔ وہ سانپ کس قسم کا ہے، کس نے اسے وہاں رکھا ہے۔ میں یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ میری آنکھیں ایک جگہ ٹک گئیں۔ باہر برآمدے میں وہی سایہ نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھے اشارے سے قریب بلا رہا تھا۔

پتا نہیں اس وقت میرے دل و دماغ پر ایسا کون سا جادو چل گیا تھا کہ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی اور میں کسی معمول کی طرح بستر سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئی۔ میں خود پر قابو کھو چکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے کوئی اور چلا رہا ہے

بلکہ کوئی مجھے کھینچے لیے جا رہا ہے۔

میں شرابیوں کی طرح ڈگمگاتی ہوئی اسی کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس کمرے میں آج گھپ اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ میں لالٹین لے کر نہیں آئی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے اس کمرے میں قدم رکھا۔ ایک عجیب سی ہلکی ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی۔ میں نے روشنی کے مخرج کی طرف دیکھا۔ یہ روشنی اُدھر سے آ رہی تھی جدھر کی دیوار میں طاق بنا ہوا تھا۔ میرے قدم ادھر ہی اٹھنے لگے۔ وہی منظر پھر سے نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ وہی کٹورا تھا اور اس میں پڑا سانپ تھا اور سانپ کی گھورتی ہوئی چمکتی آنکھیں تھیں۔ آج بھی میرے دماغ میں سرگوشی ہوئی کہ ''تمہیں روپیا چاہیے۔ لے جاؤ میرے پاس بہت روپیا ہے۔ تمہیں دولت چاہیے اور مجھے زندگی۔ میں مر رہا ہوں۔ سو سال سے میرا جسم پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اسے جان چاہیے۔ جان لے کر جان آتی ہے۔ تم جان دو، روپیا لے جاؤ۔''

میں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں...... میں اب اور کسی کی جان نہیں دے سکتی۔ کوئی نہیں مرے گا۔ تم مر جاؤ۔''

''لڑکی عقل سے کام لو ورنہ پچھتاؤ گی۔ میں ٹیڑھی کھیر ہوں اب تو گلے میں اٹک ہی گیا ہوں۔ جلدی بھوگ (قربانی) دو ورنہ میں تمہیں ہی مار دوں گا۔''

''اگر تمہاری بات صحیح ہے کہ میں نے کسی کو قربان کیا ہے تو میں تمہاری محسن ہوئی ناں! کوئی محسن کو بھی مارتا ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ جتنی جلد ہو سکے مجھے قربانی دو۔ مجھے خون چاہیے، تازہ خون۔ میری پیاس جاگ رہی ہے۔''

''میں...... میں کوشش کروں گی۔''

''جاؤ...... پرسوں پورنماشی کی رات ہے۔ یہ رات بہت اہم ہوتی ہے۔ آسمان پر پورا چاند ہوتا ہے۔ اور زمین پر برستی ہوئی اس کی چاندنی کائنات کے پورے راز کھولتی رہتی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ یہ رات مہینے میں ایک ہی بار آتی ہے۔ پرسوں کی رات کئی معنوں میں اہم ہے۔ وہ اس لیے کہ اس رات کرک ریکھا (خطِ استواء) کروٹ لے گی اور ایسا پانچ سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ جاؤ میرے لیے خون کا انتظام کرو۔ گرم گرم تازہ تازہ خون۔''

میں دوڑتے ہوئے باہر بھاگی۔ کب برآمدے کو پار کیا۔ کب میں کمرے میں آئی کچھ خبر نہیں۔

بستر پر آ کر ایسے گری تھی جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہوں۔ کافی دیر تک میں لیٹے لیٹے سانس لیتی رہی پھر سونے کے لیے کروٹ بدل لی۔ پتا نہیں کب میری آنکھوں میں نندیا دیوی نے پیر پھیلا لیے۔ کب میں نیند کی وادی میں اتر گئی۔ کب میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ کچھ بھی یاد نہیں۔

☆=======☆=======☆

وہ ایک گھنا پیڑ تھا۔ آسمان پر چمکتے چاند کی کرنیں سیدھی آ کر اس پر گر رہی تھیں۔ شاید اسی لیے اس کا سایہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ برگد کا وہ پیڑ ہندوؤں کے لیے متبرک تھا۔ دور دور سے ہندو عورتیں آتی تھیں۔ اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر پتا نہیں کیا کیا بدبداتی تھیں۔ منتر جاپنے کے بعد لوٹے میں لائے پانی کو اس پیڑ کی جڑ میں ڈالتی تھیں پھر کچے سوت کے دھاگے کا ایک سرا پیڑ میں باندھ کر دوسرا سرا پکڑ لیتیں پھر اس کے گرد گول گول گھومتی تھیں۔

مگر یہ سب کچھ شام کے وقت ہوتا تھا۔اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ایسے پُر اسرار ماحول میں، میں اکیلی بیٹھی تھی۔اسی پیڑ کے نیچے بنے چبوترے پر تبھی مجھے دور سے آتا ہوا ایک نوجوان نظر آیا۔وہ نوجوان نہایت ہوشیاری سے اطراف کا جائزہ لیتا ہوا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی مٹی کی ہانڈی تھی۔دور ہی سے اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ رس گلہ لیے چلا آ رہا ہے کیونکہ مٹھائیوں میں یہ واحد مٹھائی ہے جو ہانڈی میں آتی ہے۔وہ نوجوان قریب آ گیا۔اس نے قریب آ کر وہ ہانڈی میرے ہاتھ میں دے دی۔ ہانڈی میں رس گلہ تھا۔اسے دیکھ کر میں نے کہا۔''کیا بات ہے یہ کس خوشی میں لائے ہو؟''

''میرے گھر میں ''ست نرائن برت کتھا'' تھی۔تم تو آئی نہیں اس لیے میں تمہارے لیے رس گلہ لے آیا۔''

''میں نے کہا ہے ناں، میں تمہیں صرف دیکھنے آتی ہوں۔نہ مجھ سے زیادہ باتیں کیا کرو اور نہ مجھے کبھی کچھ کھانے پینے کے لیے کہو۔'' کہہ کر میں اس کے شانے پر سر رکھ کر آسمان پر بکھرے تاروں کو دیکھنے لگی۔اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں صدیوں سے اسی طرح اس کے شانے پر سر ٹکا کر بیٹھتی آ رہی ہوں۔میں اس طرح سے بیٹھنے کی عادی ہوں۔پتا نہیں اس وقت میری حمیت کو کیا ہوا تھا۔میں تو ایسی نہیں ہوں۔صوم صلوٰۃ کی پابند ہوں۔غیر مرد کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔پھر ایسا کیوں؟ جب کہ اس وقت میرے ہر انداز سے پیار جھلک رہا تھا جیسے میں اسے دل و جان سے چاہتی ہوں۔وہ بھی پیار بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''تمہاری پُر اسراریت اپنی جگہ مگر مجھے تم سے پیار ہے۔میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔اس لیے تو تمہاری ہر بات پر سرِ تسلیم خم ہے۔تم نے کہا کبھی میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہ کرنا، میں نے آج تک تمہارے گھونگھٹ کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔تمہاری آواز مجھے بہت پسند ہے پھر بھی میں تمہارے حکم پر تمہیں کم سے کم بولنے کو کہتا ہوں۔''

وہ ایک کے بعد ایک اپنے دل کا درد بتاتا جا رہا تھا اور میں خاموشی سے سن رہی تھی۔کئی بار دل میں آیا کہ میں اپنے چہرے سے گھونگھٹ ہٹا دوں اپنا چہرہ اسے دکھا دوں مگر پتا نہیں ایسی کیا بات تھی کہ میں چاہ کر بھی ایسا نہ کر سکی۔

''آج میرے دل کی مراد پوری کر دو موہنی!''

نوجوان نے التجائیہ انداز میں کہا۔اس کے لہجے میں زمانے بھر کی امید سمٹ آئی تھی۔وہ کسی بھکاری کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔''ادھر دیکھو وہ چاند طلوع ہو رہا ہے۔جب یہ چاند اوپر اور اوپر چڑھے گا تو پورا گگن، پوری دھرتی پورا علاقہ کرنوں سے نہا جائے گا۔ہر سُو اجالے کی ضیا پاشی ہوگی۔سب کچھ حسین نظر آنے لگے گا۔میں اپنی دنیا کو بھی حسین، حسن کی ضیاء سے منور کرنا چاہتا ہوں۔بس ایک بار صرف ایک بار اپنا چہرہ دکھا دو۔''

یہ کوئی انوکھی فرمائش نہیں تھی۔نہ کوئی جرم تھا۔یہ فرمائش تو ہر محبوب کرتا ہے پھر بھی میں نے اس کی التجا کو رد کر دیا۔

نوجوان امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔''اچھا، مت دکھاؤ اپنی موہنی صورت مگر آواز تو سناتی رہو۔تمہاری آواز میں ڈھلتی شام کا سارا روپ ہے۔تم بولتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے کچنار کی کلیاں ہواؤں کی تال پر رقص کر اٹھتی ہوں۔''

میں سمجھ گئی وہ کلائی تک پہنچنے کے لیے انگلی پکڑ رہا ہے۔اب ایک کے بعد ایک فرمائشوں کی قطار لگے گی۔اس لیے میں گویا پاگل ہو اٹھی۔

اسے زور کا دھکا دیا اور اچھل کر کھڑی ہوگئی پھر دوڑتی ہوئی گاؤں میں داخل ہوگئی۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا۔اس سے پہلے بھی ایک نوجوان نے زبردستی میری زندگی میں آنا چاہا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ یاد کیوں نہ ہوگا صرف تین مہینے پہلے کی بات ہے۔اس روز میں اسکول جارہی تھی۔ میرا اسکول گھر سے فاصلے پر تھا۔اس لیے میں اکیلی نہیں جاتی تھی۔ پڑوس کی روشن آراء کو ساتھ لے لیتی تھی۔ وہ بھی میری ہی کلاس میں پڑھتی تھی اور میرے انتظار میں گلی کے باہر سڑک پر کھڑی میرا انتظار کرتی تھی۔ میں جیسے ہی اپنے گھر سے نکلی اور چلتے چلتے داہنی جانب کی دوکان پر نظر ڈالی، غصہ جاگ اٹھا۔ آج پھر وہی لڑکا کھڑا تھا۔ وہ ہر روز اسی جگہ کھڑا ہوتا تھا۔ آج بھی کھڑا تھا۔اسے کھڑا دیکھ کر میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ سڑک پر پہنچی تو روشن آراء کھڑی تھی۔ اس نے میرا جائزہ لے کر کہا۔

''کیا بات ہے تُو کچھ فکر مند نظر آ رہی ہے؟''

''فکر مند نہیں پریشان؟''میں نے تصحیح کی۔

''کس بات کی پریشانی؟''

''ایک لڑکا ہر روز میرا پیچھا کرتا ہے؟''

''تُو ہے ہی اتنی پیاری اس بے چارے کا کیا قصور۔''روشن آراء نے اس بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔

''تُو اسے مذاق سمجھ رہی ہے اور میری جان نکل رہی ہے اگر میرے بابا نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔ یہ عمر ہوتی ہی اس لیے ہے کہ.....''روشن آراء نے میری بات کو بہت ہلکے لیا۔

''خیر اب میں کچھ نہیں کہوں گی۔''میں نے ناراضگی بھرے لہجے میں کہا۔

''ارے تُو تو ناراض ہوگئی۔ اچھا بابا بول کیا کہنا چاہتی ہے۔ ایسا کر تُو مجھے کل اس لڑکے کو دکھا دینا پھر میں اپنے بھائی سے کہہ کر اس کی اچھی خاصی مرمت کرادوں گی۔''

''ٹھیک ہے کل تُو میرے گھر آ جانا ہم دونوں ایک ساتھ نکلیں گے۔''

''کیا وہ لڑکا چھٹی کے وقت بھی اسکول کے باہر نظر آتا ہے؟''

''ہاں کبھی کبھی!''

''اگر آج نظر آئے تو بتانا۔''

''وہ دیکھو وہ رہا پیلی شرٹ والا۔''میں نے اشارے سے دور کھڑے اس لڑکے کو دکھایا۔

روشن آراء نے ادھر دیکھا اور اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

''کیا ہوا تیرا رنگ فق کیوں پڑ گیا؟''میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ تُو فکر نہ کر اب یہ لڑکا تیرے پیچھے نہیں آئے گا۔'' کہہ کر اس نے قدم تیز کر دیے۔ میں بھی تیز تیز قدموں سے اسکول کی

طرف بڑھتی چلی گئی۔

پتا نہیں روشن آرا نے کس طرح اس لڑکے کو دھمکی دی کہ اس دن کے بعد سے وہ پھر نظر نہ آیا میں بھی خوش تھی کہ چلو اس لڑکے سے جان چھوٹی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا کہ 1964ء کے فسادات شروع ہو گئے۔

بہار کے جمشید پور سے شروع ہونے والا فساد مغربی بنگال میں پھیلا پھر مشرقی پاکستان تک پہنچ گیا۔ مغربی بنگال میں مسلمانوں کے گھر جل رہے تھے تو یہاں ہندوؤں کے گھر جلنا شروع ہو گئے۔ گو کہ مغربی بنگال جیسی شدت نہیں تھی مگر فساد تو ہر حال میں فساد ہوتا ہے۔ یہاں بھی گھر لٹنے لگے تھے۔ ہندوؤں کی سب سے بڑی آبادی سکھاری بازار خالی ہونے لگا تھا۔ ہندو بھاگ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے بھی وہ حملہ کرنے سے باز نہیں آ رہے تھے۔

ہمارے گھر پر بھی حملہ ہو گیا۔ بابا کو ذرا بھی امید نہ تھی کہ کوئی ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ سبھی کو علم تھا کہ بابا جھاڑ پھونک بھی جانتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں سے کون نہیں ڈرتا ہے۔ پھر بھی حملہ ہوا اور بابا کو گھر سے باہر کھینچ کر قتل کر دیا گیا۔ گھر میں آگ بھی لگا دی گئی۔ اماں اور بہنیں کہاں گئیں کچھ پتا نہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ شہر میں کشیدگی پھیلنے سے پہلے مجھے روشن آراء کی ماں فریدہ موسی اپنے ساتھ لے کر زنجیرا چلی گئی تھیں۔ ڈھاکا اور زنجیرا کے درمیان صرف بوڑھی گنگا کا تیز دھارا ہے مگر یہاں کی بھڑکتی ہوئی آگ وہاں تک پہنچ نہیں پائی۔ زنجیرا میں امن و امان رہا جب کہ وہاں اچھی خاصی تعداد میں ہندوؤں کے گھر تھے اور وہ سب کے سب پیسے والے تھے۔ تقریباً ہر گھر میں بندوق تھی۔ اس دور میں بندوق کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے گاؤں والوں نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ فریدہ موسی نے وہاں سب کو یہ بتا دیا تھا کہ میں مسلمان ہوں اور ایک عامل کی بیٹی ہوں اس لیے سب نے مجھے عزت و احترام سے رکھا۔ ایک ہفتے بعد ڈھاکا سے خبر پہنچی کہ مجھ پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ اب میرا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ میں بے سہارا ہو چکی تھی۔ کہاں جاؤں کس کا سہارا لوں اس بارے میں سوچ سوچ کر ذہن پھٹ رہا تھا۔ تقریباً دو ہفتے زنجیرا میں گزار کر فریدہ موسی ڈھاکا آ گئی۔ ان کا گھر بھی لٹ چکا تھا۔ رفاعی ادارے لٹے ہوئے لوگوں کی امداد کر رہے تھے۔ جلے ہوئے مکانات دوبارہ تعمیر ہو رہے تھے۔ فریدہ موسی نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا کیونکہ میرا رونا کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ میرے غم کا احساس انہیں بھی تھا اور وہ بھرپور انداز میں میری دل جوئی کر رہی تھیں۔ ان کا بیٹا میرے گھر کی تعمیر میں لگا ہوا تھا۔ اس نے امدادی رقم سے مکان تعمیر کرا دیا۔ دوبارہ اسی طرح گھر کے باہر بورڈ لگ گیا کہ یہاں کالے علم کی کاٹ کی جاتی ہے۔

مجھے ہوش کہاں تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہی بابا کی جگہ پر بیٹھنے لگا ہے اور خود کو ان کا شاگرد کہتا ہے۔

میں سارا دن کمرے میں پڑی رہتی۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ عام حالات میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ مجھے سہارا دینے کے لیے شادی کر دینا چاہیے تھا مگر ابھی تک ایسی بات کسی نے نہیں کی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ صرف بابا کی گدی کے لیے میرا سہارا لینا چاہتے تھے جو انہیں مل گیا۔ اب انہیں پیسوں سے مطلب ہے اور پیسے آنے کے راستے کھل چکے ہیں۔ بابا کے تمام گاہک اب جلیل سے "عمل"

کرانے لگے تھے۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی تھی اور میں نے موسیٰ سے کہہ دیا کہ جلیل سے کہہ دیں وہ میرے بابا کی گدی پر نہ بیٹھے میں خود بیٹھوں گی۔

مجھے روشن آراء کا خیال آ گیا تھا۔ میں اُٹھ کر اس کے گھر جانے کے لیے نکل پڑی۔

روشن آراء گھر میں ہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی اور اس نے پوچھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟ اکیلی کیسے رہوگی؟''

''اللہ جیسے رکھے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ایک بات بتاؤں ناراض تو نہیں ہوگی؟''

''بولو! تم سے ناراضگی کیسی؟''

''حالات یوں ہی کشیدہ ہیں مگر بولے بغیر چارہ نہیں۔ تمہیں یاد ہے ناں وہ لڑکا جو تمہارے اسکول کے راستے میں کھڑا رہتا تھا؟''

''ہاں یاد ہے پھر؟''

''تو یہ کہ تم اسے اپنا لو، وہ واقعی تم سے بہت پیار کرتا ہے۔''

''میں اسے کیسے اپنا لوں میں مہاجر ہوں اور وہ بنگالی پھر ہم دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟''

''شہنشاہ اکبر کی بیوی جودھا بائی ہندو تھی، جب ہندو مسلمان ایک ہو سکتے ہیں تو پھر بنگالی بہاری کیوں نہیں۔ اسلام میں صرف تقویٰ کو......''

''بڑے لوگوں کی بڑی بات ہم غریب لوگ طبقات کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''اگر اسے اپنا نہیں سکتی تو کوئی بات نہیں اسے سہارا دینے کی ہی اجازت دے دو، مستقبل کا حال تو اللہ کے علم میں ہے۔''

''لیکن تم اس کی اتنی وکالت کیوں کر رہی ہو؟''

''اس لیے کہ وہ میرا سب سے بڑا بھائی ہے سگا بھائی۔''

''اچھا تو اسی لیے اس دن اسے دیکھتے ہی تمہارے چہرے کی رنگت اُڑ گئی تھی؟''

''ہاں یہی بات تھی۔ وہ تمہیں دل و جان سے چاہتے ہیں۔ میری ان سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تم سے شادی نہیں ہوئی تو وہ زندگی بھر کنوارہ رہے گا۔''

میں سوچ میں پڑ گئی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ میں کسی نہ کسی بندے کا سہارا لوں۔ کسی ایسے بندے کا جو واقعی میرے لیے مخلص ہو۔ وہ لڑکا جی جان سے میری مدد کرتا۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔

''اس سے کہنا کہ میں اس کے بارے میں سوچوں گی۔'' پھر میں وہاں سے اٹھ آئی۔ اس کے گھر سے میرے گھر کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ میں پیدل ہی لوٹ رہی تھی۔ ابھی میں گلی کے موڑ پر پہنچی ہی تھی کہ میرے قریب آ کر ایک جیپ رکی اور اس سے دو آدمی اترے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ میں خود بھی سمجھ نہ سکی۔ ان لوگوں نے مجھے چاول کے بورے کی طرح اٹھایا اور جیپ میں بھر لیا۔ میں چیخی چلائی لیکن جیپ تیز رفتاری

سے گنڈیریا کی طرف دوڑنے لگی۔ گنڈیریا کا پل پار کرتے ہی ''پوستا'' کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سیدھا راستہ نرائن گنج تک جاتا تھا۔ وہ لوگ مجھے اسی طرف لیے جا رہے تھے۔ ایک نے میرا منہ دبا رکھا تھا اور دوسرے نے سیٹ کے نیچے دھکیل کر پیروں سے دبا رکھا تھا۔ میں کوئی پہلوان تو تھی نہیں اس لیے تکلیف سے جان نکل رہی تھی۔ سخت اذیت کا سامنا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جیپ رکی۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم چاشہرہ پہنچ چکے ہیں۔ مجھے بوٹ سے دبائے رکھنے والے نے اپنا جوتا میری پیٹھ پر سے ہٹا لیا تھا۔

''خاموشی سے نیچے اترو شور شرابہ کرکے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے کہ یہ گھر انتہائی اجاڑ جگہ میں ہے۔'' میرے منہ کو دبانے والے نے کہا۔

میں نے بہ مشکل خود کو گھسیٹ کر سیٹ کے نیچے سے نکالا پھر جیپ کے گرے ہوئے پردے سے باہر جھانکا۔ دور تک کھیت ہی کھیت نظر آ رہے تھے۔

''چلو نیچے اترو۔'' ایک نے دھکا دے کر کہا۔

مجھے اپنی عزت آبرو سخت خطرے میں نظر آئی مگر کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے حکم پورا کرنا پڑا۔ نیچے اتری تو سامنے ایک بیڑے (بانس کی چٹائی) سے بنا گھر نظر آیا۔ وہ لوگ مجھے اس گھر میں لائے اور پھر انہوں نے میرے پیروں میں زنجیر ڈالی جس کا ایک سرا شہتیر کے ساتھ باندھ دیا پھر وہ لوگ چلے گئے۔ جاتے جاتے بولے تھے۔

''خاموشی سے بیٹھی رہنا۔ ہم باس کو بلانے جا رہے ہیں۔ چالاکی دکھانے کی ذرا کوشش نہ کرنا۔ سمجھیں!''

☆=======☆=======☆

ایسا کیسے ہوگیا، زنجیر کیسے پگھل گئی۔ شنکر کو لقوہ کیوں مار گیا۔ اس کے ساتھی پتھر کیوں بن گئے۔ یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اب میں کیا کروں ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے قریب آ کر کسی نے سرگوشی کی۔ میں نے چونک کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ تبھی وہی سرگوشی پھر سنائی دی۔ ''بھاگ جا۔''

پتا نہیں میں کس جذبے کی اسیر بن گئی تھی کہ باہر کی سمت بڑھتی چلی گئی۔ باہر آ کر میں نے کالی سڑک پر نظریں دوڑائیں۔ دور دور تک کسی سواری کا نام ونشان نہیں تھا۔ میں پیدل ہی سڑک پر بڑھتی چلی گئی۔ کافی دور جانے کے بعد بھی مجھے کوئی راہ سجھائی نہ دی کہ میں شہر تک کیسے پہنچوں گی۔ اس سڑک پر ٹرک اور بسیں عام تھیں مگر آج ایک بھی سواری نظر نہیں آ رہی تھی۔ کسی وقت بھی شنکر اپنے گرگوں کے ساتھ مجھے ڈھونڈتا ہوا آ سکتا تھا اسی ڈر سے میں نے رفتار بڑھا دی تھی۔

اب میں کافی آگے آ چکی تھی۔ یہاں سے ''پوستہ'' کی آبادی نظر آ رہی تھی۔ ''پگلا'' کی فلور مل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ تبھی مجھے ایک گھنے برگد کے نیچے وہ دکھائی دے گیا۔ وہ اپنی دھن میں مست بیٹھا کچھ کر رہا تھا۔ میں تیز تیز چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ شاید کوئی فقیر تھا۔ اچھی خاصی عمر تھی۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے بالکل جھاڑ جھنکار سے نظر آ رہے تھے۔ جسم پر بوسیدہ لباس تھا۔ گالوں اور ہاتھوں پر میل کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ شاید وہ برسوں سے نہایا نہیں تھا۔ منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ گویا وہ پورا کریہہ صورت تھا۔ میرے قریب پہنچنے کے بعد بھی اس نے سر نہیں اٹھایا۔ وہ بڑے انہماک سے زمین پر آڑی ترچھی لکیر کھینچنے میں مصروف تھا۔ میری موجودگی کو بھی اس نے محسوس نہیں کیا تھا اور بے مقصد لکیریں کھینچے جا رہا تھا۔ اس کے قریب چند سکے پڑے ہوئے تھے جو شاید مسافروں نے ترس کھا کر اس کے سامنے ڈال دیئے تھے۔ میں نے اپنے آنچل میں بندھے روپے کھولے اور ان میں سے ایک نوٹ نکال کر اس کے سامنے ڈالنا چاہا تھا کہ اس نے جھکا ہوا سر اٹھا دیا۔ اس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو رہی تھیں لیکن نظروں میں ایسی تیزی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے جسم کا ایکسرے کر رہا ہو۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''بابا! اسے رکھ لو۔''

''کیوں رکھ لوں؟''

''یہ تمہارے کام آ سکتا ہے۔''

''یہ کاغذ کا معمولی سا ٹکڑا میرے کس کام کا ہے۔''

''تم اس سے کھانے پینے کا سامان خرید سکتے ہو۔''

اس نے وحشت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر گونجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے ساتھ مذاق کرتی ہو۔ بیوقوف عورت! بھوک کبھی نہیں مٹتی۔ جتنا مٹانے کی کوشش کرو گی اتنی ہی بڑھے گی۔ میں ایک عرصے سے فاقہ کر رہا ہوں تم بھی شروع کر دو۔''

میں سمجھ گئی تھی کہ وہ صحیح الدماغ نہیں ہے۔ پاگل کا کیا بھروسا وہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

''مجھے چھوڑ کر نہ جا۔ رک جا۔'' اس کی آواز میں یکلخت درد بھر آیا تھا۔ ''اگر تو چلی گئی تو میں بھٹک جاؤں گا۔''

''نہیں بابا تم کبھی بھٹک ہی نہیں سکتے۔''

''کیوں میرے میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے نوٹ اٹھالیا پھر اسے جھٹکے سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بولا۔'' لے یہ تیرے لیے ہے۔''

''میں نے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ وہ نوٹ کے ٹکڑوں کو ہوا میں اڑا تا رہا تھا۔ اس کے انداز نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ بولا۔'' دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہے جا اپنا کام کر۔ راستہ ناپ راستہ۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس خانے میں فٹ کروں۔ اسے مجذوب سمجھوں یا بزرگ یا پھر دیوانہ۔ وہ سی آئی ڈی افسر بھی ہوسکتا تھا جس نے خود کو دنیا والوں کی نظروں سے بچانے کے لیے بھیس بدل رکھا ہو۔ میں نے کہا۔''تم وہ نہیں ہو جو نظر آ رہے ہو۔''

''ہاں میں انسان نہیں لگڑ بگڑ ہوں۔ شیر کی آمد کا پتا دیتا ہوں۔ تُو بھی سنبھل جا...... جا تُو بھی سنبھل جا...... جا جا جا؟''

''تو تم اپنی اصلیت نہیں بتاؤ گے۔ اچھا یہ ہی بتا دو۔ میری پریشانیاں کیسے دور رہوں گی؟''

''اُڑ جا...... جا چلی جا یہی حل ہے وقت ہاتھ سے نکل گیا تو ساری زندگی پچھتائے گی۔''

اس کی باتیں عجیب ہی نہیں عجیب العجائب تھیں۔ میں اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ تبھی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بھاگتا چلا گیا۔ اسے دوڑتے دیکھ میں نے بھی دوڑ لگا دی۔ عجیب مضحکہ خیز منظر تھا۔

آگے آگے وہ پھٹے حال فقیر جس کے ہاتھ میں سانپ جیسا ٹیڑھا میڑھا عصا اور پیچھے پیچھے میں۔ میری ٹنگائل کی لمبے پاڑ والی ساڑھی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ آنچل پرچم کی طرح ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا اور میں دوڑ رہی تھی۔ کیوں دوڑ رہی تھی۔ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دوڑتے دوڑتے وہ رکا پھر اس نے مجھ سے کہا۔''بس جا تیرا کام ہو گیا۔'' اتنا کہتے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب میں نے غور کیا تو حیرت سے گنگ رہ گئی۔ اس وقت میں اپنے محلے میں کھڑی تھی۔ کہاں ''پوستہ'' اور ''پگلا'' کا علاقہ کہاں میرپور۔ اتنا طویل راستہ کیسے طے ہو گیا یہ سمجھ ہی میں نہ آیا۔ لیکن بہت زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ پے در پے میرے ساتھ ایسے حادثات ہو چکے تھے جنہوں نے سمجھا دیا تھا کہ اس دنیا میں انہونی بھی ہوتی ہے۔

میں انہی باتوں پر غور کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ ابھی میں گھر میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ روشن آراء کی آواز آئی۔''سن!!''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سامنے والے گھر سے نکل رہی تھی۔

''میں کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ تو گئی کہاں تھی؟'' روشن آراء نے کہا۔

''نیو مارکیٹ تک گئی تھی۔'' میں نے جھوٹ سے کام لیا پھر پوچھا۔'' خیریت! میری تلاش کیوں ہو رہی تھی۔''

''اس لیے کہ کل رات، ایک عجیب وغریب خواب دیکھا۔ خواب میں دیکھا کہ تم ایک ریگستان میں کھڑی ہو۔ تیز ہوائیں چل رہی ہیں، ریت اُڑ رہی ہے اور تم ریت میں دھنستی جا رہی ہو۔ تمہارے بالوں میں ریت بھر رہی ہے، کپڑے بھی میلے ہیں تبھی تمہارے ابا کہیں سے آ جاتے

ہیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے میری بیٹی کو ہوشیار کردو وہ دلدل میں دھنس رہی ہے۔ میں تمہیں بچانے کے لئے دوڑتی ہوں لیکن تم تک پہنچ نہیں پاتی ہوں۔ آدھے راستے میں ریت سے نکل کر ایک سانپ تمہیں جکڑ لیتا ہے۔''

میں پریشان ہوگئی کہ میرے مرحوم ابا پریشان ہیں۔ یکا یک حالات نے جو رخ اختیار کیا ہے وہ واقعی دلدل ہے، میں اس دلدل سے کیسے نکلوں، یہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

''کس سوچ میں ڈوبی ہے کیا اندر نہیں جانا ہے۔'' روشن آراء نے کہا تو میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور سیدھے اس کمرے میں آ گئی جس میں، مَیں سوتی تھی۔ کمرے کی ابتر حالات دیکھ کر روشن آراء نے کہا۔''یہ تُو نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ انسان جہاں رہتا ہے وہاں صفائی ضرور رکھتا ہے۔''

''کمرے کی یہ حالت اس لیے ہے کہ میرا دل اب کسی کام میں نہیں لگتا۔''

''یہ سب باتیں چھوڑ اور زندگی میں دلچسپی لے۔ بڑے بڑے حادثے ہوتے ہیں اور لوگ انہیں بھلا دیتے ہیں۔ زندگی غم میں گزارنے کا نام نہیں۔ انجوائے کرنے کا نام ہے۔ خیر تُو سو جا میں چلتی ہوں۔'' کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں سونے کی کوشش میں لیٹ گئی۔ ابھی لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے گھر میں ہوں، اسی کمرے میں جہاں ایک طاق میں رکھے کٹورے میں سانپ دیکھا تھا۔ میں کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی ہوں اور کٹورے کا سانپ رینگتا ہوا کٹورے سے باہر آ رہا ہے۔ اب اس کی جسامت بھی بڑھ چکی ہے۔ پہلے دن وہ مجھے لاغر سا نظر آیا تھا۔ دوسری بار پہلے سے زیادہ تندرست تھا مگر اب تو وہ پوری طرح چاک و چوبند نظر آ رہا تھا۔ بار بار پھنکار رہا تھا۔

اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میری ساری مصیبتیں اسی کی وجہ سے ہیں۔ اسی کی وجہ سے میری بہن مری۔ اسی کی وجہ سے میرے ابو اور امی قتل ہوئے۔ اسی کی وجہ سے میرا گھر لٹا۔ میرے ابو امی مشرقی پاکستان اس لیے آئے تھے کہ یہاں عزت آبرو محفوظ رہے گی لیکن آج خود میری آبرو خطرے میں آ چکی ہے۔ پورے ڈھاکا شہر میں ہند وحقارت کا نشان ہیں۔ اونچی آواز میں کسی بنگالی سے تو بات کر لیں مگر کسی اردو داں سے بات کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی۔ اردو بولنے والوں نے ان کی تضحیک کے لیے نام دے رکھا ہے۔ وہ انہیں ملعون کہہ کر پکارتے ہیں۔ پھر بھی انہوں نے ہمارا گھر لوٹ لیا۔ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی۔

''مت سوچ مت سوچ۔'' میرے ذہن میں سرگوشی ہوئی اور میں نے چونک کر سانپ کی طرف دیکھا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں میری جانب تھیں۔ وہ تیز نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں پھیر لیں۔

''مجھ سے نظریں چرا رہی ہے مت بھٹک۔ تیری منزل سامنے ہے۔ دولت، شہرت، عزت سب ملے گی۔ تجھے۔ تُو صرف میری سیوا (خدمت) کیے جا۔ مجھے بلی (قربانی) چڑھاتی رہ۔ مجھے شکتی (قوت) دیتی رہ پھر دیکھنا اس برہمہ لوک (عالم) میں ہر کوئی تیرے آگے نت مستک (سر جھکائے) رہے گا۔ میری شکتی آپرمپار (قوت لامحدود) ہے۔ یہ شکتی میں تجھے دوں گا بس تُو مجھے ایک بلی اور دے دے۔''

پتا نہیں کیسے مجھ میں پہلی بار اس سے ہمکلام ہونے کی قوت آ گئی اور میں نے جواباً بے معنی سا سوال کیا۔ ''اے تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام ست دیر ہے۔ بہت خوب تم نے پہچان لیا کہ میں معمولی سانپ نہیں ایک مہان شکتی ہوں۔''

''اپنا پورا تعارف کراؤ تبھی تو میں پہچانوں گی۔''

''میرا پریچے؟ میرا نام تو سن چکی۔ اب سنو میں کون ہوں۔ کہہ کر وہ رکا پھر بولا۔'' تم نے راجا وکر مادت کا نام سنا ہوگا۔ اجین نگری کا مشہور راجا!''

''یہ اجین کہاں ہے؟''

''اجین'' پراچین کال میں بہت بڑی نگری (شہر) تھی۔ اس نگری پر راجا وکر مادت راج کرتا تھا۔ وہ بہت دیالو (رحمدل) اور نیائے داتا (انصاف دلانے والا) تھا۔ اس نے بے شمار اچھے کام کیے تھے۔ بھگوان اس سے خوش تھے۔ میں اسی کے دربار کا پروہیت (پجاری) تھا......''

''مگر یہ اجین تھا کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''اجین آج بھی ہے مگر اب وہاں راجا وکر مادت کا راج نہیں ہے۔ اس وقت وہ بھارت کے صوبہ مدھیہ پردیش کا ایک شہر ہے۔''

''پھر تم یہاں کیسے آ گئے؟''

''میں آیا نہیں ہوں لایا گیا ہوں۔ میں نے برسوں پہلے گھور تپسیا کی تھی۔ خود کو امر کر لیا تھا۔ اب مجھے موت نہیں آئے گی یہ جاننے کے بعد میں نے خود کو سانپ کے قالب میں ڈھال لیا۔ میں سانپ بن کر اپنے ہی محل کے نیچے ایک تہہ خانے میں سو رہا تھا۔ میری نیند سو سال پر محیط تھی کہ یہاں کے ایک تانترک نے اپنے منتر شکتی سے مجھے وہاں سے یہاں کھینچ لیا۔ اس نے اپنی شکتی، قوت بڑھانے کے لیے مجھے کھینچا تھا۔ وہ میرے علم کو چھین لینا چاہتا تھا۔ گیدڑ نے شیر پر حملہ کیا تھا۔ میں نے اسے ایسا سبق دیا کہ وہ زندگی ہار بیٹھا۔ میں نے نہ صرف اس کے علم پر قبضہ کر لیا بلکہ اس نے جتنی دولت جمع رکھی تھی وہ بھی حاصل کر کے اس کی آتما (روح) کو غلام بنا لیا۔ میرے غلاموں کی بہت بڑی فوج ہے۔ جہاں پر یہ گھر بنا ہے وہیں اس بدذات تانترک کا محل تھا جو برسوں پہلے کھنڈر ہو گیا۔ میں اسی کھنڈر تلے آرام سے سو رہا تھا کہ تمہارے باپ نے پتا نہیں کیا کیا پڑھنا شروع کیا جس نے میری قوت کو کم کرنا شروع کر دیا۔'' سانپ بول رہا تھا مگر اس کی آواز میرے دماغ میں گونج رہی تھی جیسے وہ وہیں بیٹھا ہوا بول رہا ہو۔

میں حیرت سے اس کی سرگزشت سن رہی تھی کہ میرے دل میں اک نیا خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ ''میرے ابا نے ایسا کون سا عمل کیا تھا؟''

''وہ کوئی عمل نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنی وہ کتاب پڑھتا تھا جس کا میں نام بھی نہیں لے سکتا۔ اگر لیا تو جل جاؤں گا۔''

''قرآنِ حکیم؟''

''ہاں! اسی لیے تو اسے حکیم کہتے ہیں کہ اس میں حکمت کی تمام باتیں ہیں۔ تمام رازِ کائنات ہے۔ اس کا ہر لفظ اپنی جگہ ایک قوت رکھتا ہے۔ اسی قوت نے میری قوت کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا تھا مگر اس میں ایک اچھی بات بھی تھی۔ وہ ہر روز اس کتاب کو نہیں پڑھتا تھا۔ جمعہ کے جمعہ

بڑھتا۔ جب وہ بڑھتا تو میری قوت گھٹ جاتی۔ میں تڑپنے لگتا اور یہ ایک ہفتہ جو مجھے ملتا اس ایک ہفتے میں، میں اپنی قوت مجتمع کرتا۔ لیکن میری قوت اس کی قوت کے آگے صفر تھی اس لیے میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا کہ مجھے تم نظر آ گئیں اور میں نے جان لیا کہ تم اس کتاب کے گنتی کے الفاظ (سورہ) پڑھتی ہو۔ بس میں نے تم سے کام لینے کی شروعات کر دی۔ اسی کتاب کے مطابق ایک بالٹی پانی کو ایک قطرہ نجاست خراب کر دیتا ہے۔ میں نے بھی تمہیں دولت دے کر تمہارے ایمان کو خراب کیا پھر تم پر سوار ہو کر تمہاری بہن تک پہنچا اور اسے پیڑ سے گرا کر اس کی آتما پر قبضہ کر لیا اس طرح میری قوت بڑھ گئی۔''

''یعنی تمہاری روح، تمہاری نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری آتما کو نئی آتما سے قوت ملتی ہے۔ مجھے بار بار قوت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اب میرے لیے یہ کام تم کرو گی کیونکہ اب تمہارا باپ بھی نہیں رہا جو یہاں بیٹھ کر وہ کتاب پڑھے گا اور تم پڑھ نہیں سکتیں کیونکہ تمہارے اندر میں نے نجاست ڈال دی ہے۔''

''اور اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟''

''تو میں تمہاری آتما پر بھی قبضہ کر لوں گا۔ تمہیں کل اپنے گھر آ کر میرے لیے انسانی بلی (قربانی) کا انتظام کرنا ہے۔'' کہہ کر سانپ نے کٹورے میں خود کو لٹا لیا تبھی میری آنکھ کھل گئی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں تو اسی کمرے میں لیٹی تھی جو نور النہار کا تھا۔ یعنی اب تک میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ فقط خواب تھا۔ میں بستر پر لیٹی اسی خواب پر غور کر رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ کوئی اندر آنا چاہتا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ گھر نور النہار کا تھا۔ اس کی امی یا وہ خود آتی رہتی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے آواز دی۔ ''دروازہ کھلا ہوا ہے اندر آ جائیں۔''

دروازہ کھلا اور وہ داخل ہوا اسے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ ''تم......تم کیوں آئے ہو؟''

''میرا آنا برا لگا ہے؟'' اس نے کہا۔

''برا لگنے کی بات ہے اتنی رات گئے، چوروں کی طرح تم آؤ گے تو کیا مجھے برا نہیں لگے گا؟''

''یہ جو سینے میں ٹک ٹک کرتا ہوا دل ہوتا ہے ناں! یہ بڑا ظالم ہوتا ہے۔ جب بغاوت پر اترتا ہے تو کچھ نہیں دیکھتا۔ میں بھی تمہاری چاہت میں بے قابو ہو چکا ہوں۔''

''اپنے دل کو سنبھال کر رکھو۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔''

''میں بھی کوئی سڑک چھاپ یا دل پھینک نہیں ہوں۔ زندگی گزارنے کے لیے ہر لڑکے کو ایک لڑکی اور ہر لڑکی کو ایک لڑکا چاہیے۔ میں نے اپنی زندگی کے سفر میں تمہیں ہمسفر چن لیا ہے۔''

''تم میری سہیلی کے بھائی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہاری شکایت پر مجبور ہو جاؤں اس لیے فوراً چلے جاؤ۔''

''اگر میں نہ گیا تو؟''

''تو میں شور مچا دوں گی۔''

''روشن آراء تو پہلے ہی میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ تمہارا شور باقی کے لوگوں کو بھی اس پیار کی خبر سنا دے گا۔''

''مجھے غصہ نہ دلاؤ شرافت سے چلے جاؤ، بہت ہو گیا۔ اب اگر بکواس کی تو میں جوتے سے بات کروں گی۔'' میرا لہجہ حد درجہ سخت ہو گیا تھا۔

میرے لہجے کی تلخی نے اسے سمجھا دیا کہ اب میں کچھ کر بیٹھوں گی۔ خود وہ بھی سہم گیا تھا شاید اسی لیے وہ مرے مرے قدموں سے سر جھکائے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

اسے یوں بے نیل و مرام لوٹاتے ہوئے خود مجھے بھی افسوس ہو رہا تھا۔ ہر لڑکی کے اندر ایک چور جذبہ بھی ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے چاہے اس کی پرستش کرے۔ اس کے آگے پیچھے رہے۔ مگر فی الحال ایسے حالات نہ تھے کہ میں عشق و عاشقی کا کھیل کھیلتی اس لیے میں نے خود کو بستر پر گرا لیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس وقت بھی ذہن جاگ رہا تھا اور میں سوچے جا رہی تھی کہ میرا گھر تو ملبہ بن چکا ہے۔ یہ گھر اس کا ہے۔ روشن آراء بھلے ہی میری سہیلی ہے مگر وہ بھی بھائی کا ساتھ دے گی۔ کہیں یہاں ٹھہرنا میرے حق میں برا ثابت نہ ہو۔ وہ اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا لے۔ کیا مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جانا چاہیے۔

یہی سب سوچتے سوچتے میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو طبیعت بے حد افسردہ مضمحل تھی اور جسم کا ایک ایک عضو، ایک ایک جوڑ دکھ رہا تھا جیسے میں میلوں پیدل چلی ہوں۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ایک طویل انگڑائی لی اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر تکیہ کے سہارے بیٹھ گئی۔ پھر یکا یک بری طرح چونک اٹھی۔ میں اس طرح سے چونکی تھی جیسے کسی نے مجھ پر انگارے الٹ دیئے ہوں۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اس قدر حیرت ناک اور ناقابلِ یقین تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اپنی بینائی پر شبہ ہوا تھا۔ کہیں میں عالم خواب میں تو نہیں ہوں یہ سوچ کر میں نے خود اپنے ہاتھ پر چٹکی بھری تو یہ بات وثوق کو پہنچ گئی کہ میری آنکھوں کے سامنے سو فیصد حقیقت ہے مگر ایسی خوفناک حقیقت کہ میرے جسم کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور خنکی کے باوجود پسینا آ گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں رات میں جب سوئی تھی تو میرے جسم پر گلابی سوٹ تھا۔ بے داغ گلابی سوٹ۔ نئے فیشن کے مطابق میں نے پی آئی اے کٹنگ کا سوٹ سلوایا تھا مگر وہی بے داغ سوٹ اس وقت خون کے چھینٹوں سے لتھڑا ہوا تھا۔ تازہ سرخ اور کراہیت آمیز خون۔ خصوصاً دائیں ہاتھ کی آستین تو خون میں شرابور تھی اور اس سے ابھی تک قطرے ٹپک رہے تھے۔ میرے ہاتھ بھی خون میں لتھڑے ہوئے تھے اور پاؤں بھی آلودہ تھے۔ میں خوفزدہ نظروں سے اپنے لباس کو دیکھ رہی تھی جو خون میں شرابور ہونے کے سبب جسم سے چپک گیا تھا۔

کچھ دیر میں جب حواس بحال ہوئے تو میں نے غور کرنا شروع کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ روشن آراء کا بھائی وہ رات کے کسی پہر پھر میرے کمرے میں آ گیا ہو اور میرے دھتکارنے کا بدلہ اس طرح لیا ہو کہ میں مر جاؤں۔ اس نے بری طرح مجھے زخمی کر دیا ہو لیکن میں اپنے جسم پر معمولی سی بھی تکلیف محسوس نہیں کر رہی تھی۔ پھر بھی میں نے جسم کو ٹٹول کر دیکھا لیکن کہیں بھی معمولی سی خراش تک نظر نہ آئی۔

ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ میرے اکلوتے دشمن شنکر نے کسی کو قتل کر کے خون میرے کپڑوں پر پھینک دیا ہو۔ تاکہ میں قتل کے الزام میں پکڑی

جاؤں اور اس کا انتقام پورا ہو جائے۔ اس مفروضے کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی تھی کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اب یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص کسی طرح اندر آ گیا پھر جب اس کا کام مکمل ہو گیا ہو تو وہ باہر نکل گیا ہو اور چٹخنی خود بخود بند ہو گئی ہو ایسا صرف شنکر کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی ایسی قوت تھی جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔

''اے تُو اٹھ گئی ہے تو اب باہر بھی آ جا۔'' روشن آراء کی آواز پر میں چونک گئی۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور تیاری کرنے لگی۔ روشن آراء کے کسی کزن کی شادی تھی۔ وہ سب وہیں جا رہے تھے۔ میرے گھر والوں کا چہلم ابھی نہیں ہوا تھا۔ اصولاً مجھے ہر تقریب سے اجتناب کرنا چاہیے تھا۔ مگر مجبوری تھی اس لیے ان لوگوں کے ساتھ جانا پڑ رہا تھا۔ یہ تقریب شہر کے دوسرے کونے پر تھی۔ ایک کونے پر میر پور تھا تو دوسرے کونے پر آدم جی نگر۔ شادی، آدم جی نگر میں ہو رہی تھی۔ وہاں تک جانے کے لیے ہمیں دو بسیں بدلنی تھیں اس لیے صبح سے تیاری ہو رہی تھی۔

سامان وغیرہ کے ساتھ ہم لوگ سات بجے نکلے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے گلستان پہنچے۔ وہاں سے دوسری بس لینی تھی۔ وہاں بیٹھے ہم انتظار کر رہے تھے کہ یکا یک بھگدڑ سی مچ گئی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا وہ ادھر بھاگنے لگا۔ میں بھی دوڑ پڑی تھی۔ میرے ساتھ روشن آراء تھی مگر وہ راستے میں کہاں رہ گئی کچھ خبر نہیں۔ میں ''ہاٹ کھولا'' کی طرف دوڑ رہی تھی۔ گورنر ہاؤس پیچھے رہ گیا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میں ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ کب تک بے ہوش رہی خدا جانے، ہوش آیا تو بری طرح چونک گئی۔ میں سڑک کنارے پڑی تھی اور میرے قریب ایک عجیب شخص کھڑا تھا۔

اس کا حلیہ کچھ یوں تھا۔ جسم پر پھٹا پرانا لباس تھا جس پر جگہ جگہ پیوند کاری کی گئی تھی۔ گلے میں اس نے بڑے بڑے موتیوں والی مالا ڈال رکھی تھی۔ اپنی بغل میں اس نے ایک بڑا سا کشکول تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں میرے وجود پر گڑی ہوئی تھیں۔

''کیا سوچ رہی ہے، یہی کہ تُو یہاں کیوں پڑی تھی۔'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں تجھے لایا...... یہ دنیا خراب ہے۔ شیطان کا گھر ہے۔ اکیلی لڑکی کو دیکھ کر ہر ایک کے دل میں شیطان انگڑائی لینے لگتا ہے۔ اکیلی لڑکی...... ہاہاہا...... اکیلی لڑکی......''

اس کے ہنسنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرے اندر ایک عجیب سے احساس نے جنم لے لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی ہے۔ ہر منکے سے ٹکراتی، لہراتی لہر دماغ تک پہنچ کر مجھے خوفزدہ کر گئی تھی۔ میں خود میں سکڑ گئی۔

''ارے تُو کیسی لڑکی ہے۔ تُو نے اب تک یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے۔'' وہ وحشت ناک انداز میں قہقہہ لگا کر بولا۔

''آں! ہاں میں یہی تو پوچھنا چاہتی تھی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''جھوٹ...... تُو نے جھوٹ بولا...... اپنی عاقبت خراب کر لی...... ہاہاہا...... سن لڑکی یہ دنیا امتحان گاہ ہے ہر ایک کے ہاتھ میں خود اس کا سوال نامہ ہے۔ ہر سوال کمپلسری ہے، جواب ضرور دینا ہے...... مت بھول کہ یہ تیرے ہنستے ہوئے ہونٹ بھی تیرے اپنے نہیں ہیں۔ تیرا کچھ بھی اپنا

نہیں ہے۔'' وہ مسلسل بول رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔'' تیرے لیے امتحان گاہ نرالی ہے۔ تجھے بہت بڑی منزل ملنے والی ہے لیکن اِک آگ کا دریا ہے اور پار اترنا ہے...... بول پار کر لے گی؟ آگ سے ڈرے گی تو نہیں؟''

''بابا میں سمجھی نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

میری آواز میں التجا تھی۔ دراصل میں اس کی پُراسرار شخصیت سے مرعوب ہو گئی تھی۔ میں سمجھ کر بھی کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔'' بابا بتائیں ناں مجھے کیا کرنا ہے؟''

''میں کوئی عالم الغیب ہوں کہ آنے والے وقت کی نبض پکڑ لوں۔ نہیں میں تجھے کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ میری بساط سے باہر ہے۔ میں کسی کے راز سے پردہ نہیں اٹھا سکتا۔''

ابھی میں کچھ اور پوچھتی کہ کسی نے رعب دار آواز میں کہا۔'' اے تُو کون ہے؟...... اچھا ایک لڑکی بھی ہے۔ اے بڈھے یہ لڑکی کون ہے۔'' میں نے سر گھما کر دیکھا۔ بالکل ہمارے سر پر دو پولیس والے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چھڑی تھی۔ وہ دونوں گشتی پولیس کے سپاہی تھے۔

''اے بڈھے بتاتا کیوں نہیں ہے۔ یہ کون ہے؟'' دوسرے پولیس والے نے کہا۔

''تو خود پوچھ لے۔'' کمر جھکی کنٹھ مالا والے شخص نے جواب دیا۔

''اے بہروپیے سچ سچ بتا دے ورنہ تھانے لے جا کر وہ چھترول کروں گا کہ بس!'' ایک سپاہی بولا۔

''تُو کہتا ہے تو میں بتائے دیتا ہوں مگر پھر نہ کہنا یہ کیا ہوا۔'' اس عجیب حلیے والے نے گلے میں پڑی موٹے موٹے موتیوں کی مالا سے کھیلتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اسے ہٹا کر کچھ دور لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔

''جانتا ہے میں کیا کہنے والا ہوں۔ سن...... ایک ہفتے پہلے جابر خان کے ہاں جو ڈکیتی ہوئی ہے اس میں کس کا حصہ کتنا بنا ہے۔ وہ روپے کہاں کہاں پر اور کس کس برانچ میں جمع کرائے گئے ہیں اکاؤنٹ کا نمبر کیا ہے۔''

سپاہی جو میرے بالکل برابر میں کھڑا تھا اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ گویا اس کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ بڑے میاں کے ہونٹوں پر ہنسی تھی۔ وہ ہولے ہولے مسکرا رہا تھا۔'' کیوں بول ناں میں تیرے ساتھی کو سب بتا دوں۔''

''آ...... آپ کون ہیں......'' سپاہی ہکلایا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کوئی عجیب الخلقت مخلوق دیکھ لی ہو۔

''اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کبھی کسی سے پنگا نہ لو۔ کس بھیس میں کون چھپا ہے کسے خبر!''

''آں...... ہاں ہاں...... آپ...... آپ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔'' کہتا ہوا وہ پیروں پہ جھک گیا۔

''جا تجھے معاف کیا۔'' بابا نے بے نیازی سے کہا تو وہ سپاہی اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑے اس طرح سے بھاگا جیسے پٹا ہوا کتا دم دبا کر بھاگتا ہے۔ ان کے جانے کے بعد میں بھی کھڑی ہو گئی۔

''اے تم کہاں چلیں۔ اکیلی جاؤ گی؟ اوپر دیکھ کیسے گھنگھور بادل چھائے ہوئے ہیں۔ دیکھ دیکھ بجلی بھی کڑک رہی ہے۔ وہ تیرے پیچھے ہے اس سے بچ کر جانا ورنہ تباہ ہو جائے گی۔ ہر دم ورد کر مگر تُو کیسے کرے گی تیرے اندر تو ناپاکی ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے جا اپنے گناہوں کی معافی مانگ جا چلی جا۔'' کہتے ہوئے مڑ گیا۔

اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ شاید وہ برگد کی سوکھی ہوئی جٹا تھی یا پھر کسی خاص پیڑ کی شاخ۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے سانپ ہو، بل کھاتا ہوا دم کے سہارے کھڑا سانپ۔ وہ اس لاٹھی کو ٹیکتا ہوا بائیں ہاتھ سے گلے میں جھولتے کشکول کو سہارا دیتے بڑھتا چلا گیا۔ میری آنکھیں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں کہ وہ یکا یک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اس تھوڑے سے عرصے میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ سمجھ گئی تھی کہ میں ایک ایسے گرداب میں پھنس گئی ہوں جس سے نکلنا فی الحال مشکل ہے اور اس دوران میں میری یہ دو آنکھیں بہت کچھ دکھائیں گی۔ میں انہی سب باتوں پر غور کرتی ہوئی نورالنہار کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ چلتے چلتے اچانک ہی مجھے صبح والی بات یاد آ گئی کہ جب میں بیدار ہوئی تھی تو میرے کپڑے خون آلودہ تھے جنہیں میں نے جلدی جلدی اتار کر بستر کے نیچے چھپا دیا تھا اور دوسرا لباس پہن کر کمرے سے باہر آئی تھی۔ میں ڈر رہی تھی کہ میرے ہاتھوں پر لگا خون کسی کو نظر نہ آ جائے مگر حیرت انگیز طور پر کسی نے مجھے ٹوکا نہیں تھا۔ نلکے تک پہنچنے تک کوئی بھی ٹکرایا جو نہیں تھا۔ ان دنوں ہینڈ پمپ کا رواج تھا۔ میں نے جلدی جلدی ہینڈ پمپ دبایا تھا اور گرتے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھو لیا تھا۔ ہاتھ منہ دھوتے وقت ایک اور حیرت انگیز بات نظر آئی تھی کہ دھونے والا خون بہتے پانی کے ساتھ نظر نہیں آیا تھا۔ پانی ذرا سا بھی رنگین نہیں ہوا وہ سب کیا تھا؟ بابا کون تھا جو میری مدد کے لیے آیا تھا۔ کیوں اس نے یہ بات کہی تھی کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔ بجلی کڑکنے کی بات کیوں کی تھی۔ پھر غائب کیوں ہو گیا۔ میں اسی طرح خیالوں کے گرداب میں پھنسی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تک یہ بات بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ یکا یک بھگدڑ کیوں مچی تھی۔ لوگ کیوں دوڑ پڑے تھے۔ ایسا کیا ہو گیا تھا اگر گولیاں چلتیں، بم دھماکے ہوتے تو آواز سنائی دیتی۔

میں اپنے خیالوں میں اس طرح ڈوبی ہوئی تھی کہ مجھے وہ جیپ نظر نہیں آئی تھی جو سڑک کے درمیان آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ میں اس وقت چونکی تھی جب اس سے وہ باہر نکلا تھا۔ اس نے میرا راستہ روک لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دیسی ساخت کا پستول تھا جسے عرف عام میں ''کٹا'' کہا جاتا تھا۔ بندوق کی نال کو چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر ایک فائر کے لیے اسے بنایا جاتا تھا۔ وہ کٹا ہلا کر بولا۔ ''تم نے کیا سمجھا تھا مجھے بیوقوف بنا کر بھاگ نکلو گی۔ میں تمہیں پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں اپنے مقصد کے لیے حاصل کر کے رہوں گا۔''

میں نے نظریں اٹھا کر شنکر کا جائزہ لیا۔ اس کے پیچھے وہ تینوں بھی کھڑے ہوئے تھے جو اس کے ساتھ اس جھونپڑی میں تھے جہاں مجھے پابندِ سلاسل رکھا گیا تھا۔ جہاں میری زنجیر برف کی طرح پگھل کر بہہ گئی تھی۔ میں نے ایک نظر ان سب پر ڈالی پھر منہ بنا کر کہا۔ ''کیوں تُو بار بار میرے راستے میں آ رہا ہے۔ کیوں اپنی تباہی کو آواز دے رہا ہے۔ خبردار اپنی سوچ کو پاک کر لے ورنہ بری طرح نقصان اٹھائے گا۔''

اس نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا۔ ''تُو کیا سمجھتی ہے مجھ سے بچ جائے گی، تیرا باپ میرے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ بس اتفاقیہ اسے وہ شکتی مل گئی تھی جس کی ضرورت مجھے تھی۔ وہ شکتی پتا نہیں کیسے تیرے اندر منتقل ہو گئی ہے۔ تجھے وہ شکتی مجھے دینا ہو گی ورنہ میں تیری زندگی جہنم بنا دوں گا۔''

''اگر تُو یہ سمجھتا ہے کہ مجھ پر فتح پالے گا تو یہ تیری خام خیالی ہے۔ تُو میرے آگے عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔'' پتا نہیں یہ الفاظ کہاں سے میرے ذہن میں آ رہے تھے جنہیں میری زبان ادا کر رہی تھی۔ میں نے پھنکارتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی بھی وقت ہے چلا جا اپنی راہ اگر نہیں گیا تو جو شکتی تیرے پاس ہے وہ بھی تیرے کام نہیں آئے گی۔'' پھر میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھا دیئے۔

''اے، تُو ایسے نہیں مانے گی۔'' کہہ کر شنکر نے ہاتھ اٹھا کر کچھ پڑھا اور اس کی مٹھی میں کچھ تھا جسے اس نے میرے چہرے پر پھینکا تھا اور میں چکرا گئی تھی۔

آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے کرتے بھی زمین پر گر گئی تھی۔

''اسے اٹھا کر جیپ میں ڈالو!'' ڈوبتے ذہن کے ساتھ میں نے شنکر کی آواز سنی پھر احساس ہوا جیسے مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا جا رہا ہے۔ اٹھانے والوں نے چاول کی بوری کی طرح میرے جسم کو جیپ میں پھینکا تھا۔ پتا نہیں میں بے ہوش تھی یا میرا ذہن شنکر کے منتر کا شکار تھا کہ میرا احساس تو زندہ تھا مگر جسم بے خبر تھا۔ میں سب کچھ دیکھ رہی تھی پھر بھی کچھ کرنے کا چارہ نہ تھا۔ مجھے جیپ میں ڈال کر وہ لوگ چلے۔ پتا نہیں کس کس راستے سے ہوتے ہوئے وہ لوگ لال باغ تھانہ پہنچے۔ بورڈ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ چکی ہوں۔ شنکر نے شاید پہلے ہی معاملہ طے کر رکھا تھا۔ کیونکہ اس کے نیچے اترتے ہی پولیس والوں نے جیپ کو گھیر لیا تھا۔

''ہاں یہی ہے وہ۔'' کسی کی آواز سنائی دی پھر کئی لوگوں نے اندر جھانک کر دیکھا۔

''اب تم لوگ منہ کیا دیکھ رہے ہو اسے اٹھا کر حوالات میں پہنچاؤ۔'' کسی نے کڑک دار آواز میں کہا۔

ایک ساتھ کئی پولیس والیاں جیپ میں چڑھ آئیں پھر ان لوگوں نے مجھے کھینچ کھانچ کر نیچے اتارا اور تقریباً گھسیٹتی ہوئی حوالات تک لے گئیں۔ اب تک میری حالت میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ میں اسی عالم میں تھی کہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

''اسے ہوش میں لاؤ، بیان لکھنا ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔ مجھے لانے والیوں میں سے ایک نے میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں نے میرے حواس لوٹا دیئے۔

''اے تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں!'' اسی آفیسر نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم نے بی بی ارشدی بھوئیاں کا خون کیوں کیا؟ کیا کوئی پرانی دشمنی تھی؟''

میں سمجھ نہیں پائی کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ میں تو کسی بی بی ارشدی نام کو پہچانتی بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس کے چہرے کو تکتی رہ گئی۔

''بولتی کیوں نہیں ہو؟'' اس نے اس بار سخت لہجے میں کہا۔

''میں کسی بی بی ارشدی نامی عورت کو نہیں جانتی۔'' بالآخر میری زبان سے ہوش میں آنے کے بعد پہلا بڑا جملہ ادا ہوا۔

''تمہیں چار آدمیوں نے اس کے گھر میں گھستے پھر خون آلودہ چھری کے ساتھ باہر آتے دیکھا ہے۔ ہم آبھاری (شکر گزار) ہیں شنکر کے

کہ اس نے تمہیں دیکھ کر ہمیں خبر دے دی اور ہمارے آدمیوں کے ساتھ جا کر اس نے تمہیں گرفتار بھی کروایا۔''

''یقین کریں میں کسی ارشدی نامی عورت کو نہیں جانتی۔''

''تم شاید یہ سمجھ رہی ہو کہ عورت ہونے کی وجہ سے پولیس کے تشدد سے بچ جاؤ گی۔'' پھر اس نے لیڈیز کانسٹیبل سے کہا۔ اے رضیہ ذرا اس کی زبان کھلوانا تو...... مجھے بھی دیکھنا ہے کہ یہ کب تک سچ نہیں بولتی ہے۔''

رضیہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں پولیس والوں کی مخصوص چھڑی تھی، بینت کی لچکیلی چھڑی، نزدیک پہنچ کر اس نے اوباش مردوں کی طرح میری ٹھوڑی کو دو انگلیوں سے اٹھایا پھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''ارے پارسا بی بی سیدھی طرح سے سچ اگل دو کیوں اپنی اس گوری چمڑی سے دشمنی کر رہی ہو۔ اتنے بینت ماروں گی کہ تمہاری یہ سرخ و سفید چمڑی نیلی پڑ جائے گی۔''

پتا نہیں کیسے میں نے اتنا سخت جملہ کہہ دیا۔ وہ آواز بھی مجھے اپنی نہیں لگی تھی۔ میں نے کھرکھراتی آواز میں کہا تھا۔ ''جا جا بہت دیکھی ہیں تجھ جیسے دو دو ٹکے میں اپنا ایمان بیچنے والیاں۔ اگر میرے جسم سے ایک بینت بھی ٹکرایا تو سمجھ لے تیری سات پشت تیرے حال پر نوحہ کناں رہے گی۔''

''تو یہ لے!'' کہہ کر اس نے بینت کو ہوا میں لہرایا۔ شاپ کی تیز آواز گونجی۔ چیخنا مجھے چاہیے تھا مگر چیخ کی وجہ کیا ہے یہ دیکھنے کے لیے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو حیرت سے میں خود بھی اچھل پڑی۔ میں رضیہ سے کئی فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی مگر میرا جسم غائب تھا۔ میں غیر مرئی حالت میں کھڑی تھی۔ رضیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں میں کچھ دیر پہلے کھڑی تھی۔ پولیس آفیسر، وہاں موجود تمام سپاہی سب کے سب حیران تھے، سب کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثر تھے۔ چہرے سفید پڑ گئے تھے۔ آنکھوں سے خوف جھانک رہا تھا۔ تبھی مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے ایک سپاہی کی ٹوپی اتار کر اس کے گنجے سر پر زوردار چپت لگا دی۔ وہ وحشت سے پاگل ہو گیا اور چیختا ہوا اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگا۔

''اے کیا ہو گیا ہے تجھے۔'' ایک سپاہی نے اس سے پوچھا۔

''بھ...... بھوت...... بھوت۔'' اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''اس نے مجھے چپت ماری ہے۔''

''وہم ہوا ہوگا۔'' اسی سپاہی نے کہا۔

اس کا وہم دور کرنا ضروری تھا اسی لیے میں نے اس کی گدی پر زوردار چپت لگا دی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اب میرا یہاں رکنا فضول ہے یہ سوچ کر میں آگے بڑھی اور زوردار قہقہہ لگایا۔ قہقہے نے انہیں مزید خوفزدہ کر دیا۔ حوالات کی سلاخیں میرے لیے بے معنی تھیں۔ میرا جسم کثافت سے پاک ہو چکا تھا یعنی...... میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میں سلاخوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ جلد سے جلد اس جگہ سے دور ہو جاؤں اس خیال کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں میرا جسم پھر سے کثیف شکل اختیار نہ کر لے۔ میرا خوف بے وجہ نہیں تھا۔ تھانے سے نکلتے وقت میں نے دیکھ لیا تھا کہ پورے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہلچل مچ گئی ہے۔ بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ مگر میں تو کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے بلا خوف چلتی ہوئی باہر آ گئی تھی اور اس وقت میں ''وائرلیس'' کے اسٹاپ پہ کھڑی تھی۔ ایک راستہ ''کمریل'' کی طرف جاتا تھا اور دوسرا موتی جھیل سے آ کر پاک موڑ کی طرف۔ اب کسی بھی طرف سے بس آتی تو میں اس میں سوار ہو جاتی۔ جس کے ذریعہ میں کسی بھی طرف نکل سکتی تھی۔ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے میرا ٹھوس جسم واپس آ

گیا ہے۔ اب مجھے بس میں سوار ہونے میں وقت نہ ہوتی یہ سوچ کر میں خوش ہو رہی تھی کہ مجھے دور سے دوڑتے ہوئے پولیس والے نظر آئے۔ وہ سب میری طرف چلے آرہے تھے۔ شاید انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں بھی انہیں دیکھ کر ڈر گئی تھی اور میں نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ میں بغیر سوچے سمجھے دوڑ رہی تھی سامنے ہی مگ بازار کی بستی تھی۔ اصفہانی کالونی کی بلڈنگوں کی جھلک دکھائی دینے لگی تھی۔ بلال آباد کالونی کی طرف میرا رخ تھا۔ میں تیز رفتاری سے ادھر ہی بھاگ رہی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سب پیچھا کر رہے تھے۔ میں بھاگ کر سامنے والے بنگلے میں گھس گئی۔ اتفاق سے کسی سے بھی میرا ٹکراؤ نہیں ہوا اور میں ایک کمرے میں گھس گئی۔ سامنے ہی ایک بڑا سا چھپر کھٹ بچھا تھا۔

اب تو چھپر کھٹ خواب ہو گیا ہے اس کی جگہ انگلش بیڈ نے لے لی ہے۔ چھپر کھٹ اور بیڈ میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا صرف نقاشی کا اور ڈیزائن کا فرق ہوتا تھا۔ پائے زیادہ اونچے ہوتے۔ اتنے اونچے کہ نیچے ایک آدمی آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ سرہانے اور پائنتی کی طرف نقاشی والے تختے ہوتے تھے جن پر آئینے لگے ہوتے۔ میں چھپر کھٹ کے نیچے گھس کر بیٹھ گئی۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجھے احساس ہوا کہ میرا ٹھوس جسم پھر سے غائب ہو گیا ہے اور میں ایک بار پھر سے نادیدہ بن گئی ہوں۔ تبھی دروازہ کھلا اور کئی پولیس والے دندناتے ہوئے گھس آئے۔ اس وقت سپاہیوں کو بندوقیں نہیں ملتی تھیں اس لیے سب کے ہاتھوں میں لمبے لمبے ڈنڈے تھے۔ ان سب کے پیچھے ایک آفیسر بھی گھس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''کہاں گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''سر! ابھی یہیں تھی۔ ہم نے خود اسے اس کمرے میں گھستے دیکھا تھا۔'' ایک سپاہی بولا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو اسے ڈھونڈو۔''

سپاہیوں نے ایک ایک جگہ دیکھ لی نیچے بھی دیکھا مگر میں انہیں نظر نہ آئی۔ اتنے میں ایک بوڑھی عورت پریشانی کے عالم میں اندر آئی اور چیخ کر بولی۔ ''یہ تم لوگوں نے کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ بغیر اجازت میرے گھر میں گھس آئے۔ تم جانتے نہیں ہو یہ گھر کس کا ہے۔ میرا بیٹا اسلام آباد میں ایک بہت بڑے عہدے پر ہے۔ میرے شوہر بھی ریٹائرڈ سول سرونٹ ہیں۔ میں تم لوگوں کو چھوڑوں گی نہیں۔ ایک ایک کو دیکھ لوں گی۔''

''اماں جی! یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو یہ دیکھیں کہ ہم کس مجبوری میں پھنسے ہیں۔ ایک ایسی لڑکی جس نے کئی خون کیے ہیں یہاں آ کر چھپ گئی ہے۔ وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' ایک سپاہی نے بڑی بی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ میرے پاس بندوق بھی ہے اور پستول بھی میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں۔ اگر وہ اس گھر میں کہیں چھپی ہوئی ہے تو بھی وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ اگر اس نے کوئی بدمعاشی کی تو میں اسے شوٹ کر دوں گی۔ اب تم لوگ یہاں سے نکلو ورنہ بہت برا ہوگا۔'' بڑی بی نے بگڑے تیور سے کہا۔ بڑی بی کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی سے ڈرنے والی نہیں ہیں۔ ان کی جھڑکیوں نے بالآخر ان لوگوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

پولیس کے جاتے ہی میں نے اطمینان کی سانس لی اور اسی بیڈ پر اطمینان سے لیٹ گئی۔ بڑی بی نے باہر سے اس کمرے کی زنجیر چڑھا دی تھی۔

ان دنوں آٹو میٹک ڈور عام نہ تھا۔ اس لیے دروازوں میں زنجیر اور کنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔

بڑی بی مطمئن ہو کر لوٹ گئی تھیں اور میں نے بھی اطمینان سے سونے کے لیے پیر پھیلا لیے تھے۔ ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی تھکن نے

بے حال کر رکھا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو نیند نے خود ہی ڈیرا ڈال لیا۔ میں بے خبر سو رہی تھی کہ میرے جسم کو ویسا ہی جھٹکا لگا جیسا میں نے پہلے بھی کئی بار محسوس کیا تھا۔

ہر بار اس قسم کے جھٹکے کے بعد یا تو میرا جسم نادیدہ بن جاتا تھا یا پھر دوبارہ ٹھوس۔ میں سمجھ گئی کہ میرا جسم ٹھوس بن چکا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں، کھلی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ میں تو بستر پر لیٹی ہوئی تھی مگر میرا جسم کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ ایسا کیسے ہوا میں یہی سوچ رہی تھی کہ میرے جسم نے کھڑکی پر پہنچ کر سلاخیں تھام لیں پھر مڑ کر میری طرف دیکھا اور زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ آواز بھی میری نہیں تھی۔ پھر اس نے کھڑکی کی سلاخوں پر ہاتھ رکھا تو پورا چوکھٹا اکھڑ کر سامنے آ گیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا کہ میں بھی بستر سے اتر کر اس کے تعاقب میں کھڑکی پار کر گئی۔ اب آگے آگے میرا جسم تھا اور پیچھے پیچھے میں۔ بس فرق اتنا تھا کہ وہ زمین پر قدم بہ قدم چل رہا تھا اور میں ہوا میں تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میرا جسم گھ بازار چورنگی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

بازار پار کرنے کے بعد وہ ریلوے لائن کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت تک تمام ریل گاڑیاں ''پھول بڑیا'' اسٹیشن پر آتی تھیں۔ کملاپور جنکشن تعمیر ہو رہا تھا۔ اس اسٹیشن کی تعمیر صدر پاکستان محمد ایوب خان کے حکم پر ہو رہی تھی۔ کھلتا ہوا کنول کا پھول جیسی عمارت بن رہی تھی۔ اسٹیشن کے چاروں طرف پلیٹ فارم بنائے جا رہے تھے۔ جو یقیناً خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہوتے۔ گورنر منعم خان نے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف ایوب خان کی حمایت کے لیے شرط یہ رکھی تھی کہ ڈھاکا کی از سرِ نو تعمیر ہو۔ کملاپور اسٹیشن اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ دوسری کڑی محمد پور کے سامنے سکنڈ کیپیٹل عرف ایوب نگر کی تعمیر تھی جس کی پوری ڈیزائننگ جاپانی آرکیٹیکچر نے کی تھی نہایت خوبصورت گول گول قلعہ کی طرح بنائی گئی عمارت ایوب نگر اور کملاپور ابھی تعمیر کے مراحل میں تھے۔ یہ ریلوے لائن بھی ابھی زیرِ استعمال نہ تھی اس لیے ریلوے پھاٹک بنا نہیں تھا۔ ہم دونوں پھاٹک کراس کر کے دوسری طرف پہنچے۔ وہ کروان بازار کا پچھلا حصہ تھا۔ اسی طرف FDC کی عمارت تھی اس فلم اسٹیڈیو میں فلمیں تیار ہوتی تھیں۔ آس پاس کئی فلم اسٹار کے بنگلے بھی تھے انہی بنگلوں میں سے ایک میں وہ داخل ہو گیا۔

میں ابھی تک حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی تھی مگر ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ میں اس کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھوں گی تاکہ اس راز کی تہ تک پہنچ سکوں۔ اب وہ ایک بنگلا نما مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس مکان کے گرد چار دیواری تھی۔ چار دیواری تقریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ میرا جسم اس طرح اچھل کر دیوار پر پہنچ گیا جیسے اس میں اسپرنگ لگے ہوں یا پھر بلندیاں اور فاصلے اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ بہر حال مجھے حیرت تھی کہ میرا اناتجربے کار جسم اچانک اتنا پھرتیلا کیسے بن گیا تھا۔

دیوار کی دوسری جانب بھی وہ اسی آسانی سے اتر گیا پھر وہ ایک مکان کی جانب بڑھا۔ میں بھی جو لطیف شکل میں اڑ رہی تھی اس کے تعاقب میں لگی رہی۔ وہ مکان کے برآمدے پر چڑھا پھر اندر داخل ہو گیا۔ وہ مکان اندر سے کافی کشادہ تھا اور اس میں بہت سے کمرے بنے ہوئے تھے۔ میرا جسم کمروں کی قطار سے گزر کر ایک بند دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اس نے نہایت آہستگی سے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا

گیا اور میرا جسم اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سرسری طور سے جائزہ لیا۔ اس کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا اور بستر پر ایک نوجوان دوشیزہ محوِ خواب تھی۔ تکیے پر اس کے گھنے لمبے بال پھیلے ہوئے تھے۔ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی کیونکہ اس کے ہونٹوں پر بہت پیاری سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لڑکی کی عمر سولہ سترہ سے زیادہ نہ ہو گی۔ اس کا سڈول بدن بے ترتیبی سے بستر پر پھیلا ہوا تھا۔ میرا جسم للچائی نظروں سے اس معصوم دوشیزہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھوں کے راستے اسے نگل جائے گا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا پھر اتنی احتیاط سے بستر پر بیٹھا کہ سونے والی کو ذرا سا بھی احساس نہ ہوا۔ اس کی للچائی آنکھیں ہنوز اس لڑکی کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس پر جھکا۔ لڑکی نے چادر اوڑھ رکھی تھی جو اس کی بلوری گردن تک تنی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دھیرے دھیرے اس کی چادر کو نیچے کیا۔ ارمانوں بھرا سینہ اس کے سانسوں کے زیر و بم کا احساس کرا رہا تھا۔ میرے کمینے جسم نے بائیں ہاتھ کو بڑھایا اور اپنی ہتھیلی کو اس کے منہ کا ڈھکن بنا دیا، اگر وہ چیخنا بھی چاہتی تو چیخ نہ پاتی۔ آواز خارج ہی نہ ہو پاتی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے گھٹنے کو اس کے سینے پر رکھ کر اسے بے بس کر دیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں کیونکہ اب اس کے داہنے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ عجیب سا لہردار خنجر جس کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ میرے جسم نے خنجر والے ہاتھ کو بلند کیا اور پوری قوت سے اس کے نرخرے پر وار کیا۔ خنجر اندر تک دھنسا جسے اس نے پھرتی سے کھینچ لیا۔ کٹے ہوئے حلقوم سے خون کا فوارہ چلا، جس ہاتھ میں خنجر تھا اب اس ہاتھ میں ایک کشکول نما پیالہ نظر آ رہا تھا جو اوپر سے کافی کھلا ہوا تھا۔ میرے جسم کے ہاتھ نے پیالے کو اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ نرخرے سے خرخر کی آواز کے ساتھ ابلنے والا خون اس پیالے میں جمع ہو رہا تھا۔ لڑکی کا جسم اذیت کی وجہ سے بار بار جھٹکے لے رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا مگر میرے جسم نے اسے پوری قوت سے گھٹنوں تلے دبا رکھا تھا جس کی وجہ سے لڑکی آزاد نہیں ہو پا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے لڑکی کے جسم کو اپنی جکڑ سے آزاد کر دیا لیکن لڑکی ساکت رہی ذرا سی بھی جنبش دکھائی نہ دی۔ کشکول نما برتن بھی خون سے لبالب بھر چکا تھا۔ میرے جسم کا تمام لباس خون آلود ہو گیا تھا اور ہاتھ پاؤں بھی خون میں لت پت ہو چکے تھے۔ اب مجھے اپنے لباس کے خون میں لتھڑ جانے کا راز معلوم ہو چکا تھا۔ یہ راز کم خطرناک نہیں تھا۔ حیرت انگیز بھی تھا۔

میرا جسم اپنے دونوں ہاتھوں میں خون سے بھرا پیالہ اٹھائے باہر کی جانب بڑھا پھر اس نے اسی طرح اچھل کر دیوار پار کی اور سڑک پر آ گیا۔ اس کی رفتار بہت زیادہ تیز تھی۔ وہ اڑنے کی حد تک تیز چل رہا تھا یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ وہ آہستہ آہستہ زمین سے بلند ہو رہا تھا۔ میں تو حقیقتاً لطیف حالت میں تھی، روح کی شکل میں اس لیے میں بھی آہستہ آہستہ زمین سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اُڑتا ہوا تیج گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اس وقت تک تیج گاؤں کی آبادی نام بھر تھی۔ اکا دکا مکانات تھے پھر ائیر پورٹ تھا یا پھر اہل تشیع کا قبرستان اور ڈرم فیکٹری۔ گویا دور دور تک ویرانہ تھا۔ پھر کافی آگے جانے کے بعد کورمی ٹولہ شروع ہوتا تھا۔ کورمی ٹولہ میں کینٹونمنٹ تھا اس لیے وہاں آبادی تھی مگر فوجیوں کی۔ فوجی بیرکس کے بعد پھر ویرانہ شروع ہو جاتا تھا جس کا اختتام ٹونگی انڈسٹریل ایریا میں ہوتا تھا۔ بنسکو سکٹ، سکندر نیپل، چندا بیٹری، رمنا سگریٹ کے علاوہ دو تین ہی بڑے کارخانے تھے۔ میرا جسم ہوا میں پرواز کرتا ہوا ائیر پورٹ پر پہنچا پھر وہاں سے کورمی ٹولہ کی طرف مڑ گیا۔

میں یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ ٹونگی کی طرف جائے گا مگر وہ کورمی ٹولہ سے ''کچو کھیت'' کی طرف مڑ گیا۔ ادھر بھی ویرانہ تھا مگر کچھ آبادی بھی تھی۔

اس آبادی کا اختتام میر پور گیارہ نمبر سیکشن پر ہوتا تھا۔ یعنی بنگالیوں کا ایریا ختم ہو جاتا تھا پھر اردو بولنے والوں کا علاقہ آ جاتا تھا۔ میرا جسم پرواز کرتا ہوا میر پور کے علاقے میں داخل ہوا پھر وہاں سے ایک نمبر سیکشن کی طرف مڑ گیا۔ اسے ادھر پرواز کرتے دیکھ میں سمجھ گئی کہ یہ میرے گھر کی طرف جا رہا ہے۔

اس گھر کی طرف جو ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں کھنڈر بن چکا ہے۔ فساد بھارت میں ہوئے تھے اور اس کے شعلے یہاں تک پہنچ گئے تھے جس نے میرے خاندان کو برباد کر دیا تھا۔ میرے سر سے سایہ چھین لیا۔ میں بے آسرا ہو گئی اور اب ایک غیر خاندان میں رہ رہی تھی۔

میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا اور وہ دو نمبر سیکشن کے پلاٹ ایریا سے ہوتا ہوا ایک نمبر سیکشن کی طرف مڑ گیا پھر وہاں سے مزار کی طرف۔ شاہ علی بغدادی کا مزار مقدس شان سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ مگر میرا جسم ادھر نہیں گیا بلکہ وہ میرے گھر کے کھنڈر پر رک گیا۔ وہاں پہنچتے ہی ایک عجیب منظر نظر آیا۔ میرے گھر میں جہاں پر وہ کمرا تھا جس میں کٹورا اور سانپ نظر آیا تھا وہ جگہ کسی کنواں کی طرح کھل گئی تھی۔ میرا جسم خون سے بھرا پیالہ لیے اس کنواں میں اترتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں خود بھی اترتی چلی گئی۔ کافی گہرائی میں اترنے کے بعد وہ کنواں کافی کشادہ ہو گیا تھا۔

اندر ہلکی ہلکی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔ بغور روشنی کے مخرج کو دیکھا تو پتا چلا کہ دیواروں میں جگہ جگہ قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں اور یہ روشنی انہی پتھروں سے پھوٹ رہی ہے۔ نیچے اترتے ہی وہ کنواں ایک تنگ راستے میں بدل گیا۔ وہ راستہ زمین کے اندر ہی اندر آگے بڑھ رہا تھا۔ میرا جسم مجھ سے دس قدم آگے اپنے پیروں سے چلتا ہوا ایک کمرے میں پہنچا۔ وہ کمرا مستطیل تھا۔ اس تکونے کمرے میں پہنچتے ہی میرے جسم کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ وہ ردھم میں کچھ بول رہا تھا یا پڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی آواز تھمی کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا۔ اس روشنی میں جو کچھ نظر آیا وہ حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ سامنے ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر ایک انسانی ڈھانچہ پڑا تھا۔ کھال سوکھ کر ہڈیوں سے چپک گئی تھی۔ آنکھیں بھی بند تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سالخوردہ لاش عرصے سے وہاں پڑی ہو، وہ لاش بے لباس تھی۔ اس کا منہ ہولناک اور تاریک غار کی مانند کھلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور بوسیدہ بدن سے تعفن پھوٹ رہا تھا۔ چہرے کے نقوش بالکل مسخ ہو چکے تھے۔

میں حیرت اور خوف میں ڈوبی ہوئی اس بدشکل لاش کو گھور رہی تھی اور میرا جسم خون سے بھرا پیالہ اٹھائے اس لاش کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ پڑھتا بھی جا رہا تھا۔

زندگی کا ہر باب اپنے اندر نہ جانے کیسی کیسی کہانیاں چھپائے ہوئے ہے یہ بھی ایک عجیب کہانی تھی جو میری نظروں کے سامنے رُونما ہو رہی تھی۔ میری ہی نظروں کے سامنے میرا جسم مجھ سے الگ ہو کر خون بھرا پیالہ لے کر اس سالخوردہ لاش کے سامنے کھڑا کچھ پڑھ رہا تھا پھر اس نے اس چھوارہ لاش کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے سے بلا کا جوش اور عزم ہویدا تھا۔

لاش کے گرد پہلا چکر مکمل کرنے کے بعد میرے جسم نے اپنی انگلیاں خون میں ڈبوئیں اور عجیب سے الفاظ ادا کرتے ہوئے لاش کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ اس نے لاش کے گرد باون چکر لگائے تھے۔ چکر مکمل کرنے کے بعد وہ پتھر کے چبوترے پر چڑھ گیا پھر اس نے خون سے بھرا ہوا برتن بلند کیا اور لاش کے سر پر الٹ دیا۔ اسی لمحے لاش کے قریب ایک شعلہ سا لپکا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا بدہیئت لاش کی جگہ اس چبوترے پر ایک تندرست و توانا نوجوان بیٹھا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا مگر وہ لاش پہلے جیسی ہی نظر آئی۔ وہ منظر ایک لمحے کے لیے ہی نظر آیا تھا یا پھر میری بینائی کا فتور

تھا۔ اب کیفیت یہ تھی کہ وہ لاش سرتاپا خون میں نہائی ہوئی تھی۔ مرے ہوئے چوہے جیسا اس کا اکڑا ہوا جسم اب اور زیادہ خوفناک نظر آ رہا تھا۔

میرا جسم اپنا کام ختم کر کے چبوترے سے نیچے اتر آیا پھر اس نے لاش کے پیروں کے پاس رکھے انسانی ہاتھ کی ہڈی کو اٹھایا اور اسے دور سے ہی لاش کے گرد گھمانے لگا۔ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے اس لاش نے آنکھیں کھول دی ہوں مگر یہ وقفہ چند لمحوں پر محیط رہا۔ تبھی میرے جسم نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور چلتا ہوا میرے قریب آ رکا پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تجھے ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟''

اس غیر متوقع صورتِ حال پر میں گھبرا اٹھی میں یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے میری موجودگی کا احساس نہیں ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر میرے جسم نے کہا۔ ''ڈرو نہیں۔ یہاں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔'' اس وقت اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''تم......تم میرے جسم......میرے جسم ہو......پھر تم مجھ سے کیسے سوال کر رہے ہو؟'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

''ہاں میں تمہارا جسم ہوں مگر اس وقت تمہارے قبضے میں نہیں ہوں۔ تمہاری روح سے الگ ہو گیا ہوں۔ یہ کیسے ہوا اسے سمجھنے کے لیے تمہیں کسی وِدوان پنڈت، عالم و فاضل جید مولانا سے رجوع کرنا ہوگا جو تمہیں روح اور جسم کی حقیقت بتائے گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس وقت تمہارا جسم دیکھنے میں تمہارا ہے مگر تمہارا نہیں ہے۔''

میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ میں تعجب کے گرداب میں غوطہ زن تھی۔ یہ دیدہ بینا جو نہ دکھائے کم ہے دکھانے پر آئے تو پھانس بھی دکھا دے اور نہ دکھانا چاہے تو شہتیر بھی اوجھل رہے۔ میں نے بھلا یہ کب سوچا تھا کہ ایسا عجیب و غریب تماشا دیکھوں گی۔ اپنے ہی جسم کو اس حالت میں دیکھوں گی کہ ایک ہاتھ میں کٹار اور دوسرے میں خون سے لبالب بھرا پیالہ ہوگا۔

ایک نوجوان لڑکی کا قتل ہو چکا ہوگا اور یہ قتل بھی میرا جسم کرے گا۔

میرا جسم اس لڑکی کے خون کو جمع کر کے اس سوختہ لاش پر انڈیل چکا تھا اور اب پھر وہ میری طرف متوجہ تھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہاں میں تمہارا جسم ہوں مگر تمہارے قبضے میں نہیں ہوں۔

''مگر......مگر......تم تو میرا جسم ہو پھر تم مجھ سے ایسے عجیب سوال کیوں اور کیسے کر رہے ہو؟''

''ہاں میں تمہارا ہی جسم ہوں، لیکن اس وقت تمہارے قبضہ قدرت میں نہیں ہوں کیونکہ تم جو دیکھ رہی ہو وہ حقیقت نہیں ہے کچھ اور ہے۔ اب یہ جسم تمہارا ہو کر بھی تمہارا نہیں ہے۔ میں نے تمہارے جسم کو تمہاری روح سے الگ کر دیا ہے اور اس جسم میں اپنی روح داخل کر دی ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس کیوں کا جواب بھی مل جائے گا۔ اور یہ بھی سمجھ لو کہ میں تمہارا برا نہیں چاہتا۔'' پہلے اس کا لب و لہجہ مردانہ تھا اب آواز بھی مردانہ ہو گئی تھی۔

''کیا......کیا......مطلب......اب تم نے مجھے مونث کی جگہ مذکر بنا دیا ہے؟''

''میں جو کچھ ہوں اسی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ گلاس میں دودھ ڈالا جائے گا تو دودھ برآمد ہوگا۔ شہد ڈالا جائے گا تو شہد اور اگر زہر

ڈالا گیا تو زہر نکلے گا، مطلب یہ کہ اس میں اہمیت گلاس کی نہیں ہوتی بلکہ چیز کی ہوتی ہے جو گلاس کے اندر ہے۔ بس تمہارا جسم ایک گلاس ہے اور اس میں اس وقت میں داخل ہوں۔ اس لیے اہمیت میری ہے جسم کی نہیں۔‘‘

میرا جسم گفتگو کر رہا تھا اور مجھے حیرانی کے سمندر میں پے در پے غوطے دے رہا تھا۔ میں نے سوختہ لاش کی جانب اشارہ کر کے پوچھا۔ ’’یہ لاش کس کی ہے؟‘‘

’’یہ لاش نہیں ہے۔‘‘ میرے جسم نے کہا۔

’’پھر کیا ہے؟‘‘ میں نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

’’ایک زندہ جسم!‘‘ میرے جسم نے مردانی آواز میں جواب دیا۔ ’’جیتا جاگتا جسم!‘‘

مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ میں حیرت بھری نگاہوں سے اس سوختہ لاش کو دیکھنے لگی جس کی کھال تک سوکھ کر ہڈیوں سے جا لگی تھی۔ میں نے دوبارہ اپنے جسم کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا پھر کہا یہ سوکھا سمٹا اور بوسیدہ جسم زندہ کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘

’’ہاں یہ بوسیدہ جسم زندہ ہے بھلے ہی سانس نہ لے رہا ہو پھر بھی یہ زندہ ہے کیونکہ یہ میرا جسم ہے میرا!‘‘

’’تمہارا جسم؟‘‘ میرے لہجے میں پھر حیرت در آئی۔ ’’مگر تم تو میرے جسم ہو۔‘‘

’’میرے جسم کی روح اس وقت تمہارے جسم میں ہے۔‘‘

’’یہ کیسے ممکن ہے؟‘‘

’’ہر چیز ممکن ہے لڑکی!‘‘ میرے جسم نے جواب دیا۔ ’’بس عظیم قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے پاس قوت ہے۔ میں ناممکن کو ممکن بنانے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ میرا تعاقب کرتے وقت تم شاید یہ سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہاری موجودگی سے باخبر نہیں ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک روح کی حیثیت سے تم عام لوگوں کی نظروں میں نہیں آسکتیں لیکن میری نظروں سے تم چھپ نہ سکیں مجھے شروع ہی سے معلوم تھا کہ تم میرے پیچھے ہو۔ میں نے خود تمہیں موقع فراہم کیا کہ تم یہاں تک آسکو۔ کیونکہ تمہیں یہاں لانا بہت ضروری تھا۔ اب اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہیں یہیں رہنا ہے اسی جگہ۔‘‘

میرے جسم کی آواز میں تحکم کا عنصر کچھ زیادہ ہی تھا۔

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یکا یک اس میں ایسی کیا تبدیلی آگئی کہ وہ مجھے حکم دے رہا ہے۔ انسان جب دبتا ہے تبھی لوگ اسے دباتے ہیں اور انسان تبھی دبتا ہے جب اس کی کوئی خاص کمزوری ہو۔ میری ایسی کون سی کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے میں نے کہا۔

’’نہیں میں اس طلسماتی دنیا میں نہیں رہ سکتی۔ ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔‘‘

’’تمہیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔‘‘ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ’’تم یہ بھول رہی ہو کہ تم پر کنواری لڑکیوں کے خون کا الزام ہے۔ پولیس تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے اگر یہاں سے نکلیں تو پھانسی کے پھندے میں جھولتی نظر آؤ گی۔‘‘

’’تو گویا تم مجھے زبردستی روکنا چاہتے ہو؟‘‘

''بالکل۔''

''مگر میں نے نہ تو خون کیا ہے اور نہ کوئی اور جرم۔ میں تو خود حالات کی ستائی ہوئی ہوں۔''

''تمہاری یہ بات قانون نہیں مانے گا اور نہ جن کی لڑکیاں قتل ہوتی ہیں وہ لوگ۔''

''یہ سب تمہاری کارستانی ہے تم نے میرے جسم پر زبردستی قبضہ کیا ہے اور اب اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہو۔''

''میں نے کہا ناں تمہاری کہانی پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا ویسے بھی تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تکلیف کا سامان تمہیں تب ہوگا جب تم یہاں سے نکلوگی۔ تمہیں کوئی پہچانے یا نہ پہچانے مگر شنکر تمہیں ضرور پہچان لے گا اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم یہیں رہو کیونکہ ابھی مجھے تم سے اور بھی کام لینے ہیں۔''

''میرا جسم تو لے ہی چکے ہو اب اور کیا لوگے؟''

''یہ جسم تو صرف گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ہی لے سکتا ہوں۔ تم سے جو کام لینا ہے وہ تو ابھی میں نے لیا ہی نہیں ہے۔'' وہ مکروہ ہنسی ہنس کر بولا۔''اگر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ مگر مجھے یقین ہے تمہیں یہاں آنا ہی پڑے گا۔''

''ہاں میں جانا چاہتی ہوں بس اتنی مہربانی کرو میرا جسم مجھے واپس کر دو۔''

''فکر نہ کرو وہ بھی تمہیں واپس کر دوں گا کیونکہ میں تمہیں ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اتنی پیاری ہو تم کہ میں تمہیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

''جس کا تم نے خون کیا ہے ان میں سے بھی بہت سی لڑکیاں مجھ سے زیادہ پیاری ہوں گی نازک اندام ہوں گی۔ پھر بھی تم نے ان کا خون کر دیا۔''

''کسی بھی جاندار کی جان لینا پاپ ہے تمہارے مذہب میں بھی اور میرے دھرم میں بھی۔ پھر بھی تم لوگ جانور ذبح کر کے کھاتے ہو ہم بھی شکار کر کے کھاتے ہیں کیونکہ گوشت کھانے سے گوشت بڑھتا ہے۔ خود کو زندہ رکھنے کے لیے دوسرے کی جان لینا پڑتی ہے ہر طاقتور کمزور کا شکار کرتا ہے بڑی مچھلی چھوٹی کو نہ کھائے تو وہ زندہ رہ ہی نہیں سکتی مجھے بھی زندہ ہونے کی ضرورت ہے اس لیے میں لڑکیوں کا شکار کر رہا ہوں کنواری لڑکیوں کا تاکہ مجھے تازہ تازہ خون ملے، ان کی قوت ملے۔''

''میں لڑکی ہوں اسی لیے تم میرے جسم کے ذریعہ لڑکیوں کا شکار کر رہے ہو؟''

''نہیں اس کی وجہ کچھ اور ہے انسانی جسم کیا ہے فقط گوشت اور ہڈیوں کا مجموعہ؟ نہیں۔ یہ انسانی جسم ہی اس دنیا کو بنانے والے کی قوت کا مظہر ہے خدا، گوڈ، بھگوان، ایشور، یزداں کسی بھی نام سے پکارو مطلب ایک ہی نکلتا ہے یعنی خالقِ کائنات۔ اس کائنات کے خالق نے انسانی جسم کو لاتعداد ذروں سے بنایا ہے اب اسے ایٹم کہو یا سیل یعنی خلیہ۔ انسان کا جسم خلیہ کا مرکب ہے اربوں کھربوں خلیے کام کرتے ہیں تب کہیں جا کر انسان کا چھوٹا سا کام نکلتا ہے۔'' اس نے مدبرانہ انداز میں کہا۔''ہاتھ ہلانا ہے تم نے یہ سوچا مگر تم ہلا نہیں سکتیں جب تک دماغ حکم نہ دے۔ دماغ حکم دیتا

ہے تو کھربوں خلیے مل کر زور لگاتے ہیں اور ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے امریکا یورپ میں جا کر دیکھو، ایک مشین کام کر رہی ہے جس کا نام کمپیوٹر ہے۔ مستقبل میں ایک دن یہاں بھی وہ مشین آئے گی کیونکہ یورپی ممالک اپنی آف ڈیٹ چیزیں ایشیاء بھیج دیتے ہیں تا کہ ناکارہ چیزیں زرمبادلہ پیدا کر سکیں۔ کمپیوٹر کا بھی جب ترقی یافتہ ماڈل وہاں کی مارکیٹوں میں آ جائے گا تو پرانے، ناکارہ کمپیوٹرز کو یہاں کی مارکیٹ میں بھیج دیا جائے گا۔ خیر...... اس مشین کو آپریٹ کرنے کے لیے ایک پروگرام چلایا جاتا ہے جسے ونڈو کہا جاتا ہے۔ ونڈو کے پروگرام میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے کاغذ پر نوٹ کرو گے تو کئی من کاغذ بھی ناکافی ہوگا۔ اتنا لمبا چوڑا پروگرام صرف چھوٹی انگلی سے بھی چھوٹے پرزے میں جسے چپس کہتے ہیں آ جاتا ہے۔ چپس بنانے کا خیال، یہ عقل اسے انسانی جسم کی کارکردگی دیکھ کر آئی کہ ایک خلیہ وہ بھی اتنا ننھا کہ ایک سوئی کی نوک پر سینکڑوں آ جائیں۔ یہ ننھا سا خلیہ اپنے اندر پورا ایک نظام رکھتا ہے کہ اس میں ایندھن کی بھٹی ہے پورٹ اور ڈی پورٹ ہے معاونین کی پوری فوج ہے جو اس خلیہ کو زندہ رکھنے کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں اور ہر خلیہ دوسرے کا معاون ہے۔ سب مل کر ایک عضو بناتے ہیں اور وہ عضو دوسرے عضو کے سہارے کام کرتا ہے۔ یعنی سب کچھ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک ہے۔ اسی طرح ساری لڑکیاں ایک ہیں مگر ہر ایک کی صفت الگ ہے۔ ہر ایک کے خون کی قوت الگ ہے۔ جو قوت کنواری لڑکی کے خون کی ہوگی وہ بیاہتا یعنی شادی شدہ لڑکی کے خون کی نہ ہوں گی پھر کنواریوں میں بھی کئی اقسام ہیں شاستر کے مطابق عورت چار قسم کی ہوتی ہے۔ پدمنی، سنکھنی، ہسنی، اشونی، یہ چاروں قسم کی عورتوں کے خون میں جو خلیے ہیں ان کی قوت میں فرق ہے۔

پدمنی کو سب سے اعلیٰ مانا جاتا ہے۔ مجھے بھی پدمنی لڑکیوں کے خون کی ضرورت ہے۔ پدمنی میں بھی صرف تولا راشی یعنی جن کا برج میزان ہو۔ مجھے کل پچاس لڑکیوں کا خون چاہیے ابھی تو صرف چودہ ہوئی ہیں۔'' میرے جسم نے لمبی چوڑی تقریر کر دی۔

''یعنی تم ابھی اور خون کرو گے؟''

''بالکل!''

''میرے جسم کے ذریعہ شکار کھیلو گے؟''

''بالکل!''

''میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی''

''تمہارے اجازت دینے نہ دینے سے کیا فرق پڑے گا۔ تم یہاں رہو یا پاتال میں، ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ تم جانا چاہتی ہو چلی جاؤ۔ میں روکوں گا نہیں۔''

''میرا جسم تو واپس کر دو۔ اس پر تو تم نے قبضہ کر رکھا ہے۔''

''جا لے جا مگر یاد رکھ یہ جسم تیرے لیے خطرے کھینچتا رہے گا۔''

''مجھے پروا نہیں ہے بس میرا جسم لوٹا دو۔''

☆=======☆=======☆

اس گھر سے باہر آئی تو ایک نئے خیال نے ستانا شروع کر دیا، کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ میر پور جانے کے لیے کرایہ چاہئے۔ پورے چار آنے کی ضرورت تھی کیونکہ میر پور تقریباً 20 کلومیٹر دور تھا۔ تب ہی شرافت چچا یاد آ گئے وہ بھی بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ حضرت مخدوم شاہ سے تمسک رکھتے تھے اسی لیے انہوں نے ابو کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ پہلے بھی کئی بار میں ان کے ہاں جا چکی تھی ان کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ بادام تلی میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں میں کئی کئی دن رہ چکی تھی۔ اب تو ابو بھی نہیں رہے اس لیے یقیناً شرافت صاحب شریفانہ برتاؤ کریں گے۔ اپنے مرحوم پیر کی نشانی سمجھ کر مجھے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے ساتھ میں دو وقت کی روٹی دیں گے۔

میں اسی خوش فہمی میں بادام تلی کی طرف چل پڑی۔ سامنے پلاسی بیرک کا علاقہ تھا۔ یہ علاقہ انگریزوں کے زمانے میں فوجیوں کی چھاؤنی تھی۔ مشرقی پاکستان آزاد ہوا تو فوجیوں کی تعداد بڑھی کیونکہ بھارت کی دہشت گردی کا خطرہ تھا۔ فوجیوں کی تعداد بڑھی تو جگہ کم پڑ گئی۔ لال باغ قلعہ کو تاریخی عمارت قرار دے کر فوجیوں کو نکال دیا گیا۔ پلاسی بیرک سرکاری ملازمین کو رہائش کے لیے دے دیا گیا۔ فوجی چھاؤنی کرمی ٹولہ منتقل ہو گئی اور یہ علاقہ آباد ہو گیا۔ میں اس علاقے کو پار کرتی ہوئی حسینی دالان کی طرف بڑھنے لگی۔ مغلیہ دور میں نواب شائستہ خان حاکم صوبہ بنگال نے اس امام بارگاہ کی تعمیر کرائی تھی۔ نواب سراج الدولہ نے مرشد آباد میں ہزار دواری امام بارگاہ بنائی تھی نواب شائستہ خان نے اسی کی نقل میں حسینی دالان بنوائی تھی۔

حسینی دالان کو بنگال میں کئی معنوں میں اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا تھا۔ اس امام بارگاہ کے عقب میں ایک ”پاتال توڑ“ تالاب تھا جس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں بیان کی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ غریبوں کی بیٹیوں کی شادی کے وقت مانگنے سے جہیز پانی سے نکل آتا تھا۔ جن لوگوں پر سحر کا اثر ہوتا تھا وہ اس کے پانی میں غسل کرتے تھے تاکہ سحر کا اثر ختم ہو جائے۔

مجھے ان باتوں سے کوئی لینا دینا نہ تھا اس لیے میں حسینی دالان کے برابر سے ہوتی ہوئی جیل پہنچی۔ تبھی میری نظر بیگم بازار والی سڑک پر ٹھہر گئی۔ اس سڑک سے بڑی بڑی موتیوں کی مالا پہنے ہاتھ میں ٹیڑھی میڑھی لکڑی تھامے وہی بابا چلا آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ کر سہم گئی۔ اتنی دیر میں وہ میرے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے تیز نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر بولا ”کیوں آ گئی۔ اپنے اندر گند بھر کر آ گئی...... ارے ڈر...... ڈر اس وقت سے جب قہر ٹوٹے۔ ارے کاغذ کی کشتی زیادہ دور نہیں جاتی ڈوبنا اس کا مقدر ہے۔ مت سہارا لے کاغذ کی کشتی کا۔“

وہ اول فول بکے جا رہا تھا اور میں سر جھکائے کھڑی اس کی بکواس سن رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ راہ گیر آ جا رہے تھے مگر کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب اپنی اپنی راہ چل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا میرے علاوہ اس کی بکواس کسی کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں رہی ہے یا پھر وہ بابا کسی اور کو نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔

اس کے لگاتار بولنے سے تنگ آ کر میں نے کہا ”بابا میں کیا کروں، کوئی راستہ بتائیں پتہ نہیں وہ کون ہے جو میرا جسم بھی مجھ سے چھین رہا ہے۔“

”پاگل لڑکی یاد رکھ ازل سے وہ ہی قوت رہی ہے اور ابد تک رہے گی...... سن...... ادھر کان لا...... شیطان جنت سے پیچھے لگا ہے...... جنت تک جانا چاہتا ہے...... تو کیا ہے مشت بھر خاک، تُو نیچے گرنے والی وہ اوپر اٹھنے والا...... ہوشیار رہ......“

”بابا......“

خاموش...... چپ رہ۔'' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا پھر بولا۔'' ہر کام کا وقت معین ہے۔ مقرر ہے...... ہر کام اپنے وقت پر بھلا لگتا ہے۔ کل کا انتظار کر...... کل بہت سی باتیں خود ہی سمجھ میں آجائیں گی۔''

''مگر بابا......''

''پھر بولی......'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔'' میں پھر سمجھا رہا ہوں۔ مردار مت کھا، یہ گدھ کا کام ہے۔ عادت پڑ گئی تو زندگی بھر یہی کرے گی۔ چل میرے ساتھ میں تجھے حفاظت کا طریقہ بتاؤں۔'' کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ بادام تلی گھاٹ پیچھے چھوٹ گیا۔ ہم بوڑھی گنگا کے کنارے پہنچ گئے پھر اس نے ایک کشتی والے سے بات کی اور مجھے ساتھ لے کر کشتی پر بیٹھ گیا۔

میں نے خود کو حالات کے تیز دھارے پر چھوڑ دیا تھا وہ جدھر چاہے لے جائے۔ مگر ذہن الجھا ہوا تھا۔ اگر وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا تو پھر کشتی والے سے کیسے بات کر لی۔ یہ سوال بار بار ذہن کو جکڑ رہا تھا۔

بوڑھی گنگا کے اس پار زنجیرا کا علاقہ تھا، غلام بازار تھا، کالی گنج گھاٹ تھا۔ انہی تینوں میں سے کسی ایک میں وہ مجھے لے جانا چاہتا تھا۔ میں خاموش تماشائی بنی کشتی میں بیٹھی رہی۔ بالآخر کشتی کالی گنج گھاٹ پر جا لگی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اترا اور چھوٹے سے بازار کو پار کرتا ہوا ایک مفلوک الحال محلے میں داخل ہو گیا۔

یہاں ہر طرف غریبی کا راج تھا۔ بانس کی چٹائیوں کے گھر تھے یا پھر کشتی پر چلتے پھرتے گھر۔ اس نے ایک چٹائیوں والے گھر کا دروازہ کھولا اور کہا۔'' آجاؤ یہی وہ غریب خانہ ہے جہاں میں رات گزارتا ہوں۔''

میں نے اس ایک کمرے کے گھر پر نظر ڈالی۔ کمرے میں لکڑی کی چوکی بچھی ہوئی تھی جس پر ہلکا پھلکا بستر تھا۔ بستر پر دھلی ہوئی سفید چادر بچھی تھی۔ ایک طرف پانی کا مٹکا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ دیوار پر ہینگر بھی تھے اور اس پر کئی لباس لٹکے ہوئے تھے۔ مگر یہ تمام لباس وہ تھے جو بابا کے جسم پر نظر آتے تھے۔ بالکل ایک جیسے لباس۔

''اس دنیا میں جینے کے لیے روٹی کپڑا اور مکان کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے بھی سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے تھی سو میں نے یہ گھر لے لیا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے کہا۔'' اس دنیا میں وقت گزارنے ہم آئے ہیں۔ ہر ایک کو لوٹ کے جانا ہے کیونکہ ہم یہاں صرف امتحان دینے آئے ہیں اسی امتحان کے نتیجے میں ہمارا رزلٹ آئے گا اور اسی کے مطابق ہمیں اُس دنیا میں مقام ملے گا۔''

''تو؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ اسے ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کسی اچھے کام میں صرف کی جائے اور اس کے لیے ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا چاہیے۔ خیر اب میری کوشش یہ ہے کہ تمہیں اس دلدل سے کھینچ لوں۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ نکلتے نکلتے بولا۔'' ہوشیار رہنا خطرہ ابھی باقی ہے۔''

میں اکیلے کمرے میں بیٹھی اپنے خیالوں ڈوب رہی تھی ابھر رہی تھی کہ یکا یک دروازہ کھلا اور درانہ کئی آدمی گھس آئے۔ انہوں نے اپنے

اپنے ہاتھوں میں مختلف قسم کے اسلحے اٹھا رکھے تھے۔

''اٹھو لڑکی...... چلو تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کہاں؟'' میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

''ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاتا۔ خاموشی سے اٹھو اور ہمارے ساتھ چلو۔ اگر نہیں چلو گی تو ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔''

میں ایک لڑکی تھی۔ اپنی اس کمزوری کو سمجھتی تھی۔ ان سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اس کا واحد حل یہی تھا کہ میں ان کا حکم مان لیتی۔ اب جو قسمت میں تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی ''چلو کہاں چلنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''باہر نکلو مگر یاد رہے چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ چاقو سینے کے پار ہوگا۔'' کہہ کر وہ دونوں اس ترتیب سے باہر آئے کہ ایک میرے آگے تھا تو دوسرا پیچھے۔ اپنی نگرانی میں لے کر وہ دوبارہ کالی گنج گھاٹ آئے اور ایک کشتی میں مجھے بٹھا کر صدر گھاٹ کی جانب بڑھنے لگے۔

صدر گھاٹ گویا مرکزی گھاٹ تھا یہاں سے مشرقی پاکستان کے تقریباً تمام ضلعوں کے لیے لانچ چلتی تھی۔ صبح سے رات گئے تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ مسافروں سے بھری ہوئی لانچیں آتیں اور نئے مسافروں کو بھر کر نئے سفر پر روانہ ہو جاتیں جس وقت ہماری کشتی ٹرمنل کے برابر میں کنارے سے لگی۔ اسی وقت کھلنا سے آنے والی لانچ ''راکٹ'' پہنچی تھی۔ اس دو منزلہ لانچ سے انسانوں کا ریوڑ سا باہر آنے لگا۔

ہماری کشتی سے پہلے ایک کود کر اترا پھر اس نے مجھے سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کا سہارا لے کر ساحل پر اتر آئی۔

''اب سیدھے سیدھے چلتی رہو، خیال رہے ٹھیک تمہارے پیچھے میں ہوں۔ ذرا بھی چالاکی دکھائی تو پیچھے سے چاقو کا وار ہوگا اور تم بیچ سڑک پر تڑپ رہی ہوگی۔'' اس کے لہجے میں اتنی سفاکی تھی کہ میں سہم کر رہ گئی۔

ہم تینوں آگے پیچھے چابی مارکہ صابن والے کے سامنے سے گزرتے ہوئے روپ محل سینما ہال کے پاس پہنچے۔ شو شروع ہونے والا تھا۔ ٹکٹ گھر کے سامنے لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ میرے دل میں آیا کہ میں چیخ مار کر سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کی قطاروں کے درمیان گھس جاؤں۔ کوئی عورت مردوں کی بھیڑ میں درانہ گھس جائے تو افراتفری مچنا ضروری ہے۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر میں سینما ہال کے برابر والی پتلی گلی میں گھس سکتی تھی جو لال کوٹھی پر جا کر نکلتی اور میں لال کوٹھی سے لکھی بازار کی طرف نکل سکتی تھی جہاں قائداعظم کالج کے برابر میں میری ایک منہ بولی خالہ رہتی تھی۔

''اے کھڑی کیوں ہوگئی، آگے بڑھ۔'' پیچھے والے نے میری پیٹھ پر ٹہوکا دے کر کہا۔ اور میں خیالوں کی دنیا سے پھر حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔

''پیدل چلنے سے اچھا ہے رکشا کر لیا جائے۔''

اس کے ساتھی نے مشورہ دیا۔

''خیال برا نہیں ہے۔'' کہہ کر اس نے ایک سائیکل رکشہ روکا اور مجھے درمیان میں بٹھا کر رکشے والے سے کہا۔ ''چلو سکھاری بازار چلو۔''

سکھاری بازار کا نام سنتے ہی میں سمجھ گئی کہ یہ دونوں کس کے گرگے ہیں۔ سکھاری بازار ہندوؤں کا مرکزی محلہ تھا۔ سکھاری، سنکھ کی چوڑیاں

انگوٹھیاں بنانے والے کو کہتے ہیں۔ ہندو بنگالیوں کی نشانی سنکھ کی چوڑیاں ہیں۔ ہر سہاگن اپنے ہاتھ میں سنکھ کی دو موٹی چوڑیاں پہننا فرض سمجھتی ہے۔ اس لیے یہاں کے کاریگروں کی روزی روٹی چلتی رہتی ہے۔ یہ کاریگر رہتے بھی وہیں ہیں۔ مسلمان بنگالی اور ہندو بنگالیوں کی طرز رہائش اور زبان و بیان میں واضح فرق ہے۔ مثلاً مسلمان پانی کو پانی ہی کہتے جبکہ ہندو "جول" کہتے۔ اسی طرح مسلمانوں کے گھر کھلے کھلے اور ہوادار ہوتے جبکہ ہندوؤں کے گھر نسبتاً نیچے اور اندھیرے ہوتے۔ مرکزی دروازے کے بعد بھی دو اور دروازے ہوتے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ برصغیر میں ہندو مسلم فساد کی ابتداء بنگال سے ہوئی اور سال میں ایک دو بار مذہبی فساد ضرور ہوتا ہے۔ اکثر مسلمانوں کا جتھا مار دھاڑ کرتا ہوا سکھاری بازار کے اندر تک پہنچ جاتا۔ انہی سب وجہ سے ہندو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ بھولا بھٹکا مسلمان بندہ جب سکھاری بازار میں پھنس جاتا تو اس کا زندہ نکل آنا معجزے سے کم نہ تھا۔

میں سمجھ گئی تھی کہ اس بار شنکر نے مجھے اپنے علاقے میں قید کرنے کی ٹھانی ہے تاکہ میں فرار نہ ہو سکوں۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ لوگ مجھے ساتھ لے کر جس گھر میں پہنچے وہاں شنکر پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ میں کب سے تمہارا منتظر ہوں۔ لال باغ تھانہ سے تو بھاگ نکلیں اب یہاں سے فرار ہو کر دکھاؤ تو جانوں۔"

"تو کیا سمجھتا ہے میں تجھ سے ڈر جاؤں گی؟"

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے مجھے تو صرف تمہارے بابا کی وہ کتاب چاہیے جس سے وہ جاپ کیا کرتے تھے۔"

"اسے تو کسی بھی صورت میں تم ہاتھ نہیں لگا سکتے اسے حاصل کرنے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔" میں نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔

"زبان کھلوانا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ بڑے بڑوں کی زبانیں کھلوا چکا ہوں۔ تم تو کبوتری ہو کبوتری۔ میں جب چاہوں تمہاری گردن مروڑ دوں مگر۔"

"مگر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مگر میں ہر بار مجبور ہو جاتا ہوں۔ میرے پاس جتنا علم ہے اسے میں نے گھور تپیا کر کے حاصل کیا ہے میں نے جو ودیا (علم) حاصل کی ہے وہ شاہد ہے کہ تمہارے پاس بھی کوئی ودیا ہے جس کے ذریعہ تم اپنی حفاظت کر رہی ہو۔"

"یقین کرو نہ تو میں نے کوئی چلہ کاٹا ہے اور نہ کوئی عمل کیا ہے۔ میں تو پُر اسرار علم یا جادو سحر کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"مگر میرا علم کہتا ہے کہ تیرے پاس کوئی مہاشکتی، کوئی بہت بڑی طاقت ہے جو تیرے آگے پیچھے چھتر چھایا کی طرح ہے وہ ہمہ وقت تیری حفاظت کرتی رہتی ہے ورنہ میں کب کا تجھے سالم نگل گیا ہوتا۔"

"جا کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی، چاہے جگ بیری ہوئے سمجھے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت شاملِ حال رہے تو سمجھ لو کہ تمہارا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میرے ساتھ بھی یقیناً یہی معاملہ ہے۔"

''یہ بھی پتا چل جائے گا۔ فی الحال تم اسی گھر میں قید رہو گی۔ یہاں سے بھاگ نہ سکو اس کا بھی علاج کیے دے رہا ہوں۔'' کہہ کر اس نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی پھر اس ڈبیا سے چٹکی بھر سفوف نکالا اور اس پر کچھ پڑھ کر اس نے پھونک ماری پھر اسے میری طرف اچھال دیا۔

آپ یقین کریں گے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اس سفوف کے ذرے میرے نتھنوں سے ٹکرائے اور میرا جسم پتھر کا بن گیا۔ میں سب کچھ دیکھ سکتی تھی، سن سکتی تھی مگر ہاتھ پیر ہلا نہیں سکتی تھی۔ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔ میری حالت دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا پھر کہا۔

''اس سفوف کا اثر صرف ایک پہر کے لیے ہوتا ہے اس لیے یہاں سے جانے سے پہلے میں ایک کام اور کر کے جا رہا ہوں۔'' کہہ کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں موٹی سی زنجیر تھی۔ شنکر نے زنجیر لینے کے بعد اس کا ایک سرا ستون میں باندھا اور دوسرا میرے پیروں سے اور زنجیر میں تالا لگا دیا تھا۔

''اچھا بے بی میں چلتا ہوں دو دن تک بھوک اور پیاس کی اذیت سہہ کر تمہارے دماغ کی صفائی ہو جائے گی۔'' کہہ کر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلا گیا۔

شنکر نے جاتے جاتے دروازہ بند کر دیا تھا۔

باہر سے چٹخنی لگنے کی آواز بھی آئی تھی۔ شاید وہ جاتے جاتے باہر کی کنڈی بھی لگا گیا تھا۔ میں اکیلی اس نیم تاریک کمرے میں بیٹھی تھی۔

انہیں گئے ہوئے بہ مشکل دس منٹ گزرے تھے کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے بدن میں آگ بھر گئی ہو۔ گرمی نے برا حال کر دیا تھا۔ پھر میں نے ایک عجیب بات دیکھی۔ میرا وہ پیر جسے زنجیر سے باندھا گیا تھا سرخ ہونے لگا۔ بالکل ایسے جیسے لوہے کی سلاخ کو آگ میں تپایا گیا ہو پھر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے پیروں میں بندھی زنجیر اس طرح سے گل گل کر زمین پر گر رہی تھی جیسے موم کی بنی ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ زنجیر گل کر زمین پر گرتی تو زمین ہلکی ہلکی سفید پڑ جاتی بالکل ایسے جیسے زمین پر انگارہ گرنے کے بعد مٹی کی رنگت ہو جاتی ہے۔

عقل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ دماغ جواب دے گیا تھا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ اگر کوئی اور مجھے ایسی کوئی بات بتاتا تو میں کبھی یقین نہیں کرتی مگر یہ نظروں کے سامنے کا واقعہ تھا خود پر گزری تھی اس لیے یقین کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن دماغ پھر بھی اسے سچ ماننے پر تیار نہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر پگھلتی ہوئی زنجیر کو پکڑا تو تڑپ کر رہ گئی۔ وہ اتنا گرم ہو رہا تھا کہ ہاتھ جلنے لگا تھا۔ وہ زنجیر خود میرے پیروں پر سے پگھل کر گری تھی مگر پیروں کو کچھ نہیں ہوا تھا جب کہ ہاتھ بری طرح جل گیا۔ بابا کے بتائے ہوئے کسی ''آیتِ قرآنی'' کو پڑھتی کوئی ''عمل'' کرتی تو شاید دل کو تسلی ہو جاتی کہ یہ اسی کا چمتکار ہے مگر میں نے تو کچھ بھی پڑھا نہیں تھا۔

پھر یہ کیسے ہو گیا اس پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اس گھر کا دروازہ دھکیلا۔ بند دروازہ ایسے کھل گیا جیسے کھلا ہوا ہو۔ باہر نکلی تو زنجیر اسی طرح دروازے میں لگا ہوا نظر آیا۔

دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آئی پھر سڑک پر آ گئی۔ سکھاری بازار کے اس چھوٹے سے مکان سے نکل کر میں سیدھی اسلام پورا آئی کہ وہ علاقہ زیادہ بھیڑ بھاڑ والا تھا اگر شنکر یا اس کے گرگے چاہتے بھی تو میرا کچھ بگاڑ نہ پاتے کیونکہ میں چیخ کر لوگوں کو جمع کر سکتی تھی۔

چلتے چلتے میں لائن سینما کے پاس پہنچ گئی۔ اس تمام راستے مجھے ایک ہی بات پریشان کیے ہوئے تھی کہ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ میں نے کوئی جاپ یا عمل تو کیا نہیں ہے جو میرے اندر ایسی قوت آ گئی ہے کہ میرے ہاتھ میں بندھی زنجیر پیروں میں پہنائی گئی بیڑیاں کٹ جائیں، پگھل کر بہہ جائیں۔ کیا واقعی مجھ پر میرے ابا میاں کی روح مہربان ہوگئی ہے؟

میرے ابا میاں خانقاہی آدمی تھے۔ درویش صفت تھے، زندگی بھر پیرانِ پیر حضرت مخدوم شاہ کی نیابت کی۔ گدی نشینی کی پھر مشرقی پاکستان آ کر حضرت شاہ علی بغدادی کے مزار سے منسلک ہوگئے۔ زندہ تھے تو سوائے اپنے ہر ایک سائل کی دادرسی کرتے رہے سب کو مشکل آسان ہونے کی دعا دیتے رہے اور جب مرے تو میرے کام آ رہے ہیں۔ ایسی محیرالعقول باتیں روح ہی کی مرہونِ منت ہے وہی لوہے کو پگھلا سکتی ہے۔

میں اپنے خیالوں میں ڈوبتی ابھرتی بڑھی چلی جا رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اتنی پھرتی سے پلٹی جیسے سانپ کی دم پر پیر پڑنے سے سانپ پلٹتا ہے۔

پیچھے کھڑے شخص کو دیکھ کر میرے پورے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔ خوف نے پوری طرح دبوچ لیا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں لال باغ تھانے کا داروغہ تھا۔ اس وقت ایس ایچ او کو اسی نام سے پہچانتے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”تُو نے کیا سمجھا تھا ہم سے بچ کر بھاگ نکلے گی۔ ارے قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔ پاتال تک ڈھونڈ لاتے ہیں۔ ایسٹ پاکستان کے کسی بھی گوشے میں چھپو گی ہم تلاش کر لیں گے۔“

”لیکن......لیکن میرا قصور کیا ہے؟“ میں نے اپنے لرزتے وجود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ زمانہ قدیم سے پولیس دہشت کی علامت رہی ہے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ آج کے اس دور میں محکمہ پولیس بدنام ہے۔ نہیں! بادشاہی دور میں بھی یہی عالم تھا۔

انگریزوں کے دور میں بھی ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ ایسٹ پاکستان میں بھی پولیس کو دیکھ کر لوگ سہم جاتے تھے۔ بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا، میں تو ایک معمولی سی لڑکی تھی۔ میرا خوفزدہ ہونا یقینی تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور آتے جاتے لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے۔

”چلو......ادھر جیپ کھڑی ہے جا کر اس میں بیٹھ جاؤ۔“ اس نے اسٹار سینما کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

اسٹار سینما کے بالکل سامنے مون سینما تھا اور اس کے عقب میں طوائف خانہ جسے گنگا جلی کہتے تھے۔ دو سینما ہال اور دو طوائف خانے، ایسے علاقے میں تو پولیس والے شوقیہ گھومتے ہیں۔ ان کی آمدنی کا راستہ کھلتا ہے ناں! شاید وہ بھی اسی خیال سے آیا تھا کہ کچھ ہاتھ آ جائے، اور میں اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس کا حکم مانے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے جیپ کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ میرے پیچھے پیچھے داروغہ اور دونوں سپاہی بھی چلے آ رہے تھے۔ بھیڑ کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ہم اس مقام تک پہنچے جہاں جیپ کھڑی تھی۔ جیپ میں پہلے سے دو سپاہی بیٹھے تھے انہی کے ساتھ مجھے بھی بیٹھنا پڑا۔

جیپ چل پڑی، وکٹوریہ پارک تک آئی اور پھر راستہ بدل کر کورٹ کی طرف مڑ گئی۔ آزاد سینما کے سامنے سے گزرتی ہوئی رتھ کھولا پہنچی پھر وہاں سے ٹیپو سلطان روڈ کی طرف بڑھنے لگی پھر بلدیہ گارڈن کی طرف سے ہوتی ہوئی ہاٹ کھولا پہنچی اور وہاں سے لال باغ والے راستے پر چل پڑی۔

پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اس نے مجھے کوتوال کے سامنے پیش کیا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس نے بے شمار کنواری لڑکیوں کا خون بہایا ہے۔

شہر کوتوال جو ایس پی کے برابر ہوتا تھا اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر کہا۔ ''تو وہ تمہی ہو جس نے یہاں سے فرار ہوتے وقت بہت سارے پولیس والوں کو زخمی کیا تھا؟''

''میں نے کسی کو زخمی نہیں کیا تھا۔ مجھے خود فرار کرایا گیا'' پتا نہیں یہ الفاظ کیسے میری زبان سے ادا ہو گئے۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے میرے اندر سے یہ بات کہی ہو اور اس میں میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔

''جھوٹ مت بولو'' اس نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اچانک کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ حیرت و خوف سے کھلا ہوا تھا، آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں اور چہرے پر دہشت و استعجاب کا ملا جلا تاثر تھا۔

ایسا لگ رہا تھا گویا اس نے کوئی بھیانک شے دیکھ لی ہو اور اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ روح جسم کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔

میں اس کی اس بدلی ہوئی کیفیت پر حیران تھی۔ آخر میں نے عاجزی سے کہا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں ہے جناب!''

میرا جملہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور دروازے کی طرف بھاگا۔ وہ مجھے مخاطب کر کے مسلسل یہی الفاظ کہہ رہا تھا۔

''تم...... تم کون...... کون ہو...... کہاں ہو...... یہ کیا طلسم ہے، کون سا جادو ہے؟''

''میں ادھر ہوں جناب، اس طرف۔'' میں کوتوال کی طرف بڑھی لیکن جوں ہی اس نے میری آواز سنی ایک اور چیخ ماری اور جست لگا کر دروازے کے باہر نکل گیا، دوسرے ہی لمحے میں نے باہر سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔

صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوتوال کس چیز سے خوفزدہ ہے اور باہر سے دروازہ بند کر کے مجھے کیوں قید کر گیا ہے۔ باہر اس وقت ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بہت سے لوگوں کی تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوتوال کی آواز سب سے نمایاں اور بلند تھی۔ وہ عجیب بے ہنگم گفتگو کر رہا تھا۔ شور و غل کی وجہ سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بہر کیف میں دروازے کی طرف بڑھی تا کہ لوگوں کو متوجہ کر کے دروازہ کھولنے کی درخواست کروں، افراتفری میں، مَیں یہ بھول گئی تھی کہ شنکر کی قید سے بھاگتے وقت میں بند دروازے سے گزر گئی تھی۔ یہاں سے بھی نکل سکتی ہوں۔ ابھی میں چند قدم ہی چلی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ مجھ پر ایک خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا تھا اور وہ یہ کہ میرا جسم غائب تھا۔ میں وجود رکھتی تھی مگر بے وجود بن گئی تھی۔ اس وقت میرا کوئی مادی وجود نہیں تھا۔ بس میں روحانی طور پر اپنی شخصیت کو محسوس کر رہی تھی۔ ایک احساس تھا کہ میرا وجود ہے...... اور بس۔ ہر چند کہ میں اس وقت بغیر جسم کے تھی لیکن عام انسانی کیفیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھی، دیکھ سکتی تھی، سوچ سکتی تھی سمجھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی، بس گوشت پوست سے محروم تھی اور اسی بنا پر کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

باہر کا شور و ہنگامہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ قسم قسم کی باتیں بنا رہے تھے۔ میں دروازے کے قریب چلی گئی اور باہر کی آوازوں پر کان لگا دیئے۔ کوتوال کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''ابھی میں اس سے باتیں ہی کر رہا تھا کہ اس کا جسم نظروں سے غائب ہو گیا۔''

''ہوسکتا ہے آپ کی نظریں کسی اور طرف ہوں اور وہ کسی اور طرف سے نکل گئی ہو۔''

''نہیں میری نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے ہٹی نہیں تھیں۔''

''عجیب بات ہے۔ خیر میں دیکھتا ہوں۔'' پھر دروازے پر دستک ہوئی اور تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔

''تم جو کوئی بھی ہو اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو پولیس اندر داخل ہو رہی ہے۔ ذرا بھی گڑبڑ کی تو گولیاں سینے میں اتر جائیں گی۔''

''آپ اندر آ سکتے ہیں۔'' میں نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''میں بالکل بے ضرر ہوں۔ میرے پاس کسی قسم کا اسلحہ وغیرہ بھی نہیں ہے اور دروازہ بھی باہر سے بند ہے۔'' چند ثانیے گھمبیر سناٹا چھایا رہا پھر قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور آہستہ آہستہ دونوں پٹ کھل گئے۔ دروازے میں کئی پولیس افسر پستول اور بندوقیں لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے وہیں سے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر ان کے چہرے حیرت و استعجاب کی آماجگاہ بن گئے۔ ظاہر ہے انہیں آفس میں کوئی نظر نہیں آیا تھا کہ انہوں نے صرف میری آواز سنی تھی جبکہ میں پُراسرار طور پر غیر مرئی بن گئی تھی۔

پولیس والے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ پھر وہ چند قدم آگے بڑھ گئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ان کے درمیان سے نکل آئی۔ باہر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ میں لوگوں سے بچتی بچاتی پولیس آفس سے باہر نکل آئی۔ اب میرا رخ گھر کی جانب تھا۔ راستے بھر خیالات میں غلطاں و پیچاں رہی۔ میں سوچ رہی تھی آخر یہ کیا طلسم ہے۔ میرا جسم اچانک کہاں غائب ہو گیا، میں لوگوں پر کس طرح اپنی شخصیت واضح کروں گی؟ مصروفیت کو کیونکر جاری رکھ سکوں گی؟ میری حیثیت کیا ہو گی اور میرے مستقبل کا کیا بنے گا۔ میں اپنے خیالوں میں ڈوبتی ابھرتی بڑھی چلی جا رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اتنی ہی پھرتی سے پھر پلٹی۔ وہ کوئی اور نہیں روشن آرا تھی۔

بنگال کے نام بھی عجیب ہیں ہر تیسری لڑکی کا نام روشن آرا یا نور النہار یا فریدہ یا یاسمین ہونا ضروری تھا۔

اگر کسی بازار میں کھڑے ہو کر روشن آرا کہہ کر آواز دی جائے تو ایک ساتھ سو آوازیں آئیں گی۔ ''جی!'' خود میرے ہاں جو ماسی کام کرتی تھی اس کی بیٹی کا نام نور النہار تھا اور میری سہیلی کا بھی یہی نام تھا۔ میرے اسکول میں بھی کئی لڑکیاں اسی نام کی تھیں۔ یہ والی نور النہار میری سہیلی تھی جس کے گھر میں، میں رہ رہی تھی۔ اس نے میرے رکتے ہی کہا۔ ''اے تو کہاں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ کل بھیا بھی پوچھ رہے تھے کہ یہ کہاں چلی گئی؟ سیدھی گھر چل۔''

''مگر تُو یہاں کیا کرنے آئی تھی؟''

''اسلام پور میں لائن سینما کے پیچھے میری باجی ہیں ناں میں انہی کے گھر آئی تھی اب واپس جا رہی ہوں۔''

سر چھپانے کے لیے وہ جگہ بری نہ تھی۔ یہ تو میرے اندر کا خوف تھا کہ میں اس کے ہاں سے نکل آئی تھی کیونکہ روشن آرا، نور النہار کے بھائی نے مجھے پیغامِ عشق دے دیا تھا۔ عشق کا بھوت سب سے خطرناک ہوتا ہے۔ عزت و شہرت کا تیاپانچہ ہو جاتا ہے اسی لیے میں اس گھر سے دور رہنا چاہتی تھی مگر کوئی دوسرا سہارا ابھی نہیں تھا اس لیے میں نے دوبارہ اسی کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم دونوں سائیکل رکشا پر سوار ہو کر ''گلستان'' پہنچے پھر وہاں سے 5 نمبر کی صبحانی بس سروس میں بیٹھ کر میرپور آ گئے۔ بس اسٹاپ سے

باتیں کرتے ہوئے ہم نورالنہار کے گھر میں داخل ہوئے جیسے ہی اندر پہنچے اس کے بھائی جلیل سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ بڑا بھائی میرے عشق میں پاگل تھا تو یہ میرا دشمن نمبرایک۔ ابا میاں کے زمانے میں صبح سے شام تک ہمارے ہاں پڑا رہتا تھا۔ ابا میاں سے وظائف وغیرہ پوچھتا رہتا تھا ساتھ ہی ساتھ یہ ایک ''اگھوری'' سے بھی خفیہ رابطہ بنائے ہوئے تھا۔ اگھوری دراصل اس شخص کو کہتے ہیں جو گندے علوم کا ماہر ہوتا ہے خاص کر کالے علم کا۔ اس بات کا پتا ہمیں تب چلا جب ابا میاں کا انتقال ہوگیا اور اس نے ہمارے ''آستانے'' پر قبضہ کرلیا۔ وہاں اس نے بورڈ ٹانگ دیا تھا کہ یہاں کالے علم کی کاٹ کی جاتی ہے۔ یہ بات مجھے پسند نہ تھی مگر کیا کرتی کہ میں بری طرح الجھ گئی تھی۔ کٹورے کے سانپ نے، پھر شنکر نے اور اب اس فقیر نے الجھا دیا تھا۔ اس لیے میں جلیل سے الجھ نہیں پائی تھی ورنہ میرا دل کر رہا تھا کہ اسے دھکے دے کر اپنے ابا کے آستانے سے نکال دوں۔ وہ کمینہ میرے ابا میاں کا نام بیچ رہا تھا۔ ابا میاں کے مریدوں کو ٹھگ رہا تھا۔ تبلیغ دین کی جگہ پیسے کے حصول میں لگا ہوا تھا۔

اس نے مجھے ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آ گئیں! کہاں تھیں اتنے دنوں؟''

''تم سے مطلب؟'' میں نے بھی ترش لہجے میں جواب دیا۔

''یہ گھر ہے سرائے نہیں کہ جب دل چاہا چلی آئیں، ورنہ مڑ کر خبر نہ لی۔'' کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

میرے دل میں نفرت کی تیز لہر اٹھی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جو دن رات ابا میاں کے پاس پڑا رہتا تھا اور آج ان کی گدی پر بیٹھ کر جھوٹے سچے شعبدے دکھا کر لوگوں کو بیوقوف بنا رہا ہے کہ وہ کالے علم کی کاٹ جانتا ہے۔

''اے یہاں کھڑی کیا سوچ رہی ہے تو؟'' روشن آرا، نورالنہار نے اپنے کمرے سے نکل کر پوچھا۔

''آں!'' میں نے چونک کر کہا۔ ''بس یوں ہی ایک خیال آ گیا تھا۔'' کہہ کر میں اس کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ جس میں، میں سویا کرتی تھی۔ اس کمرے میں پہنچ کر میں نے خود کو بستر پر گرا سا دیا تھا۔ یوں بھی تھکن غالب تھی۔ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد آرام کا لمحہ میسر آیا تو آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور میں کچھ ہی دیر میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆=======☆=======☆

وہ علاقہ جانا پہچانا تھا، سانبھر ندی کا کنارا۔ گوروہاٹ کے عقبی حصے پر واقع۔ ایک جانب ''لال ماٹی'' کی کالونی تھی تو دوسری طرف ایک ویران مندر۔ آزادی سے پہلے جب یہاں ہندوؤں کی کثیر آبادی تھی تب شاید یہ مندر خوب آباد رہتا ہو۔ اب تو فقط ایک پنڈت تھا جو صبح شام گھنٹے بجا بجا کر پوجا کرتا اگر کوئی آ جائے تو گھنٹے بجانے کی ڈیوٹی اسے سونپ دیتا اور خود پیتل کی تھالی میں چراغ جلا کر آرتی اتارتا۔ یہ مندر شنکر بھگوان کا تھا۔ گلے میں سانپ ڈالے پالتھی مارے بیٹھے شنکر کا جس کے جوڑے سے گنگا ندی نکل رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں ترسول تھا جس میں ڈگڈگی بندھی ہوئی تھی۔ مندر کی سیڑھیوں پر وہ نوجوان بیٹھا تھا اس کی نظریں پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں۔ پگڈنڈی کبھی خوب استعمال ہوتی ہوگی مگر اب تو خال خال ہی لوگ آتے۔ محلے کے زیادہ تر ہندو ہجرت کر گئے تھے جو بچے تھے وہ آبادی کے درمیان بنے مندر میں جاتے تھے اسی لیے یہ پگڈنڈی ویران پڑی تھی۔ سیڑھیوں پر بیٹھے نوجوان کا چہرہ کھل اٹھا اس نے دونوں بازو پھیلا دیئے تھے۔

''کیا بات ہے کارتک آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو؟''

''میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا تاکہ تمہیں وہ خوش خبری سنا سکوں۔''

''کون سی خوشی خبری؟''

''تمہیں تو معلوم ہے کہ میں یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں۔''

''اور اب مجھے حاصل کرنے کی کوشش میں ہو۔''

''بھگوان کے لیے شانتی سنجیدہ ہو جاؤ۔ خیر میں نے بتایا تھا ناں کہ میرا گھر میمن سنگھ شہر سے کافی اندر کی طرف ایشور گنج میں ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں اپنی بہن کو خط میں لکھ دیا تھا اس نے تمہیں دیکھنے کے لیے ماں کو بھیجا ہے۔''

''مگر میں تو ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''میری ماں سے ملاقات کر لو۔ یوں بھی ابھی میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے۔ پہلے تعلیم مکمل کر لوں پھر شادی کی تاریخ وغیرہ پر بات ہوگی۔ ابھی تو بس ماں کو اپنا یہ سندر چہرہ دکھا دینا ہے تاکہ وہ میری پسند پر مہر لگا دیں۔''

''ابھی تو میرے گھر والے بھی راضی نہیں ہوں گے۔''

''بیٹی والے راضی ہونے میں دیر نہیں لگاتے ویسے تمہاری ذات کیا ہے؟ تم برھمن ہو یا کھتری؟''

''کنیا کچھ برھمن ہیں، چٹرجی ہیں چٹرجی۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ ہم لوگ بھی بٹرجی ہیں۔'' کارتک نے مسکرا کر کہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''لیکن تم نے ابھی تک اپنے بابا کا نام تو بتایا ہی نہیں ہے۔ کس کی بیٹی ہو، محلے میں کون سا گھر تمہارا ہے۔''

''بتا دوں گی۔''

''ارے کہاں چل دیں، کیا ناراض ہو گئی ہو؟''

''ناراض نہیں ہوئی ایک کام یاد آ گیا۔ اچھا میں چلتی ہوں، کل اسی وقت یہیں پر ملاقات ہوگی۔''

کارتک کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ وہ جتنا خوش تھا اتنا ہی غمگین ہو گیا۔ وہ اداس نظروں سے ویران پگڈنڈی کو تکنے لگا۔

☆=======☆=======☆

شام ہو چلی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا مگر میں کسلمندی کی وجہ سے اب تک بستر سے ایک بار بھی اتری نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں بدن ٹوٹتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید یہ ''پروائی'' کا اثر تھا۔ پورب سے بہنے والی ہوائیں بھی جواں جسم میں عجیب سی تھکاوٹ بھر دیتی ہے۔ جوڑ جوڑ دکھنے لگتا ہے۔ دل تشنگی سے بھر دیتی ہے۔ میرے پاس جو جمع پونجی تھی وہ ختم ہونے والی تھی۔ اس گھر میں رہتے ہوئے مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی پھر بھی میں پریشان تھی۔ کیا کروں کہاں سے رقم اکٹھی کروں۔ یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ مجھے خیال آ گیا۔ ہمارا گھر جواب ملبے کا ڈھیر تھا اسے بیچا جا سکتا ہے۔ اس

کے کاغذات ابا کے ایک مرید کے پاس تھے۔ وہ ایک وکیل تھا اس نے مکان تعمیر کرانے کے لیے کسی بینک سے قرض دلانے کی بات کی تھی اسی لیے وہ کاغذات لے گیا تھا ورنہ وہ کاغذات بھی جل کر خاک ہو جاتے۔ وہ صاحب ٹیپو سلطان روڈ پر رہتے تھے مگر میں نے ان کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ ٹیپو سلطان روڈ کوئی چھوٹا موٹا علاقہ نہیں تھا۔ رتھ کھولا سے شروع ہو کر ہاٹ کھولا تک جاتا تھا۔ انہیں وہاں جا کر کہاں ڈھونڈوں گی ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ مجھے یاد آ گیا۔ ابا کی ایک ڈائری تھی اس میں ان کے پچاسوں مریدوں کے پتے درج تھے۔ وہ ڈائری مجھے فرزانہ کے بھائی نے لا کر دی تھی۔ ہندوؤں کا حملہ ہوا تو مسلمانوں نے روکنے کی کوشش کی تھی۔ جوابی حملہ کرنے والوں میں فرزانہ کا بھائی بھی تھا۔ میرا گھر لٹنے کے بعد وہ پہنچا تھا۔ اسے وہ ڈائری پڑی ہوئی نظر آئی تو وہ اسے اٹھا لایا۔

اس ڈائری کو ابا کی نشانی سمجھ کر میں اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی۔ اس وقت بھی وہ میرے تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔

اسے نکالنے کے لیے میں نے تکیہ ہٹایا تو میری سانس چڑھنے لگی۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ تکیے کے نیچے ایک دو نہیں پانچ پانچ گڈیاں رکھی تھیں، پچاس پچاس کے کرارے نوٹوں کی گڈیاں۔ یہ نوٹ کہاں سے آئے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ دور بہت سستا تھا پچاس پیسے کلو آٹا اور پچھتر پیسے کلو موٹا چاول مل جاتا تھا۔ اتنے پیسوں میں تو کوئی گھر بنا سکتی تھی اس لیے میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اسے اٹھا کر میں اپنے پرس میں رکھنے لگی تبھی مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ نوٹ جعلی تو نہیں ہیں۔ اسے اچھی طرح چیک کیا مگر وہ اصلی کرنسی نوٹ تھے۔ میری زندگی بدل گئی تھی میں یک لخت امیر بن گئی تھی۔ لیکن تشویش کی بات یہ تھی کہ یہ خطیر رقم کون رکھ گیا اور کیوں رکھ گیا۔ کیا واقعی مجھ پر کوئی پُر اسرار ہستی مہربان ہو گئی ہے یا وہی کٹورے والا سانپ مجھے پھنسانے کے لیے پھر کوئی چال چل رہا ہے۔ ایک جوڑی کنگن دے کر اس نے میری بہن کی جان لی تھی۔ اب کیا وہ میری جان لینا چاہتا ہے۔

اتنی بڑی رقم یک مشت مل جانے کا یہی مطلب تھا کہ اب مجھے کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ سوال ذہن میں تازہ تھا کہ آخر یہ رقم آئی کہاں سے۔ کیا واقعی کوئی پُر اسرار ہستی مجھ پر مہربان ہو گئی ہے لیکن کیوں؟ مجھ میں ایسی کیا بات ہے۔ میں اپنے ابا کی طرح عبادت گزار بھی نہیں تھی اور نہ ہی تسخیرِ جنات کا عمل کیا تھا کہ جنات مجھے رقم فراہم کرتے۔ جب کوئی بات سمجھ نہ آئی تو میں نے بستر چھوڑ دینے ہی میں عافیت سمجھی اور بیڈ سے نیچے پیر لٹکا کر سلیپر پہننے لگی۔

میں بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ نور النہار ہو گی مگر دروازہ کھولتے ہی سکتے میں رہ گئی۔ دروازے پر پولیس والے کھڑے تھے۔ ان سب نے میری طرف رائفلیں سیدھی کر رکھی تھیں۔

ان کے پیچھے شنکر تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ اس بار پولیس والے مجھے بخشنے والے نہیں ہیں۔

انہوں نے واقعی ذرا بھی رعایت نہیں کی۔ تین طرف سے رائفل کی نالیں میرے جسم سے لگا دی گئیں۔

ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر مجھے ہتھکڑیاں لگائیں اور مجھے کھینچتے ہوئے لے چلے۔ اس بار ان کی چوکسی قابلِ دید تھی۔ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑا جا رہا تھا۔ کبھی تفتیش کے نام پر سوال جواب کرتے تو کبھی یوں ہی اپنے سامنے بٹھائے رکھتے۔

یہ سلسلہ تین دن تک چلا۔ تین دن کے بعد مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ کو بھی شاید سکھا پڑھا دیا گیا تھا۔ اس نے ایک بند کمرے میں مجھ سے سوال جواب کیے۔ پولیس نے جن لڑکیوں کے قتل کا الزام مجھ پر لگایا تھا اس کے بارے میں سوالات کرنے کے بعد فوراً ہی فیصلہ سنا دیا گیا۔ مجھے پھانسی کا حکم دیا گیا تھا۔ یوں بھی اوپر سے نیچے تک محکمہ پولیس میں میری وجہ سے خوف چھایا ہوا تھا۔ پولیس والے دور دور کھڑے ہو کر مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتے اور یکا یک سب کی نظروں سے غائب ہو جانے والی میری خوبی کا تذکرہ کرتے۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ مجھے جتنی جلد ممکن ہو چڑیلوں والی سزا دی جائے یعنی زندہ جلا دیا جائے۔ اسی لیے قانون کی کھلی خلاف ورزی کی گئی تھی اور مجھے پھانسی پر لٹکانے کا کام اتنی جلدی نمٹا دیا گیا تھا۔

میرے آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں کہ وہ میری پیروی کراتا۔ ہائی کورٹ میں میرا مقدمہ پیش کرتا اس لیے میں سر پکڑے بیٹھی رہی۔

اگلے ہی دن مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچانے کا انتظام کر دیا گیا۔ بلیک وارنٹ پر میرے انگوٹھے لگوا لیے گئے تو ایک مولوی صاحب آ گئے انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹی! نماز پڑھ لو۔ اللہ کو یاد کرنا بہت ضروری ہے اسی نے یہ زندگی دی ہے اسی کے پاس ایک دن سب کو جانا پڑتا ہے۔“

آج کئی دنوں سے میں نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ نماز پڑھنا گویا بھول چکی تھی۔ پھر بھی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ مگر یہ کیا میرا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ دماغ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ ایک لفظ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ اکبر کہنا بھی بھول رہی تھی۔ کیا کروں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں رکوع پھر سجدے میں جھک گئی۔ دکھاوے والی نماز پڑھی اور سلام پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ مولوی صاحب میرے قریب بیٹھ کر سورۃ یٰسین پڑھنے لگے۔ بالکل ایسے جیسے قریب المرگ مریض کے سرہانے پڑھی جاتی ہے تلاوت ختم ہوئی تو پانچ بج چکے تھے۔ ٹھیک سوا پانچ بجے مجھے پھانسی دی جانی تھی۔ میری زندگی کے صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس کے بعد میرا جسم پھانسی پر لٹک جاتا اور پھانسی گھاٹ پر کھڑے لوگ میرے تڑپنے کا نظارہ کرتے۔

جیلر نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پیروں میں جان نہیں تھی اگر دو سپاہی دو طرف سے مجھے سہارا دیئے ہوئے نہ ہوتے تو میں ایک قدم بھی اٹھا نہ سکتی تقریباً گھسٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ مجھ پر موت کا خوف چھایا ہوا تھا۔ قارئین خود سوچیں جب یہ یقین ہو جائے کہ پندرہ منٹ بعد موت یقینی ہے تو دل پر کیا گزرتی ہے۔ اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ ذہن چیخنے لگتا ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا کیونکہ موت سے بھیانک موت کا انتظار ہے۔ میں بھی موت کے اپنی طرف بڑھتے قدموں کی دھمک اپنے دماغ میں محسوس کر رہی تھی۔ موت کا پھندا دور ہی سے جھولتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ پھندا میرے جسم میں اور زیادہ دہشت کی لہر اٹھا رہا تھا۔ پھانسی گھاٹ کے چبوترے کے نیچے ایک مجسٹریٹ کھڑا تھا۔ اس نے مجھے رک جانے کا اشارہ کیا پھر پوچھا۔ ”بی بی آپ پر کئی نو خیز لڑکیوں کے قتل کا الزام ہے۔ عدالت نے غور فکر کرنے کے بعد آپ کو قصوروار جانا ہے سزائے موت دی ہے۔ آپ نے بلیک وارنٹ پر دستخط بھی کیے ہیں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

میری زبان نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھ سے بولا نہ گیا بس سر سے نفی میں اشارہ کر دیا۔

مجسٹریٹ نے نہایت نرم لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کی کوئی آخری خواہش؟''

''زندہ رہنا۔'' میں یہی کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔

کارروائی ختم ہوگئی۔ مجھے پینے کے لیے چند گھونٹ پانی دیا گیا اور پھانسی گھاٹ پر کھڑا کر کے میرے چہرے پر کالے کپڑے کا غلاف چڑھا دیا گیا۔ میرے دونوں ہاتھ تو پیچھے بندھے ہوئے ہی تھے اب پیروں کو بھی باندھ دیا گیا۔ میں تخیل کی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ جلاد کا ہاتھ اس لیور پر ہے جسے وہ اپنی طرف جھکائے گا۔ جیسے ہی وہ لیور جھکے گا میرے پیروں سے نیچے موجود تختہ خود بخود ہٹ جائے گا اور میری گردن میں پھنسا پھندا کس جائے گا۔ میری آنکھیں ابل جائیں گی۔ زبان باہر نکل آئے گی اور میں مر جاؤں گی۔

''اشہد ان لا الہ الا اللہ!'' مولوی صاحب نے مجھے پڑھنے کے لیے کہا۔ میں کلمہ کو دوہراتی کہ میرے جسم کو جھٹکا لگا۔ لطیف سا جھٹکا، اس سے پہلے بھی ایسا جھٹکا لگ چکا تھا اور جب بھی ایسا جھٹکا لگا تھا ایک انوکھی کرامت نظر آئی تھی۔

جھٹکا لگنے کے ساتھ میں نے کچھ دہشت زدہ اور گھبرائی ہوئی آوازیں سنیں اور اب جو گردوپیش کا جائزہ لیا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا پھانسی کا پھندا جو میری گردن میں ڈالا گیا تھا وہ فضا میں خالی ہو کر جھول رہا تھا۔ میرے چہرے پر چڑھا کنٹوپ اتر کر الگ پڑا تھا اسی لیے میں سب کچھ صاف صاف دیکھ رہی تھی۔ میں روحانی حیثیت میں کھڑی تھی اور میرا جسم غائب ہو چکا تھا جیسا کہ اس سے پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ جلاد سپاہی، جیلر، مجسٹریٹ اور مولوی صاحب، سب کے سب پھٹی پھٹی نظروں سے پھانسی گھاٹ کو دیکھ رہے تھے اور خالی چبوترا سب کا منہ چڑا رہا تھا۔ اتنی دیر میں، ان سب کے چہروں پر پھیلی حیرت نے، حالات کے نئے رخ نے، میرے اندر نئی توانائی بھر دی تھی۔ کچھ دیر پہلے مجھ پر جو موت کا خوف غالب تھا وہ یک دم موقوف ہوگیا تھا۔ تبھی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جلاد جو لیور پکڑے کھڑا تھا اس نے مجھ سے رشتہ جوڑنے کا اظہار کیا۔ پدری سلسلے کی خواہش بیان کی۔ اپنی پاکیزہ ماں کے بارے میں اتنی بڑی بات میں کیسے سہہ لیتی؟ اس نے لیور کو غصے سے جھٹکا دے کر یہ بات کہی تھی۔ میں نے وہیں رکھا ایک سپاہی کا ڈنڈا اٹھا لیا اور دل میں آیا کہ اس نے لیور کو تھام کر میرے بارے میں جو رائے دی تھی وہی بات میں عملی طور پر دہرا دوں اس لیے ڈنڈا اٹھا کر اس کی کمر پر زوردار انداز میں جما دیا۔ وہ تلملا کر پلٹا اس کی نظر پیچھے کھڑے سپاہی پر پڑی۔ دو میں سے ایک کا ڈنڈا میں نے سنبھال رکھا تھا دوسرے کا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ جلاد چیختا ہوا پلٹا تھا اور اس نے یہی سمجھا کہ شاید اس سپاہی نے ڈنڈا چلایا ہے بس اس نے ہاتھ گھما دیا تھا۔ عین اسی لمحے میں نے سپاہی کی ٹانگ کھینچی تھی وہ نیچے گرا تھا اور جلاد کا طمانچہ جیلر کے گال پر پڑا تھا۔ جیلر گالیاں بکتا ہوا سپاہی کی طرف پلٹا تھا کہ میں نے مولوی صاحب کو دھکا دیا۔

وہ بے چارے لڑھک کر مجسٹریٹ پر جا گرے۔

مجسٹریٹ صاحب کا غصے میں آنا ضروری تھا وہ مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ انسان کو غصے کے عالم میں پہچانو اور حضرت علیؓ کا قول ہے کہ غصہ عقل کو اس طرح کھاتا ہے جیسے سوکھی گھاس کو آگ۔

اس وقت وہاں موجود لوگوں کی اصلیت بھی ظاہر ہو رہی تھی اور عقل کی گہرائی بھی۔ وہ سب بغیر کچھ سوچے سمجھے آپس میں لڑ پڑے تھے۔ ہر ایک کا شک تھا کہ اسے دانستہ مارا گیا ہے۔

میں نے وہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھا کہ مبادہ میرا جسم لوٹ آئے اور میں ان لوگوں کو نظر آنے لگوں۔ غصے کی وجہ سے انہوں نے مجھے بھلا دیا تھا۔ میرے غائب ہو جانے کو نظر انداز کر دیا تھا مگر یہ سب لمحاتی کھیل تھا جیسے ہی انہیں کچھ دیر پہلے کا واقعہ یاد آتا وہ سب اپنا غصہ بھول جاتے اور میری تلاش شروع ہو جاتی۔ یہی ہوا، مجسٹریٹ صاحب چیخے۔ ''بیوقوفو! اس لڑکی کو ڈھونڈو وہ کہاں غائب ہوگئی۔'' ان کا اتنا کہنا تھا کہ میں تیز تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھی۔ میں ٹھوس جسم سے عاری تھی اس لیے بغیر کسی دقت کے ہوا میں تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ مجھے جیل کی ٹھوس دیوار بھی روک نہ سکی اور میں اس میں سے گزرتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔

ڈھاکا سنٹرل جیل شہر کے قلب میں واقع ہے۔ پرانے شہر کے بیچوں بیچ۔ ایک راستہ مغلوں کے دور میں بنے حسینی دالان امام بارگاہ کی طرف سے آتا ہے جو بادشاہی دور میں بنے لال باغ قلعہ کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا راستہ بیگم بازار کی طرف اور تیسرا بنگشال کی جانب۔

میں بنگشال کی طرف بڑھنے لگی۔ دراصل میں نواب پور سے ہو کر گلستان تک جانا چاہتی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے سوچا اس طرح پرواز کرتے ہوئے جانا آسان تو ہے مگر وقت طلب بھی ہے۔ اگر ٹھوس جسم ہوتا تو رکشا پر چلی جاتی۔

میں اپنے خیالوں میں ڈوبتی ابھرتی پرواز کر رہی تھی کہ کسی نے میری کلائی کو پکڑ لیا۔ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں غیر مرئی حالت میں تھی اس لیے میرا ہاتھ پکڑنا حیرت کے زُمرے میں آ رہا تھا کہ مجھے دیکھا کیسے گیا؟ کس نے مجھے دیکھا ہے اس لیے میں ہاتھ پکڑنے والے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

جس طرح میں غیر مرئی تھی۔ مجھے کوئی بھی دیکھ نہیں سکتا تھا پھر بھی پکڑنے والے نے میری کلائی پکڑ لی تھی۔ یہ کون ہے یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ میرے کانوں میں جانی پہچانی آواز آئی ''تمہیں پھانسی کے پھندے سے اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم یوں سڑکوں پر ٹہلتی رہو۔ چلو مجھے تم سے کام ہے۔''

آواز نے بتا دیا تھا کہ میرا ہاتھ تھامنے والا کون ہے مجھے کس نے پھانسی کے پھندے سے بچایا ہے۔

دنیا کا نظام ہی ایسا ہے کہ ہر شخص غرض کا بندہ ہے۔ بغیر اپنی غرض کے ایک پتہ بھی نہیں کھڑکتا۔ دنیا کی ہر چیز اپنے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ اس نے بھی مجھے بچایا تھا اپنے مفاد کے لیے۔ اسے میرے جسم کی ضرورت تھی۔ یہ بات اس نے پہلے بھی کہی تھی۔ اب میں اس کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھی اس لیے اس کے ساتھ چلتی رہی بلکہ اڑتی رہی۔

یہ وہی تھا جس نے میرے جسم کا سہارا لے کر کئی خون کیے تھے۔

میں اس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تھی جہاں اس سے پہلے بھی آ چکی تھی۔ وہاں پہنچا کر اس نے کہا

''تمہارا یہ جسم اب تمہارا نہیں ہے اس لیے تمہیں اس کی حفاظت کرنا ہوگی۔''

''اپنا جسم کسے عزیز نہیں ہوتا میں تو اس کی حفاظت کر رہی ہوں۔''

''میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے بیماری، زخم، چوٹ وغیرہ سے بھی بچائے رکھنا ہے۔ اس کی حفاظت ہتھیلی کے چھالے کی طرح کرنا ہے۔''

''اس کی حفاظت کے لیے میں کافی ہوں۔''

تبھی وہ آواز سنائی دی اور میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کی چوکھٹ تھامے وہی پُراسرار بوڑھا کھڑا تھا جس کے گلے میں بڑے بڑے منکے کی مالا تھی جو نہایت پُراسرار انداز میں سامنے آتا تھا۔

میں عجیب دوراہے پر آ گئی تھی جس کے ہر سرے پر ایک دشمن تھا۔ ایک طرف کٹورے والا سانپ تھا جو انسانوں کی طرح بولتا تھا۔ پھر وہ ایک نئے روپ میں ملا جس نے میرے جسم کو اپنے قبضے میں لے کر مجھ سے کئی خون کرا دیئے۔ ایک وہ شنکر تھا جو زبردستی مجھے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتا تھا جب مایوس ہو گیا تو مجھے قانونی طور پر سزا دینے کی راہ ہموار کرتا رہا اور ایک یہ پُراسرار بابا تھا جس نے اب تک مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا مگر اپنے بارے میں حقیقت بھی نہیں بتائی تھی۔ وہ کیا چاہتا ہے، دوست ہے یا دشمن یہ بات بھی عیاں نہیں ہو پائی تھی۔ اس بوڑھے بابا نے میرا ہاتھ پکڑا اور دروازے سے نکل کر باہر جانے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم......تم اسے نہیں لے جاسکتے۔'' کونے سے آواز آئی۔

''مجھے کون روکے گا؟'' فقیر بابا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہم اور ہمارے مؤکل۔'' وہی آواز سنائی دی۔

''لو سنو! پنڈت جی نے ہیجڑوں کی فوج بنا رکھی ہے۔'' فقیر بابا نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تمہارے مؤکلوں کی اوقات کیا ہے میری ایک پھونک......''

''اتنا اونچا نہ اڑو کہ پر جل جائیں۔ بہت زیادہ خوش فہمی بھی اچھی نہیں ہوتی۔''

''اگر ہمت ہے تو روک لو۔'' کہہ کر فقیر بابا نے مجھے باہر کی جانب کھینچا۔ یقین کریں اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے پیر زمین سے چپک گئے ہوں، میں قدم اٹھانے کی کوشش کیے جا رہی تھی لیکن قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ آخر میں نے بے چارگی سے فقیر بابا کی طرف دیکھا۔ شاید وہ میری حالت سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا اس کے ساتھ ہی میرا بدن ہلکا ہو گیا۔ میں تیزی سے قدم اٹھانے لگی۔ ابھی دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ دروازہ اپنی جگہ سے غائب تھا وہاں پر سپاٹ دیوار تھی۔ اس دیوار کو پار کرنا ناممکن سی بات تھی۔

''کہو کیسی رہی۔ اپنے علم کو آزماؤ، شاید کوئی راستہ نکل آئے۔'' وہی آواز پھر سے گونجی۔ فقیر بابا کے چہرے کا تاثر بدل چکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت غصے میں ہیں اور کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چمٹے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور سر سے بلند کر کے زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے زوردار انداز میں اس دیوار پر دے مارا۔ دیوار سے ایسی آواز ابھری جیسے کوئی درد کی شدت سے کراہ اٹھا ہو، کسی کا سر پھٹا ہو یا ہاتھ پیر ٹوٹے ہوں۔

میں نے چونک کر دیوار کی طرف دیکھا تھا اور تب دیوار پہ جو کچھ نظر آیا اسے دیکھ کر اوسان خطا ہونا ضروری تھا۔ دیوار بہ ظاہر سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی مگر ان بے جان اینٹوں کی اس دیوار سے ٹھیک اس جگہ جہاں پر چمٹے کی ضرب پڑی تھی وہاں کی اینٹیں جھڑی ہوئی لگ رہی تھی۔ یقیناً چمٹے کی ضرب سے وہ ٹوٹی ہوئی اینٹ کا خلا پیدا ہوا ہوگا اور اب اس جگہ سے خون رس رہا تھا۔ تازہ تازہ سرخ خون۔

☆======☆======☆

میں کہاں، ایسی محفل کہاں۔ یہ سب خواب ہو گئے تھے۔ جب سے باوا جان کا انتقال ہوا تھا خوشیاں جیسے روٹھ گئی تھیں۔ نور النہار کی شادی کے طفیل یہ خوشیاں دیکھنا نصیب ہو رہی تھیں۔ یہ شادی اچانک ہی طے ہوئی تھی اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق سب کچھ ہو رہا تھا۔ اُس دور میں شادیاں ہال میں تو ہوتی نہ تھیں، گھر کے باہر قناتیں لگ جایا کرتی تھیں۔ وہ بھی صرف مردوں کے لیے عورتیں اندر مصروف رہتیں۔ ہر رسم میں تقریباً تمام مہمان خواتین کو شریک ہونا پڑتا۔ تقریباً ہر گھر میں آنگن کا ہونا ضروری تھا۔ گھر کے آنگن میں سفید براق چاندنی بچھا دی جاتی۔ درمیان میں ڈھول رکھ دیا جاتا۔ لڑکیاں بالیاں تالیوں کی تال پر بیاہ کے گیت گاتیں۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دینے والیاں اس دور میں بھی کچھ زیادہ ہی شوخ نظر آتی تھیں۔ خواہ مخواہ کی مصروفیت کے بہانے بار بار مردانے میں آتیں اپنی چھب دکھا کر چھپ جاتیں، یعنی اوٹ میں ہو جاتیں۔ اس وقت ان کی پھبن کچھ اور ہوتی کھلے بالوں پر بیلے کی لڑیاں، رنگ برنگی ساڑھیاں جسے بنگال کا خاص پہناوا کہا جاتا ہے، ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی پڑتی تھی۔ اُڑتے، ڈھلکتے آنچل کو تھامنے کے نام پر ڈھلکاتی سنبھالتی، اس خیال سے اِدھر اُدھر دیکھتیں کہ کون انہیں دیکھ رہا ہے، کس کی نظروں میں تنبیہ ہے اور کن آنکھوں میں ستائش۔ بالوں میں سجے گجرے پر بھی دھیان مرکوز کہ کہیں گر نہ جائے، کجرے کی دھار پر توجہ کہ چوڑی نہ ہو جائے۔ لیکن میں اس رنگ و مہک کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی سب سے الگ، سب سے جدا خود میں مگن تھی۔ ایک طرف بوڑھی، بہت بوڑھی عورتوں کے لیے دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں انہی میں سے ایک پر میں بھی بیٹھی تھی۔

اس دور میں کرسیوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ صرف خاص خاص موقعوں پر نکالی جاتیں۔ اول جب حکیم وید اور سیانوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹروں کو بلایا جاتا۔ وہ اس پر بیٹھ کر جگہ جگہ اپنے تھس کوپ لگا کر دیکھتا کہ مریض اور موت کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ کتنا ہے۔ یوں بھی ڈاکٹر کو کسی گھر میں جاتے دیکھ کر ہی لوگ جلدی جلدی کھا پی کر تیار ہو جاتے کہ کسی بھی وقت کندھا دینے کا بلاوا آ سکتا ہے۔ عورتوں کو بَین کرنے جانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کرسی کا ایک مصرف اور تھا، لڑکوں کو ایک بار ضرور بٹھایا جاتا اور اس کے سامنے حجام استرا چھپائے بیٹھا ہوتا تاکہ لڑکے کے والد، تایا، ماما کوئی لڑکے سے کہے "وہ دیکھو اوپر سونے کی چڑیا اُڑ رہی ہے۔" لڑکا بزرگ کی بات کو جھوٹ کیسے سمجھتا حیرت سے اوپر دیکھتا اور اگلے ہی لمحے چیخ چیخ کر رونے لگتا۔ کرسیوں کے ان دو مصرف کے بعد ایک تیسرا مصرف یہ تھا کہ شادی بیاہ کے موقع پر ایک دوسرے کے گھر بھیجنا یعنی شادی والے گھر میں محلے بھر کی کرسیاں جمع ہو جاتیں۔

میں جس کرسی پر بیٹھی تھی وہ بھی مانگی ہوئی تھی۔ میں اس پر بیٹھی سب کا جائزہ لے رہی تھی مگر ذہن کہیں اور تھا۔ تبھی ایک بچہ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا۔ "باجی! آپ کو آپ کے چاچا بلا رہے ہیں۔"

میں نے حیرت سے بچے کو دیکھا اور وہاں سے اٹھ گئی حیرت سے دوچار اس لیے تھی کہ میرا چاچا کہاں سے پیدا ہو گیا، یہ کون آ گیا ہے یہی دیکھنے کے لیے باہر آ گئی۔

باہر مردانے کے آخری سرے پر جو شخص کھڑا تھا اسے دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ فقیر بابا تھے۔ گیروے کپڑے میں ملبوس گلے میں موٹے موٹے موتیوں کی مالا۔ داہنے ہاتھ میں بڑا سا لوہے کا چمٹا اور بائیں ہاتھ میں سیاہ کشکول جو پتلی سی ایک زنجیر کے سہارے گردن سے بندھا ہوا

تھا۔ کہیں کسی کی نظر ان پر نہ پڑ جائے یہ سوچ کر میں نے انہیں اندھیرے اور سنسان پڑے گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

باوا جان زندہ تھے تو اور بات تھی ان کے پاس ایسے لوگ آتے رہتے تھے۔ پیر، فقیر اور قلندر ان سب کا رابطہ یقینی ہے مگر میں تو ایک عام سی لڑکی تھی مجھ سے ایسے لوگ کیوں ملیں گے۔ اسی لیے میں انہیں ساتھ لے کر نسبتاً اندھیرے گوشے میں آ گئی پھر پوچھا'' کیسے آنا ہوا، کوئی کام تھا مجھ سے؟''

''بغیر کام کے کوئی کسی کے پاس نہیں جاتا۔'' فقیر بابا بولے۔

''فرمایئے!'' میں نے پوچھا۔

باتیں میں بابا جی سے کر رہی تھی مگر ذہن کہیں اور تھا۔ باوا جان کا خیال آتے ہی ان کی تصویر نگاہوں میں آ گئی۔ واقعی یہ سچ ہے کہ بیتے لمحے لوٹ بھی آئیں تو یاد بنیں یا خواب، پرچھائیں تو پرچھائیں ہے ہاتھ کہاں سے آئے۔ میرے باوا جان زندہ تھے تو یہی دن رات کیسے حسین تھے۔ ہر طرف، زندگی کے آنگن میں چاندنی ہی چاندنی تھی پھر پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی کہ ہر طرف درد کی کالی رات اتر آئی۔

''اے کس سوچ میں ڈوبی ہو؟'' فقیر بابا نے مجھ پر نظریں جما کر پوچھا۔

''بس کچھ پرانی باتیں یاد آ گئیں ہیں؟'' میں نے کہا۔

''یعنی کہ بیتی رُتوں کی یاد اچانک یوں آئی تنہائی میں جیسے پریاں ناچ اٹھی ہوں من مندر انگنائی میں۔'' فقیر بابا مسکرا کر لحن میں بولے۔

''بس یہی سمجھ لیں۔'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہو، تم سے ایک ضروری کام ہے۔''

''کتنی دور جانا ہے؟''

''یہیں قریب ہی تاکہ کوئی دخل نہ دے بیٹھے۔''

''چلئے، تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہیں۔''

کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیئے۔

بنگال میں تالاب اور گھر لازم و ملزوم ہیں۔ ہر بڑے گھر سے متصل تالاب کا ہونا ضروری ہے اور تالاب میں اترنے کے لیے پختہ سیڑھیوں کا۔ ہم ایسے ہی ایک تالاب کے کنارے بنی پختہ سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ بابا جی نے تالاب کے پانی پر نظریں جما کر کہا۔'' کل رات جس طرح میرا راستہ روکا گیا تھا وہ حیران کن بات ہے اگر مجھے اپنے استاد کی تعلیم کردہ دعائیں یاد نہ ہوتیں تو کام سے گیا تھا۔ واقعی وہ بہت قوی ہے اس سے نمٹنے میں دانتوں پسینے آ ئیں گے۔''

''بقول آپ کے وہ شیطانی قوت کا حامل ہے اور آپ نوری قوت کا ادراک رکھتے ہیں۔ شیطان کی تو قسمت میں ہی منہ کی کھانا لکھا ہے پھر بھی آپ دلبرداشتہ ہیں؟''

''خبیث ارواح اور شیطانی قوتوں سے ٹکرانے کے لیے بڑی ثابت قدمی درکار ہوتی ہے۔''

"کلام ربانی کے سامنے حقیر طاغوتی قوت کا ذکر کیا۔ آپ اللہ والے ہو کر بھی ہمت ہار رہے ہیں۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اللہ والا ہوں...... خیر! ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ تم سے سانپ نے کیا کہا تھا؟"

"اس کا کہنا تھا کہ وہ نئی زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اسے زندگی کی ضرورت ہے۔ دوسروں کی زندگی لے کر وہ اپنی زندگی بڑھانا چاہتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے علم کے مطابق وہ آدھا کامیاب ہو چکا ہے۔" فقیر بابا بولے۔

"مگر آپ کون ہیں۔ اب تک آپ نے اپنے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔"

"میرے بارے میں آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا۔ ویسے یہ سمجھ لو کہ ہر فرعونِ راموسیٰ است۔ جب جب شیطانی قوتیں سر اُبھارتی ہیں اللہ تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی بندہ مقابلے کے لیے ان کے سامنے آ ہی جاتا ہے۔ شاید اس بار اس کام کے لیے مجھے منتخب کیا گیا ہے۔"

"مگر آپ تو اکیلے ہیں اور وہ تین ہیں ایک سانپ، دوسرا وہ خون کرنے والا، تیسرا شنکر۔"

"چوتھے کو کیوں بھول رہی ہو، بھاسکر جس سے مندر کی سیڑھیوں پر ملاقات ہوتی ہے۔" فقیر بابا نے مسکرا کر کہا اور کھڑے ہو گئے۔ "اچھا تم جاؤ تقریب میں شرکت کرو مگر ہوشیار رہنا، دراصل میرے آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔ اس کی بدبو فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔" فقیر بابا نے انکشاف کیا۔

اجازت ملتے ہی میں لوٹ کر شادی والے گھر آ گئی مگر میرا ذہن الجھا ہوا تھا کہ کہیں وہ شادی کی محفل میں رخنہ نہ ڈال دے۔ پیٹرومیکس روشن تھے۔ محفل عروج پر تھی محبت کے لین دین کی سہانی ساعت معراج پر تھی۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ انتظار کے شجر باز و طویل کر رہے تھے۔ تیکھے نینوں کی تابانی، اُڑتے آنچل کی رنگینی اور مہکتے جسموں کی خوشبو نے آنگن میں جاری محفل کو گرم کر دیا تھا۔ افتخار کے شگوفے کھلاتی الھڑ جوانیاں مسکراتے چہروں کے ساتھ کبھی کبھی جذب میں کھڑی ہو کر کمر مٹکانے لگتیں۔ بنگال کی ثقافت کا یہ حصہ ہے اس لیے خوب واہ واہ ہی ملتی۔ اتنے میں پتا نہیں کہاں سے نور الاسلام آ گیا۔ یہ بھی ایک خاصے کی چیز تھی محلے بھر میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کا گھر ہمارے گھر سے متصل تھا۔ وہ خود کو 'کوبی' یعنی شاعر کہتا اور کھدر کا کرتہ پائجامہ پہن کر مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام کے اسٹائل میں ایک کندھے پر سے چادر گزار کر اوڑھتا۔ خود کو اس دور کا سب سے بڑا شاعر کہتا۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو اتنی بھاری چٹان جیسی گالی دیتا کہ سننے والا اس کے بوجھ تلے دب کر اسے اس کے ابا حضور کے ساتھ ساتھ نذر الاسلام، جسیم الدین، رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی بڑا شاعر تسلیم کر لیتا۔ اسے دیکھ کر لڑکیوں نے شور مچا دیا کہ وہ کوئی اپنا گیت سنائے۔ وہ تو اسی انتظار میں رہتا تھا۔ محفل میں آنے کی وجہ بھی شاید یہی تھی کہ لوگ اس سے گزارش کریں۔ اس کا کہنا تھا کہ جو شخص ہاتھی کی لگام ہی تلاش کرتا رہ جائے وہ کبھی اس پر چڑھ نہیں سکتا بالفاظ دیگر جو خود کو منوا لے وہی من مندر کا دیوتا ہے۔ اس نے پہلے تو "نہ" کیا مگر فوراً راضی بھی ہو گیا اور پھر تان چھیڑ دی۔ لڑکیاں منہ دبا دبا کر ہنسنے لگیں اور وہ پسینے میں شرابور ہوتا رہا جیسے گیت گانے سے محنت طلب کام کوئی اور نہیں ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گرمی میں جمع شدہ فاسد خیالات پسینے کی راہ خارج ہو رہا ہے۔

محفل عروج پر تھی کہ یکا یک اندھیرا چھا گیا۔

آنگن میں جل رہے تمام کے تمام پیٹرومیکس یکا یک بھڑک کر بجھ گئے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔

ایسے میں بچوں کا واویلہ ضروری تھا ہر کوئی اپنی اپنی کہہ رہا تھا۔ کوئی کسی کی سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر نکل آئی باہر بھی اندھیرا تھا۔ کل پانچ پیٹرومیکس جلائے گئے تھے سب کے سب بجھے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ سب کا بجھنا خطرے کی علامت تھی۔ کب کون سا سانحہ گزر جائے اب یہ میرے لیے عجیب بات نہیں تھی۔ فقیر بابا نے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہے۔ یہ کام اس کا بھی ہو سکتا تھا۔

میں اس مقام سے دور ہٹنے لگی۔ کچھ آگے جا کر منشی باڑی کا تالاب تھا۔ میں اس تالاب کے کنارے کنارے چلتی ہوئی گھوم کر گھر کے عقب میں پہنچ گئی۔ پھر وہاں سے ہوتی ہوئی نورالنہار کے گھر کے عقب میں آ گئی۔ یہاں سے ہوتی ہوئی پچھلے دروازے سے میں اس کمرے میں آ گئی جہاں میں سویا کرتی تھی۔ لالٹین جلا کر میں بستر پر لیٹی چترالی اخبار پڑھ رہی تھی۔ ڈھاکا سے دو اردو اخبار نکلتے تھے۔ ایک روزنامہ ''پاسبان'' اور دوسرا ہفت روزہ ''چترالی''۔ اول الذکر میں سیاسی، جرائم اور اسی قسم کی خبریں ہوتیں جبکہ چترالی میں صرف فلمی۔ اس دور میں فلم کا کریز تھا۔ ہر لڑکی کے خواب وحید مراد کے نام سے سجے رہتے۔ جبکہ لڑکوں کا پسندیدہ ہیرو محمد علی اور کمال تھے۔ چترالی بیک وقت اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔ میں دونوں خریدتی، بنگلہ میں ڈھاکا کی بنگلہ فلموں کا تذکرہ زیادہ ہوتا جبکہ اردو میں لاہور اور کراچی کی فلموں کی خبریں ہوتیں۔ جب سے یہ افتاد پڑی تھی میں چترالی خرید نہیں رہی تھی۔ یہ بھی نورالنہار نے لا کر دیا تھا جسے میں لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہی تھی۔

ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ نورالنہار کی کزن آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''محترمہ! ذرا اٹھ کر دروازے تک جائیں کوئی آیا ہے۔''

''کون ہے؟''

''کوئی محترمہ ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں اٹھ کر باہر آئی۔ واقعی باہر ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ایٹی کیٹ کے تحت میں نے بھی ہاتھ بڑھایا اس نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا پتا نہیں اس کے ہاتھ میں ایسا کون سا جادو تھا کہ جیسے ہی میں نے ہاتھ بڑھایا اور اس نے میرے ہاتھ کو تھاما ایک عجیب سی لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے میں، مَیں نہیں رہی وہ ہو گئی۔ اس کے اشارے کی غلام بن گئی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور میں چل پڑی۔

اب آگے آگے وہ تھی اور پیچھے پیچھے میں ہم ایک دوسرے کے آگے پیچھے بڑھتے جا رہے تھے۔ مگر اس کا رخ ادھر نہیں تھا جدھر سے میں آتی جاتی تھی بلکہ وہ تیز تیز قدموں سے سیدھے سیدھے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ یہ راستہ بھی میرا جانا پہچانا تھا۔ اسی راستے کے آخری سرے پر ندی تھی سابھرندی۔ داہنی طرف مڑنے سے شاہ علی بغدادی کا مزار آ رہا تھا۔

وہ پُراسرار عورت مجھے کھینچتی ہوئی اُدھر ہی لے جا رہی تھی اور میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی جیسے اس نے میرے

ذہن ودل کو، ہپناٹائز کر کے مسخر کر لیا ہو۔ میں خاموشی سے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے ساتھ اپنے گھر کے ملبے پر پہنچی۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایسا لگا کہ میں کسی اور دنیا میں آ گئی ہوں۔ اب نہ وہاں ملبہ تھا نہ میرا محلہ۔ یہ جگہ کوئی اور تھی۔ یہ جگہ کسی محل کا اندرونی حصہ تھا جہاں میں ایک غلام گردش میں کھڑی تھی۔ اب وہ عورت بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔

میں بالکل اکیلی کھڑی تھی۔ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کانوں کے پاس آ کر سرگوشی کی ''چلی آؤ آگے اور آگے، یہ جو بڑا سا نقاش دار دروازہ نظر آ رہا ہے اسے دھکا دے کر کھول لو۔ اندر میں تمہارا منتظر ہوں آؤ چلی آؤ۔''

میں کسی معمول کی طرح ادھر بڑھتی چلی گئی لیکن اس کمرے میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ ایک سجا سجایا کمرا تھا۔ ایسی آرائش وزیبائش میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

دیواروں میں جگہ جگہ مشعل نصب تھے مگر ان مشعلوں میں آگ نہ تھی قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے جن سے روشنی نکل رہی تھی۔ اسی روشنی سے کمرا منور تھا۔ فرش پر قالین بچھے تھے۔ ایرانی قالین جن میں پیر دھنس رہے تھے۔ ایک بڑی سی کھڑکی کے نزدیک بڑا سا جہازی سائز کا بیڈ تھا جس پر انتہائی نفیس قسم کی مسہری لگی ہوئی تھی۔ اور اس مسہری کے اندر ایک جوانِ رعنا لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ؟ اف! اتنا حسین کہ نظریں نہ ٹھہریں۔ وہ مجھے پہچانا پہچانا سا لگ رہا تھا مگر اسے کہاں دیکھا ہے یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ وہ مجھے آنکھوں سے اشارہ کر کے قریب آنے کے لیے کہہ رہا تھا میں دو قدم اور آگے بڑھی۔ اس کے قریب پہنچی۔ نزدیک پہنچتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔

اس جوانِ رعنا کا چہرہ جتنا حسین تھا پیر اتنے ہی بدصورت۔ پاجامے سے باہر انتہائی کریہہ صورت سوکھے سوکھے سے پیر جھانک رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گوشت گل چکا ہو اور چمڑا ہڈیوں سے چپک گیا ہو۔

میں کسی معمول کی طرح اس مسہری کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جوانِ رعنا جو اس مسہری پر لیٹا ہے اس کی آنکھوں سے مقناطیسی لہریں نکل رہی ہیں جو مجھے کھینچ رہی ہیں اور میں کچے دھاگے سے بندھی کھنچی چلی جا رہی ہوں لیکن جیسے ہی اس کے قریب پہنچی مجھے جھٹکا سا لگا۔ کراہیت سی محسوس ہوئی۔ اس کا چہرہ جتنا حسین تھا اس کے پیر اتنے ہی بدصورت، سوکھے سوکھے سے اکڑے ہوئے تھے۔ سُوکھے کی بیماری میں مبتلا بچوں کے پیر بھی ایسے نہیں ہوتے ان میں بھی کچھ جاذبیت نظر آتی ہے رونق نظر آتی ہے مگر ان پیروں کو دیکھ کر تو ایک ہی شبیہہ یاد آ رہی تھی۔ بانس کے جھاڑ میں سوکھ گیا بانس۔ اس کے پیر کچھ اس طرح کے تھے جیسے گوشت گل چکا ہو اور چمڑا سوکھ کر ہڈیوں سے چمٹ گیا ہے۔ اسی لیے کراہیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھیر لیں۔ مجھے سر موڑتے دیکھ اس نے کہا۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔''

اس کی آواز سن کر میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ شاید وہ بھی میرے چہرے کی کیفیت سے میری سوچ کا اندازہ لگا چکا تھا اسی لیے بولا۔ ''ہاں میں وہی ہوں اور یہی میری اصل شکل ہے۔''

''تو تم اسی شکل کے تھے؟''

''ہاں تبھی تو اجین نگر کی تمام ناریاں مجھ پر فدا تھیں اور آج بھی میں خود پر فدا ہوں۔ خود کو سکندرِ اعظم سے زیادہ خوش نصیب و کامران سمجھ رہا

ہوں اس لیے کہ میں زندہ ہوں، میری ایک سانس کی بادشاہت ابھی باقی ہے۔‘‘

’’ہوں، تو تم نے خود کو پھر سے زندہ کرلیا ہے؟‘‘

’’زندگی کی قیمت کا ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہے کیونکہ تم زندہ ہو۔ زندگی بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے جن کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ تکلیف نہ دینے لگیں۔ جب تمہاری روح بھی اس جہان کے بیکراں سمندر میں بھٹکے گی تب تمہیں زندگی کی قدروقیمت کا احساس ہوگا۔‘‘

’’مگر تم نے جوانی کیوں پسند کی۔ اس حساب سے تو تمہیں بوڑھا ہونا چاہیے تھا۔ آخر کو عمر کی ریزگاری تو کم ہونا ہے ناں۔‘‘

’’بڑھاپا بھی کسی کو پسند آیا ہے۔ یہ تو عمر کا وہ حصہ ہے جب آدمی ایک ایسے کھنڈر میں رہتا ہے جہاں بھری دوپہر میں چراغاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھا کے سونے کا وقت ہے تو یادوں کے فانوس جگ مگ جگ مگ کرنے لگتے ہیں۔ میں یادوں کی کھلی کھڑکی کو بند کر آیا ہوں۔ پرانی باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیے تو تمہیں اپنا کر ایک نئی زندگی کی شروعات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’جو کہ ناممکن ہے۔‘‘ میں جلدی سے بولی۔

’’یہی سمجھ کا پھیر ہے تم اس بدبخت جاہل بڈھے پر نازاں ہو میں اگر چاہوں تو اسے چٹکیوں میں مسل دوں۔‘‘

’’تو پھر تم اس سے ڈر کیوں رہے ہو مقابلہ کرو۔‘‘

’’میں خود پہل کرنا نہیں چاہتا۔ اسے مقابلے پر آنے تو دو پھر دیکھنا میں کیسے اسے پیروں تلے مسلتا ہوں۔ فی الحال تو اسے مغالطے میں ڈالا ہے کہ میں اس سے کمزور ہوں۔‘‘ اس نے نخوت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

’’کہیں چیونٹی ہاتھی کو نہ الٹ دے۔‘‘

’’وہ مجھے شکست خاک دے گا ابھی تو وہ اس گتھی کو بھی سلجھا نہیں پایا ہے کہ میمن سنگھ والے لڑکے کا راز کیا ہے۔‘‘

’’تم بتاؤ وہ کون ہے۔‘‘

’’میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ مندر کی سیڑھیوں پر اس کے ساتھ بیٹھ کر اقرارِ محبت کرنے والی لڑکی کون ہے، وہ اس سے کیوں ملتی ہے۔‘‘ اس جوانِ رعنا نے جواب دیا۔

’’انسان کی آنکھ جو نہ دکھائے کم ہے۔ دکھانے پر آئے تو شہتیر دکھا دے، نہ دکھانے پر آئے تو آنکھ کا تنکا نہ دکھائے۔ جب میری بھی آنکھیں اس قابل ہو جائیں گی تو میں بھی سب کچھ خود دیکھ لوں گی۔‘‘ میں نے لاپروا انداز میں کہا۔

’’جانتی ہو میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے؟ صرف اس لیے کہ تمہیں بتادوں ابھی مجھے کچھ اور لڑکیوں کا تازہ خون چاہیے۔ پرسوں ٹھیک شام کے وقت تم میرپور سے نکل کر لکھی بازار کی طرف چلی جاؤ۔ وہاں کی پتلی پتلی گلیاں معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔ باقی کا کام میں خود سنبھال لوں گا۔ اب تم جاسکتی ہو۔‘‘

میں ''اچھا'' کہہ کر مڑی تھی کہ بری طرح لڑکھڑا گئی، پہلے جیسا جھٹکا لگا تھا پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیروں تلے کی زمین ہلی ہو۔ سنبھلی تو حیرت زدہ رہ گئی کیونکہ میں نورالنہار کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ شادی کی رونق باہر ہی سے نظر آ رہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی پچھلے دروازے سے اس گھر میں داخل ہوگئی۔ وہی پہلے جیسا ماحول تھا۔ ہر طرف رنگینیوں کی بہار تھی۔ تیکھے نینوں کی تابانی، لہراتے آنچلوں کی رنگینی اور مہکتے جسموں کی خوشبو سے ماحول دمک رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ رنگینی، یہ عروجِ محفل مجھے ذرا بھی پسند نہ آیا اور میں آنگن سے ہوتی ہوئی اگلے حصے کی طرف بڑھی، اُدھر جہاں مردوں کا انتظام تھا۔ ابھی مردانہ حصے میں پہنچی ہی تھی کہ میری توجہ بحث ومباحثہ کی طرف مبذول ہوگئی۔ کئی آدمی ایک ساتھ زور زور سے بول رہے تھے۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں یہ سننے کے لیے میں کچھ اور آگے آ گئی۔ پتا چلا کہ لڑکا نکاح پر راضی نہیں ہے اس کا کہنا ہے کہ اسے ریلیے سائیکل اور تین بینڈ کا ٹرانسیسٹر خرید کر دیا جائے اس زمانے میں ٹی وی، فریج، اے سی جیسی اشیاء عام نہ تھیں۔ یہی دونوں چیزیں قیمتی تحائف میں شمار ہوتے تھے۔ بائیک بھی خال خال نظر آتی تھی جسے ''پھٹپھٹیا'' کہتے تھے۔

میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا جب میں نے ''چھپر کا باجا'' (لاؤڈ اسپیکر) بند پایا۔ ریکارڈنگ رک گئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے ادھر بڑھی۔ میں نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''بس اتنی سی بات یہ لو پیسے، اور ابھی جا کر ٹرانسسٹر اور سائیکل خرید لو۔'' کہہ کر میں نے آنچل میں بندھے، تکیے کے نیچے سے ملنے والے نوٹوں کے بنڈل سے پانچ سو روپے نکال کر دیئے۔

پانچ سو روپے معمولی رقم نہ تھی۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ وہاں موجود ہر شخص کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔

میں نے نوٹ آگے بڑھائے تھے کہ ایک تیز آواز آئی۔ ''ٹھہرو!''

میں نے مڑ کر دیکھا، سرخ ساڑھی میں ملبوس پیشانی سے دونوں آنکھوں کے کونوں تک قوس کی شکل میں صندل سے بنی ننھی ننھی بندیوں کی قطار، ناک میں بڑی سی ''نتھ'' پیشانی کے ذرا دائیں طرف سونے کا بڑا سا ''چھپکا'' گلے میں ''گندھ راج'' پھول کا موٹا سا ہار جس کے درمیان ''جوباکسم'' کے سرخ پھول۔ وہ دلہن کے لباس میں تھی مگر چہرے پر حیا کی لالی نہ تھی، غصے کی سرخی تھی۔ اس نے نئی نویلی دلہن کی طرح شرماتے ہوئے نہیں، سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''میں اس لالچی شخص سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہوں۔''

''مگر...... مگر بیٹی دہلیز پر آئی برات لوٹائی نہیں جاتی۔''

''آپ کو روایت کی پڑی ہے اور میری زندگی کا سوال ہے جو شخص زندگی کے پہلے ہی روز بھیک کے لیے ہاتھ پھیلا دے اس پر میں اعتبار نہیں کر سکتی۔ یہ مرد ہو ہی نہیں سکتا۔ مرد تو وہ ہوتا ہے جو تیشے سے پہاڑ کاٹ کر نہر نکالتا ہے۔ خود اپنی روزی تلاش کرتا ہے نہ کہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ کو چبا کر بولی۔

''ہاں یہ ٹھیک کہتی ہے۔'' میں آگے بڑھ کر نورالنہار کے برابر کھڑی ہوگئی پھر اس کے ابا کو مخاطب کر کے بولی۔ ''خالو! آپ نظریں دوڑائیں اگر آپ کی نظر میں اس سے بہتر کوئی لڑکا ہے؟ خواہ وہ لڑکا کچھ نہ کرتا ہو تو بھی میں اسے اتنا کچھ دوں گی کہ اسے ملازمت کی ضرورت نہ ہوگی مگر شرط یہ ہے کہ لڑکا آپ پسند کریں۔''

''مجھے تو انور پسند ہے اگر اس کے ماں باپ راضی ہوں۔'' نورالنہار کے والد نے جواب دیا۔

میں آگے بڑھی اور انور کے والد سے بولی۔ ''آپ کو لڑکی کے خاندان میں کوئی برائی نظر آتی ہے؟''

''جی نہیں!''

''لڑکی میں!''

''جی نہیں!''

''تو پھر دیر کس بات کی ہے مولوی صاحب موجود ہیں۔''

''مگر.......مگر......''

''اگر مگر کچھ نہیں، سوچیں لڑکا تین مہینے سے ای پی آر ٹی سی (ایسٹ پاکستان روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن) میں کنڈیکٹری کر رہا ہے وہ بھی عارضی طور پر۔ اگر وہ میری سہیلی کو اپنا لے گا تو میں اسے ایک بہت بڑی دکان کرا دوں گی، بیت المکرم میں۔''

بیت المکرم مسجد کے ارد گرد جو دکانیں تھیں وہ شہر کی مہنگی ترین دکانیں تھیں۔ بس یوں سمجھ لیں کراچی کا ڈیفنس ایریا یا کلفٹن۔ ایسی جگہ دکان، کم سے کم 20-25 ہزار روپے میں ملتی تھی اور یہ 20'20 ہزار آج کے 20'25 لاکھ کے برابر تھے۔ انور ہی نہیں انور کا پورا خاندان راضی ہو گیا۔ نکاح کی تیاری شروع ہو گئی۔ مولانا صاحب خطبہ پڑھتے کہ میں نے کہا۔ ''ٹھہریں!''

سب چونک گئے اور حیرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''یہ نقلی دولہا جو سج سنور کر گھر سے آیا تھا کہ سائیکل ریڈیو لے گا پہلے اس کی خاطر داری کر دیں تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں۔ لڑکی والوں کو کمزور سمجھ کر دبانا کہاں کا انصاف ہے؟''

''ابھی لو!'' کئی آوازیں سنائی دیں۔ اچھے کام کے لیے برسوں کوشش کرنا پڑتی ہے جبکہ تخریب کاری کے لیے صرف اشارہ دینا کافی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی جوشیلے نوجوان اٹھے اور انہوں نے اس لڑکے کا سہرا وغیرہ نوچ لیا پھر اس کی وہ درگت بنائی کہ الامان الحفیظ! میں یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتی رہی۔ اس بے چارے بے نیل ومرام لوٹے دولہا سے نمٹ کر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ اس تمام عرصے میں، مَیں خاموش تماشائی بنی کھڑی رہی۔ پھر مبارک سلامت کا شور بلند ہوا اور میں لوٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جانا تھا کیونکہ نورالنہار کی وجہ سے میں یہاں تھی۔ وہ ہی پیا دیس چلی گئی تو اب میں کس کے لیے یہاں رہتی۔ میں نے اس گڈی سے چند نوٹ اپنے لیے رکھے باقی نوٹ انور کے ابو کو دینے کے لیے میں ساتھ لے کر نکل پڑی۔ رخصتی کی رسم ابھی باقی تھی۔ ڈولی لیے کہار کھڑے تھے۔ میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے نزدیک پہنچی اور ان کے ہاتھ پر وہ نوٹ رکھ دیئے۔ کاغذ کے کرارے کرارے ان نوٹوں میں کیسا جادو ہے کہ آنکھوں کی چمک دوچند ہو جاتی ہے۔ میں انہیں خوش ہوتا چھوڑ کر دوبارہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ رات تو آخر یہاں گزارنی تھی صبح ہی کوئی دوسرا آسرا ڈھونڈنا تھا۔

تبھی مجھے ایسا لگا جیسے تھکن جسم سے سفر کرتی ہوئی آنکھوں میں اتر آئی ہے اور میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔

☆=======☆=======☆

وہی ندی کنارے شکستہ حال مندر اور مندر کی سیڑھیاں، اور ان سیڑھیوں پر بیٹھا ایک نوجوان جس کی نظریں پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں اس نوجوان کی آنکھوں میں دیپ جل اٹھے وہ آشا بھری نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں محبت کے ستارے جھلملانے لگے تھے۔ وہ محبت پاش نظروں سے پگڈنڈی پر بڑھتی چلی آ رہی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے سرخ پاڑ (بارڈر) والی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ ایسے چل رہی تھی جیسے نیند کا عالم طاری ہو۔ نوجوان اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بے تابی سے لڑکی کی طرف بڑھا تھا کہ میں چونک اٹھی تھی۔ اس سے پہلے بھی میں نے اس لڑکی کو اسی لڑکے سے ملتے دیکھا تھا مگر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب جو میں چونکی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی شکل ہو بہو مجھ سے مل رہی تھی۔ وہ میری حقیقی کاپی تھی۔ آج کی زبان میں یوں سمجھ لیں کہ وہ میری فوٹو اسٹیٹ تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے چلی آ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہا مگر میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکی ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے پیروں میں گوند لگ گیا ہو، پیر زمین سے چپک گئے ہوں۔

وہ لڑکی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں بغور اسے دیکھ رہی تھی کہ وہ بالکل نیند کی حالت میں چلنے والی لڑکی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لڑکے کے نزدیک پہنچی پھر وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔ اس نے لڑکے کے شانے سے سر ٹکا دیا تھا اور لڑکا پیار بھرے انداز میں اسے تھپکی دے رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''تم نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں جب بھی پوچھتا ہوں تم ٹال جاتی ہو۔ بھگوان کے لیے اپنا پریچے دو ناں! کہ تم کون ہو، کس کی بیٹی ہو، تمہارا گھر کون سا ہے۔''

''جب تم ضد پر آمادہ ہو تو سنو!'' لڑکی نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا پھر بولی۔ ''زندگی کیا ہے، ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ حالات کی موجیں کبھی اوپر اٹھاتی ہیں تو کبھی نیچے پٹکتی ہیں۔ کبھی یہ زندگی مخملی سیج نظر آتی ہے تو کبھی کانٹوں بھری راہ گزر کہ ہر قدم لہولہان ہو جائیں۔ میری زندگی بھی کانٹوں بھری راہ گزر ہے اگر پاؤں کے چھالے تنگ نہ کریں تبھی میری طرف بڑھنا۔''

لڑکی کی باتیں سن کر نوجوان مسکرا دیا پھر بولا۔ تم تو ''ساہتک'' (ادیب) ہو۔ ایسی کومل، پیاری اور دل کو چھو لینے والی بھاشا بولتی ہو۔ تم بولتی رہو تمہارے ہر سوال کا جواب ہاں میں دوں گا۔''

''سنو!'' لڑکی بولی۔ ''میں نے آج تک ایک پل بھی سکھ بھری سانس نہیں لی ہے کیونکہ میں نے کسی راجے مہاراجے کے گھر میں آنکھ نہیں کھولی ہے۔ ایک مفلوک الحال گھرانے میں پیدا ہوئی ہوں۔''

''میں بھی منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوا ہوں۔ ایک غریب گھر میں جنم لیا ہے۔''

''اوپر تلے میری پانچ بہنیں تھیں۔ میں چوتھے نمبر پر تھی۔ گھر میں زیادہ تر فاقے ہوا کرتے تھے مگر میں اس میں بھی مطمئن تھی۔ قسمت کا لکھا سمجھتی تھی۔ اپنی پوری زندگی میں گنتی کے چند دن خوشی کے گزارے ہیں۔''

''میں نے بھی تنگی ترشی میں زندگی گزاری ہے اب بس یہی امید ہے کہ کسی طرح بی اے کر لوں تو کہیں اچھی سی نوکری مل جائے گی۔''

''مجھے بھگوان نے خالی جھولی بھیجا ہے پھر بھی میں قناعت پسند بنی ہوئی ہوں۔ ہر حال میں خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''میرا بھی یہی عالم ہے۔''

''مجھے بھگوان نے صرف روپ کی دولت دی ہے۔ تبھی تو میری سہیلیاں کہتی ہیں۔''ہائے اللہ! تجھے دیکھ کر ہول آتا ہے۔ یہ من موہنی صورت، خاموش آنکھیں، رسیلے ہونٹ جن پر یوں لگتا ہے جیسے آہ مچل رہی ہے۔ کیسے گزارے گی تُو زندگی۔ اللہ میاں کی گائے ہے تُو! نہ بولنا جانے نہ نخرے دکھانا کیسے کرے گی میاں کو قابو...... کوئی تیز سا مل گیا تو اٹھا پٹخ میں برابر کر دے گا...... اور تو جان سے چلی جائے گی مگر منہ سے کچھ نہ بولے گی۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں میرا ہاتھ تھام لو میں پلکوں پر بٹھائے رکھوں گا۔''

میری سب سے پیاری سہیلی نورالنہار سہیلیوں کی باتوں پر جل کر کہتی۔''اے ہے! تم لوگوں کے منہ میں خاک، ایسا تو نہ کہو، اللہ میاں نے شکل دی ہے اتنی پیاری شکل، تاروں کے جھرمٹ کا چاند سمجھو اونچے سے اونچے گھر میں سجے گی۔ راج کرے گی راج!''

''میں تمہیں واقعی راج کراؤں گا۔ میرے دل کے سنگھاسن (تخت) پر آ کر دیکھو۔''

میں حیران حیران سی مندر کی سیڑھی پر بیٹھے ان دونوں لڑکی لڑکے کی باتیں سن رہی تھی۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس لڑکی کی نہ صرف شکل بلکہ حالات بھی میرے جیسے تھے۔ وہی باتیں وہ بتا رہی تھی جو کبھی سہیلیوں نے مجھ سے کہی تھی۔ آخر اس میں راز کیا ہے۔ یہ لڑکی کون ہے۔ ہاں لڑکا جانا پہچانا تھا۔ میری سہیلی کا کزن تھا اور میمن سنگھ سے پڑھنے کے لیے ڈھاکا آیا ہوا تھا۔

لڑکی اب اٹھ کر جا رہی تھی اس کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔ وہ اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ چلی گئی۔ لڑکا بھی اٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب میں تھی اور وہی ویران پگڈنڈی، شکستہ حال مندر، میں بھی وہاں سے لوٹ چلی مگر یہ کیا؟ میں تو اسی کمرے میں نورالنہار کے گھر میں تھی۔ باہر شادی کا ہنگامہ جاری و ساری تھا۔ یہ کیسا گورکھ دھندہ تھا جو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں گھر میں تھی تو کیا وہ سب کچھ خواب تھا مگر یہ کیسا خواب تھا کہ وہ لڑکا میری سہیلی کا بھائی تھا اور میری سہیلی نے بہت پہلے بتایا تھا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے مندر کی سیڑھیوں پر آتی ہے۔

میں جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی جا رہی تھی۔ سوچتے سوچتے میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆======☆======☆

''اٹھو بیٹی!'' نورالنہار کی ماں نے پکارا تو میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ شادی کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا۔ نورالنہار رخصت ہو چکی تھی۔ بکھرا ہوا گھر رات کی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر ہینڈ پمپ پر منہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کے لیے باورچی خانہ میں جا کر بیٹھ گئی۔

بغیر مانگے، اپنی مرضی سے میں نے انور کے باپ کو مٹھی بھر روپے دے دیئے تھے۔ اس کا بدلہ تو مجھے ملنا ہی تھا۔ سب کی نظروں میں، مَیں اہمیت اختیار کر چکی تھی۔ وی آئی پی ٹریٹمنٹ ہو رہا تھا۔ سب مجھے سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ کاغذ کے یہ معمولی ٹکڑے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چند روپوں سے لوگوں کی ہمدردی خریدی جا سکتی ہیں۔ میرے سامنے چیوڑا اور گڑ کی رکابی رکھتے ہوئے نورالنہار کی ماں نے کہا۔ ''بیٹی! تُو نے اتنے سارے پیسے انور کو دے دیئے پھر نہار کے ابا کو بھی دیئے اب تُو کیا کرے گی؟''

''اللہ مالک ہے!'' میں نے بے فکری سے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کو بھی کچھ چاہیے؟''

''تُو تو جانتی ہے شادی کے لیے کس کس سے ادھار نہیں لیا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں سب کا ادھار میں چکتا کر دوں گی۔ میرے پاس ابھی اور روپے ہیں'' حالانکہ میرے پاس گنتی کے روپے باقی بچے تھے۔

''اچھا! تو کیا تم اور روپے دو گی؟''

''ہاں ہاں میں اس گھر کے حالات بدلنا چاہتی ہوں۔'' کہہ کر میں ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آ گئی۔ باہر آ کر میں نے سوچا انور کے گھر میں ''رسم'' ہو رہی ہوگی چلو چل کر دیکھ آتے ہیں۔ ایک ہی محلے کی بات ہے۔ ویسے بھی میں کوئی نورالنہار کی سگی تو ہوں نہیں۔ محلے والے تو دونوں طرف جاتے ہیں کہ محلے کی بیٹی سب کی ساجھی۔ میں یہی کچھ سوچتی ہوئی انور کی گلی میں داخل ہو گئی۔ اس کے گھر پر لٹکتا ہوا ٹاٹ کا پردا اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔ اس زمانے میں ہر گھر پر ٹاٹ کا پردہ لٹکانا لوگ ضروری سمجھتے تھے کیونکہ ٹاٹ بھاری ہوتا تھا اور ہوا سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا۔

آنگن میں بچھی چوٹی پر رسم ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انور کی ماں نے جلدی سے ایک مونڈھا لا کر دیا میں اس پر بیٹھ گئی۔ نورالنہار سرخ ساڑھی میں ملبوس گلے میں ''جویا کسم'' کے سرخ پھولوں کا ہار ڈالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے اس کی نند ایک پیتل کی تھال میں آٹے کا چراغ لیے کھڑی تھی۔ روئی کے فلیتے کو گھی کے ذریعہ روشن رکھا گیا تھا۔ اس تھال میں پان کا پتا اور مٹھی بھر چینی تھی۔ سہاگنیں آگے آتیں اور پان کے پتے کو ہلکا چراغ پر گرم کر کے نورالنہار کے گال پر لگاتیں۔ ساتھ ہی ساتھ سوال و جواب بھی چل رہے تھے۔ نند پوچھتی۔ ''اے بہن کیا کر رہی ہو؟''

گال سینکنے والی جواب دیتی۔ ''دلہن کا منہ سینک رہی ہوں تا کہ بولے کم۔''

شادی بیاہ کی رسمیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بات ہی بات میں بہت کچھ جتا دیتی ہیں۔ بہو اور ساس کا بیر تو ازل سے قائم ہے اسی کا یہ توڑ ہے جبکہ ہوتا وہی ہے جو ہوتا آیا ہے۔ ہر بہو سسرال میں پرانی ہوتے ہی بولنا کیا چیخنا شروع کر دیتی ہے۔

''خالہ آگے آیئے آخری رسم ادا کر دیجئے۔''

ایک لڑکی نے مسالہ پیسنے والی سل پر رکھا بٹا اٹھا کر کہا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ یہ بھی رسم خوب ہے نئی دلہن کے ہونٹوں پر تین بار بٹے کو آہستہ آہستہ مار کر ساس کہتی ہے۔ ''خبردار جو ایک لفظ بولی، تیرا منہ میں نے کچلا۔''

حالانکہ ساس منہ کیا کچلے گی بعد میں بہو صاحبہ ہی ساس کا منہ کچلتی ہے کیونکہ مستقبل میں یہی کچھ ان کے ساتھ بھی ان کی بہو کو کرنا ہے۔ مجھ سے ہنسی ضبط نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے ہاتھوں میں تھام رکھی پیالی کی چائے کو جلدی جلدی حلق میں انڈیلا اور اجازت لے کر باہر نکل آئی۔

میں کہاں جاؤں گلی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی کہ رات والی بات یاد آ گئی۔ میں نے سوچا چلو ایک نظر اس ویران مندر کی سیڑھیوں کو دیکھ آؤں، کیا واقعی وہاں وہ لڑکی اور لڑکا ملتے ہیں یا یہ سب کچھ میرا واہمہ ہے۔ جو میں خواب میں دیکھتی ہوں۔ یہی سوچ کر میں تیز تیز قدموں سے مندر کی طرف بڑھنے لگی۔

مندر والی پگڈنڈی پر پہنچ کر میں نے مندر کی سیڑھیوں پر نظر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے اوپر چڑھنے لگی۔ ٹھیک اس جگہ پہنچتے ہی میرے قدم رک گئے جہاں پر ان دونوں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ سیڑھیوں پر ٹھیک اسی جگہ جہاں لڑکی بیٹھی تھی ایک چاندی کا چھلہ گرا ہوا تھا جواب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب مجھے یاد آنے لگا کہ وہ لڑکا لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے لڑکی کی انگلی میں پڑے چھلے کو بار بار گھما رہا تھا۔ کہیں وہ لڑکی میں ہی تو نہیں ہوں؟ یہ خیال میرے ہوش اڑانے کو کافی تھا۔ یہ کیسا چکر ہے میں اس لڑکے کے پاس کیوں آتی ہوں؟ وہ سب خواب نہیں حقیقت ہے جسے میرا تحت الشعور دکھا رہا ہے۔ میں اس گورکھ دھندے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

تبھی مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عورت کو اتنا ذکی حس تو بنایا ہی ہے کہ اس کا ہر موئے تن آنکھیں بن گئی ہیں۔ مرد کسی بھی رخ سے اسے دیکھے عورت کو فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ مندر کے برآمدے میں کھڑا بوڑھا پجاری مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس اجاڑ بیابان میں جہاں ہر طرف ویرانی کا ڈیرا ہے کسی اکیلی لڑکی کا وہ بھی مسلمان لڑکی کا آنا شک وشبہ کی بنیاد ہے اسی لیے میں فوراً سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

محلے میں داخل ہوئی تو اشرف چاچا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ ابو کے دوست تھے، محفلِ سماع کے شوقین۔ اردو بڑی اچھی بولتے تھے بقول ابو، وہ جمنا میں دھلی قلعہ معلٰی کی زبان بولتے ہیں، محاورہ اور روزمرہ اوڑھنا بچھونا ہے۔ دہلی سے بنگال آ کر انہوں نے اردو کی ترویج کے لیے بہت کام کیا ہے مگر میرے خیال میں اوڑھنے اور بچھونے کی سیٹنگ بدل گئی ہے۔

بچھانے کی چیز کو اوڑھتے ہیں اور اوڑھنے کی چیز کو بستر صلائے عام بناتے ہیں جس کی وجہ سے ہر کسی کی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”بیٹی! کہاں سے آ رہی ہو؟“

میں سچ بول نہیں سکتی تھی اس لیے بہانہ کیا۔

”بس یوں ہی ٹہل رہی تھی۔ کل رات نورالنہار کی شادی کا ہنگامہ تھا ناں!“

”ہاں بھئی میں نے سنا تم نے انور کو بیت المکرّم میں دکان خریدنے کے لیے رقم دی ہے۔“

”میرے پاس کچھ پیسے پڑے ہوئے تھے سوچا کہ کسی کا بھلا ہو جائے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے دیکھو میں نے اسلام پور روڈ کی دو دکانیں الاٹ کرا رکھی ہیں پھر بھی کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ ایک آدھ دکان اور بھی مل جائے۔ ارے بھئی روپے سے روپوں کو کھینچا جاتا ہے۔ اڑانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔“

وہ مجھ سے ایسے بول رہے تھے جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں ہوں۔ وہ دونوں دکانیں ہندوؤں کی متروکہ جائیداد تھیں۔ یہ سچ ہے کہ بھارت سے لٹ لٹا کر آنے والوں کو حکومت متروکہ جائداد سے حصہ دے رہی تھی مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ محکمہ سے رجوع کیا جائے اور وہ جگہ فراہم کرے، یہی ہو رہا تھا۔ مگر اشرف چاچا تھے تو دہلی والے مگر عرصے سے کلکتہ میں مقیم تھے اور جب کلکتہ میں فسادات کی لہر اٹھی تو یہ وہاں سے اپنی دکان تو

لا نہ سکے دکان کا ایک کلو وزنی علی گڑھی تالہ ضرور لے آئے۔ کسی نے ان سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ کیا واقعی یہ آپ کی دکان کا تالہ ہے یا مالِ مسروقہ۔ بات جو بھی ہو ڈھا کا پہنچتے ہی انہوں نے اسلام پورہ سے پٹواٹولی تک سروے کیا اور دو دکانوں پر ''جائداد متروکہ'' کی پلیٹ لگی دیکھ اپنے وزنی تالہ سے حملہ کر بیٹھے۔ دروازے کے زنگ آلود تالے پر اپنے ''علیگ'' تالے کی ایک ایک ضرب سے دکان میں اپنی ملکیت بلامنت سرکار بنالی یعنی اول الذکر کو ثانی الذکر پر مار کر آخر الذکر کا قبضہ لے لیا۔

سنتے ہیں کلکتہ میں جب رہتے تھے تو خوب ناچ گانے دیکھتے تھے۔ ''بہو بازار'' کی شام انہی کی مرہونِ منت تھی مگر ڈھا کا آنے کے بعد انہوں نے ناچ گانا اور سینما دیکھنا چھوڑ دیا۔ اپنے پیسوں سے دوستوں پر رعب ڈال کر سینما دکھلانے کا حکم صادر کرتے رہتے تھے۔ اپنے پیسوں سے صرف محفلِ سماع میں آنے کی تکلیف گوارہ کرتے تھے۔ بیگم سینما دیکھنے کی عادت سے نالاں تھی۔ ہمیشہ طعنہ دیتی کہ اولاد جوان ہوگئی ہے۔ اب تو یہ دھندے بند کردو۔ جواب میں موصوف فرماتے کہ بیگم تم نے بھی خوب کہا جوان ہوئی وہ ہیں اور نیک چلنی کی ہدایت مجھے کر رہی ہو۔ اپنے بچوں کو سنبھالو۔

ایسے شخص کی زبان سے ہدایت نامہ سن کر ہی میں سمجھ گئی کہ موصوف بھی کچھ اینٹھنے کے چکر میں ہیں اسی لیے زبان میں رس گلے کی شیرینی کا بہاؤ بنائے ہوئے ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کو بھی جب ضرورت پڑے مجھ سے مانگ لیجئے گا۔''

''نہیں بیٹا میں اتنا بھی گرا ہوا نہیں ہوں کہ بیٹی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ ہاں اگر اتنا ہی بضد ہو تو ایسا کرنا اپنی چچی کو رقیہ کے جہیز کے لیے کچھ دے دینا۔ یہی کوئی جڑاؤ ہار کوئی کنگن وغیرہ۔''

''کنگن تو میرے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ تو میں بغیر مانگے دوں گی۔ پورے دس تولے کا کنگن ہے جس میں زمرد بھی ٹکا ہوا ہے۔'' کہہ کر میں آگے بڑھ گئی کہ کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے چونک کر دیکھا اور غیر ارادی طور پر ہاتھ چھڑانے کے لیے جھٹکا مارا لیکن فوراً ہی ذہن سے خطرے کا احساس ختم ہوگیا۔

میرے برابر میں وہی بابا کھڑے تھے۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا پہنے اور ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھائی لکڑی تھامے۔ ان سے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے مطمئن ہوگئی تھی۔

''ذرا تیز تیز چل، آبادی سے باہر جانا چاہتا ہوں۔'' بابا بولے۔

''خیریت! کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟'' میں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔

''یہ سب تیری وجہ سے ہے۔ تُو بیوقوفی پر بیوقوفی کیے جا رہی ہے۔ کیوں موت کو آواز دے رہی ہے۔ زندہ رہنا بڑی بات نہیں ہے۔ ایک کتا بھی زندہ رہتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی زندگی کا ایک نصب العین ہے۔ اپنے راستے سے مت بھٹک۔ گناہ کی گٹھڑی اٹھا نہ پائے گی۔'' بابا نے تیز لہجے میں کہا۔

''مگر ہوا کیا ہے۔ میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''بیوقوف لڑکی، ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی ہے۔ تُو نے عاقبت خراب کر لی ہے اب بھی توبہ کا وقت ہے، توبہ کر توبہ!''

''بابا میں سمجھ نہیں پائی آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

''تُو نے ایک عفریت کو جگا دیا ہے اور اب اسے زندگی دے رہی ہے۔''

''آپ اسے روکیں ناں، میں تو مجبور ہوں۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رکھتی۔''

''کھانا کھانا جانتی ہے ناں؟ کھاتے وقت نادانی کہاں جاتی ہے۔'' بابا واقعی بہت غصے میں تھے۔

''اے تُو اسے کیا بہکا رہا ہے۔ مرد ہے تو مجھ سے مقابلہ کر۔'' ایک آواز آئی اور میں نے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ بابا اور نہ آواز دینے والا۔ میں حیران رہ گئی۔ یہ دوسری بار ایسا ہوا تھا۔ بابا اللہ والے نظر آتے تھے پھر اپنے مقابل سے ڈر کیوں جاتے ہیں، کیا وہ کمزور ہیں؟ کیا وہ بوڑھا جسے میں سانپ کی شکل میں دیکھ چکی ہوں وہ زیادہ طاقتور ہے؟ میں یہی کچھ سوچتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرا سر چکرانے لگا ہو۔ قدم لڑکھڑانے لگے ہوں۔ ابھی بمشکل ایک فرلانگ طے کیا تھا کہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا لیکن یہ دورانیہ بہت کم ثابت ہوا۔ لیکن لمحہ بھر میں مقام بدل چکا تھا۔ میں اسی محل میں کھڑی تھی جہاں اس سے پہلے بھی آ چکی تھی۔ سامنے وہی کمرا تھا جس میں ایک حسین شخص کو بستر پر لیٹا دیکھ چکی تھی۔ جس کے پیر سوکھے بانس جیسے تھے۔ میں بلا جھجک اسی کمرے میں داخل ہو گئی بالکل وہی منظر تھا۔ مسہری پر وہی جوانِ رعنا لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی، اس نے کہا۔ ''میں نے تمہیں دوبارہ اس لیے بلایا ہے کہ تم مجھے اچھی طرح اصل حیثیت میں دیکھ لو۔ میں اپنی پوری رعنائی، مکمل حسین سراپا کے ساتھ تمہارے سامنے آنے والا ہوں۔ تاکہ تم اس بڈھے کی باتوں میں نہ آسکو آؤ یہیں، اسی مسہری پر بیٹھ جاؤ۔''

میں کسی معمول کی طرح آگے بڑھ کر اس کی مسہری پر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی میری نگاہوں کے آگے کا منظر بدل گیا۔ میں نے خود کو ایک لق و دق صحرا میں کھڑے پایا۔ جہاں چاروں طرف دبیز تاریکی پھیلی ہوئی ہے اور بیکراں سناٹے کا راج ہے۔ یکا یک دور افق پر روشنی کا ایک نقطہ سا ابھرتا ہے پھر وہ نقطہ واضح اور نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ پُر اسرار روشنی تیزی سے میری جانب بڑھتی ہے اور قریب آ کر کچھ فاصلے پر ٹھہر جاتی ہے۔ تیز روشنی سے میری نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں اور جب دوبارہ اسی طرف دیکھتی ہوں تو رنگ برنگی روشنیوں کے جلو میں ایک مرصع تخت نظر آتا ہے جس سے نظر نواز شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ تخت پر ایک جوانِ رعنا متمکن ہے اس کے جسم سے نور کی کرنیں سی پھوٹ رہی ہیں۔ وہ قدیم شہزادوں کے لباس میں آراستہ ہے۔ گلے میں ہیرے موتی کے ہار ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں سرخ اور تازہ گلابوں کے ہار تھام رکھے ہیں۔ یکا یک وہ جوان تخت سے نیچے اترتا ہے اور بارعب انداز میں قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھتا ہے۔ میں بھی بے اختیاری میں اس کی طرف بڑھتی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ ایک انداز سے پھولوں کی مالا میرے گلے میں ڈال دیتا ہے پھر کہتا ہے۔ ''یہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے کہ لڑکی لڑکے ایک دوسرے کو جیون ساتھی بنانے کے لیے ایک دوسرے کے گلے میں ''ورمالا'' ڈالتے ہیں۔ میں نے بھی تمہیں چن لیا ہے۔ میرا انتخاب تم ہو۔'' پھر ہم دونوں تخت پر بیٹھ کر راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ وقفہ کافی طویل تھا پھر وہ میری پیشانی پر الوداعی بوسہ دیتا ہے اور اس کا تخت پھر سے ہوا میں بلند ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور میں چونک اٹھتی ہوں۔ اطراف پر نظر ڈالتی ہوں۔ وہی کمرا تھا، وہی مسہری تھی اور وہی سوکھی ٹانگوں والا نوجوان تھا۔

میں نے چونک کر اپنے سینے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اچھل پڑی۔ میرے گلے میں سرخ اور تازہ گلابوں کی مالا موجود تھی۔ مجھ پر

حیرت کا شدید دورہ پڑا۔ میں سوچنے لگی کہ وہ خواب تھا یا حقیقت؟

تب اسی لمحے اس نوجوان کی سرسراتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''تم نے مجھے دیکھ لیا، میرا تحفہ ابھی تک تمہارے گلے میں ہے۔ وہ میرے شباب کا تصوراتی پیکر تھا۔ کچھ دنوں کے بعد تم مجھے مجسم دیکھ سکو گی جب کنواری لڑکی کے خون سے آخری اشنان ہوگا اور میں دوبارہ حسن وجوانی کا مالک بن جاؤں گا۔ کیا تم نے مجھ سے زیادہ حسین نوجوان رُوئے زمین پر کہیں دیکھا ہے۔''

وہ صحیح کہہ رہا تھا کیونکہ وہ واقعی حسن وجمال میں یکتا تھا۔ وہ ایسا جاذبِ نظر تھا کہ تعریف وتوصیف کے تمام الفاظ اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ گویا سارے جہاں کا حسن ایک اس کی ذات میں سمٹ آیا ہو اور دنیا کی کوئی شے اس کی ہمسری اور برابری کا دعویٰ نہ کر سکتی ہو۔

''میں نے تمہیں یہی دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ اب تم اچھی طرح سن لو کہ تمہیں میں نے پسند کر لیا ہے۔ تم میری ہو میری رہو گی میرے علاوہ تمہاری زندگی میں کوئی اور نہیں آئے گا اس لیے میرا انتظار کرو۔''

''ایسا ناممکن ہے، میں نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا ہے اور تم...... تم پتا نہیں کیا ہو، میں تمہیں کیسے اپنا لوں؟'' میں نے کورا جواب دیا۔

''آج تک یہی ہوتا آیا ہے۔ میرا یہ بدہیت چہرہ اور بوسیدہ جسم جو تم دیکھ رہی ہو کسی وقت حسن وجمال کا مرقع تھا۔ اس کریہہ المنظر اور بدبودار جسم سے خوشبو کی لپٹیں نکلا کرتی تھیں۔ یہ وہی جسم ہے جس کے سامنے بڑی بڑی مغرور حسینائیں سر جھکا دیا کرتی تھیں اور ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین رہتی تھیں۔ غرض میری جوانی کا چرچا عام تھا اور میری پرستار مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتی تھیں بلکہ میری پوجا کرتی تھیں لیکن دنیا میں سب ہی کچھ ممکن نہیں ہوتا ہے۔ وقت کی رفتار کو کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ وقت جوں جوں آگے بڑھتا ہے ہر شے پر اپنے اثرات مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرا حسن بھی متاثر ہونے لگا۔ چہرے کے نقوش بگڑنے لگے۔ جسم ڈھیلا بھدا اور بدوضع ہو گیا اور حسن ودلکشی معدوم ہوتی چلی گئی۔ مجھے اپنے حسن وشباب کے زوال کا بڑا قلق تھا۔ میں سدا خوبصورت اور پُرشباب رہنا چاہتا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ لوگ مجھے ہمیشہ اسی طرح پوجتے رہیں۔ میں سدا کنواریوں کے دلوں پر حکمرانی کروں مگر اس کے برعکس ہوا۔ غلط کاریوں کے نتیجے میں بڑھاپا تیزی سے میرے جسم پر محیط ہونے لگا۔ اب میرا چاہنے والا کوئی نہ تھا۔ میری کسی کو خواہش نہ تھی۔ میں ایک فضول اور بے مصرف شے بن کر رہ گیا تھا۔ اب کوئی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔''

وہ کچھ دیر کے لیے رکا پھر اس نے اپنی سانس درست کی اور گویا ہوا۔ ''جیسے جیسے میری عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ دوبارہ جوان بننے کی خواہش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہرچند کے میری عمر نوے برس ہو چکی تھی۔ تمام جسم بدنما جھریوں سے ڈھک گیا تھا۔ پلکیں اور بھنویں تک سفید ہو گئی تھیں لیکن میرے جذبات واحساسات اور خواہشات میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ میرے احساسات بدستور جوان تھے اور ان کی تسکین کے لیے دل مچلتا تھا لیکن کون سرپھری مجھ ایسے بڈھے کی طرف راغب ہوتی۔ ان ہی دنوں میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو مجھ سے بھی بڑا گیانی تھا۔ مجھ سے زیادہ پُراسرار علوم کا علم رکھتا تھا۔ اس کے قبضے میں شیطانی ارواح بھی تھیں اس نے مجھے بتایا کہ اگر میں خبیث طاقتوں کی پوجا کروں اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو پُراسرار قوتوں کا مالک بن جاؤں گا اور میری سدا جوان رہنے کی خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ میں تو خود اسی

جستجو میں تھا۔ میں نے تپسیا کی، اندر کی، نارد کی، شنکر کی، مہا کالی کی، بھیرو کی، غلیظ سے غلیظ دیوتا کی بھی پوجا کی، ارادھنا کی، آخر کار مجھے شکتی مل گئی۔ میں اپنی کڑی تپسیا کے باعث ان کا منظورِ نظر بن چکا تھا اور میری قوتوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے بے شمار جاپ کیے اور بڑی کٹھنائیاں جھیلیں۔ آخر طویل تپسیا کے بعد مجھ پر بھید کھلا کہ اگر میں کنواری لڑکیوں کے خون سے غسل کروں تو جوانی لوٹ آئے گی۔ میں سوچ بچار کرنے لگا پھر خود پر گہری نیند طاری کر لی تا کہ آنے والے وقت میں چاق و چوبند رہوں۔ ابھی نیند کو ڈھائی تین سو سال ہی ہوئے تھے کہ تیرے باپ نے اٹھا دیا اگر تُو مجھے پسند نہ آ گئی ہوتی تو میں خود اسے مار کر اس کی روح کو اپنے قبضے میں لے لیتا۔''

''اب کیا کرنا چاہتے ہو، ابا تو زندہ نہیں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔''

''اور یہ ناممکن ہے۔''

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں عظیم قوتوں کا مالک ہوں، میں اشارہ کر دوں تو یہ پہاڑ پھٹ پڑے اور آگ کی بارش ہونے لگے مگر میرے نزدیک یہ سب معمولی شعبدے ہیں۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''ابھی تم نے میری قوت دیکھی نہیں ہے ناں۔ جب دیکھو گی تو خود پاگل ہوا ٹھو گی۔ خود سے آگے بڑھ کر میرے گلے میں ''ور مالا'' ڈال کر اپنا جیون ساتھی بنا لو گی کیونکہ اس طرح تم بھی اعلیٰ حیثیت کی حامل بن جاؤ گی۔''

''مجھے کوئی حیثیت نہیں چاہیے۔ میں جانا چاہتی ہوں۔ مجھے راستہ دو۔''

''یہی بات میں خود بھی کہنا چاہتا تھا۔ اس وقت تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ کل رات میں ضرورت پڑے گی کیونکہ میں تمہارے جسم کے ذریعہ شکار کھیلوں گا۔''

''یعنی کسی بے گناہ لڑکی کا خون بہاؤ گے؟''

''یہی ہوتا آیا ہے۔ صدیوں سے یہی ہو رہا ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھانے پر مجبور ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو بازار میں کھڑا سپاہی ریڑھی والے کو نہیں بخشتا۔ غریب ریڑھی والا آنکھ بچا کر ایک سیر سیب میں دو داغدار سیب ملا کر نقصان پورا کرتا ہے۔ ترازو میں ایک چھٹانک کا پھیر لگا رکھا ہے کیونکہ ایک من کم تولنے کی گنجائش نہیں۔ ماسٹر بقا اللہ زمانے بھر کو گالیاں دیتا ہے عزت نہ کرنے والوں کی ہجو کرتا ہے اور امتحان میں پاس کرانے کے پورے دو سو روپے لیتا ہے۔ ظلم کا پہیہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا ہے جو اس کے ساتھ ہوا ہے۔ اژدہا سالم نگلتا ہے، شارک دانتوں سے خونم خون کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹری اصول کے مطابق چبا چبا کر کھاتا ہے۔ پسو، کھٹمل، مچھر سب حسب مقدور و مقدار خون کی چسکی لگاتے ہیں۔ کوئی کسی کو بخشتا نہیں۔ سیٹھ ساہوکار انکم ٹیکس کے ڈبل کھاتے بنا کر رکھتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ میں کوئی نئی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

بات صحیح تھی میں اس سے بحث کرنا بھی نہیں چاہتی تھی اس لیے واپسی کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے سے گلیارے میں آئی تبھی میرا سر چکرایا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے جھٹکے سے پیروں تلے کی زمین کھینچ لی ہو۔ میں لڑکھڑائی پھر جب سنبھلی تو اپنے محلے میں کھڑی تھی۔ میرے قدم

آہستہ آہستہ نورالنہار کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ ابھی میں نورالنہار والی گلی میں داخل ہی ہوئی تھی کہ اشرف چاچا نظر آ گئے۔ بڑے تپاک سے آگے بڑھے نزدیک پہنچتے کہ چھپاک کی آواز آئی۔ وہ مین ہول میں جا لیٹے تھے۔ دراصل میونسپل کمیٹی والے مین ہول بناتے وقت دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ ہمیشہ کھلا رہے تاکہ ڈھکنا دیکھ کر چوروں کا تجسس جاگ نہ اٹھے کہ ڈھکنے کے پیچھے کیا ہے ڈھکنے کے پیچھے...... دوئم دہانہ اتنا چوڑا ہو کہ سائیکل چلانے والا اس میں اندر تک بغیر کسی رکاوٹ کے چلا جائے۔ آسانی کے ساتھ تیز رفتاری کے ساتھ سائیکل پر بیٹھتی سواری کے ساتھ۔ چاچا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ مسلم ان کی ذاتِ شریف اندر تشریف لے جا چکی تھی اور اب وہ ٹانگیں کاندھوں پر رکھے بَین کر رہے تھے۔ اندر اتنی جگہ نہ تھی کہ پیر کو اپنے کاندھے سے اتار کر سیدھا کر لیتے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بس جھک کر پھٹی آنکھوں سے مین ہول میں دیکھتی رہی اور اندر سے چاچا چیختے چلاتے، مدد کے لیے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے۔ یہ تو ان کی قسمت تھی کہ اسی وقت ایک لڑکا گلی میں داخل ہوا۔ میں نے اسے آواز دے کر روکا پھر ساری صورتِ حال بتا کر مدد کے لیے کہا۔ اس نے مین ہول کے اندر جھانکا پھر اپنے کندھے سے گمچھا (بڑا رومال) اتار کر اندر لٹکا دیا۔ چاچا نے اسے پکڑ لیا اور لڑکے نے انہیں کھینچ کر باہر نکال لیا۔

کیچڑ سے سنے کپڑوں پر نظر ڈال کر وہ بولے۔ ''تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی مگر اب نہیں پھر کسی وقت۔''

''ابھی کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت میرے کپڑے اس قابل نہیں ہیں۔ بدبو سے خود میری ناک پھٹی جا رہی ہے۔'' کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگے۔

پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا تھا کہ کسی نے انہیں بزورِ قوت روک دیا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس سے انہیں روک دینے کے لیے ہی گٹر بہانہ بنا ہے۔ میں سوچ کر گرداب میں ڈوبتی ابھرتی آہستہ آہستہ اپنی راہ چلنے لگی۔ کچھ آگے جا کر میں نورالنہار کے گھر کی طرف مڑ گئی۔ ابھی میں گھر میں داخل ہونا ہی چاہتی تھی کہ سامنے والی تسلیمہ نے آواز دی۔ ''باجی! بات سنیں۔''

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''ایک منٹ کے لیے یہاں آئیں گی؟'' اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''آ رہی ہوں۔'' کہہ کر میں اس کے دروازے پر پہنچی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر دروازے پر آ گئی۔ پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں اندر داخل ہوئی تو وہ بولی۔ ''باجی میں نے آپ کو ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔''

''بولو!'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہماری عزت کا سوال ہے۔ میرے میاں کو پولیس پکڑ لے گی۔''

''کیوں، وجہ کیا ہے؟''

''مالک نے ان پر چوری کا الزام لگایا ہے۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''مگر احمد تو ایسا لڑکا نہیں ہے۔ وہ تو بہت شریف ہے۔''

''مگر دکان کا مالک ماننے پر تیار نہیں ہے۔''

''کس چیز کی چوری کا الزام لگا رہا ہے، کسی زیور کا؟''

''بڑا ہی عجیب حادثہ ہوا ہے۔ ایسا واقعہ شاید ہی آپ نے سنا ہو۔ پولیس والوں نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق کل کی بات ہے کہ ایک نہایت خوبصورت عورت میرے میاں کی دکان پر پہنچی۔ اس نے ایک خوبصورت ہار پسند کیا جس کی قیمت ڈھائی ہزار تھی۔ ہار پورے بیس تولے کا تھا۔ دو سو روپے تولے کے حساب سے دو ہزار کا سونا ہوا۔ پانچ سو بنوائی وغیرہ۔ اس عورت نے کہا کہ میں گھر سے روپے لانا بھول گئی میرے میاں ڈاکٹر ہیں یہ رہا ان کا کارڈ آپ پانچ سو روپے جمع رکھیں برابر میں ہی میرے میاں کا کلینک ہے کسی کو ساتھ کر دیں تو میں اسے روپے دے دوں گی۔ نفسیاتی ڈاکٹر کا کارڈ، عورت کی خوبصورتی اور نئی کار یہ سب دیکھ کر مالک مرعوب ہو گیا۔ اس نے احمد کو ساتھ کر دیا۔ وہ عورت احمد کو لے کر کلینک پر پہنچی احمد کو باہر بٹھایا اور خود ڈاکٹر کے روم میں چلی گئی پھر فوراً ہی باہر آئی اور بولی جائیے آپ کو بلا رہے ہیں۔ احمد جیسے ہی اندر گئے ڈاکٹر نے ان سے کہا۔ ''لیٹ جائیے۔''

احمد نے گھبرا کر کہا۔ ''مجھے تو دو ہزار روپے چاہییے۔''

ڈاکٹر نے کہا ''مل جائیں گے پہلے لیٹ تو جائیے۔'' احمد نے لیٹنے کی بجائے روپے کے لیے کہنا شروع کر دیا لیکن ڈاکٹر کی ایک ہی رٹ کہ پہلے معائنہ کرنے دیجیے۔ تنگ آ کر احمد نے وہیں سے فون کر کے مالک کو بلا لیا۔ بات کچھ اور ہے یہ دیکھ کر ڈاکٹر نے پولیس بلا لی۔

تب یہ راز کھلا کہ وہ عورت ایک دن پہلے ڈاکٹر کے پاس آئی ان سے وقت لیا کہ میرے شوہر کو عجیب بیماری ہے۔ وہ ہر ملنے والے سے دو ہزار روپے مانگتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ٹائم دے دیا آتے وقت اس نے ڈاکٹر کا وزیٹنگ کارڈ لے لیا کہ یہ کارڈ لے کر میرے شوہر آئیں گے اور آج انہیں لے آئی۔ بعد میں مالک کی نیت بدل گئی اس نے احمد سے کہا۔ ''یقیناً وہ عورت تمہاری شناسا تھی اس لیے تم نے اسے ڈیل کیا اب رقم تم بھرو ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ باجی اگر آپ دو ہزار دے دیں تو مہربانی ہوگی۔''

اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے کہا۔ ''دو ہزار کیا میں چار ہزار دے سکتی ہوں مگر یہ مسئلے کا حل نہیں ہے اصل چیز ہے بدنامی سے نجات۔ اس الزام سے خود کو بچانا۔''

''اب اس عورت کو کہاں سے تلاش کیا جائے۔ اتنا بڑا پاکستان ہے پتا نہیں کہاں چھپی ہوگی۔''

''ڈھاکا، چٹا گانگ، کھلنا جیسور یا کسی اور شہر، خوبصورت عورت کہیں نہیں چھپ سکتی، اسے میں ڈھونڈ دوں گی۔ رہا سوال رقم کی واپسی کا تو وہ جب کہو گی میں دے دوں گی۔ مگر سب سے اہم چوری کا الزام ہے پہلے اس الزام سے نجات حاصل کرو۔''

''آپ سچ کہہ رہی ہیں پہلے الزام سے نجات بہتر ہے تاکہ لوگ طعنے نہ دیں۔''

''میں پوری کوشش کروں گی کہ وہ الزام سے نجات پالے تم فکر نہ کرو میں احمد کے لیے کوشش کروں گی۔ ہر حال میں اس پر سے یہ الزام ختم

ہوگا۔'' کہہ کر میں کھڑی ہوگئی۔

''اگر ضرورت پڑی تو آپ پیسے دیں گی ناں!'' اس نے پھر پوچھا۔

''تمہیں یقین نہیں ہے؟ میں نے وعدہ تو کرلیا ہے۔'' میرے اطمینان دلانے پر وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

نورالنہار کے گھر میں داخل ہونے کے بعد بھی میں اسی بات پر غور کررہی تھی کہ وعدہ کرنے کو تو کرلیا ہے مگر اب اسے پورا کیسے کروں۔ میرے پاس جتنی رقم تھی وہ بھی خرچ ہوچکی تھی۔ گنتی کے چند نوٹ باقی تھے جنہیں میں نے بستر کے سرہانے میں تکیے کے نیچے دبا رکھا تھا۔ دوسرا مسئلہ بھی الجھا ہوا تھا۔ میں کیسے اس پر لگا الزام غلط ثابت کروں؟ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں بستر پر لیٹ گئی۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ گن کر دیکھ لوں کل کتنی رقم بچی ہے۔ میں نے سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور نوٹ ٹٹولنے لگی کہ حیرت کا جھٹکا لگا اور میں چونک کر اٹھ بیٹھی پھر تکیے کے نیچے سے ہاتھ کھینچ کر باہر نکالا۔ وہاں ایک اور گڈی رکھی ہوئی تھی۔ نئے نئے کرارے نوٹوں کی گڈی۔

میں نے گڈی کو دوبارہ سرہانے کے نیچے رکھ دیا اور غور کرنے لگی کہ یہ ہر روز ایک نئی گڈی مجھے کون دے رہا ہے۔ بابا جی دے رہے ہیں یا وہ سانپ؟ جو بھی یہ رقم دے رہا تھا۔ وہ میری مشکلات میں آسانیاں ہی پیدا کررہا تھا۔ وہ میرے بے شمار مسائل رقم کی وجہ سے حل ہوجاتے۔ یہی سوچ کر میں نے لیٹنے کا ارادہ ملتوی کردیا اور بستر سے اتر پڑی۔ میں پہلے بابا جی سے رابطہ کرنا چاہتی تھی لیکن ان سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ تو سرراہ خود ہی مل جایا کرتے تھے۔ ان سے کیسے ملا جائے، کمرے میں ٹہلتے ہوئے میں یہی سوچ رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے بابا میرے منتظر ہیں۔ وہ باہر کھڑے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں کمرے سے نکل آئی پھر تیز تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھنے لگی۔ گھر سے باہر، گلی میں آکر میں نے نظریں دوڑائیں۔ گلی کے اختتامی سرے پر بابا کی ایک جھلک دکھائی دی اور میں دوڑنے کے انداز میں ادھر بڑھتی چلی گئی۔ سڑک کے کنارے ایک بند دکان کے باہر وہ کھڑے تھے۔ میں جیسے ہی ان کے نزدیک پہنچی وہ بولے۔ ''تم نے مجھے یاد کیا لو میں آگیا۔ اب بولو کیا پریشانی ہے؟''

''میری ایک واقف کار ہے اس کا میاں ایک جھوٹے کیس میں پھنس گیا ہے کسی طرح اسے باعزت بری کرادیجیے۔''

''ہوجائے گا۔ یہ کون سا ایسا مشکل کام ہے مگر بدلے میں تم کیا دوگی؟'' بابا نے عجیب انداز میں کہا۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں چکرا کر رہ گئی۔

''مگر آپ تو اللہ والے ہیں؟'' میں نے کہا میرے منہ سے یہ جملہ نکلا تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ بابا کا چہرہ دیکھتے ہی دیکھتے مکروہ ہوگیا میں ہکا بکا کھڑی رہ گئی تھی۔ عقل ماؤف، ذہن کند ہوگیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بابا جی کا چہرہ کیسے بدل گیا۔ ''کیا یہ بابا جی نہیں ہیں؟'' میرے دل نے سوال کیا۔ ''ہاں یہ وہ نہیں ہیں؟'' دماغ نے جواب دیا۔ یہی جواب صحیح لگا کیونکہ نور، نور ہے اور نار نار ہے۔ آگ میں زردی گھلی ہوتی ہے اور نور میں خیرہ کن تاثر۔ کچھ دیر پہلے تک اس شخص کے چہرے پر نور تھا مگر اب وہ کافور ہوچکا تھا اس کی جگہ خباثت نے لے لی تھی۔ ایسا مکروہ چہرہ کسی اللہ والے کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے میں سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''ڈرو نہیں میں دشمن نہیں دوست ہوں۔ ہمارا تمہارا ساتھ نیا نہیں ہے۔ دو ماہ میں تم کئی بار مل چکی ہو۔ میرے کئی روپ دیکھ چکی ہو۔'' اس نے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے اسے پہچان لیا تھا اسی لیے روہانسے لہجے میں بولی۔ ''تم چاہتے کیا ہو؟''

''اپنی زندگی...... میں پھر سے اس براہمنڈ (دنیا) کا آنند لینا چاہتا ہوں اور مجھے زندگی صرف تمہی دے سکتی ہو۔''

''میں نہ کوئی عامل کامل ہوں نہ ولیہ کہ میری دعا سے تم دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے۔''

''ہر آدمی کے اندر گپت شکتی (مخفی قوت) ہوتی ہے۔ تمہارے اندر تو گپت شکتی کا بھنڈار (خزانہ) ہے کیونکہ تم تُو لا راشی (برج میزان) ہو۔ تمہارا جنم ایسے سمے (وقت) ہوا ہے جب شُکر (مریخ) اور چندرما (چاند) سپتم (ساتویں) گھر میں تھا۔ یہ لگن (مبارک ساعت) کسی کسی کے بھاگیہ (قسمت) میں آتی ہے۔ یہ تو میرا بھاگیہ تھا کہ تم فوراً مل گئیں۔ اب ایک ہی بنتی (التجا) ہے، بس ایک قتل اور کر دو، ایک اور لڑکی کے خون سے لبالب بھرا پیالہ لا دو تا کہ میں پھر سے زندگی کا مزہ لوٹنے کے قابل بن جاؤں۔'' وہ گڑگڑانے لگا تھا۔ وہ سرتاپا ملتمس تھا۔ اس کے چہرے پر کرب سایہ فگن تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

پتا نہیں کیوں میں اس کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کرنے لگی تھی۔ شاید یہ اس کے لہجے کا جادو تھا یا اداکاری کا سحر یا پھر اس کی آنکھوں کی چمک کا اثر تھا ایسا ہی اثر اس وقت بھی محسوس ہوتا تھا جب وہ سانپ کے قالب میں تھا اور اس کی باتیں سیدھی میرے دماغ میں گونجتی تھیں۔ وقت کے ساتھ اس نے بھی ترقی کی تھی۔ پہلے کٹورے میں نظر آیا پھر بستر پر اور اب یوں سرِراہ۔ میری قوت تو وہیں کی وہیں تھی مگر اس کی قوت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

میں نے سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے مگر خدا کا شکر کہ گلی سنسان تھی ورنہ لوگ خواہ مخواہ متوجہ ہو جاتے۔

''دیکھو تم جو کوئی بھی ہو مجھ پر رحم کرو۔ مجھ سے میرے ماں باپ چھینے، بھائی بہن چھینے، سب کے سب قبر میں جا سوئے۔ میں تہی دست ہو گئی ہوں کسی بنجارن کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہوں۔'' بولتے بولتے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں نے اب تک تمہیں کوئی نقصان پہنچایا؟ ہر قدم پر مدد کر رہا ہوں۔ یہ تو حالات تھے کہ ہندو مسلمان فساد ہو گیا اور تمہارے گھر والے مارے گئے۔ اگر مارنے والے کالی دیوی کا نعرہ نہ لگا رہے ہوتے تو میں انہیں سزا دے دیتا۔ خیر جو ہوا اسے بھول جاؤ اور میری مدد کرو۔ میں بہت لمبی نیند سو لیا ہوں۔ اب اس دنیا کا آنند پھر سے لینا چاہتا ہوں اور اس میں میری مدد صرف تم کر سکتی ہو۔''

''میں اب کسی معصوم لڑکی کا خون نہیں کروں گی۔''

''ہر کام ایک قاعدے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ ایک سیڑھی چڑھنے کے بعد ہی دوسری سیڑھی ملتی ہے اور اگر دوسری سیڑھی نہ ملے تو اٹھا ہوا قدم توازن بگاڑ دیتا ہے۔ انسان چاروں خانے چت گر سکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ میں نے پہلا قدم اٹھا لیا مگر اب دوسرا قدم نہیں اٹھ رہا ہے۔ پیر رکھنے کا مقام نہیں مل رہا ہے نتیجتاً ڈگمگا رہا ہوں کسی بھی لمحے گر سکتا ہوں اور اس حالت میں تمہاری زندگی خطرے میں آ جائے گی۔ اس لیے شام سے پہلے خون کا انتظام کر دو ورنہ میری پوری قوت سلب ہو جائے گی۔''

''میں کوشش کرتی ہوں۔''

''وہ بڈھا ہر قدم پر میرا راستہ روک رہا ہے۔ وہ روڑے اٹکانے کی پوری کوشش کرے گا۔ جاؤ، ڈھونڈو کسی بھی کنواری لڑکی کے نرخرے کا خون لا دو ورنہ تم بے موت ماری جاؤ گی۔ میرے پاس وقت کم ہے یہی بتانے آیا تھا'' کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ میں ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ کہاں سے خون کا انتظام کروں۔ اگر نور النہار کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں اس کو قربان کر دیتی۔ یہی تو ہوتا آیا ہے کہ خود کو بچانے کے لیے لوگ اپنے پیاروں کو قربان کر دیتے ہیں۔

اتنی ساری لڑکیوں کا قتل میں نے نہیں کیا تھا۔ میں تو مجبور تھی یہ اس کا سحر تھا کہ میں قتل کرتی چلی گئی تھی۔ اور ان لڑکیوں کا خون وہ استعمال کیے جا رہا تھا۔

اگر میں کسی کا خون کر سکتی تو اب تک کر چکی ہوتی۔ ارادہ کرنے کے بعد بھی پوری رات گزار دی تھی اور صبح کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ساری رات جاگتی رہی تھی لیکن ہمت نے ساتھ نہ دیا تھا۔ میں زبردستی سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے کمرے کی دیوار ٹی وی کی اسکرین بن گئی ہے۔ اس پر اس شخص کا چہرہ نظر آیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''لڑکی تو نے بہت برا کیا ہے۔ میری قوت اور اپنی جان کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اب اس کا ایک ہی علاج ہے۔''

''کیا؟''

''اس دنیا میں تیرا سگا رشتے دار کوئی نہیں ہے اس لیے تُو یہ کام بہ آسانی کر لے گی۔''

''کون سا کام؟'' میں نے پوچھا ہی تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور دیوار پر منعکس عکس غائب ہو گیا۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور اونچی آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟'' پھر بولی۔ ''دروازہ کھلا ہوا ہے آ جاؤ۔''

دروازہ کھلا اور تسلیمہ داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ شاید وہ اس لیے آئی ہے کہ دو ہزار روپے مانگ سکے پھر بھی میں نے استفسار کیا۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

''آپا! آپ نے کہا تھا کہ میرے میاں کو باعزت بچا لیں گی۔ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ دیں گی کہ ان پر جو چوری کا الزام لگا ہے وہ ختم ہو جائے۔''

''کیوں، دکان کے مالک نے پھر کوئی شرارت کی ہے کیا؟''

''وہ بات نہیں ہے اس نے جو وقت دیا ہے وہ ابھی گزرا کہاں ہے مگر لوگ باتیں بنا رہے ہیں اسی لیے آئی ہوں۔''

''ایسا کرو تم گھر جاؤ میں کچھ دیر میں آ رہی ہوں۔'' دراصل میرے دماغ میں ایک نادر پلان آ گیا تھا۔ اسے آزمانا چاہتی تھی۔ جیسے ہی وہ کمرے سے باہر گئی میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ میرا خیال صحیح نکلا تھا۔ ادھر دروازہ بند ہوا تھا کہ دیوار پر پھر سے بابا کا عکس نظر آنے لگا تھا۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا اور ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھاتی لکڑی کا عصا۔ انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تو کیا تُو اس

عورت کے شوہر کو الزام سے نجات دلائے گی۔''

''میں نہیں، میرے اندر اتنی قوت کہاں ہے۔ انسانیت کے ناتے یہ کام آپ کریں گے۔''

''یاد رکھ ہر بات کے پیچھے ایک نہ ایک وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ ہلکا پھلکا دھچکہ دے کر توبہ پر راغب کرتا ہے تُو اس ناشکرے کو نہیں جانتی اس کے گناہوں کا بوجھ بہت بھاری ہے۔ اس سے کہہ کہ وہ استغفار کرے۔''

''پہلے یہ جھنجٹ تو ختم ہو۔ اسے الزام سے نجات مل جائے تبھی تو وہ کچھ اور کرے گا۔ انسانیت کے ناتے یہ کام کردیں۔''

''اس عورت کو تلاش کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اتنے بڑے شہر میں تُو اسے کیسے تلاش کرے گی؟''

''میں نہیں آپ کریں گے۔ میں تو اسے پولیس تک پہنچاؤں گی۔''

''بیوقوف لڑکی پولیس تو خود تیری تلاش میں ہے۔ تجھ پر اتنی لڑکیوں کے قتل کا الزام ہے کہ کئی بار پھانسی کی سزا لکھی جائے گی۔''

''تو کوئی دوسرا راستہ بتایئے؟''

''صرف تیری وجہ سے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ عورت پولیس کی حراست میں ہوگی پھر پولیس اسے لے کر ڈاکٹر کے ہاں جائے گی اور ڈاکٹر کا بیان لے کر جیولرز کے ہاں، اس طرح وہ الزام خود غلط ثابت ہوجائے گا۔''

''ہاں یہ بہتر طریقہ ہے فوراً کردیں۔ ابھی کردیں اتنی دیر میں، مَیں کچھ کھالوں کیونکہ اس وقت میرے پیٹ میں چوہوں کی قومی اسمبلی کا اجلاس شباب پر ہے جس میں ہاتھاپائی، ڈسک بجانا، کرسی چلانا جمہوریت کا حصہ ہے بڑا شور شرابہ مچا ہوا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اچھا تُو پیٹ کی آگ بجھا اب میں تجھ سے کل ملوں گا۔ اسی طرح خفیہ انداز میں کیونکہ وہ شیطان ابن شیطان مجھے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہر طرف سے جال پھینک رہا ہے۔''

دیوار پر سے عکس غائب ہوتے ہی میں بستر سے اٹھ گئی اور باہر جانے کے لیے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی سرد ہوا کا تیز جھونکا جسم کو کپکپا گیا۔ غضب کی سردی تھی حالانکہ میرے ابا بنگال کی سردی کو کبھی خاطر میں ہی نہ لاتے تھے۔ کہتے تھے یہ بھی کوئی سردی ہے۔ دراصل وہ ملیریا کی کپکپاہٹ جیسی سردی کے قائل تھے۔ میں انہیں یاد کرتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی تاکہ کچھ کھا کر پیٹ کی آگ بجھاسکوں۔

نورالنہار کی ماں نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر بولیں۔ ''بھوک لگی ہے؟ یہیں بیٹھ جاؤ کھانا تیار ہے۔''

وہ پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے بولیں۔ ''تسلیمہ کیا کرنے آئی تھی۔ ضرور کچھ مانگنے آئی ہوگی کہ میرے میاں کی نوکری چھوٹ گئی ہے کچھ دے دیں۔''

''نہیں خالہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنا ایک مسئلہ لے کر آئی تھی۔''

''ہاں ہاں میں خوب جانتی ہوں۔ جب سے محلے والوں کو معلوم ہوا ہے کہ تم نے اپنی سہیلی کے میاں کو دکان لے کر دی ہے اور تمہارے پاس بہت پیسہ ہے تب سے سب کو کسی نہ کسی مسئلے نے گھیر لیا ہے۔ ارے یہ آنکھیں صرف دیکھتی ہی نہیں بہت کچھ سن بھی لیتی ہیں بھانپ بھی لیتی ہیں

اور سمجھ بھی لیتی ہیں۔'' خالہ کی آواز میں ترشی گھلی ہوئی تھی۔ میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے مچھلی چاول کھاتی رہی۔

کھانا کھا کر پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا کہ میں چہل قدمی کے لیے گلی میں نکل آئی۔ اس میں میرا دخل نہیں تھا بس دل کا التماس تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میرے اندر اور بھی کوئی بیٹھا ہے جو مجھے اکسا رہا ہے کہ ٹھنڈ کا لطف لینے کے لیے کھلے میدان میں چلی جاؤ۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر بڑھتی جا رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔

احساس کا جذبہ ہر انسان میں ہوتا ہے۔ عورت میں تو خاص طور سے ہوتا ہے۔ کتنی ہی دور سے عورت کو نظر بھر کے دیکھیں اسے فوراً احساس ہو جائے گا۔ اسے ہی تو چھٹی حس کہتے ہیں۔ میری چھٹی حس تو کچھ زیادہ ہی تھی جیسے ہی مجھے ایسا احساس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے میں رک گئی۔

''رکو نہیں چلتی رہو۔ میرے پاس بہت کم وقت ہے۔ میں نے تم سے گرما گرم کسی کنواری کے نرخرے سے ابلتا ہوا خون لانے کے لیے کہا تھا مگر تم نہیں لائیں۔ الٹا میرے دشمن سے راز و نیاز کرتی رہیں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میری قوت سلب ہو رہی ہے۔ اتنے سال کی تپسیا کے بعد میں نے جو قوت حاصل کی تھی وہ ختم ہو رہی ہے۔ میں زندگی کے قریب آ کر موت کی گود میں گر رہا ہوں۔''

''تم فکر نہ کرو، مجھے تھوڑا سا وقت اور دے دو میں تمہیں خون لا کر دے دوں گی۔''

''خون دینے کا وقت گزر چکا ہے بیوقوف لڑکی اور ایسا تیری نادانی سے ہوا ہے۔'' اس کا لہجہ تپا تپا سا تھا۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی تھیں کہ اندھیرے میں مجھے سلگتا ہوا الاؤ لگ رہی تھیں۔ پیشانی پر بل تھے اور چہرے پر سفاکیت۔

''آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ میں الجھ گئی تھی اسی لیے کام نہ کر سکی۔''

''یہ مت بھول کہ اس شہر کا ذرہ ذرہ تیرا دشمن بن چکا ہے۔ تجھ پر قتل کے اتنے الزام ہیں کہ صفائی دے دے کر تھک بھی جائے تو کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ محلہ جسے تُو جائے پناہ سمجھ رہی ہے یہاں والوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ شہر میں جس قتالہ کا چرچا ہے جس کی خبر اخبارات ذائقہ بڑھانے کے لیے اچھال رہے ہیں وہ تیرا ہی کارنامہ ہے تو سمجھ لے کہ تیری خیر نہیں۔ لوگ تکا بوٹی کر دیں گے۔ پولیس الگ تیری تلاش میں ہے۔''

اس کی بات میں صداقت تھی۔ میں تو گویا خطروں کے دلدل میں دھنس چکی تھی۔ ہر قدم پر پھندا ہر قدم پر جال تھے۔ رہائی کے کوئی آثار نہ تھے۔ میں کتنا ہی ہاتھ پیر کیوں نہ ماروں مگر اس مکڑی جال سے نکل نہیں سکتی۔ باباجی اور اس عجیب قوت کے درمیان پھنسی میں بری طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ پتا نہیں ان دونوں نے مجھے کیوں دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ کس بات کا بدلہ لے رہے ہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ دو پاٹوں کے بیچ پسنے کے لیے میں ہی کیوں منتخب ہوئی ہوں۔

''کس سوچ میں ڈوب گئیں!'' اس کی آواز نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت بھی جوانِ رعنا کے روپ میں تھا۔

مردانہ وجاہت کا شاہکار بنا ہوا تھا۔ کچھ بھی ہو عورت ہونے کی وجہ سے میرے اندر بھی صنفِ مخالف کے لیے کشش تھی۔ شاید وہ میری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھانے آیا تھا۔

''تم چاہتے کیا ہو؟'' میں نے روہانسی آواز میں کہا۔

''اپنی زندگی۔ یہ بھی سمجھ لو اگر تم نے مجھے میری زندگی لوٹا دی تو تم گھاٹے میں نہیں رہو گی۔ دنیا کی سب سے شکتی شالی (قوی) عورت کہلاؤ گی۔ کیونکہ تم میری اردھانگنی (نصف بہتر) بن چکی ہو گی۔ میں تمہیں اپنا لوں گا۔ اپنا نام دے دوں گا۔''

اس کی بات سن کر میں تپ گئی، کھول گئی۔ اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب وہ مجھے حاصل کرنے کا خواب دیکھنے لگا تھا۔ میں کوئی سخت جواب دیتی کہ وہ بولا۔ ''تمہارا چہرہ جو نفرت کی عکاسی کر رہا ہے مظہر ہے کہ تمہیں میری باتیں پسند نہیں آئی ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی وقت ہے سوچ لو۔ میں تم پر کوئی دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا۔ یہ صرف پیشکش ہے۔'' اس نے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''یعنی تم مجھے زبردستی بیوی بنانا نہیں چاہتے ہو؟'' میں نے معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں نے تمہارے بارے میں جتنا کچھ معلوم کیا تھا اس کے مطابق تم عقل کے معاملے میں مسکین ہو لیکن اب ایسا لگ رہا ہے کہ تم بے عقل لوگوں کی امام بن گئی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں، تمہاری بھاشا (مادری زبان) میں بول رہا ہوں؟''

''آں...... ہاں ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا کر کہا۔

''کوئی کسی پر اپنی مرضی تھوپ نہیں سکتا۔ زبردستی کنیز تو بنایا جا سکتا ہے بیوی نہیں، اور کنیز صرف حکم پورا کرتی ہے، خوشیوں میں ساجھا نہیں کرتی۔ میری یہ پیشکش اس لیے ہے کہ میں جو بہت جلد دنیا کا سب سے شکتی شالی (قوی)، مہان (اعلیٰ) اور پورب سے پچھم تک کا حاکم بننے والا ہوں اور ایسا صرف تمہاری وجہ سے بنوں گا۔ تمہارے اس احسان کا بدلہ یہی ہو گا کہ تمہیں بھی وہی مرتبہ، وہی مقام دلواؤں جو میرا ہو گا اور ایسا تبھی ممکن ہے جب تم میری جیون ساتھی بنو، میں تمہیں بھی طویل عمری کا راز بتا دوں گا۔''

''میں قانونِ فطرت کو چیلنج کرنا پسند نہیں کرتی۔ اس مالکِ کل نے جتنی عمر دی ہے اسے ہی گزار لوں یہی بہت ہے۔ یوں بھی اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے عام زندگی میں ناممکن ہے۔ کسی کو بتاؤں بھی تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ کون یقین کرے گا کہ تم اتنی لمبی عمر کے حامل ہو۔''

''ٹھہرو!'' اس نے میرے کلام کو قطع کیا۔ ''یہ دنیا بڑی پُر اسرار ہے۔ ہر قدم پر ایک نیا اسرار کھلے گا۔ تمہارے دھرم کی کتابوں میں یہ بات لکھی ہے ناں کہ نوح، داؤد، یوشع وغیرہ انتہائی طویل عمر کے تھے۔ ان کے دور میں ہر آدمی کی عمر ہزار بارہ سو سال کی تھی، ایک ایک سجدہ میں وہ کئی کئی سال گزار دیتے تھے۔ اس دور کے لوگ طویل عمر کے کیوں ہوتے تھے؟ اس لیے کہ کڑی مشقت کرتے تھے۔ خالص غذا کھاتے تھے۔ ہر طرف جنگل تھے اس لیے ہوا بھی خالص ہوتی تھی۔ ہماری جوانی کے دور میں ہم ناشتے میں پانچ کلو دودھ پیتے تھے، ایک سے ڈیڑھ پاؤ مکھن ڈال کر۔ دودھ آج بھی ہے، مکھن آج بھی ہے۔ ہے کہ نہیں؟''

''ہاں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم ایک کلو دودھ سو گرام مکھن ڈال کر پی سکتی ہو؟''

''نہیں!'' میں نے انکار میں گردن ہلائی۔

''اس لیے نہیں پی سکتیں کہ تمہارے جسم کی قوت کم ہوگئی۔ جسم اوپر سے وہی ہے اندر سے اس میں تبدیلی آ گئی۔ اب اگر اس تبدیلی کو پھر سے دور کر دیا جائے تو انسان پہلے جیسا بن سکتا ہے کیونکہ انسان کچھ نہیں ہے صرف کیڑوں (خلیوںCell) کا مجموعہ ہے۔ یہ ننھے ننھے کیڑے (خلیے) جمع ہو کر جسم بناتے ہیں۔ ان کیڑوں کو طاقتور بنا دو انسان طویل عمر کا بن جائے گا۔''

''مگر تم تو روح ہو بھٹکتی ہوئی روح، بدروح۔''

''روح کیا ہے یہ الگ بحث ہے پہلے یہ بتا دوں کہ تم جو کچھ دیکھ رہی ہو یہ تمہاری قوت ہے اور اس قوت پر کسی دوسرے کی قوت حاوی ہو جائے تب تم وہی کچھ دیکھو گی جو وہ دکھانا چاہے گا۔ عرف عام میں اسے نظر بندی کہتے ہیں۔'' اس نے چلتے چلتے رک کر میرے چہرے پر نظر ڈالی پھر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''تم نے پہلے مجھے سانپ کی شکل میں دیکھا وہ میری قوت تھی، پھر میں نے تمہیں اپنی اصل شکل دکھائی یہ بھی میری قوت تھی۔ اس وقت بھی تم مجھے اپنے ساتھ دیکھ رہی ہو یہ بھی میری قوت ہے جبکہ میں یہاں سے کئی سو میل دور ایک پہاڑ کے سرد غار میں پڑا ہوا ہوں۔''

''یعنی...... یعنی تم میرے ساتھ نہیں ہو؟''

''ہاں...... جو چیز سمجھ میں نہ آئے اسے جادو کہتے ہیں۔ تمہارے اس دور کا میں نے ایک جادو دیکھا کہ جادوگر کسی چیز کی طرف بڑے غور سے دیکھتا ہے۔ وہ چیز اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہے۔ بلند ہو جاتی ہے۔ جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ اسے ہپناٹزم کا نام دیا گیا ہے۔ دراصل یہ ذہن کی قوت کا نام ہے۔ آج کل کے انسان کی ذہنی قوت سے کئی سو گنا زیادہ قوت میرے پاس ہے۔ اسی قوت کے سہارے میں اب تک زندہ ہوں۔ میرے اندر کے تمام کیڑے زندہ ہیں۔''

''تو کیا تم واقعی انسان ہو؟''

''بالکل! میں نے بھی ماں سے جنم لیا ہے۔ پالنے میں جھولا ہوں لیکن جب جوان ہوا تو وقت برباد نہیں کیا۔ علم حاصل کیا، تپیا میں وقت گزارا اور اپنی قوت بڑھالی۔ قوی بن گیا مگر ایک کسر رہ گئی کیونکہ اس وقت مجھے اس کمی کا پتا نہ تھا۔ اب اس کمی کے سدباب کا بھی پتا چل گیا ہے اور اس کمی کو تم دور کرو گی۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔ وہ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ رک گیا کیونکہ کافی دور ایک ہیولا سا نظر آیا تھا، انسانی ہیولا جو دھیرے دھیرے ادھر ہی بڑھ رہا تھا۔ پھر اس کے پیچھے دو ہیولے اور نظر آئے۔ یہ کون ہیں میں اس پر غور کرنے لگی۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

''اے تم تو کسی آڑ میں چلے جاؤ۔ یوں اکیلے میں کسی مرد کے ساتھ میرا نظر آنا کہانی بنا دے گا۔''

''اچھی بات ہے میں چلا جاتا ہوں کیونکہ میں نے اپنی ذہنی قوت کو ٹھوس جسم میں تبدیل کر لیا ہے اگر میں اس شکل میں نہ ہوتا تو اسے نظر بھی نہ آتا۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے چلنے کی رفتار گھوڑے سے بھی تیز تھی۔ ایک پل میں ایک کوس کا فاصلہ طے کر گیا۔ میں نے ادھر سے نظریں موڑ کر آنے والوں کی طرف دیکھا۔ وہ قریب آتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ اور قریب آئے تو میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ شنکر تھا۔ اس شنکر نے مجھے کئی چرکے

دیئے تھے اس لیے میرا خوفزدہ ہونا تعجب خیز نہ تھا۔ اب میں پچھتا رہی تھی کہ اسے جانے کا کیوں کہہ دیا۔ شنکر نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اب وہ مکروہ ہنسی ہنستا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ نزدیک آ کر بولا۔ ''او بھاگیہ ہمارے۔ آج تو قسمت کی دیوی ہم پر مہربان ہے۔ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔''

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اسے باندھ لو۔''

''خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا ورنہ......''

''ورنہ تم میرا منہ نوچ لوگی۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم لڑکیاں یہی دھمکی دیتی ہو ناں!''

''میں تمہیں تباہ کر دوں گی۔ جان سے چلے جاؤ گے، سمجھے!''

''جاؤ جاؤ تم میرا کیا بگاڑ لوگی۔'' کہہ کر وہ میری طرف جھپٹا۔ میں نے اچھل کر خود کو بچایا۔ اسے ناکام ہوتے دیکھ اس کے دونوں ساتھی لپکے۔ میں پھر چیخی۔ ''شنکر اپنے آدمیوں کو روکو ورنہ اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں تم سب خود جل جاؤ گے۔''

''بہت بک بک کر رہی ہے۔'' شنکر کے ساتھی نے کہا اور مجھے دبوچ لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ کسی خاص مقصد سے کہیں جا رہے تھے کیونکہ ان کے پاس مچھلی پکڑنے والی موٹی ڈور تھی۔ انہوں نے ڈور کو دوہرا کر کے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ میں تقریباً بے بس ہو چکی تھی۔

''ہاں تو مہارانی جی اب بولیں سودا کریں گی؟''

''کیسا سودا؟''

''مجھے اپنے ابا کی کتاب دے دو۔ مجھے کتاب مل گئی تو میں تمہیں جانے دوں گا۔''

''کتاب میرے پاس نہیں ہے۔''

''ذرا غور سے سنو۔ پولیس چوکی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے انہیں خبر دینے کی دیر ہے۔''

''پہلے اپنی خبر لو، تم نے میرا ہاتھ باندھ کر سمجھ لیا ہے کہ میں مجبور ہو گئی ہوں۔''

''مجبور تو ہر لڑکی ہوتی ہے۔ دیکھو ایسے......'' کہہ کر وہ میری طرف بڑھا اس نے میری ساڑھی کا پلو پکڑا اور اسے کھینچنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی پیٹھ پر لات پڑی اور وہ اچھل کر منہ کے بل گرا۔ وہ پھرتی سے اٹھا تھا مگر اس کی کوشش ناکامیاب ٹھہری۔ ایک اور لات پڑی تو وہ گر کر لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی حیرت سے منہ پھاڑے کھڑے تھے کیونکہ انہیں مارنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری مدد کو کون آ گیا ہے یہ خود میں بھی دیکھ نہیں پائی تھی۔ سوچنے سمجھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ اس لیے میں خود بھی ایک طرف کھڑی ہو کر تماشا دیکھ رہی تھی۔ مارنے والے نے شنکر کو اٹھایا تھا اور سر سے بلند کر کے پوری قوت سے زمین پر پٹخا تھا۔ یقین کریں میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کی چیخیں نکل جاتیں۔ شنکر کا سر پھٹ کر بھیجا باہر نکل آیا تھا، اور مقتول کے نزدیک کوئی موجود ہو تو پولیس اسے چھوڑتی نہیں ہے۔ کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے اس ڈر سے میں وہاں سے کھسکنے والی تھی کہ ایک اور چیخ بلند ہوئی۔ میں چونک کر مڑی تو دیکھا کہ شنکر کا دوسرا ساتھی بھی شنکر کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اس کا سر بھی کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ دو لاشوں کے درمیان کھڑے ہونا اپنی بدقسمتی کو آواز دینا تھا اس لیے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی لوٹ چلی تھی کہ تیسری چیخ سنائی دی۔ میں سمجھ گئی کہ شنکر کا دوسرا

ساتھی بھی مارا گیا۔ اب میں نے بھاگنا شروع کر دیا تھا۔

بھاگتے بھاگتے میں شاہ علی بغدادی کے مزار پر پہنچ گئی۔ مزار کے باہر فقیروں کی قطار جمع تھی۔ میں ان کے درمیان سے گزر رہی تھی کہ ایک فقیر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میرے بازو کو پکڑ لیا۔ ایسا یکا یک ہوا تھا میری چیخ نکل گئی تھی۔

''خاموش آواز نہ نکلے۔'' اس نے کہا تو میری دوسری چیخ حلق میں اٹک گئی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب موڑ رکھا تھا، اور چادر کا بکل بھی مار رکھا تھا۔

''کو...... کون...... کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''خاموشی سے چلو۔ یہاں بہت لوگ ہیں۔ مزار کے عقب میں تم سے بات کروں گا۔''

میں گھسٹنے کے انداز میں چلتی رہی۔ مزار کے پیچھے پہنچ کر اس نے ایک بڑے سے پتھر پر مجھے دھکا دینے کے انداز میں بٹھا دیا۔ اس کی ہر حرکت سے جارحیت ٹپک رہی تھی۔ میں بری طرح سہمی ہوئی تھی لیکن جب اس کے چہرے کو دیکھا تو کچھ اطمینان ہوا۔ یہ وہی بابا جی تھے مگر اس وقت سخت غصے میں نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک اور تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ صبح جب انہیں دیکھا تھا تو وہ فربہ اندام تھے مگر اس وقت قحطِ بنگال کا نمونہ نظر آ رہے تھے۔ بالکل سوکھ گئے تھے۔ ایسا کیسے ہو گیا، یہ ناممکن سی بات ہے۔ اس پر میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ اب ہر قدم پر ایک عجیب بات نظر آتی تھی۔ ایسی باتیں جو ناممکن ہوتی تھیں۔

''تو تُو نے جہنم پسند کر لیا۔ ارے بیوقوف لڑکی۔ کم سے کم اپنے باپ کی بزرگی ہی کا لحاظ کر لیتی۔'' بابا جی نے غصے میں ابال کھانا شروع کر دیا۔

''ایسا میں نے کیا کر دیا؟''

''زندگی دینے اور لینے کا مالک صرف اللہ کی ذات ہے۔ ارے اس نے تو شداد و نمرود جیسے ظالمین کو بھی ایک عرصے تک سزا نہ دی تھی اور تُو نے ذرا سی بات پر اس ملعون کے ذریعے تین آدمیوں کی جان لے لی۔ یہ حق تجھے کس نے دیا ہے؟''

''کیا کرتی۔ اگر اسے نہ روکتی تو وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے۔''

''مگر اس کے لیے جان لینا تو ضروری نہیں تھا۔''

''میں کیا کروں حالات ہی ایسے ہو جاتے ہیں۔''

''تو جا مر اب میں تیری کوئی مدد نہیں کروں گا۔''

''شنکر کون سا اچھا آدمی تھا۔ اس نے تو اتنے گناہ کیے ہیں کہ کاتبین بھی لکھتے لکھتے تھک گئے ہوں گے ان کی روشنائی ختم ہو گئی ہو گی۔''

''تجھے یہ اختیار کس نے دیا کہ تُو کسی کے گناہ و ثواب کا حساب رکھے۔ جب وہ مالکِ کُل اپنے باغی بندوں کو کچھ نہیں کہتا تو ہم کون ہوتے ہیں اس کے کام میں دخل دینے والے؟ جا مر اب میں خاموش تماشائی بن کر تیری تباہی دیکھوں گا۔ تیری ہی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی ہے۔ دیکھ ذرا میں کیسا سوکھ کر کانٹا بن گیا ہوں۔''

بابا غصے میں مڑے تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر ان کے بازو کو پکڑ لیا۔ ''نہیں آپ ایسے نہیں جا سکتے ورنہ میری یہ غلطی جو آپ کے دل میں پھانس بن کر چبھی ہے کل آگ بن کر دہکنے لگے گی۔ میں خود بھی پچھتاؤں گی آگ میں جلوں گی اور میری آہ آپ کو بھی جھلسا دے گی۔''

کچھ احساسات، کچھ جذبات لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ میری التجا نے بھی اثر کیا اور وہ رک گئے پھر بولے۔ ''تیرا گناہ بہت بڑا ہے اور میں بہت چھوٹا ہوں تُو نے ایک کے بعد ایک گناہ کو جمع کر کے پہاڑ بنا لیا ہے جس کے ایک پار میں ہوں اور دوسرے پار تُو ہے۔ میں اگر چاہوں تو بھی تیری مدد نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میں جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے جب پچھتانے کا موسم آئے گا، جب تیرے اندر کا شور خود تیرے اعصاب کو توڑنے لگے گا، جب تیری انا کے دیو قامت بت ٹوٹ کر خود تیرے پیروں پر گریں گے تب تُو مجھے یاد کرے گی، مجھے مدد کے لیے بلائے گی مگر تب تک وقت گزر گیا ہوگا کیونکہ تُو نے خود کو گناہوں کے گرداب میں پھنسا لیا ہے جس کا نتیجہ تباہی ہے۔ جب تک تیرے گناہ کم تھے میں تیری مدد کرتا رہا مگر اب یہ ناممکن ہو چکا ہے۔'' کہہ کر وہ واپسی کے لیے مڑ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد رک کے پھر بولے۔ ''مگر میں تجھ پر ہمہ وقت نظر رکھے رہوں گا۔ دیکھتا رہوں گا کہ تُو مزید کس حد تک گر سکتی ہے۔''

بابا جی کا سہارا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے محافظ ہیں نگران کے یوں چلے جانے سے میں افسردہ ہو گئی تھی۔ سر جھکائے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے میرے کچے ریشم ایسے بالوں کو سمیٹ سمیٹ کر بکھیر رہے تھے اور بکھیر بکھیر کر سمیٹ رہے تھے۔ ہر چند کہ میں نے سفید جارجٹ کا دوپٹہ پوری طرح ڈھانپ کر اوڑھا ہوا تھا لیکن کمر پر جھولتے نرم نرم ڈھلے بال دوپٹے سے باہر نکل کر ہوا کی شہ پر شوخیاں کر رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ملال کے ان موسموں نے مجھ پر ملاحتوں کی بارش کر دی تھی۔

یقیناً میری بے کاجل آنکھوں میں سمندروں کا سکوت اتر آیا تھا۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا۔ قسمت میں جو لکھا ہے اس پر قناعت کر لیا۔

''اے! کس خیال میں ڈوبی ہوئی ہو؟'' اس آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے بالکل قریب وہی سوکھے پیروں والا جوانِ رعنا کھڑا تھا۔

''وہ گئے تو تم آ گئے۔ میرے حال پر رحم کرو کیوں مجھے چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پیس رہے ہو۔''

''اس دنیا کا نظام ایک دوسرے کے سہارے کا محتاج ہے۔ وہ بڈھا اپنی موت آپ مر رہا ہے۔ مجھ سے ٹکرانے کی سزا پا رہا ہے۔ اب تم میری مدد کرو اس میں تمہاری بہتری ہے بدلے میں، میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے صرف آزادی چاہیے تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے باپ نے مجھے جگایا ہے اب تم مجھے پوری زندگی دو گی۔''

''میں اور کسی کا خون نہیں کر سکتی۔ کیوں معصوم لڑکیوں کے دشمن بن رہے ہو۔''

''تم نے دیکھا ہوگا، ہر بیل کو اوپر چڑھنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ میری روح امر ہے

لیکن اسے جون تبدیل کرنے کے لیے خون کی ضرورت ہے۔" اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"کیا بغیر کسی کا خون بہائے تمہارا کام نہیں چل سکتا؟"

"جیسا کہ میں پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ انسانی جسم اپنے آپ میں بہت بڑا جادوئی کارخانہ ہے۔ اس کا نظام اتنا گنجلک، اتنا وسیع، اتنا پیچیدہ، اتنا حیرت انگیز ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے تمہیں کئی برس درکار ہیں۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکا پھر بولا۔ "ہر انسان کے اندر بہت بڑا قوت کا خزانہ چھپا ہے، حیرت انگیز قوت کا خزانہ۔ بس اسے اپنے بس میں کرنے کی ضرورت ہے۔ میں جو کنواری لڑکیوں کے خون سے اپنے جسم کو غسل دے رہا ہوں اس کے پیچھے بھی یہی راز ہے۔ انسانی قوت کا سرچشمہ خون ہے۔ خون کے کیڑے (خلیے) ہی انسانی جسم کو توانائی دیتے ہیں۔ یہی توانائی پورے براہمنڈ (عالم) میں تغیر لاتی ہے اسی لیے ہر دھرم میں ہر مذہب میں قربانی دینے کا تصور عام ہے۔ خون بہتا ہے تو اس کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ روح کو قوت ملنے لگتی ہے۔"

"تمہاری روح تو کئی سو سال سے بھٹک رہی ہے اسے اب مزید قوت کی کیا ضرورت ہے؟"

"یقیناً روح لامحدود قوت کی حامل ہے وہ انسانی جسم سے نکلنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے مگر اس کی قوت میں بھی کمی بیشی آتی رہتی ہے پھر بھی وہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اس جسم میں آسکتی ہے جس سے وہ نکلی تھی۔ بشرطیکہ اس جسم کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہر رات جب انسان سوتا ہے تو اس کے جسم سے نکل جاتی ہے۔ اثنائے سفر میں وہ جو کچھ دیکھتی ہے وہی تو خواب کہلاتا ہے۔"

"تو تمہاری روح کتنے دنوں میں قوی بن جائے گی؟"

"یہ تمہارے اوپر منحصر ہے۔ تمہاری ایک غلطی نے اس عمل کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اب اسے جلا بخشنے کے لیے تمہیں ایک خاص آدمی سے مدد لینی ہوگی۔"

"وہ آدمی کہاں ملے گا؟"

"اس کے لیے تمہیں سفر کرنا ہوگا اور اگر تم سفر نہیں کرو گی تو مفت میں اپنی روح کو میری قید میں ڈال دو گی۔" بولتے بولتے اس کا لہجہ تبدیل ہو گیا، سختی آ گئی۔ اس کا یہ انداز مجھے ذرا بھی نہیں بھایا۔ پھر بھی میں خاموش رہی مگر اس نے میرے چہرے کے تغیر سے سمجھ لیا اور بولا۔ "تمہیں تو یہ بات معلوم ہی ہوگی کہ میں اجین نگری میں سویا تھا۔ زمین چلتی ہے، زمین کا نچلا حصہ مزید تیز چلتا ہے جو چیز یہاں دبی ہوگی سو سال بعد وہ ہزاروں میل دور پہنچ جائے گی۔ بالکل اسی طرح جو علم جغرافیہ بتا رہا ہے یعنی سینکڑوں سال پہلے براعظم امریکا و ایشیا جڑے ہوئے تھے مگر اب وہ زمین کی گردش کے تحت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرا جسم بھی اجین سے یہاں آ گیا جسے تمہارے بابا نے جگا دیا۔ اب جب میں جاگ اٹھا ہوں تو اس زندگی کا لطف لینا بھی ضروری ہے۔ مجھے قوت دو جلد سے جلد قوت لا دو۔ آدھا جسم زندہ ہو چکا ہے۔ آدھا باقی ہے اسے بھی زندہ کر دو۔ پھر تم آزاد ہو گی، اپنی مرضی کی زندگی گزار سکو گی۔ کبھی کسی بات کی پریشانی نہ ہوگی دولت برسا کرے گی۔"

"مگر مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

''قبل مسیح ارکان جواب برما کا سرحدی شہر ہے وہاں ایک ''بودھی'' کا پاک درخت بویا گیا تھا۔ دو بھکشو جو اپنی باطنی ریاضت میں ثانی نہیں رکھتے تھے تبت سے چل کر چٹا گانگ پہنچے پھر کٹھن صعوبتیں اٹھاتے، کڑی مشکلوں سے گزرتے، ارکان تک جا پہنچے۔ ان دو بھکشوؤں میں سے ایک کڑی مسافت کی وجہ سے وہاں پہنچتے ہی مر گیا۔ مگر ایک جو بچ گیا تھا اس نے وہاں ایک خانقاہ بنا ڈالی اور روحانی علوم کی تحقیق میں وقت گزارنے لگا۔ اس نے یہ کام نہایت رازداری سے شروع کیا تھا مگر دھیرے دھیرے یہ بات علاقے میں پھیلتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ ان لوگوں نے کوئی ایسا راز دریافت کر لیا جس کی وجہ سے وہ احترام کا باعث بن گئے۔ انہیں شفا کی وہ قوت حاصل ہوگئی تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ اگر مردے کو بھی دوا دے دیتے تو وہ زندہ ہو جاتا تھا۔ وہ خود کو کئی ہزار سال تک زندہ رکھنے پر قادر ہو گئے تھے۔ وہ خانقاہ اب بھی ہے لیکن اب وہاں کئی سو بھکشو رہتے ہیں۔ ان میں کچھ سرکردہ ہیں جن کے پاس علم کا وہ خزانہ ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا ہے۔ تمہیں ان سے وہ کتاب حاصل کرنی ہے جو بڑے بھکشو کے پاس تھی اور اس میں عمر طویل کرنے کے متعلق اہم باتیں لکھی ہیں۔''

''تم خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتے۔ تمہارے پاس تو خفیہ قوت بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ سب سحر و ساحری میں یکتا ہیں وہاں پہنچتے ہی غلط خیال سے جانے والوں کی آنکھیں جاتی رہتی ہیں۔ میں خود بھی اندھا ہو جاؤں گا۔''

''تو کیا میں اندھی نہیں بن سکتی ہوں؟''

''نہیں کیونکہ تم ساحرہ نہیں ہو، معمولی لڑکی ہو۔''

''تو ٹھیک ہے میں جاؤں گی۔''

''جتنی جلدی ممکن ہو نکل پڑو تا کہ وہ بڈھا منہ دیکھتا رہ جائے۔ اس کی پوری کوشش ہے کہ میں دوبارہ زندہ نہ ہو سکوں۔''

''میں اگر کسی بھی طرح ارکان پہنچ گئی تو بھی یہ مسئلہ رہے گا کہ خانقاہ کے اندر کیسے جاؤں؟''

''اس کے لیے تم یہ لکڑی رکھ لو۔'' کہہ کر اس نے ڈھائی تین انچ کی لکڑی کا ایک مستطیل ٹکڑا بڑھایا۔ ''یہ لکڑی ایک چابی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں ایسی تین لکڑیاں اس جماعت کے تین برگزیدہ افراد کے پاس تھیں۔ ان میں سے ایک کام سے ارکان کے باہر آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اسے قتل کر کے یہ لکڑی حاصل کر لی۔ تب سے اس خانقاہ کے بھکشو اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

میں اس بھری پری دنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اگر اس مہم سے واپس نہ آ سکی تو بھی مجھ پر رونے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے بھی میں راضی ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے تم گھر جاؤ اور ایک لمبے سفر کے لیے خود کو تیار کر لو۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں بھی چلتا ہوں۔'' کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک گلی میں مڑ گیا۔

گھر آ کر میں نے ہر رخ پر غور کیا بالآخر سفر پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ نور النہار کی ماں سے کہا کہ میں میمن سنگھ جا رہی ہوں اور سیدھی اسٹیشن جا پہنچی۔ گرین ایرو نامی ایکسپریس ٹرین چٹا گانگ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیا اور بیٹھ گئی۔

میرے سامنے والی برتھ پر ایک خوبرو جوان بیٹھا تھا باقی سب بس ایویں سے تھے، عام سے دیہاتی۔ پتانہیں کیوں اس نوجوان میں مجھے ایسی کون سی جاذبیت نظر آ رہی تھی کہ بار بار میرا ذہن اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے نوجوان کی طرف دیکھا اور تب یہ انکشاف ہوا کہ موصوف بھی چور نظروں سے میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کوئی اور موقع ہوتا، حالات اعتدال پر ہوتے، زندگی میں خوشیوں کی جھنکار ہوتی تو اسے دیکھ کر یقیناً میرے دل میں چور جذبے پیدا ہو جاتے مگر حالات نے مجھے پتھر کا بنا دیا تھا۔ شگفتہ جذبے معدوم ہو چکے تھے۔ اب تو مجھے ہر ایک پر شک ہوتا تھا کہ یہ بھی میرے دشمنوں میں سے کسی کا کارندہ ہے۔ اس لمحے بھی اس خیال نے سر اٹھایا تھا۔ یوں بھی میں جس مہم پر نکلی تھی یہ کوئی نیک کام تو تھا نہیں، اور وہ موٹے منکوں کی مالا والے بابا جی ہر بدکام سے روکنے کے لیے خدائی فوجدار تھے۔ کہیں یہ نوجوان بھی ان کا ہرکارہ نہ ہو۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے تقویت ملی۔ ٹرین پر بیٹھنے کے بعد سے جو خوف دامن گیر تھا وہ کچھ حد تک کم ہو گیا۔ میں مطمئن ہو کر بیٹھی تھی اور اسٹیشن پر اسٹیشن گزرتے جا رہے تھے کہ اکھوڑا جنکشن آ گیا۔ یہ وہی جنکشن تھا جسے بعد میں کافی شہرت ملی۔ 1971ء میں جب پاک بھارت جنگ ہوئی تو اس اسٹیشن پر غضب کا رن پڑا تھا۔ پاک فوج کے بہادر جوانوں نے دشمن کی لاشوں سے پلیٹ فارم بھر دیا تھا۔

خیر اکھوڑا میں گاڑی رکی تو میں نے کھڑکی سے باہر گردن نکالی اور چائے والے کو آواز دی۔ چائے والا نزدیک آ رہا تھا میں ہاتھ باہر نکالے اسے قریب آنے کا اشارہ کر رہی تھی کہ پلیٹ فارم پر کھڑے ایک نوجوان نے جھپٹا مارا اور میری کلائی پر بندھی گھڑی نوچ لی۔ میرے سامنے والے برتھ پر بیٹھنے والا نوجوان اس وقت دروازے پر کھڑا تھا۔

اس نے وہیں سے چھلانگ لگائی اور بھاگتے ہوئے اچکے کو دبوچ لیا پھر اسے کھینچتے ہوئے میرے قریب لے آیا۔ گھڑی اب تک اچکے کی مٹھی میں تھی۔ نوجوان نے اسے لے کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سفر کے دوران انسان کو ہوشیار رہنا چاہئے۔''

''شکریہ!'' کہہ کر میں نے گھڑی لے لی۔ اچکے کو ریلوے پولیس ساتھ لے گئی تھی۔ تھانے تک وہ بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ لیکن انجن کے سیٹی دیتے ہی دوڑتا ہوا واپس آ گیا تھا۔

ٹرین چلی تو وہ آ کر میرے سامنے والی برتھ پر بیٹھ گیا باقی لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے مگر میں خاموش تھی کیونکہ اب تک تعارف کی رسم ادا نہیں ہوئی تھی اس لیے فاصلہ خاموشی کے سہارے قائم تھا۔ اس خاموشی کے گراں بار احساس کو اسی نے ختم کیا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ پڑھتی ہیں؟''

''جی نہیں!''

''اچھا اچھا تو یقیناً کا کس بازار گھومنے آئی ہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تو کیا ہل ٹریک کا جنگل دیکھنے آئی ہیں؟'' اس نے میری جی نہیں، جی نہیں سے اکتا کر کہا۔

''جی ہاں ہل ٹریک جا نا ہے۔''

''یقیناً ڈاکٹروں نے بھیجا ہوگا کیونکہ عام شخص جنگل کی سیر کے لیے اتنی دور نہیں آتا ہے۔'' اس نے شریر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔''

''اگر برا نہ مانیں تو یہ بھی بتا دیں کہ کس گاؤں میں جائیں گی۔ دراصل میں خود بھی اسی علاقے کا ہوں۔''

''اچھا!'' میں نے مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''اگر رہبری کی ضرورت سمجھیں تو بندہ مفت فراہم کر سکتا ہے۔'' وہ شوخ لہجے میں بولا۔

''مجھے اگیاب جانا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ارے باپ رے، آپ اکیلی اگیاب جا سکیں گی؟''

''کیوں؟ کیا اگیاب دنیا کے نقشے سے غائب ہو گیا ہے؟''

''غائب تو خیر نہیں ہوا ہے لیکن وہاں تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ بڑے بڑے جواں مرد حوصلہ ہار جاتے ہیں۔''

''رنگون جانے کا راستہ تو یہی ہے؟''

''ہاں مگر یاد رہے ہل ٹریک سے برما کے پہلے شہر اگیاب تک 'اگیاب' اور 'بے تالی' یہ دو بڑے گاؤں ہیں اور یہ دونوں ہی ہل ٹریک کے وسط میں ہیں، کیا آپ اس سے پہلے گئی ہیں؟''

''جی نہیں، میرے چچا کے دوست ہیں وہ اسی گاؤں کے ہیں انہی کے بلاوے پر میں جا رہی ہوں۔''

''اچھا! لیکن آپ دونوں میں پاگل کون ہے؟'' اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی کیا کہا؟'' میں سمجھ نہ سکی کہ وہ طنز کر رہا ہے یا مذاق۔

''اکیلی لڑکی کو بیابان جنگل میں جو انتہائی دشوار گزار رستوں سے پٹا ہو کوئی صحیح الدماغ تو بلوا نہیں سکتا۔''

''انہوں نے کہا تھا کہ چٹا گانگ پہنچ کر مجھے اطلاع دے دینا میں آ جاؤں گا۔''

''محترمہ! اگیاب تک نہ کوئی ریل جاتی ہے اور نہ ڈاک تار کا محکمہ کام کرتا ہے۔ پورا راستہ ٹٹو پر طے کرنا پڑتا ہے۔''

''اور یہ ٹٹو کہاں سے ملتے ہیں؟''

''پیسوں سے ملتا ہے اور چٹا گانگ کے نواح میں بازار ہے وہاں سے خرید کر آپ کو آگے جانا ہوگا مگر یاد رکھیں راستے میں چکما قبیلے آباد ہیں۔ کہنے کو تو بدھ مذہب کے پیروکار ہیں مگر فطرتاً چنگیزی ہیں۔ لوٹ مار کرنا ان کا شوق ہے۔''

مجھے بس اتنا اشارہ دیا گیا تھا کہ چٹا گانگ میں ایک مندر ہے وہاں کا پروہیت میری رہنمائی کرے گا۔ پھر بھی اس نوجوان سے خاصی معلومات مل گئی تھی۔

''دیکھیے محترمہ میں دو دن تک حالی شہر میں رکوں گا اس دوران میں اگر آپ محسوس کریں کہ میری ضرورت ہے تو بلا تکلف مجھے بلا لیجیے گا۔

میں آپ کو اگیاب تک پہنچادوں گا۔'' نوجوان نے کہا۔

باتوں کے دوران وقت گزرتا رہا۔ سفر طے ہوتا رہا اور پھر چٹا گانگ آ گیا۔ گاڑی کے رکتے ہی میں نیچے اتری۔ نوجوان تو گویا میرا سایہ بن گیا تھا۔ وہ بھی اتر آیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں چمڑے کا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا جبکہ میں خالی ہاتھ تھی صرف ایک وینٹی بیگ تھا جس میں انتہائی ضرورت کی چیزیں تھیں۔ یہی میرا کل اثاثہ تھا مگر اس بیگ میں نوٹوں کا ایک بنڈل بھی تھا اس لیے مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ میں ٹکٹ نکال کر گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس نوجوان نے پوچھا۔'' آپ ٹھہریں گی کہاں؟''

''کسی ہوٹل میں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''روپوشی لا جنگ صحیح رہے گا۔ یہ ہوٹل میرے جاننے والے کا ہے۔ اگر شہر میں ٹھہرنا ہوتا ہے تو میں اسی ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔''

''آپ کہتے ہیں تو وہیں ٹھہر جاتی ہوں۔''

''تو پھر آیئے۔'' کہہ کر اس نے ایک سائیکل رکشا کو روکا اور اس میں سوار ہو گیا پھر مجھ سے بولا۔'' آیئے ناں۔''

یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا۔ ابھی تک کسی غیر مرد کے ساتھ اس طرح رکشے میں بیٹھی نہیں تھی اس لیے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اگر آپ نے بنگلہ دیش کا سائیکل رکشا دیکھا ہے تو میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ جس نے بھی اس قسم کے رکشے کا ڈیزائن کیا ہے خاصا عاشق مزاج ہوگا کیونکہ دو آدمی بڑی مشکل سے اس میں سماتے ہیں۔

رکشا تیز رفتاری سے دوڑتا رہا اور ہم ایک ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے۔ اس نے رکشے سے اتر کر کرایہ دیا اور مجھے ساتھ لے کر کاؤنٹر پر پہنچا۔ اسی نے کمرا حاصل کیا۔ وہ خود بھی اسی ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا جبکہ اس نے یہ بتائی تھی کہ اس کا گاؤں پہاڑی پر ہے اور وہاں جانے کے لیے صبح سویرے نکلے گا۔ حالی شہر جا کر صبح تڑکے لوٹنا ممکن ہے۔

میں نے کچھ دیر آرام کیا پھر مندر کی تلاش میں نکل پڑی۔ شورویرنے نے بتایا تھا کہ وہ مندر ساحل کے نزدیک ہوگا اور اس مندر کے باہر دو شیولنگ نصب ہیں۔ عام طور سے مندر کے باہر یا اندر صرف ایک شیولنگ ہوتا ہے اس لیے اس مندر کو ڈھونڈنا دشوار نہ تھا۔ شام کا وقت تھا اس لیے ٹریفک کچھ زیادہ ہی تھی۔ سائیکل رکشا اور بے بی ٹیکسی (آٹو) کے علاوہ موٹر کاریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں بھیڑ بھاڑ بھرے رستے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک ایسا ہی مندر نظر آ گیا۔ شاید پوجا اور آرتی ختم ہو چکی تھی کیونکہ دور و نزدیک کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے مندر کے احاطے میں داخل ہو کر جائزہ لیا۔ ایک طرف قطار سے کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ یہ کمرے پجاریوں کے لیے وقف ہیں۔ ان کمروں میں سے ایک کمرا باہر ہی سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ یقیناً وہ بڑے پجاری کا ہوگا۔ اس لیے میں نے آگے بڑھ کر دستک دی فوراً ہی دروازے کے عقب سے آواز آئی۔ ''کون ہے جو اس وقت مخل ہو رہا ہے۔''

''ہم مچھلیاں پکڑنے والے ہیں اور سکون کی تلاش میں آئے ہیں'' میں نے جواب دیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوئی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ پھر بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک منحنی سی آواز سنائی دی۔ ''اندھیرے کی پروا نہ کرو سیدھے بڑھتے چلے جاؤ۔''

میں کچھ قدم آگے بڑھی تھی کہ ایک اور دروازہ کھل گیا اور میں داخل ہوگئی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ کمرے کے اندر بھی ایک کمرا ہے۔ اس کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ کمرا بھی خاصا بڑا تھا۔ اندر ایک چوکی بچھی تھی جس پر ایک بوڑھا پھوس پنڈت نیم دراز تھا۔ اس کی سفید داڑھی خاصی لمبی تھی۔ سر گُٹھا ہوا تھا اور بھویں بھی سفید تھیں۔ ماتھے پر صندل سے قشقہ لگایا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کئی اور آدمی بیٹھے تھے۔ میں انہی کے درمیان جا کر بیٹھ گئی۔ پنڈت نے پوچھا۔

''کیسے آنا ہوا؟''

''بس آپ کے درشن کے لیے آ گئی ہوں۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ''آپ کو مجھے اگیاب جانے میں مدد کرنا ہے۔''

''میرے خیال سے اگیاب جانا آسان نہیں ہے۔''

''مگر آپ کو میری مدد کرنا ہی ہوگی۔ یہی مجھ سے کہا گیا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''میں شورویر کے حکم سے آئی ہوں۔'' شورویر کا نام لیتے ہی وہ چونک گیا پھر بولا۔

''وہ تو مر چکا تھا؟''

''یہ پرانی بات ہے۔ وہ پھر سے زندگی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''اگیاب جانے کا مطلب یہی ہے۔ خیر اگر تم کامیاب ہوگئیں تو میرا دوست پھر سے زندہ ہو جائے گا۔ اس کا زندہ ہونا میرے لیے بھی ضروری ہے۔ میں اگلی منزل کے لیے رقعہ لکھ دیتا ہوں۔''

میں خط لے کر ہوٹل میں لوٹ آئی۔

میں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ یہ ایک دوسرے درجے کا ہوٹل تھا۔ تختوں کو جوڑ کر دیواریں بنائی گئی تھیں اور ٹین کی چادروں سے چھت بنی تھی۔ کمرے میں ایک جہازی سائز بیڈ تھا اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ بیڈ پر میں تھی اور کرسی پر وہ نوجوان جس نے میرے ساتھ ریل میں سفر کیا تھا، وہ بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کا عکس دیکھ لیا تھا اسی لیے میں نے اسے بلایا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا بڑی میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں خود بھی نظروں کی چبھن محسوس کر رہی تھی اسی لیے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے پوچھا۔ ''تم کرتے کیا ہو؟''

''فی الحال تو نوکری کی تلاش کر رہا ہوں۔ بی اے کر چکا ہوں اور اب بی اے کرنے پر غور کر رہا ہوں۔'' اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا اور میں شرما گئی۔ دراصل بنگلہ میں بیچلر آف آرٹس کی ڈگری کے لیے تو بی اے استعمال ہوتا ہی ہے لیکن بنگلہ میں ''بی اے'' شادی کرنے کو بھی کہتے ہیں۔

''اچھا، یہ بتاؤ، اگر تمہیں ایک ہزار روپے مہینے کی نوکری مل جائے تو کرو گے؟''

''بالکل کروں گا، لیکن اتنی بڑی تنخواہ والی نوکری بی اے پاس کو کہاں ملتی ہے۔''

''یہ صحیح ہے کہ بی اے پاس کو کلرکی ملتی ہے اور ایک کلرک کو تین، ساڑھے تین سو سے زیادہ نہیں ملتے مگر ایسے بہت سے کام ہیں جو Handsome pay کر سکتے ہیں۔'' پتا نہیں، کیسے میں جو جاہل جٹ تھی، انگلش کے صحیح لفظ بول گئی۔ شاید یہ بھی شورویر یعنی اس پُراسرار شخصیت کا کرشمہ تھا جو پہلی بار مجھے سانپ کی شکل میں نظر آیا تھا اور اس سفر کی وجہ بھی وہی تھا۔

''مجھے کرنا کیا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''میری رہبری، میری مدد!'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''یعنی تمہارا نوکر بن کر اگیاب جانا ہوگا؟''

''نوکر نہیں، مددگار......! تم اپنا قیمتی وقت دو گے تو اس کی قیمت نہ سہی، بدلہ تو دینا ہوگا نا! اگر تم راضی ہو تو بتاؤ میں پیشگی تین ماہ کی تنخواہ دے دوں گی۔ یہ رقم تم اپنے گھر والوں کو دے دینا۔ راستے کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔''

''پیشکش تو بہت اچھی ہے لیکن رقم کے لیے نہیں، تمہاری خاطر میں یہ نوکری کرنے پر تیار ہوں۔''

''تو یہ رہی تین ماہ کی پیشگی رقم......!'' میں نے فوراً کرارے نوٹ بڑھا دیئے۔ روپے کی مجھے کوئی کمی نہ تھی کیونکہ جب ضرورت محسوس کرتی، خود بہ خود میرے پاس آ جاتے۔ کبھی تکیے کے نیچے سے نکلتے تو کبھی کپڑے کی تہ سے۔ کسی نہ کسی طرح پورا ایک بنڈل مل ہی جاتا تھا۔

روپے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی پھر بھی وہ بولا۔ ''ارے نہیں، میں کوئی پائی پیسا نہیں لوں گا۔''

''نہیں، رکھ لو۔'' میں نے زور دیا تو اس نے رکھ لیے۔ اسی دن پروگرام بن گیا کہ ہم ہفتے کے دن سفر شروع کر دیں گے۔ یوں بھی کہا جاتا ہے کہ سفر کے لیے بہتر دن ہفتے کا ہوتا ہے۔ اس دن اگر ایک پتھر بھی اپنی جگہ سے ہلے تو سو سال بعد سہی، اپنی جگہ لوٹ کر ضرور آتا ہے۔ میں نے بھی یہی دن پسند کیا اور خچر وغیرہ کی خریداری کے لیے اسے رقم دے دی۔ وہ حیران تھا کہ ایک جنگلی سردار سے ملنے کے لیے میں اتنی اتاولی کیوں ہو رہی ہوں؟ میں نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا تھا کہ میں ایڈونچر کی شوقین ہوں، اسی وجہ سے وہاں جانا چاہ رہی ہوں۔ میرے والد کے پاس بہت رقم تھی جو بطور ترکہ اب مجھے ملا ہے۔

☆======☆======☆

اونچی نیچی کھائیاں، گہرے عمیق غار جن کے دہانے دکھائی نہ دیں کیونکہ خودرو بیلیں ان پر اس طرح پردہ کیے ہوئے ہوتیں کہ وہ بھی زمین کا حصہ نظر آتے۔ جانوروں کی حسیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ شاید ہی کوئی جنگلی جانور ان میں گرتا ہو مگر ہم جانور نہ تھے، عام سے انسان تھے اس لیے ان میں گر سکتے تھے سو بڑی احتیاط سے پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ اسباب ایک ٹٹو (pony) پر لاد رکھے تھے جبکہ دو ٹٹو الگ سے تھے۔ ایک پر میں سوار تھی اور دوسرے پر وہ یعنی ابوالکلام! ایسے وقت میں مجھے شورویر پر غصہ آ رہا تھا۔ کہاں تو وہ ہر جگہ خدائی خدمت گار کی طرح میری مدد کو آ جاتا تھا۔ کبھی تھانے کے لاک اپ سے تو کبھی پھانسی کے پھندے سے بچا لیتا تھا اور اب وہ رابطہ کرنے پر بھی تیار نہ تھا۔ ابھی تک اس نے مڑ کر خبر بھی نہ لی تھی جبکہ میں اس کی وجہ سے در در بھٹک رہی تھی۔ اسے زندگی دینے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہی تھی۔

''کس خیال میں ڈوب گئیں؟'' ابوالکلام نے مسکرا کر پوچھا۔

''آں......ہاں، بس یوں ہی......! میں حالات پر غور کر رہی تھی۔ اگر تم ساتھ نہ ہوتے تو مجھے کس قدر پریشانی ہوتی!'' میں نے چونک کر جواب دیا اور پھر سامنے کی طرف دیکھنے لگی۔

ہم گھنے جنگل سے گزر رہے تھے۔ دائیں بائیں جگہ جگہ گہری کھائیاں تھیں۔ راستہ انتہائی دشوار گزار تھا۔ ہم دونوں دو ٹٹوؤں پر سوار تھے۔ ابھی آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ دھپ دھپ کی آواز کے ساتھ پیڑوں پر سے کئی آدمی کودے۔ ان کے چہرے چوڑے اور قد بوٹے تھے۔ رنگت گوری تھی۔ ان سب کے ہاتھوں میں لمبے لمبے برچھے تھے۔ جسم پر کپڑوں کے نام پر معمولی سی چندیاں تھیں جن سے ستر پوشی کی گئی تھی۔ پورے جسم پر سرخ رنگ کی گیرو مٹی ملی ہوئی تھی۔ انہوں نے اتنے منظم انداز میں گھیرا ڈالا تھا کہ ہم چاہ کر بھی فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے کر ایک جانب بڑھنے کا اشارہ دیا۔ ہمارے سامنے اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ہم ان کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ رہ رہ کر وہ سب منہ سے عجیب سی آوازیں نکالتے جو یقیناً کافی دور تک سنی جا رہی تھیں۔ اتنی دیر میں، میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ کچھ تو ہمارے ساتھ چل رہے تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو درختوں کے اوپر ہی اوپر چل رہے تھے۔ ایک درخت سے اچھل کر وہ دوسرے درخت پر چڑھ جاتے تھے۔ اسی طرح جھولتے ہوئے نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

کافی دور جانے کے بعد ایک آبادی نظر آئی۔ دائرے میں پچاس، ساٹھ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔

وہ سب ہمیں ساتھ لے کر ان جھونپڑیوں کے درمیان میں پہنچے۔ جھونپڑیوں کے درمیان میں جو میدان تھا، اس میدان کے کنارے پر ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا۔

وہ لوگ ہمیں اس چبوترے پر بٹھا کر خود بھی میدان میں بیٹھ گئے۔

دن ابھی ڈھلا نہیں تھا۔ سورج میں تمازت باقی تھی پھر بھی وہ سب دھوپ میں جمے بیٹھے تھے۔ اتنے میں شور سا بلند ہوا۔ میں نے اسی طرف دیکھا۔ سامنے والی جھونپڑی سے نکل کر ایک نہایت قد آور شخص چلا آ رہا تھا۔ اس نے گلے میں قیمتی پتھروں کی مالا پہن رکھی تھی اور سر پر رنگ برنگے پروں کا تاج تھا۔ اس شخص نے نزدیک پہنچ کر ہمارا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں تک جانا ہے؟''

اس نے نہایت شستہ بنگلہ میں پوچھا تھا۔ اس جنگل میں کوئی اتنے مہذب انداز میں بھی باتیں کر سکتا ہے، اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں نے تعجب خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا کہ ان جنگلیوں کے درمیان یہ کہاں سے آ گیا جبکہ صورت شکل اور حلیے سے وہ بھی انہی جیسا لگ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''آپ کا لب و لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ نے ڈھاکا یا کلکتہ میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے۔''

''جی ہاں، مگر اپنے رسم و رواج کو بھولا نہیں ہوں مگر آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ آپ کون ہیں، کہاں سے آئی ہیں؟''

''مجھے احساس ہے کہ آپ کو مطمئن کرنا دشوار ہوگا اس لیے میری گزارش ہے کہ کچھ دیر مجھ سے تخلیے میں باتیں کر لیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کہتی ہیں تو یہی سہی! آیئے میرے ساتھ!'' کہہ کر اس نے پہرے پر کھڑے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''انہیں لے کر آؤ۔''

چٹا گانگ کی بنگلہ یوں بھی عجیب وغریب ہوتی ہے لیکن اس نے جس زبان میں یہ بات کہی تھی، وہ چٹا گانگ کی بنگلہ سے یکسر مختلف اور زیادہ دشوار تھی۔ اس کے آدمیوں میں سے ایک نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ میں دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔

وہ مجھے ساتھ لے کر ایک جھونپڑی میں آئے۔

وہاں پہنچ کر اس نے کہا۔ ''ہاں، اب بولو، کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میں مقدس تابوت پر جانا چاہتی ہوں۔''

''کیا......! تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے؟ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے! کیوں موت کو آواز دے رہی ہو؟''

''کیا کروں کہ حکم یہی ہے۔'' کہہ کر میں نے ڈھائی انچ کا مخروطی لکڑی کا ٹکڑا نکالا اور اسے دکھایا۔ اسے دیکھتے ہی وہ سجدہ ریز ہو گیا پھر بولا۔ ''معاف کر دینا کہ میں تمہارے بارے میں غلط خیال دل میں لایا تھا۔ ہم اپنے علاقے میں باہر والوں کا آنا پسند نہیں کرتے ہیں، صرف اس لیے کہ باہر کی کثافت سے ہم لوگ بچنا چاہتے ہیں۔ جھوٹ، مکر وفریب سے ہم کوسوں دور ہیں، اگر باہر والے آتے رہے تو یہاں کا ماحول بھی ڈھا کا والا ہو جائے گا لیکن مقدس نشان کی وجہ سے ہم تمہیں راستہ بتانے پر مجبور ہیں۔''

میں مسکرا کر خاموش رہی۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر طوفان سا اٹھ رہا تھا اور میں اس سے بچنے کی سعی کر رہی تھی۔

''ہمارا آدمی تمہیں اپنے علاقے سے باہر تک پہنچا آئے گا۔ آگے تمہاری قسمت......!''

''بس مجھے اتنی ہی مدد درکار ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''آج آپ ہمارے مہمان ہیں، کل ہم آپ کو پہنچا آئیں گے۔'' اس کے التماس پر میں ٹھہرنے پر راضی ہو گئی۔

اس نے ہمیں ایک وسیع جھونپڑی میں ٹھہرایا تھا۔ وہ جھونپڑی کسی کشادہ مکان کے برابر تھی۔ پندرہ بائی اٹھارہ فٹ کے تین کمرے برابر برابر میں بنے ہوئے تھے مگر ان کی چھت ایک تھی۔ جھونپڑی میں داخل ہونے کے لیے دو فٹ اونچے برآمدے پر چڑھنا پڑتا تھا۔ برآمدے کے سامنے بانس کی قمچیوں سے بنی جالی لگائی گئی تھی۔ ابوالکلام جسے میں ابو کہہ کر مخاطب کرتی تھی، اسے میرے برابر والا کمرا نہ دے کر اس کے برابر والا کمرا دیا گیا تھا۔ یعنی میرے اور اس کے کمرے کے درمیان والا کمرا خالی تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھنا مناسب نہ سمجھی اور کمرے میں داخل ہو گئی۔

اندر کافی بڑا بستر بچھا تھا لیکن بستر پر چادر نہ تھی۔ پوال کو تہ بہ تہ رکھ کر بستر کی شکل دی گئی تھی۔

میں بستر پر بیٹھی آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی کہ ایک عورت کھانا لے کر آ گئی۔ اس عورت نے چٹا گانگ ہل ٹریک کی دیگر عورتوں کی طرح گھٹنوں کے کچھ نیچے سے لے کر سینے تک تہ بند باندھ رکھی تھی۔ یہی یہاں کا پہناوا تھا۔ وہ ڈھاک کے پتے پر چاول اور ناریل کے خشک چھلکے میں دال لائی تھی۔ میں نے دال چاول کھائے۔ بستر پر لیٹنے لگی تھی کہ وہ عورت بولی۔ ''ٹھہریں، میں چادر لا رہی ہوں۔''

بنگلہ اور برمی زبان مل کر جو نئی زبان بنی تھی، اسی میں وہ باتیں کر رہی تھی۔

''لے آؤ۔'' میں نے کہا تو وہ باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں برسوں پرانی چادر تھی جسے اس نے بستر پر بچھا دیا۔

صبح تڑکے ہم چلے تھے۔ اب شام ہونے والی تھی۔ لالٹین جل چکی تھی۔ میں بستر پر لیٹ گئی۔

مجھے یوں لیٹے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ آنکھوں میں نیند اتر آئی۔ میں بے خبر سو رہی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں کروٹ بدل کر دوبارہ سونا چاہتی تھی کہ برآمدے میں ہونے والی ایک مدھم چاپ سن کر چونک گئی۔ پتا نہیں، کیسی آواز تھی یہ......؟

میں نے کان آہٹ پر لگا دیے۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے۔ اتنے میں وہی آواز پھر سنائی دی۔ دروازے کے باہر اور بالکل قریب، میں آواز پر غور کرنے لگی۔ عجیب قسم کی آواز تھی وہ، جیسے کوئی بڑا مینڈک اُچھل کر آگے بڑھ رہا ہو۔

میں تھوڑی دیر تک حیران و ششدر آواز کی نوعیت پر غور کرتی رہی پھر خوف سے اُچھل پڑی۔ یقیناً یہ کوئی آدمی تھا لیکن کسی چوپائے کی مانند ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اچھلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ غالباً کوئی دشمن آ گیا تھا۔

میں ایک کونے میں چھپ کر کھڑی ہو گئی اور وہ چاقو ہاتھ میں لے لیا جسے ابو نے چٹا گانگ کے بازار سے خرید کر دیا تھا۔ آواز وقفے وقفے سے آ رہی تھی۔ میں اضطراری کیفیت میں کھڑی سنتی رہی۔ چند ثانیے بعد ہی وہ آواز میرے کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے سے گزر گئی۔

میں نے کچھ توقف کیا اور پھر دروازے کو ذرا سا کھولا اور گردن نکال کر باہر جھانکا۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ میں خالی برآمدہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اگر کوئی شخص تھا تو کہاں گیا......؟ اتنی جلدی غائب ہو جانا خلافِ عقل بات تھی کیونکہ برآمدے کو بانس کی قمچیوں سے بنی دیوار نے گھیر رکھا تھا۔ اسے پھلانگنا بھی آسان نہ تھا۔ اس کے معنی یہی تھے کہ وہ جو کوئی بھی تھا، دونوں کمروں میں سے کسی ایک میں داخل ہو کر چھپ گیا تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کوئی جانور تھا......! گھنے جنگل میں کسی درندے کی موجودگی حیرت انگیز نہیں تھی خوف کی سرد سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں واپس ہونا چاہتی تھی کہ رُک گئی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی آدمی ہو، اس خیال نے پھر اُکسایا اور میں ابو کے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی کیونکہ اس کی زندگی خطرے میں تھی اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔

آنے والے کی نیت اچھی نہیں تھی ورنہ وہ رات کے وقت یوں دبے پاؤں کیوں آتا......؟ اس خیال نے میرے اندر بجلی سی بھر دی۔ اعصابی کشیدگی بھی دور ہو گئی اور گھبراہٹ کی بجائے جوشیلا پن دل میں در آیا تھا۔ میں کوئی آواز پیدا کیے بغیر چپکے سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

ابو کے کمرے کے سامنے پہنچ کر مجھے تھوڑی سی ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔ میرا خیال غلط بھی ہو سکتا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا، ممکن ہے، آگے نکل گیا ہو مگر یہ دیکھ کر کہ ابو کے کمرے کا دروازہ بند نہیں ہے، میں اندر گھس گئی۔

میں جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی، اندھیرے کونے سے ایک ہیولا سا میری طرف لپکا۔ اس نے ایک ہی جست میں میرا گلا پکڑ لیا تھا اور دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری سانس رکنے لگی تھی اور میں آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پیر چلانے لگی تھی مگر مقابل کی پکڑ بہت سخت تھی۔ وہ آکٹوپس کی طرح مجھے پکڑے ہوئے تھا۔

وہ اچانک ہی مجھ پر آ پڑا تھا اس لیے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا اور میں جھونک میں نیچے گر گئی تھی لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میری گردن آزاد ہو گئی تھی۔ میں اٹھ بھی نہ پائی تھی کہ وہ پھر مجھ پر آ رہا تھا لیکن اس بار میں غافل نہیں تھی۔ وہ جیسے ہی میری گردن پکڑنے کے لیے مجھ پر

جھکا میں نے ٹانگوں کا زور لگا کر اسے اچھال دیا۔ وہ بھد سے فرش پر گرا مگر پھرتی سے اٹھ گیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ گھپ اندھیرے میں ہماری یہ کشتی خاصی عجیب تھی۔ پتا نہیں، اس نے اپنے جسم پر کیا لگا رکھا تھا کہ وہ بار بار پھسل رہا تھا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے بال لمبے ہیں۔

میں نے اسے دھکا دے کر گرانا چاہا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ میں عورت ہوں۔ مجھ میں اتنی قوت نہیں ہے کہ میں کسی مرد کو زیر کر سکوں مگر اندھیرے میں، مَیں نے محسوس کیا کہ میرا مقابل کمزور پڑ رہا ہے۔ وہ میرا مقابلہ نہیں کر پا رہا ہے تبھی ابول کی آواز آئی۔

''کے......کے اچھے؟'' (کون......کون ہے؟)

''امی اچھی آر ایک شترواچھے۔'' (میں ہوں اور ایک دشمن ہے۔) میں نے نسبتاً نیچی آواز میں کہا۔ اتنی دیر میں ابول نے لالٹین کی روشنی تیز کر دی۔ زرد زرد سی کانپتی ہوئی روشنی میں اپنے مدِمقابل کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ وہ ایسا کچھ کر سکتا ہے۔

اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی وزنی ہتھوڑے سے اس کا چہرہ کوٹا گیا ہو۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ میرے ہر گھونسے پر اس کی دبی دبی سی چیخ کیوں گونجتی تھی۔ زخم دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ غضب کا صابر تھا اور بڑی آسانی سے درد کو پی رہا تھا۔ مجھے ایک غیر یقینی بات کا بھی احساس ہوا کہ میرے بازوؤں میں بہت زیادہ قوت آ گئی تھی۔ کیا یہ خیال صحیح ہے؟ اسے آزمانے کے لیے میں نے اس شخص کے سر پر ایک گھونسا اور مارا۔ یہ گھونسا پوری قوت سے چلایا تھا۔ یقین کریں، اس گھونسے نے اس کے سر کی ہڈی چٹخا دی اور ہڈی چٹخنے کی آواز میں نے صاف سنی تھی۔

وہ گھونسا کھا کر لڑھک گیا تھا۔ ابول نے اٹھ کر اس کی نبض دیکھی۔ پلکیں الٹ کر دیکھا پھر افسوس بھرے لہجے میں بولا ''مر گیا! مگر یہ میرے کمرے میں کیوں آیا تھا؟''

''ادھر وہ چاقو پڑا ہے۔ اسے دیکھ کر تمہیں احساس نہیں ہوا کہ وہ کیوں آیا تھا؟'' میں نے اس کے بستر کے قریب پڑے چاقو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اگر یہ ہمارا دشمن تھا تو پھر اس نے ہمیں مہمان کیوں ٹھہرایا تھا؟ قبیلے کا سردار تو کچھ بھی کر لے، کوئی روک نہیں سکتا۔ اُسے اندھیرے میں حملہ کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟'' ابول کے لہجے میں تعجب تھا۔

''سیدھی سی بات ہے وہ تمہیں راستے سے ہٹا کر مجھ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اب یہاں سے نکلنے کی سوچو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم پھنس کر رہ جائیں۔ اپنے سردار کی موت پر اُجڈ قبیلے والے خاموش نہیں رہیں گے۔ ہمیں برداشت نہیں کریں گے۔''

''لیکن رات کے اندھیرے میں ہم کیسے نکلیں گے؟''

''دن کے اُجالے میں ان جنگلیوں کے برچھے راستہ روکیں گے اس لیے بہتر یہی ہے کہ رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھالو۔''

''ہمارے ٹٹو اوران پر لدے سامان کہاں ہو سکتے ہیں، کچھ اندازہ ہے؟''

''ٹٹو بھی میری نظر میں ہیں اور سامان بھی! درمیانی کمرے میں سامان ہے اور برآمدے کے نیچے ٹٹو بندھے ہیں۔ سامان لادنا شروع کر دو۔ ہاں، پستول کو اب سامان کے ساتھ باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ساتھ رکھنے کی چیز ہے، باہر رکھنا!''

ہم رات کی تاریکی میں اس گھر سے نکلے اور پگڈنڈی پر دھیرے دھیرے بڑھتے چلے گئے۔ ساری رات چلتے رہے۔ پَو پھٹنے پر ہم ایک دوسری پہاڑی پر پہنچ چکے تھے۔ جنگل میں بھی علاقے مخصوص ہوتے ہیں۔ ایک قبائلی دوسرے قبیلے کے علاقے میں کچھ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ ہمیں بھی اب خطرہ نہیں تھا پھر بھی ہم چلتے رہے۔ ہمارے ٹٹو بھی تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ آدھی رات سے یہ سفر جاری تھا اس لیے ان پر تھکن کا غلبہ یقینی تھا۔ ہم خود بھی تھک چکے تھے اور کہیں لیٹ جانے کو دل کا تقاضا تھا۔ بالآخر ہمیں ایک غار نظر آ گیا۔ وہ غار قدرے صاف ستھرا تھا یعنی کہ اس میں پودے یا بیلیں نہ تھیں۔ ہم نے ٹٹوؤں کو پیڑوں سے باندھا اور اندر گھس گئے۔ پتھریلی زمین تھی۔ پتوں بھری ڈالی سے اُسے صاف کیا اور اپنے اپنے تھیلوں سے تکیے کا کام لے کر لیٹ گئے۔

کہتے ہیں نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے! اس پتھریلے فرش پر بھی آ گئی۔ ہم بے خبر سو گئے۔

☆=======☆=======☆

سو کر اٹھے تو دن ڈھل رہا تھا۔ غار سے باہر آئے۔ ٹو ٹو بھی ہری ہری دوب سے پیٹ کی آگ بجھا کر تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ ہم پھر سے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جنگل میں سڑک یا پگڈنڈی تو ہوتی نہیں ہے، بس اندازے سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہمارا رخ برما کی طرف تھا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے کے بعد ہمیں ایک پگوڈا نظر آیا۔ جنگل میں چکمہ اور شہر میں بودھسٹ! یہ دونوں ہی گوتم بدھ کے ماننے والے ہیں، بس پوجا میں ہلکا سا فرق ہے۔ دونوں کے پگوڈا الگ الگ ہیں مگر دونوں جگہ گوتم بدھ کی مورتی نظر آتی ہے۔ اس پگوڈا میں بھی گوتم بدھ کی قدِ آدم مورتی تھی۔ مذہبی حوالے سے گوتم بدھ کے پجاری انتہا درجے کے امن پسند ہوتے ہیں مگر چکمہ خون خرابے کو نا پسند نہیں کرتے۔ تلوار اور تیر ساتھ رکھنا معیوب نہیں سمجھتے۔ یہ پگوڈا بھی چکما قبائل کا تھا اس لیے ہمیں کچھ خطرہ تھا لیکن ٹھہرنے کے لیے تو ایک نہ ایک جگہ چاہیے تھی سو ہم نے اس کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا بلند دروازہ تیسری دستک پر بھی نہ کھلا تو مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ میں نے لوہے کی کڑی کو زور زور سے ہلانا شروع کر دیا تبھی ایک تنگ دریچہ کھلا اور ایک گنجا سر اس میں سے باہر آیا۔ اس سر پہ ایک لمبی سی چوٹی تھی، بالکل چینیوں جیسی! اس نے نہایت کرخت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

ابول نے آگے بڑھ کر سرگوشی میں کچھ کہا۔

اس نے کیا کہا، یہ تو میں سن نہ سکی مگر دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے اندازہ لگا لیا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اسی لیے دروازہ نہیں کھول رہا ہے۔ میں کچھ کہتی کہ ابول نے اس چوٹی والے سے پھر کچھ کہا۔ اس جملے کا اثر فوراً ہی ہوا۔ دروازہ کھل گیا۔ اس آدمی نے آگے بڑھ کر ابول کو ٹو ٹو سے اترنے میں مدد دی۔

ابول کا اشارہ پا کر میں بھی نیچے اتر آئی۔ ڈیوڑھی میں تین آدمی رہ گئے تھے۔ میں ابول اور گنجے سر والا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ ابول نے میری طرف اشارہ کر کے گنجے سے کہا۔ ''انہیں بھی اندر آنے کی اجازت دو!''

بھکشو نے اس کی درخواست منظور کر لی۔ ہم اس پھاٹک سے گزر کر اندر چلے گئے۔ اندر ایک کشادہ صحن تھا جس کے چاروں طرف جھونپڑیاں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی ایک ایک کمرے کی جھونپڑیاں! صحن کے وسط میں گوتم بدھ کی ایک بڑی سی مورتی بھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں پہ کنول سے مشابہ دو بڑے پھول، سر پر تاج اور گلے میں مالا تھی مگر جسم سوکھا ہوا تھا۔ بنانے والے نے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ گوتم بدھ کی ایک ایک پسلی کو ابھارا تھا۔

ہمیں اندر لانے والے نے بُت کے سامنے پہنچ کر کہا۔ ''آپ لوگ یہیں ٹھہریں، میں بڑے لاما کو بلا کر لاتا ہوں۔'' اور وہ چلا گیا۔

ہم اسی حالت میں کھڑے اس لاما کا انتظار کرتے رہے۔ ہر طرف گہری خاموشی اور ویرانی تھی جس کے بھیانک اثرات میں اضافہ کرنے کے لیے عود و عنبر کی تیز بو مشام پر ضرب ثابت ہو رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیوں نے طول کھینچا تو ہماری پریشانی بڑھ گئی۔

اگر ان لوگوں کو جنہیں ہم ایک پُر اسرار شخصیت کے کہنے پر دھوکا دینے آئے تھے، اس کی خبر ہو جاتی، ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو ہمارا اس مقام سے بھی زندہ بچ نکلنا مشکل ہو جاتا بلکہ ناممکن سی بات ہو جاتی کیونکہ تمام مٹھ، تمام پگوڈوں میں رابطہ رہتا ہے۔ جنگل کے درمیان اس وسیع و عریض پگوڈا میں جہاں راہبوں، بھکشوؤں کے علاوہ کسی اور کا گزر نہیں، دو افراد کی ہلاکت کا واقعہ اول تو ظاہر ہی نہیں ہوتا اور اگر ظاہر بھی ہو جاتا تو یہ

خبر باہری دنیا تک پہنچ ہی نہ پاتی۔

ہم اس حالت میں کھڑے رہے۔ حیرت سے پگوڈا کے اندرونی ماحول کو دیکھتے رہے تبھی دور افتادہ مقام سے گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آئی۔ کچھ دیر تک یہ آواز ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے ہماری سماعت تک پہنچتی رہی پھر رک گئی۔

خاموشی کی چادر پھر سے تن گئی تھی۔ رگوں میں دوڑنے والے خون کو خشک کر دینے والی مہیب و ہولناک خاموشی میں مغموم و مایوس کھڑے ہم بڑے لاما کا انتظار کرتے رہے۔

مزید دس منٹ گزرے تو میرے کانوں میں کسی کی مدھم چاپ سنائی دی پھر تین آدمی آتے نظر آئے۔ دو تو نوجوان تھے مگر تیسرا انتہائی ضعیف العمر تھا۔ تقریباً 80 سال کا لگ رہا تھا۔ ان تینوں نے بھکشوؤں کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ وہ داہنے ہاتھ پر بنی اونچی جھونپڑی کے لکڑی کے زینے سے اتر رہے تھے۔

دونوں نوجوان بوڑھے لاما کو ہمارے پاس کھڑا کر کے خاموشی سے لوٹ گئے۔ ان کے جانے کے بعد لاما نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”آپ لوگ کون ہیں اور کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟“

”ہم چٹاگانگ سے آرہے ہیں لیکن ہمیں خود نہیں پتا کہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ ہمارے آنے کا مقصد تو وہی جانتے ہوں گے جنہوں نے طلب کیا ہے؟“

”شاید آپ نے جو کچھ کہا ہے، درست ہو لیکن مجھے کیسے یقین آئے گا کہ ”آپ کو طلب کیا گیا ہے؟“

”کیا آسمان پر سات ستارے رہبری نہیں کرتے ہیں؟“ پتا نہیں، کیوں یہ الفاظ میری زبان سے نکلتے چلے گئے۔ اس وقت مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے اندر سے کسی نے یہ الفاظ کہے ہوں!

”پھر بھی بھٹکنے والے بھٹک جاتے ہیں۔“ لاما نے آہستہ سے کہا۔

”مگر نشانیاں برقرار رہتی ہیں۔“ میں بولی۔

میرے جواب پر وہ دو زانو ہو گیا اور جھک کر میرے ہاتھ کو بوسا دیتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ وہی ہیں جس کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے تو ہمارے لیے ایک اور پختہ ثبوت ہوگا۔ اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں!“

”ہاں ہے!“ کہہ کر میں نے اپنے لبادے میں بنی خفیہ جیب کے اندر سے وہ لکڑی نکالی جو مجھے پُراسرار شخص نے دی تھی۔ لکڑی کے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں پکڑ کر لاما نے آنکھوں کے قریب کیا۔ میں سمجھ گئی کہ اسے کم نظر آتا ہے۔ یوں بھی اس عمر میں پہنچ کر بینائی کا کمزور ہونا یقینی ہے۔ وہ اسے اپنے تئیں نہایت باریک بینی سے دیکھتا رہا پھر اس نے لکڑی کے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگایا، چوما اور مجھے واپس دے کر بولا۔

”یقیناً آپ وہی ہیں جسے حیات و موت پر دسترس حاصل ہے۔ آپ کے لیے اس پگوڈا کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ آئیے، ہم اصل حصے میں چلتے ہیں۔“

میں سوچ رہی تھی، تقریباً ہر مذہب والے کسی نہ کسی کی آمد کے منتظر ہیں۔ مسلمان حضرت مہدیؑ کے، یہودی حضرت مسیح موعود کے، عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے، ہندو کلکی اوتار کے۔ یہ لوگ بھی مجھے اوتار سمجھ رہے ہیں۔

ہم اس کے ساتھ اس بڑی جھونپڑی میں داخل ہو گئے مگر اندر پہنچتے ہی حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ اندر پہنچ کر لاما نے دیوار پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ہاتھ پھیرتے ہی جھونپڑی کی پچھلی دیوار کھسک گئی تھی۔ ہم اسے پار کر کے ایک دوسرے علاقے میں آ گئے تھے۔

جسے ہم نے جھونپڑی کے پیچھے کا جنگل سمجھا تھا، وہ دراصل پتھریلی فصیل کو چھپانے کے لیے لگایا گیا تھا۔ پیڑوں کی قطار کے ساتھ پتھروں سے بنی ایک دیوار بھی تھی۔ اس دیوار کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کی عقل کو سراہنا پڑا۔ نہایت عقل مندی سے اس کی تعمیر کی گئی تھی۔ دیوار کے چاروں طرف ڈھاک کے پیڑ تھے۔ ڈھاک کے پتے پلیٹ جتنے چوڑے ہوتے ہیں۔ اس کی گھنی شاخوں میں کئی آدمی چھپ سکتے ہیں۔ وہاں تو دیوار کے ساتھ پوری قطار تھی جس نے دیوار کے تمام حصے کو چھپا لیا تھا۔ اس پختہ احاطے کے درمیان پتھروں سے بنی چھوٹی چھوٹی عمارتیں بھی تھیں۔ یقیناً ان میں چھوٹے لاما اور بھکشو رہا کرتے ہوں گے۔ اس احاطے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے اندر بیٹھ کر محاصرے کی صورت میں طویل عرصے تک دشمن سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ ان کے بھی لاتعداد دشمن ہوں گے۔ برصغیر میں ایسے بے شمار پگوڈا ہیں جنہیں سناتن دھرمی ہندوؤں نے مسمار کر دیا۔ اس پگوڈا پر بھی حملہ ہوتا ہوگا اسی لیے اتنی احتیاط برتی گئی تھی۔

''آپ لوگ یہاں آرام کریں، میں آپ کے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔'' کہہ کر وہ بوڑھا لاما چلا گیا۔

لاما کے جانے کے بعد ابول بولا۔ ''اس خبیث پر پوری طرح بھروسا مت کرنا۔ پتا نہیں، کیوں مجھے ایسا احساس ہو رہا ہے کہ یہ ہمیں دھوکا دے گا!''

''کچھ بھی ہو، ہمیں ہر حال میں اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔'' میں نے کہا۔

تبھی قدموں کی چاپ ابھری اور ہم ہوشیار ہو گئے۔ لاما کے ساتھ کئی اور آدمی بھی تھے۔ انہوں نے ہاتھوں پر بڑی بڑی پراتیں اٹھا رکھی تھیں۔ اس جنگل بیابان میں ایسے لوازمات......! میں حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ کھانا لانے والوں نے کمرے کی دیوار سے متصل جگہ پر گھاس سے بنی چٹائی بچھائی اور اس پر خوان رکھ کر ادب سے پیچھے ہٹ گئے اور بھکشوؤں کے عام انداز میں سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

''جو کچھ تیار تھا، حاضر ہے۔ کھائیں اور مہا آتما بدھ سے پرارتھنا کریں۔ ہو سکتا ہے، کوئی بھلائی کا راستہ مل جائے۔ موکچھ پراپت (نجات حاصل) ہو جائے!''

ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور ان لذیذ کھانوں نے آرام کی طلب پیدا کر دی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں وہیں ایک طرف لیٹ گئی۔ مجھے لیٹتا دیکھ کر لاما نے اجازت طلب کی اور باہر نکل گیا۔

پتا نہیں، میں کتنی دیر تک سوئی تھی۔ ابھی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ابول بھی اٹھ چکا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''شاید اس پگوڈا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی عورت کو اندر آنے کی اجازت ملی ہے ورنہ پگوڈا کے آنگن سے ہی پوجا کے بعد عورتوں کو بھگا دیا جاتا ہے۔''

''مجھے خود حیرت ہے کہ پگوڈا کے اصل حصے تک مجھے آنے کی اجازت کیسے مل گئی۔شاید لکڑی کے اس ٹکڑے کا کمال ہے جو میں نے اسے دکھایا تھا۔''

''تیرے اندر شیطان ہے اسی لیے شیاطین میں جگہ ملی ہے۔'' ایک ایسی آواز ابھری جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ابول بھی چکرا اٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔

''یہ کون بولا؟'' پھر وہ اٹھ کر باہر تک ہو آیا۔اس کا خیال تھا، دروازے کے باہر کوئی ہے مگر اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا تو لوٹ کر بولا۔'' پتا نہیں، کون تھا؟''

میں پہچان گئی تھی کہ یہ آواز کس کی ہے۔سمجھ گئی تھی کہ باباجی یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ان کا مقصد کیا ہے، یہ میں سمجھ رہی تھی اس لیے بولی۔

''ابول ان سے ڈرنا نہیں۔یہ میرے مددگار ہیں۔''

''مگر مجھے نظر کیوں نہیں آئے؟''

''تمہیں نظر آئیں گے۔''

''کیوں؟''

''یہ ایک راز ہے۔'' میں نے کہا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ مجھے بیوقوف سمجھ رہا ہو۔

عین اسی وقت لاما داخل ہوا۔اس کے ساتھ دو اور لاما تھے۔بڑے لاما کے چہرے پر غصے کی جھلک تھی لیکن وہ خاموش تھا۔بقیہ دونوں میں سے ایک نے اندر آتے ہی کہا۔''تم لوگ کیوں ہماری شانتی بھنگ کرنے آئے ہو؟ چلے جاؤ، جھوٹ کے سہارے زیادہ سفر نہیں ہوتا۔راستہ جلد کھوٹا ہوتا ہے۔''

''ہم سمجھے نہیں، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' ابول بولا۔

''صاف سیدھی بات ہے، تم لوگ وہ نہیں ہو جن کا ہمیں انتظار ہے۔''

''پھر کون ہیں، صاف سیدھی بات کرو!'' ابول نے تنک کر اونچے لہجے میں کہا۔

''تم لوگ سنجیونی لینے آئے ہو، موکچھ نہیں۔''

''نہیں، ہم موکچھ (گناہ سے نجات) حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو!'' لاما کے ساتھ آنے والے نے جھڑکا۔اس کے انداز پر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور خوف بھی کہ پتا نہیں، اب یہ لوگ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کریں تبھی میری نظر ابول پر پڑی اور میں چونک اٹھی۔ایسی شعلہ بار خوفناک آنکھیں جو اس وقت نظر آئیں، میں نے اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھی تھیں۔جو حال چڑیا کا سانپ کو دیکھ کر ہوتا ہے، وہی ان تینوں کا تھا۔وہ تینوں اپنی پلکیں بھی جھپکا نہیں پا رہے تھے۔

بڑی آہستگی سے ایک ایک انچ کر کے ابول نے اپنا داہنا ہاتھ پہلے اٹھایا پھر اس طرح جھکانا شروع کیا جیسے اس کے ہاتھ میں گراری فٹ

ہو اور وہ جام ہو رہی ہو۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے بڑے لاما سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر تم نے جھوٹا الزام لگایا ہے۔ اب اس بہتان کی سزا میں تم دونوں کو دوں گا جو عبرت ناک ہوگی۔'' پھر وہ اُن کے اور قریب پہنچا۔

''آ...... میرے سامنے آ......! سنو، تم میرے بس میں ہو۔ میں جب تک چکر نہ دوں گا، تم حرکت نہ کر سکو گے۔'' ابول نے اپنا ہاتھ مزید نیچے جھکا لیا۔

وہ جیسے جیسے ہاتھ جھکا رہا تھا، بڑے لاما کے دونوں ساتھیوں کی کمر بھی خم ہو رہی تھی۔

''تم اب سیدھے بھی کھڑے نہیں ہو سکتے ہو۔''

ابول نے سفاک اور سرد آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں اب بھی خوفناک انداز میں چمک رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ان دونوں کی پیشانیاں پسینے سے بھیگ گئیں پھر پسینے کے قطرے فرش پر گرنے لگے۔ بڑے لاما کے چہرے پر کشمکش تھی شاید وہ پچھتا رہا تھا کہ ان دونوں کو کیوں لے کر آیا؟

وہ دونوں کسی سنگی مجسمے کی طرح جھکے، اکڑے کھڑے تھے۔ ''اب میری طرف دیکھو!'' ابول نے کہا۔

ان بدنصیبوں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی مگر کوشش کے باوجود سر کو اٹھا نہ سکے۔

''اب کل تک تم دونوں اسی طرح رہو گے۔''

ان دونوں سے کہہ کر ابول نے بڑے لاما کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ ''انہیں لے جا کر سلا دیں۔''

لاما نے خاموشی سے دونوں کے ہاتھ تھامے اور وہ دونوں سحر زدہ سے اس کے ساتھ چل پڑے۔ اب میں نے جانا تھا کہ ابول جتنا سیدھا نظر آتا ہے، اتنا ہے نہیں! وہ بھی تھوڑا بہت مخفی علوم جانتا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ پھر اس نے اس کا اظہار پہلے کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ میری محنت پر ڈاکا ڈالنا چاہتا ہے؟ میرے دماغ نے سوال کیا۔

''ہاں، یہی بات ہوگی۔'' جیسے کسی نے میرے اندر سے جواب دیا۔ ''ابول تمہاری محنت سے حاصل کردہ سنجیونی جھپٹ لینا چاہتا ہے اسی لیے وہ اتنی آسانی سے اتنے دشوار کن سفر پر تیار ہو گیا۔ آگے نہ جانے یہ کون سا گل کھلائے گا؟'' میں یہی سوچ جا رہی تھی۔

''اے، یہ کس سوچ میں ڈوب گئیں؟'' ابول نے ہنس کر کہا۔ ''شاید تم میری اس قوت سے خوف زدہ ہو۔ دیکھو ناں، اگر میں شرافت سے کام لیتا تو وہ ہمیں یہاں ٹھہرنے کب دیتے بلکہ جان پر بن آتی۔ ان حالات میں میرا یہ فیصلہ ہی درست تھا۔''

''مگر تم نے مجھے بھی تو نہ بتایا تھا کہ تم اتنے اہم علم کی جانکاری رکھتے ہو۔''

''یہ کوئی اہم علم تو ہے نہیں، صرف ہپناٹزم کا کمال ہے جسے میں نے شوقیہ سیکھا تھا۔'' ابول نے مسکرا کر کہا مگر پتا نہیں، کیوں مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے بیوقوف بنا رہا ہے لیکن میں نے فوری جواب دینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ میں ابھی اس کا ساتھ چھوڑنے کی

متحمل نہیں تھی۔ اس گھنے جنگل میں جہاں دور دور تک تہذیب کا گزر نہیں، انسانی شکل کے نام پر صرف اور صرف بھکشو یا لاما نظر آتے ہیں، وہ بھی اس لیے کہ بدھسٹوں کا اعتقاد ہے کہ موکچھ یعنی گناہوں سے نجات صرف اپنے نفس کو مار کر حاصل ہو سکتی ہے اور نفس کو مارنے کا آسان ترین راستہ یہی ہے کہ انسان، انسانوں سے دور ہو کر اوپاسنا (عبادت) کرے اسی لیے یہ اکیلے بیابان میں زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کے پگوڈا میں بڑے بڑے منکے نما غار بنے ہوتے ہیں جن میں بیٹھ کر یہ لوگ عبادت کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو ایذا پہنچا کر نفس کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالآخر نفس کو مارنے والے آہستہ آہستہ اتنے سارے علوم پر دسترس حاصل کر لیتے ہیں کہ اس کا حساب نہیں!

یہاں رہنے والے بھکشو اور لاما بھی بہت سارے خفیہ علوم پر دسترس رکھتے ہوں گے ورنہ آس پاس کے خونخوار جنگلی قبائل انہیں کیسے بخش دیتے۔ ابول نے بتایا تھا کہ انہی اطراف میں ایک پُراسرار قبیلہ بھی آباد ہے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ کسی کو اپنے علاقے میں آنے دیتا ہے۔ انہی علوم کی قوت سے یہ لوگ ان وحشی قبائل سے بچے ہوئے ہوں گے۔ یہی سب سوچتی میں اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر آنگن میں نکل آئی۔ پتا نہیں، کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر گھٹن سی بھرتی جا رہی ہے۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب سے بابا کی آواز سنی تھی، دل کا چین چھن گیا تھا۔ اب تک میں یہی سمجھ رہی تھی کہ میں صحیح راستے پر چل رہی ہوں۔ اس بدبخت کا مطالبہ پورا کرتے ہی مجھے آزادی مل جائے گی مگر پتا نہیں، کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی بہت بڑا جرم کر رہی ہوں۔ کچھ بھی ہو، بابا سے مجھے ڈھارس تھی۔ کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ کئی مرحلے پر مجھے مدد ہی ملی تھی۔ پھر وہ بار بار مجھے ایمان و کفر کے درمیان کی باریکی کے بارے میں اشارتاً سمجھایا کرتے تھے۔ بار بار تنبیہ کرتے تھے کہ میں کفر کی جانب بڑھ رہی ہوں۔ گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لاد رہی ہوں۔

میں انہی خیالات میں ڈوبتی ابھرتی، ٹہلتی ہوئی پگوڈا سے باہر نکل آئی۔ باہر پُراسرار خاموشی کی چادر یہاں سے وہاں تک تنی ہوئی تھی۔ عجیب سی خاموشی جس میں جھینگروں کی جھاں جھاں بھی شامل تھی۔ کبھی کبھی دور سے کسی جانور کے دہاڑنے، غرّانے، ریگنے، بھونکنے کی آواز آ جاتی۔ لمحہ بھر کے لیے خاموشی کے سمندر میں دائرے بنتے اور پھر خاموشی کی سطح برابر ہو جاتی۔ عام طور سے لڑکیاں چھپکلی اور کاکروچ کو بھی دیکھ کر سہم جاتی ہیں۔ خود میں بھی کبھی ایسی ہی فطرت والی تھی مگر اب میرے اندر واضح تبدیلی آ چکی تھی۔

میں کسی بھی بات پر چونکتی نہیں تھی اور نہ مجھے خوف آتا تھا۔ اب میں بے دھڑک کسی بھی خطرے سے ٹکرا جانے کی ہمت اپنے اندر پاتی تھی۔ اسی وجہ سے رات کی خاموشی میں بھی بے دھڑک باہر نکل آئی تھی مگر کیوں آئی تھی، یہ ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ میں آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیچھے دبے پاؤں کوئی چل رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے واہمہ سمجھ کے سر کو جھٹکا اور آگے بڑھی تھی کہ پھر اسی احساس نے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے خود کو پھرتی سے موڑا۔ سامنے ہی ایک گھنا پیڑ تھا اور اس پیڑ کے پیچھے کسی نے چھپنے کی کوشش کی تھی۔ میں تقریباً دوڑتے ہوئے واپس ہوئی تھی اور اس شخص کو دیکھ لیا تھا جو چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ ایک ناگا تھا۔ ناگا ایسے سادھوؤں کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ستر پوشی کے لیے صرف ایک چھوٹا سا کپڑا باندھتے ہیں۔ یہ علاقہ بدھ مذہب کے ماننے والوں کا تھا اور ناگا سناتن دھرمی یعنی ہندو ہوتے ہیں۔ ہندو ہوتے ہوئے وہ یہاں کیسے آ گیا؟ میں اچنبھے میں تھی

کہ اس نے کہا۔

''لڑکی! یہ مت سمجھ کہ تُو ہماری نظروں سے چھپی ہوئی ہے۔ تیرا اٹھا ہوا ہر قدم ہماری نظروں میں ہے اس لیے کبھی بھی تُو کوئی ایسا کچھ نہ سوچنا جو تیرے لیے خطرناک ثابت ہو۔''

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر کہا۔ ''اور تُو کیا سمجھتا ہے کہ مجھے دباؤ میں لا کر کام نکال لے گا۔ یہی تیری اور تیرے بڑے کی بھول ہے۔ جا، میں تیرا کام نہیں کرتی۔''

مجھے غصے میں دیکھ کر اس نے کہا۔ ''تُو شاید ابھی تک مغالطے میں ہے۔ تیرے سر پہ جس کا ہاتھ ہے، اس کی قوت کا تجھے ادراک نہیں ہے۔ اگر تُو نے انکار کیا تو سمجھ لے، تیری زندگی ختم کی ختم!''

''تم مجھے کیا ختم کرو گے، میں خود تم لوگوں کو ختم کر دوں گی۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور مڑ گئی۔

''سوچ لو، اگر گرو جی کو پتا لگ گیا تو سمجھ لو، قیامت آ جائے گی۔'' اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''میں گرو جی کو بھی سیدھا کر دوں گی۔ تم لوگوں نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں اکیلے سب سے نمٹ سکتی ہوں۔'' کہہ کر میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اب حالت یہ تھی کہ میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے تھا۔

کسی بھکشو یا لاما کی نظر پڑ جاتی تو خواہ مخواہ کا پھڈا کھڑا ہو جاتا کہ میں ایک سناتن دھرمی سادھو سے کیوں مل رہی ہوں۔ ابھی تک تو وہ اسی مغالطے میں تھے کہ میں بھی بدھسٹ ہوں۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں غیر مذہب کی ہوں تو وہ فوراً مجھے نکال باہر کرتے۔ ان سے پروانہ لیے بغیر ہم ''لاڈنگ'' کے مقدس تابوت والے مٹھ میں جا نہیں سکتے تھے جو میری اصل منزل تھی۔ یہاں آ کر بھی منزل سے اتنی ہی دور تھی جتنی ڈھاکا سے!

میں جس مایا جال سے نکلنے کے لیے اس دشوار و ابتلا کے سفر پر نکلی تھی، وہ ختم ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ پُر اسرار شخصیت ہے جو پہلی بار کٹورے میں سانپ کی شکل اختیار کر کے ملا تھا اور پھر ایک پُر اسرار شخصیت درمیان میں کود پڑی جو خود کو اللہ والا کہتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کی رسہ کشی میں رسّہ بن گئی تھی۔ اسی رسّہ کشی سے نجات کے لیے میں نے سوچا تھا کہ کسی ایک کا مطالبہ پورا کر دوں اور قرعہ فال سانپ والے کے حق میں ڈالا تھا کیونکہ وہ مجھے زیادہ قوی نظر آیا تھا۔ اسی دوران میں ابول کی شخصیت پُر اسرار ثابت ہوئی۔ اب میں کیا کروں، کس سے مدد طلب کروں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور میں خیالوں سے الجھتی ہوئی پگوڈا کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

ابھی میں آنگن میں پہنچی ہی تھی کہ بڑے لاما کے ساتھ آٹھ دس خوب موٹے تازے بھکشو نظر آئے اور میں اپنی جگہ بت بن کر رہ گئی۔ مجھے سکتہ مار گیا تھا کیونکہ وہ سب ابول کو گھسیٹتے ہوئے لا رہے تھے۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ ابول کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ہپناٹزم بیکار ہو جاتا ہے جب ہپناٹسٹ کی آنکھیں بند ہوں۔ ابول بھی بیکار شے بن گیا تھا۔

''کی ہولو؟'' (کیا ہوا؟) میں نے پوچھا۔

''امرا بوکا نوے۔'' (ہم لوگ بیوقوف نہیں ہیں۔) لاما نے جواب دیا'' تمرا موسلمان نسچتے کونو اپرادھ اڑ بُونو آئی چھو۔'' (تم لوگ مسلمان ہو اور کسی جرم کے لیے آئے ہو۔)

بات غلط بھی نہ تھی۔ ہم لوگ لاڈمنگ کے مقدس تابوت پر جانا چاہتے تھے جہاں سنجیونی تھی اور سنجیونی کو حاصل کرنا ہی ہمارا مقصد تھا اس لیے خاموش رہ گئی۔

مجھے خاموش دیکھ کر لاما نے کہا۔'' تمرا اے کھانے تھا کا اُدھیکار ہارے دیئے چھو۔'' (تم لوگوں نے یہاں رہنے کا حق کھو دیا ہے۔) میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔'' تمرا چلے جاؤ!'' (تم لوگ چلے جاؤ!)

میں ابول کو سہارا دے کر گوڈا سے باہر نکل آئی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں جنگل کی ہیبت ناکی بڑھ جاتی ہے۔ درندے کسی بھی لمحے تکا بوٹی کر سکتے ہیں پھر بھی میں ابول کو سہارا دیئے ہوئے اندازے سے پہاڑ کی طرف بڑھنے لگی۔ وہاں کسی غار میں بیٹھ کر رات گزاری جا سکتی تھی۔

تقریباً ڈھائی گھنٹے تک ہم چلتے رہے۔ میں نے اپنے تینوں ٹٹو بھی ساتھ لے لیے تھے۔ ایک پر میں بیٹھی تھی اور دوسرے پر ابول اور تیسرے پر سامان لدا ہوا تھا۔ ہم قطار میں آگے پیچھے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہماری منزل ابھی بھی دور تھی کیونکہ جس پہاڑی سلسلے کو میں نے قریب سمجھا تھا، وہ کافی دور تھا۔

ہر سفر کا اختتام ہے۔ بالآخر ہم پہاڑ تک پہنچ ہی گئے مگر اتنی دیر میں صبح کاذب کی سپیدی پھیل گئی تھی اور کسی غار کا سہارا لینا اب ضروری نہیں تھا۔ میں مزید آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر ابول نے روک لیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ کچھ دیر آرام کر لینا بہتر ہے کہ اس طرح ہمیں نئے سفر کے لیے آسانی رہے گی۔

ہم نے کسی مناسب غار کی تلاش میں نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہمیں ایک مناسب غار نظر آ گیا۔ اس غار میں ہم نے جھانک کر دیکھا۔ اکثر ریچھ یا شیر اسی قسم کے غار کو اپنا مسکن بناتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم ہوشیاری برت رہے تھے۔ نہایت احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اندر کے حالات بتا رہے تھے کہ یہ کسی درندے کا مسکن نہیں ہے۔ ٹٹو پر لدے سامان میں سے دو کمبل اتارے اور ایک ایک کمبل بچھا کر ہم لیٹ گئے۔ ابول غار کے دہانے پر لیٹا تھا میں نسبتاً اندر کی طرف۔ اس کا خیال صحیح تھا کہ ہم واقعی بہت تھک چکے تھے اس لیے کہ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

پتا نہیں، میں کتنی دیر سوئی تھی کہ تکلیف کے احساس نے جگا دیا۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے کوئی نوکیلی چیز چبھوئی ہو۔ آنکھیں کھلتے ہی جو منظر نظر آیا، وہ خون خشک کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میرے چاروں طرف الف ننگے قبائل لمبے لمبے نیزے تانے کھڑے تھے۔ انہی میں سے کسی نے مجھے نیزہ چبھویا تھا۔ وہ سب خونخوار نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے۔ ان کے مکروہ و ہیبت ناک چہرے دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ ابول اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے گرد بھی آٹھ دس نیزہ بردار کھڑے تھے۔ ان سب نے مل کر ہمیں دھکیلتے ہوئے غار سے باہر نکالا۔ ہم ان کے اشارے پر آگے بڑھنے لگے۔ وہ ہمیں ساتھ لے کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمیں پتا تھا کہ پہاڑ کی دوسری طرف برما

کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اُدھر سرحدی محافظ بھی ہو سکتے ہیں پھر بھی ہم رکے نہیں، بڑھتے رہے۔ ہیبت ناک چہرے والے وحشی ہمارے گرد حلقہ بنائے چل رہے تھے۔

میرے پاس پستول بھی تھا۔ چٹاگانگ سے چلتے وقت ابول نے دو پستول خریدے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ جنگلی جانوروں کے لیے یہ ضروری ہے۔ ابتدا میں یہ پستول سامان کے ساتھ رکھا تھا مگر پچھلی بار جب چکمہ قبیلے نے ہمیں گھیرا تھا، اس کے بعد سے ہم پستول کو اپنے ساتھ رکھنے لگے تھے۔ اس وقت بھی میری کمر کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ ابول کے ساتھ بھی تھا مگر یہ موقع اسے استعمال کرنے کا نہیں تھا کیونکہ گولیوں کی آواز سے ان کے دیگر ساتھی بھی اِدھر آ سکتے تھے۔ ہم پر ٹڈی دل کی طرح وہ ٹوٹ پڑتے۔ میں اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ بری طرح چونک گئی۔ ابول کے چہرے پر سختی عود آئی تھی۔ شاید اس نے کوئی حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ حالات حد درجہ مخدوش تھے۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہو کہ ہمارے آگے چل رہے وحشیوں میں سے دو تیورا کر گرے۔ ان کے گرتے ہی باقی تمام وحشی اِدھر اُدھر درختوں کے پیچھے چھپ گئے مگر اس عرصے میں ایک اور وحشی دھماکے کا شکار ہو گیا۔ ابول نے تین فائر میں تین وحشیوں کو مار گرایا تھا۔ پھر اس نے مجھے بھاگنے کا اشارہ دیا۔ خود بھی بے تحاشا دوڑنے لگا۔

ناہموار زمین پر جا بجا خار دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ عام حالات میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کسی خطرے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس وقت جان بچانے کے پیشِ نظر میں یہ خطرہ مول لینے پر مجبور تھی۔ جنگلی کہاں رُوپوش ہوئے تھے، میں یہ نہ دیکھ سکی لیکن میرا اندازہ تھا کہ جب تک وہ قبیلے کے دوسرے افراد کو ہماری موجودگی سے باخبر کریں گے، ہم ان کی دسترس سے دور جا چکے ہوں گے۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جنگلی دھماکے والے ہتھیاروں سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں لیکن میری یہ خوش فہمی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔

ہم بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ابول مجھے اپنی آڑ میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اگر کوئی نیزہ اُڑتا ہوا آئے تو وہ اسے لگے۔ تبھی میں نے دیکھا کہ وہ دوڑتے دوڑتے کھار دار جھاڑیوں میں اُلجھا اور گرتا چلا گیا۔ میں اسے سہارا دینے کے لیے مڑتی کہ میری داہنی سمت کی جھاڑیوں سے سات آٹھ وحشی نیزہ تانے سامنے آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت جھلک رہی تھی۔ میں ٹھٹک گئی۔ پستول بلند کرتی کہ میرے عقب سے آواز آئی۔ ''مارا جابے! اسمرپن کورے داؤں۔'' (مارے جاؤ گے۔ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔)

میں نے پستول کو نیچے گرا دیا۔ انہوں نے مجھے یہی حکم دیا تھا۔ غرضیکہ میں اب ان کے رحم و کرم پر تھی۔ زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ موت کا تصور کس قدر تلخ اور جان لیوا ہوتا ہے۔

پستول کے گراتے ہی میں ان کے رحم و کرم پر تھی۔ انہوں نے گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ فرار کی راہیں پوری طرح مسدود ہو چکی تھیں۔ اگر ہم بھاگنے کی کوشش کرتے تو شاید پلک جھپکتے میں ہماری پشت نیزوں سے چھد گئی ہوتی۔

وہ سب ہمیں دھکیلتے ہوئے پہاڑی دامن میں بسے ایک گاؤں میں لے گئے جہاں انہی کی طرح الف ننگے وحشی سینکڑوں کی تعداد میں ہمارے منتظر تھے۔ ان سب کی نگاہوں میں ہمارے لیے نفرت و حقارت تھی۔

کھلے میدان میں لا کر ہمارے ہاتھ پاؤں اس طرح باندھ دیئے گئے کہ ہم اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہمیں لانے والے بھی تماشائیوں میں شامل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک طرف سے دو موٹی موٹی عورتیں آتی نظر آئیں۔

انہیں دیکھ کر تماشائیوں کا جوش بڑھ گیا۔ ان دونوں نے ستر پوشی کے لیے "ڈھاک" کے پتے باندھ رکھے تھے۔ گلے میں قیمتی مگر ناتراشیدہ پتھروں کی مالا تھی اور ناک میں کسی جانور کی پتلی ہڈی کو اس طرح سے ڈالے ہوئے تھیں جیسے وہ بھی کوئی زیور ہو۔ لمبے لمبے بالوں کو اوپر اٹھا کر باندھے ہوئے تھیں۔ عمر تقریباً پچاس سال رہی ہوگی۔ وہ دونوں ہمارے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں پھر انہوں نے مجمع کی طرف دیکھ کر کچھ کہا تو وہ لوگ جو ہمیں لے کر آئے تھے، مجمع سے نکل کر ان کے قریب پہنچ گئے۔ پھر ان دونوں عورتوں سے باتیں کرنے لگے۔ وہ لوگ برمی، بنگلہ اور آسامی زبان کا ملغوبہ بول رہے تھے اور لہجہ بھی اتنا کرخت اور الفاظ کی ادائیگی اتنی تیز تھی کہ میں ان کی بات پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی مگر اتنا اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ہمارے جرائم کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ پھر وہ دونوں ہماری طرف مڑیں اور بولیں۔ "تومار مورود ہتھیارا اچھے۔" (تمہارا مرد قاتل ہے!)

میں نے جلدی سے کہا۔ "بھول ہوئے چھے۔ کھوما کورے دین۔" (غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیں!)

"کارو پران نیے کھلواڑ جوگھتو پاپ۔ اے کے ساجا امرا ودیبوائی دیبو۔" (کسی کی جان سے کھیلنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کی سزا ہم دیں گے ہی دیں گے!) کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ڈھول پیٹنے کی آواز تیز ہو گئی۔

ڈھول کی آواز میں کچھ ایسا ردھم تھا کہ مجھے خون کی گردش میں تیزی محسوس ہو رہی تھی۔ تبھی چار ہٹے کٹے وحشی خوف ناک انداز میں آگے بڑھے اور انہوں نے ابول کو دھکا دے کر گرا دیا۔ ہاتھ پیر تو پہلے ہی بندھے ہوئے تھے، اس لیے وہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا مجھ سے دور چلا گیا۔ اس کے بعد ان درندوں نے بڑے ظالمانہ انداز میں اس کے بدن سے کپڑوں کو نوچنا شروع کر دیا۔ تمام کپڑے تار تار ہو کر علیحدہ ہو گئے۔ اب وہ بھی انہی کی طرح الف ننگا تھا۔

ابول کی کربناک چیخوں سے میری روح گھائل ہو رہی تھی۔ بے چارہ میری مدد کے لیے آیا تھا اور اپنی زندگی گنوا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو منہ کے بل زمین پر گر پڑی اور بے بسی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔

ابول کو برہنہ کرنے کے بعد چاروں وحشی ببول کے کانٹے دار ڈالی سے اُسے پیٹنے لگے۔ ایسا اذیت ناک منظر......! میں نے آنکھیں بند کر لیں کیونکہ ہر ضرب پر ببول کے لمبے لمبے کانٹے ابول کے جسم میں گھس جاتے جنہیں وہ وحشی زور لگا کر کھینچتے اور زخموں سے خون کی دھار نکلنے لگتی۔

کافی دیر تک یہ اذیت بھری کارروائی جاری رہی پھر ابول کی چیخ رفتہ رفتہ مدھم پڑتی چلی گئی۔ شاید اس کی قوت مدافعت جواب دے گئی تھی لیکن ان بے رحموں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ڈھول کی آواز کے ساتھ ان چاروں کی بربریت میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ چاروں اس کے جسم کے گرد نعرے لگا کر ناچ رہے تھے اور میں پتھرائی آنکھ سے یہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور تھی کیونکہ میری آنکھیں بند ہوتیں تو کمر پر لکڑی کی ضرب پڑتی اور میں پھر سے آنکھیں کھول دیتی۔ اچانک ڈھول کی آواز بند ہو گئی جس کے ساتھ ہی ہر طرف موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔

میں نے ان دونوں عورتوں کو جنہوں نے گلے میں قیمتی مگر ناتراشیدہ پتھروں کی مالا پہن رکھی تھی اور مجمع جن کی تعظیم کر رہا تھا، انہیں پھر سے

مجمعے سے باہر نکلتے دیکھا۔ انہوں نے ابول کے بارے میں فیصلہ کیا تھا۔ اس بار وہ نہتی نہیں تھیں۔ ان دونوں نے ایک نظر ابول پر ڈالی پھر چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر اپنی زبان میں زور زور سے کچھ کہنے لگیں۔ میں پوری بات تو نہ سمجھ سکی مگر دو چار لفظ جو میری سمجھ میں آئے، ان کا مفہوم یہ تھا کہ وہ اپنے دیوتا کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہیں۔ اچانک ان میں سے ایک نے خاموش ہو کر اشارہ کیا اور نیزہ ابول کے سینے میں پیوست کر دیا گیا۔ خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ میں نے دانتوں کو سختی سے بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد کیا ہوا، میں نہ دیکھ سکی لیکن جب دوبارہ ڈھول بجنے لگے اور وحشیوں کی چیخ و پکار ابھری تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اُف! میں بتا نہیں سکتی کہ وہ منظر کتنا بھیانک تھا۔ پتا نہیں، کتنے لوگوں نے اس پر وار کیا تھا کہ لاش نام کی چیز باقی نہ تھی۔ اس کا جسم چھوٹی چھوٹی بوٹیوں میں بدل گیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک قیمہ سا پھیلا ہوا تھا۔

کاش، اس وقت میرے ہاتھ پاؤں آزاد ہوتے تو میں اپنے انجام کی فکر کیے بغیر ان سے بھڑ جاتی لیکن حالات نے مجھے مجبور و بے بس کر دیا تھا۔

ابول کے ساتھ جو سلوک ہوا تھا، اس کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ میں زندہ بچوں گی۔ قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق میری قربانی دینے سے پہلے انہیں شگون لینا تھا لیکن انہیں شگون خلاف ملا اس لیے مجھے ایک ایسی جھونپڑی میں بند کر دیا گیا جسے عقوبت خانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس جھونپڑی میں نہ ہوا کا گزر تھا اور نہ روشنی کا۔ میں نے اندازے سے رائے قائم کر لی کہ رات ہو چکی ہے کیونکہ کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ پھر باہر سے چلنے پھرنے، بولنے کی آوازیں آنے لگیں تو اندازہ لگا لیا کہ صبح ہو گئی ہے۔ میں ضرورت کے لیے باہر جانا چاہتی تھی مگر دروازہ بند تھا۔ کیا کروں، کیسے ان لوگوں سے جان چھڑاؤں، یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ یکایک ایسا لگا جیسے باہر طوفان آ گیا ہے۔ ہوا کی سنسناہٹ، بجلی کی گڑگڑاہٹ اور بارش کا شور، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بنگال اور بارش لازم و ملزوم ہیں اس لیے تعجب مطلق نہ ہوا۔ تعجب کا جھٹکا تب لگا جب وہ جھونپڑی ہوا سے گری۔ تیز ہوا نے اسے گرا دیا تھا اور اب بارش کی تیز بوچھار مجھے بھگو رہی تھی۔

میں ہونق کی طرح کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے کہا ہو۔ ''بھاگو، فرار ہو جاؤ!''

شاید یہ میرے اندر کی آواز تھی۔ میں چھلانگ مار کر جھونپڑی سے باہر آئی اور جنگل میں بھاگتی چلی گئی۔ اس پورے گاؤں میں بھگدڑ مچی تھی۔ کئی لوگوں نے مجھے بھاگتے دیکھا تھا مگر کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی تھی۔

میں جنگل میں پہنچ کر بھی نہ رکی اور بگٹٹ بھاگتی رہی۔ کئی نالے آئے۔ پہاڑیاں حائل ہوئیں مگر میں رکی نہیں، بس بھاگتی رہی۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی کیونکہ کیچڑ پانی میں دوڑنا آسان نہ تھا پھر بھی میں دوڑے جا رہی تھی۔ پتا نہیں، کتنے گھنٹے گزر چکے تھے اور کتنا فاصلہ طے ہو گیا تھا کہ مجھے ایک غار نظر آیا۔ میری قوت ختم ہو رہی تھی۔ کہیں بیٹھ کر ستا لینے کی اُمنگ دل میں پیدا ہونے لگی اور میں اس غار میں گھس گئی۔

وہ غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ پانی کی بوچھار سے بھی پناہ مل گئی تھی۔ میں نے خود کو اس غار کے فرش پر گرا دیا پھر جو نیند آئی تو دنیا کیا، مافیہا کی بھی خبر نہ رہی۔ شاید یہ اپنے محفوظ ہونے کا احساس تھا کہ میں بے خبر سوئی تھی۔ آدھے سے زیادہ دن میں نے بھاگتے ہوئے گزارا تھا اسی

لیے رات گزرنے کا بھی احساس نہ رہا تھا۔علی الصباح جب سارا جنگل پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا تو میں بیدار ہوئی تھی۔

''ساری دنیا ایک جیسی ہے!'' میں نے انگڑائی لیتے ہوئے اطراف پر نظر ڈالی۔ ''سب جنگل ایک جیسے ہیں خواہ سندر بن کا جنگل ہو یا سلہٹ کا یا ارکان کا۔ وہی درخت، وہی گھاس، وہی پیڑ پودے، وہی جانوروں کی آوازیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ اگر ہم جنگل میں بیٹھے ہوں تو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کس علاقے میں ہیں کیونکہ جنگلوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ ان کی کوئی تہذیب نہیں ہوتی۔ ان کے کوئی رسم ورواج نہیں ہوتے۔ جنگل تو بس جنگل ہوتے ہیں! ہزار ہا جانوروں کے علاوہ ان انسانوں کی بھی پناہ گاہ جو معاشرے کے خوف سے یہاں آ چھپتے ہیں۔

میں بھی تو یہاں بن بلائے آ گئی تھی۔ میرے آنے کا ایک خاص مقصد تھا جواب پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ مجھے نہ تو راہ کا علم تھا اور نہ کوئی میرا مددگار تھا جو مجھے مقدس تابوت تک پہنچا دیتا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ مقدس تابوت ہے کہاں؟ بس اتنا علم تھا کہ وہ کسی پگوڈا میں رکھا ہوا ہے لیکن وہ پگوڈا ہے کہاں، اس بارے میں کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ کل کی بارش نے جنگل کے پیڑ پودوں کو نہلا کر تروتازہ کر دیا تھا۔ کھلے کھلے لگ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر سے سفر شروع کر دیا تھا اور اندازے سے بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے سامنے پہاڑی سلسلہ تھا۔ اسے پار کر کے میں دوسری طرف اتر جانا چاہتی تھی۔ دھیرے دھیرے میں پہاڑ پر چڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اوپر اور اوپر پہنچ کر میں نے دوسری جانب نظر ڈالی۔ کھلا میدان تھا۔ میں خوش ہو اٹھی اس لیے کہ اس میدان کے آخری سرے پر آبادی کے آثار نظر آ گئے تھے۔ میں اسی طرف بڑھتی چلی گئی۔

☆=======☆=======☆

بدھ مذہب کے مہنت (پجاری) عبادت کے لیے پگوڈا ایسی جگہ بناتے ہیں کہ جہاں ان کی عبادت میں خلل نہ پڑے۔ آبادی سے دور ہو۔ اس آبادی کا مطلب تھا کہ یہاں قریب میں کوئی بڑا پگوڈا نہیں ہے لیکن جب آبادی میں پہنچی تو حیرت زدہ رہ گئی کیونکہ تمام کی تمام جھونپڑیاں خالی تھیں۔ آوارہ کتے تک نہ تھے۔ میں ایک کے بعد ایک جھونپڑی میں جھانکتی جارہی تھی مگر کسی بھی جاندار کے آثار نہ ملے جبکہ گھر میں اسباب بھرا ہوا تھا۔ ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ پتا نہیں، اس بستی پر ایسا کون سا برا وقت آیا تھا کہ سب کے سب مال و اسباب چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھی کہ اچھل پڑی۔ ایک گھر کے پچھواڑے سے ایک نوجوان برآمد ہوا۔

عام حالات میں انسان کی رفاقت بھلی لگتی ہے۔ کچھ دیر پہلے تک، یہاں پہنچنے سے پہلے میں کسی انسان کا چہرہ دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی مگر یہاں کے پُراسرار حالات میں یوں کسی نوجوان کا سامنے آنا خوف زدہ کر گیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اب تیز تیز قدموں سے میری ہی طرف آرہا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی مگر میرے پیر جیسے کسی نے جکڑ لیے تھے۔ اتنی دیر میں وہ میرے قریب آ گیا۔ ”تم...... تم انسان ہوں ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تم شاید ڈر رہی ہو۔ ڈرو نہیں، میں بھی تمہاری طرح بھٹک کر یہاں آیا ہوں۔“

اس کے دلاسہ دینے پر میرا حوصلہ قوی ہوا اور میں نے لکنت کے ساتھ پوچھا۔ ”تم شاید بنگال کے ہو؟“

”ہاں......! میں بوریسال کا ہوں اور ایک خاص کام سے آیا ہوں۔“ کہہ کر اس نے امرود جیسا ایک پھل میری طرف بڑھایا۔ اس کے دامن میں ایسے بہت سارے پھل تھے۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے میں نے لے لیا۔

وہ پھل کھانے میں خوش ذائقہ تھا۔ ہم دونوں ایک جھونپڑی کے سائے میں بیٹھ گئے۔ پیٹ کی آگ سرد کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ”کچھ پتا ہے، یہ گاؤں خالی کیوں پڑا ہے؟“

”یہ گاؤں باذیہ مسلمانوں کا تھا۔ ان کا ٹکراؤ چا کما کے ایک بڑے پجاری سے ہو گیا اور اس نے گاؤں پر کوئی منتر پھونکا جس کی وجہ سے یہاں تباہی مچ گئی اور یہاں کے مکین فرار ہو کر کسی دوسرے گاؤں میں چلے گئے۔“ نوجوان نے بتایا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اروند......! میں ہندو ہوں۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور ہم اٹھ کر اسی جھونپڑی کے اندر چلے گئے۔ اندر پہنچ کر میں نے کہا۔

”مسٹر اروند! تم شاید آگے جانا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں!“

”کہاں تک؟ اگر مناسب سمجھو تو مجھے بتا دو۔“

"میں کسی کی زندگی مانگنے مقدس تابوت پر جا رہا ہوں۔ سنا ہے، وہاں کچھ ایسے مہنت ہیں جو زندگی اور موت پر قابو پانے کا راز جانتے ہیں۔"

"کس کی خاطر نوجیون (نئی زندگی) مانگنے جا رہے ہو؟"

"بڑی لمبی کہانی ہے۔" اروند نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اگر مناسب سمجھو تو کہہ دو شاید میں تمہارے کام آ جاؤں کیونکہ میں خود بھی مقدس تابوت پر جا رہی ہوں۔"

"تم......تم مقدس تابوت جا رہی ہو؟ کس لیے؟"

"لمبی کہانی ہے۔ پہلے تم بتاؤ، تب میں بتاؤں گی۔"

"تو سنو، یہ آج سے چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں بوریسال سے ڈھاکا نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ ڈھاکا کی رینگن اسٹریٹ میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں ہے اکیلا رہتا ہے۔ میں اسی کے ہاں ٹھہرا تھا۔ کبھی رینگن اسٹریٹ انگریزوں اور دولت مند ہندوؤں کی آبادی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد مقامی لوگ بھارت ہجرت کر گئے اور ان خالی مکانوں پر بھارت سے آنے والوں نے قبضہ کر لیا۔ میرا دوست جس مکان میں رہتا تھا، صرف وہی ایک مکان ایسا تھا جس میں ہندوؤں کا قبضہ تھا اس لیے لوگ اس گھر سے دور رہتے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ وہ گھر خالی کرے تو اس پر بھی قبضہ کیا جا سکے۔ کئی بار اس پر تشدد بھی کیا گیا کہ وہ مکان چھوڑ دے مگر میرا دوست بھی اڑ گیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ یہ مکان کسی حالت میں خالی نہیں کرے گا۔ ایک رات جب میں اس مکان میں سو رہا تھا تو ایسا لگا کہ آنگن میں کوئی کودا ہے۔ خوف سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر چلنے کی آہٹ ہوئی تو میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ آنگن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی پھر باہر کے لائٹ پوسٹ کی روشنی بھی اندر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں جو کچھ دیکھا، وہ حیرت زدہ کر گیا۔ آنگن میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار لڑکیاں دیکھی ہیں مگر اتنی حسین لڑکی پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب چلی آئی۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اندر تو آنے دو پھر میں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں؟" اس نے بے باک لہجے میں کہا۔

میں دروازے پر سے ہٹ گیا۔ وہ اندر آ گئی۔

اندر آ کر وہ میرے بستر پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے یہ گھر اسی کا ہے۔

"ہاں، اب بتاؤ، تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔ دراصل مجھے خوف تھا کہ اگر میرا دوست اٹھ گیا تو بدنامی ہوگی۔

"میں روح ہوں!" اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور میں اندر سے کانپ اٹھا تھا۔ روح کے روبرو بیٹھنا آسان بھی تو نہ تھا!

"ڈرو نہیں، میں ڈرانے نہیں، تم سے امداد لینے آئی ہوں۔"

"کس قسم کی امداد؟ کیا تم بتاؤ گی؟"

"ہاں، کیوں نہیں مگر تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔"

اتنی دیر میں میرا خوف کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''فرمائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''پہلے میری رُوداد سن لو پھر کچھ کہنا۔'' کہہ کر اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیا پھر بولی۔ ''میرا نام گائتری ہے۔ میں نے ایک براہمن کے گھر میں جنم لیا تھا۔ میرا باپ اشوک بڑے مندر کا مہنت تھا۔ تقریباً چالیس پجاری اس کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ بڑا نام تھا۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میں ان کی سنیہہ (شفقت) کی چھایا (سائے) میں پروان چڑھتی رہی۔ جب میں بالی عمر کو پہنچی تو میری آنکھوں میں بھی بہار اترنے لگی۔ خوش رنگ سپنے جاگنے لگے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی ابھیلاشا (چاہت) پیدا ہونے لگی مگر ہمارا مندر آبادی سے باہر تھا۔ وہاں لوگ صبح شام آتے تھے مگر ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مجھے پسند آتا۔ انہی دنوں شیوراتری کا تہوار آ گیا۔ شیوراتری میں مندر کے سامنے بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں کھیل تماشا بہت ہوتا۔ لوگ دور دور سے میلہ دیکھنے آتے۔ اسی میلے میں وہ مجھے ملا تھا۔ اس کا نام گنیش تھا۔ بس پہلی ہی نظر میں وہ مجھے بھا گیا۔ وہ بھی مجھے پسند کرنے لگا تھا۔ میلہ ختم ہو گیا مگر وہ مجھ سے روز ملنے آتا۔ کہتے ہیں ناں، پیار کبھی جھکتا نہیں اور پیار کبھی چھپتا نہیں! وہی ہوا۔ یہ بات میری ماتا جی کے کانوں تک پہنچ گئی اور وہ میری تاک میں رہنے لگیں۔ پتا جی بہت بڑے وِدّان (عالم) تھے۔ بہت سارے جاپ کر چکے تھے۔ پچاسوں بیر (مئوکل) ان کے قبضے میں تھے اس لیے قصبے کے تمام لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ انہی کے برابر وِدیا (علم) والا ایک اور شخص تھا۔ وہ آبادی کے وسط میں رہتا تھا۔ اس کا نام گجادھاری تھا۔ وہ کالے علم کا ماہر تھا۔ ماتا جی نے میرے پیار کی خبر پتا جی سے چھپائی تھی مگر وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ میں اس سے قربت اختیار نہ کروں۔ ایک دن وہ مجھے لے کر گجادھاری کے پاس پہنچ گئیں اور بولیں کہ اس پر کوئی ایسا عمل کرو کہ یہ گنیش کو بھول جائے۔ گجادھاری نے وعدہ کر لیا کہ وہ میرے اوپر عمل کرے گا مگر اس نے ایک عجیب شرط رکھ دی تھی کہ مجھے اس کے ہاں ایک رات ٹھہرنا ہوگا۔ وہ رات میں ہی عمل کر سکتا ہے۔ ایک کنواری لڑکی کا کسی غیر مرد کے ہاں رکنا مناسب نہیں تھا اس لیے ماتا جی نے انکار کر دیا پھر میں نے بھی اس کی آنکھوں میں ایک عجیب وحشی چمک دیکھ لی تھی اس لیے میں نے بھی منع کر دیا اور ماتا جی کے ساتھ چلی آئی۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ میں ہر رات گنیش سے ملنے مندر کے پیچھے بنے گھاٹ پر جاتی رہی۔ ماتا جی نے صاف لفظوں میں مجھے منع کیا مگر میں نے سن کر نہ دیا اور تب ایک رات وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ گجادھاری کے ہاں لے گئیں اور بولیں کہ کسی بھی طرح اسے رام کرو۔ اس کے من سے گنیش کا نام بھلا دو۔

گجادھاری نے مجھ پر عمل کرنے کے لیے جاپ شروع کیا تو مجھ پر غشی چھانے لگی۔ اسی غشی کے عالم میں مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میری مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہے۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے ہاتھ پیر چلانا شروع کر دیئے۔ شاید یہ حرکت کرنے کی وجہ سے ہی تھا کہ میرے ذہن پر چھانے والی دھند چھٹ گئی اور میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اٹھنے کے ساتھ میری نظر گجادھاری پر پڑی۔ وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ وہیں ایک پیتل کا گول لوٹا تھا جسے لٹیا کہتے ہیں اور پنڈتوں کے پاس ضرور رہتا ہے۔ میں نے اس لٹیا کو اٹھایا اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے ماری۔ چیخ کے ساتھ وہ الٹ گیا۔ مجھے موقع مل گیا اور میں بھاگتی چلی گئی۔ ابھی میں نے آدھا ہی راستہ طے کیا تھا کہ وہ یکا یک ہی میرے راستے میں نمودار ہو گیا یعنی اچانک ہی ایک پیڑ سے کودا تھا۔ کہاں سے کودا تھا، یہ سمجھ نہ سکی۔ سمجھنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ پھر میں یہ بات بھی جانتی تھی کہ وہ کالے علم کا ماہر ہے۔ انہونی کو ہونی بنا سکتا ہے۔

اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر راستہ روکا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ حد سے زیادہ بھیانک لگ رہا تھا۔ سر سے بہنے والا خون چہرے پر جمع ہو رہا تھا۔ اس نے پھنکارنے کے انداز میں کہا۔ ”تُو نے بہت برا کیا۔ اب میں تجھے کڑی سزا دوں گا“ کہہ کر اس نے پھونک ماری۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔ میرا سر چکرایا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑی۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک جھونپڑی میں تھی۔ کچے فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس جھونپڑی میں، مَیں ننگے فرش پر بیٹھی تھی تبھی دروازہ کھلا۔ کھلے دروازے سے باہر کا جو منظر دکھائی دیا، وہ ہولانے کے لیے کافی تھا۔ باہر گھنا جنگل نظر آیا تھا اور اس کھلے ہوئے دروازے سے اندر آنے والے کو دیکھ کر تو حرکتِ قلب بند ہو جانی چاہیے تھی۔

وہ ایک ہڈیوں کا پنجر تھا یعنی ڈھانچہ تھا مگر اپنے پیروں سے چل رہا تھا۔ وہ کٹ کٹ کی آواز کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ اس کے چلنے سے ایسی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے دو سوکھے بانس آپس میں ٹکراتے ہیں۔

دھیرے دھیرے وہ میرے بالکل قریب آ گیا پھر اس نے عجیب سی سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم اس جگہ قید ہو۔ یہاں سے باہر نہیں جا سکتیں۔ اگر گئیں تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھوگی۔ میں تمہارا گلا بھی دبا سکتا ہوں۔ اگر کسی طرح مجھ سے بچ کر نکل بھی گئیں تو بھی جنگل سے باہر نہ جا سکوگی کیونکہ اس جنگل کے چپے چپے پر میرے آقا کے غلام پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ مختلف شکلوں میں زندہ ہیں! اگر باہر گئیں تو وہ تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ فرش پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔“

اروند اپنی کہانی سنا ہی رہا تھا کہ باہر بارش تھم گئی۔ بارش کے رکتے ہی میں نے کہا۔ ”اروند! موقع غنیمت ہے۔ فوراً نکل چلو ورنہ ہم پھنس سکتے ہیں۔“

میرا مشورہ معقول تھا۔ وہ فوراً راضی ہو گیا۔ یوں بھی وہ خود اس آسیب زدہ ماحول سے دور بھاگنا چاہتا تھا کیونکہ اس سنسان پڑے گاؤں میں وہ اتنی دیر ٹھہر گیا تھا، یہی بہت تھا پھر اُسے مقدس تابوت تک پہنچنے کی بھی جلدی تھی۔

ہم دونوں اس جھونپڑی سے باہر آئے۔ باہر کا ماحول نہایت خوشگوار تھا۔ آسمان پر اَبر چھٹ چکا تھا اور اب سورج نکل آیا تھا۔

”میری معلومات کے مطابق مقدس تابوت جس پگوڈا میں ہے، وہ شمالی طرف ہے۔ چلو، ہم شمال کی طرف چلتے ہیں۔“ اروند نے کہا اور قدم بڑھا دیئے۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگی۔ ہم دونوں خاموشی کی چادر اوڑھے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ اروند چلتے چلتے رک گیا۔

”کیوں، کیا بات ہوگئی؟ تم رک کیوں گئے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی ہمارے تعاقب میں ہے۔“ اروند بولا۔

”تمہارا وہم ہوگا ورنہ اس ویرانے میں کون آئے گا؟“

”میرا مطلب ہے، کوئی انسان نہیں، درندہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔“

درندے کا نام سنتے ہی میں خوف زدہ ہوگئی۔

''ڈرو نہیں! درندے کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہوں، ان میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ بلا اشتعال ہم پر حملہ کر دیں۔ بس چلتی رہو!''

اروند کے حوصلہ دینے پر میں آگے بڑھنے لگی۔ اروند نہایت چوکنے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے لیکن اوپر پہنچ کر مجھے ناکامی محسوس ہوئی کیونکہ دوسری طرف وادی نہیں تھی۔ ادھر ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا، دریائے ارکان کی ایک شاخ! دریا بہتے بہتے پہاڑ کے دامن تک آ گیا تھا۔ اب میں کیا کروں؟ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ اروند بولا۔ ''شیر! حملہ! بھاگو!''

میں نے مڑ کر دیکھا تو واقعی ہمارے پیچھے ایک شیر تھا۔ پیچھے شیر اور آگے دریا! کیا کیا جائے، ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ اروند چیخا۔

''اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ چھلانگ لگا دی جائے۔''

اونچی چٹان سے دریا میں کودنا، یہ جگہ بیس گز سے کم اونچی نہ تھی مگر جب ایک طرف موت یقینی ہو تو اتنی اونچائی سے کودنا زیادہ خطرناک نہیں تھا اور میں نے اروند کی تقلید میں چٹان پر سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

ہم دونوں ہی اچھے تیراک تھے مگر مضمحل اعضاء دریا کا یخ پانی اور بہاؤ کی تیزی نے ہمارا حلیہ بگاڑ دیا۔ دریا کی گہرائی کسی طرح پچاس فٹ سے ہرگز کم نہ تھی۔ تقریباً بیس منٹ تک ہم چپ چاپ، پہلو بہ پہلو تیرتے رہے۔

شیر کے ہاتھوں ہلاک ہو جانے کا خوف ہمارے دل سے نکل چکا تھا، تاہم وہ تکلیف جو اس یخ بستہ دریا میں تیرنے میں محسوس ہو رہی تھی، وہ بھی کسی غیبی عذاب سے کم نہ تھی۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ جسم کا دورانِ خون بھی تھمنے لگا تھا۔ ہر لحظہ یہی خوف دامن گیر تھا کہ اعضاء سُن ہو کر نہ رہ جائیں۔ اعضاء سُن ہونے کا امکان یقینی تھا۔

ہم جتنا آگے بڑھ رہے تھے، دریا کا بہاؤ مزید تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اروند نے دفعتاً آواز لگائی۔ ''جس طرح ممکن ہو، ساحل تک پہنچنے کی کوشش کرو۔''

میں نے اس کی آواز سنتے ہی ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے مگر تھکن نے نیم جان کر دیا تھا۔ بہاؤ کا مقابلہ کرنا دشوار تھا۔

تیرنے کی قوت ختم ہو رہی تھی۔ دریا کا بہاؤ مجھے اپنی گرفت میں لے کر بے اختیار آگے لیے جا رہا تھا۔ میں اسی حالت میں ساحلی نشیب سے گزرتی اس حصے میں پہنچ گئی جہاں دونوں طرف خاصی اونچی اونچی چٹان تھی۔ یکا یک مجھے ایک ہولناک خطرے کا احساس ہوا اور اروند کو تاکید کہ ساحل کی طرف بڑھو، اس کی حقیقت سامنے آ گئی۔ کچھ ہی دور آگے بڑھنے کے بعد دریا یکا یک غائب ہو گیا تھا اور سامنے صرف کھلا آسمان اور تیرتے بادل کے ٹکڑے تھے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اتنا بڑا دریا چلتے چلتے غائب ہو جائے یا زمین میں جذب ہو جائے، یقیناً آگے جا کر دریا آبشار کی صورت اختیار کر گیا تھا کیونکہ اس جگہ پانی کا بہاؤ انتہا سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ساحل تک پہنچنے کی میری مزاحمانہ کوشش کارگر نہ ہوئی۔ میں تنکے کی طرح بہتی بے اختیار اس مقام کی طرف جا رہی تھی جہاں دریا کا پانی نشیب میں گر رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں اسی مقام تک پہنچ گئی جہاں سے آبشار کا فاصلہ دس گز سے زیادہ نہ تھا۔ نیچے گرتے ہوئے پانی کی آواز مہیب خوفناک اور سماعت شکن تھی۔ اس خیال سے کہ زیست کا سفر تمام ہوا، میری آنکھوں کے سامنے

رنگ برنگے شرارے اڑنے لگے۔

اس شخص کی مانند جو ڈوبتے وقت تنکے کا سہارا تلاش کر رہا ہو، میں نے کوئی ایسی جگہ ڈھونڈنی چاہی جو بچاؤ میں میری مدد دے سکے مگر خوف ناک گرداب میں خشکی کا نشان تک نہ تھا البتہ اس مقام پر جہاں پانی نشیب میں گر رہا تھا، متعدد چٹانیں پانی پر ابھری نظر آئیں۔ میرے لیے یقینی موت سے بچنے کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ ان میں سے کسی چٹان کو پکڑ لوں۔

خطرے کی شدت نے میرے اوسان بحال کر دیے۔ میں نے دور ہی سے ایک چٹان کو تاڑ لیا اور پوری قوت سے پانی کاٹتی ہوئی اس چٹان کی طرف بڑھنے لگی۔ میری پوری کوشش یہی تھی کہ میں اپنے بچاؤ کا یہ آخری موقع ہاتھ سے نہ جانے دوں۔

میں جلد ہی اس کے قریب جا پہنچی اور چٹان کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا مگر پتھر چکنا تھا۔ ہاتھ میں آتے ہی چھوٹ گیا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی پھر بھی ناکام رہی۔ قریب تھا کہ پانی کا تیز ریلا مجھے بہا کر لے جاتا اور گہرائی میں پھینک دیتا۔ بغیر کسی کوشش کے ایک دوسرا بڑا پتھر میرے ہاتھ آ گیا۔ یہ میرے لیے انتہائی آزمائش کا وقت تھا۔

میں اس پتھر سے چمٹ گئی مگر پانی کا دباؤ اتنا سخت تھا گویا اَن گنت بھوت اپنے نادیدہ ہاتھوں سے مجھے نشیب کی جانب دھکیل رہے ہوں! زندگی اور موت کا رشتہ بال سے زیادہ باریک ہو گیا تھا لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور خاصی تھکا دینے والی کوشش کے بعد اس پتھر پر چڑھ گئی۔ ابھری ہوئی چٹان پانی کی سطح سے خاصی اونچی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گئی اور اپنی بے ترتیب سانسوں کو معمول پر لانے کے لیے کوشش کرنے لگی۔ اس وقت میری حالت کسی زندہ انسان کے برعکس مردہ شخص سے مشابہ تھی۔

تھوڑی دیر تک میں آنکھیں بند کیے اس چٹان پر بیٹھی رہی پھر جب سانس معمول پر آ گئی تو میں نے آنکھیں کھول کر پانی کی گرتی چادر کی طرف دیکھا۔

نظارہ اتنا بھیانک اور خوفناک تھا کہ میں کانپ کر رہ گئی۔ دونوں طرف سے اونچے کناروں میں گھرا تیز، ٹھنڈا پانی لامحدود مقدار میں نصف میل کی بلندی سے نیچے گر رہا تھا۔ سماعت شکن شور کے ساتھ آبشار کی تہ میں دور تک دھند چھائی ہوئی تھی جس پر سورج کی کرنیں اس طرح پڑ رہی تھیں کہ دھنک کے ساتوں رنگ واضح اور صاف نظر آتے تھے۔

میں دیر تک یہ بھیانک مگر دل فریب نظارہ دیکھتی رہی پھر جب نظر ہٹا کر دائیں کنارے کی طرف دیکھا تو وہاں اروند کھڑا تھا۔ اس کے کپڑے پانی میں تر تھے۔ اروند کو محفوظ پا کر میرے تن بدن میں نئی جان آ گئی۔ میں اپنی جگہ سے کنارے پر پہنچنے کی تدبیر سوچنے لگی لیکن ایسا کوئی ذریعہ نظر نہ آیا جس کی مدد سے میں ساحل پر پہنچ جاتی۔

جس مقام پر پانی اپنی پوری طاقت سے دبیز چادر کی شکل میں نیچے گر رہا تھا، اسی جگہ اس طرح کی چند چٹانیں تھیں جن پر میں بیٹھی ہوئی تھی اور ساحل کے پاس ایک دوسرے سے ان کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔

کوئی بھی مشاق آدمی ایک چٹان سے پھلانگ کر دوسری چٹان تک بہ آسانی پہنچ سکتا تھا مگر میں جس چٹان پر بیٹھی تھی، اس کا فاصلہ قریبی

چٹان سے تقریباً آٹھ فٹ تھا۔ اتنا فاصلہ ایک چھلانگ میں طے کرنا ناممکن سی بات تھی۔ کئی بار دل میں آیا کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر چھلانگ لگا دوں مگر فوراً ہی یہ خیال ذہن میں آ جاتا کہ اگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی تو میرا انجام کیا ہوگا؟

میں ابھی اس شش و پنج میں تھی کہ اروند کنارے پر واقع جنگل میں گھس گیا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرا دل مایوسی سے بیٹھ گیا کہ شاید وہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ گیا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ جنگل سے نکل کر ساحل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے شانے پر ایک ٹوٹے ہوئے درخت کا بڑا سا تنا تھا۔ ساحل پر آتے ہی اس نے درخت کے تنے کو پانی پر چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے بہتا ہوا اس مقام کی طرف چلا آیا جہاں آبشار کے پاس چٹان پر میں بیٹھی تھی۔

میں دل ہی دل میں اروند کی ذہانت پر اَش اَش کر اٹھی۔ میں اس کی ترکیب سمجھ گئی تھی۔ جیسے ہی درخت کا تنا بہتا ہوا میرے نزدیک آیا، میں نے جھک کر اس کا ایک سرا پکڑ لیا اور اسے آڑا کر کے دونوں چٹانوں کے درمیان پھنسا دینے کی کوشش کی۔ میں لاکھ بولڈ سہی مگر عورت تھی اور عورت کی جسمانی قوت ہی کتنی ہوتی ہے! وہ تنا دونوں چٹانوں کے درمیان پھنسنے کی بجائے تیز بہاؤ کے نتیجے میں زور سے چکر کاٹتا ہوا تیز رفتاری سے بہتا چٹانوں کے بیچ میں سے گزرتا آبشار میں جا گرا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے یوں بہہ جاتے دیکھ کر مجھ پر مایوسی سی چھا گئی مگر اروند نے اشارے سے مجھے تسلی دی اور دوبارہ جنگل میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب دوبارہ سامنے آیا تو ایک اور ٹوٹے ہوئے درخت کا تنا اس کے کاندھے پر تھا۔

ساحل پر آتے ہی اس نے تنے کو پانی میں چھوڑ دیا۔ اس بار میں پہلے سے زیادہ محتاط اور چوکس تھی۔ میں نے پوری احتیاط سے کام لیا اور اسے اس طرح روکا کہ وہ دونوں چٹانوں کے درمیان آڑا ہو کر پھنس گیا۔

مجھے اس کمزور اور متحرک پل پر سے گزرنا تھا۔ دوسری چٹان تک پہنچنا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی مجھے لقمۂ اجل بنا دیتی۔ آبشار میں گرا دیتی۔ میں جب چٹان سے تنے پر چڑھنے کے لیے اٹھی تو اپنے دل میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اپنے چاروں طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا پھر بڑی آہستگی اور احتیاط سے چلتی ہوئی چٹان پر سے اتری اور اس تنے پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے گھوڑا سواری کے لیے گھوڑے پر بیٹھا جاتا ہے۔ جدھر سے پانی آ رہا تھا، اس طرف ٹانگ پر پانی کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ مجھے لگا جیسے کسی بھی وقت میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔

مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ میں اگر لکڑی پر سے گزرتے ہوئے اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی تو تنا تیز بہاؤ کی وجہ سے کچھ سرک جائے گا اور میں فوراً پانی میں گر جاؤں گی۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ خود کو متوازن رکھتی، ایک ایک انچ سرکتی، دوسری چٹان پر پہنچ گئی۔ اس درمیان میں نے ایک بار بھی اُدھر نہیں دیکھا جدھر پانی زوردار آواز کے ساتھ آبشار میں گر رہا تھا۔

دوسری چٹان پر پہنچ کر میں نے چند ثانیے آرام کیا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو معمول پر لائی۔ باقی چٹانوں کا جائزہ لیا۔ آگے کا سفر زیادہ دشوار نہیں تھا۔ میں بآسانی چٹانوں کو پھلانگتی ہوئی اروند تک پہنچ گئی لیکن خشکی پر پہنچتے ہی میری ہمت جواب دے گئی اور میں ریت پر گر پڑی تھی۔

میرے دانت سردی سے بج رہے تھے اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اروند کا سراپا مجھے ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"شکر ہے کہ تم بچ گئیں۔" اروند بولا۔ "اب بہتر یہی ہے کہ ہم کوئی محفوظ مقام ڈھونڈ کر آگ جلائیں تاکہ تمہارے جسم کو کچھ گرمی ملے اور

تمہارے کپڑے خشک ہو جائیں۔ تم بہت ٹھٹھری ہوئی ہو۔ آگ کی حرارت ہی تمہیں سکون دے سکے گی۔''

میں جواب دینے کی پوزیشن میں کب تھی! اس وقت اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوس رہی تھی کیوں میں ڈھاکے سے باہر آئی تھی۔ مجھے کیا ضرورت تھی اتنا دشوار گزار سفر کرنے کی؟ زیادہ سے زیادہ وہ مجھے کچھ سزا دے لیتا۔ میری زندگی میں زہر بھر دیتا۔ یوں بھی اس زندگی میں رہا ہی کیا! ماں باپ بھائی، بہن، سب تو اس ست ویر بدمعاش کی وجہ سے موت کی گود میں جا سوئے اور میں جان کے خوف سے اس کی بساط پر مہرہ بن گئی تھی۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے پھر سے زندہ کرنے کے لیے اس کی بھٹکتی ہوئی روح کو ایک جگہ قرار دینے کے لیے مقدس تابوت تک جاؤں اور میں اس کے ڈر سے گھر بار چھوڑ کر نکل پڑی تھی۔

''اے! کس خیال میں ڈوب گئیں؟'' اروند نے چلتے چلتے ٹوکا۔

''آں......! کچھ نہیں!'' میں نے بہانہ کیا اور اس کے قدم سے قدم ملانے لگی۔ ہمیں کسی ایسے غار کی تلاش تھی جس میں کچھ دیر آرام کیا جا سکے۔ تھوڑی دور آنے کے بعد ہمیں ایک مناسب غار مل ہی گیا۔

اس غار میں پہنچ کر اروند نے سوکھی لکڑیاں جمع کیں اور ان میں آگ لگا کر مجھے قریب بلا لیا۔

میرے بدن کے کپڑے پوری طرح بھیگ گئے تھے مگر مجبوری یہ تھی کہ میں انہیں اتار کر سکھا نہیں سکتی تھی۔ میری مجبوری کو اروند بھی سمجھ رہا تھا اسی لیے اس نے کہا۔ ''آگ کے اور قریب آ جاؤ تا کہ کپڑے خشک ہو جائیں۔''

میں مزید آگے کھسک آئی اور ہاتھ سینکنے لگی۔ جسم میں کچھ گرمی آئی تو ذہن پر غنودگی سی چھانے لگی۔ میں نے نیند بھگانے کے لیے اروند سے کہا۔ ''ہاں، تم بتا رہے تھے کہ کوئی روح تمہارے پیچھے پڑ گئی تھی۔''

''پیچھے پڑ گئی تھی کیا، وہ تو اب بھی میرے ساتھ ہے، مجھ سے امید باندھے ہے کہ میں اس کی نجات کے لیے کچھ کروں گا اسی لیے تو میں مقدس تابوت تک جا رہا ہوں۔''

''مقدس تابوت پر پہنچ کر دعا مانگنے سے کیا اسے نجات مل جائے گی؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''دعا نہیں مانگنا ہے بلکہ وہاں کے گیانیوں (علم والوں) سے اوپائے (حل) پوچھنا ہے کہ اسے کیسے مکتی (آزادی) ملے گی؟''

اروند عام ہندوؤں کی طرح سنسکرت ملی بنگلہ میں بول رہا تھا۔ مسلمان اور ہندو کی بنگلہ میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ مسلمان عربی، فارسی، اردو کے زیادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ہندو سنسکرت کے۔

مسلمان پانی کو پانی کہیں گے جبکہ ہندو جل! نذر الاسلام کی شاعری میں تو پورا پورا شعر اردو کا ہوتا ہے۔ اروند بھی اسی انداز میں بول رہا تھا۔

''تم بتا رہے تھے کہ گائتری کو کسی جنگل میں بنی جھونپڑی میں قید کر دیا گیا تھا؟''

''ہاں بقول گائتری، اسے ہوش آیا تو وہ ایک جھونپڑی میں تھی اور اس کی پہرے داری ایک ڈھانچہ کر رہا تھا۔ وہ موقع کی تاک میں تھی کہ کسی بھی طرح اس مایا جال سے نکل جائے اور پھر کچھ ہی دیر بعد اسے موقع مل گیا۔ وہ ڈھانچہ بیٹھے بیٹھے کہیں غائب ہو گیا تھا شاید جنگل سے باہر چلا

گیا تھا۔ یہی موقع تھا فرار کا لیکن جیسے ہی اس نے باہر قدم نکالا، ڈھانچہ دھم سے آ کودا۔ ”اے! کہاں چلیں؟“

گائتری نے اسے راستہ روکے دیکھا تو خوف زدہ ہو کر پلٹی تبھی اس کی نظر دیوار پر لٹکی ہوئی تلوار پر پڑی۔ اس نے دوڑ کر تلوار اتار لی۔ تلوار کافی پرانی تھی اور بھاری بھی نہیں تھی۔ اس نے میان سے تلوار باہر نکال لی۔ اس تلوار پر کچھ لکھا ہوا تھا مگر کیا، یہ دیکھنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ اسے لے کر ڈھانچے کی طرف بڑھی۔ ڈھانچہ تلوار دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر وہ شیر بن گئی۔ اس نے ہاتھ بلند کیا اور اس کی طرف دوڑی۔ وہ خوف زدہ ہو کر مزید پیچھے ہٹا۔ گائتری نے تلوار چلا دی۔ ڈھانچے کی کھوپڑی جس میں صرف آنکھ زندہ تھی، اُڑ کر دور جا گری۔ گائتری نے اسی پر بس نہیں کیا، اس نے پے در پے کئی وار کر دیئے۔ کھوپڑی ہوگئی۔

وہ کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکلی۔ باہر گھنا جنگل تھا۔ وہ اس جنگل میں دوڑتی چلی گئی۔ ابھی وہ کچھ ہی دور پہنچی تھی کہ یکا یک ایک گھنے پیڑ پر سے ایک جانور کودا۔ اس کا جسم کسی ریچھ سے مشابہ تھا۔ وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھوں کو اس طرح پھیلا کر کھڑا ہوگیا جیسے وہ اس کا راستہ روکنا چاہتا ہو۔

گائتری ٹھٹک گئی۔ ان حالات میں لوگ خوف سے کانپتے ہیں مگر جب سے اس کے ہاتھ میں تلوار آئی تھی، خوف دل سے کوسوں دور ہوگیا تھا۔ اس نے تلوار کو بلند کیا اور پوری قوت سے اس جانور کے سر پر ماری۔ وہ جانور اپنی جگہ مستعد تھا، پھرتی سے کنی کترا گیا۔ تلوار ایک پیڑ کے تنے سے ٹکرائی گائتری نے کسی پھرتیلے لڑاکا کی طرح تلوار کھینچی اور دوبارہ چلا دی۔ اس بار بھی وہ جھک گیا اور تلوار دوہنی طرف کے پیٹر سے ٹکرائی تبھی وہ انسانوں کی طرح بولا۔

”واپس جاؤ ورنہ پھاڑ کھاؤں گا۔“

”میں تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔“ کہہ کر اس نے دوبارہ تلوار چلا دی۔ شاید اس جانور کا ستارہ گردش میں تھا۔ اس بار تلوار اس کے سر سے ٹکرائی تھی اور کھچ کی آواز کے ساتھ اترتی چلی گئی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا تھا اور وہ یکا یک غائب بھی ہوگیا تھا۔

اس کے غائب ہونے سے وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ ”نظر بندی“ ہے۔ اس خیال نے اسے تقویت دی تھی اور وہ تلوار لہراتی ہوئی آگے کی طرف دوڑتی چلی گئی تھی لیکن جیسے جیسے وہ آگے کی طرف دوڑ رہی تھی، پیڑوں کے درمیان پگڈنڈی بنتی چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جنگل ختم ہوگیا اور دریا کا کنارہ آ گیا۔ دریا کنارے پر پہنچتے ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ سامنے ہی گنیش کھڑا نظر آ گیا تھا۔

وہ اسے دیکھتے ہی بے تاب ہوگئی تھی۔ گنیش نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اب وہ بھی اسی کی سمت دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے مل گئے۔

گنیش نے بتانا شروع کیا کہ تمہارے غائب ہونے کی خبر تمہارے پتا جی تک پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے جا کر گجادھاری کی پٹائی کروائی ہے۔ گجادھاری نے بتایا ہے کہ جب اس کا ایک آدمی تمہیں لے کر گھر جا رہا تھا تو کشتی غرق ہوگئی اور تم ڈوب گئیں۔ پھر وہ مجھے لے کر میرے گھر پہنچا۔ اب پتا جی کو بھی معلوم ہوگیا کہ میں گنیش کو پسند کرتی ہوں۔

پتاجی نے مجھے گھر پہنچانے پر گنیش کا شکریہ ادا کیا جس کی وجہ سے گنیش کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ پتاجی نے میری زندگی بچانے پر تشکر کے جذبے سے مغلوب ہو کر میری شادی گنیش سے طے کر دی لیکن جب یہ خبر گجادھاری کو ملی تو وہ آگ بگولہ ہو اٹھا۔ اس نے دھمکی دے دی کہ وہ ہم دونوں کو ملنے نہیں دے گا۔ اس کی دھمکی، کوری دھمکی نہ تھی۔ اگلی رات جب گنیش مجھ سے ملنے آیا تو پتا نہیں کب سے ٹیلے کے پیچھے چھپے کھڑے کچھ لوگوں نے اس پر کیتی سے وار کیا اور وہ گر کر چھٹپٹانے لگا۔ اس کی تڑپ مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں نے چیخنا شروع کر دیا۔ میرے چیخ سے گھبرا کر انہی میں سے کسی نے اپنی کٹار میرے سینے میں اتار دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری آتما (روح) جسم سے نکل کر گنیش کی آتما کی طرف بڑھی تھی کہ گجادھاری نے اپنے علم سے ہماری آتماؤں کو دیکھ لیا اور وہ ہاتھ پھیلائے آگے بڑھتے گنیش سے بولا۔ ''تیری وجہ سے میری محبوبہ مری ہے۔ میں تجھے اس روپ میں بھی اس سے ملنے نہیں دوں گا۔''

پھر اس نے منتر پڑھا اور میری آتما کو ایک ''کلش'' میں بند کر کے بھاگ اٹھا۔ پتاجی نے اس سے کلش چھیننے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے تب سے میں الگ بھٹکتی رہی ہوں اور گنیش الگ! ہم دونوں مل نہیں پا رہے ہیں۔ ہمیں اگر ملا سکتے ہو تو صرف تمہی ملا سکتے ہو۔''

''مگر میں کیسے ملا سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''ہمیں ملانے کا اُپائے (طریقہ) مقدس تابوت والے مندر کا وِدّان بتائے گا۔'' اس نے التجائیہ انداز میں کہا تو میں نے ٹھان لی کہ مجھے مقدس تابوت والے بودھ مندر میں جا کر گائتری کی نجات کا اُوپائے معلوم کرنا ہوگا اور میں اس سفر پر نکل پڑا۔''

اس نے اپنی بپتا روک کر میری طرف دیکھا اور میں ہنس پڑی۔

مجھے ہنستا دیکھ کر اس نے کہا۔ ''تم ہنسیں کیوں؟''

''میں بھی کسی کی نجات کا راز معلوم کرنے آئی ہوں۔''

میں نے کہا تھا کہ ایک آواز آئی۔ ''اور میں تمہیں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔''

اس آواز کو سن کر ہم دونوں چونک اٹھے۔ میں پہچان گئی تھی کہ یہ آواز کس کی ہے۔

وہ آواز فقیر بابا کی تھی۔ وہی فقیر بابا جو مجھے سانپ کی شکل میں ملنے والی پُراسرار شخصیت سے دور رکھنے کی کوشش میں کوشاں تھے۔ جب میں ڈھاکا سے نکل رہی تھی، اس وقت بھی انہوں نے منع کیا تھا۔ میرے سفر کی مخالفت کی تھی اور غصے میں بھر اٹھے تھے مگر اس وقت تو میرا ذہن کسی اور کے قبضے میں تھا اسی لیے میں اس خطرناک سفر پر چل پڑی تھی اور انہوں نے تمام رابطے توڑ لیے تھے مگر اب اتنے دنوں بعد ان کی آواز سنائی دی تو میں خوش ہو اٹھی اور ڈر بھی گئی۔

مجھے خوف نے آ گھیرا تھا کہ اب پھر ان دو طاقتوں کے بیچ رسہ کشی ہو گی اور دونوں طرف سے مجھے کھینچا جائے گا۔

ابھی میں اسی خیال میں ڈوبی تھی کہ پھر وہی آواز سنائی دی۔ ''سن لڑکی! ابھی بھی وقت ہے۔ دوبار موت کے منہ سے بچی ہے۔ اسی پر شکر ادا کر اور اپنی زندگی کو بچا لے۔ گناہوں سے توبہ کر لے۔ لوٹ جا ورنہ بہت پچھتائے گی۔''

اروند اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک دوسری آواز سنائی دی۔

''بزدل! بچی کو بہکاتا ہے۔ اگر ہمت ہے تو سامنے آ جس طرح ہم سامنے ہیں۔ دونوں ہی جگہ تُو نے نہیں، ہم نے اسے موت سے بچایا ہے۔ دور رہ کر بھی ہم اس کی حفاظت کر رہے تھے اسی لیے تو اب تک ہم اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔''

میرے ساتھ اروند بھی مڑ گیا۔ ہم دونوں غار کے دہانے کی طرف دیکھنے لگے تھے کیونکہ دوسری آواز اُدھر ہی سے آئی تھی۔ غار میں وہی بودھ بھکشو داخل ہو رہا تھا جسے میں نے پگوڈا کے باہر جنگل میں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک عجیب سی چکری پکڑ رکھی تھی۔ ہر بودھ بھکشو عبادت کے لیے ایک چکری ہاتھ میں رکھتا ہے اور اسے گردش دیتے ہوئے منتر پڑھتا ہے مگر اس کے ہاتھ میں جو چکری تھی، وہ اور طرح کی تھی اس نے چکری کو بھی الگ انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ بالکل ایسے جیسے ٹارچ کو روشن کر کے پکڑا جاتا ہے۔

''تُو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ میرا مقابلہ تُو کیا کرے گا۔ اپنے مرتے ہوئے گرو کو بھیج۔ وہی میرا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن اس وقت تو وہ بھی لاچار ہے۔''

فقیر بابا کی آواز سنائی دی۔ ''اس کی زندگی نسل انسانی کی موت ہے اسی لیے میں نے اس کے آگے پہاڑ کھڑا کر دیا ہے۔ اگر اس میں ہمت ہے تو اس دیوار کو پھلانگ لے لیکن یہ ناممکن ہے کیونکہ جب جب وہ کامیابی کے قریب پہنچے گا، میں اس کی راہ میں مزید دشواریاں کھڑی کر دوں گا۔ اب یہی دیکھو، اس نے لڑکی کو ورغلا کر ڈھاکا میں اپنا کام نکال ہی لیا تھا کہ میں نے رخنہ ڈال دیا۔ اسے بساط کے اسی خانے میں پہنچا دیا جہاں سے اس نے چال چلی تھی!''

''مگر مہاراج نے اسے مقدس تابوت تک بھیجنے پر تیار تو کر لیا۔'' بھکشو نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تمہیں شاید علم نہیں کہ مہاراج کا علم بہت وسیع ہے۔ اس کی سادھنا ایک دو نہیں، ہزاروں سادھک کرتے ہیں۔ وہ اشارہ کر دے تو اس کے سادھک زمین آسمان ایک کر دیں!''

''یہیں پر تم مار کھا گئے! اگر وہ سب کچھ کر سکتا تو مقدس تابوت تک لڑکی کو نہ بھیجتا۔ وہ کالے علم کا ماہر ہے اور کئی سو سال سے کالا علم کرنے والے ہر سادھک نے اس کی سادھنا کی ہے تاکہ علم کی معراج حاصل کر سکے مگر یاد رکھنا، جب تک حق ہے، باطل کو کُلی فتح نہ ملی ہے نہ ملے گی۔ اگر لڑکی کو مرنا ہے تو وہ آگے جائے گی ورنہ یہ یہیں سے واپس ہو جائے گی۔'' فقیر بابا کی آواز میں غضب کا جلال تھا۔

''یہ لڑکی آگے جائے گی۔ اسے مقدس تابوت تک جانا ہی ہو گا!'' بھکشو کے لہجے میں غصے کی جھلک تھی۔

''میں اسے روکوں گا نہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے صرف اچھائی اور برائی کا علم دیا جاتا ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ گناہ کی راہ پر آگے بڑھے یا عاقبت سنوار لے۔'' فقیر بابا نے اس کو جواب دیتے ہوئے مجھے بھی پیغام دے دیا۔

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اب آگے نہیں جاؤں گی۔ یہیں سے واپس ہو جاؤں گی۔

''لڑکی کو روک سکتے ہو تو روک لو!'' کہہ کر بھکشو آگے بڑھا اور ہمارے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔

اروند ابھی تک خاموش تھا۔ فقیر بابا بھی خاموش تھے۔ ان کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی شاید وہ چلے گئے تھے۔

جس پُراسرار انداز میں وہ آئے تھے، اسی انداز میں لوٹ گئے تھے مگر مجھے بتا گئے تھے کہ بدی کی قوت زیادہ نہیں ہے شکست ہی اس کا

مقدر ہے اور مجھے حق کا ساتھ دینا چاہیے۔

''لڑکی! کس سوچ میں ہے؟ آگے بڑھ! تجھے آج ہی مقدس تابوت تک پہنچنا ہے۔'' بھکشو نے سخت لہجے میں کہا۔

''نہیں! میں اب آگے نہیں جاؤں گی۔ اب تک میں غلط سمت بڑھ رہی تھی مگر اب مجھے ہوش آ گیا ہے۔ میں واپس ڈھاکا جاؤں گی۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''تجھے جانا ہوگا!'' یکایک اروند نے غضب ناک لہجے میں کہا اور خنجر نکال لیا۔

''تم...... تم بھی اُسی مردود کے آدمی ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اور کیا...... ہم تمہیں اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ابول جو راستے میں مارا گیا، وہ بھی ہمارا ہی آدمی تھا۔ ہم سب بھیرو کے بھگت ہیں اور کالے علم کی معراج حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

''یعنی ابھی تک جو کچھ تم نے اپنے بارے میں کہا تھا، سب جھوٹ تھا؟''

''ہاں! اتنی لمبی چوڑی کہانی میں نے گھڑی تھی تاکہ تمہارا اعتماد حاصل کر سکوں۔ اب جب راز سے پردہ ہٹ چکا ہے تو یہ بھی سن لو، اگر تم نہیں گئیں تو یہیں زندہ بھسم کر دوں گا۔ یہ چھری پیٹ میں اتار دوں گا۔'' کہہ کر اس نے چھری ہلائی۔

''تمہیں شاید پتا نہیں ہے کہ کوئی میری بھی حفاظت کرتا ہے۔ تم لاکھ سر مار لو مگر میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے! اب تو میں ہرگز آگے نہیں جاؤں گی۔''

''تمہیں جانا پڑے گا۔'' بھکشو نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس وقت پتا نہیں کہاں سے میرے اندر اتنی قوت آ گئی کہ میں نے جھٹکا مارا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ دونوں مجھے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے تھے کہ میں نے دوڑ لگا دی۔ غار سے باہر نکل کر میدان میں سرپٹ بھاگنے لگی تھی۔ اس وقت میرے دل میں بس ایک ہی خیال تھا کہ میں کسی بھی طرح ان کے ہاتھ نہ آؤں حالانکہ میں جانتی تھی، اس گھنے جنگل میں جہاں دور دور تک کسی آبادی کا نشان تک نہیں ہے، ہر طرف جنگلی درندے پھیلے ہیں۔ خونخوار قبائل آباد ہیں۔ کوئی بھی میری مدد کو نہیں آئے گا۔ ہر طرف خطرے ہی خطرے ہیں۔ اس حالت میں اکیلے سفر کرنا بھی خطرناک ہے پھر بھی میں بھاگتی رہی۔ بھاگتے بھاگتے یکایک ہی میرے دل میں خیال آیا کہ میں فقیر بابا کو آواز دوں شاید وہ میری مدد کو آ جائیں۔ اتنا سوچنا تھا کہ میری زبان پر پکار مچل اٹھی۔ میں نے زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

''بابا! فقیر بابا! آپ کہاں ہیں؟ مجھے بچائیں ورنہ میں بھٹک جاؤں گی۔ خدا کے لیے، مجھے بچا لیں!''

میں گلا پھاڑ پھاڑ کر پکار رہی تھی۔ گلے میں خراش پڑ رہی تھی مگر میں پکارے جا رہی تھی کہ ایک عجیب بات رُونما ہو گئی۔ ہر وہ بات جو عقل کو عاجز کر دے، سمجھ میں نہ آئے ''معجزہ'' کہلاتی ہے اور معجزہ زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں رُونما ضرور ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ معجزہ رُونما ہوا ہے اور کچھ لوگوں کی سمجھ میں آخر وقت تک نہیں آتا! کسی نے دعا مانگی کہ میری تنخواہ بڑھ جائے۔ تنخواہ بڑھنے کی دور دور تک کوئی امید نہ تھی پھر بھی بڑھ گئی۔ یہ بھی معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ یکایک پتا نہیں کہاں سے ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور بغیر رکے مجھے لپک کر اپنے گھوڑے پر

بھاتے ہوئے جنگل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

گھڑ سوار سرخ و سفید، توانا، طویل القامت تھا۔ اس قسم کے جثے والے بنگال میں خال خال نظر آتے ہیں۔ یقیناً وہ کسی اور علاقے کا تھا۔

وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، اس نے میری مدد کیوں کی، اس بارے میں سوچنے کا بالکل موقع نہ تھا کیونکہ میرا ذہن ماؤف تھا۔ میں گویا اس کے ساتھ اُڑی جا رہی تھی۔ گھوڑے پر یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس سے قبل صرف ٹٹو پر بیٹھی تھی۔ وہ بھی اسی سفر میں ورنہ سائیکل رکشا، ٹیکسی یا بس میں سفر کرتی رہی تھی، اس لیے گھوڑے پر سفر کرنا اچھا لگ رہا تھا جیسے میں واقعی ہوا کے دوش پر سوار ہوں۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی میل کا سفر طے ہو گیا۔ پورے راستے گھڑ سوار بالکل خاموش رہا تھا۔ اس کی خاموشی دیکھ کر میری ہمت بھی جواب دے گئی تھی ورنہ میں ایک نہ ایک سوال ضرور کرتی۔ کافی دیر چلنے کے بعد اس نے گھوڑے کی رفتار کم کر لی اور پھر روک لی۔

''لڑکی! یہاں سے آگے تمہیں اکیلے جانا ہوگا۔ سامنے ہی آبادی ہے۔ وہاں سے تمہیں آگے جانے کے لیے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔ جاؤ، خدا حافظ!''

میں نے سر کے اشارے سے شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گئی۔ سامنے ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی کو پار کرتے ہی مجھے ایک بڑی آبادی نظر آئی۔ چھوٹے چھوٹے بہت سارے مکانات بھی تھے۔ ان مکانوں کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی حیرت ان کچے مکانوں کے درمیان بنے پختہ مکانوں کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کی تعداد کم تھی مگر دس بارہ مکان ضرور تھے۔ ایسے مکان صرف شہروں میں یا شہر کے آس پاس کے علاقوں میں بنتے ہیں۔ 'تو کیا نزدیک میں کوئی شہر ہے؟' میں یہی کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کچھ دیر بعد میں اس بستی میں تھی۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ سرخ اینٹوں سے بنی سڑکیں بھی ہیں۔ یقیناً یہ کوئی سب ڈویژنل ٹاؤن ہے مگر کون سا، یہ بات تبھی معلوم ہو سکتی تھی جب کوئی سائن بورڈ نظر آتا۔ میں متلاشی نظروں سے جائزہ لیتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی کہ سامنے سے آتا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچا، ٹھٹک گیا ایسے جیسے اس نے کوئی حیرت انگیز بات دیکھ لی ہو۔ وہ منہ پھاڑے حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''اے! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟'' میں نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''تم...... تم سونالی ہو ناں؟'' اس نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

''نہیں! میں سونالی نہیں ہوں، کچھ اور؟''

''نہیں! تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم سونالی ہی ہو، سونالی!'' اس نے میرے ہاتھ کو تھام کر کہا۔

اگر کوئی نوجوان ہوتا تو میں الٹا طمانچہ مار دیتی لیکن وہ کافی سن رسیدہ تھا۔ ایسے شخص پر ہاتھ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ میں نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور آگے بڑھنا چاہا تھا کہ اس نے پھر سے میرا راستہ روک لیا اور التجائیہ انداز میں بولا ''خدا کے لیے، سونالی! ہم پر رحم کھاؤ۔ تمہاری ماں روتے روتے جان دے رہی ہے۔ خدا کے لیے، گھر چلو!''

اس کے لہجے میں ذرا سا بھی کھوٹ نہ تھا۔ کوئی بناوٹ نہ تھی۔ میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا تو حیرت ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میرا دل نرم پڑ گیا۔ میں نے سوچا 'یوں بھی ڈھاکا میں میرا کوئی سگا رشتے دار تو ہے نہیں جو میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ وہاں جا کر بھی کسی نہ کسی کا سہارا لینا پڑے گا۔ تو کیوں ناں میں کچھ دن انہی لوگوں کے درمیان گزار لوں۔'

اس خیال کے آتے ہی میں بولی۔ ''چلیے!''

بڑے میاں خوشی سے کھل اٹھے۔ انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھنا، گھر میں کیسی رونق آ جائے گی! ہر کوئی خوشی سے کھل اٹھے گا۔ تمہاری ماں جس نے بستر پکڑ رکھا ہے، وہ بھی اٹھ بیٹھے گی۔''

وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

کافی دور آنے کے بعد میری نظر ایک عمارت کے باہر لگے بورڈ پر پڑی۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ ''آفس آف دی ڈویژنل انجینئر پی ڈبلیو ڈی رانگامائی۔''

میں حیرت سے اچھل پڑی۔ رانگامائی چٹا گانگ سے زیادہ دور نہ تھا۔ یہ ایک ساحلی شہر تھا جبکہ میں نے سفر کی ابتدا میں کئی دن اور کئی رات کا سفر کیا تھا تب کہیں جا کر اس پگوڈا تک پہنچی تھی۔ اسی مناسبت سے لوٹنے میں بھی اتنے ہی دن لگتے پھر بھی اتنا لمبا راستہ اس گھوڑے والے نے منٹوں میں طے کر لیا تھا۔ یہ ایک انہونی بات تھی مگر میرے ساتھ جو کچھ ہوتا آیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے زیادہ حیرت نہ تھی۔ یقیناً وہ گھڑ سوار کوئی پہنچا ہوا شخص تھا اور اسے فقیر بابا نے ہی بھیجا ہوگا۔ مجھے نقصان تو نہیں پہنچا تھا، فائدہ ہی ہوا تھا کہ اتنی جلدی میں شہر تک پہنچ گئی تھی، اس لیے میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور بڑے میاں کی باتوں پر دھیان دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ وہ ابھی تک اپنی باتیں دہرائے جا رہے تھے۔ کچھ دور جاتے ہی بڑی سڑک آ گئی۔ بڑے میاں وہیں ایک پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ ''بس آ رہی ہوگی۔ جب تک تم بھی کچھ دیر بیٹھ کر پیروں کو آرام دے لو۔''

بڑے میاں کے کہنے سے میں بھی وہیں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ بڑے میاں کا لیکچر اسی طرح چلتا رہا۔ وہ اپنی ایک ایک بات بتانے پر تلے بیٹھے تھے۔ تبھی دور سے ایک کھٹارا سی بس آتی دکھائی دی جس کی چھت پر طرح طرح کے اسباب لدے ہوئے تھے۔ بڑے میاں نے کھڑے ہو کر ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ بس نزدیک آ کر رک گئی۔ اندر کچھ زیادہ مسافر نہیں تھے۔ کئی سیٹیں خالی تھیں۔ میں عورتوں کے پورشن میں جا کر بیٹھ گئی۔ بس چل پڑی۔ تقریباً ڈھائی تین گھنٹے کا سفر تھا۔ سفر ختم ہوا چٹا گانگ شہر میں۔

بس سے اتر کر بڑے میاں نے سائیکل رکشا لیا اور مجھے بٹھا کر رکشے والے سے بولے۔ ''حالی شہر چلو۔''

رکشا والا پیڈل مارتا ہوا نہایت تیزی سے چل پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم حالی شہر میں تھے۔ بڑے میاں نے ایک مکان کے سامنے رکشا رکوایا۔ مکان دیکھ ہی مکین کی خوشحالی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ سامنے بڑا سا باغیچہ تھا جس میں آم اور کٹھل کے درجن بھر درخت تھے۔ ان درختوں کی قطار کے بعد اونچا سا برآمدہ تھا۔ بنگال کے عام گھروں جیسا ٹین کی چادروں اور شیشم کی شہتیروں سے بنا، وہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ بڑے میاں میرا

ہاتھ تھامے ہوئے اس گھر کے برآمدے پہ پہنچے ہی تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک دوشیزہ باہر نکلی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ اتنی زور سے چیخی کہ میں ڈر گئی۔ ”سونالی آپا! آپ کہاں تھیں؟“

کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے انداز میں ذرا سی بھی اداکاری کی جھلک نہ تھی۔ میں مزید الجھ گئی تھی کہ بڑے میاں کو مغالطہ ہو سکتا تھا، لیکن لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ ابھی میں اسی الجھن میں تھی کہ اندر سے دو عورتیں نکل آئیں۔ دو لوگ بھی سونالی، سونالی کی رٹ لگانے لگے۔ شاید میری شکل کسی سونالی نامی لڑکی سے ملتی ہے اسی لیے یہ لوگ دھوکا کھا رہے ہیں۔ میں سوچنے پر مجبور تھی۔

وہ سب مجھے اپنے گھیرے میں لے کر اندر پہنچے۔ سامنے ہی ایک بڑا سا ہال نما کمرا تھا۔ اس کمرے میں دری اور چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے سہارے کئی گاؤ تکیے بھی رکھے تھے۔ ایسے کمروں کو ”بیٹھک خانہ“ کہا جاتا تھا جسے اب ”ڈرائنگ روم“ کہتے ہیں۔ شرفاء کے ہاں بیٹھک خانہ ضرور بنتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ صاحب حیثیت ہیں پھر بھی وہ سب میرے آگے بچھے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی بہت ہی اہم ہستی ہوں۔ وہ مجھے نہایت احترام کے ساتھ اس کمرے سے ہو کر اندر لے کر آئے۔ اس کمرے کے دوسرے دروازے سے باہر نکلتے ہی ایک بڑا سا آنگن تھا۔ بالکل ویسا جیسا بنگال کے عام گھروں میں ہوتا ہے۔ آنگن کے آخری سرے پر باورچی خانہ، دائیں بائیں کمرے۔ انہی کمروں میں سے ایک میں مجھے لے جایا گیا۔ کمرا دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ حیرت اس لیے ہوئی تھی کہ دیوار پر ٹنگی فریم میں ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ گو کہ اس تصویر میں کھڑی ہوئی لڑکی نے ساڑھی پہن رکھی تھی مگر اس کے چہرے میں میری شباہت تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہی سونالی ہے۔ جب تک وہ نہیں آتی، میرے لیے یہ ایک معقول جائے پناہ تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ وہ سب مجھے آرام کرنے کا کہہ کر چلے گئے تھے۔

کمرا خالی ہوا تو میں لیٹ گئی۔ بستر کی نرماہٹ نے میری پلکیں بھاری کر دی تھیں۔ میں سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے کھڑکی پر دستک ہوئی ہو۔ میں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہاں ایک جانا پہچانا چہرہ موجود تھا۔ وہ فقیر بابا تھے۔ دھیمی آواز میں انہوں نے کہا۔ ”تم تھک گئی ہوگی، اس لیے یہ انتظام کیا۔ ان کی لڑکی ایک مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ میں نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر ایک کو تمہاری شکل اسی لڑکی جیسی نظر آئے۔ ہاں! اس بدبخت کی طرف سے ہوشیار رہنا! وہ دُم کٹے سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے۔ اس کے پاس اب صرف چالیس دن ہیں۔ ان چالیس دنوں میں اگر اسے مقدس تابوت والوں نے زندہ نہ کیا تو وہ فنا ہو جائے گا۔“

”وہ کسی دوسرے کا سہارا کیوں نہیں لیتا؟ میرے پیچھے کیوں پڑا ہے؟“

”بیٹی! تم ”تولہ راشی“ ہو۔ تمہارا جنم ایسے وقت ہوا ہے جب ستارے ایک خاص زاویے پر تھے۔ ایسے ہی لوگوں کو ”معمول“ بنا کر جادو منتر کرنے والے عامل اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔“

”اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟“

”بہت آسان! میں نے پہلے بھی بتایا تھا۔ یاد رکھو بیٹی! نماز ہر مرض کی دوا ہے۔ ہر جنگ کی فتح! نماز پڑھنے کا مطلب ہے، اپنے مالک کی بڑائی تسلیم کرنا! اس سے مدد طلب کرنا! جب اس سے مدد طلب کرو گی تو وہ ضرور مدد کرے گا۔ صرف سورۃ الحمد ہی بڑی سے بڑی مصیبت سے بچاتی

ہے۔ پوری نماز کی تو بات ہی کیا ہے! تم پابندی سے نماز پڑھو اور اپنی نماز بچانے کے لیے خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ تم ہر مصیبت سے بچی رہو گی۔''

بابا جی نے دوا ایک اور نصیحتیں کیں اور چلے گئے۔

میں نے ٹھان لیا تھا کہ اب پابندی سے نماز پڑھوں گی۔

یہی سب سوچتے سوچتے میں نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ میری آنکھ کھلی تو دن ڈھل چکا تھا۔ کسی نے لالٹین لا کر میرے کمرے میں ٹانگ دی تھی۔ کمرے میں مٹیالی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں بستر سے اٹھنے پر غور کر رہی تھی کہ ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی ہاتھوں میں پیالہ لیے آ گئی۔

''آپا! چائے پی لو۔ نیند کا خمار اتر جائے گا۔'' کہہ کر اس نے پیالہ مجھے دے دیا۔

پیالے میں چائے تھی اور اس میں مُرمُرے ڈال لائی تھی۔ بنگال میں چائے کے ساتھ موڑھی (مُرمُرے) کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ میں نے چمچے سے چائے میں بھیگے مُرمُرے کھانا شروع کر دیے۔ لڑکی وہیں قریب میں بیٹھی تھی کہ میں نے پوچھا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ، میرے پیچھے کیا کیا ہوا؟''

''آپا! وہ سدرشن ہے ناں......!''

''کون سدرشن؟''

''ارے، وہی شیطان کا بچہ! جس سے بھیا کا جھگڑا ہوا تھا۔''

''مجھے یاد نہیں آ رہا ہے، کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''

''ارے واہ! آپ ہی کے لیے تو ہوا تھا...... آپ اسکول سے آ رہی تھیں کہ اس نے آوازے کسے تھے اور آپ نے اس کی شکایت گھر میں کر دی تھی جس پر بھیا نے جا کر اس کی پٹائی کر دی تھی۔'' لڑکی نے بتایا۔

''پتا نہیں، میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے؟ مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔''

''پٹائی کے اگلے روز ہمارے گھر کے دروازے پر ایک لیموں جس پر سیندور لگا تھا، دو ہری مرچ، ہلدی کی گانٹھ اور مرغ کا کٹا ہوا سر پڑا ملا تھا۔ ابا نے اُسی وقت 'اوجھا' (جھاڑ پھونک کرنے والا ہندو) کو بلا کر دکھایا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ کسی نے آپ کے گھر پر ''کالی'' بھیجا ہے یعنی موت، تباہی! اور اس کے اگلے ہی روز بازار سے آتے ہوئے بابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور بابا ہم سب کو روتا چھوڑ گئے۔ بابا کی موت نے پورے گھر کو ہلا دیا تھا۔ ہر کوئی ٹوٹ گیا تھا، بکھر گیا تھا مگر جوشیل بھیا بپھر گئے تھے۔ سوئم کے بعد والے روز بھیا رام داؤ (ایک قسم کی بڑی سی چھری) لے کر سدرشن کے گھر میں گھس گئے تھے۔ وہ تو گھر میں ملا نہیں، اس کا بھائی تھا۔ بھیا نے اُسے بری طرح زخمی کر دیا۔ بھیا کو محلے والوں نے پکڑ لیا ورنہ وہ تو اسے ختم کر کے دم لیتے۔ سدرشن نے اس واردات کی رپورٹ تھانے میں کر دی اور بھیا گرفتار ہو گئے۔ ہم ابھی اسی الجھن میں پھنسے ہوئے تھے کہ ایک دن تم غائب ہو گئیں۔''

''ہاں! مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے۔ ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔'' میں نے ذہن پر زور دینے کے انداز میں کہا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم آرام کرو۔ میں اب کھانا پکانے چلی۔'' یہ کہہ کر لڑکی جانے لگی۔

''اے سنو!'' میں نے آواز دی۔

''یہ اے اے کہہ کر کیوں بلا رہی ہیں؟ سب مجھے روشن آراء کہتے ہیں۔ صرف آپ مجھے پتول (گڑیا) کہہ کر بلاتی ہیں۔ کتنے دن ہو گئے، آپ نے مجھے اس نام سے نہیں پکارا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

میں اس کا نام جاننا چاہتی تھی جو معلوم ہو گیا تھا پھر بھی میں نے کہا۔ ''پتول! میری بہن! دیکھ، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ جب بھی کوئی ملنے آئے، اس سے پہلے مجھے چپکے سے اس کا تعارف کرا دینا۔''

''ہاں، میں سمجھ رہی ہوں۔ اوجھا کو بلایا تھا آپ کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے۔ اُسی نے بتایا تھا کہ آپ کے ذہن پر سدرشن نے ''قبضہ'' کر لیا ہے اور اُسی نے آپ کو غائب کیا ہے۔ ماں خود سدرشن کے گھر گئی تھی مگر وہ گھر سے غائب ہے۔ یہ اُسی کا جادو ہے کہ آپ کی یادداشت صحیح طور پر کام نہیں کر رہی ہے۔'' پتول نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں مطمئن ہو گئی۔ یوں بھی مجھے اس گھر کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ مجھے انہی کے سہارے اپنے قیام کی مدت گزارنا تھی۔ میں بستر پر لیٹی انہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ یہ دنیا واقعی غم و الم کی جگہ ہے۔ ہر کوئی اپنے غم میں الجھا ہوا ہے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو خوش ہو۔ ہاروت و ماروت جس علم کو لے کر دنیا میں آئے تھے، یعنی جادو سحر، اُسے بے عمل لوگوں نے اپنا کر اس دنیا کو غم و الم سے بھر دیا ہے، اسی لیے تو قرآن پاک میں جادو سحر کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ابھی میں اسی سوچ میں تھی کہ ایک بڑی بی لاٹھی ٹیکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے پتول بھی آ گئی۔

اندر آتے ہی اس نے کہا۔ ''آپا! آپا! دیکھو تو تمہیں دیکھنے کے لیے چاچی آئی ہیں۔ نورل چاچا کی بیوہ!''

میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''سلام چاچی! کیسی ہیں آپ؟ طبیعت کیسی ہے؟''

''طبیعت کا کیا پوچھتی ہو! بس اللہ اللہ کر رہی ہوں۔ پتا نہیں کب بلاوا آ جائے۔'' کہتی ہوئی بڑی بی اپنی کمر پکڑ کر آہ کرتی ہوئی بستر پر بیٹھ گئیں پھر لاٹھی کو ایک طرف کھڑا کر کے بولیں۔ ''اور بتاؤ، کہاں کہاں گھوم آئیں؟ ڈھاکا بھی گئی تھیں؟''

''چاچی! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کے سامنے ہی تو اوجھا نے بتایا تھا کہ آپا کو سدرشن نے قید کر رکھا ہے۔'' پتول جلدی سے بولی۔

''اے لو، میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں خوب جانتی ہوں، تم لوگ پردہ ڈالنے کے لیے سدرشن کا نام لے رہی ہو۔ جادو منتر سب ڈھکوسلہ ہے۔ اگر جادو منتر میں اتنی قوت ہوتی تو حکومت پولیس کا محکمہ تشکیل نہ دیتی۔ ہر تھانے میں ایک ایک اوجھا، تانترک کو بٹھا دیتی۔ وہ منتر پڑھ کر مجرم کو کھینچ لاتے۔ عدالت کے سامنے پیش کر دیتے۔'' بڑی بی نے منہ بگاڑ کر کہا۔

''نہیں چاچی! ایسا نہ کہیں۔ جادو سحر بھی ایک حقیقت ہے۔ ایک علم ہے۔ جو جانتا ہے، وہ اس کا استعمال کر سکتا ہے۔'' میں نے سمجھانا چاہا۔

''سب بکواس ہے! ہندو لوگ مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لیے ایسی مہمل باتیں پھیلا دیتے ہیں اور کمزور ایمان والے ان کے جال میں پھنس کر ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔'' بڑی بی کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ انتہا درجے کی چالاک ہیں۔ آہ! آہ! کرتے ہوئے بھی دل کی بھڑاس نکال رہی ہیں شاید وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میں ایک خراب لڑکی ہوں اور سب کو دھوکا دے کر گل چھرے اڑانے گئی تھی۔

میرے اندر خوب اُتھل پتھل مچ گئی تھی۔ غصے سے برا حال تھا پھر بھی بڑے تحمل سے بولی۔

''چاچی! آپ نے سنا ہوگا، جادو منتر کرنے والی کئی قوموں کو خداوند کریم نے نیست و نابود کر دیا۔ ان کے ملک کو الٹ دیا۔ حضرت موسیٰ سے ٹکرانے والے جادوگر ہی تو تھے۔ اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔ جادو برحق ہے مگر اس کا کرنے والا کافر ہے۔ خود رسول اکرمؐ پر دو بار جادو کیا گیا اور جادو کرنے والا مدینے کا لبید بن اعظم اور مکے کی ایک بڑھیا تھی تبھی تو معوذ تین اتریں کہ گنڈوں پر پھونک مارنے والی (والوں) سے اے خدا! ہمیں محفوظ رکھ! کیا یہ سچ نہیں ہے؟''

''اے لو، میں رسول اکرمؐ کی بات کو جھوٹ کہہ کر جہنم نہیں خریدنا چاہتی۔ ضرور سچ ہوگا مگر اس دور میں، اب ایسے عامل کامل کہاں؟''

''علم ہر دور میں رہا ہے۔ جس نے سیکھا، اس نے فائدہ اٹھایا۔ اچھائی اور برائی تو ساتھ ساتھ چلتی ہے۔''

''مجھے اتنا کچھ معلوم نہیں، بس تُو اتنا بتا دے۔ اتنے دن کہاں رہی؟'' اس بار بڑی بی سیدھے سیدھے حملہ آور ہوئیں۔

''میں نے کہا ناں کہ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کہاں تھی؟ دادا جی مجھے رانگامائی سے لے کر آئے ہیں۔''

''تو ایسے بولو ناں، رانگامائی میں گلچھرے اڑا رہی تھیں۔ ہاں بھائی! پوری دنیا ساحلِ سمندر کا مزہ لینے وہیں تو آتی ہے۔'' بڑی بی نے ہائے کہہ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ چکی تھی کہ بڑی بی فطرتاً سازشی ہیں۔ اس طرح کی عورتیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں جن کا پہلا شوق یہی ہوتا ہے کہ ہر ایک کی کردار کشی کریں۔ لگائی بجھائی کر کے گھروں میں تفرقہ ڈالیں۔ ایسی عورتوں کو لگام دینا ضروری ہے۔ میں ان کے لیے کچھ کرتی کہ بتول بھنا اٹھی:

''چاچی! اتنی دیر سے تمہاری بکواس سن رہی ہوں۔ ہم اتنی پریشانیوں میں گھرے ہیں اور تمہارے اندر کا زہر کم ہو کر نہیں دیتا۔ کیوں ہم لوگوں کے پیچھے پڑی ہو؟'' بتول نے تنک کر جھاڑ پلائی۔

''اے لڑکی! میرے منہ نہ لگنا! تم سب نے مل کر خاندان کا نام مٹی میں ملا دیا ہے۔'' بڑی بی ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

مجھے تو ان پر غصہ آ ہی رہا تھا کہ بڑی بی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں اور دماغ کا گند کم نہیں ہوتا۔ کاش! میرے پاس بھی کوئی علم ہوتا تو میں انہیں ایسا مزہ چکھاتی کہ یہ زندگی بھر یاد رکھتیں! اپنے علم سے بغیر ہاتھ لگائے انہی کے ڈنڈے سے انہیں پیٹتی۔

ابھی میں نے صرف اتنا سوچا تھا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ رُونما ہو گیا۔ بڑی بی کے ہاتھ سے ڈنڈا نکلا اور ہوا میں تیرنے لگا۔ بتول اور بڑی بی حیرت سے اُڑتے ہوئے ڈنڈے کو تک رہی تھیں کہ وہ ڈنڈا تیرتے ہوئے سیدھا ہوا اور آ کر پوری قوت سے بڑی بی کی کمر پر پڑا۔ بڑی بی حلق پھاڑ کر چیخیں۔ ان کے لیے ایک ہی ڈنڈا کافی تھا! وہ بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپنے لگی تھیں۔ ان کی چیخ سن کر گھر بھر جمع ہو گیا تھا۔ تب میں نے بڑی بی سے کہا۔ ''کیوں چاچی! اب یقین آیا ناں کہ علم میں بڑی قوت ہے! اگر ابھی بھی یقین نہیں آیا ہے تو کچھ اور دکھاؤں؟''

میرا اتنا کہنا تھا کہ بڑی بی نے بَین شروع کر دیا کہ میں بہت بڑی جادوگرنی ہوں اور انہیں مارنا چاہتی ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مجھ سے معافی بھی مانگتی جا رہی تھیں۔

''چاچی! جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا مگر آئندہ کبھی ہمارے گھر کے کسی فرد کے بارے میں کوئی بری بات نہ سوچنا۔''

میرا اتنا کہنا تھا کہ بڑی بی اٹھ کر ڈنڈے کا سہارا لیے بغیر باہر کی طرف بھاگیں۔ وہی چاچی جو ڈنڈے پر وزن ڈالے بغیر ایک قدم نہ اٹھا سکتی تھیں، انہیں بغیر کسی سہارے کے جوانوں کی سی تیزی سے دوڑتے دیکھ کر پتول بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ان کے جانے کے بعد بولی۔ ''آپا! لگتا ہے، اس دوران میں آپ نے بھی بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔''

''جو کچھ سیکھا ہے، وہ صرف اس لیے سیکھا ہے کہ کوئی ہمارے خاندان پر انگلیاں نہ اٹھا سکے۔ ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔'' میں نے بقیہ لوگوں کا جائزہ لے کر کہا۔

''اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ہم پر جو مصائب ٹوٹ رہے ہیں، ان کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے۔ اب آپ دو کام کریں۔ اماں کے لیے کچھ کریں کہ وہ صحت یاب ہو جائیں۔ اور بھیا کو بھی رہا کرائیں۔''

پتول نے قریب آ کر میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ارے پگلی! وہ صرف تیرا نہیں، میرا بھی بھیا ہے۔ میں اسے آج ہی رہا کرانے کا سامان کروں گی۔ اب یہ بتا، اماں کو کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا۔

''اماں پر فالج گرا ہے۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی ہیں۔ اوجھا نے بتایا ہے کہ یہ بھی اُسی حرامزادے سدرشن کی کارستانی ہے۔ اس نے انتقام کی آگ میں ہمارے پورے گھر کو راکھ کر دیا ہے۔''

''تُو فکر نہ کر، اب میں آ گئی ہوں ناں! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جا تو گھر کے کام دیکھ مگر پہلے ان سب کا تعارف تو کرا دے۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ سامنے کھڑی عورتوں میں سے ایک بولی۔

''آپا! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ مجھے نہیں پہچان رہی ہیں؟ میں شیولی ہوں، آپ کے بھیا کی منگیتر، یہ خالہ زینب ہیں۔ یہ میری امی اور آپ کی پھپھو ہیں۔ یہ خالہ زینب کے بیٹے اور بیٹی!''

''دراصل میرے دماغ پہ دھندسی چھا گئی ہے مگر تم لوگ فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھنا، میں سب صحیح کر دوں گی بس تم لوگ میرا ساتھ دیتی رہو۔''

''ہم سب تو آپ کے ساتھ ہی ہیں کیونکہ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا اثر ہم پر بھی تو پڑ رہا ہے۔'' پتول نے کہا۔

''بس تم لوگ نماز کی پابندی کرو۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہو تاکہ میری دُعا میں اثر ہو۔ جس گھر میں قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے، وہ گھر ہر طرح سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس گھر میں کوئی ایک بھی دُعا مانگے تو اس گھر کا ذرہ ذرہ اس کی دُعا میں شامل ہو جاتا ہے۔'' میں نے فقیر بابا کے الفاظ دہرائے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ فقیر بابا نے مجھے اسی لیے اس گھر میں بھیجا ہے تاکہ ان کے مصائب کا خاتمہ ہو جائے۔

''ارے آپا! آپ تو پیر صاحب کی طرح بولنے لگی ہیں۔ ضرور کوئی شکتی مل گئی ہے۔'' شیولی بولی۔

''اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یوں بھی رات ہو رہی ہے۔ جاؤ، سب اپنے اپنے کمرے میں۔ میں اب کچھ دیر عبادت کروں گی۔''

میرا حکم سنتے ہی سب باہر نکل گئیں۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان سب کی آنکھوں میں عقیدت کی جھلک ہے۔ ڈنڈے کا کمال انہیں مرعوب کر چکا تھا۔ ان لوگوں کے باہر نکلتے ہی میں نے خود کو بستر پر گرا لیا۔

میں ابھی کچھ اور سونا چاہتی تھی۔ جانے والیوں نے دروازے کو بھیڑ دیا تھا۔

میں لیٹی لیٹی سوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ شاید یہ سفر کی تھکاوٹ تھی کہ مجھے پھر سے نیند کی دیوی نے بانہوں میں بھر لیا۔ میں بے خبر سو رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ اچانک بادل زور سے گرجے اور میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں تاریکی محسوس کر کے میں اٹھ بیٹھی۔ شاید لالٹین کا تیل ختم ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ لالٹین کو دوبارہ روشن کروں یا رہنے دوں؟ ٹھیک اسی لمحے مجھے باہر سے کسی بلی کے رونے کی آواز آئی۔ اور میں چونک پڑی۔ بلی کے رونے کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قریب آتی جا رہی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے خون کی گردش بھی تیز ہونے لگی تھی۔

میں نے سوچا۔ لالٹین جلا لینا چاہیے۔ ماچس عام طور سے لالٹین میں پھنسا کر رکھی جاتی تھی۔ میں ٹٹولتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی اور اندازے سے دیوار پہ جہاں لالٹین ٹنگی تھی، وہاں پہنچی۔ کچھ دیر کی تگ ودو سے لالٹین تو مل گئی مگر ماچس نہ ملی۔

بلی کے رونے کی آواز اب اور قریب آ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد وہ آواز دروازے پر سنائی دینے لگی۔ میں دم سادھے سن رہی تھی اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

اس سے پہلے بھی میں نے زندگی میں کئی بار بلیوں کو روتے سنا تھا، لیکن اس بلی کے رونے کی آواز میں عجیب سی وحشت اور خوف تھا جس سے میں دہشت زدہ ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر کسی کو پکارنا چاہا تھا کہ باہر ایک دم بادل زور سے گرجا اور میں اچھل پڑی۔ بلی کے رونے کی آواز بادل کے گرجنے کے ساتھ ہی بند ہو گئی اور پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ ٹین کی چھت پر گرنے والے قطرے جل ترنگ سا بجا رہے تھے مگر میرے کان بلی کی آواز کے منتظر تھے۔

کئی لمحے گزر گئے اور بلی کے رونے کی آواز سنائی نہ دی تو میں کچھ مطمئن ہو گئی اور میرے ذہن پر چھایا خوف دور ہونے لگا۔ باہر بوندا باندی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے پتول کو آواز دی مگر بارش کی آواز میں میری آواز دب گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ برابر والا کمرا اُسی کا ہے۔ اس حالت میں شاید ہی کبھی ایسا ہو کہ آواز برابر والے کمرے میں نہ جائے۔ شاید وہ سو گئی ہے تبھی اسے میری آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر والے دروازے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اسے اٹھانے کے لیے اس کا دروازہ بجانا پڑے گا۔

میں جاؤں یا نہ جاؤں، ابھی میں اسی پر غور کر رہی تھی۔ کہ میرے عقب سے آواز آئی ”بیکار ہے بلانا۔ اس گھر کا ایک فرد بھی صبح سے پہلے بیدار نہیں ہوگا۔“

میں نے چونک کر چہرہ گھمایا کیونکہ آواز میرے عقب سے آئی تھی مگر اندھیرے میں کچھ نہ دکھائی دیا اور میرے ذہن پر خوف کی چادر پھیلتی چلی گئی

''کک......کون ہے؟ کون ہے یہاں؟''میں نے ہکلا کر پوچھا کیونکہ خوف رگ رگ میں سرائیت کر چکا تھا۔

''مجھے دیکھنا چاہتی ہو؟''

''ہاں......! مگر اندھیرے میں مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''میں نے روہانسی آواز میں کہا۔

''آؤ روشنی میں چلتے ہیں۔تم وہاں مجھے دیکھ سکوگی۔''جواب میں وہ ہنستے ہوئے بولا۔

اس کے ساتھ ہی ایک کھردرے ہاتھ نے میرے ہاتھ کو تھام لیا۔وہ ہاتھ برف کی طرف یخ بستہ تھا مگر اس کے لمس سے مجھ پر عجیب سا خمار طاری ہوگیا اور میں بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

یقیناً میری کلائی تھامنے والا ہاتھ اسی ہستی کا تھا لیکن تاریکی میں اس کا وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔وہ مجھے دروازے سے باہر لے جانے لگا اور میرے قدم بے اختیاری میں اٹھتے چلے گئے۔کمرے سے باہر بھی تاریکی تھی۔آسمان پر گھرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش جاری تھی۔

باہر آ کر میں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا مگر وہ ہیولے کی مانند دکھائی دیا۔وہ مجھے برآمدے میں لے آیا اور پھر بڑے دروازے کی طرف چل دیا۔میرا دل خوف سے دھک دھک چل رہا تھا اور سردی کے باوجود مجھے پسینا آ رہا تھا لیکن خوف کے باوجود اسی ہستی کے لمس میں اتنی زیادہ کشش تھی کہ میرے قدم خود بہ خود اٹھ رہے تھے۔یہ بھی عجیب بات تھی کہ بارش ہو رہی تھی مگر میں بارش سے محفوظ تھی۔بادل گرج رہے تھے لیکن بادلوں کی گرج مطلق سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں بار بار اس کی طرف دیکھ رہی تھی مگر تاریکی میں وہ محض ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ایک بار اچانک برق چمکی اور ایک ثانیے کے لیے سارا منظر روشنی میں نہا گیا۔اس ثانیے میں مجھے میرا ہمراہی دکھائی دے گیا اور اس کی صورت دیکھ کر خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی۔

وہ قدیم وضع کے لباس میں ملبوس تھا۔اس کے سر پر کلغی دار پگڑی تھی۔مجھے اس کا صرف نصف چہرہ دکھائی دیا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک خوبرو نوجوان ہے لیکن اس کا چہرہ گردن سے کٹا ہوا تھا۔گردن اور چہرے کے درمیان دو انچ کا فاصلہ تھا۔میرے قدم یکدم رک گئے۔وہ بھی رک گیا۔

اب وہ تاریکی میں پہلے کی طرح محض ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔

''تت......تم......تم کون ہوں؟''میں دہشت سے ہکلا کر رہ گئی۔

''میں تمہارا ہمدرد ہوں۔''اس نے ہمدردی اور اپنائیت سے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔''ذرا جلدی چلو!''

''مگر......تم مردہ ہو۔تمہاری گردن تن سے جدا ہے۔''

''نہیں! میں زندہ ہوں۔ہزاروں سال سے زندہ ہوں۔گردن کا معاملہ جلد سمجھ میں آ جائے گا۔آؤ!''

اس نے میرا ہاتھ کھینچا اور میں انکار نہ کر سکی۔خوف سے میرا حلق خشک ہو چکا تھا اور ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا جا رہا تھا۔

میں اس کے ساتھ کھنچتی ہوئی گھر کے بند دروازے سے گزر آئی جیسے میرا مادی وجود ختم ہو گیا ہو۔ایسا کیسے ہوا، کیا میں مر چکی ہوں کیونکہ روح ہی اس

طرح ٹھوس چیزوں سے گزر سکتی ہے؟

اگر میں مرچکی ہوں تو پھر مجھے اپنی کلائی پر گرفت کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟‘ میں نے خود سے سوال کیا۔ میں سوچوں میں گم غیر ارادی طور پر قدم اٹھاتی جارہی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے سامنے کی سمت میں کسی چراغ کی لو نظر آنے لگی۔ شاید اس طرف بھی کوئی گھر تھا۔ میں چراغ کی لو پر نظریں جمائے چلتی رہی لیکن اُس چراغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک دم آس پاس سے کئی پُراسرار آوازیں ابھرنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں بدروحیں اور چڑیلیں مل کر دانت کچکچا رہی ہیں۔ ہڈیاں چبا رہی ہیں۔ ان آوازوں کو سن کر دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

دانت کچکچانے اور ہڈیاں چبانے کی آوازیں سن کر میرے قدم رک گئے تھے۔ میں ساکت ہوگئی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔

”بس یہیں رک جاؤ!“ مجھے لانے والے نے کہا۔ ”یہیں مہاراج پدھاریں گے۔“

”کون...... سدرشن؟“ میں نے پوچھا۔

”مہاراج سدرشن کا وہ دُوت (ہرکارہ) ہے۔ وہی تم سے بات کریں گے۔ مہاراج سدرشن کا پیغام پہنچائیں گے۔“

اس کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ چھن چھن چھنن کی آواز سنائی دی جیسے کوئی الھڑ مٹیار پازیب پہنے مٹکتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی چلی آ رہی ہو۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا ہوگا پھر بارش بھی ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں کسی عورت کا گھر سے باہر آنا ناممکن سی بات تھی۔ میں حیرت سے اُدھر دیکھ رہی تھی جدھر سے آواز آ رہی تھی کہ ایک حیرت انگیز منظر نظر آیا۔ چند فٹ کے فاصلے پر تاریکی میں دو خوف ناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ آنکھیں کسی بڑے جانور کی معلوم ہو رہی تھیں اور ان سے بے پناہ درندگی جھلک رہی تھی۔ شاید عام حالت میں کسی ایسے منظر پر یقین نہ آتا مگر میں نے اب تک جتنے بھی مناظر دیکھے تھے، تقریباً سب ہی ناممکن کے زمرے میں آتے تھے۔ ایسے ایسے محیر العقول مناظر دیکھ چکی تھی کہ میں کسی کو بتاؤں تو وہ جھوٹ سمجھے مگر اپنی آنکھوں دیکھے منظر کو کیسے جھٹلا سکتی ہوں؟ ایسا منظر کوئی اور دیکھتا تو یقیناً بے ہوش ہو جاتا مگر میں تو اس سے بھی زیادہ عجیب منظر دیکھ چکی تھی اس لیے حیرت و تجسس سے دیکھتی رہی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ایک تندرست و توانا نوجوان تھا۔ اس کے متناسب جسم پر قدیم وضع کے راجپوت راجکماروں کا لباس تھا مگر سرتا پاوہ زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

پیروں میں بیڑیاں تھیں جن کی جھنکار پر مجھے پازیب کا گمان ہوا تھا۔ کمر سے بندھے ہوئے پٹکے میں تلوار سے خالی نیام اُڑسی ہوئی تھی اور...... اور کشادہ سینے کے اوپر موٹی گردن سر سے محروم تھی۔ اچانک میری نظر اس کے بائیں ہاتھ پر گئی جس میں اس نے ایک کٹا ہوا سر بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔

سر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور یہ کھلی ہوئی آنکھیں بڑے نفرت انگیز تاثرات کے ساتھ مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے اچانک اس کٹے ہوئے سر کے نیم وا باریک ہونٹوں سے ایک خوف ناک قہقہہ بلند ہوا۔

''سنو! ایسے شعبدے میں بہت دیکھ چکی ہوں۔ تم سے بھی بڑے بڑے تانترک، گنک، اوجھا، پنڈت اور عامل مجھ سے ٹکرا چکے ہیں۔ طرح طرح کے جادو منتر اور بان مجھ پر آزما چکے ہیں۔ اگر تم مجھے ایسا کوئی منظر دکھا کر مرعوب کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ پتا نہیں کیوں میرے دل سے خوف یکسر غائب ہو گیا تھا اور یہ احساس ایک لمحے میں پیدا ہوا تھا ورنہ کچھ دیر پہلے تک میں پور پور خوف میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''سنو لڑکی! میں شعبدہ نہیں دکھا رہا۔ یہ حقیقت ہے۔ میرا یہ سر برسوں پہلے کٹا تھا تب سے میں اسے لیے گھوم رہا ہوں۔ کیوں، یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے سنا کر وقت برباد نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے یہ سنو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟'' سر کٹے نے کہا۔ یہ آواز اس کے ہاتھ میں لٹکے سر سے آ رہی تھی۔

''بتائیں حضور! آپ کس لیے تشریف لائے ہیں؟'' میں نے طنزیہ آواز میں پوچھا۔

''میں ہی کیا، میرے جیسی پچاسوں روحیں گرو مہاراج سدرشن جی کی قید میں ہیں۔ جسے جو حکم دیا جاتا ہے، اسے ہر حال میں حکم ماننا پڑتا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں سمجھائیں۔ بتائیں کہ ایسی نادانی سے صرف نقصان ہوتا ہے، فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ تم جس کام سے ڈھاکا سے چلی تھیں، اسے پورا کرو۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں دخل نہ دو۔''

''یہ مجھ سے کبھی نہ ہو گا۔ میں نے ایک بار انکار کر دیا تو سمجھو، وہی کچھ اہم ٹھہرا۔ اب میں اس وقت تک یہاں سے ہلوں گی نہیں جب تک سونالی کے گھر والوں کے درد دور نہ کروں۔'' میرے لہجے میں عزم تھا۔

''کیوں اپنی تباہی کو آواز دے رہی ہو۔''

''تم سب مل کر بھی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ہو، سمجھے!'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

''تو سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' سر کٹے نے کہا۔ اس کا اتنا کہنا تھا کہ دھم دھم کی آواز ہوئی اور دونوں طرف سے میرے دونوں بازوؤں کو گرفت میں لے لیا گیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھنا چاہا تو میرے پورے جسم میں خوف کی سرد لہر سی دوڑ گئی۔ میری دو طرف دو ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے، ہڈیوں کے ڈھانچے! انسانی ڈھانچے!

اگلے ہی لمحے مجھے اپنے دونوں بازو شکنجوں کی گرفت میں محسوس ہوئے۔ میرے بازو ان ڈھانچوں کے استخوانی ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ ان کی گوشت پوست سے محروم انگلیاں میرے بازوؤں میں چبھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے بازو ان کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

''چلو لڑکی! سمندر کی بپھرتی موجیں تمہیں نگلنے کی منتظر ہیں۔'' ایک ڈھانچے نے ہنس کر کہا۔

اس کی ہنسی اتنی خوف ناک تھی کہ مجھے سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ہنسنے سے اس ڈھانچے کے لمبے لمبے دانت کھڑکھڑانے لگے تھے۔

''آؤ سندری! سمندر کی مخلوق تمہارے خون سے پیاس بجھانے کے لیے بے تاب ہے۔'' دوسرے نے میرا بازو کھینچا۔

''بچاؤ......! بچاؤ......!'' میں چیخی تھی۔

''فضول ہے لڑکی! یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی تمہاری چیخ و پکار پر کوئی آئے گا۔ سب کچھ ہماری دسترس میں ہے۔ اب بارش ہی کو دیکھو۔ کیسی جھما جھم برسات ہے مگر ہم پر ایک چھینٹا تک نہیں آ رہا ہے۔''

ٹھیک اسی لمحے کسی جانور کے کودنے کی آواز آئی۔ آواز سنتے ہی ڈھانچوں نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ شاید انہوں نے بھی آواز سن لی تھی۔ ایک لمحے بعد ہی ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ ''میں آ گیا ہوں تمہارے سر کچلنے کے لیے۔''

اس کے ساتھ ہی ڈھانچوں کے عقب سے کوئی جانور غراتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے ڈھانچوں پر چھلانگ لگا دی۔

وہ شیر تھا...... اصلی بنگال ٹائیگر......! اس کے پنجے کی ایک ہی ضرب نے دونوں ڈھانچوں کو زمین بوس کر دیا تھا۔ شیر دو قدم آگے جا گرا تھا۔

ڈھانچے تیزی سے کھڑے ہوئے تھے۔ اسی لمحے شیر نے سنبھل کر دوبارہ ان پر چھلانگ لگائی اور اپنے پنجے ان میں سے ایک کی گردن کی ہڈی میں گاڑ دیئے۔ ڈھانچے کی کربناک سی چیخ بلند ہوئی۔ شیر نے دوسرا پنجہ دوسرے کے کندھے کی ہڈی میں پیوست کر دیا اور وہ ڈھانچہ دونوں ہاتھوں سے شیر کو پکڑ کر پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں آج تمہیں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دوں گا۔'' دفعتاً ایک بھاری آواز گونجی۔ یہ آواز شیر کے منہ سے نکلی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اس ڈھانچے کو زمین پر گرا لیا۔ ڈھانچے کے منہ سے چیخیں نکلنے لگی تھیں۔

''رحم کرو! ہم مجبور ہیں۔'' ڈھانچے چیخے۔

''تم رحم کے قابل نہیں ہو ذلیل! تم نے اِس معصوم دوشیزہ کو فریب دیا۔ اسے راہِ راست سے بھٹکانے کی کوشش کی۔ اِسے ذہنی اذیت دی۔ میں تمہیں فنا کر دوں گا۔''

پھر ڈھانچوں کی کھوپڑیاں کڑکڑانے اور چٹخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یکے بعد دیگرے دونوں ڈھانچوں کی کھوپڑیاں الگ ہو گئیں اور وہ خاموش ہو گئے......!

ڈھانچوں کی ہڈیاں الگ ہوتے ہی وہ ایسے غائب ہوئے جیسے ان کا وہاں وجود ہی نہ تھا۔ تب اس بنگال ٹائیگر نے دھاڑ ماری اور سر کٹے کی طرف متوجہ ہوا جو کسی پتھر کے بت کی طرح اپنی جگہ ایستادہ کھڑا تھا۔ شیر نے جیسے ہی اس پر چھلانگ لگائی، وہ پنجر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ یقیناً وہ سر کٹا بہت عقل مند تھا اسی لیے اس نے مقابلے کی بجائے فرار کو ترجیح دی تھی۔

ان کے غائب ہوتے ہی شیر بھی خاموشی سے ایک طرف دوڑتا چلا گیا اور میں گھر لوٹ آئی مگر دروازے پر پہنچ کر رکنا پڑا کیونکہ دروازہ مقفل تھا مگر اگلے ہی لمحے دروازہ خود بخود کھل گیا۔

☆=======☆=======☆

سدرشن کہاں مل سکتا ہے، یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ضروری تھا اس لیے کہ اس سے نمٹنا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ میری یہ عارضی پناہ گاہ وہ کسی بھی لمحے چھین سکتا تھا۔ میں اس خاندان کی عزت ڈھانپنا چاہتی تھی اور وہ انہیں سرِ عام ننگا کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ رحمت چاچی کے ذریعے مجھے پھنسانے کی کوشش میں تھا تبھی تو وہ یہ بات پھیلا رہا تھا کہ میں سونالی نہیں ہوں، بہروپیا ہوں اور سونالی کا بہروپ بھر کر اس کے گھر والوں کو بیوقوف بنا رہی ہوں۔ رحمت بی بی ایک سازشی عورت تھی۔ لگائی بجھائی کا اسے خاص شوق تھا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر ہی میرے پاس آئی تھی حالانکہ پہلے ہی دن میں نے اس کی تواضع ڈنڈے سے کردی تھی۔ اسی کی لاٹھی اس کی کمر پر پڑی تھی اور یہ واقعہ سب کے سامنے رُونما ہوا تھا اسی لیے اس گھر کے کسی بھی فرد نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا ورنہ اس نے اپنے تئیں پوری کوشش کرلی تھی۔ جب گھر والوں نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی تو اس نے محلے والوں سے کہنا شروع کردیا۔

یہ بات محلے میں پھیلے گی تو میرے لیے دشواری کھڑی ہوسکتی ہے اسی لیے میں نے اس کے بارے میں معلومات جمع کی تھیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے ایسا کررہی ہے مگر فقیر بابا نے یہ بتا کر حیران کردیا تھا کہ اسے سدرشن اپنے مفاد کی خاطر استعمال کررہا ہے اور اسے سدرشن نے مٹھی بھر روپے دیئے ہیں کہ وہ یہ بات محلے میں پھیلائے۔ اگر یہ بات وہ اسی طرح پھیلاتی رہی تو میں سب کی نظروں میں مشتبہ ہو جاؤں گی پھر سدرشن سے یوں بھی حساب کتاب کرنا ضروری ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اس گھر کو تباہ برباد کیا ہے۔ اس کی سزا نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ شاید باباجی نے مجھے اسی لیے یہاں بھیجا ہے۔

اسی رات میں نے باباجی سے رابطہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ سدرشن کالی مندر کے اندر چھپا ہوا ہے۔ کالی مندر میں داخلہ آسان نہ تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ میں مسلمان تھی اور کسی مسلمان کا مندر میں داخل ہونا خطروں کو دعوت دینا ہے پھر کالی مندر خود میں کسی قلعے سے کم نہ تھا۔ یہ مندر پاکستان بننے سے تقریباً پچاس سال پہلے کسی راجا نے بنوایا تھا۔ اس مندر اور مندر کے پجاری کے بارے میں اتنی پُراسرار باتیں مشہور تھیں کہ مسلمان اِدھر سے گزرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ کہا یہ بھی جاتا ہے کہ وہاں انسانی قربانی بھی دی جاتی ہے۔ یہ قربانی کالی پوجا کے دنوں میں ہی دی جاتی ہو گی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ اس بل میں چھپا بیٹھا ہے تو بھی میں اسے باہر نکالوں گی خواہ اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے ورنہ وہ پتا نہیں کتنے مسلمان گھرانوں کو برباد کرتا رہے گا۔

ابھی میں کالی مندر میں گھسنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ صبح ہی صبح ایک ملنگ آکر دروازے پر بیٹھ گیا۔

شیولی نے اسے کھانے کے لیے دیا تو اس نے تمام کھانا پھینک دیا۔ اُس کی اِس حرکت پر شیولی چراغ پا ہوگئی۔ وہ زور زور سے بول رہی تھی۔ اتنی اونچی آواز میں وہ کس سے باتیں کررہی ہے، یہ دیکھنے کے لیے میں بھی باہر آگئی۔

مجھے دیکھتے ہی ملنگ نے نعرہ لگایا۔ ''او جھوٹی مکار! کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہی ہے؟ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے۔ جا، اپنا کام کر! مقدس تابوت کا راستہ لے۔''

''اگر میں جھوٹی اور مکار ہوں تو بھی تیرا کیا لیتی ہوں؟'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''جھوٹ کا محل کھڑا کررہی ہے اور پوچھ رہی ہے کہ تیرا کیا لیتی ہوں؟ سن! یہ علاقہ ہمارا ہے۔ ہم اپنے علاقے میں کسی اور کی اجارہ داری

برداشت نہیں کر سکتے۔''

''تمام جہان اللہ تعالیٰ کا ہے۔تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو ستانا بند نہ کیا تو میں سب کو تباہ و برباد کردوں گی۔''

''اے لو، مینڈ کی کو بھی زکام ہونے لگا......! بیوقوف لڑکی! تُو ہماری قوت سے واقف نہیں ہے۔''

''میں تیری اور تیرے گرو سدرشن کیا تمام باطل طاقتوں کی قوت سے واقف ہوں۔''

''سمجھ گیا، تُو ایسے نہیں مانے گی۔ تباہی تیرا مقدر ہے۔''

''نہیں! تباہی سدرشن کا مقدر ہے۔ اس کے اقبال کا سورج غروب ہونے والا ہے۔''

''تُو کتنے پانی میں ہے، اس کا اندازہ ہمیں بخوبی ہے پھر بھی ہم تجھے سمجھائے دے رہے ہیں کہ ابھی تمہیں بچھو کا ہی منتر معلوم نہیں ہے تو پھر سانپ کے بل میں ہاتھ کیوں ڈال رہی ہو؟''

''سانپ کا سر کچلنے کے لیے! غور سے سن لو بلکہ میرا پیغام اس اُچکے سدرشن تک پہنچا دینا کہ میں بہت جلد اسے اپنے جوتے تلے مسلنے والی ہوں۔ جس بل میں وہ چھپا ہوا ہے، وہاں سے اسے کھینچ کر باہر نکالوں گی۔''

''چیونٹی کی موت آتی ہے تو وہ اڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ تمہاری موت بھی، آ چکی ہے اسی لیے مہاراج کو للکار رہی ہو۔''

''یہ تو وقت بتائے گا۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تمہیں سمجھانے کے لیے بلایا تھا مگر اب اندازہ ہو گیا کہ تم کسی طور اپنی موت کو ٹالنا نہیں چاہتی۔ جاؤ جو جی میں آئے، کرو۔'' کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ کے چمٹے کو زور سے بجایا۔

شیبولی جواب تک خاموش تھی، بولی۔''آپا! یہ کون ہے؟ اس طرح کیوں بول رہا ہے؟''

''تم چلے جاؤ اور پھر کبھی اِدھر کا رخ نہ کرنا۔''

کہہ کر میں پیر پٹختی ہوئی مڑ گئی۔ اس وقت میرے دل میں ضد نے جڑ پکڑ لی تھی کہ میں سدرشن کے بچے کو نہیں چھوڑوں گی۔ سزا دے کر ہی رہوں گی۔ اس کام میں دیر نہیں کروں گی۔

یہ کام رات گئے آج ہی کرنا ہو گا۔ میں نے ٹھان لی تھی اور یہ بھول گئی تھی کہ سدرشن کالے علم کا ماہر ہے جبکہ میں ہر جانب سے جکڑی ہوئی ہوں۔ میرے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔ فقیر بابا اور کٹورے والے سانپ کے درمیان کھلونا بنی ہوئی ہوں۔ جس کی طاقت چاہتی ہے، مجھے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے

ابھی ان دونوں کی جکڑ سے آزاد ہوئی نہیں ہوں کہ اس خواہ مخواہ کی مصیبت کو مول لے رہی ہوں لیکن اس وقت پتا نہیں کیوں ایسے کسی خدشے نے مجھے ہوشیار نہیں کیا تھا اور میں اسی رات اٹھ کر سدرشن کی کچھار یعنی کالی کے مندر کی طرف چل پڑی۔ اس مندر کی طرف جہاں کے چپے چپے پر کالے علم کا پہرہ تھا۔ موت کی حکمرانی تھی۔ تباہی کا طوفان تھا۔ مصائب کا کوہِ گراں تھا......!

☆=======☆=======☆

میں سدرشن کے کچھار یعنی اس مندر کی طرف چل پڑی تھی جہاں سدرشن چھپا بیٹھا تھا۔ یہ شہر میرے لیے نیا تھا۔ راستے اجنبی تھے۔ صرف سن رکھا تھا کہ شہر سے باہر جانے والے راستے پر واقع ایک پہاڑی پر وہ مندر ہے۔ کسی راجا نے اسے تعمیر کرایا تھا جو اب ایک کالے علم کے ماہر گنیش چیٹر جی کے قبضے میں ہے۔ اسی نے سدرشن کو پناہ دی ہے۔ میں نے ٹھان لی تھی کہ اگر گنیش نے اسے بچانے کی کوشش کی تو اسے بھی بھرپور سبق دوں گی۔

گنیش کے بارے میں پتا چلا تھا کہ اس کی عمر ستر پچھتر سال ہے اور اس نے کالا علم سکھانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ دور دور سے لوگ یہ علم سیکھنے کے لیے اس کے پاس آتے ہیں۔ سدرشن بھی اسی کا شاگرد ہے۔

اتنے بڑے ماہرِ فن سے کیسے نمٹوں گی، اسی پر غور کرتی ہوئی میں اس مندر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

سونالی کی قیام گاہ سے اس پہاڑی کا فاصلہ جس پر مندر بنا ہوا تھا، تین میل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ میں اس فاصلے کو طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ آبادی پیچھے رہ گئی اور میں پہاڑی کے نزدیک پہنچ گئی۔ اب مجھے پہاڑی پر چڑھنا تھا۔

میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہندو اپنے مندر آبادی سے باہر کیوں بناتے ہیں؟ تقریباً ہر جگہ میں نے یہی دیکھا ہے کہ مندر ویرانے میں بنا ہے۔ بعد میں آبادی ہو گئی ہو تو اور بات ہے۔ یہ مندر بھی شہر سے باہر اس ویران پہاڑی پر تھا۔ میں نے پہاڑی پر چڑھتے ہوئے پلٹ کر آبادی کے کچے پکے مکانوں کو دیکھا پھر نئے عزم کے ساتھ اوپر چڑھنے لگی۔ کوئی بیس پچیس منٹ تک میں برابر آگے بڑھتی رہی۔ کئی بار خوف کا غلبہ ہوا مگر میں نے ہر بار خود ہی اپنے حوصلے کو سوا کیا۔

آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ تاروں کی مدھم روشنی میں ویرانی کی چادر اوڑھے پہاڑیاں بہت زیادہ پُراسرار لگ رہی تھیں۔ پہاڑی کے اوپر بنے کالی مندر میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ اندر جل رہے چراغوں کی روشنی عجیب سی لگ رہی تھی۔ پُراسراریت کو بڑھا رہی تھی۔

اپنی منزل کو قریب دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ میں رُک گئی۔ گہری گہری سانسیں اپنے اندر اُتاریں پھر دوبارہ نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

پہاڑی راستہ ناہموار تھا اور بار بار پاؤں کے نیچے آنے والے پتھروں سے پیر رپٹ رہے تھے اس لیے میری رفتار بہت کم تھی۔ سُست رفتاری ہی سے سہی، میں مندر کے قریب پہنچ گئی۔ مندر کا احاطہ بہ مشکل چالیس گز کے فاصلے پر تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے وہاں میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔

میں ٹھٹک گئی تھی۔ رُک گئی تھی۔ پھر اپنے چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی تھی مگر وہاں دور دور تک کسی آدم زاد کا پتا نہ تھا۔ میں نے اسے اپنے اعصاب کی کمزوری سمجھا اور دل کو تسلی دیتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ابھی کچھ ہی دور آگے گئی ہوں گی کہ مجھے پھر ایسا لگا جیسے کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ میں نے صاف سرسراہٹ محسوس کی تھی لیکن میں رُکی نہیں بلکہ چلتے چلتے ہی اِدھر اُدھر نظریں گھما گھما کر دیکھتی رہی مگر کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اب میں احاطے کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ گیٹ سے اندر داخل ہونے ہی والی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ یقین کریں، وہ منظر ہی ایسا تھا کہ کمزور دل والوں کا دل بیٹھ جائے۔ اچانک ہی میرے سامنے گیٹ کے بالکل درمیان میں دھوئیں کے سفید بادل آ گئے تھے اور اب وہ ایک دائرے میں

پھیل رہے تھے۔ پہلی نظر میں، مَیں نے اسے کہر (Fog) سمجھا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے جب غور کیا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ کہر کا ٹکڑا اب سمٹ سمٹا کر انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر رہا تھا پھر اس نے میری طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ ہوا میں تیرتا ہوا آگے آ رہا تھا۔ میرے فرار کی راہ نہ تھی۔ ایسی کوئی گنجائش نہ تھی کہ میں اس سے بچنے کے لیے کسی اور راہ کا انتخاب کر لیتی اس لیے میں اسی جگہ پر کھڑی ہو گئی اور اس کہر کے ٹکڑے کا جائزہ لینے لگی۔

میں ابھی اس انسانی ہیولے کو دیکھ رہی تھی کہ وہ میرے قریب آ گیا۔ بالکل مقابل آ کر ٹھہر گیا۔

''خبردار! آگے نہ بڑھنا! مندر میں گھسنے کی غلطی نہ کرنا!'' اس نے سرکاری جیسی آواز میں کہا جس کی گونج کافی دیر تک محسوس ہوتی رہی۔ ہر آواز کا اپنا اثر ہوتا ہے جو جسم کے مختلف حصوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس آواز کا اثر میں نے دل پر محسوس کیا تھا۔ دل دھڑک اٹھا تھا مگر یہ سوچ کر کہ جو ڈر گیا، سو مر گیا! میں نے دل کو مضبوط کیا اور خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

میری کوشش کامیاب ٹھہری اور دل کی دھڑکن نارمل ہوتی چلی گئی۔ میں نے خوف پر قابو پاتے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا یہ مندر یاتریوں کے لیے بند ہے؟''

''مندر کا دروازہ ہر یاتری کے لیے کھلا ہوا ہے۔ کوئی بھی پوجا کرنے کے لیے آ سکتا ہے مگر اس پہر جب کسی پوجا کا سمے (وقت) نہیں ہے، کیسے کسی کو اجازت مل سکتی ہے؟''

''بھلے ہی یہ پوجا کا سمے نہ ہو مگر منوتی (منّت) کرنے کا سمے تو ہے! میں بھی منوتی مانگنے آئی ہوں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''جھوٹ مت بولو۔ کوئی بھی مسلمان کسی مندر میں منوتی نہیں مانگتا۔ تم بھی مسلمان ہو اس لیے دیوی دیوتا کے سامنے سر جھکا نہیں سکتیں۔ پھر میں تمہیں اچھی طرح سے پہچان گیا ہوں۔ تمہارا گرو (استاد) بھی میری نظروں میں ہے۔ مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ جاؤ، واپس چلی جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔''

میں سمجھ چکی تھی کہ یہ ایسے نہیں مانے گا۔ انگلی ٹیڑھی کرنا ہی پڑے گی مگر میں اسے کیسے قابو کروں؟ میرے پاس علم بھی تو محدود تھا بلکہ ذرّے جتنا تھا۔ اتنے کم علم سے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

میرے دماغ نے راہ بتائی۔ مشورہ برا نہیں تھا۔ میں نے واپس ہو جانے میں ہی عافیت جانی اور مڑ گئی۔ تبھی اس ہیولے نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''تُو نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ تُو، تو بہت چھوٹی ہے۔ تیرا گرو بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے، پھر تُو جس کی کھوج میں آئی ہے، وہ میرے گرو کی شرن (حفاظت) میں ہے۔'' میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور واپسی کے لیے قدم تیز کر دیئے۔

مندر تک پہنچ کر لوٹ آنا ایسا ہی تھا جیسے جیتی ہوئی بازی کو ٹھوکر مار دینا۔ میں نے بھی دانستہ شکست کو اپنا مقدر بنایا تھا۔ میں اس ہیولے سے ڈر کر واپس نہیں ہوئی تھی بلکہ میرے اندر سے کسی نے لوٹ جانے کو کہا تھا تبھی تو میں لوٹ آئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میں پوری طرح شیطانی چکر سے نکل آئی ہوں اور فقیر بابا کی حفاظت میں ہوں۔ وہی میری حفاظت کے داعی ہیں۔ ہر خطرے سے وہی بچا رہے ہیں۔ یقیناً آگے خطرہ تھا، ایسا

خطرہ جس سے بچنا آسان نہ تھا۔

یوں بھی میں کوئی عامل کامل تو تھی نہیں، اور نہ ہی میرے پاس کوئی ایسا علم تھا جس سے میں کسی بڑے خطرے سے خود کو بچا لیتی۔ یہ تو فقیر بابا کی عنایت کا کمال تھا کہ میں اب تک مختلف خطروں سے بچتی رہی تھی بلکہ فقیر بابا بچاتے آئے تھے اور اب خطرات بھی زیادہ تھے کیونکہ میں نے سانپ کے قالب میں نظر آنے والے ساحر کے حکم کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس سے دشمنی مول لے لی تھی اس لیے مجھے زیادہ ہوشیار رہنا تھا۔ میں نے چلتے چلتے سوچا کہ اس بار فقیر بابا سے کہوں گی کہ وہ مجھے کوئی ایسا علم سکھا دیں جس سے ضرورت کے وقت کام لے سکوں۔

یہی کچھ سوچتی ہوئی میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ فاصلے سمٹتے جا رہے تھے۔ سونالی کا گھر نزدیک آتا جا رہا تھا۔ اب یہی گھر میری جائے پناہ، میرے لیے سب کچھ تھا۔ فقیر بابا نے میرے لیے بہت اچھا انتظام کر دیا تھا۔ میں اس نعمتِ غیر مترقبہ میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ ایک عورت بڑی تیزی سے باہر نکلی تھی۔ اس کی سراسیمگی دیکھ کر میں چونکی تھی اور تیز رفتاری سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ وہ یاسمین تھی۔ سونالی کے چچازاد سلیم کی بیوی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ رک گئی تھی۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے پوچھا تھا۔ ''کیا بات ہے بھابی؟ آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟ کوئی بیمار ہو گیا ہے کیا؟''

''ابھی ابھی بابل آیا تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟'' دراصل مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ یہ بابل کون ہے؟

''اے لو، ایسے کہہ رہی ہو جیسے بابل سے واقف ہی نہیں ہو۔ پورے چار مرڈر کر چکا ہے۔ اس کے نام سے پورا علاقہ کانپتا ہے۔''

''غنڈوں سے الجھنے پر ہی وہ نقصان پہنچاتے ہیں اور سلیم بھیا لڑائی بھڑائی کے شوقین ہیں نہیں، پھر ڈرنا کیسا؟''

''ارے بیوقوف! بھول گئیں، وہ سود پر روپے دیتا ہے اور تمہارے بھیا نے اس سے پورے دس ہزار روپے لے رکھے ہیں۔ چلے تھے ہوٹل چلانے۔ سارے روپے برباد کر بیٹھے۔ اب وہ بابل سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ دو ماہ سے اسے سود کی رقم نہیں پہنچائی ہے۔ وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہے۔''

''ایسے ہی وہ مار پیٹ کر دے گا۔ آخر قانون بھی تو کوئی چیز ہے۔ پولیس میں رپورٹ لکھا دیں۔''

''ارے احمق کہیں کی! یہ سب تو بعد کی بات ہے، ابھی تو ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ سلیم کو ڈھونڈنے آیا تھا کہ ایک بچے نے بتا دیا کہ وہ سامنے والے ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ بابل گالیاں بکتا ہوا اُدھر گیا ہے۔ کہیں دونوں میں ہاتھا پائی نہ ہو جائے۔ بابل چاقو باز ہے اسی لیے میں اُدھر جا رہی ہوں کہ بیچ بچاؤ کرا سکوں۔''

''چلیں، میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔'' کہہ کر میں بھی اس کے ساتھ ہو لی۔

سڑک پر روشنی تھی۔ بجلی کے کھمبوں پر بلب جگمگا رہے تھے۔ ان دنوں بنگال میں ساٹھ پاور کے بلب کی روشنی کو ہی بہت سمجھا جاتا تھا۔ وہ اسی روشنی میں تیز تیز آگے بڑھ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قدم سے قدم ملاتی چل رہی تھی اگلی نکڑ سے مڑتے ہی وہ ہوٹل نظر آنے لگا جسے سونالی کے چچا

زاد نے بنایا تھا مگر چلا نہیں پایا اور اب کسی دوسرے کے ہاتھ میں تھا۔

ہم جس وقت ہوٹل کے دروازے پر پہنچے تو ہوٹل خالی پڑا تھا۔ صرف کاؤنٹر پر ایک آدمی بیٹھا تھا یا پھر بیرا تھا۔ میں نے اِدھراُدھر دیکھا تو مجھے وہ نظر آ گیا۔

کونے کی میز پر دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بحث عروج پر تھی۔ بابل کی آواز اونچی تھی جبکہ سونالی کا تایازاد سلیم نیچی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ ہم ان کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ بابل نے گالی بکی۔ سلیم غصے سے کھڑا ہو گیا۔ بات اب اور آگے بڑھتی کہ میں نے مداخلت کی۔ ''اے بابل! زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ۔''

اس نے مڑ کر دیکھا پھر کہا۔ ''ورنہ کیا کرلوگی؟ تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اگر ایک دن میں میرے پیسے نہیں ملے تو پھر میں اسے اٹھا کر لے جاؤں گا۔'' دنگا فساد اور اغوا بابل کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ کوری دھمکی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا سکتا تھا۔

''اسے ہاتھ لگایا تو ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد کرو گے۔'' میں نے اسے مرعوب کرنا چاہا۔

''جاؤ، جاؤ، میرے منہ نہ لگو۔ پتا نہیں، کس کس کے ساتھ وقت گزار آئی ہے۔ ہونہہ!'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ہاتھ گھما دیا۔ چٹاخ کی آواز سے ہوٹل گونج اٹھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا شخص بھی چونک اٹھا۔ اس نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ میں اس رخ سے کھڑی تھی کہ بابل میرے سامنے تھا اور بابل کی پیٹھ کاؤنٹر کی طرف تھی۔ اسی وجہ سے میں کاؤنٹر مین کو صاف دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر بابل کو دیکھا۔ وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید یہ میری چھٹی حس تھی یا پھر کوئی اور بات، میں جھٹکے سے بیٹھتی چلی گئی تھی اور وہ اپنی ہی جھونک میں آگے کی طرف جھک گیا تھا اور سیدھا میرے سر سے ٹکرایا تھا۔ بس یہی لمحہ تھا جب میں نے سوچا تھا کہ میرے گھونسے میں بھی مردوں جیسی قوت آ جاتی۔ ساتھ ہی ساتھ بیٹھے بیٹھے میں نے گھونسا بھی چلایا تھا جو اس کے پیٹ میں لگا تھا۔

یقین کریں، میرا گھونسا اتنا زبردست ثابت ہوا تھا کہ وہ اڑتا ہوا دور جا پڑا تھا اور کچھ دیر تک وہیں پڑا حیرت سے مجھے گھورتا رہا تھا۔ اس کی بے چارگی دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور میں خود کو بھولو پہلوان سمجھنے لگی تھی۔

''اور ایک ہاتھ دوں؟'' میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میرا اتنا کہنا ہی کافی ثابت ہوا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا تھا، سچ ہے یہ تو واقعی کچھ اور بن گئی ہے۔ جادوگرنی بن چکی ہے۔

اس کے چہرے پر خوف جھلک آیا تھا۔ کوئی کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو، بھوت پریت، جادو منتر سے سبھی ڈرتے ہیں اسی لیے جیسے ہی میں نے گھونسا چلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور تب میں یاسمین کی طرف مڑی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں حیرت زدہ رہ گئی تھی کیونکہ ان دونوں میاں بیوی کی آنکھیں خوف سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کی روح اب نکلی کہ تب! تبھی کاؤنٹر مین کی آواز آئی۔ ''باپ رے باپ! یہ تو ہنٹر والی کی نانی ہے۔''

اُن دنوں بھارت کی ایک فلم ''ہنٹر والی'' کا چرچا زوروں پر تھا۔ بہت شہرہ تھا۔ ہر دلیر لڑکی کو یہی خطاب دیا جاتا تھا۔ میں نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔ ''تجھے بھی ایک ہاتھ دوں؟''

''میرے باپ کی توبہ، میں کوئی دشمن ہوں؟ آؤ، آؤ، اسپیشل چائے پیو۔'' کاؤنٹر مین بولا۔

''چائے میں گھر جا کر پیوں گی۔'' میں نے کہا اور یاسمین کا ہاتھ پکڑا۔ وہ میرے ساتھ کھنچتی ہوئی چلی آئی تھی۔

اس کا شوہر بھی ساتھ ہولیا۔ ہم تینوں گھر پہنچے۔ میں نے راستے ہی میں سمجھا دیا تھا کہ وہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ دونوں پہلے ہی اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ گھر آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں بھی اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا۔ آخر کب تک میں اسی طرح اللہ توکل چلتی رہوں گی؟ میرے گرد دشمنوں کا گھیرا ہے۔ ایک دو نہیں، کئی دشمن ہیں۔ شنکر ہے، نورالنہار کا بھائی ہے۔ سانپ کی شکل میں ملنے والی پُراسرار ہستی ہے پھر یہ نئے نئے برساتی مینڈکوں ایسے دشمن ہیں۔

ان سب سے بچاؤ کے لیے میری اپنی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ قوت کہاں سے آئے؟ میں اس پر غور کرنے لگی۔ ہر انسان کے اندر ایک نہ ایک پُراسرار قوت ضرور ہوتی ہے۔ ایک اندھا بغیر دیکھے بہت ساری چیزوں کا، سمت اور راستوں کا، شخصیت کا ادراک کر لیتا ہے۔ اس کی حسیں کئی سو گنا بڑھ جاتی ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ اس کے اندر کی قوت قوی ہو جاتی ہے۔ یہ قوت بینائی رہتے بھی ہوتی ہے مگر اس وقت حس کو بیدار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس لیے لوگ نہیں کرتے بلکہ ایسی قوت کو محسوس ہی نہیں کر پاتے ہیں۔ میرے اندر بھی کوئی قوت ضرور ہے اس لیے تو وہ پُراسرار شخصیت، وہ فقیر بابا میری زندگی میں دَر آئے ہیں۔ بقول اس شخصیت کے کہ میرا جنم ایسے وقت میں ہوا تھا جب مریخ اور مہتاب ساتویں گھر میں تھے اور اس ساعت میں پیدا ہونے والے بچے مخفی قوت کا سرچشمہ ہوتے ہیں اس لیے بھی میرے اندر پُراسرار قوت کا خزانہ ہے۔ میں اس خزانے سے لاعلم ہوں۔ کیسے اسے کام میں لاؤں؟''

ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ میرے ذہن میں فقیر بابا کی شبیہہ ابھر آئی۔ ہاں! وہی بتا سکتے ہیں کہ میں کیسے اپنے اندر کوئی مخفی قوت پیدا کر سکتی ہوں۔

فقیر بابا کا خیال آتے ہی میں نے دل ہی دل میں انہیں آواز دینا شروع کر دی۔ بہ مشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ کھڑکی پر دستک ہوئی۔ گو کہ دستک بہت ہلکی تھی لیکن کمرے کی خاموشی اور میری ہمہ تن گوشی کی وجہ سے یہ دستک مجھے چنگھاڑ جیسی سنائی دی۔ میں گویا اچھل پڑی۔ دوسری دستک پر میں جھپٹ کر کھڑکی پر پہنچی اور کھڑکی کھول دی۔ دوسری طرف فقیر بابا کھڑے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے پھر بولے۔ ''تُو نے میرا دل خوش کر دیا۔''

''اچھا! ایسی کون سی بات ہے جس نے خوشی بخش دی؟''

''میں اگر چاہتا تو بغیر اجازت بھی اندر آ سکتا تھا مگر اب تجھ میں کئی تبدیلیاں آ چکی ہیں اسی لیے احتراماً دستک دے کر تجھ سے اجازت لے

لی۔'' بابا نے مسکرا کر کہا۔'' جانتی ہے، اللہ تعالٰی نے انسان کو پیدا کیوں کیا؟ عبادت کے لیے؟ نہیں، عبادت کے لیے ملائکہ وفرشتے کافی تھے۔ عبادت تو انسان کے لیے ایک حصار ہے۔ تُو نے نماز شروع کر دی، تو سمجھ لے، تیرے گرد ایک حفاظتی حصار قائم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کل تُو مندر تک جا کر بہ حفاظت لوٹ آئی۔''

''تو کیا وہاں زیادہ خطرہ تھا؟''

''بچھو کا جھاڑ معلوم نہیں، اور سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال رہی تھی! ارے بیوقوف! وہ مندر شیطان کا گڑھ ہے۔ تجھے شاید علم نہیں، ''کالی''، جس کی وہاں پوجا ہوتی ہے، وہ ہندوؤں کے بقول، وناش یعنی تباہی کی دیوی ہے۔ سحر وساحری کی دیوی ہے۔ اسی کا ایک روپ ''کمکھیا'' ہے۔ کمکھیا کا اصل مندر آسام کے کامروپ شہر میں ہے۔ اس مندر میں اسی کمکھیا کی پوجا ہوتی ہے۔ وہ مندر دلدل ہے، دلدل۔''

''بابا! آپ تو میرے ساتھ ہیں، پھر مجھے خوف کیسا؟''

''سردی کے موسم میں گرم کپڑے سردی سے بچاتے ہیں۔ تم خوب گرم کپڑے پہن لو اور انتہائی ٹھنڈی اثر والی چیزیں ڈھیر ساری کھا لو تو کیا طبیعت خراب نہیں ہوگی؟ اور اگر گرم اثر والی چیزوں کا اعتدال میں استعمال کرتی رہو تو گرم کپڑوں کی بھی ضرورت نہ رہے۔ تمہارے لیے میں گرم کپڑے ایسا ہوں۔ اوپر اوپر سے بچانے والا۔ تمہیں چاہیے کہ تم خود اپنے اندر قوت پیدا کرو۔''

''مگر کیسے؟''

''آج میں تمہیں اپنی حقیقت بتا رہا ہوں۔ تمہارے ابا بھی بہت اچھے عامل تھے۔ وہ میرے پیر بھائی تھے۔ ہم دونوں حضرت مخدوم شاہؒ جن کا مزار بہار شریف ضلع نالندہ صوبہ بہار بھارت میں ہے، انہی کے مرید تھے۔ میں تمہارے ابا سے زیادہ عبادت وریاضت کرتا تھا اس لیے ان سے آگے بڑھ گیا۔ جب پاکستان بنا اور وہ ہجرت کر کے ڈھاکا آ گئے لیکن میں وہیں رہ گیا۔ آج بھی وہیں ہوں۔ یہ میرا روحانی سفر ہے۔ صرف پیر بھائی کی محبت میں، مَیں تمہاری حفاظت کر رہا ہوں۔''

''تو کیا آپ اس وقت چٹا گانگ میں نہیں ہیں؟''

''چٹا گانگ کیا، میں مشرقی پاکستان سے بھی باہر ہوں۔ اس وقت پٹنہ کے پھلواری شریف کی خانقاہ میں بیٹھا ریاضت کر رہا ہوں۔ تمہارے سامنے میرا سایہ ہے، روحانی سایہ! اگر تم نے بھی اللہ تعالٰی کی خوشنودی حاصل کر لی تو سمجھو کہ ایسا ہی کمال حاصل کر لو گی۔ اللہ تعالٰی کی رضا حاصل کرنے کے بے حساب طریقے ہیں۔ علماء، فضلاء اور فقہاء، اولیاء، ابدال اور قلندر، سب انسان ہوتے ہیں بس انہیں معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ علم کا وجدان مل جاتا ہے اور وہ انسان ہوتے ہوئے بھی ایک دو سیڑھی بلند ہو جاتے ہیں۔ تم بھی کوشش کرو۔ شاید قلندری کا ایک جز ہی سہی، تمہیں بھی مل جائے۔''

''مگر یہ کیسے ملے گا؟''

''عبادت میں دل لگاؤ۔ بزرگانِ دین نے اپنے تجربے کا نچوڑ تحریری طور پر بھی چھوڑا ہے۔ اس سے استفادہ کرو۔ تمہارے ابا کے پاس

حضرت مخدوم شاہؒ کا ایک رسالہ تھا۔ اس میں بہت کچھ ہے۔ اس سے استفادہ کر سکتی ہو۔''

''مگر وہ کتاب تو پتا نہیں، کہاں کھو گئی؟ ڈھاکا میں جب ہمارا گھر لٹا تو تمام اثاثے تلف ہو گئے۔''

''مگر وہ کتاب محفوظ ہے۔ یاد کرو، تمہیں وہ کتاب مل گئی تھی پھر اسے تم نے اپنی سہیلی نورالنہار کے گھر کی دوچھتی میں چھپا دیا تھا کیونکہ شنکر اس کتاب کے حصول کے لیے تم پر زور دے رہا تھا۔''

''ہاں، ہاں، یاد آ گیا۔ میں جلد ڈھاکا جا کر وہ کتاب لے آؤں گی۔''

''ابھی ڈھاکا جانا تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ کچھ دن یہیں رہو۔ تمہیں کتاب کی ضرورت ہے ناں، میں لا دیتا ہوں۔ یوں بھی مجھے ایک خاص عمل کرنے کے لیے پوری دلجمعی سے بیٹھنا ہے۔ چالیس دن تک تم سے ملاقات کسی طور نہیں ہو گی۔ اس دوران میں تم اس کتاب کا مطالعہ کرتی رہنا۔ اگر کچھ حاصل کر لو تو اور بھی اچھی بات ہے۔''

''آپ جیسا کہیں!'' میں نے سر جھکا کر ادب سے کہا اس لیے کہ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ میرے ابا کے ساتھی ہیں اس لئے اُن کا احترام کرنا ضروری تھا۔

''کچھ دیر ٹھہرو، میں کتاب لے کر آتا ہوں۔''

کہہ کر فقیر بابا غائب ہو گئے۔ یہ وقفہ طویل ثابت نہ ہوا۔ بمشکل منٹ ڈیڑھ منٹ میں وہ حاضر ہو گئے۔ انہوں نے وہی ابا والی بوسیدہ سی، ہاتھ سے لکھی کتاب مجھے لا کر دے دی۔ کتاب دیتے وقت بولے۔ ''یاد رکھو، سب سے بہترین عمل عبادتِ الٰہی ہے۔ یہی پہلا زینہ ہے کیونکہ یہ فرض ہے۔ واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھے گا کہ میں نے لذیذ سے لذیذ پھل، غذائیں بخشی تھیں۔ تم نے کھائی کیوں نہیں؟ بے شمار نعمتیں بخشی تھیں؟ ان سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ بلکہ یہ پوچھے گا۔ ''ہم نے جن باتوں کا حکم دیا تھا، انہیں پورا کیوں نہیں کیا؟ جن باتوں سے منع کیا تھا، انہیں کیوں کیا؟'' پہلا حکم عبادت کا ہے۔ اسے غلطی سے بھی ترک نہ کرنا ورنہ کوئی عمل قبول نہیں ہو گا۔''

''جی بہتر! میں دل سے عبادت کروں گی۔''

''ہاں، یاد رکھنا، چالیس دن تک میں تم سے غافل رہوں گا اس لیے کسی قسم کا رسک نہ لینا یعنی خطرے کے وقت تم سوچتی تھیں اور وہ کام ہو جاتا تھا۔ اب نہیں ہو سکے گا۔''

''اچھا! تو خدا حافظ!'' کہہ کر فقیر بابا ہوا میں گویا تحلیل ہو گئے۔ اب میں تھی اور اکیلا کمرا تھا۔ میں نے بوسیدہ کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا۔ ''اے انسان! ذرا سوچ، تُو پیدا کیسے ہوا ہے؟ تُو گندگی کی پوٹ ہے۔ صرف تیری روح پاکیزہ ہے۔ اسے پاک رکھ! حرص و طمع میں نہ پڑ۔ سوچ، یہ تیرے سامنے جتنا کچھ ہے، کیا ہے؟ سب فنا ہو جائے گا۔ باقی رہے گی ذاتِ باری تعالیٰ! جسے فنا ہونا ہے، اس سے محبت کیسی؟ دنیا میں سب سے شیریں شہد ہے۔ ذرا سوچ، شہد کیا ہے؟ ایک مکھی کا پاخانہ! دنیا میں سب سے ملیح، سب سے نرم کپڑا ریشم ہے۔ ریشم کیا ہے؟ ایک کیڑے کا پاخانہ! اے مرد! تو حسین عورت پر جان فدا کرنے کو سوچتا ہے۔ اس لذت کی انتہا کہاں ہے؟ کیسی جگہ؟ کیا تو انہی چیزوں، انہی لذات

کے لیے زندہ ہے؟ تف ہے تجھ پر! کہ تُو اپنے مالک کو بھولا ہوا ہے۔ عبادت کر! عبادت!'' میں نے اتنا ہی پڑھا تھا کہ مجھ پر رعشہ سا طاری ہو گیا۔ فوراً کتاب بند کی اور مصلے پر بیٹھ گئی۔ رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگی۔ اپنی کوتاہیوں، غلطیوں پر آہ و بکا کرنے لگی۔

اب میں زیادہ وقت عبادت میں گزارنے لگی تھی صرف اس امید پر کہ شاید مجھے بھی کچھ مل جائے۔ کوئی قوت حاصل ہو جائے۔ اسی کتاب میں ایک عمل تھا جسے کرنے کے بعد مجھے کئی قسم کی قوت مل جاتی۔ میں نے اس عمل کو کئی بار پڑھا۔ ذہن میں ایک ایک سطر کو بٹھایا پھر وہ تمام آیات و اسمِ باری تعالیٰ ایک کاغذ پر اتار لیے۔

اس عمل کو کرنے کے لیے مجھے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا تھا جہاں کوئی مخل نہ ہو۔ کھلے آسمان تلے ہونا ضروری تھا۔ یہ عمل آبی تھا یعنی پانی کے نزدیک کرنا تھا۔ ایسا ہی ایک عمل آتشی بھی تھا جسے آگ کے نزدیک کرنا تھا جو سریع الاثر تھا مگر اس پر لکھا تھا کہ اس میں جان کا خطرہ زیادہ ہے اور اسے کسی پختہ کار عامل کی نگرانی میں کرے۔ مجھے وہ عمل زیادہ گنجلک لگا تھا اسی لیے آبی کو منتخب کیا تھا اور اب ذہن پر زور ڈال رہی تھی کہ کہاں پر یہ عمل کروں؟ بہت سوچنے کے بعد یاد آیا کہ ''کالی ڈیگھی'' (کالا تالاب) کے نزدیک کیا جا سکتا ہے۔

کالی ڈیگھی بہت بڑا تالاب تھا جس کا دوسرا کنارا سمندری نالے سے جا کر ملتا تھا۔ اس کی طوالت کے سبب ہی اسے ''کالی ڈیگھی'' کہا جاتا تھا پھر وہ تالاب سونالی کے گھرانے کی ملکیت تھی اس لیے کسی اور کی مداخلت کا سوال نہ تھا پھر اس طرف سے عام راستہ بھی نہ تھا۔ دن میں بھی ادھر کم ہی لوگ جاتے تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اسی روز چودھویں کی رات تھی۔ میں نے رات ہی سے عمل کے آغاز کی ٹھان لی اور عمل میں جن چیزوں کی ضرورت تھی، ان کا انتظام کر لیا اور رات کا پہلا پہر شروع ہوتے ہی دبے پاؤں گھر سے نکل پڑی۔

رات کے اس پہر میں کالی ڈیگھی کا ماحول حد درجہ پُراسرار لگ رہا تھا۔ جگہ جگہ خودرو جھاڑیاں تھیں۔ اتنی بڑی بڑی جھاڑیاں کہ ان کے پیچھے کئی آدمی چھپ سکتے تھے۔ ہوا سے ہلتی ہوئی جھاڑیوں نے ماحول کو نہایت خوف ناک بنا دیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی جھاڑی کے پیچھے سے کوئی اب نکلا کہ تب نکلا لیکن مجھ پر ذرا بھی خوف کا اثر نہ تھا جبکہ تالاب کے دوسری طرف گوروں کا قبرستان تھا۔

شاید نصف صدی پہلے وہاں انگریزوں کے مردے دفن ہوتے تھے لیکن اب متروکہ کہلاتا تھا۔ وہاں دسیوں پکی قبریں تھیں جن پر بڑے بڑے صلیب بنے ہوئے تھے۔

چاند کی روشنی کھیت کر رہی تھی ورنہ میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتی کیونکہ راستہ حد سے زیادہ ''اوبڑ کھابڑ'' تھا۔ کہیں کھڈے تھے تو کہیں ابھرے ہوئے پتھر جن سے قدم ٹکراتے ضرور۔

کافی تلاش کے بعد میں نے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی جہاں حصار کھینچ کر بیٹھ سکتی تھی۔ کتاب میں تحریر تھا کہ کسی بھی حالت میں حصار سے باہر نہیں نکلنا خواہ آندھی آئے یا اولے پڑیں ورنہ عمل الٹا پڑ جائے گا اسی لیے میں نے اس جگہ کو منتخب کیا تھا جس کے چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور وہاں بیٹھا ہوا شخص دور سے کسی کو نظر بھی نہیں آتا۔

ابھی میں جگہ کو صاف کر کے بیٹھی ہی تھی کہ ایک عجیب بات دیکھی۔ ڈیگھی (تالاب) میں ایک کشتی چلی آ رہی تھی۔ گو کہ کشتی ابھی دور تھی پھر بھی میں حصار کھینچتے کھینچتے رک گئی تھی۔ آدھا حصار بنا تھا۔ میں حیرت سے اس کشتی کو دیکھ رہی تھی کہ یہ کہاں سے آ رہی ہے؟ بنگال میں کشتی سب سے عام سواری ہے۔ ہر جگہ نظر آتی ہے کیونکہ ندی نالوں کی بہتات ہے مگر اس ڈیگھی میں کشتی کا آنا تعجب خیز بات تھی۔

دھیرے دھیرے وہ کشتی کنارے پر آ رکی اور ایک کے بعد ایک کل آٹھ آدمی اترے پھر انہوں نے کشتی پر سے سہارا دے کر ایک جنازہ اتارا اور اسے اٹھا کر چلے۔ میں سوچ رہی تھی۔ 'قبرستان تو دوسری طرف ہے اور یہ لوگ جنازہ ادھر کیوں لے آئے؟' میں جھاڑیوں کی آڑ میں تھی اس لیے یہ خوف بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ مجھے دیکھ لیں گے۔ انہوں نے جنازے کو ایک جگہ اتار کر رکھا اور دو قوی ہیکل آدمی پھاوڑا لے کر قبر کھودنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قبر کھد گئی۔ اب اس قبر میں ایک شخص اُترا اور اس نے کہا۔ ''لاؤ بھئی، جنازہ بڑھاؤ۔ کام جلدی ختم کرنا ہے۔''

باہر سے دو آدمیوں نے کفن میں ملبوس لاش کو سہارا دے کر قبر میں اتارا۔ لاش قبر میں پہنچی تو اندر والے نے چیخ کر کہا۔ ''ارے، غضب ہو گیا۔ قبر چھوٹی ہے اور لاش بڑی ہے۔ جلدی لاش اوپر اٹھاؤ۔''

لاش کو پھر سے تابوت میں رکھ دیا گیا۔

''اب کیا ہوگا؟ قبر تو کھد چکی ہے۔ خالی قبر کو بند کرنا غلط ہے۔'' ایک شخص نے کہا۔

''قبر خالی کیوں رہے، یہ لو۔'' کہہ کر پھاوڑے والے نے اپنے برابر میں کھڑے شخص کے سر پر پھاوڑا مارا۔ زخمی شخص تیورا کر نیچے گرا تو اس پر دوسرے پھاوڑے والے نے حملہ کر دیا۔ اسے مار کر اسی قبر میں دفن کر دیا گیا پھر اس قبر کے برابر نئی قبر کھودی جانے لگی۔ وہ قبر تیار ہوئی مگر وہ بھی چھوٹی نکلی۔ مردے کو پھر سے باہر نکالا گیا اور ایک دوسرے شخص پر وہ دونوں پھاوڑا برسانے لگے۔ زخمی شخص بے دم ہو کر قبر میں جا گرا۔ اوپر والوں نے بجلی کی سی پھرتی سے اس پر بھی مٹی ڈالی اور قبر بند کر دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے چھ قبریں تیار ہو گئیں۔ مگر مردے کو قبر نصیب نہ ہوئی۔ ساتویں قبر کھودی گئی مگر وہ بھی چھوٹی ثابت ہوئی۔ اب ایک پھاوڑے والے نے دوسرے سے کہا۔ ''اب کیا کیا جائے؟ یہ قبر بھی چھوٹی نکلی۔''

''کسی اور کو دفن کر کے نئی قبر کھودو۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''لیکن اب تو کوئی بھی نہیں بچا۔ ایک میں ہوں اور دوسرے تم۔ میں تو خودکشی کرنے سے رہا۔ کیا تمہیں مار کر قبر بند کر دوں؟''

''ارے عقل کے اندھے! آنکھیں کھلی رکھا کر۔ ابھی ایک قبر اور تیار ہو سکتی ہے۔''

''پہلے اس قبر کو بھرنے کی سوچو۔''

سوچنے کی ضرورت کیا ہے۔ ذرا ان جھاڑیوں کے پیچھے دیکھو۔ وہ لڑکی بیٹھی ہے ناں، اسے اٹھا لاؤ۔''

''ارے واہ، مان گئے تمہاری آنکھوں کو۔ ابھی لو۔'' کہہ کر وہ میری طرف لپکا۔ میں بری طرح گھبرا اٹھی۔ گھبراہٹ میں، میں حصار سے باہر نکل آتی کہ مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے سرزنش کی ہو۔ رکنے کے لیے کہا ہو، اور میں ٹھٹک گئی۔ رک کر زور زور سے آیت قرآنی پڑھنے لگی۔

بس وہی لمحہ تھا کہ اِدھر میں نے کلامِ ربانی کا وِرد کیا، اور اُدھر طوفان آ گیا۔ عجیب سا شور و غوغا مچ گیا۔ چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سینکڑوں چڑیلیں ایک ساتھ منمنا رہی ہوں۔ بَین کر رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ آوازیں کم ہونے لگیں جو ایک وقت پر آ کر بالکل ختم ہو گئیں۔

وِرد کا ہی اثر تھا کہ وہ کھیل تماشا ختم ہو گیا۔ یقیناً مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے ہی ایسا منظر مجھے دکھایا گیا تھا کیونکہ روحیں اپنی مرضی سے نہیں بلائی جاتیں۔ علم کے زور پر انہیں حاضر ہونے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ علم کی قوت ہے جو ارواح کو پھر سے اجسام کی دنیا سے تعلق پیدا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مجھے علم تھا، ابا سے سنا تھا کہ روحوں میں انسانوں کی طرح مختلف مزاج اور طبیعت کی روحیں ہوتی ہیں۔ نیک و بد، شریف اور ذلیل، روح زندہ و جاوید ہے۔ روح، جسم کے زندان میں مقید رہتی ہے۔ جب جسم ختم ہو جاتا ہے تو روح ابدی وسعتوں میں گم ہو جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ روح کی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب مادی جسم اپنی سرگرمی ختم کر دیتا ہے۔

میں اس وقت پوری دلجمعی سے تیاری کر رہی تھی کیونکہ روحانیت میں سب سے مشکل کام اس دنیا سے عالمِ بالا میں رہنے والی روحوں میں تعلق پیدا کرنا ہے۔ میں نے ساتھ لائی ہوئی پیتل کی تھالی میں انگارے دہکا لیے تھے اور اس پر لوبان چھڑک کر خوشبو پھیلا رہی تھی۔ اس کنارے پر اور اس کنارے کے قبرستان میں سکوتِ مرگ طاری تھی۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ رات بہت پُرسکون تھی۔ چاند تمام تر تابانی سے چمک رہا تھا۔ پرندے بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں خاموش تھے۔ میں نے وظیفہ شروع کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے ہر طرف اندھیرا چھانے لگا ہے پھر ایسا لگا جیسے زبردست قسم کا طوفان اُمڈ آیا ہے جو سب کچھ تہ و بالا کر دے گا۔ میں نے گھی کا جو چراغ جلایا تھا، وہ یکایک بجھ گیا۔ میں نے اسے دوبارہ روشن کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور وظیفہ پڑھتی رہی۔ طوفان کا زور بڑھتا رہا۔ مجھے اپنے کپڑے پھڑپھڑاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے کہ یکایک اندھیرا بڑھ گیا اور چنگاریاں سی میرے اردگرد منڈلانے لگیں۔ میں ان سے مُطلق خوف زدہ نہ تھی کیونکہ اپنے اندر ایک نیا حوصلہ پا رہی تھی اسی لیے نہایت محتاط انداز میں اپنے عمل کو جاری رکھا پھر میرے کانوں میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ ایسا لگا تھا جیسے کوئی نزدیک ہی کسی جھاڑی کے پیچھے بیٹھا رو رہا ہو پھر یہ آواز آہستہ آہستہ بڑھنے لگی جو میری سماعت کو گھائل کر رہی تھی۔ میں اس آواز پر وظیفہ روک دیتی کہ مجھے احساس ہوا جیسے کسی نے مجھے ہوشیار کیا ہو کہ نہیں، ایسی غلطی نہ کرنا ورنہ ساری محنت برباد ہو جائے گی اور میں نے زور زور سے ورد شروع کر دیا۔ اپنی آواز کو رونے کی آواز سے بلند کرتے ہوئے انگاروں پر لوبان ڈالتی چلی گئی۔ تیز خوشبو سے پوری فضا معطر ہو گئی۔ پھر تیز ہوا کے جھکڑ، طوفان، آگ کے شعلے اور دھوئیں کے مرغولے، سب کی طاقت ختم ہو گئی اور مجھے محسوس ہوا کہ زمین لرزنے لگی ہے۔ میں نے اپنا وظیفہ مکمل کر لیا تھا اس لیے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے پکارنے لگی۔ ''اے مقدس و پاکیزہ روح! حاضر ہو جاؤ۔ میں تمہیں ان اسماء کا واسطہ دے رہی ہوں جو تمہارے لیے اہم ہیں۔ انہی اسماء کا واسطہ، جلدی آ جاؤ۔ مجھے تم سے کام ہے۔ تمہاری مدد درکار ہے۔''

میری آواز کے جواب میں کامل سکوت رہا۔ ہوا کا شور پوری طرح سے ختم ہو چکا تھا۔ میں نے پیتل کی تھالی میں دہکتے کوئلوں پر پھر لوبان چھڑکا اور دوبارہ پکارنے لگی۔ چند لمحوں بعد میرے اطراف میں خوشبو ہی خوشبو پھیل گئی اور پھر سامنے سے دھوئیں کا ایک مرغولہ سا برآمد ہوا جس نے نزدیک پہنچتے ہی ہیولے کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے سلام کیا تو اس نے جواب سلام دیا۔ میں پوری طرح مطمئن ہو گئی کہ یہ وہی ہے جسے میں بلانا

چاہتی تھی۔ اگر شیطانی چکر ہوتا تو مجھے جواب سلام نہ ملتا۔ میں نے اس پاکیزہ روح جو ایک حسین دوشیزہ کی شکل میں حاضر تھی، پوچھا۔ ''کیا تُو بتا سکتی ہے کہ میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟''

''اس وقت تُو خطروں میں گھری ہے۔ تیرے کئی دشمن ہیں جن میں شیطانی چکر والے زیادہ ہیں تُو انہی سے نمٹنا چاہتی ہے۔''

''اس سلسلے میں تُو میری کیا مدد کر سکتی ہے؟''

''جیسا کہ تجھے علم ہے، میں اچھی روح ہوں کیونکہ زندگی میں بھی اچھے کردار کی تھی۔ میرا نام عالمِ اجسام میں فرحت تھا۔ میں اپنے نام کی طرح فرحت بخشنے والی ہوں۔ یہ تو تجھے معلوم ہی ہے کہ جسم کی قید سے آزاد ہونے والی تمام روحوں کا اپنا ایک عالم ہے۔ وہ جسم جو ازل سے اب تک پیدا کیے گئے اپنے اختتام کے بعد روح سے جدا ہو جاتے ہیں جبکہ روح ابدی حیثیت کی حامل ہے۔ وہ عالمِ ارواح میں قیام پذیر ہوتی ہیں۔ جسم، روح کے لیے قید خانہ ہے۔ روح کی بہت سی غیر معمولی صلاحیتیں جسم کے قید خانے میں دب جاتی ہیں۔ جب جسم کو شکست ہوتی ہے، تبھی روح کو اس کا صحیح مقام ملتا ہے تب روح میں کئی قوتیں خود بخود جاگ اٹھتی ہیں جن میں ماورائی چیزوں کو سونگھنے کی حیرت انگیز قوتیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ روحیں دنیا سے بے نیاز ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کے آگے ایک اور وسیع تر عالم آ جاتا ہے جس کے سامنے یہ دنیا ایک حقیر ذرے جتنی ہوتی ہے، ہاں، اگر کوئی گہری جذباتی وابستگی ہو تو بات دیگر ہے، وہ بار بار ادھر کا رخ کرتی ہیں۔ روحیں اپنی پہچان کے لیے شکل وصورت بھی رکھتی ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ وہ سابق جسموں جیسا ہو۔ اگر کوئی اپنے علم کے زور پر طلب کرے تو وہ اپنی شناخت کے لیے پرانی یا نئی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ اجسام کی دنیا سے الگ ہو کر بھی اپنی زندگی کا گہرا اثر بھول نہیں پاتیں اسی لیے نیک وبد دونوں قسم کی روحیں عالمِ ارواح میں موجود ہیں۔ روحیں جسم کی دنیا میں آنا بالکل پسند نہیں کرتیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبِ ارواح کا علم سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اس اعتبار سے تمہیں افضلیت حاصل ہے اور یہ مقام صرف اور صرف بابا مخدوم شاہؒ کی وجہ سے تمہیں ملا ہے۔'' ہیولے نے پوری تقریر کر دی۔

اس تقریر کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ارواح کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

''اچھا، یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کس طرح کرو گی؟''

''اپنی حدِ پرواز میں رہ کر میں تمہاری مدد کروں گی۔ دشمن سے تحفظ، واقعات کی قبل از وقت آگاہی اور دیگر چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے روپوں کا انتظام کر سکتی ہوں مگر یہ تمام خدمت کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔''

''یہ لو، میری ضرورت پوری کرنے کے لیے رقم تم فراہم کرو گی اور رقم فراہم کرنے کی قیمت بھی مانگ رہی ہو؟''

''جسم اور روح دونوں محتاج ہیں۔ جسم کی احتیاج مادی شے ہے جبکہ روح کی روحانی! تم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت سنی ہو گی۔ آپؓ فرماتے ہیں۔ میں نے رسولِ اکرمؐ سے سنا ہے۔ ایک باپ پر یہ فرض ہے کہ اپنے بچے کا نام اچھے معنوں والا رکھے۔ اچھے اخلاق کا حامل بنائے اور قرآنِ پاک کی تعلیم دے۔'' بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم اس لیے بھی دینا چاہیے کہ مردہ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر بچہ قرآنِ پاک پڑھتا ہوگا، نماز کی ادائیگی کرتا ہوگا تو اپنے ماں باپ، خاندان کے دیگر بزرگوں کو ثواب پہنچاتا رہے گا۔ روح کے لیے سب سے بڑا تحفہ یہی ہے۔ اس طرح

روح کے گناہ دھلتے ہیں اور جب گناہ دھل جاتے ہیں تو درجات کی بلندی عطا ہونے لگتی۔ تم ہر خدمت کا معاوضہ ایک سورۃ فاتحہ کی شکل میں دو گی۔ دو گی ناں؟''

''بالکل! اب تو میں پابندی سے تلاوت بھی کر رہی ہوں۔ پورے ایک قرآن پاک کی تلاوت کا ثواب بخش دوں گی۔''

''ایک قرآن پاک کے بدلے بعض روحیں ہفتِ اقلیم کی دولت بھی دینے پر تیار ہو جائیں گی۔ جب انسان کے پاس کوئی نعمت ہوتی ہے تو وہ اس کی قیمت نہیں جانتا مگر جب وہ نعمت اس سے چھن جاتی ہے تب اسے اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کا مول کسی روح سے پوچھو۔ اگر تم نے مجھے صرف ایک بار قرآن پاک کی تلاوت کا ثواب بخش دیا تو سمجھو، میں تمہاری کنیز بن گئی۔''

''میرا وعدہ ہے، ضرور بخش دوں گی۔ اب یہ بتاؤ، میرے دشمن سے کیسے نمٹو گی؟''

''تم للکار کر دکھاؤ۔ جسے للکارو گی، اس کا انجام بھی دیکھ لینا۔''

''ایسا کرو کہ مجھے سونالی کو دکھاؤ۔ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟''

''تم ایسا کرو کہ تمہارے پاس جو کتاب ہے، اس کے دوسرے باب کی پہلی دُعا ''یا سریع الرضا'' کا عمل کرو۔ اس جلالی وظیفے کو پڑھو پھر دیکھو، کیا ہوتا ہے۔''

میں کتاب کھول کر اس سریع الاثر دُعا کو پڑھنے لگی۔ تبھی اچانک ہی میری آنکھوں کے درمیان کی رکاوٹ دور ہوتی چلی گئی اور مجھے ایک نوجوان لڑکی نظر آنے لگی۔ وہ ایک تنگ و تاریک کمرا تھا۔ انتہائی غلیظ کمرا۔ اس کمرے میں وہ بڑی بے بسی کی حالت سے دوچار پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ بند دروازے کے باہر پہرے پر مکروہ صورت اور بدہیئت افراد موجود تھے۔ یقیناً وہ مکروہ اور گندے بیر تھے جنہیں تعینات کیا گیا تھا۔ سونالی کو اس بے چارگی کے عالم میں دیکھ کر میرا جی ہولنے لگا۔ مجھ پر وحشت سی طاری ہونے لگی۔ میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر اس کی نگاہیں بند دروازے سے ہٹی نہیں۔ وہ ایک ٹک ادھر ہی دیکھتی رہی۔ شاید اسے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی اسے بچانے ضرور آئے گا۔

میں اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھی تھی کہ فرحت نے میرا بازو تھام لیا۔ میں نے غصے سے مڑ کر اُسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بکھری ملکوتی معصومیت دیکھ کر میرا غصہ کافور ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''جلد بازی ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو شیطانی جال میں پھنس جاؤ گی۔''

میں سنبھل گئی مگر بولے بغیر نہ رہ سکی۔ ''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس معصوم لڑکی کو ہر قیمت پر بچاؤں گی۔ کوئی بھی شیطانی جال، ناپاک روحیں، میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔''

''جنگ جوش سے نہیں، ہوش سے جیتی جاتی ہے۔ طاقت کی بجائے عقل و دانش کا استعمال کرو۔ جو باتیں بین السطور ہیں، انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی واپس چلی جاؤ۔ روحانی سفر میں خطرات زیادہ ہیں۔ اگر شیطانی قوتوں کی نظر پڑ گئی تو وہ تمہاری روح کو قید کر سکتی ہیں۔ یہاں آنا ہو

تو جسمانی حالت میں آنا کیوں کہ اس پورے علاقے میں بدروحیں پھلی ہوئی ہیں۔''

مشورہ معقول تھا۔ میں لوٹ آئی۔ آنکھیں کھولیں تو اسی جگہ بیٹھی تھی جہاں بیٹھ کر وظیفہ کر رہی تھی۔ وہی جھاڑیاں، وہی تالاب کا کنارہ، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ صرف منظر میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی تھی۔ چاند کچھ اوپر آ گیا تھا۔ میں نے تمام چیزیں سنبھالیں اور کھڑی ہوگئی۔ میرے اندر اب نئی تبدیلی آگئی تھی۔ اب میں پہلے کی نسبت زیادہ قوی بن چکی تھی۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے حوصلہ ہی نہیں، ایک نئی قوت بھی آگئی تھی۔ اب میں وہ پہلے ایسی کمزور لڑکی نہ تھی۔ چھوٹی موٹی عاملہ بن چکی تھی۔ ارواح کو بلانے پر قادر ہو چکی تھی اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں نے اس کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلنے لگی۔

اس وقت میں نے محسوس کیا تھا کہ میری چال میں ایک وقار ایک تمکنت آگئی ہے لیکن اس وقار میں بُردباری کا احساس بھی تھا۔ میں دنیا کو حقیر اور خود کو اعلیٰ سمجھنے لگی تھی مگر اس میں غرور نہیں تھا بس ویسا ہی احساس تھا جیسے کسی بڑے کو بچے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بڑے پن کا احساس ہوتا ہے۔

میں نے ایک نظر اطراف پر ڈالی۔ پہلے اندھیرے سے، ویرانے سے اتنا زیادہ خوف تو آتا نہیں تھا مگر ایک عجیب سا احساس ضرور ہوتا تھا۔ اب وہ احساس بھی ختم ہو گیا تھا۔ میں بہت زیادہ بے خوف ہو چکی تھی اور کسی بہادر سورما کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔ کسی ایسے سورما کی طرح جسے جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد تمغہ دینے کے لیے بلایا جائے اور وہ شان سے سر اٹھائے آگے بڑھتا ہے۔ میں اسی طرح آگے بڑھ رہی تھی اور گھر سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ فاصلہ بھی ختم ہو گیا اور میں گھر کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

برآمدہ پار کر کے اندر آئی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اس وقت بھی میرے ہاتھ میں کتاب تھی۔ کچھ دیر بعد لالٹین کی روشنی کو تیز کر کے میں نے اس کتاب کا بھرپور انداز میں مطالعہ شروع کر دیا۔ جیسے جیسے میں کتاب پڑھتی جا رہی تھی، میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرے ابو کتنے قابل تھے۔ کتنا کچھ جانتے تھے۔ مجھے اس بات کا احساس بھی ہو چکا تھا کہ میرے ابا کی موت میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ اگر میں ابو کو اس دن سونے کا ''کڑا'' نہ دیتی اور ان کے دل میں بھی لالچ نہ آتا اور وہ نجس پیسوں کو ہاتھ نہ لگاتے تو یقیناً ان کی بے وقت کی موت کا دکھ مجھے نہ جھیلنا پڑتا۔ بس ایک لمحے میں ان کی زندگی بھر کی محنت غارت ہو گئی تھی۔

ابو کی یاد آئی تو اپنا ٹوٹا بکھرا گھر یاد آ گیا اور میری آنکھیں بھر آئیں!

کافی دیر تک میں بغیر آواز کے روتی رہی۔ دل پر چھایا غم آنسوؤں میں ڈھل گیا تو میں لیٹ گئی اور ذہنی رخ کو تبدیل کرنے کے لیے اپنے دشمنوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہی راہ آسان تھی کہ اپنے اندر غصے کی لہر پیدا کر لوں کیونکہ کوئی سا بھی جذبہ ہو، اگر غصے کا طوفان اُمڈ آئے تو وہ دوسرے تمام جذبوں کو اڑا دیتا ہے اور دشمنوں کا خیال ہی غصے کو مہمیز کرتا ہے۔ میں بھی دشمنوں سے نمٹنے کا طریقہ سوچنے لگی۔ ڈھا کالوٹنے پر غور کرنے لگی۔ جن لوگوں کی وجہ سے میرا ہنستا بستا گھر ملبے کا ڈھیر بنا ہے، میری خوشیاں راکھ ہوئی ہیں، ان سے حساب چکتا کروں۔ گھر کے ملبے پر پہنچ کر اس کٹورے کو تلاش کروں جس میں پہلی بار سانپ کی شکل میں وہ یوگی نظر آیا تھا جس کی نئی زندگی کے لیے میں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگایا تھا۔

اس ازلی دشمن کو وہیں تلاش کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے گھر کے نیچے ایسا کچھ ضرور تھا جس کا سرا یوگی سے ملتا تھا۔ اس نے بھی تو یہی کہا تھا کہ وہ

آرام سے سو رہا تھا کہ ابا کے کسی عمل نے اس کی نیند میں خلل ڈال دیا اور وہ بیدار ہو گیا۔

بیدار ہوتے ہی اس نے زندگی کی خوب صورتی کو قریب سے دیکھ لیا اور جی اٹھنے کے لیے پاگل ہوا تھا۔ ایسے وقت میں اس سب سے آسان شکار میں نظر آئی اور وہ میری زندگی میں زہر گھولتا چلا گیا۔

اتنی تباہی و بربادی کے بعد ہی سہی، مگر مجھے ہوش تو آ گیا تھا پھر میں اس مقام تک پہنچ چکی تھی کہ اس سے حساب چکتا کر سکوں۔ اس سے ٹکرا سکوں۔ پھر شنکر کو بھی سبق سکھانا تھا کیونکہ اس نے بھی مجھے کمزور سمجھ کر ستایا تھا۔ میرے پیچھے پولیس کو لگایا تھا۔ ان سب سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے یہاں کا کام ختم کرنا ضروری تھا۔ فقیر بابا نے شاید امتحاناً مجھے اس گھر میں بھیجا تھا۔ ان کے آنے سے پہلے مجھے سونالی کو قید سے چھڑا لینا تھا۔ اسے یہاں سیٹ کر دینا تھا، اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو مگر یہ معرکہ کیسے سر ہوگا؟ ابھی میں اسی سوچ میں تھی کہ برابر والے کمرے سے آتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یہاں پر میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ بنگال میں پختہ گھر خال خال تھے۔ زیادہ تر بانس کی چٹائیوں سے بنے گھر ہوا کرتے تھے۔ بانس کی ان مضبوط چٹائیوں کو ''بیڑا'' کہا جاتا تھا۔ جن کے پاس پیسے ہوتے تھے، وہ بیڑے کی بجائے ٹین کی چادروں سے گھر بناتے تھے۔ موٹی موٹی شیشم کی شہتیروں پر کھڑے وہ گھر دو منزلہ بھی ہوتے تھے۔ گو کہ دوسری منزل پر ہلکے سامان رکھے جاتے تھے اور دو چار آدمیوں سے زیادہ کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔ گھر ٹین کا ہو یا بیڑے کا، دونوں کی دیواریں آوازوں کا راستہ روک نہ پاتی تھیں۔ برابر کے کمرے میں ہو رہی گفتگو بہ آسانی سنی جاتی تھی۔

میں بھی برابر والے کمرے میں ہو رہی باتیں صاف سن رہی تھی۔ چاچی کہہ رہی تھیں۔ ''میں تو کہتی ہوں، جو کرنا ہے، آج کر دو ورنہ یہ سب کے لیے دردِ سر بنی رہے گی۔ گھر کو تباہ کر دے گی۔''

''مگر چاچی! سونالی جب سے آئی ہے، کسی کے کام میں دخل تک نہیں دیتی۔ ہمیں نقصان ہی کیا ہے؟''

یہ آواز سونالی کی چچازاد بھابی نجمہ کی تھی۔

جوائنٹ فیملی ہونے کی وجہ سے سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ایک گھر میں رہنے کی وجہ سے رنجشیں و بے زاری بھی ظاہر ہوتی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ دونوں سونالی سے خار کھاتی ہیں۔

''ارے، تُو بہت بھولی ہے۔ کم بخت کبھی اس کی آنکھوں میں بھی دیکھ۔ کیسی چمکدار آنکھیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ''کیوٹا'' کو برا سانپ کی ہوں۔ ضرور یہ کوئی خاص عمل کر کے آئی ہے اسی لیے اس کی آنکھوں میں سمندر کی لہروں جیسی بے چینی لہراتی رہتی ہے۔ اس حالت میں اس کا ہمارے درمیان رہنا بہت خطرناک ہے۔''

''اگر کچھ سیکھ کر آئی ہے تو کیا ہوا؟''

''اری بیوقوف! وہ پہلے ہی آفت کی پرکالا تھی۔ کبھی کسی کی عزت کرتی تھی۔ ہر ایک پر تنقید کرنا حق سمجھتی تھی۔ اب جادو سیکھ کر تو اور بھی خطرناک ہو گئی ہے۔ پتا نہیں، کب کیا کر بیٹھے۔''

''کیا کر لے گی؟''

’’ایک تو وہ پہلے ہی کریلا تھی، اب نیم چڑھ آئی ہے۔ گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اس کے ٹونے ٹوٹکے کی زد میں وہ بھی آ سکتے ہیں۔‘‘

’’ارے، کچھ نہیں ہوتا چاچی! اوجھا، تانترک، تعویذ گنڈے کرنے والے گلی گلی میں پائے جاتے ہیں۔ جب وہ کچھ نہیں کر سکتے تو یہ کیا کر لے گی۔‘‘

’’جاہل کہیں کی! تُو کبھی نہیں سمجھے گی۔ ارے، تُو بھول گئی۔ تیری شادی میں سب سے زیادہ اسی نے تو اڑچن لگائی تھی۔ وہ تو میرا جگر تھا کہ میں سب کے سامنے ڈٹ گئی تھی اور تجھے اس گھر میں لا کر ہی چھوڑا صرف اس لیے کہ تُو میری مددگار بنے گی۔‘‘

’’اے لو چاچی! یہ بھی بھولنے والی بات ہے۔ میں تیرے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں۔ اگر تُو نہ ہوتی تو مجھے انور کبھی نہ ملتے۔ سونالی اپنی سہیلی سے ان کی شادی کرا دیتی۔‘‘

’’قربان جاؤں میری لاڈلی! بس تو ہوشیار رہ اور میں جیسے جیسے کہوں، کرتی جا۔ سونالی کو اس گھر سے نکالنے کے لیے کمر کس لے۔ اور سن، بتول سے بھی ہوشیار رہیو۔ وہ بھی زہر کی پڑیا ہے۔ دونوں میں خوب چھن رہی ہے۔‘‘

’’بس چاچی! تم دیکھتی رہو۔ میں نے پھر سے ان دونوں میں زبردست لڑائی نہ کرا دی تو میرا نام نجمہ نہیں۔ بڑی بہن بہن کر رہی ہے ناں، پہلے کی طرح جوتیوں میں وال نہ بٹوائی تو کہنا!‘‘

’’بس بیٹی! تُو آج ہی سے کوشش میں لگ جا۔ انور جب سونے آئے تو اسے بھی خوب چڑھا دینا۔‘‘

’’ٹھیک ہے چاچی!‘‘ نجمہ نے کہا۔

’’میرے سینے میں تب ٹھنڈ پڑے گی۔ جب وہ اس گھر سے دور ہوگی۔ اس دن پتا نہیں، کون سا منتر پڑھ رہی تھی کہ کتنی ہی دیر تک میری کمر پر لاٹھی برستی رہی تھی۔ ابھی تک درد باقی ہے۔ اس بے عزتی کا بدلہ لینا ہی ہوگا ورنہ مر کے بھی مجھے چین نہ ملے گا۔‘‘

چاچی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا اور میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

’’بس چاچی! تُو دیکھتی رہ۔ میں تیرا بدلہ کیسے لیتی ہوں۔ اسے اس کے بھائی دھکے دے کر یہاں سے نکالیں گے۔‘‘

’’ہاں، دیر نہ کر۔‘‘

’’چاچی! اگر تُو کہے تو میں بتول کے چکر کی بات پھیلا دوں؟‘‘

’’آں! اس کا کوئی چکر ہے کیا؟‘‘

’’بس اتفاقیہ مجھے معلوم ہوگیا۔ اپنے نور چاچا ہیں ناں، ان کے بڑے بیٹے ناصر سے لیلیٰ مجنوں کا کھیل چل رہا ہے۔ اس کا نام لے کر میں ایسا تماشا کھڑا کر دوں گی کہ دونوں بہنیں الجھ کر رہ جائیں گی۔ ہر طرف تھو تھو ہوگی۔ دادا کے کہنے پر یہ بات پھیلائی گئی ہے ناں کہ سونالی ڈھاکا میں تھی۔ میں وہ بات بھی کھول دوں گی۔ بس تُو دیکھتی رہیو۔‘‘

’’میری دُعا ہے، تو کامیاب رہے!‘‘ بڑی بی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’میں تیرے ساتھ ہوں۔ تُو پہل کر، کوئی ڈراما رچا، پھر میرا کام دیکھ۔‘‘

اب مجھے پتول کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ بڑی معصوم سی لڑکی تھی۔ اگر کسی کو چاہتی ہے تو برا کیا ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کو چاہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چاہے جانے کی نوعیت کیا ہے۔ دائرے میں رہ کر چاہے جانے ہی سے عورت کی اہمیت کا احساس بڑھتا ہے۔ اگر یہ محبت پاک و پاکیزہ ہے تو میں اس کے لیے زمین ہموار کروں گی۔ یہ سوچ کر میں پھر سے ہمہ تن گوش ہو کر اپنی پوری توجہ ان کی گفتگو پر لگا دی لیکن اب وہاں خاموشی تھی۔ کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔

شاید دونوں یا پھر دو میں سے ایک اس کمرے سے چلی گئی تھی۔ میں بھی کمرے سے نکل آئی۔ آنگن میں پہنچی تو جی خوش ہو گیا۔ پورا آنگن چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ میں ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھی تھی کہ پتول کے کمرے پر نظر ٹھہر گئی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر روشنی تو تھی مگر بہت ہلکی۔ شاید لالٹین کی لو دھیمی کر دی گئی تھی۔ اتنی ہلکی روشنی کا مطلب تھا، وہ سو رہی ہے۔ جو سویا، سو کھویا! کہیں وہ جیتی بازی کھو نہ دے۔ اسے ہوشیار کرنا ضروری تھا۔ میں نے سوچا ’ایک نظر دیکھ لوں۔ اگر جاگتی ہوگی تو اسے بتا دوں گی۔‘ یہ سوچ کر میں آگے بڑھی۔

اس کے دروازے پر پہنچی اور پلڑے کو دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہو گئی۔

اندر پہنچتے ہی میں ٹھٹک گئی۔ ٹھٹکنے کی وجہ خالی بستر تھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ رات کے اندھیرے میں ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔ ایسے وقت میں لوگ گھروں میں دبکے رہتے ہیں اور وہ گھر سے باہر تھی۔ کہاں ہوگی؟ میں یہ سوچتی ہوئی عقبی دروازے کی طرف بڑھی تبھی وہ دروازہ نہایت آہستگی سے کھل گیا اور پتول اندر داخل ہوئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ رک گئی۔ میں نے اتنی دور سے بھی دیکھ لیا کہ وہ بوکھلا گئی ہے۔ اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میرے کمرے میں آؤ!“

وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح سر جھکائے میرے کمرے میں آ گئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میں نے برابر والے کمرے پر نظر ڈالی۔ اس کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ جب میں ان کی باتیں سن سکتی ہوں تو وہ بھی میری باتیں سنیں گی۔ یہ سوچ کر میں نے پتول کو آواز دی اور دیکھی گھاٹ کی طرف مڑ گئی۔ بنگال کے گاؤں کیا، چھوٹے شہروں میں بھی امارت کا اظہار گھر کا تالاب ہوتا ہے۔ ہر گھر کے پیچھے بڑا سا تالاب ضرور بنوایا جاتا ہے تاکہ نہانے دھونے میں آسانی رہے۔ اس گھر کے ساتھ تالاب کی جگہ دیکھی تھی یعنی اتنا بڑا تالاب جو جھیل کی طرح دور تک پھیلا ہوا ہو۔ تالاب میں اترنے کے لیے سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ گرم راتوں میں ان سیڑھیوں پر سویا بھی جاتا ہے ورنہ آدھی آدھی رات تک لوگ وہاں بیٹھ کر گپیں لگاتے ہیں۔

میں پتول کو لے کر وہیں جا بیٹھی پھر میں نے سلسلہ کلام شروع کرنے کے لیے پوچھا۔ ”تم کہاں سے آ رہی ہو؟“

وہ چور بنی بیٹھی تھی۔ اس نے جھکے سر کو اٹھائے بغیر کہا۔ ”بس یوں ہی ٹہلنے چلی گئی تھی۔“

”جھوٹ مت بولو۔ تم ناصر سے ملنے گئی تھیں۔“

میری بات پر وہ اچھل پڑی۔ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ ”آپ سے کس نے کہا؟“

”تم نے پڑھنے کے نام پر ناولوں، کہانیوں کا انبار جمع کر رکھا ہے۔ بنکم چٹوپادھیے یا شرت چندر چیٹرجی کی ناولیں ہوں، سراج الاسلام کی

کہانیاں ہوں، قاضی نذرالاسلام یا رابندر ناتھ ٹیگور کی نظمیں ہوں، سب کا محور محبت ہے۔ جب محبت کے بارے میں اتنا پڑھو گی تو ذہن پر اثر ہوگا ہی۔ یہی اثر کسی کو چاہنے پر مجبور کرے گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تو آپ سب کچھ جان گئی ہیں۔''

''بالکل جان گئی ہوں۔ یہ سینما اور ناولیں کس طرح کچے ذہن پر اثر کر رہی ہیں، اچھی طرح جان گئی ہوں۔''

''آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ شاید یہ انہی ناولوں کا اثر ہے کہ میرے دل میں آرزو مچلنے لگی تھی کہ کوئی میرے جذبوں کو سمجھے، مجھے چاہے۔ میں کسی کی جوگن کہلاؤں۔ کسی کے عشق میں نکھروں، بنوں سنوروں۔ میں بھی کسی کو انتظار دوں تو وہ سراپا انتظار بن کر مشتاقِ دید کی تصویر بن جائے، اور جب قریب رہوں تو بہاریں بھی قریب ہو جائیں۔''

میں اس کی شاعرانہ باتیں سن کر حیران ہو گئی۔

کتابیں پڑھ پڑھ کر وہ تو پنڈت بن چکی تھی۔ پوری علامہ دہر۔ اس کی بات پر میں صرف سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ بولتی رہی۔ ''میرے کھوجی من نے، سیاح نظروں نے، بہت سے ساحلوں کی سیر کی تن کے تالاب نہ سہی، من کے بے شمار سمندر ناپے تب کہیں جا کر ناصر کی قربت ملی ورنہ میں تو سنجیدہ اور کچھ ریزروسی لڑکی تھی جسے نذرل گیت، گلاب کے پھول اور بانسری کی اداس دُھنیں پسند تھیں۔ ٹھہری ہوئی زندگی، سکون، تھوڑی سی سہیلیاں، تھوڑی سی سیر کی شائق تھی لیکن نہ جانے کیسے ناصر بانسری سناتے سناتے میرے دل میں اتر گیا۔''

''تم نے محبت کی، محبت کرنا بری بات نہیں ہے۔ محبت تو خدا کے بھی قریب کر دیتی ہے بہ شرط دل صاف ہو۔ پاکیزگی ہو۔ یاد رکھنا، زندگی کے قمار خانے میں وقت اپنی بازیاں چلتا ہے۔ انسان آنے والے لمحوں کو خوشگوار بنانے کے لیے موجودہ لمحے داؤ پر لگا دیتا ہے مگر اس گیمبلنگ میں محبت بہت کم ہوتی ہے۔ محبت کے جو لمحے میسر ہوں، وہی بہت ہیں اس لیے محبت کی قدر کرو۔ ناصر سے ملنے کی بجائے قانونی طور پر اس کی ہو جاؤ۔''

''میں...... میں یہی چاہتی ہوں۔''

''اور ناصر؟''

''وہ بھی یہی چاہتے ہیں۔''

''تو پھر دیر کیسی۔ میں کل ہی انورا مامی سے بات کرتی ہوں۔'' پھر کچھ ٹھہر کر بولی۔ ''چلو زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔''

کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ٹہلنے کے انداز میں چلتے ہوئے آنگن میں آئے پھر میں نے کہا۔ ''یاد رکھنا پتول! سچائی، لگن، حوصلہ اور محبت جہاں یکجا ہوتے ہیں، وہاں کامرانیوں کے سورج طلوع ہونے لگتے ہیں اور وفا کی مدھم بھینی بھینی خوشبو کرنوں کی سنگت میں ہر گھر، ہر نگر، اپنی شناخت کروانے پہنچ جاتی ہے کہ، سنو دیکھو، میں محبت ہوں، میں لگن ہوں، میں وقت ہوں، میں سچائی ہوں، میں خلوص ہوں، میں حسن ہوں۔ اس لیے محبت کی قدر کرنا۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ جلد سے جلد تمہیں ناصر کی بنوا دوں۔''

''آپ جو کہیں گی، میں کروں گی۔''

میں اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے خود کو بستر پر گرا دیا اور سوچنے لگی کہ انور اور امی سے میں کیسے بات کروں، کس طرح انہیں تیار کروں۔ پہلے ہر روز میرے پاس نوٹوں کا ایک بنڈل آ جاتا تھا مگر اب وہ سلسلہ رہا نہیں ورنہ میں دولت کی چمک دمک دکھا کر ان لوگوں کی آنکھیں خیرہ کر دیتی۔ جب سے اس پُر اسرار ہستی سے رابطہ منقطع ہوا تھا، تبھی سے نوٹوں کی آمد کا سلسلہ بند ہوا تھا۔ یہ سلسلہ پھر سے کیسے شروع ہو، میں اس پر غور کرنے لگی تبھی میرے ذہن میں روح کی بلانے کا خیال آیا اور میں اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی وضو کیا اور مُصلّہ بچھا کر بیٹھ گئی۔ دو رکعت ''نماز! استغاثہ'' پڑھی اور اس کا ثواب تمام ارواح صالحین کو بخش دیا پھر وہ مخصوص دعائیں جو طلب ارواح کی ہیں، پڑھنے لگی۔

وِرد اپنے عروج پر تھا۔ میں رک رک کر اُسی دوشیزہ کو آواز دے رہی تھی۔

فرحت ایک پاک روح تھی۔ بقول اس کے، زندگی میں جس کا کردار جیسا ہوتا ہے، مرنے کے بعد بھی وہ کردار باقی رہتا ہے۔ اس کی روح بھی اُسی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ اس لڑکی کی روح اچھی تھی اس لیے مشورے بھی اچھے دے سکتی تھی اسی لیے میں اسے طلب کر رہی تھی کہ وہ آ کر مجھے اس مسئلے کا حل بتائے۔

میری تھوڑی سی کوشش رنگ لائی اور وہ حاضر ہو گئی۔ یوں لگا جیسے دھوئیں کا ایک مرغولہ سا کھڑکی سے داخل ہوا تھا اور کمرے میں گردش کرتے کرتے سفید ہیولے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہیولا مکمل ہوا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ اُسی لڑکی کی روح ہے۔ میں نے سلام کیا۔ وہ جواب سلام دے کر مؤدب انداز میں کھڑی ہو گئی۔

''فرحت! جانتی ہو، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟'' میں نے رسان سے پوچھا۔

''اپنی مدد کے لیے اور اس وقت تمہیں بتول کی فکر کھائے جا رہی ہے۔'' فرحت نے جواب دیا۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''بتول کی مدد!''

''چلو، اچھا ہوا، تم نے میری تائید کر دی۔ میں خود بھی یہی کرنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے تمہاری مدد درکار ہے۔''

''بولو، مجھے کیا کرنا ہے؟'' فرحت کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''مجھے اتنی رقم لا دو کہ میں ہر ایک کا منہ بند کر دوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ناممکن، یہ میں نہیں کر سکتی۔'' افسوس بھرے لہجے میں وہ بولی۔

''کیا؟'' میں گویا حیرت سے اچھل پڑی تھی۔ روح تو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔''

''یہ کس نے کہا؟ روح سے زیادہ کوئی مجبور نہیں ہوتا۔ چالاک لوگوں نے معصوم فطرتوں کو ٹھگنے کے لیے ایسی کہانیاں گھڑی ہیں کہ روح جو چاہے، کر دے۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ روح کسی ٹھوس چیز کو اٹھا نہیں سکتی۔ کسی کو دھکا دے کر گرا نہیں سکتی۔ اگر گرانا ہو گا تو وہ یہ کر سکتی ہے کہ کسی ایسی چیز کو جو ہوا کے دھکے سے گر سکتی ہے، گرائے گی جس کی وجہ سے روح کا شکار پھسل کر گرے گا یعنی وہ نظر نہ آ کر ایسے اُمور انجام دے دے گی کہ مطلوب

حاصل ہو جائے۔ میں رقم لا نہیں سکتی مگر ایسا انتظام کر سکتی ہوں کہ تمہیں رقم مل جائے مثلاً ریس میں کون سا گھوڑا جیتے گا، پرائز بانڈ کا نمبر کون سا نکلے گا، یا کس کام میں منافع زیادہ ہوگا، یہ بتا سکتی ہوں۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ، میں کیسے بتول کو اُس کا پیار دلاؤں؟"

"بہت آسان ہے۔ میں ناصر کی ماں کے کھانے میں چھپکلی گرا دوں گی۔ وہ کھانا کھاتے ہی بیمار ہو جائے گی۔ تم جانا اور اُسے ڈھیر سارا گھی پلا دینا۔ چھپکلی کے زہر کا اثر زائل ہو جائے گا اور وہ لوگ تمہارے مشکور رہیں گے۔ بس تم بدلے میں ناصر کو مانگ لینا۔"

"ہاں، یہ صحیح ہے۔" میں نے اس کے مشورے کی تائید کر دی۔

"اچھا، تو میں چلی! تم کل شام میں ناصر کے ہاں چلی جانا۔ کوشش کرنا کہ کھانے کے وقت تک وہیں رکو۔" کہہ کر فرحت پھر سے دھوئیں کے مرغولے میں تبدیل ہوگئی اور اسی طرح جیسے آئی تھی، کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی۔

اب کمرے میں، مَیں تھی اور سوچوں کی یلغار تھی۔ میں اس مرحلے کو بخوبی انجام دینے پر غور کرنے لگی۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھوں میں نیند کی دیوی چپکے سے اتر آئی اور پلکوں کی چلمن کو گرا کر بیٹھ گئی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔

☆=======☆=======☆

صبح مرغ کی بانگ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔

باورچی خانے سے دھان کوٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ دھان کو ڈھیکی (اوکھل) میں ڈال کر کوٹ کر چاول نکالنا بنگال کے روزمرہ میں داخل تھا۔ گھر کی بیٹیاں اور بہویں سورج نکلنے سے پہلے ہی یہ کام سنبھال لیتی تھیں تاکہ ناشتے میں چاول کھائے جا سکیں۔

چاول کوٹنے کی آواز سن کر میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پتول بھی باورچی خانے میں ہوگی۔ میں سیدھے اُدھر ہی چل پڑی۔

عام طور پر باورچی خانے پندرہ بیس فٹ سے کم نہ ہوتے تھے۔ میں اس وسیع و عریض باورچی خانے میں پہنچی تو اندر کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے لالٹین جل رہی تھی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں تین عورتیں ہل ہل کر پیروں سے ڈھیکی چلا رہی تھیں۔ دھان کوٹ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک یاسمین تھی، دوسری پتول اور تیسری امجدی۔ مجھے دیکھتے ہی پتول نے جھٹ سے لٹکتی ڈوری جسے اس نے سہارے کے لیے پکڑ رکھا تھا، چھوڑ دی اور ڈھیکی کے موصل پر سے پیر ہٹا کر میری طرف بڑھی۔

"ارے آپا! آپ آج اتنے سویرے کیسے اٹھ گئیں؟"

"تجھ سے ایک کام تھا۔ ایسا کر، تُو میرے کمرے میں آ جا۔ کچھ باتیں کرنا ہیں۔" کہہ کر میں کمرے کی طرف لوٹ آئی۔

پتول ہاتھ پیر دھو کر آ گئی تھی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا پھر سرگوشی میں بولی۔ "دیکھ پتول! جب سے میں...... قید سے فرار ہوئی ہوں، میرے ذہن پر دُھند سی چھائی ہے۔ میں کسی کو بھی پہچان نہیں پا رہی ہوں۔ تُو ایسا کر، مجھے ناصر کے گھر والوں کے بارے میں پوری طرح سمجھا دے تاکہ باتیں کرنے میں آسانی رہے۔"

"کیا آپ اُن لوگوں کے ہاں جائیں گی؟"

"ہاں، آج دوپہر میں ہی اُن لوگوں سے ملنے جاؤں گی۔"

"ٹھہریئے! میں البم لے آتی ہوں۔ تصویروں میں انہیں دیکھ کر ذہن نشین کر لیں۔"

"خیال برا نہیں ہے۔" اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا۔ "اس طرح میں ایک ایک کو شکل سے پہچان لوں گی۔"

پتول ایک منٹ سے بھی قلیل وقفے میں البم لے آئی پھر اس میں سجی بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں دکھانے لگی۔ مختلف تقریبات کی تصویریں تھیں۔ اس بھیڑ میں وہ فرداً فرداً ایک ایک کو متعارف کراتی چلی گئی۔ میں نے سب کی شکلیں ذہن کے کینوس پر منتقل کر لیں پھر ناشتا کر کے میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ اس سارے وقت پتول مجھے بریف کرتی رہی۔ ایک ایک بات، ایک ایک کی عادت، یہاں تک کہ کس سے کون جلتا ہے، یہ تک بتاتی رہی۔ اس عرصے میں سورج کافی چڑھ آیا اور میں ناصر کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس کا گھر زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ محلے کے آخری سرے پر تھا۔ درمیان میں آٹھ دس تالاب اور مکان تھے۔

میں نے جلدی جلدی میک اَپ کیا۔ اُس دَور میں میک اَپ کے نام پر صرف فیس اور ٹالکم پاؤڈر، تبت سنو اور سرخ لپ اسٹک رائج تھیں یا پھر نیل پالش۔ میں نے تبت سنو لگا کر فیس پاؤڈر لگایا اور لپ اسٹک پھیری پھر باہر جانے کے لیے نکل پڑی۔ مجھے تیار ہوتا دیکھ نجمہ نے منہ بنا لیا۔

میں نے ہنس کر اُسے درگزر کیا کہ جلنے والے جلتے رہیں، میں تو اپنا کام کروں گی۔ پھر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ یہ چند فرلانگ کی دوری طے کر کے میں ناصر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ بیٹھک خانہ (اوطاق) میں بیٹھے لوگ مُڑ مُڑ کر دروازے سے باہر مجھے دیکھنے لگے۔

میں اُن کی چبھتی نظروں کو نظر انداز کرتی ہوئی برآمدے پر پہنچی پھر دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

گھر کی عورتیں مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ کوئی دھان اُبال رہی تھی، تو کوئی دھان سُکھا رہی تھی۔ میں نے زوردار آواز سے سلام کیا۔ میری آواز پر سب چونک گئیں اور اپنا اپنا کام چھوڑ کر میرے گرد جمع ہوگئیں۔

''اور بیٹی! کیسے ہماری یاد آگئی؟ تم نے تو ہمیں بھلا ہی دیا ہے۔'' ناصر کی ماں انورا مامی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دیتے ہوئے کہا۔

''آپا! یہاں آجائیں!'' ناصر کی چھوٹی بہن نے چارپائی پر چادر ڈال کر کہا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا:

''مامی! آپ نے بھی تو ہماری طرف آنا چھوڑ دیا ہے۔''

''بس بیٹی! یہ بڑھاپا بھی تو ایک مرض ہے، کچھ کرنے ہی نہیں دیتا۔ گھر سے باہر نکلو تو گھٹنے میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ گٹھیا کا درد بھی تو جان کو آ گیا ہے۔''

''آپا! آج کھانا ہمارے ساتھ کھائیں ناں! ہلسا پک رہی ہے۔'' ناصر کی بہن نے فرمائش کر کے میری مشکل آسان کر دی۔ یوں بھی بنگالیوں کی پسندیدہ مچھلی ہلسا (ہِلّہ) ہے اس لیے میں نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بھات (سادے چاول) کھایئے گا یا پلاؤ بنوا دوں؟'' اس نے پوچھا۔ بنگالیوں میں پلاؤ بنانے کا اپنا انداز ہے۔ جس طرح حلوے میں چینی کے ساتھ ہلکا سا نمک بھی ڈالتے ہیں، اُسی طرح پلاؤ میں صرف گھی اور دار چینی۔ اس کے علاوہ کوئی اور مسالہ نہیں ڈالتے۔ مجھے ایسا پلاؤ زہر لگتا تھا اس لیے ہنس کر بولی۔ ''نہیں، بھات چلے گا۔''

بنگالی دوپہر کا کھانا بارہ ساڑھے بارہ بجے تک کھا لیتے ہیں کیونکہ ناشتا اذان کے وقت کرتے ہیں اور رات کا کھانا مغرب کے فوراً بعد کھاتے ہیں، فجر کی نماز پڑھ کر ناشتا کرو، ظہر کی نماز سے پہلے اور مغرب کی نماز کے فوراً بعد کھانا کھا لینے سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے جبکہ وہیں بنگال میں اردو بولنے والے الٹ کرتے تھے۔ ناشتا صبح دس بجے، کھانا ڈیڑھ دو بجے اور رات کا کھانا نو دس بجے۔ اسی وجہ سے تو بنگالی کہتے تھے کہ بہاریوں سے ہماری کوئی چیز نہیں ملتی۔ میں بہاری ہو کر بھی اُن میں اس طرح گھل مل گئی تھی کہ اُن کی عادات واطوار بھی میرے اندر رچ بس چکی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں کھانا لگا دیا گیا۔ عین اُسی وقت چاچی کمرے میں آئیں۔ انہیں دیکھ کر مامی نے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ایک ہی دسترخوان پر ہم سب بیٹھے تھے۔ سب کے سامنے بڑے بڑے کٹورے تھے جن میں شوربے میں ڈوبی ہلسا مچھلی تھی۔ ابھی ہم نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ میری تیز نظروں نے بھانپ لیا کہ چھت سے کوئی چیز مامی کے پیالے میں گری ہے۔ میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں سمجھ چکی تھی کہ اوپر سے چھپکلی گری ہے اور یہ کام فرحت نے کیا ہے۔ اب میرے امتحان کی گھڑی آ چکی تھی۔ مجھے گھی کا انتظام کرنا ہے، یہ سوچتے ہوئے میں نے نوالہ اٹھایا تھا کہ مامی تیورا کر گری۔

''ہائے اللہ! یہ کیا ہوا؟'' چاچی چیخی تھیں۔

ناصر کی بہن دوڑ کر انہیں سہارا دینے لگی۔ وہ بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور ان کے منہ سے نیلا نیلا جھاگ نکل رہا تھا۔ چھپکلی کا زہر اثر کر رہا تھا۔ میں یہی کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ''انہیں اٹھا کر باہر آنگن میں لاؤ!''

''حلق میں کانٹا پھنس گیا ہوگا۔'' ناصر کی بڑی بھابی بولیں۔

''ارے نہیں، کانٹا پھنسنے سے نیلا جھاگ نہیں نکلتا۔ کچھ اور بات ہے! فوراً گھی لاؤ۔ انہیں پلانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

میری آواز سنتے ہی چاچی نے اپنے سینے پر دوہتھڑ مار کر کہا۔ ''ہائے رے کم بخت! تجھے موت آئے سونالی! تُو نے میری بہن کو زہر دے دیا، اسی لیے آج آئی تھی۔ ارے کم بخت! ناصر کا رشتہ نہیں ڈال رہی تھی تو کیا ہوا۔ کسی کی جان بھی تو نہیں لینا چاہیے۔''

چاچی کے بَین نے مجھے غصہ دلا دیا۔ یہ اپنی فطرت سے باز نہیں آ رہی تھیں۔ وہ چیخے جا رہی تھیں۔

''ہائے! اسی سونالی کی بچی نے کچھ کیا ہے۔ اسے چھوڑنا نہیں۔''

باہر سے مرد آ گئے تھے۔ ناصر نے جلدی سے مامی کے پیالے کو اُلٹ دیا لیکن یہ کیا، اس میں سے چھپکلی کی بجائے تیلیا سانپ کا بچہ مرا پڑا تھا۔ ڈیڑھ انچ کا یہ براؤن کلر کا سانپ کس قدر زہریلا ہوتا ہے، مجھے پتا تھا۔ مجھے فرحت پر غصہ آنے لگا کہ اُس نے چھپکلی کی بجائے سانپ کیوں ڈالا تبھی میری نظر منڈیر پر پڑی۔ وہاں فرحت بیٹھی تھی اور اشارے سے بتا رہی تھی کہ اُس نے سانپ نہیں گرایا ہے۔ اگر اُس نے نہیں گرایا تو پھر کس نے گرایا، میں سوچے جا رہی تھی اور چاچی میرے خلاف اُن لوگوں کو اُکسائے جا رہی تھی۔

فرحت کے اشارے پر میں حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ سانپ اس نے نہیں گرایا تو پھر کس نے گرایا ہے؟ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ کیوں کہ اگر انور امامی کو کچھ ہو جاتا ہے تو چاچی میرے چہرے پہ کالک مل دے گی۔ چاچی سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ انور امامی پر زہر نہ چڑھنے پائے۔ زہر کا تریاق کر لیا جائے مگر یہ کیسے ہو، اسی پر غور کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ فرحت سے مشورہ کر لوں۔ یہ سوچ کر میں فرحت کی طرف بڑھی۔

''اے!'' فرحت نے خود ہی قریب آ کر کہا۔ ''تم کچھ بولنا نہیں ورنہ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے کیونکہ نہ میں کسی کو نظر آ رہی ہوں اور نہ کسی کو میری آواز سنائی دے رہی ہے۔ اگر تم بولوگی تو انہیں صرف تمہاری آواز سنائی دے گی اس لیے صرف سنو اور عمل کرو!''

فرحت بولتے بولتے کچھ اور قریب آ گئی کیونکہ اس وقت وہ کمرا مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔ ہر کوئی چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ فرحت نے بالکل قریب آ کر کہا۔ ''اسے کم سے کم ایک پیالہ گھی پلا دو تاکہ معدہ بالکل صاف ہو جائے اور سر پر لگاتار پانی ڈالتی رہو تاکہ یہ سونہ پائے۔ گھی زہر کو حل ہونے نہیں دے گا۔ یہی تریاق ہے۔''

میں نے یہی بات وہاں کھڑے ناصر کو سمجھائی۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر میں نے انہیں نہانے کا حکم دیا۔ انور امامی کو اٹھا کر ٹیوب ویل کے نیچے لے آیا۔

''تم لوگ لگاتار ان کے سر پر پانی ڈالتے رہو۔ میں جڑی بوٹی لے کر آتی ہوں۔ سانپ کا زہر فوراً اُتر جائے گا۔'' کہہ کر میں ان کے گھر

سے نکل آئی۔ سونالی کے گھر پہنچ کر ابو والی کتاب میں سانپ کے متعلق دیکھنے لگی۔ ایک جگہ سانپ کا جھاڑ نظر آ گیا۔ میں نے اُن آیات کو ذہن نشین کر لیا اور اسی تیزی سے لوٹ آئی

مامی کے سر پر لگاتار پانی ڈالا جا رہا تھا۔ میں نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وہی آیات پڑھنا شروع کر دیں۔ فوراً ہی اثر ہوتا نظر آ گیا۔ مامی جو بار بار جھٹکے لے رہی تھیں، سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں، وہ شکایت دور ہو گئی پھر یکایک انہیں بڑی سی اُلٹی ہوئی۔ متلی بالکل براؤن تھی۔ میں نے پھر سے گھی پلانے کو کہا۔ دوبارہ مزید متلی ہوئی۔ آخری متلی بالکل صاف ہوئی تو میں نے کہا۔ ''اب انہیں بستر پر لٹا دیں۔ زہر اتر چکا ہے۔''

چاچی کا بَین ہنوز جاری تھا۔ وہ اس بات کی ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھیں مگر میں مطمئن تھی کیونکہ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کی بات پر کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ سب اُن کی فطرت سے واقف تھے۔

''اچھا، میں چلتی ہوں۔'' کہہ کر میں باہر نکل آئی۔ یوں بھی مامی کی حالت بہت حد تک سنبھل چکی تھی پھر مجھے چاچی پر بار بار غصہ آ رہا تھا کہ وہ خواہ مخواہ میری دشمن بنی ہوئی ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے اب کی بار ایسی سزا دوں گی کہ دنیا عبرت لے گی۔

گھر پہنچ کر میں نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ مجھے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ باہر سے شور ہوا۔ کئی آدمیوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ تبھی پتول اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ رنگت اڑی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت خوفزدہ ہے۔ اس نے پریشان لہجے میں بتایا۔ ''آپا! باہر بابل بہت سارے غنڈوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے ہمراہ ایک تانترک بھی ہے۔ آپ کو چیلنج دے رہا ہے۔''

میں سمجھ گئی کہ بابل مجھ سے بدلہ لینے آیا ہے۔ غنڈے موالی اپنی دھاک پر زندہ رہتے ہیں۔ ایک عورت کا طمانچہ مار دینا اس کی شہرت پر دھبہ تھا۔ ہوٹل والے سے یہ بات چاروں طرف پھیل گئی ہوگی۔ کمزور اپنا بدلہ زبان سے لیتا ہے۔ اس شہر میں اس کے ہاتھوں زِک اٹھانے والوں کی کمی نہ ہوگی۔ ایسے ہی لوگ دل کی بھڑاس مٹانے کے لیے اس رات کی بات کو خوب اُچھال رہے ہوں گے۔ کسی کی بزدلی کا قصہ اُچھلے تو اسے غصہ آتا ہی ہے۔ بابل کو بھی آ رہا ہوگا اسی لیے وہ بدلہ لینے آیا ہے۔ اُس رات دیکھ چکا تھا کہ میرے ایک گھونسے نے اسے زمین چٹا دی تھی اس لیے وہ اس بار تانترک کو لے کر آیا ہے۔ تانترک کتنا ہی تنتر منتر کیوں نہ جانتا ہو، وہ میرے مقابل ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ میرے پاس رحمانی علم ہے۔ اس یقین نے مجھے شیر بنا دیا تھا۔ میں نے پتول سے کہا۔ ''چلو، میں دیکھتی ہوں، وہ کتنے پانی میں ہے۔''

باہر آئی تو حیران رہ گئی۔ بابل گھر کے احاطے میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ تین آدمی تھے۔ دو تو صورت ہی سے اس کے چمچے نظر آ رہے تھے مگر تیسرا شخص عجیب سے حلیے میں تھا۔ لمبی سی چونچ والی داڑھی جس میں بال گنتی بھر تھے، اس لیے داڑھی عجیب سی لگ رہی تھی۔ سر کے بال شانوں سے بھی نیچے تک تھے جن میں جٹ پڑ گئے تھے۔ بدن پر کپڑوں کے نام پر صرف ایک سرخ لنگوٹ تھی۔ ناخن بھی کافی بڑھے ہوئے تھے گویا وہ سر تا پا کریہہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ آ گئی۔ بابل چیخا۔ ''یہی ہے وہ!''

''ہاں، میں پہچان گیا ہوں!'' اُس سادھو نے کہا۔

''کیوں آئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تجھے سزا دینے! کتے کی موت مارنے آیا ہوں!'' وہ دانت نکال کر بولا۔

سادھو کا جملہ سن کر میرے اندر غصے کی لہر دوڑ گئی۔ یقیناً چہرہ بھی غصے سے تمتما اٹھا ہوگا! میں جلال کی کیفیت میں بولی۔ ''تم حد سے بڑھ رہے ہو! میرا مشورہ ہے کہ اپنی زبان کو لگام دو!''

وہ تلملا کر بولا۔ ''کسی اور پر آنکھیں لال پیلی کرنا! میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں!''

''خبیث! تجھے دیوی دیوتاؤں کی شکتی پر گھمنڈ ہے، تو میں یہ تیرا گھمنڈ چُور چُور کردوں گی۔ ٹھیک ہے، تُو اپنی گندی قوتوں کو آزما لے۔ تیری آنکھوں کی پٹی بھی کھل جائے گی۔'' کہہ کر میں نے اُس سادھو کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے بری طرح گھور رہا تھا۔ جیسے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے نگل جائے گا۔ میں دل ہی دل میں فرحت کو بلانے والے الفاظ کا ورد کرنے لگی۔ وہی ایک ایسی ہستی تھی جو اس وقت میرے کام آسکتی تھی۔ میں برآمدے پہ کھڑی تھی۔ میرے برابر میں پتول اور دوسری عورتیں کھڑی تھیں جبکہ برآمدے کے نیچے بابل اور اس کے ساتھی کھڑے تھے جو یقیناً تماش بین تھے۔ میں نے اُن پر سے نظریں ہٹا کر سادھو کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ ہونٹ بھی ہل رہے تھے لیکن آواز غائب تھی۔ فوراً ہی اسے احساس ہوگیا کہ وہ آواز سے محروم ہوچکا ہے تو وہ بری طرح گھبرا گیا اور اس کی آنکھوں میں غصے کی بجائے اُلجھن کے تاثرات تیرنے لگے۔ وہ تلملا کر جھکا اور چٹکی بھر مٹی اٹھا کر کچھ پڑھنے لگا پھر اُس نے وہ مٹی میری طرف اُچھال دی۔ مٹی ہوا کو کاٹتی ہوئی میری طرف بڑھی اور اُس سادھو کی طرح میں بھی حیرت زدہ رہ گئی کیونکہ وہ مٹی سرخ سرخ گلابوں کے گلدستے میں تبدیل ہو کر میرے قدموں میں آگری۔ اتنے لوگ کھڑے تھے، اس کے باوجود وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہر شخص سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔

سادھو کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ میں اُسے طنزیہ نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ گلاب کے پھول میرے قدموں میں پڑے تھے۔ میں نے سادھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''پریشان نہ ہو، ابھی اور بھی تنتر منتر یاد ہوں گے۔ بہت کچھ سیکھا ہے ناں، آزما کر دیکھ لو۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کوئی اور حربہ آزما لو!''

سادھو بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا اور پھر بند کر لیتا۔ اس کی بے بسی دیدنی تھی۔

''غصہ انسان کو پاگل بنا دیتا ہے!'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''اور پاگل شخص کا کوئی بھروسا نہیں کہ کیا بک جائے، اسی لیے میں نے تمہاری قوتِ گویائی سلب کرلی ہے۔''

سادھو بے چارگی کے عالم میں اچھل رہا تھا۔ میں نے نرمی سے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''جلد بازی کا کام اُلٹا ہوتا ہے۔ ہر کام سوچ سمجھ کر انجام دینا چاہیے۔ تم بغیر کسی دشمنی کے یہاں چلے آئے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟''

سادھو کا عجب حال تھا۔ وہ کسی وحشی درندے کی طرح اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس کی کیفیت میں سرِ مو کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں نے دوبارہ اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میرا مشورہ ہے، غصہ تھوک کر لوٹ جاؤ!''

جواب میں اُس نے منہ بنا کر زمین پر تھوک دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پھر وہ اچانک مڑ گیا۔ کوئی دس قدم کی دوری پر ایک تھیلا رکھا ہوا تھا۔ وہ کپڑے کے اس تھیلے کے قریب پہنچا اور جھک کر اس میں سے کچھ نکالنے لگا۔ میں بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اندر سے ایک دو چھوٹی چھوٹی کنکریاں نکالیں اور انہیں کچھ پڑھ کر میری طرف اچھال دیا۔ کنکریاں آ کر میرے قدموں میں گریں اور پھنکارتے ہوئے سانپ کی شکل میں ڈھل گئیں۔ وہ تعداد میں دو سانپ تھے جو نہایت خطرناک انداز میں پھوں پھوں کرتے ہوئے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے اندر خوف کی لہر سی دوڑ گئی مگر تبھی آسمان سے دو باز جھپٹے اور اپنے پنجوں میں دونوں سانپوں کو پکڑ کر اُڑا لے گئے۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا تھا۔

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ سادھو بہت زیادہ بے بسی میں ہے۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہا ہے مگر معذوری نے جکڑ لیا ہے۔ وہ چاہ کر بھی بول نہیں پا رہا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں بے بسی تھی۔ وہ کچھ دیر تک میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھتا رہا پھر دوڑ کر میرے قدموں میں گر گیا۔

میں جو ایک معمولی سی لڑکی تھی، میرے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ پھر بھی میں نے بڑے پَن کا مظاہرہ کیا اور کچھ پیچھے ہٹ کر بولی۔

''جا! میں نے تجھے معاف کیا! اگر خود کو تُو بلوان سمجھتا ہے تو بلوانوں جیسی شان پیدا کر۔ کمزوروں سے اچھا سلوک کرنے کی اللہ تجھے توفیق دے۔ جا، میں نے تجھے معاف کیا!'' پھر میں نے بابل کی طرف دیکھا جو ہونق بنا کھڑا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ''یاد رکھ! تُو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اگر اب پھر کبھی ایسی حرکت کی، کسی کو میرے مقابلے پر لے کر آیا تو تجھے ہمیشہ کے لیے نشانِ عبرت بنا دوں گی۔ چل، اَب یہاں سے بھاگ لے!''

میرا اتنا کہنا ہی کافی ثابت ہوا۔ بابل، اس کے ساتھی اور وہ سادھو، سب کے سب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔

وہاں کھڑے لوگوں نے، پتول نے، اس کے گھر والوں نے، میری فتح کی خوشی میں زوردار نعرے لگائے۔ پتول بولی۔ ''آپا! آپ تو بہت کچھ سیکھ آئی ہیں۔ اب ہماری برابری کوئی نہیں کر سکے گا۔ سب ہم سے ڈرے رہیں گے۔''

''مگر تُو مجھ سے مت ڈریو! چل، اندر چل!'' کہہ کر میں مڑ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ تھکن محسوس ہو رہی تھی اس لیے کچھ دیر آرام کرنا چاہتی تھی لیکن کیا کرتی کہ آرام میری قسمت میں نہ تھا۔ میں نے جوں ہی آنکھیں بند کیں، میری نظروں کے سامنے میرا مظلوم باپ، پیاری امی اور چھوٹے بھائی بہنوں کی شبیہیں لہرانے لگیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سب مجھ سے تقاضا کر رہے ہوں کہ ہماری موت کے ذمے دار سے بدلہ کیوں نہیں لے رہی ہو؟ اب تم ایک کمزور لڑکی نہیں رہیں۔ اچھا خاصا علم حاصل کر چکی ہو۔ روح سے بھی رابطہ ہے۔ فقیر بابا بھی مدد پر آمادہ ہیں۔ پھر دیری کیسی؟ اُس بدبخت سے بدلہ لو!''

'ہاں! ہاں! میں بدلہ لوں گی۔ خود کو کمزور جان کر اُس کے اشارے پر چلتی تھی، اب اُسے چلاؤں گی۔ اگر وہ اپنی موت نہیں مرا ہوگا تو اسے اپنے ہاتھوں سے ماروں گی۔ وہ مجھے مقدس تابوت پر بھیج رہا تھا اپنی زندگی حاصل کرنے کے لیے، میں اسے اسی تابوت میں دفن کر دوں گی۔' یہی کچھ میں سوچ رہی تھی کہ آپ ہی آپ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھنچ آئی کیونکہ سامنے کے دشمن کو بھلا بیٹھی تھی۔ سدرشن کی قید سے سونالی کو بھی تو آزاد کرانا تھا۔ فقیر بابا نے شاید اسی مقصد کے لیے مجھے یہاں پہنچایا تھا۔ ابھی تو اس سے نمٹنا تھا۔ کیسے نمٹوں، میں اس پر غور کرنے لگی۔ تبھی مجھے برابر والے کمرے کی آواز سنائی دی۔ ''چاچی! واقعی سونالی بہت بڑی تانترک بن کر لوٹی ہے۔ سادھو کو کیسے اس نے شکست دے دی!''

''ہاں رے! اب تو یہ بہت خطرناک بن گئی ہے۔''

''میرا خیال ہے، اس سے بنا کر رکھا جائے ورنہ ہم نقصان میں رہیں گے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ چپکے چپکے ہم اس کا توڑ بھی کرتے رہیں گے۔ میں ادھر اُدھر سے پتا کرتی ہوں شاید کوئی بڑا منتر کہ مل جائے جس سے اس کا مقابلہ کرادوں گی۔ وہ خود ہی اسے اس کے انجام پر پہنچا دے گا۔'' چاچی بولیں۔

''خیال برا نہیں ہے۔'' نجمہ نے جواب دیا۔

''یہ دونوں کتے کی دُم ہیں! سیدھی ہو کر نہیں دے رہی ہیں۔ انہیں سبق سکھانا ہی پڑے گا!'' میں نے سوچا۔ مجھے بار بار ان پر غصہ آ رہا تھا مگر انہیں معاف کرنا بھی ضروری تھا کہ یہ دونوں بھی سونالی کے خاندان کا حصہ تھیں اور نادان بھی تھیں۔ جوشِ رقابت میں مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی تھیں ورنہ یہ تو میرے لیے مچھر کی مثال تھیں۔ میں جب چاہتی، انہیں مسل دیتی۔

''وہ چاند پور والے ماما نے کسی پہنچے ہوئے پیر بابا کا بتایا تھا ناں! آپ ایسا کریں کہ ان کے پاس چلی جائیں۔ شاید وہ پیر بابا کوئی راستہ نکال لیں۔ اس جادوگرنی سے ہمیں نجات دلا دیں۔''

''اے ہے بیٹی! مجھ سے دو قدم تو چلا جاتا نہیں ہے، اتنا لمبا سفر کیسے کروں گی؟'' چاچی نے کورا جواب دیا۔

''بس تو پھر آرام سے خود بھی بیٹھو اور مجھے بھی اس کی مکھن پالش کرنے دو۔ اُس کی ہاں میں ہاں ملا کر میں اپنا اُلو سیدھا کر ہی لوں گی۔'' نجمہ نے جل کر کہا۔

''ارے بدبخت! یہ سب کچھ میں کس کے لیے کر رہی ہوں۔ تیرے لیے، صرف تیرے لیے! ورنہ میرا کیا ہے، میں تو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہوں! آج مری کہ کل!'' چاچی کی آواز روہانسی تھی۔ ''اچھا، میں جا رہی ہوں۔''

لاٹھی کی ٹھک ٹھک نے بتا دیا کہ چاچی کمرے سے نکل رہی ہیں۔ اب اس کمرے میں صرف نجمہ رہ گئی ہوگی۔ اس لیے میں نے اُدھر سے توجہ ہٹالی اور لیٹے لیٹے آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگی۔

مجھے معلوم تھا کہ میں یہاں عارضی مہمان ہوں۔ سونالی کے آتے ہی مجھے یہاں سے ہٹ جانا ہے اور اسے سدرشن کی قید سے بھی مجھے ہی چھڑانا ہے۔ میں اس کیسے چھڑاؤں، اب میں اس پر غور کرنے لگی۔ سدرشن کوئی بہت بڑا تانترک نہیں تھا۔ اُسے چٹکیوں میں اڑا سکتی تھی مگر اس کی پیٹھ پر جو قوت تھی، اسے شکست دینا آسان نہ تھا۔ اگر آسان ہوتا تو نادیدہ قوت مجھے مندر سے لوٹ آنے پر مجبور نہ کرتی۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ مندر کے پجاری سے پہلے نمٹنا ہوگا۔ ابھی میں اس خیال میں کھوئی ہوئی تھی کہ پتا نہیں کیسے میرے دل میں ناصر کا خیال آ گیا اور میں نے لمحہ بھر میں فیصلہ کر لیا کہ اس کے لیے کوئی راستہ تلاش کرلوں تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ اسے اگر تھوڑی بہت رقم دے دوں تو وہ آزادانہ کاروبار کر سکتا ہے۔ اگر چار کشتیاں دِلا دوں تو وہ ان کے کرائے سے اپنا گھر چلا سکتا ہے۔

بنگال میں ریور ٹرانسپورٹ River Transport سب سے منافع بخش کاروبار ہے۔ جس کی ایک کشتی ہو، وہ ایک دن میں پچاس

روپے بہ آسانی کما سکتا ہے۔

''کیا ناصر واقعی پتول سے پیار کرتا ہے؟''

میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ یہ بات اہم تھی۔ لڑکیاں تو معصوم ہوتی ہیں، کہیں وہ اسے بیوقوف نہ بنا رہا ہو اس لیے میں نے اسے آزمانے کی ٹھان لی۔ اپنے آپ کو تیار کیا پھر فرحت کو بلانے کی دُعا پڑھنے لگی۔ اِسم کا ورد جاری تھا۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں کہ مجھے احساس ہوا جیسے کمرے میں کوئی داخل ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دروازہ مقفل تھا۔ سر گھما کر نظر دوڑائی۔ کھڑکی کے پاس دھواں سا جما تھا۔ دھوئیں کے مرغولے ہیولے کی شکل اختیار کر رہے تھے پھر وہ ہیولہ فرحت کے روپ میں ڈھل گیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔ اس نے جواب سلام دے کر پوچھا۔ ''مجھے کس لیے بلایا ہے؟''

ناصر کے کردار کے متعلق جاننا چاہتی ہوں، آیا وہ پتول سے پیار کرتا بھی ہے یا صرف وقت گزاری کر رہا ہے؟''

''لو تم خود دیکھ لو!'' کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے اپنا آپ بہت ہلکا محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے میں روئی کا گالا بن کر ہوا میں اُڑ رہی ہوں! اُڑتے اُڑتے میں بیٹھک خانہ (اوطاق) میں پہنچ گئی ہوں مگر وہاں جو کچھ دیکھا، اسے دیکھ کر میں گھبرا اٹھی۔ اس وقت بیٹھک خانے میں ناصر تھا اور پتول تھی۔ ناصر نے اُس کا داہنا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور پتول گھبراہٹ بھری آواز میں بول رہی تھی۔ ''ہائے اللہ! کوئی آ جائے گا!''

''کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!'' ناصر نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔

''اُف اللہ! میں چیخنے لگوں گی!''

''چیخو! خوب چیخو! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ سب جان لیں اور جو کام کل ہو، وہ آج ہو جائے گا!''

''ہائے اللہ! میں کیا کروں؟'' پتول روہانسی ہو رہی تھی۔

''جوابِ محبت پیش کرو!'' ناصر نے تڑ سے شوخ جملہ کسا تو وہ گلنار ہو گئی۔ وہ اپنے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش ترک کر کے التجا آمیز لہجے میں بولی۔

''اللہ! ناصر! چھوڑ دیجیے ناں! کیوں میری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں! کسی نے دیکھ لیا تو آفت آ جائے گی!''

''کوئی آفت وافت نہیں آتی۔ دیکھنے والے خود ہی سمجھ جائیں گے کہ تم چور ہو!''

''ہائے اللہ! میں نے کیا چرایا ہے؟''

''میرا دل، میری نیند، میرا سکون، سب کچھ تو چرا لے گئی ہو!''

''خدا کے لیے ناصر! سمجھنے کی کوشش کریں۔ نزاکت کا احساس کریں!''

بس اس سے آگے مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں نے زیرِ لب کہا۔ ''اب چلنا چاہیے!''

فرحت نے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور میں لمحوں میں لوٹ آئی۔

''فرحت! تمہارا کیا خیال ہے، کیا واقعی ناصر، پتول کو چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اور کیا، وہ اسے دل کی گہرائی سے چاہتا ہے۔ ہلکی پھلکی جو رکاوٹ ہے، وہ بھی صرف اس کی ماں کی طرف سے ہے کیونکہ ماں چاہتی ہے کہ پہلے یہ کچھ کر لے۔'' فرحت نے بتایا۔

''میں نے پہلے ہی سوچ لیا ہے کہ اسے کچھ کرا دوں گی۔''

''برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''کیا؟''

''تم اپنی تسلی کی خاطر کچھ بھی کرا لو مگر تم یہ شادی کرا نہیں سکتی ہو۔''

''کیوں نہیں کرا سکتی؟''

''یہ تو وقت بتائے گا کیونکہ میں یہاں تک دیکھ رہی ہوں کہ اس کی محبت نا کام ہے یعنی وہ کنوارہ مرے گا!''

''نہیں فرحت! تمہیں مغالطہ ہو رہا ہے۔ تم اچھی طرح دیکھو، یقیناً اسے بتول مل کر رہے گی۔ میں خود اس کی شادی کراؤں گی۔''

''میری نظریں جہاں تک جا رہی ہیں، میں یہی دیکھ رہی ہوں۔ ویسے غیب کا علم تو بس اللہ تعالیٰ کو ہے!''

''تم نے مجھے الجھا دیا ہے!''

''میں نے کہا ناں، میں غیب داں نہیں ہوں، بس جو کچھ دیکھ رہی ہوں، وہی بتا رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے، میرا اندازہ غلط ہو!''

''اچھی بات ہے، تم جاؤ!'' کہہ کر میں سوچ میں ڈوب گئی۔ واقعی میں الجھ گئی تھی۔ دماغ ماؤف ہو گیا تھا کہ میں ان دو محبت کرنے والوں کو کیسے ملاؤں؟ سوچتے سوچتے پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی اور میں بے خبر سو گئی۔

صبح سو کر اٹھی تو میری حالت عجیب تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھڑی بھر کے لیے میں باہر نکلی تھی پھر لوٹ کر کمرے میں آ گئی تھی۔ مجھے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک دل دہلا دینے والی خبر آ گئی۔ بتول نے آ کر بتایا کہ ناصر کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔

''کیوں، اُسے کیا ہوا؟ کل صبح تو اچھا بھلا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ہفتہ پہلے شام کے وقت جب گھر لوٹ رہا تھا تو بڑی سڑک کے پاس ایک چھوٹا سا سانپ اُس کے راستے میں آ گیا۔ اُس وقت اُس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ سانپ دیکھ کر وہ واپس مڑا تو اُس کی حیرت دو چند ہو گئی کیونکہ وہی سانپ پھر اُس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ کچھ گھبرا گیا۔ اُس نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی لاٹھی سانپ پر دے ماری اور خود وہاں سے بھاگ آیا۔ اُس نے یہ تک دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ سانپ مرا بھی ہے یا نہیں؟ وہ اس واقعے کو بھول گیا تھا کہ کل پھر اسی طرح ایک اور سانپ نے اُس کا راستہ روک لیا۔ اُس سانپ کی پھنکار نے اُسے دہلا دیا اور وہ خوفزدہ ہو کر گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ گھر آتے ہی اُس کے پیٹ میں زبردست درد شروع ہو گیا اور الٹیاں آنے لگیں۔''

''اب کیسی طبیعت ہے؟ ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''ڈاکٹر کو دکھایا گیا تھا۔ اُس نے دوا دی مگر دوا کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔''

''میں دیکھ کر آتی ہوں۔'' کہہ کر میں گھر سے نکل پڑی۔ ناصر کے گھر پہنچی تو اس کی بہن ساجدہ نے کہا۔

''آپا! سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ پہلے سانپ کی وجہ سے اماں کی طبیعت خراب ہوئی۔ اب سانپ کی وجہ سے بھائی کی طبیعت بگڑ گئی ہے اور وہ بھی ایک سانپ کی وجہ سے!''

''اتفاقات کا نام زندگی ہے! ذہن پر فکر و اندوہ کا بوجھ نہ لادو۔ اللہ تعالیٰ جو کرے گا، اچھا ہی کرے گا!''

''پتا نہیں، اچھا کب کرے گا؟ اس وقت تو ہماری زندگی دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے کھانستی ہوئی چل رہی ہے۔ خون تھوکتی ہوئی کہ ایک عذاب سے نکلتے ہیں کہ دوسرا عذاب منہ کھول دیتا ہے۔''

''یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ کس کے لیے کون سا دکھ سے لبریز پرچہ ہے، کون جانے۔''

''یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہم پر فضائے چمن مہربان ہو چلی تھی کہ نشیمن خود ہی بجلیوں کو پکارنے لگے۔'' ساجدہ بھرائے گلے سے بولی۔

''میری زندگی پر بھی نظر ڈالو کہ اب تک میں صحرا صحرا نوکِ خار سے تلوے سہلا رہی ہوں اور محفل محفل اپنی وحشت کا اقرار بھی بیانگِ دُہل کر رہی ہوں۔'' میں نے بھی اُسی کے انداز میں جواب دیا۔ وہ جب رُومانی ناولیں پڑھ پڑھ کر اچھے اچھے جملے بول سکتی ہے تو میں کیوں نہیں بول سکتی۔

''آپ کی بات اور ہے!''

''ہر انسان برابر ہے۔ اس کی بڑائی کا پیمانہ صبر ہے۔ جس نے جتنا صبر کیا، وہ اتنا ہی کامیاب ٹھہرا! قرآن پاک بھی صبر کی تلقین کرتا ہے۔'' میں نے حوصلہ دینے کے لیے کہا۔

''ہم پیر پیمبر نہیں ہیں کہ صبر کی سِل کلیجے پر رکھے رہیں اور زبان سے اُف نہ کریں۔'' اس نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

''بحث لمبی ہوتی جائے گی۔ چلو، پہلے ناصر کو دیکھ آتے ہیں، کہاں ہے وہ؟''

''اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

ناصر کمرے میں لیٹا ہوا چھت پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''کیسے ہو ناصر؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بس ایک لمحے کو اس نے میری طرف دیکھا۔ پتا نہیں کیوں اس کی آنکھیں مزید سرخ ہو گئیں جیسے وہ غصے میں ہو یا میری آمد اسے پسند نہیں آئی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ میں نے اندازہ لگانے کے لیے کہا۔ ''کیوں بھئی کیسے ہو؟''

میرا سوال سنتے ہی اس نے غصے سے میری طرف دیکھا پھر کہا۔ ''کیوں میرا مذاق اڑا رہی ہو؟ تم جو سر اٹھامنا چاہتی ہو، وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔ اپنے کام سے کام رکھو، بس!''

اس کے جواب نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اس کے ذریعے جو بھی مخاطب تھا، شاید وہ میری حقیقت سے ناآشنا تھا اس لیے میں معوذتین کا ورد کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں ناصر نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ یہ وقفہ طویل ثابت نہ ہوا اور اس نے پھر

سے آنکھیں کھول دیں۔اب اس کی آنکھوں میں سرخی بھی نہیں تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''میں نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں!''اس نے جواب دیا۔

''شکر کرو کہ میں وقت پر آ گئی ورنہ پتا نہیں تمہارے ساتھ کیا ہوتا!تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی، بتاؤ گے؟''

''آپا!آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ بہت کچھ جانتی ہیں۔یہ بھی سنا ہے کہ آپ نے مؤکل کو قبضے میں کر لیا ہے اسی لیے میں آپ کو بتا رہا ہوں۔یہ بات آج کی نہیں ہے۔تقریباً ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔اس دن میں گرمی کی وجہ سے باہر باغیچے میں بیٹھا تھا۔لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔پلنگ پر کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔میں نوٹس تیار کر رہا تھا کہ مجھے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی۔میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔جامن کے پیڑ کے پیچھے سے نکل کر ایک لڑکی سامنے آ کھڑی ہوئی۔اسے دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں!اتنا مکمل حسن میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔سرخ وسفید رنگت، تیکھے نقش ونگار، بڑی بڑی سیاہ کالی آنکھیں، کاندھوں پر بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال، سرخ پھول دار سوٹ پہنے ہوئے تھی۔لڑکی چہرے مہرے سے شہر کی پڑھی لکھی نظر آ رہی تھی۔میں حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ اس نے کہا:

''کیا بات ہے ناصر!اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟''اس کی آواز میں جلترنگ کی گونج تھی۔

''جی......!جی!آپ......آپ کون ہیں؟بیٹھیے......!بیٹھیے ناں!''

''بیٹھنے ہی آئی ہوں!''مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی۔پھر وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور تکیے سے ٹیک لگا کر مجھے بغور دیکھنے لگی۔

''آپ......آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گی؟''میں نے حوصلہ جمع کر کے کہا۔

''کراؤں گی......تعارف، کراؤں گی مگر آج نہیں، کل!''اس نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''شاید آپ چھٹیاں گزارنے ڈھاکا سے آئی ہیں؟پلیز!اپنا نام ہی بتا دیں؟''میں مضبوط لہجے میں بولا۔

''میرا نام رضیہ ہے اور میں بہت دور سے آئی ہوں۔آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اس لیے میں آج آپ سے ملنے چلی آئی۔''

''مگر میں تو آپ کو نہیں جانتا؟''

''کل آپ میرا پورا تعارف سن لیں گے۔آپ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھیے ناں!''

کسی جوان لڑکی کے ساتھ ایک پلنگ پر بیٹھنا مجھے عجیب سا لگا۔اتنی بے باک لڑکی مجھے پہلی بار دکھائی دی تھی۔میں نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''آپ آرام سے بیٹھیں۔میں یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔''

''ارے!ارے، یہ کیا!آپ بھی اوپر آ جائیں ورنہ میں خود بھی وہیں آ جاؤں گی۔''وہ فوراً چارپائی سے اتر کر میرے پاس آ بیٹھی۔

''ہاں!اب اپنے متعلق بتائیں!''میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''کہا تو، پھر کبھی بتاؤں گی کیونکہ آپ کی بہن آنے والی ہے۔اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو پورے گوٹھ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں

رہوں گی۔'' کہتی ہوئی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

پتا نہیں کیوں اس کے اٹھنے کا سن کر میں بری طرح بے چین ہو گیا۔ ایسا جیسے میرے سینے میں سے کوئی میرا دل نوچ رہا ہے۔ وہ اٹھ کر باڑے کی طرف جانے لگی۔ میری نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ وہ چھوٹی سی دیوار کو پھاند کر سڑک کی طرف اتر گئی۔ کچھ دیر تک وہ نظر آتی رہی پھر پگڈنڈی کا موڑ مڑتے ہی وہ نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اٹھ کر اس کے تعاقب میں چل پڑوں۔ اس کا پیچھا کر کے دیکھوں کہ وہ کس گھر میں داخل ہو رہی ہے؟ کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟ لیکن دل مسوس کر رہ گیا کیونکہ مجھے اس کی ناراضی گوارہ نہیں تھی۔

ابھی اسے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میری بہن آ گئی۔ وہ کھانا کھا لینے کے لیے کہنے آئی تھی۔

میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ کھانا کھا لینے کے بعد میں واپس آ کر اُسی جگہ لیٹ گیا۔ میری نظروں کے سامنے اُسی کا چہرہ گردش کر رہا تھا۔ میں اسی کے خیالوں میں ڈوبا ہوا باڑے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ آتی ہوئی نظر آئی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی! مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے مجھے خوشیوں کا خزانہ مل گیا ہے! اتنی خوشی چتول کو دیکھ کر بھی کبھی نہیں ہوئی تھی جبکہ وہ میرے لیے سب کچھ تھی! ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھائی تھی۔ وہ اٹھلاتی ہوئی میرے پاس آ کر اسی پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔

اسے بیٹھتے دیکھ کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''جانتے ہیں میں کیوں لوٹ آئی؟''

''کیوں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ مجھے گھر واپس پہنچ کر احساس ہوا کہ آپ میرے انتظار میں بیٹھے ہوں گے!''

''ہاں، میں تمہیں بڑی شدت سے یاد کر رہا تھا۔ پتا نہیں تم نے ایسا کون سا جادو کر دیا ہے کہ تمہارے علاوہ کچھ سُجھائی ہی نہیں دیتا!'' میں نے کہا۔

''میں خود بھی بے چین تھی مگر کیا کرتی، گھر میں اتنے سارے لوگ ہیں۔ سب کی نظریں بچا کر آنا آسان بھی تو نہیں ہے مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں کوشش کروں گی کہ زیادہ سے زیادہ وقت میں تمہارے ساتھ گزاروں!''

''اچھا! اب تو بتا دو کہ تم کس گھر میں ٹھہری ہوئی ہو اور کسی دن ہمارے گھر بھی آؤ ناں! میری بہن بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ تم سے وہ فوراً دوستی کر لے گی۔''

''ابھی نہیں، وقت آنے پر میں خود جا کر ملاقات کر لوں گی مگر ابھی نہیں! ابھی کچھ اڑچنیں ہیں۔ ابھی اگر گئی تو میرے گھر والے مشکلات کھڑی کر دیں گے۔ یقین کرو، وقت آنے پر میں اپنے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔''

میں نے کئی بار اس سے اس کا اَتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار وہ باتوں کا رخ موڑ کر صاف پہلو بچا لیتی۔

باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ یکا یک اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''اچھا، میں چلتی ہوں!''

''ارے، یہ بیٹھے بیٹھے کیا ہوگیا کہ جانے کی باتیں کرنے لگیں؟''

''تمہاری بہن پھر آ رہی ہے!''

''تو کیا ہوا، یہ تو بہت اچھا ہے کہ اس سے آج ہی ملاقات ہو جائے۔ میں تمہارا تعارف بھی کرا دوں گا۔''

''نا...... بابا!...... نا...... لوگ باتیں بنائیں گے۔ تمہاری بہن نے اگر کسی کے سامنے منہ کھول دیا تو میرے گھر والے مجھے پھانسی دے دیں گے۔''

''اس کے معنی یہی ہیں ناں کہ تم میرے گھر نہیں آنا چاہتی ہو؟''

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آ جاؤں گی۔''

''مگر کب؟ اب تک تو تم نے اپنی حقیقت یعنی اتا پتا تو بتایا نہیں ہے، پھر کیسے آؤ گی؟''

''سنو! میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ اگر تم میرا آنا ضروری سمجھتے ہو تو میں آج رات میں ہی تمہارے گھر آؤں گی مگر کمرے میں نہیں۔ تم باہر برآمدے میں سونا۔ وہاں میں بڑی آسانی سے آ جاؤں گی۔ ابھی تو میں جا رہی ہوں ورنہ تمہاری بہن کی نظروں میں آ جاؤں گی!'' کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

اُسے گئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ واقعی میری بہن آ گئی۔ میں اس لڑکی کے اندازے پر حیران رہ گیا کہ اس نے کیسے دو، دو بار اندازہ لگا لیا کہ میری بہن آنے والی ہے؟

بہن مجھے بلانے آئی تھی کہ میں گھر کے اندر چلوں تاکہ دروازہ بند کیا جا سکے۔

گھر آ کر میں نے اماں سے کہا۔ ''اماں! میں برآمدے میں سو جاؤں؟''

''بیٹا! رات کے پچھلے پہر ٹھنڈک ہو جاتی ہے۔ شبنم بھی بہت گرتی ہے۔ کہیں ٹھنڈ و نڈ نہ لگ جائے!''

''نہیں اماں! مجھے ٹھنڈ و نڈ نہیں لگتی!''

''ٹھیک ہے، جا، بستر لے جا!'' امی نے اجازت دے دی اور میں بستر لے کر باہر برآمدے میں آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لڑکی پاس کے کسی گھر میں ٹھہری ہوئی ہے، اسی لیے وہ نظریں بچا کر ادھر آ جائے گی تبھی میرا دل دھڑک اٹھا۔ خدشے نے سر ابھارا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا! میں صرف آج کی رات گھر سے باہر برآمدے میں سونے کا ارادہ کر کے آیا تھا اور صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کس گھر سے آتی ہے؟

نرم نرم بستر پر لیٹ کر تاروں بھرے آسمان کو دیکھنا شروع کیا۔ چاند ابھی نکلا نہیں تھا۔ اندھیری رات میں تارے خوب چمک رہے تھے۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اوپر دیکھ رہا تھا۔ نیند کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ دفعتاً چوڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ وہ میری چارپائی کے نزدیک آ کھڑی ہوئی تھی۔

''تم...... تم کدھر سے آ گئیں؟'' اُس کے یکایک آ جانے پر میں حیران تھا۔

''بس آ ہی گئی! تم بہت اچھے ہو! یہ کتنا اچھا ہوا کہ تم برآمدے میں سوئے! اگر آج تم نہ آتے تو پھر میں کبھی بھی تم سے ملنے نہیں آتی۔'' اُس

نے اٹھلا کر جواب دیا۔

"نہ! نہ! ایسا کبھی مت کرنا! میں اداس ہو جاؤں گا۔ تم نے نہ جانے کیا کر دیا ہے مجھے! تمہارے بغیر میں بے قرار رہتا ہوں۔" میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ "تمہیں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں......!" کہہ کر وہ کچھ اور آگے بڑھتی کہ چونک کر ہٹ گئی پھر بولی۔ "تمہاری اماں آ رہی ہیں۔ میں چلتی ہوں!"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اُس کا اس طرح آنا پھر چلے جانا، میری سمجھ سے باہر تھا۔" ناصر نے اپنی رُوداد ختم کرتے ہوئے کہا۔ "آپا! اگر آپ کچھ کر سکتی ہیں تو اتنا کریں۔ اُسے کسی طرح بلا دیں۔"

ناصر پور پور اس کے پیار میں ڈوب چکا تھا۔

"اسے اس چنگل سے مجھے چھڑانا ہی پڑے گا،' میں نے دل ہی دل میں عہد کیا، 'ورنہ بتول کا دل ٹوٹ جائے گا مگر وہ کیا چیز ہے جو اس سے ملنے آتی ہے۔'

یہ سوچ کر میں نے اس کی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے باہر بیٹھی اس کی بہن سے کہا۔ "ایک گلاس پانی لے آؤ!"

وہ فوراً قلعی کیے ہوئے تانبے کے گلاس میں پانی لے آئی۔ میں نے گلاس تھام کر معوذتین پڑھی اور گلاس پر پھونک کر اُن آیات کا وِرد کرنے لگی جس کا ذکر ابو کی کتاب میں تھا۔

ناصر پر اس وقت بے ہوشی سی طاری ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ صرف جواب دینے کے لیے ہوش میں آیا تھا۔ میرا ورد ختم ہوا تھا کہ اُس کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ زیرِلب کچھ بڑبڑانے لگا۔ میں نے گلاس سے چُلّو میں پانی لیا اور اُس کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ ناصر نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ پھر اسے دو تین جھٹکے اور لگے۔

میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بولو، تم نے اسے کیوں تنگ کر رکھا ہے؟ اس بے چارے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ بولو؟" میں نے جملے کا آخری لفظ اونچی آواز میں کہا۔

"اس نے ہمارا بہت کچھ بگاڑا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا شوہر زخمی ہوا ہے۔ اس نے میرے شوہر کے سر پر ڈنڈا مارا ہے۔ مجھ سے میرا سہاگ چھیننے کی کوشش کی ہے۔ وہ بری طرح زخمی ہوا ہے۔ ابھی بھی بستر پر پڑا کراہ رہا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" ناصر کے منہ سے زنانی آواز نکل رہی تھی۔

میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کسی جناتی بستی میں نکل گیا ہو گا اور انجانے میں کسی جن کو زخمی کر آیا ہے! جنات آگ سے بنے ہوئے ہیں اس لیے ان کے اندر یہ خوبی بدرجہ اُتم موجود ہے کہ وہ اپنی شکل بدل سکتے ہیں۔ کسی اور قالب میں بھی ڈھل سکتے ہیں۔

اس کا شوہر بھی کسی جانور کے قالب میں ہو گا جسے ناصر نے زخمی کر دیا! میں نے اندازہ لگانے کے لیے پوچھا۔ "یہ بات کب کی ہے؟ کب

تمہارا شوہر زخمی ہوا؟''

''ایک ہفتہ پہلے وہ سانپ کے قالب میں تھا کہ ناصر نے اُس پر حملہ کر دیا۔ اُس کے زخمی ہونے کی وجہ سے اُس کے بھائی طیش میں آ گئے اور کل شام میں اُس کا چھوٹا بھائی اُسے زخمی کرنے کے لیے راستے میں آ گیا تھا لیکن یہ اُس سے بچ کر گھر آ گیا۔''

''سانپ ایک موذی جانور ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہر انسان اسے ختم کر دینے کی کوشش کرے گا۔ غلطی تمہارے شوہر کی ہے کہ وہ کیوں اس قالب میں تھا؟'' میں نے تنبیہہ کے انداز میں کہا۔

''وہ کسی کے حکم سے اس قالب میں تھا۔''

اس کی بات سن کر میں غور کرنے لگی کہ اس بات کا کیا مطلب ہے، وہ کیوں کسی اور کے حکم پر چل رہا تھا اس لیے پوچھا۔ ''کیا تم اسلام کو مانتی ہو؟''

''نہیں! ہمارا مذہب اسلام نہیں ہے۔ ہم بت پرست ہیں!'' ناصر کے منہ سے زنانی آواز سنائی دی۔

''اگر تم کافر ہو تو تمہیں اسلام قبول کرنا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے ورنہ میں تمہیں جلا کر خاک کر دوں گی!''

''تم ہو کیا چیز! بڑے بڑے عالم کو میں نے دھول چٹا دی ہے!''

''مگر تم مجھ سے ٹکرا نہیں سکتیں!'' میں نے فخریہ انداز میں کہا پھر اس کے کچھ اور قریب آ کر میں نے پوچھا۔ ''تم کس کے اشارے پر ایسا کر رہی ہو؟''

''ہمیں سدرشن کے گرو نے حکم دیا ہے کہ میں دوسروں کی طرح تم لوگوں کو بھی تباہ کر دوں۔ سدرشن کا انتقام لوں!''

''آخر اس انتقام کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟ ایسا کیا ہو گیا ہے، یہ تو بتا دو؟''

''تم نے یہاں آ کر خواہ مخواہ کی دہشت پھیلا دی ہے۔ ہماری قوت کو بغیر جانے ہم سے ٹکرا رہی ہو۔ سونالی اب تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔''

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں کوئی ہماری باتیں سن تو نہیں رہا ہے کیونکہ میں سونالی کی جگہ تھی۔ اسی کی شکل اختیار کر رکھی تھی جس کی وجہ سے سب لوگ مجھے ہی سونالی سمجھ رہے تھے۔ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ کہ تم نے کیسے جانا کہ میں سونالی کی تلاش میں ہوں؟''

''اس طرح جانا کہ تم اول تا آخر ہم لوگوں کی نظر میں ہو! ہم سدرشن کے غلام تو نہیں ہیں مگر ضرورتاً اس کی مدد کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ بھی بدی کا پُرتو ہے اور ہم بھی شیطان کے زیادہ قریب ہیں۔''

''اسی لیے تم ہمارے پیچھے لگ گئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! جب اُس نے میرے شوہر کو زخمی کیا تو ہمارے قبیلے میں ہاہا کار مچ گئی۔ میرا شوہر بے ہوش ہے اس لیے وہ ملزم کا نام بتا نہ سکا اور تب ہر ایک غصے میں بھر اٹھا۔ سب تمہاری بستی والوں کے خلاف انتقاماً کچھ کرنے کی سوچ رہے تھے کہ سدرشن کا پیغام آ گیا۔ اس نے مجھے بلایا تھا۔ پیغام یہ بھیجا تھا کہ وہ اصل مجرم کو پہچانتا ہے۔ اصل مجرم کون ہے، یہ جاننے کے لیے میں مندر پہنچی۔ وہاں سدرشن کے گرو مہاراج نے آئینے پر منتر پڑھ

کر اس کا چہرہ دکھا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی پیٹھ پر تم ہو اس لیے اس سے تو انتقام لینا ہی ہے۔ تم لوگوں کا بھی ناش کرنا ہے۔ سب کو تباہ و برباد کر دینا ہے۔'' کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ ناصر بے ہوشی کے عالم میں پڑا گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لے کر کہا۔

''یعنی تم سیدھے سیدھے مجھ سے ٹکرانے آئی ہو؟''

''بالکل! میں تم سب کو تباہ کرنے آئی ہوں۔''

ناصر کے منہ سے وہی زنانی آواز آئی۔

''ٹھیک ہے، تم اپنی قوت آزماؤ۔ میں اپنی قوت دکھاتی ہوں۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور مڑ گئی۔ مجھے فرحت سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ میں وہاں سے سیدھی سونالی کے گھر آئی اور مراقبے میں بیٹھ گئی۔ مجھے یقین تھا، اس مشکل گھڑی میں وہی میری مدد کر سکتی ہے۔ میں نے وِرد شروع کر دیا۔ بہ مشکل ڈیڑھ منٹ کا وقفہ ختم ہوا تھا کہ فرحت دھوئیں کی شکل میں آ گئی۔ اس نے سلام کیا اور پوچھا۔ ''مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''تم سے مدد کی طالب ہوں! میری مدد کرو!'' میں نے التجائیہ انداز میں گزارش کی۔

''تمہارے مقابل جو لوگ ہیں، وہ بہت عیار و مکار ہیں۔ تم نے ابھی قدم اٹھایا ہی تھا کہ انہوں نے چال چل دی ہے! ان لوگوں نے تمہارے پیچھے پولیس لگا دی ہے جو کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچنے والی ہے۔''

فرحت کی بات نے مجھے دہلا دیا۔ پولیس والوں کو بس شک ہونا چاہیے، وہ مُردے سے بھی گواہی دلا دیتے ہیں۔ اب میں ان سے کیسے بچوں، کس طرح دامن چھڑاؤں، میں اسی پر غور کر رہی تھی کہ دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔

''لو، وہ لوگ آ گئے!'' فرحت نے کہا۔ ''میں فی الحال جا رہی ہوں۔''

میری پوری توجہ باہر کی طرف تھی کہ پتول بھاگتی ہوئی آئی۔ ''آپا......! آپا! باہر پولیس آئی ہے۔ وہ لوگ تمہیں بلا رہے ہیں۔''

پتول کی بات پر میں نے گہری سانس لی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے سے باہر آئی تھی کہ دیکھا، ایک انسپکٹر اور چھ سات سپاہی آنگن میں کھڑے ہیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیوں آئے ہو؟''

''تم نے بہت ڈرامے بازی کر لی۔ اب تھانے چلو! وہاں پہنچ کر تم سے بات ہو گی کہ تم کتنی پہنچی ہوئی ہستی ہو!'' انسپکٹر نے رعب دار لہجے میں کہا۔

''کیوں، میں تھانے کیوں چلوں؟ میں کوئی چور اُچکی ہوں؟'' میں اس کے رعب میں کیوں آتی، اسی لیے تیز لہجے میں بولی۔

''تم کیا ہو، یہ وہاں چل کر پوچھوں گا۔ بڑی پیرنی بن رہی ہو ناں! پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھیں۔ کیا سمجھتی تھیں، ہم پولیس والے اندھے اور بہرے ہیں!''

پتا نہیں کس طرح یہ خبر باہر تک پھیل گئی تھی کیونکہ باہر سے نعرہ لگانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کافی سارے لوگ اندر گھس آئے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں۔ وہ سب پولیس والوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سب

پولیس والوں کی چٹنی بنا دیں گے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ پولیس والے ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں اسی لیے ہمارے دینی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔

اب جو میں نے انسپکٹر کی جیب پر لگی نام کی ننھی سی تختی پر نظر ڈالی تو بات کھل کر سامنے آ گئی۔ انسپکٹر کا نام دیال داس تھا یعنی وہ ہندو تھا۔ مشرقی پاکستان کے تقریباً ہر محکمے میں ہندو افسران مل جاتے تھے۔ اس میں تعجب کی بات نہیں تھی اس لیے میں نے بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور کڑک دار لہجے میں بولی۔ ''ابھی بھی وقت ہے، یہاں سے چلے جاؤ!''

''میں سب سمجھ رہا ہوں۔ تمہارے ایجنٹوں نے ہر طرف جال پھیلا رکھا ہے۔ عوام تو بیوقوف ہوتے ہیں، انہیں اور بیوقوف بناتی جاؤ!'' انسپکٹر نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اے انسپکٹر کا بچہ! منہ سنبھال کر بات کرو! آپا کی عزت کرو ورنہ ہم عزت کرانا خوب جانتے ہیں۔ زیادہ آئیں بائیں شائیں کرو گے تو کھال میں بھس بھر دوں گا۔''

پتا نہیں وہ کون تھا جس نے میری حمایت میں چیخ کر کہا تھا۔ یہ اتنے لوگ میری حمایت میں کیسے آ گئے؟ میں خود بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ سب مرنے مارنے پر آمادہ تھے۔ میرے لیے پولیس سے تکرار رہے تھے اور میں اس کی وجہ جاننے میں کوشاں تھی کہ میری نظر بابل پر پڑی۔ بھیڑ میں وہ بھی کھڑا تھا۔ یقیناً یہ اُسی کی چال تھی اور یہ لوگ اسی کے گرگے ہوں گے۔ وہ مجھے مزید پھنسانے کے لیے اپنے آدمی لے آیا تھا۔ بلوہ ہو جانے کی صورت میں سارا الزام مجھ پر آتا۔ یہی اس کی کامیابی تھی۔ اس نے انتقام لینے کا نایاب طریقہ ڈھونڈا تھا۔ میں نے مداخلت کرنا ضروری سمجھا اور انسپکٹر سے بولی۔

''آپ اس وقت چلے جائیں۔ میں بعد میں خود ہی آ جاؤں گی۔''

''نہیں! آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر سیدھی طرح نہیں چلیں گی تو مجھے ہتھکڑی لگانا ہوگی۔'' انسپکٹر داس بھی اڑ گیا تھا۔ اتنا مجمع دیکھ کر اس نے ہتک آمیز الفاظ کا استعمال تو کم کر دیا تھا مگر لہجہ ابھی بھی وہی تھا۔

میں نے اسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی۔ ''انسپکٹر مجمع بلوے پر آمادہ ہے۔ خدا کے لیے، تم چلے جاؤ!''

''میں ان غنڈوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں!'' کہہ کر اس نے پستول نکال لیا۔

''عوام جب بپھر جائیں تو انہیں سنبھالنا آسان نہیں ہے۔ پلیز، میرا کہا مان لو!''

انسپکٹر نے ہوا میں گولی چلائی پھر چیخ کر کہا۔ ''تم سب پیچھے ہٹو ورنہ بھون کر رکھ دوں گا!''

گولی کی آواز سے پورا آنگن گونج اٹھا۔ مجمع کچھ پیچھے ہٹا۔ کئی افراد کھسک لیے مگر اب بھی بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ فائر کی آواز کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ ایسی قیامت کی خاموشی کہ آدمی اپنی ہی آواز سے ڈر جائے! پھر داس نے مڑ کر مجھ سے کہا۔ ''سنو لڑکی! میں کوئی کچا عقیدہ رکھنے والا نہیں ہوں جو تمہاری شعبدہ بازی سے مرعوب ہو کر دھرماتما یا اوتار سمجھ کر تمہاری پوجا شروع کر دوں۔''

انسپکٹر کا لہجہ تلخ تھا پھر بھی میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''انسپکٹر! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کچھ لوگوں نے تمہیں میرے ضمن میں ورغلایا ہو؟''

''اصلیت کیا ہے، یہ جاننا تمہارا نہیں، بلکہ ہمارا کام ہے۔'' انسپکٹر نے مجھے لال پیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے لیے یہی حکم ہے کہ تم سیدھی تھانے چلو!''

''میں نے ابھی کچھ دیر پہلے کہا تھا ناں، کہ تم چلے جاؤ۔ میں خود تھانے آ جاؤں گی!''

''بکواس بند کرو!'' داس نے جھڑکا۔ ''میں تمہیں حوالات میں بند کر کے سڑوا سکتا ہوں!''

داس کے منہ سے بے ہودہ کلمات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے زبان بندی کا عمل پڑھ کر اس کی جانب دم کیا تو وہ بولتے بولتے یک لخت خاموش ہو گیا۔ اس کی حالت مضحکہ خیز ہو گئی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز ندارد تھی!

دوسرے ہی لمحے وہ خوفزدہ نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے بے بسی جھانک رہی تھی۔ اس نے واپس جانے کے لیے مڑنا چاہا تھا مگر اپنی کوشش میں بری طرح ناکام رہا کیونکہ وہ کسی پتھر کی مورت جیسا بن گیا تھا۔ اس کے پیروں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا۔ اس کیفیت نے اس کی رہی سہی عقل بھی خبط کر دی تھی اور تب اس نے معافی مانگنے کے انداز میں آنکھوں سے اشارہ کیا۔ داس سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں اسے صرف اس کی بدکلامی پر ہلکی سی سزا دینا چاہتی تھی سو دے چکی تھی چنانچہ جب اس نے آنکھوں کے اشارے سے معافی مانگی تو میں نے بڑی نرمی سے کہا۔

''جاؤ انسپکٹر! آئندہ اس بات کا دھیان رکھنا کہ اللہ والوں کو چھیڑنے اور اُن سے بدکلامی کرنے کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ تمہارے لیے اتنی ہی نصیحت کافی ہے!''

میرا یہ کہنا تھا کہ داس کی قوتِ گویائی لوٹ آئی۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں بوکھلا کر میرا شکریہ ادا کیا اور اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔ دروازے سے باہر نکل گیا۔ میری طاقت کا ہلکا سا مظاہرہ دیکھ کر وہاں کھڑے لوگ بہت زیادہ مرعوب ہو گئے تھے، اسی لیے پولیس والوں کے جاتے ہی دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ تبھی میں نے بابل سے کہا۔ ''بھئی، تمہاری یہ سازش بھی ناکام ہو گئی اس لیے پھر میں کہہ رہی ہوں کہ تم سدھر جاؤ! مجھ سے ٹکراؤ گے تو بری طرح ٹوٹ جاؤ گے! میں کوئی بڑی سزا بھی دے سکتی ہوں!''

شاید میرے لہجے کا اثر تھا کہ وہ بھی لوٹ گیا۔ اب میں اکیلی آنگن میں کھڑی تھی۔ گھر کے تمام افراد پہلے ہی اپنے اپنے کمروں میں بند تھے۔ ہجوم کو دیکھ کر وہ سب خوفزدہ ہو گئے تھے میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں حالات کا تجزیہ کر رہی تھی کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب کھڑاگ اُسی پنڈت نے پھیلایا ہے جس کے قبضے میں سونا لی ہے؟ کہیں اس نے حملے کی پیش بندی تو نہیں کر لی ہے؟ اس بارے میں معلومات کا ذریعہ صرف اور صرف ''کشف'' تھا! میں نے ''کشف'' کرنے کا سوچا اور بستر پر بیٹھ گئی۔ ابھی میں نے آنکھیں بند کر کے پڑھنا شروع کیا تھا کہ ایسا لگا جیسے میری آنکھوں کے آگے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا ہے اور میں دور تک دیکھ رہی ہوں۔ میں نے ورد جاری رکھا۔ تبھی میں نے دیکھا کہ میں مندر کے اندر داخل ہو رہی ہوں۔ یہ وہی مندر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مشرقی بنگال کا سب سے اہم مندر ہے جہاں پوجا کرنے کے لیے مغربی بنگال یعنی بھارت سے بھی لوگ آتے ہیں۔ جادو ٹونا سیکھنے

والوں کا یہ گڑھ ہے۔ یہاں بڑے بڑے تانترک سادھنا کر رہے ہیں۔ سدرشن بھی یہیں اپنے گرو کی پناہ میں چھپا بیٹھا ہے۔

میں مندر کے اندر داخل ہوئی۔ میرے سامنے ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال کے آخری سرے پر ایک چبوترہ تھا اُس چبوترے پر ایک مادرزاد برہنہ عورت کی مورتی تھی۔ کمر سے گھٹنوں تک ستر پوشی کے لیے انسانوں کے کہنی تک کٹے ہاتھ جھالر کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس کے دو کی بجائے چار ہاتھ تھے۔ ایک ہاتھ میں گنڈاسا تھا۔ دوسرے میں کٹا ہوا سر! تیسرے اور چوتھے میں بھی کچھ تھا جبکہ پیروں کے نیچے ایک شخص دبا ہوا پڑا تھا۔ میں پہچان گئی کہ وہ ہندوؤں کی دیوی "کالی" کی مورتی ہے اور اس کے قدموں میں جو شخص پڑا ہے، وہ کوئی اور نہیں، اس کا شوہر شنکر بھگوان ہے۔ اسے پیروں سے کچل دینے کی وجہ سے ہی کالی دیوی نے زبان باہر نکال دی ہے۔ جادو ٹونا سیکھنے والے اسے ہی پوجتے ہیں۔ یہ میں بھی جانتی تھی۔

ہال پار کر کے میں مورتی کے برابر سے گزرتی ہوئی ایک گلیارے کی طرف بڑھی۔ یہ سب کچھ میرا "روحانی سفر" تھا۔ میں "کشف" کے ذریعے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ میرا دوسرا "روحانی سفر" تھا۔ پہلا سفر فرحت کے ساتھ کیا تھا اور اب اکیلی تھی۔

میں مورتی کے برابر سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے اُس مورتی نے حرکت کی ہو۔ وہ مڑی ہو۔ میں نے چونک کر اُدھر دیکھا لیکن مجھے ایسا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں پھر آگے بڑھی تو دوبارہ وہی احساس جاگا اور میں پھرتی سے پلٹ گئی۔ اس بار میں نے اُس مورتی کو حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھسکی تھی۔ مجھے فرحت کی تنبیہ یاد آ گئی۔ اس نے گزشتہ سفر میں مجھے منع کیا تھا کہ میں اس مندر میں زیادہ دیر نہ ٹھہروں۔ اگر زیادہ دیر رُکوں گی تو میرے لیے خطرہ ہے کیونکہ یہ میرا "روحانی سفر" ہے! میری روح کو قید کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس خوف سے قدم تیز کر دیئے۔

ابھی میں گلیارے میں پہنچی ہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میری پیٹھ پر کسی نے سنگل مارا ہو۔ میں سر تا پا لرز گئی تھی! کیونکہ میری پوری توجہ مورتی کی طرف تھی۔ اُدھر دیکھتے ہوئے میں اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی۔ گلیارے میں اونچے اسٹینڈ پر بنا پیتل کا چراغ دان میری پیٹھ سے ٹکرایا تھا۔ اُسی کی تینوں نوکیں پیٹھ پر چبھی تھیں اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ میں اُدھر سے مطمئن ہو کر مورتی کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ مورتی آہستہ آہستہ مڑ رہی تھی۔ اب اس کا چہرہ میری طرف تھا۔ میں گلیارے میں کھڑی حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میں اسے بھی جادو سمجھ رہی تھی کہ مورتی کے قدموں کے درمیان ایک سر ابھرتا نظر آیا۔ وہ سر بالکل گنجا تھا۔ صرف گدی پر بالوں کا ایک گچھا تھا جسے ہندو ٹنک یا ٹکی کہتے ہیں۔ وہ گنجا سر آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ اب میں اس راز کو سمجھ چکی تھی۔ یقیناً وہ مورتی کسی تہ خانے کے خفیہ دروازے پر تھی جسے میکینزم mechanism سے حرکت دی جاتی ہو گی۔ وہ شخص اسی دروازے سے باہر آ رہا تھا پھر وہ مکمل طور پر باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی اس نے مورتی کے گنڈاسے کو پکڑ کر ہلکا سا اوپر اٹھایا۔ مورتی گھوم کر اپنی جگہ پر آ گئی اور وہ شخص اسی دروازے کی طرف بڑھا جدھر میں کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ لیا جانا یقینی تھا۔ میں چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی کہ وہ شخص بالکل میرے نزدیک پہنچ گیا۔

اس نے میرے سامنے رک کر کہا۔ "اے بالیکے! تو کون ہے، یہاں کیا کر رہی ہے؟" اُس کی تیز نظریں میرے اندر تک پیوست ہو رہی تھیں۔ میرے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں

''میں......میں پوجا کے لیے آئی تھی اور راستہ بھٹک گئی۔ باہر جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔''

''بالیکے! تُو تو بڑی سندر ہے مگر حد درجہ مورکھ ہے، اسی لیے مجھے بھی مورکھ سمجھ رہی ہے۔ تو کیا سمجھتی ہے، میں تیرے جھانسے میں آ جاؤں گا؟ یہاں چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ ہم اندر تک جھانکتے ہیں کہ مَن میں کیا چھپا ہے۔ میں بھی تیرا مَن دیکھ رہا ہوں جہاں چھل کپٹ، دھوکا دہی، مکر و فریب چھپا ہے۔ تُو جھوٹ بول رہی ہے۔'' اُس گنجے نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔

''یقین کرو، میں بھٹک کر آ گئی ہوں!'' میں نے پیچھے کی جانب ہٹتے ہوئے کہا۔

''شریر بھٹکتا ہے، آتما نہیں! تُو یہاں مجسم نہیں ہے۔ یہ تیری آتما ہے اور اب میں اس آتما کو اپنے قبضے میں کرنے والا ہوں کیونکہ تُو منزل کا خواب دیکھنے چلی ہے اپنے پاؤں کاٹ کر، خاک منزل پر پہنچے گی!''

میں سمجھ گئی تھی کہ میرا راز کھل چکا ہے۔ اب مقابلہ کرنا ناگزیر ہے۔ مجھے ہر حالت میں اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ مقابلہ کس طرح کروں، ابھی اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھی کہ اس نے کہا۔ ''میں کب سے تمہارا منتظر تھا۔ میں تو تمہیں مختلف علاقوں میں ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم مجھے اس مندر میں مل جاؤ گی۔ خود چل کر پھندے کے پاس آ ؤ گی۔''

میں نے چونک کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی جہاں خباثتیں ہی خباثتیں تھیں۔ وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''سنو بالیکے! میں ہی وہ سدرشن ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔ مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ تم مجھے تباہ کرنے کے خیال سے اس شہر میں آئی ہو، میں نے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ تم کسی کونے کھدرے میں چھپی میری تباہی کا انتظام کر رہی ہوگی، اسی لیے میں جاپ کرنے بیٹھ گیا تھا کہ نئی شکتی کے ساتھ تم سے مقابلہ کروں۔'' اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' کہہ کر میں نے ورد کرنا شروع کیا مگر یہ کیا، میرا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ ایک لفظ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ذہن سادہ کاغذ بن گیا ہے۔ کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس پر اس بدمعاش کی زہر افشانی! وہ کہہ رہا تھا۔ ''شکتی پراپت (قوت حاصل) کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ پھر شکتی پراپت ہو جائے تو اسے سنبھالے رکھنا بھی اتنا ہی مشکل ہے۔'' وہ انتہائی تحقیر کے انداز سے مخاطب تھا۔ اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھے نرکھ (جہنم) میں جھونکنے کا ارادہ کیا ہے ناں! اب مجھے میرا انجام دکھاؤ! کوئی شکتی شالی (قوی) وظیفہ پڑھو! بلاؤ اپنے مؤکل کو! انہیں حکم دو کہ وہ مجھے جلا کر بھسم کر دیں! میرا ناش کر دیں!''

اس کی نفرت انگیز باتیں ناقابلِ برداشت تھیں لیکن کیا کرتی کہ میرے ہمراہ میری بے سروسامانی تھی۔ میری قوت صفر رہ گئی تھی!

''بالیکے! تم نے بہت کھیل لیا! تمہارے دن پورے ہو چکے ہیں۔ سمے بیت چکا ہے۔ اب اپنی قید کی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ! معافی کا دو چار دل میں نہ لانا۔ میں شما (معافی کا) قائل نہیں ہوں!'' وہ غرور کے ساتھ ایک ایک لفظ ادا کر رہا تھا۔

میں سمجھ گئی تھی کہ اب میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ میں پوری طرح اس کے قبضے میں ہوں۔ آج میری آزادی کا آخری دن ہے۔ مبہم حسرتوں اور موہوم آرزوؤں کے ساتھ میں نے فقیر بابا کو یاد کیا۔ شاید کوئی معجزہ رُونما ہو جائے، اسی امید پر انہیں پکار رہی تھی۔

''کیوں وقت برباد کر رہی ہے؟ کوئی بھی طاقت تجھے اب بچا نہیں سکتی ہے۔ بلا لے اپنے گرو کو تا کہ وہ بھی میری شکتی کو دیکھ لے۔ میرے دھرم کی سچائی کو جان لے۔''

بس یہی موقع تھا کہ میں نے فقیر بابا کو دل سے پکار لیا اور پھر واقعی معجزہ سا رونما ہو گیا۔ فقیر بابا تمام تر تمکنت، تمام تر وقار اور جاہ و جلال کے ساتھ لکڑی ٹیکتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔ اُن کی آنکھیں جلال سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ نہیں سکا تھا کیونکہ اُن کی طرف اُس کی پشت تھی۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ اب بالکل قریب آ چکے تھے۔ اتنے قریب کہ ان کے آنے کی آہٹ اس نے بھی محسوس کر لی اور وہ کسی چیتے کی طرح مڑ گیا تھا۔ اپنے سامنے فقیر بابا کو کھڑے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ ایک ثانیے کے لیے اُس کا چہرہ متغیر ہوا پھر اُس نے فوراً خود پر قابو پا لیا اور فقیر بابا سے سرد اور تند لہجے میں مخاطب ہوا۔

''تم......تم کہاں سے آ گئے؟'' اس نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

''جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی طاقتور اپنے زعم میں کسی کمزور کو دبا رہا ہے تو مجھے آنا پڑتا ہے کیونکہ صحیح معنوں میں طاقتور وہی ہے جو اپنے سے کمزور کو معاف کر دے۔ ہر دھرم یہی بتاتا ہے۔'' فقیر بابا بولے۔

''مجھے اُپدیش (ہدایت) نہ دو! میرے پاس گیان (علم) کا بھنڈار (خزانہ) ہے۔'' اس نے حقارت سے کہا۔

''یہ ہے تیری اوقات کہ تُو خود کو بہت بڑا، بہت قوی سمجھنے لگا ہے جبکہ تیری اوقات دودھ میں گری مکھی کی سی ہے جو پر رکھتے ہوئے بھی اڑنے سے مجبور ہے! اگر تجھ میں حوصلہ ہے تو مجھ پر حملہ کر کے دیکھ! شاید تُو کامیاب ہو جائے!'' کہہ کر فقیر بابا نے اس کی طرف پھونک ماری۔

قارئین! آپ یقین کریں گے، وہی شخص جو اتنی دیر سے بڑھکیں مار رہا تھا، یکا یک اپنا گھٹنا پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا جیسے اس کے گھٹنوں میں شدید درد اور تکلیف ہے۔ کراہ بار بار سنائی دے رہی تھی۔

''جہنمی! میرا منہ کیا تک رہا ہے! اگر جنتر منتر کچھ یاد ہوں تو انہیں آزما! اپنے بیروں، غلاموں کو آواز دے! کبھی تُو نے یہ بھی سوچا ہے کہ تجھے یہ طاقت کس نے اور کیوں عطا کی ہے؟ ارے احمق! تُو نے طاقت تو حاصل کر لی اور یہ بھول گیا کہ جو قوت فراہم کرتا ہے، وہ اس طاقت کو چھین بھی سکتا ہے!''

اس شخص کی عجیب کیفیت تھی۔ فقیر بابا کے چہرے پر جلال تھا تو اس شخص کے چہرے پر بے بسی! رنگت زرد تھی! ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے بے حد تکلیف ہو رہی ہو۔ فقیر بابا اسی جلال کی کیفیت میں بولے جا رہے تھے۔ ''پنڈت! اگر تُو خود کو بلوان سمجھتا ہے تو اپنے اندر بلوانوں جیسی قوت بھی پیدا کر! انسان اور حیوان میں فرق رہنا ضروری ہے۔ اپنے سے کمزور کو مت للکار! ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا!''

وہ شخص خاموش رہا۔ شاید بولنا نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کے چہرے سے اندرونی کیفیت عیاں تھی۔ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھا جیسے اس کے اندر قیامت برپا ہو!

میں اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ تبھی پورا کمرا تعفن سے بھر گیا۔ ایسا لگا جیسے کسی گٹر کا منہ کھل گیا ہو! فقیر بابا بھی چونک اٹھے تھے۔ میں

نے بدبو کے مخرج کی وجہ دریافت کرنے کے لیے اُدھر دیکھا اور حیرت سے اچھل پڑی۔ ٹھیک اسی جگہ سے جہاں سے سدرشن نکلا تھا، ایک اور شخص نکل رہا تھا۔ وہ انتہائی کریہہ شخص تھا۔ اس کے سر پر محض ایک چٹیا کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی استرا پھیرا گیا ہو! رنگت ایسی کالی تھی جیسے تارکول سے بنا ہوا ہو! باہر آتے ہی اس نے فقیر بابا کو للکارا۔ "بڈھے! اس سے کیا، مجھ سے مقابلہ کر! وہ نادان ہے۔ ابھی اس کی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ میں ہی اس کا استاد ہوں۔ آ مجھ سے مقابلہ کر!"

☆=======☆=======☆

مندر کا وہ حصہ تعفن سے بھرا اٹھا تھا۔ بدبو سے دل مالش کرنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کھایا پیا اُلٹ رہا ہے۔ حلق میں چلا آ رہا ہے اور کسی بھی وقت متلی ہو جائے گی کیونکہ دم بدم بدبو بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ بدبو وہاں سے اُٹھ رہی تھی۔ جہاں سے کچھ دیر پہلے سدرشن نکلا تھا۔

جہاں سے سدرشن نکلا تھا، وہ مورتی کے نیچے بنا تہہ خانے کا خفیہ راستہ تھا۔ اسی راستے سے وہ کریہہ الصورت بڈھا نکل رہا تھا۔ تہہ خانے کی پہلی سیڑھی پر وہ کھڑا تھا اور اب تب میں باہر نکلنے والا تھا۔ اس شخص کا چہرہ حد سے زیادہ کریہہ تھا۔ رنگت تو اتنی کالی تھی جیسے کسی نے توا اُلٹ دیا ہو اس کی ناک بالکل کسی طوطے کی چونچ جیسی تھی اور آنکھوں میں غصے کی جھلک تھی۔ بالکل سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں حد درجہ گول تھیں جن میں تیز چمک تھی۔ اس کی نظریں فقیر بابا پر ٹکی ہوئی تھیں۔

وہ ایک سیڑھی اور اوپر آیا پھر اس نے فقیر بابا کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اے! اگر ہمت ہے تو مجھ سے مقابلہ کر۔ سدرشن تو ابھی بچہ ہے۔ اسے کالے علم کی صرف ابجد معلوم ہے۔ ابھی وہ سیکھ رہا ہے اور اسے میں ہی سکھا رہا ہوں۔''

فقیر بابا اسی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور نپے تلے قدم اُٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں سے کھا جائیں گے۔ اس سیاہ چہرے والے نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''میری طرف بڑھنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے۔ میں تجھے موت کے منہ میں دھکیلنے والا ہوں۔''

''تیرے اندر کتنی قوت ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' فقیر بابا نے کہا تھا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا پھر ایسا لگا جیسے اس کا سراپا آگ کی طرح دہکنے لگا ہو۔ اس کی گول گول آنکھیں مزید بڑی ہو گئی تھیں اور ان میں شعلے سے لپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی ناک کسی گوریلے کی طرح پچکی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مزید پھیلی ہوئی لگ رہی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹ دائیں بائیں کھنچے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کی خوفناکی سوا ہو گئی تھی۔ جبڑے بھی تنے ہوئے تھے جن سے بدنما دانت جھانکنے لگے تھے۔

وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''تجھے میں تیری اوقات بتا کر ہی رہوں گا۔''

''پہلے اپنی خیر منا میں تیرے لیے موت کا ہرکارہ بن کر آیا ہوں۔ تجھے موت دے کر ہی جاؤں گا۔''

''تُو مجھے مارے گا۔ واہ...... بھئی واہ مرغی بھی لگی اچھلنے مرغے کے برابر۔ لے میری ہلکی سی جھلک تُو بھی دیکھ لے۔'' کہہ کر وہ اپنا قد لمبا کرتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنا لمبا ہو گیا کہ اس کا سر چھت سے ٹکرانے لگا۔ میں حیرت زدہ سی کھڑی تھی کہ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''تُو اس کا مددگار ہے ناں اب اسے بچالے۔ اگر بچا سکتا ہے مگر کیسے بچائے گا؟''

''اللہ کی حمایت و نصرت سے۔'' فقیر بابا بولے اور ایک قدم آگے بڑھے۔

''تیرے دو ہاتھ ہیں اور میرے دیکھ۔'' کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے لیکن یہ کیا؟ میں حیرت کے مارے چیخ اُٹھی کیونکہ عقل سے ماورا بات تھی۔ اس کے مزید دو بازو اُگ آئے یعنی اس کے چار بازو ہو گئے تھے۔ وہ چاروں ہاتھوں کو ہلاتا ہوا آگے بڑھا۔ ''ایک ہاتھ سے ایک ٹانگ پکڑوں گا۔ دوسرے ہاتھ سے دوسری پھر دونوں ٹانگوں کو چیر دوں گا۔''

''تُو میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' فقیر بابا نے بے خوفی سے جواب دیا اور مزید آگے بڑھ آئے۔ اب دونوں کے درمیان کا فاصلہ گھٹ کر بالکل کم ہو گیا تھا۔ تبھی اس نے اپنے لمبے بازو اُٹھا کر فقیر بابا کے گلے کو پکڑنا چاہا تھا کہ میرا دھڑکتا ہوا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ وہ آگے بڑھا ضرور تھا مگر عجب انداز سے درمیان میں رُک گیا تھا بلکہ لڑکھڑا گیا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا گیا ہو، اس نے دوبارہ کوشش کی اور پھر اسی طرح سے لڑکھڑا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے آگے ٹرانسپیرنٹ دیوار آ گئی ہو جو اسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔

تیسری بار جب وہ پھر لڑکھڑایا تو سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے کچھ پڑھا اور پھونک ماری۔

پھونک مارتے ہی چیخنے کی آواز ابھری اور پھر اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اندھوں کی طرح ہوا میں ٹٹولا۔ شاید اب وہ دیوار نہیں تھی اسی لیے وہ دو قدم آگے آ گیا مگر عجب انداز سے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے نشے میں چُور ہو، وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھا پھر اس نے منہ کھول دیا۔

اس نے جیسے ہی منہ کھولا، مجھے ایسا لگا جیسے آگ سے دہکتی ہوئی بھٹی کا منہ کھل گیا ہو۔ اس کے منہ سے لپلپاتے ہوئے شعلے نکلنے لگے تھے۔

وہ شعلے مرغولوں میں ڈھلے اور فقیر بابا کے گرد پھیل گئے۔ شعلوں کی تپش مجھ تک پہنچ رہی تھی مگر فقیر بابا ایسے کھڑے تھے جیسے بارش کی بوچھاڑ میں سرتاپا شرابور ہو کر مزے لے رہے ہوں۔

''یہ ہے میری قوت! مجھ سے ٹکرانے آئے تھے ناں، اب کباب بننے کا لطف لو۔'' پتا نہیں یہ لفظ اس کالے کلوٹے سادھو کے تھے یا کسی اور کے، مگر میں خوف سے گنگ رہ گئی تھی۔ مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ فقیر بابا اس وار سے بچ نہیں پائیں گے کیونکہ اب وہ آگ کے شعلوں میں اس طرح سے گھر چکے تھے کہ باہر سے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔ اس وقت مجھے جتنی بھی آیتیں یاد تھیں، میں انہیں دہرانے لگی۔ پتا نہیں یہ میری وجہ سے ہوا تھا یا بابا جی کی قوت تھی کہ فقیر بابا نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی تھی اور کلوٹے کے سر پر جا پہنچے تھے پھر انہوں نے اس کی لمبی چٹیا کو پکڑ کر جھٹکا دیا تھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے تھے۔ ''بیٹی! سورۃ اخلاص پڑھ کر پھونک مارو۔''

میں نے جلدی جلدی وہی کچھ پڑھا تھا اور اس کلوٹے کی طرف منہ کر کے پھونک ماری تھی اور پھر ایک حیرت انگیز منظر نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر یہ سچ ہے کہ میرے پھونک مارتے ہی ایک کڑاکا سا ہوا تھا بالکل ایسے جیسے بجلی سی چمکی ہو۔ کڑاکے کی آواز معدوم ہوتے ہی سینکڑوں قسم کی ہولناک آوازوں سے مندر گونج اُٹھا تھا۔

ٹھیک اسی لمحے کئی سیاہ چمگادڑوں نے ایک جیسی ہیبت ناک آوازیں نکالتے ہوئے ہم پر غوطہ لگایا۔ یہ چمگادڑیں پتا نہیں کہاں سے آ گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان کے منہ کھلے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے اور ان کی خون کی طرح سرخ زبانیں سانپ کی طرح منہ سے اندر باہر ہو رہی تھیں۔

بے ساختہ غیر ارادی طور پر میں کسی ماہر غوطہ خور کی طرح سینے کے بل سخت اور کھردری زمین پر لیٹ گئی۔ فقیر بابا اکڑوں بیٹھ چکے تھے اور لٹو کی طرح تیزی سے چمگادڑوں پر اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کو مار رہے تھے۔ کوئی دائیں گر رہی تھی کوئی بائیں، ایک عجیب شور و غوغا مچ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے قیامت کا سماں ہو۔ ڈنڈے سے ٹکراتے ہی چمگادڑوں کے بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور وہ پل بھر میں جل کر خاک ہو جاتیں۔ کچھ

دیر میں احساس ہو گیا کہ چمگادڑوں کی تعداد کم ہونے لگی ہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آ گیا جب ایک بھی چمگادڑ نہ بچی لیکن فقیر بابا کا ڈنڈا اب بھی پھرکی کی طرح گول گول گھوم رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں یہ کھیل ختم ہو گیا اور وہ رُک گئے پھر آہستہ آہستہ کچھ پڑھتے ہوئے اس کلوٹے کی طرف بڑھے۔ پھر انہوں نے اپنی لاٹھی کو بلند کیا اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ لاٹھی گویا تلوار بن گئی تھی۔ ضرب پڑتے ہی اس کا سر بیچ سے دو آدھا ہو گیا اور خون کا فوارہ سا اُبل پڑا تھا۔ سر سے اُبلنے والا خون اس کے جسم پر پرنالے کی طرح بہنے لگا تھا پھر ایک حیرت ناک بات نظر آئی۔ وہ کلوٹا یک لخت غائب ہو گیا مگر اگلے ہی پل اس کی جگہ ایک دوسرا کلوٹا کھڑا تھا جو زخمی بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں ایک گنڈاسا پکڑ رکھا تھا۔ وہ اپنے گنڈاسے کو بلند کرتا کہ فقیر بابا نے فوراً لاٹھی گھما دی۔ وہ آنِ واحد میں پہلے کی طرح زخمی ہوا پھر غائب ہو گیا۔

اس طرح کوئی چودہ پندرہ بار کلوٹا مرا اور زندہ ہوا۔ تبھی بابا نے ایک آخری کوشش کے طور پر اُچھال بھری اور عین اس جگہ پہنچ گئے جہاں سرنگ کا دہانہ تھا اور تب میں نے دیکھا کہ اس دہانے میں آدھے دھڑ سے کھڑا کلوٹا انہیں اپنے قریب دیکھ کر تلملا گیا ہے اور اندر کی طرف مڑنے والا تھا مگر فقیر بابا نے اسے مطلق بھاگنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر حملہ کر بیٹھے۔ وار ہوتے ہی ایسا لگا جیسے ہر طرف سے بَین کرتی آوازیں گونجنے لگی ہیں۔ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ بہت تیز آوازیں تھیں۔ پھر اس کلوٹے کے جسم میں خود بخود آگ بھڑک اُٹھی تھی اور وہ سوکھے پتے کی طرح جلنے لگا تھا۔

چند منٹوں میں ماحول اس قدر پُرسکون ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو وہ کلوٹا اپنی جگہ سے غائب تھا۔

میں نے گردن موڑ کر اُدھر دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے سدرشن کھڑا تھا، وہ جگہ بھی اب خالی تھی۔ دونوں ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ تہہ خانے کا راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ مندر کے اس وسیع ہال میں فقیر بابا اور میں کھڑی تھی کہ فقیر بابا بولے۔ ”تیری پکار پر میں وظیفہ مکمل نہ کر سکا اور ادھورا چھوڑ کر آ گیا۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے تاکہ میں اپنے علم کا دریا مزید وسیع کر سکوں۔“

”میں بھی تو یہاں آپ ہی کے حکم سے آئی ہوں۔ شاید آپ کی منشاء یہی ہے کہ میں سونالی کو سدرشن کی قید سے رہا کرا لوں۔“ میں نے کہا۔

”اگر اسے صرف رہا کرانا مقصود ہوتا تو میں کب کا آزاد کرا چکا ہوتا۔ اصل کام تو کچھ اور ہی ہے جو تجھے آگے چل کر معلوم ہو گا۔ فی الحال تو اپنی کوشش جاری رکھ۔ آگے میں تیری رہنمائی کروں گا۔“

”تو کیا میں خود کو سونالی کے گھر تک محدود کر لوں؟“

”میں نے یہ کب کہا ہے؟ تُو اپنی عقل کو آزماتی جا۔ جہاں پر تُو لڑکھڑائے گی میں تجھے سنبھال لوں گا۔“ فقیر بابا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ نہ جانے کہاں سے وہ کلوٹا اور سدرشن پھر آ دھمکے۔ ان کے ساتھ پھر سے چمگادڑوں کا غول تھا۔ اس بار تعداد بھی زیادہ تھی۔ فقیر بابا نے جھپٹ کر حملہ کرتے چمگادڑوں پر ہلہ بول دیا۔ وہ پھر سے لاٹھی گھمانے لگے تھے اور تب ایک قیامت سی مچ گئی۔ طوفان کے زناٹے، بھیڑیوں، کتوں کے رونے کی آوازیں کان کے پردے پھاڑ رہی تھیں لیکن فقیر بابا پر اس کا اثر محسوس نہیں ہو رہا تھا جبکہ وہ آوازیں میرے دل و دماغ پر دھماکے سے بجا رہی تھیں۔ تبھی فقیر بابا جو اپنی لاٹھی سے مقابلہ کر رہے تھے، یکا یک انہوں نے رُک کر کچھ پڑھا پھر پھونک ماری۔ پھونک مارنا تھی کہ ایک عجیب تماشا ہوا۔

حیرت ناک خاموشی چھاگئی۔ ایسی خاموشی کہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خاموشی سمٹ کر میرے اندر دل بن گئی ہے۔ دھک دھک کی ساعت شکن گونج بن گئی ہے۔ چمگادڑیں غائب ہوگئیں۔ کلوٹا بھی تھک کر بیٹھ گیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں غصے کی جھلک ہنوز باقی تھی۔

میں نے کلوٹے کو مخاطب کیا۔ ''ہوگئی اکڑفوں رخصت مان گئے ناں اپنی شکست۔''

''جنگ میں فتح وشکست عام سی بات ہے۔ ابھی تم لوگ بھاری پڑ رہے ہو، کچھ دیر میں میدان میرے ہاتھ میں ہوگا۔ میرا ابھی کوئی حربہ کامیاب ٹھہرے گا۔'' کلوٹے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

''اوئے......شیطان ابن شیطان! بک بک نہ کر ورنہ تیری موت یقینی ہے۔'' فقیر بابا رسان سے بولے۔

اس کلوٹے نے زمین پر اِدھر اُدھر بکھری پڑی چمگادڑوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''مترو! اس مُسلے کو گھیر لو۔ جانے نہ پائے ورنہ اس مندر پر سے لوگوں کا وشواس ختم ہو جائے گا۔''

اس کا اتنا کہنا تھا کہ دم توڑتی چمگادڑوں نے اُچھال بھری اور ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں۔ اس طرح باہم گڈمڈ ہوگئی تھیں کہ انہیں الگ کرنا دشوار تھا پھر وہ سب اس طرح سے ایک دوسرے میں پھنس گئیں کہ وہ اونٹ جیسا جانور نظر آنے لگیں۔ یقین کریں، وہ سب مل کر واقعی ایک عجیب الخلقت جانور بن گئی تھیں پھر وہ جانور اپنے لمبے لمبے پیروں کو اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی کم سے کم دس ٹانگیں ہیں جن کے سہارے وہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی ٹانگیں تو زمین پر تھیں مگر ڈیڑھ دو فٹ ابھرا ہوا جسم چھت کو چھو رہا تھا۔

اس کی رنگت شعلوں جیسی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنی ٹانگیں ہوا میں اُٹھائیں اور تیز سیٹی جیسی آواز نکالتا ہوا فضا میں معلق اژدھے کی طرح لہراتے ہوئے فقیر بابا کی طرف بڑھا۔

باباجی نے بغیر کسی تاخیر کے اپنا ڈنڈا گھما دیا۔ ڈنڈے سے سر پھٹتا ہے مگر کٹتا نہیں ہے لیکن وہاں معاملہ اُلٹا تھا۔ وہ بیچ سے کٹتا چلا گیا تھا جیسے وہ لاٹھی نہ ہو، تلوار ہو لیکن یہ کیا؟ جیسے ہی درمیان سے کٹے ہوئے دونوں جسم زمین پر گرے، اس جگہ ایک دوسرے جانور نے لے لی۔ وہ جسامت میں ارنے بھینسے جیسا تھا۔ وہ پھوں پھوں کرتا ہوا فقیر بابا کی طرف بڑھا۔

ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر فقیر بابا نے اپنی لاٹھی گھمادی۔ عام حالات میں جو بات ناممکن نظر آتی ہے، وہی بات جب کوئی اپنی نظروں سے دیکھ لیتا ہے تو اسے ناقابلِ فہم یا پُراسرار کہہ کر نظریں چرا لیتا ہے۔ علم سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے مگر وہ بھی روحانی معراج کی گتھی سلجھا نہ سکی ہے۔ صرف حیران ہو کر نظریں چرا لیتی ہے۔ میں بھی نظریں چرا رہی تھی۔ وجہ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی کہ معمولی سی لاٹھی جو لہراتے سانپ کی شکل ایسی تھی، وہ کیسے تلوار کا کام کر رہی تھی؟

باباجی کی لاٹھی اس پُراسرار جانور کے پیروں پر لگی اور اس کے سامنے والے دونوں پیر کٹ کر دور جا گرے اور ایسی آوازیں اُبھریں جیسے بھونچال آگیا ہو۔ زلزلہ آگیا ہو اور یہ آوازیں دیگر تمام آوازوں پر بھاری ثابت ہوئی تھیں پھر وہ پُراسرار جانور اس طرح بلند ہوا جیسے گیس بھرا غبارہ ہو۔ وہ نہایت تیزی سے فقیر بابا کی طرف لپکا تھا۔

فقیر بابا کے جسم میں گویا بجلی سی بھر گئی تھی۔ انہوں نے بڑی تیزی سے سے لاٹھی گھمانا شروع کر دی تھی۔ ان کی وہ پُراسرار لاٹھی تلوار ہی کی طرح زخم لگا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جانور اپنے ہی خون میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس قدر شور و غل مچا رہا تھا کہ کان پڑی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تبھی بابا جی نے دونوں ہاتھ میں لاٹھی کو پکڑا اور پوری قوت سے اس جانور کے سر پر دے ماری۔ وہ ڈکراتا ہوا زمین پر گر گیا اور اس طرح سے تڑپنے لگا جیسے جانکنی کے عالم میں ہو۔ کچھ دیر تک پچھاڑیں کھانے کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔ ساکت ہونے کے عالم میں اس کی ہیئت بدلنے لگی اور وہ پھر سے اسی کلوٹے کی شکل میں آ گیا اور وہ کلوٹا لنگڑاتا ہوا تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ راستہ دوبارہ کھل گیا اور وہ اس راستے سے نیچے اُتر گیا۔

اس افتاد سے نجات پا کر فقیر بابا بولے۔ ''بیٹی! اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے نکل چلو۔''

فقیر بابا جتنی عقل مند میں نہ تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ علم رکھتے تھے اس لیے میں نے ان کا کہا مان لیا کہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

مندر سے باہر آتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''بابا! ابھی تک آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مجھے کرنا کیا ہے؟ کیا اسی طرح میں کالے علم والوں سے ٹکراتی رہوں گی۔''

''ہر کام کا ایک وقت معین ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے جس کے لیے میں نے تمہیں منتخب کیا ہے۔ فی الحال سونالی کے گھر میں آرام سے رہو۔ جب وقت قریب ہوگا، تو میں خود تمہیں بتا دوں گا۔''

مندر سے نکل کر ہم سڑک پر آ گئے۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے فقیر بابا کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے چل رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''بابا! آپ ناراض ہیں ناں؟''

''نہیں بیٹی! میں پریشان ہوں۔ میرا چلہ ابھی پورا نہیں ہوا ہے اس لیے مجھے لوٹ کر جانا پڑے گا۔ تُو یہاں اکیلی رہ جائے گی۔ میں نے چاہا تھا کہ تُو اس کتاب سے ایک کے بعد ایک عملیات سیکھتی رہے گی۔ اس طرح تُو کچھ سیکھ بھی لے گی اور وقت بھی گزر جائے گا مگر تُو نے اُلٹا کیا۔ خواہ مخواہ سدرشن کے گرو کو چھیڑ دیا۔ اب کسی بھی لمحے وہ اُلٹ کر تجھ پر بھی وار کرے گا۔''

''مگر وہ تو جل کر مر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ تیری بھول ہے۔ سدرشن اور اس کا گرو مندر کے اندر بنے تہہ خانے میں بیٹھے ہیں۔ سدرشن جسم کے ساتھ آیا تھا مگر اس کا گرو وہیں بیٹھا رہا تھا۔ جس نے مجھ سے مقابلہ کیا تھا، وہ اس کی پرچھائیں تھی۔ بس یوں سمجھ لو، اس نے اپنے ''دوت'' کو اپنی شکل میں بھیجا تھا۔ یہ کالا علم کرنے والے ایسی ایسی باتیں کر دکھاتے ہیں جس پر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ نظر جو کچھ آتا ہے، وہ نہیں ہوتا۔''

''تو کیا ہم نظر بندی کا شکار ہو گئے ہیں؟''

''اسے نظر بندی نہیں، جادو کہتے ہیں۔ سحر و ساحری بڑی بُری چیز ہے۔ اس کی ''تھاہ'' کہاں ہے، کسی کو نہیں پتا۔ روحانیت کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ اگر سیدھے راستے پر چلو تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ملے اور بھٹک گئے تو شیطان کی پناہ میں چلے گئے۔''

''ہاں...... اس کا احساس تو مجھے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھا تو اللہ ملا، اسی کلام کو اُلٹا پڑھا تو عذاب کا مستحق بننے کے لیے شیطان کی پناہ

میں انسان چلا جاتا ہے۔ سامری نے کیا کیا تھا؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے قدموں کی خاک پیتل کے بچھڑے میں ڈال دی تھی تو وہ بولنے لگا تھا یعنی قوتِ الٰہی کو غلط رُخ پر لے گیا تھا۔''

باتوں کے دوران راستے کی طوالت کا مطلق احساس نہ ہوا اور ہم سونالی کے محلے میں پہنچ گئے۔ محلے کے قریب پہنچ کر فقیر بابا نے کہا۔

''بیٹی! تم جاؤ مگر ہوشیار رہنا۔ کوشش کرنا کہ مندر کی طرف نہ جانا پڑے۔''

''جی اچھا۔'' کہہ کر میں سونالی کے مکان کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ احاطے کی دیوار کے پاس پہنچ کر میں نے سر گھما کر دیکھا۔ فقیر بابا غائب ہو چکے تھے۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی احاطے کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر پہنچتے ہی میری نظر پتول پر پڑی۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے پتول؟ یہاں کیوں کھڑی ہو؟''

''بس کیا بتاؤں آپ نے پریشان کر دیا ہے۔ اتنی دیر سے آپ غائب تھیں۔ فکر تو ہونا ہی تھا۔''

میں نے آگے بڑھ کر اسے پیار سے چپت لگائی اور بولی۔ ''بیوقوف لڑکی! اب میں وہ پہلے والی سونالی نہیں ہوں۔ کوئی میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ جو بھی مقابلے پر آئے گا، منہ کی کھائے گا۔''

''چاچی کی خبر ہے، وہ سب سے کیا کیا کہتی پھر رہی ہیں؟''

''کیا کہہ رہی ہیں؟''

''کہہ رہی ہیں کہ سونالی نے کالا علم سیکھ لیا ہے۔ کافر ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں ناں کہ جادو برحق ہے۔ ہمارے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جادو کیا گیا تھا۔ اسی لیے سورۃ الناس نازل ہوئی تھی مگر جادو کرنے والا کافر ہے۔ اس کے ساتھ کھانا پینا حرام ہے۔ ان کی باتیں سن سن کر مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں محلے والے آپ کے دشمن نہ ہو جائیں۔''

''بس میں تیری شادی کرا دوں، پھر دیکھنا، میں ان لوگوں سے کیسے بدلہ لیتی ہوں۔''

''نہیں آپا! ایسا نہ سوچیں۔ بدلہ لینے سے بہتر ہے، معاف کر دینا۔''

''اگر تم یہی چاہتی ہو تو یہی ہو گا۔ یوں بھی چاچی بوڑھی عورت ہیں۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہیں۔ آج مریں کہ کل۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہاں......ہاں......میری موت کی دعائیں مانگو منتر پڑھو۔ مگر یہ مت بھولنا میں نماز پڑھتی ہوں۔ مجھ پر جادو منتر اثر نہیں کرے گا۔'' چاچی پتا نہیں کب سے دروازے کے پیچھے کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں چیختی ہوئی نکل آئی تھیں۔ میں نے تلملا کر سخت جواب دینا چاہا تھا مگر پتول نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے چپ کرا دیا۔ میں خاموشی سے دروازہ پار کر کے آنگن میں چلی آئی اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر کے بعد پتول بھی آ گئی۔

اس نے لالٹین کی لو تیز کی اور میرے بستر پر آ کر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ''آپا! آپ چاچی کی باتوں کا بُرا نہ مانا کریں۔ ان کی تو عادت ہے۔''

''بیوقوف لڑکی! میں ان کی باتوں کا بُرا کب مناتی ہوں اگر بُرا مناتی تو وہ اب تک اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکتیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''انور امامی کی کوئی خبر ملی؟ اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ابھی تک تو ادھر جا نہیں سکی ہوں۔ ان شاء اللہ کل جاؤں گی۔''

''ارے ہاں...... میں یہ بتانا بھول گئی کہ آج لطف الرحمٰن ماما کا ٹیلی گرام آیا ہے۔ ان کی دونوں بیٹیاں چٹا گانگ آ رہی ہیں۔''

''یہ لطف الرحمٰن ہیں کون؟ حدود اربعہ بتا دو۔ تمہیں تو معلوم ہے، آج کل میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔''

''اے لو آپ لطف الرحمٰن ماما کو بھول گئیں۔ اماں کے چچا زاد ہیں۔ ان کی دو ہی بیٹیاں ہیں۔ بڑی لاڈلی ہیں۔''

''اچھا...... اچھا...... تو کب آ رہی ہیں؟''

''ٹیلی گرام میں لکھا ہے کہ کل تک پہنچ جائیں گی۔''

''کل جب وہ آ جائیں تو تعارف احتیاط سے کرانا تاکہ انہیں شک بھی نہ ہو اور میں سب کو پہچان بھی لوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اب آپ سو جایئے۔ میں جا رہی ہوں۔'' کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

آسمان پر سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ برسات اور بنگال لازم و ملزوم ہیں۔ زیادہ تر لوگ اس موسم کو پسند نہیں کرتے ہیں مگر مجھے یہ موسم بہت پسند ہے اسی لیے میں بستر سے اُٹھ کر کھڑکی سے لگ کر بیٹھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا، برسات کی بھیگی ہوا مجھے گدگدا رہی تھی کہ سلمٰی بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ آنگن میں کھڑی آوازیں دے رہی تھیں۔ مجھے پکار رہی تھیں۔

''کیا ہے بھابی؟'' میں نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مہمان آئے ہیں۔ آ کر مل لو۔'' میں سمجھ گئی کہ لطف الرحمٰن ماما کی بیٹیاں آ گئی ہیں۔ اب مجھے بتول کا انتظار تھا مگر وہ اب تک مجھے لینے نہیں آئی تھی۔ میں پریشان ہو اُٹھی۔ کسی دوسرے کا رول کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا مجھے اچھی طرح پتا لگ گیا تھا۔ صرف چہرے کی مماثلت کچھ نہیں ہوتی۔

''بھابی! انہیں یہیں لے آئیں ناں باہر پھوار بھی پڑ رہی ہے۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ چاچی کا طنز سنائی دیا۔

''غرور بیٹی! باہر کیوں آئے گی؟ پوری دنیا اس کی غلام ہے ناں سب جا کر اس کے حضور سلام کرو۔''

میرا جی جل کر رہ گیا مگر میں کچھ بولی نہیں۔ چاچی کے رویے نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ غصے کو ضبط کرنا کتنا مشکل ہے اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ اصل بہادر وہ ہے جو غصے کو پی جائے میرے پاس طاقت تھی۔ میں جب چاہتی انہیں چیونٹی کی طرح مسل سکتی تھی پھر بھی طرح دے رہی تھی۔ خود ہی اُٹھ کر باہر آ گئی۔ برآمدے میں بچھی بید کی کرسیوں پر دو نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لباس کی تراش و خراش بتا رہی تھی کہ دونوں ہی فیشن پرست ہیں۔ صورت شکل کی بھی بُری نہ تھیں۔ دونوں نے مسکرا کر سلام کیا پھر خیریت پوچھی۔ میں نے جواب دیا اور ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

بھابی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم انہیں کمپنی دو، تب تک میں کچھ پکا لوں۔ راستے میں انہوں نے کیا کھایا ہوگا۔ چربی میں تلے ہوئے قیمہ بھرے پراٹھے یا اُبلے ہوئے انڈے اس کے علاوہ اسٹیشنوں پر اور ملتا ہی کیا ہے۔''

''ارے نہیں بھابی! میں ''گرین ایریو'' سے آئی ہوں۔ اس گاڑی کے ساتھ پینٹری کار بھی چلتی ہے۔'' ان میں سے ایک بولی۔

''آں! ریل کے ساتھ کار بھی چلتی ہے؟'' بھابی نے تعجب سے پوچھا۔

''ارے نہیں بھابی! پینٹری کار اس ڈبے کو کہتے ہیں جس میں باورچی خانہ بھی ہوتا ہے۔ میں نے ڈائننگ کار میں پیٹ بھر کر کھایا ہے۔ ہاں یہ رضیہ روزے سے رہی یعنی کچھ بھی کھانے سے انکار کرتی رہی۔''

میں نے نظر اُٹھا کر رضیہ کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس سے چھوٹی تھی مگر حُسن میں بڑی کو مات دے رہی تھی۔ رضیہ نے بھی میری طرف اشتیاق سے دیکھا پھر کہا۔ ''آپا! آپ کی شہرت ڈھاکا تک پہنچ گئی ہے اسی لیے ہم ضد کر کے آئے ہیں تا کہ پتا لگا سکیں کہ کیا واقعی آپ نے جادو منتر سیکھ رکھا ہے یا لوگ جھوٹ موٹ کہانیاں گھڑ رہے ہیں۔''

''چھوڑو ان باتوں کو، لوگوں کا کیا ہے، یونہی سب رائی کا پہاڑ بنا رہے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ ڈھاکا میں کہاں رہتی ہو؟''

''آں..... اتنی جلدی بھول گئیں؟ دو سال پہلے ہی تو آپ ہمارے ہاں آئی تھیں۔ ارے بھئی ہم لوگ دھان منڈی میں رہتے ہیں۔'' رضیہ نے جواب دیا۔

علاقے کا نام سنتے ہی میں سمجھ گئی کہ یہ لوگ بہت زیادہ امیر ہیں اس لیے کہ وہ علاقہ صرف امراء کے لیے مختص ہے۔ غرباء تو ادھر کا رُخ بھی نہیں کرتے۔ یوں بھی بنگال میں طبقاتی فرق بہت زیادہ ہے۔

''مشغل کیا ہیں یعنی کیا کر رہی ہو؟''

''اے لو۔ آپ کا دماغ ہے کہاں؟ ارے بھئی میں ڈھاکا میڈیکل کالج ہسپتال میں ایم بی بی ایس کر رہی ہوں اور آپا صوفیہ ایم اے کر رہی ہیں۔''

ذرا سی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں بہت جلد فری ہو جانے والی ہیں پھر بقول ان کے، سونالی ان کے ہاں جا کر رہتی بھی تھی اس لیے میں بھی بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''اور یہ بتاؤ یہاں ایک ڈیڑھ ماہ تو رہو گی ناں؟''

''ناں بابا! اتنے دن ہم کیسے رہ سکتے ہیں؟ صرف ایک ہفتے کے لیے آئے ہیں اس لیے آپ کو ایک کام کرنا پڑے گا۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں رانگامائی لے کر چلنا ہوگا۔''

''رانگامائی؟ میرا مطلب ہے وہاں اکیلے؟''

''بھئی اکیلے کا کیا مطلب ہے؟ ہم آدمی ہیں بھئی۔''

''آدمی نہیں، لڑکیاں کہو، ایسے سفر میں گھر والوں کا ساتھ ضروری ہے۔''

''گھر والوں کے ساتھ کیا خاک مزہ آئے گا، یہ بڈھے بڑھیاں ٹوک ٹوک کر زندگی جہنم بنا دیتے ہیں پھر پکنک کا مزہ کہاں رہتا ہے؟''

''نہیں رضیہ! مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لڑکیاں اکیلی رانگا ماٹی جائیں اور ہوٹلوں میں ٹھہریں کیونکہ تین گھنٹے جانے اور تین گھنٹے آنے میں صرف ہوتے ہیں۔''

''تو پھر کیا تفریح کریں؟ ہم لوگ چھٹیاں گزارنے ہلہ گلہ کرنے آئے ہیں۔ گھر میں بیٹھ کر بور ہونے نہیں آئے ہیں۔''

''اگر سیر و تفریح ہی کرنا مقصود ہے تو چٹا گام بھی بُری جگہ نہیں ہے۔ اس شہر کے تین نام ہیں چٹا گام، چٹا گانگ اور چٹا گاؤں! کچھ لوگ چوٹو گام بھی کہتے ہیں۔ اس کے جتنے نام ہیں، اتنا ہی یہاں مزہ ہے۔ یہاں سمندر کی بپھرتی موجیں ہیں۔ بڑے بڑے دیو پیکر جہاز ہیں جو یورپ تک لوگوں کو لے جاتے ہیں۔''

''حالی شہر ہے۔ وارلیس کالونی ہے۔ صدر روڈ ہے اور...... اور.....'' رضیہ نے پُر مزاح انداز میں کہنا شروع کیا تھا کہ صوفیہ نے اسے روک دیا اور بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے، آپ ہی کوئی جگہ بتائیں۔''

''میں تو گئی نہیں ہوں مگر سنتی ہوں کہ جلال بازار تفریح کے لیے اچھی جگہ ہے۔ وہاں پکنک منانے اور سیر کرنے کا اپنا لطف ہے۔''

''تو پھر وہیں چلیئے۔'' رضیہ سر ہو گئی۔

میں عجیب مشکل میں پھنس گئی تھی۔ مشورہ میں نے دے دیا تھا اس لیے انکار ممکن نہیں تھا حالانکہ مجھے سیر سپاٹے کا زیادہ شوق نہیں تھا پھر الجھنیں اتنی تھیں کہ ان سب فضول باتوں کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ یہاں ہر طرف دشمن بکھرے تھے۔ کسی بھی وقت کوئی بھی حملہ کر سکتا تھا۔ بقول پیر بابا کے کہ سدرشن کا گرو تاک میں ہے مگر ضد کی وجہ سے مجبور ہو گئی۔

اتوار چھٹی کا دن تھا اس لیے اسی روز کا انتخاب کیا۔ سواری کے لیے واکس ویگن کرائے پر لی گئی کیونکہ ان دنوں یہی آرام دہ سواری ہوتی تھی۔ بس اتنی آرام دہ نہیں ہوتی تھی پھر ہم تعداد میں بھی کم تھے۔ بتول، میں، رضیہ اور اس کی بہن کے علاوہ سلیم بھائی اور یاسمین بھابی کو ساتھ لے لیا تھا۔

ہم سب جلال بازار پہنچے۔ وہاں کے ساحل پر ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ موسم خوشگوار تھا۔ ہم سب اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ واکس ویگن سے سامان اُتار کر دریاں وغیرہ پھیلانے کی ڈیوٹی سلیم بھائی کی تھی۔

بچے ریت پر دوڑنے لگے۔ ہواؤں میں بھی اور خنکی آ گئی تھی۔ ہم سب مزے سے ریت پر گھوم رہے تھے کہ مزہ کر کرا ہو گیا۔ بادلوں نے زور باندھا اور بارش شروع ہو گئی۔

ہم چاروں لڑکیاں واپسی کے لیے مڑے۔ بوندوں کی تیز بوچھاڑ میں ہمارے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا تو وہاں جگہ خالی تھی۔ بھائی اور بھابی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ بچے بھی غائب تھے۔ رضیہ کا گھبراہٹ کے مارے بُرا حال تھا۔ اس پر دہشت سی سوار تھی۔ ہر سمت کھلا ہوا علاقہ سمندر کا کنارا اور طوفانی بارش پھر بھی میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہوں؟'' میں نے بارش کی بوچھاڑ سے اپنا چہرہ بچاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' رضیہ کانپتی آواز میں بولی۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہی جگہ ہے۔''

''تمہیں کوئی نشانی یاد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نشانی یادرکھنے کی ضرورت کیا تھی پھر میرا ذہن اتنا بودا بھی نہیں ہے کہ میں اتنی جلدی یہ جگہ بھول جاؤں۔''

''ٹھیک ہے، پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہی وہ جگہ ہے؟ یہاں تو ہر جگہ ایک سی لگتی ہے۔ دور دور تک پھیلا یہ ساحل، شاید کبھی یہاں ہفتہ واری بازار بھی لگا کرتا ہوگا مگر اب تو فقط ساحل رہ گیا ہے۔''

''ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟'' رضیہ کی حالت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔

''ٹھہرو، دیکھتی ہوں۔ سب سے پہلے تو ہمیں پناہ کے لیے کوئی جگہ دیکھنی ہوگی۔ آؤ میرے ساتھ۔'' کہہ کر میں نے قدم بڑھادیئے۔

ایسے وقت میں جب تیز بوچھاڑ میں ایک ہاتھ کی دوری پر کھڑا آدمی دکھائی نہ دے۔ ہمارا آگے بڑھنا ناممکن سی بات نظر آرہی تھی۔ ہم نے ابھی بمشکل دس گز کی دوری طے کی تھی کہ اچانک ایک سماعت شکن کڑاکا ہوا جیسے قریب ہی کسی جگہ بجلی گری ہو۔ اس کڑاکے کی گونج سے پورا ساحل کانپ اٹھا۔ پیروں کے نیچے کی ریت کھسکتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ ہمیں توازن برقرار رکھنا دشوار محسوس ہوا۔

''بھاگو۔'' میں نے چیخ کر کہا اور دوڑ لگادی۔ میں اندھوں کی طرح اندازے سے بھاگ رہی تھی۔ ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ ان کے زناٹے سے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ ان کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور نہ مجھے یہ خبر تھی کہ میرے ساتھ کون کون ہے؟ میں بے تحاشہ دوڑ رہی تھی۔ کہاں جارہی ہوں، اس کا بھی ہوش نہ تھا۔ نہ مجھے پروا تھی۔

ابھی میں نے چند سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک اور دھماکا ہوا اور ہمارے پیروں تلے کی زمین تھرا اٹھی اور میں لڑکھڑا کر زمین پر گر گئی۔ مجھے بارش کی جگہ ریت برستی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرا پورا جسم ریت سے اَٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب یہ ریت کی بارش کم ہوئی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دھند کا نام ونشان نہ تھا مگر نظریں جو دیکھ رہی تھیں، اسے دیکھ کر لڑکیاں کانپ اٹھیں۔ وہ انسان نہیں تھا۔ کیا تھا، اس کا فیصلہ ذہن نے کیا نہیں تھا۔ لمبائی میں وہ کھجور کے درخت جتنا تھا اور رنگت بالکل کالی تھی۔ کالے چہرے پر چیچک کے بدنما داغ تھے۔ دانت بھی نسبتاً بڑے بڑے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے تنفس کی آوازیں مجھے بے چین کرنے لگی تھیں۔ گویا مقابلے کے لیے اُکسا رہی ہوں۔ میں نے دل مضبوط کر کے اس کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی کی سلوٹیں انگریزی حرف ''اے'' کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح اپنا منہ کھولے ہوئے تھا جیسے وہ مجھے کھا جائے گا۔ اس کے اوپر کی بائیں سمت والے دانت نوکیلے اور لمبے لمبے تھے۔ درمیان کے دو دانت چھوڑ کر بقیہ تین دانت بھی لمبے اور نوکیلے تھے۔ اس کی نصف پیشانی اور بائیں جانب کے تھوڑے سے بال نظر آرہے تھے۔ اس کی دبی دبی خرخراہٹیں سن کر میرے جسم میں عجیب سا احساس رینگنے لگا تھا جسے خوف بھی نہیں کہا جاسکتا۔ میں ابھی اس کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ اس نے کھڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم اپنی موت کو آواز دے رہی ہو۔ ذرا سوچو، اپنی قوت کا ادراک کرو کہ تم کس سے ٹکرانے چلی ہو۔ اگر میرے گروجی کو غصہ آگیا تو نہ صرف تم ماری جاؤ گی بلکہ یہ دنیا جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔''

اس کی آواز سنتے ہی رضیہ اور اس کی بہن تیورا کر گریں اور بے ہوش ہوگئیں مگر میں اپنی جگہ جمی ہوئی تھی۔ بارش کا زور ٹوٹا نہیں تھا۔ ہم بھیگ رہے تھے مگر سردی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ اس کی آواز نے میرے غصے کو آواز دے دی تھی۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا گرو کون ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟''

''ابھی کل ہی تو اس سے مقابلہ کر چکی ہو۔ وہ تو فقط ایک نمائش تھی۔ گرو جی نے تو اپنی قوت کی صرف جھلک دکھائی ہے۔ اگر تم نے اس علاقے کو چھوڑا نہیں تو تمہارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔ بہت تباہی پھیلے گی۔ تم سب ماری جاؤ گی۔ میرا گرو بہت طاقتور ہے۔ اس کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ جو بھی مقابلے میں آئے گا، نہایت اذیت ناک موت مرے گا۔ وہ سب کو ختم کر دے گا۔ بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دے گا۔ پورے چٹا گام کو اُجاڑ دے گا۔ خون اس طرح سڑکوں پر بہے گا جس طرح بارش کا پانی سڑکوں پر بہتا ہے۔ یہ دنیا ختم کر دے گا وہ۔ ذرا سوچو، جب ہر طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی ہوں گی۔ خون ہی خون پھیلا ہوگا۔ جب ہزاروں ہزار لوگ مارے جا چکے ہوں گے اور شہر کے باقی لوگ اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے ہوں۔ جدید ترین ہتھیار بھی گرو جی کے بھیجے ہوئے ''بیر'' کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ لاشیں گراتے اور خون بہاتے چلے جائیں گے...... سمجھیں۔''

اس کی بات نے مجھے واقعی خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں کیا کروں، ابھی میں سوچ رہی تھی کہ ذہن میں فرحت کا نام آیا اور میں بلا سوچے سمجھے اسے آواز دینے لگی۔ اسے بلانے کے لیے جو کچھ پڑھا کرتی تھی، اسے پڑھنے لگی۔

میری حالت عجیب تھی۔ بارش میں بھیگ رہی تھی۔ سر تا پا شرابور تھی۔ ایک طرف دونوں لڑکیاں ریت پر گری ہوئی تھیں اور دوسری طرف وہ عجیب الخلقت بلا تھی جو دھمکی دے رہی تھی مگر میں ہر طرف سے بے پروا پڑھنے میں مشغول تھی کہ فرحت آ گئی۔ اس نے نمودار ہوتے ہی اس بلا کا جائزہ لیا پھر بولی۔ ''بولو مجھے کس لیے بلایا ہے؟''

''ذرا اس بڑبولے کو اس کی اوقات بتا دو۔ بہت بڑھکیں مار رہا ہے۔ اس کو یہاں سے لے جا کر سمندر کے گہرے پانی میں چھوڑ دو۔''

فرحت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''یہ کون سا مشکل کام ہے مگر میرے ہاتھ نجس ہو جائیں گے کیونکہ یہ نجاست کی پوٹ ہے۔''

''کچھ بھی کرو، مجھے اسے سزا دینی ہی دینی ہے۔'' میں نے کہا تھا کہ وہ عجیب الخلقت بلا بولی۔

''ارے...... یہ دربدر بھٹکنے والی روح میرا کیا بگاڑے گی۔ میں خود اسے سمندر میں پھینک آتا ہوں۔'' کہہ کر اس نے فرحت کو پکڑنا چاہا تھا کہ اس کے گرد آگ کا دائرہ سا بن گیا۔ یہ آگ بھی عجیب تھی جو تیز بارش اور ہوا کے جھکڑ میں بھی ایک ہی جگہ قائم تھی۔

اس نے جیسے ہی آگ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ اتنی بھیانک چیخ تھی کہ پورا علاقہ گونج اُٹھا تھا۔ فرحت نے تیزی سے گردش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ آگ کا دائرہ بھی گردش کر رہا تھا۔ وہ عجیب انداز میں آگ کے دائرے کو اس کے جسم سے مس کر رہی تھی۔ جب جب وہ دائرہ اس کے جسم سے ٹکراتا، وہ چیخ اُٹھتا۔

یہ کھیل تقریباً دس منٹ تک چلا پھر یکا یک وہ بلا برستے ہوئے پانی میں بھی جل کر خاک ہوگئی اور اس کی راکھ ریت میں مل گئی۔

اگر ایسا واقعہ مجھے کوئی اور سناتا اور میں خود ان حالات سے گزری نہ ہوتی تو کبھی یقین نہ کرتی اور اسے جھوٹ کہہ کر مسترد کر دیتی مگر آنکھوں دیکھی بات کو کون جھٹلا سکتا ہے۔ میں بھی یقین کرنے پر مجبور تھی۔

خیر...... اس بلا کے ختم ہوتے ہی بارش یکلخت بند ہوگئی اور حیرت انگیز طور پر ساحل پر پھیلی ریت جو بارش سے جل تھل ہو رہی تھی، سوکھ گئی۔ اس طرح کہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہاں بارش بھی ہوئی ہے۔

میں نے جھک کر رضیہ اور اس کی بہن صوفیہ کو جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ دو چار بار کی کوشش سے وہ دونوں ہوش میں آگئیں۔

''مجھے...... مجھے کیا ہوا تھا؟'' رضیہ بولی۔

''وہ...... وہ عجیب وغریب بلا کہاں گئی؟'' رضیہ کی بہن صوفیہ نے پوچھا۔

''لگتا ہے، تم لوگوں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ چلو، دوسروں کو ڈھونڈتے ہیں۔'' کہہ کر میں نے دونوں کو سہارا دیا اور آگے بڑھ گئی۔

ابھی ہم سمت کا تعین کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرن جھلملائی۔ کوئی ہماری طرف بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ سلیم بھائی تھے۔ قریب پہنچ کر انہوں نے بتایا کہ ہم تینوں غلط جگہ پر اپنا پڑاؤ تلاش کر رہے تھے۔ تبھی ہمیں کامیابی نہیں ملی ورنہ ہم لوگوں نے جہاں ٹھکانہ بنایا تھا، وہاں بارش سے بچنے کے لیے بھی انتظام تھا۔

ہم سلیم بھائی کے ساتھ اس جگہ پہنچے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا۔ باقی گھر والے وہاں موجود تھے اور وہ سب کافی پریشان تھے۔ ہمیں بخیر و عافیت پا کر انہیں اطمینان ہوا۔ انہوں نے ہماری آؤ بھگت کی گویا ہم مہمان ہوں اور بہت دور سے آ رہے ہوں۔ دھوپ نکل آئی تھی لیکن اس میں شدت نہیں تھی۔ انہی کی زبانی پتا چلا کہ وہاں صرف جھکڑ چلے تھے، بارش نہیں ہوئی تھی مگر انہوں نے بھی بارش ہوتے دیکھی تھی۔ یہ بات ایک عام سی بات تھی۔ بنگال میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ایک محلے میں بارش ہو رہی ہوتی ہے اور پڑوس کا محلّہ سوکھا پڑا رہتا ہے۔

دراصل جہاں بادل جمے رہتے ہیں، وہاں بارش ہوتی ہے۔

اس کے بعد ہم مختلف قسم کی تفریح میں مشغول ہو گئے تھے۔ میں نے رضیہ وغیرہ کو منع کر دیا تھا کہ وہ اس عفریت کا تذکرہ کسی سے نہ کریں۔

وہ تو پہلے ہی خوفزدہ تھیں۔ یہ سن کر کہ اگر تذکرہ ہوا تو وہ پھر آ جائے گا، ان کی ہوا سرد ہو گئی تھی۔

یوں ہنستے کھیلتے شام ہو گئی اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ رضیہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کچھ دیر تک وہ کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتی رہی پھر وہ مجھ سے سرگوشی میں بولی۔ ''آپا! میں یہاں ایک کام سے آئی ہوں اور کل سے کئی بار کوشش کر چکی ہوں کہ آپ کو بتاؤں مگر حوصلہ نہیں ہو رہا ہے۔''

''بولو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''آپا!'' کہہ کر وہ بالکل میرے کان کے قریب منہ لے آئی اور بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ''آپ کو تو علم ہوگا، میری شادی طے ہو چکی ہے۔''

میں نے جھوٹ موٹ میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔''

''میرے سسر صاحب کا ایک مہینے پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے اسی لیے شادی کی تاریخ ٹل گئی ہے۔''

''تو کیا میں دعا کرا دوں کہ تمہاری شادی جلد ہو جائے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں......نہیں بات کچھ اور ہے۔''

''اچھا بولو کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میری ساس کو ہر روز ایک عجیب سا خواب آتا ہے۔ انہوں نے یہاں سے مغربی پاکستان تک کے ہر معبر سے تعبیر پوچھ لی مگر کوئی بھی تعبیر بتا نہیں سکا ہے۔ اسی دوران میں ہم تک آپ کی شہرت پہنچی۔ تمام رشتے دار کہتے ہیں کہ آپ کے پاس مؤکلوں کی قطار ہے۔ جنات بھی قبضے میں ہیں پھر جادو پر بھی کمال حاصل ہے اسی لیے میری ہونے والی ساس نے مجھے خصوصی طور پر بھیجا ہے۔ وہ خود بھی آئی ہیں مگر کسی کو پتا نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سینٹرل ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں۔''

''تو کیا مجھے ان سے ملنے جانا ہوگا؟''

''ہاں......''

''اگر میری وجہ سے تمہاری ساس تم پر مہربان ہو سکتی ہیں تو میں ضرور چلوں گی۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا اور سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ پہلے فرحت کو بلا کر تعبیر پوچھوں گی۔ اگر وہ نہ بتا سکی تو فقیر بابا سے رابطہ کر کے پوچھ لوں گی کیونکہ یقیناً وہ خواب کافی الجھا ہوا اور اہم ہوگا تبھی وہ اتنی پریشان ہیں۔

☆=======☆=======☆

واکس ویگن پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اندر بیٹھے تمام لوگ ہنس بول رہے تھے۔ ہم ساحلی علاقے سے تقریباً نکل چکے تھے اور اب مرکزی شاہراہ پر پہنچنے والے تھے۔ گویا ویران علاقے سے نکل کر مصروف علاقے میں پہنچنے والے تھے۔

یہ شاہراہ قائداعظم روڈ کہلاتی تھی اور اسے مرکزیت حاصل تھی۔ کاکس بازار سے چٹاگانگ کو ملاتی تھی۔ اس تفریحی مقام پر جانے والوں میں فلمی یونٹس زیادہ تھے کیونکہ ڈھاکا میں بننے والی تمام فلموں کے ایک دو سین ڈائریکٹرز یہاں آ کر ضرور فلماتے تھے۔ مغربی پاکستان سے بھی فلم بنانے والے یہاں آتے رہتے تھے اس لیے کاکس بازار اور رانگاماٹی میں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا تھا۔ اس وجہ سے یہ سڑک زیادہ مصروف رہتی تھی۔

ہماری واکس ویگن اب اس سڑک پر پہنچنے ہی والی تھی کہ یکایک ایک عجیب بات ہوئی۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر میری نظروں کے سامنے یہ سب ہوا تھا اس لیے نہ میں جھٹلا سکتی ہوں اور نہ کوئی دوسرا جو ساتھ تھا۔

ہماری ویگن مرکزی شاہراہ پر پہنچنے والی تھی کہ داہنی طرف سے دھپ دھپ کی آواز اُبھری۔ سب کے سب چونک گئے تھے اور ہر ایک کا چہرہ اُدھر ہی گھوم گیا تھا۔ آواز کے مخرج پر نظر پڑتے ہی رضیہ چیخ اُٹھی تھی۔ ایک رضیہ ہی کیا، سب کے سب خوف زدہ ہو اُٹھے تھے۔ میں خود چکرا گئی تھی کہ یہ کون سا جانور ہے؟ دیکھنے میں بالکل ڈائنوسار جیسا تھا اور قد عربی اونٹ جتنا اس کی آنکھیں بلب کے ایسے چمک رہی تھیں اور اس کے لمبے لمبے نوکیلے دانتوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ زبان کسی کتے کے ایسے باہر لٹک رہی تھی۔ زبان پر بھی خون جما ہوا تھا۔

''اسے روکو...... ورنہ یہ ہم سب کو روند ڈالے گا۔'' رضیہ چیخی۔

''بس...... میں اسے ابھی روکتی ہوں۔'' کہہ کر میں سورۃ الناس پڑھتے ہوئے نیچے اُتر آئی۔ پھر اس کی طرف پھونک ماری۔ وہ ہیبت ناک عفریت اپنی جگہ جم کر رہ گیا مگر اس کی پھوں پھوں ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت غصے میں ہو۔ میں نے اس کی طرف دوبارہ پھونک ماری مگر ویسا کچھ نہ ہوا جس کی مجھے توقع تھی کیونکہ عین اسی وقت ایک شخص پتا نہیں کہاں سے نمودار ہوا اور اپنی جگہ سے اُچھل کر اس جانور کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اس شخص نے صرف ایک لنگوٹ باندھ رکھی تھی۔ پورا بدن ننگا تھا۔ سر گٹھا ہوا تھا۔ گٹھے ہوئے سر پر شاید اس نے تیل لگا رکھا تھا جس کی وجہ سے چندیا چمک رہی تھی۔ سر کے پچھلے حصے میں بڑی سی چٹیا تھی۔ پیشانی پر سیندور سے قشقہ کھینچ رکھا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں ترشول سنبھال رکھا تھا۔ لوہے کے تین نوک والا ترشول بطور ہتھیار بھی استعمال ہو سکتا ہے اس لیے میں اس سے دوری بنائے کھڑی تھی کہ وہ بولا۔

''بہت بڑی تانترک بنتی ہے ناں! آ مجھ سے مقابلہ کر۔''

''تُو کیا اور تیری اوقات کیا۔ میں جب چاہوں، تجھے فنا کر دوں کیونکہ حق ہی باطل پر فتح پاتا ہے۔ لے سنبھل۔'' کہہ کر میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر پھونک ماری۔ نتیجہ فوراً سامنے آ گیا۔ پھونک مارتے ہی اس عفریت کے دونوں پیر گلنے لگے۔ میں نے خود کو روکا نہیں اور سب سے التجا کی کہ وہ سب زور زور سے آیات قرآنی پڑھتے رہیں۔

مجھ سے مقابلے کے لیے آنے والے نے جب یہ دیکھا کہ اس کی سواری اپنی حقیقت کھو رہی ہے تو وہ جھنجھلا اُٹھا۔ اس نے کچھ پڑھ کر ترشول کو میری جانب پھینکا۔

ترشول کے بارے میں، مَیں بہت کچھ جانتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ہندوؤں کے نزدیک بہت مقدس ہتھیار ہے۔ شنکر بھگوان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ تنتر منتر کرنے والے اسے بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہر قسم کا منتر اسی کے ذریعے چلاتے ہیں۔ اس وقت بھی اس نے ترشول پھینکا ہے تو اس پر ضرور کچھ پڑھا ہوگا۔ ترشول ہوا میں تیرتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ تبھی اس شخص نے عجب انداز سے کہا۔ ''تُو اس لڑکی کو بہت چاہتی ہے ناں تو دیکھ میرے انتقام کی پہلی چنگاری۔''

اس کے لہجے کی سفاکی نے مجھے دہلا دیا تھا۔ اس کے تیور غضب ناک تھے۔ اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ رضیہ کی چیخ گونجی تھی۔ ترشول اس کے جسم سے ٹکرایا تھا اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ میں نے رضیہ کے اُلٹے ہاتھ کو جسم سے علیحدہ ہوتے دیکھا جو اب زمین پر پڑا پھڑ پھڑا رہا تھا پھر اس گنجے کا منحوس ہاتھ ایک بار پھر فضا میں بلند ہوا اور ترشول ریموٹ کنٹرول کھلونے کی طرح واپس اس کے ہاتھ میں پہنچ گیا اور پھر ایک بار وہ ترشول فضا میں بلند ہوا اور رضیہ کا دوسرا ہاتھ بھی اس کے بدن کا ساتھ چھوڑ کر زمین پر تڑپنے لگا۔ رضیہ کی فلک شگاف چیخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔

رضیہ پر جو کچھ گزر رہی تھی، شاید اس نے میری قوت گویائی سلب کر دی تھی۔ میری حیثیت ایک خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔

''کیوں مہاشکتی شالنی!'' گنجے نے میری طرف دیکھ کر طنز کیا۔ ''کیا اب بھی تم اپنی مہان شکتیوں، اپنے سہائتا کارک کو آواز نہیں دوگی؟ کچھ تو کرو۔ لڑکیاں تو اپنی سکھیوں کا جیون بچانے کے لیے اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا دیتی ہیں۔ تم کیسی سکھی ہو جو خاموش کھڑی تماشا دیکھ رہی ہو؟''

میں نے پوری قوت صرف کر کے آگے بڑھنا چاہا لیکن میرے قدم جیسے زمین میں جکڑ دیئے گئے تھے۔ میں اپنی جگہ سے جنبش کرنے سے بھی قاصر تھی۔

''مہاشکتی شالنی! اب بھی وقت ہے، تم اپنی پراجیت (شکست) سویکار (تسلیم) کر لو اور اس شہر سے منہ کالا کر لو۔'' اس کے بھدے اور غلیظ ہونٹوں سے شرائط سنائی دیں۔

میں گندی اور طاغوتی قوتوں کے ناقابلِ یقین کھیل تماشے پہلے بھی دیکھ چکی تھی اس لیے اس تماشے نے بھی بہت زیادہ اثر نہ ڈالا تھا اور میں نے اپنے خوف پر قابو پالیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی پُراسرار قوتیں کتنی ہی قوی کیوں نہ ہوں، مگر الٰہی قوتوں کے آگے ٹک نہ سکیں گی۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی میں پوری طرح سنبھل گئی تھی اور ذہن سے خوف کے احساس کو جھٹک کر گنجے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتی آواز میں بولی۔ ''تم ایسے شعبدے دکھا کر مرعوب نہیں کر سکتے۔''

''تو پھر خوف کیسا! اگر بچا سکتی ہو تو اپنی دوست کو بچا لو۔'' کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ میں نے خداوند کریم سے دل ہی دل میں مدد طلب کی اور سورۃ الناس کا ورد کرتے ہوئے آگے بڑھی۔ ہمارے درمیان کا فاصلہ گھٹ چکا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے۔ اچانک دور سے کسی گیدڑ کے رونے کی آواز آئی۔ ایسی مکروہ آواز تھی کہ رونگٹے کھڑے ہو گئے پھر ایسا لگا جیسے کسی بلی نے کراہتی ہوئی آواز میں رونا شروع کر دیا ہے۔ ایک جانب سے بلی کے رونے کی آواز آرہی تھی اور دوسری جانب سے گیدڑ کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ میں جو خود کو بہت زیادہ بہادر سمجھنے لگی تھی، اس افتاد پر سہم سی گئی تھی۔

ابھی ان دو آوازوں کا خوف طاری ہی تھا کہ ایک تیسری آواز بھی ان میں شامل ہوگئی۔ یہ کسی کے قہقہے کی آواز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی پاگل قہقہہ لگا رہا ہے۔ خوب زور زور سے ہنس رہا ہے۔ میں اس کے اتنے قریب پہنچ چکی تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑ سکتی تھی تبھی ایسا لگا جیسے میرے پیچھے کسی درندے کی غراہٹ گونجی ہو۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ میرے بالکل پیچھے ایک بھیڑیا کھڑا تھا۔ اس کی شعلہ برساتی نگاہیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ خوف ناک انداز میں غرا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب تب میں وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ اس سے بچنے کا طریقہ سوچ ہی رہی تھی کہ مغربی سمت سے ایک بڑی سی چمگادڑ ہوا میں تیرتی ہوئی میری طرف بڑھتی نظر آئی۔ اس کا انداز جارحانہ تھا۔ وہ پلک جھپکتے میں میرے سر پر پہنچ گئی تھی پھر اس نے غوطہ لگایا اور میرے چہرے کو نوچنے کی کوشش کی۔ میں پھرتی سے بیٹھ گئی تھی اور وہ اپنی رَو میں آگے نکلتی چلی گئی تھی۔

میں تین دشمنوں کے درمیان گھری کھڑی تھی۔ ان سے بچنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ دماغ ماؤف ہو چکا تھا تبھی ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی ہو۔ ''بیوقوف لڑکی! حصار والی دعا پڑھ ''حرز جواد'' پڑھ۔''

اور میں زور زور سے ''حرز جواد'' پڑھنے لگی۔ ابھی یہ دعا ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایسا لگا جیسے ایک نادیدہ لاٹھی ہوا میں چلنے لگی ہے۔ کھٹ کھٹ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی مگر دکھائی کچھ بھی نہیں دے رہا تھا۔ ضرب کا اندازہ دشمنوں کے چہروں سے ہو رہا تھا۔ پہلی ضرب گنجے پر پڑی تھی اور دوسری بھیڑیے پر۔ دونوں اُلٹ گئے تھے کہ چمگادڑ جھپٹی۔ وہ غوطہ لگا کر مجھ پر جھپٹنا چاہتی تھی کہ اس کی پرواز درمیان میں ہی رہ گئی۔ وہ پھڑپھڑاتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ ایسی گری کہ پھر اُٹھ نہ سکی۔ کچھ دیر تڑپتی رہی پھر ایسا لگا جیسے وہ گھل رہی ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پانی کی طرح زمین پر بہہ کر مٹی میں جذب ہوگئی۔

اس نا ہنجار سے نجات ملی تو میں نے بھیڑیے کی طرف دیکھا۔ جو زمین پر گرا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ شاید اس کا وقت بھی قریب آ چکا تھا۔ پھر میں نے اُدھر سے نظریں ہٹا کر گنجے کی طرف دیکھا۔ وہ سر پکڑے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ ساری اکڑفوں نکل گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے اُٹھا اور پھر اتنی تیزی سے دوڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا کہ میں اسے روک بھی نہ سکی۔ چمگادڑ ختم ہو چکی تھی۔ بھیڑیا اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا اور گنجا اپنی جان بچا کر فرار ہو چکا تھا۔ میں رضیہ کی طرف بڑھی۔ اس تمام عرصے میں گاڑی میں بیٹھے لوگ اس طرح سے سیٹوں کے نیچے دبکے رہے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ پتا نہیں، ان میں سے کتنے ہوش میں تھے اور کتنے بے ہوش ہو چکے تھے لیکن ان کی طرف دیکھنے کا مجھے ہوش نہ تھا۔ رضیہ سڑک پر پڑی تھی اور اس کے کٹے ہوئے ہاتھ بھی وہیں گرے ہوئے تھے۔ میں مخصوص دعا کو پڑھتے ہوئے اس کی جانب بڑھی۔ تبھی ایک معجزہ سا نظر آیا۔ رضیہ کے کٹے ہوئے ہاتھ دھیرے دھیرے اس کے شانوں کی طرف بڑھے اور پھر اپنی جگہ پر چپک گئے۔ ہے ناں تعجب خیز بات مگر مجھے تعجب نہیں تھا کیونکہ اس کئی ایک مہینے میں ایسے ایسے واقعات دیکھ چکی تھی کہ اب کسی بات پر تعجب نہیں ہو رہا تھا۔

ہاتھ کے جڑتے ہی رضیہ کھڑی ہوگئی۔

''مم...... مجھے...... مجھے کیا ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں...... چلو گاڑی میں بیٹھو۔'' میں نے جواب دیا۔

اس کی آواز سن کر پہلے صوفیہ نے گاڑی سے سر باہر نکالا پھر ایک کے بعد ایک سب اُتر آئے۔

''نہیں......نہیں......آپ سب اندر بیٹھیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ اب ہمارا راستہ کون روکتا ہے؟''

میں نے رضیہ کو اپنے برابر بٹھایا اور ڈرائیور سے بولی۔ ''چلو بھئی۔''

''یہ......یہ سب کیا تھا؟'' ڈرائیور نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''جو کچھ تھا، وہ ختم ہو چکا ہے مگر یاد رکھو اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا۔ اگر کرو گے تو میں تمہارے لیے کبھی دعا نہیں کروں گی اور یہ عفریت تمہیں ہی نہیں، تمہارے پورے خاندان کو ختم کر دے گی کیونکہ جب اس کا نام لیا جاتا ہے، وہ فوراً وہاں پہنچ جاتا ہے اس لیے کبھی بھی اسے یاد نہ کرنا، اگر یاد آئے تو فوراً لاحول پڑھ لینا۔'' میں نے ڈرانے کے لیے کہا تاکہ یہ بات پھیل نہ جائے۔

ڈرائیور کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ حد درجہ خوف زدہ ہے۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم گھر پہنچ چکے تھے۔ یہ گھر میرا نہیں تھا پھر بھی سب اسے میرا قرار دیتے تھے کیونکہ سبھی مجھے سونالی قرار دے رہے تھے۔ رضیہ بھی تو مجھے سونالی سمجھ کر مدد مانگنے آئی تھی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچی تو وہ بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔ اس نے تقریباً سرگوشی میں پوچھا۔ ''آپا! آپ کب جائیں گی؟''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ساس سے ملنے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اتنے بڑے تجربے کے بعد بھی یہ کہہ رہی ہو؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟ جب آپ جیسی قابل ہستی میرے ساتھ ہوگی، تو پھر مجھے ڈر خوف کیسا؟'' وہ مجھ پر اندھا اعتماد کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، کچھ دیر آرام کر لوں پھر چلوں گی۔''

آرام کے نام پر بمشکل میں آدھا گھنٹہ لیٹی ہوں گی کہ رضیہ پیر تسمہ پا بن کر آ گئی کہ چلیے۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر میں نے پتول کو بلا کر کہا کہ میں بازار جا رہی ہوں۔ کچھ ضروری چیزیں خریدنی ہیں۔ اگر تم چاہو تو اپنی ضرورت بتا دو۔ میں خرید کر لیتی آؤں گی۔ اس وقت میک اپ کی بس ایک چیز مقبول تھی جسے ہر لڑکی پسند کرتی تھی۔ وہ تھی ''تبت سنو'' پتول نے وہی لانے کے لیے کہا۔ میں رضیہ کے ساتھ نکل پڑی اور سیدھی ہوٹل پہنچی۔ میں نے برقعے میں خود کو چھپا رکھا تھا تاکہ کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ ہم دونوں اوپر پہنچے۔ تین سو آٹھ نمبر کے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی ایک بڑی بی بیٹھی تھیں۔ رضیہ کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''السلام علیکم!'' میں نے قدرے بلند آواز میں سلام کیا۔

انہوں نے یک آواز میں جواب دیا اور مجھے اپنے قریب بٹھا لیا پھر وہ بولیں۔ ''بیٹی! میں تمہاری تعریف ہر ایک کے منہ سے سن رہی ہوں اسی لیے میں رضیہ کے ساتھ یہاں آئی ہوں۔ پلیز، میری مدد کر دو۔''

''آپ میرے لیے قابلِ احترام ہیں۔ فرمائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' میں نے جواب میں کہا۔

''یہ مسئلہ میری بیٹی روپالی کا ہے۔اس مسئلے کا حل تمہیں ہی نکالنا ہے۔وہ بہت بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے۔'' بڑی بی بولیں۔

''کیا وہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہے؟''

''ہاں......''

''تو اسے بلائیے ناں۔''

''تمہارے آنے کا علم تو تھا نہیں۔اسے کچھ خریداری کرنا تھی۔وہ بازار تک گئی ہے۔''

''اچھا......یہ بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے؟''

''میری بیٹی کی پہلی شادی 1950ء میں ہوئی۔1955ء تک کوئی اولاد نہ ہوئی تو اس کے میاں نے اسے طلاق دے دی۔تقریباً دو سال بعد اس کی دوسری شادی ہوئی۔شادی کے تین سال بعد اس کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا۔بچے کی پیدائش کے بعد سے وہ ایک عجیب انداز کا خواب دیکھ رہی ہے۔''

''کس قسم کا خواب؟'' میں نے پوچھا۔

''انتہائی خوفناک خواب۔''

''تفصیل سے بتائیں۔شاید میں تعبیر بتا دوں۔''

''بس وہ آتی ہی ہوگی۔جب تک تم لوگ چائے وغیرہ پیو۔''

''اس سوئٹ کا وہ والا کمرا کیا خالی ہے؟'' میں نے سوئٹ کے دوسرے کمرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں......کیوں؟''

''دراصل میں کچھ دیر کے لیے مراقبہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں......ہاں......کیوں نہیں۔اس کمرے میں چلی جاؤ۔چاہو تو دروازہ بھی اندر سے بند کر سکتی ہو۔''

''شکریہ......'' کہہ کر میں اس کمرے میں داخل ہوگئی لیکن دروازہ اندر سے بند نہیں کیا۔بیڈ پر بیٹھ کر فرحت کو بلانے کے لیے اسی مخصوص دعا کو پڑھنے لگی۔کچھ ہی دیر میں فرحت دھوئیں کے مرغولے میں سوار آگئی۔اس کے حاضر ہوتے ہی میں نے کہا۔''تم تھیں کہاں؟ دوبار آواز دے چکی ہوں۔''

''زندہ اور مُردہ روح میں بہت فرق ہے۔ذرا سوچو، جب انسان زندہ ہوتا ہے اور وہ سو رہا ہو تو اس پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی روح اسے چھوڑ کر نکل جاتی ہے۔پورے جہاں کا گشت کر لیتی ہے۔وہ آسمان کی بلندیوں پر پہنچی ہوئی ہوتی لیکن جب بھی سونے والے کو بیدار کیا جاتا ہے، وہ پلک جھپکنے میں لوٹ آتی ہے کیونکہ اس روح کا ایک سرا جسم سے جڑا ہوتا ہے۔رشتہ باقی رہتا ہے بلکہ یوں سمجھ لو کہ اس کا ریسیونگ سینٹر کام کر رہا ہوتا ہے۔یعنی جسم اور روح کا رشتہ قائم ہے مگر مرنے کے بعد روح خود کار ہو جاتی ہے۔ہر بلا مصیبت سے اسے خود کو

بچانا پڑتا ہے اسی لیے روح کو زمین پر آنے میں کبھی کبھی دیر ہو جاتی ہے۔"

"اچھا...... اچھا...... اب زیادہ لیکچر نہیں۔ سنو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔"

"بولیں۔"

"رضیہ کی نند کو کیا پریشانی ہے، ذرا دیکھ کر مجھے بتاؤ۔"

فرحت کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی پھر اس نے کہنا شروع کیا۔" یہ سب خود اس کا خرید کردہ ہے۔ اُف اللہ! وہ تو بہت بڑی پاپن ہے۔ گناہگار ہے۔"

"ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟"

"اُسے سمجھانے کے لیے مجھے اس کی پوری کہانی کہنی پڑے گی۔"

"ہاں...... ہاں کہو۔"

"1959ء میں اس کی شادی عطاء الرحمٰن سے ہوئی۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ تقریباً تین دن تک رنگ کھیلا جاتا رہا۔ (قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتا چلوں کہ بنگال میں شادی سے تین دن پہلے دلہن کا جوڑا یعنی ساڑھی بلاؤز ہلدی میں رنگا جاتا ہے پھر اسی زرد رنگ کو گھر والے ایک دوسرے پر پھینک کر خوشیاں مناتے ہیں۔ ساڑھی رنگنے والا رنگ تو فوراً ختم ہو جاتا ہے اور پھر لوگ خود ہی رنگ گھول گھول کر ایک دوسرے پر پھینکتے رہتے ہیں۔ اسے "رنگ کھیلنا" کہتے ہیں: مصنف) عطاء الرحمٰن سیکرٹریٹ میں ملازم تھا۔ وہ روپالی کو بہت چاہتا تھا مگر جب شادی کو تین سال گزر گئے تو روپالی کو فکر ہوئی کیونکہ اب محلے والے بھی طعنہ دینے لگے تھے کہ تُو بانجھ ہے۔ خود ساس بھی دبے دبے لہجے میں کہنے لگی تھی کہ مجھ سے اب انتظار نہیں ہوتا۔ پوتے پوتیوں کو دیکھنے کا ارمان لے کر میں قبر میں جا سوؤں گی۔ روپالی طعن تشنوں سے گھبرا اُٹھی اور اس نے جھاڑ پھونک کرنے والوں کا سہارا لے لیا۔ ایک سال تک وہ مختلف لوگوں کے جال میں پھنس کر پیسے برباد کرتی رہی پھر اس کی ایک سہیلی نے چاند فقیر کا نام بتایا۔ وہ اپنے علاقے کا مشہور و معروف عامل تھا۔ اس کے آستانے پر ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔ روپالی بھی وہاں پہنچ گئی۔ پھر کیا ہوا؟ یہ میں بتانے سے بہتر سمجھتی ہوں کہ تم خود دیکھ لو۔ بس آنکھیں بند کر کے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ لو۔"

میں نے آنکھیں بند کر کے جیسے ہی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، مجھے ایسا لگا جیسے بادلوں پر سوار ہو کر میں اُڑی جا رہی ہوں۔

☆=======☆=======☆

وہ ایک بھیڑ بھری سڑک تھی۔ شاید نواب پور روڈ، میں اس روڈ پر پرواز کرتی ہوئی سکھاری بازار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نیچے سڑک پر روپالی رکشے پر سوار اُدھر ہی جا رہی تھی۔ سکھاری بازار ہندوؤں کا علاقہ ہے۔ تمام کے تمام ہندوؤں کے مکانات، دکانیں اسی بازار میں ہیں۔ اس بازار کے نکڑ پر یعنی جہاں سے کپڑوں اور سونے کے زیورات کی مارکیٹ شروع ہوتی تھی، اسی پٹواٹولی اسلام پور بازار کے پاس وہ گھر تھا جس گھر کے دروازے پر بڑا سا بورڈ لٹکا ہوا تھا۔" سادھک شری پتامبر بابا جی! ماہر علم الاعداد و سادھنا۔" روپالی نے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور

وہ اندر داخل ہوگئی۔اسی کے ساتھ میں بھی اندر چلی آئی۔

وہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔اس کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی۔دیواروں کے سہارے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔کچھ عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس پر مندر کا دھوکا ہورہا تھا کیونکہ بڑی سی کالی دیوی کی مورتی، شنکر اور پاربتی کی مورتی، گنیش، لچھمی اور سرسوتی کی مورتی برابر برابر میں رکھی ہوئی تھیں۔اسی کے سامنے ایک شخص ننگے بدن صرف لنگوٹ باندھے سر جھکائے بیٹھا تھا۔اس کے سامنے ایک بڑا سا تسلہ رکھا تھا جس میں آگ سلگ رہی تھی۔اس آگ پر وہ لوبان ڈالتا جارہا تھا جس کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔روپالی سیدھی جاکر اس کے سامنے بیٹھ گئی اور دونوں ایک دوسرے سے سرگوشی میں باتیں کرنے لگے۔میں کچھ اور آگے بڑھی۔اتنے قریب پہنچ گئی کہ ان کی باتیں سن سکتی تھی۔شاید میں کسی کو نظر نہیں آرہی تھی اسی لیے کسی نے میری طرف توجہ نہ دی اور میں ان کی باتیں سننے لگی۔روپالی کہہ رہی تھی۔"مہاراج! میں آپ کو دو ہزار روپے دے چکی ہوں مگر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا؟"

میں حیران رہ گئی دو ہزار کی رقم معمولی نہ تھی۔دو ہزار میں تو مکان خریدا جاسکتا تھا۔میں نے اب پوری توجہ ان دونوں کی طرف لگادی۔ سادھک نیچی آواز میں کہہ رہا تھا۔"میں نے اپنی پوری کوشش کرلی۔تمہاری کوکھ کو کسی نے باندھ دیا ہے۔تم ماں نہیں بن سکتیں اس وقت تک جب تک تمہارے اوپر کیا گیا عمل باطل نہ کیا جائے۔"

"تو یہ توڑ کب کروگے؟"

"بس بہت جلد۔تم دیکھتی رہو۔ایسا کرو تم مزید دو ہزار روپوں کا انتظام کرلو پھر دیکھو کیسے تمہاری کوکھ ہری ہوتی ہے اور ساس نندیں تمہاری کنیزیں بن جاتی ہیں۔ارے، میاں جی تو تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے۔"

"لیکن اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں؟"

"بہت آسان بات ہے فرید پور والی زمین بیچ دو۔"

"نہیں...... یہ ناممکن ہے کہ شوہر سے چھپا کر میں زمین بیچ دوں۔"

"پھر تو ایک ہی راستہ بچ جاتا ہے۔"

"کون سا راستہ؟"

"کسی پہلوٹھی کے بچے کے خون پر منتر پڑھ کر جسم پر چھڑکاؤ کیا جائے۔اگر کہیں سے انتظام کرسکتی ہو تو کرلو۔"

"ٹھیک ہے، میں کروں گی۔" روپالی نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

☆=======☆=======☆

"اب بولو کیا ایسی لڑکی کو سزا نہیں ملنا چاہیے جو انتہا درجے پر پہنچ جائے۔" فرحت نے سوال کیا۔

"ہاں...... واقعی جو عورت اپنی کوکھ کے لیے کسی معصوم بچے کو ذبح کرنے پر تیار ہوجائے اسے تو زندہ جلادینا چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

''ابھی یہ ابتدا ہے۔ اگلے روز کا واقعہ بھی دیکھو۔ اسی واقعے کی وہ سزا بھگت رہی ہے۔'' کہہ کر فرحت نے پھر سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا اور میں نے خود کو پھر سے اُڑتے ہوئے پایا۔

وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ دو کمرے اور ایک باورچی خانہ، چھوٹا سا آنگن۔ اس کے بعد بیت الخلاء۔ فرحت سیدھی اسی مکان میں اُتر گئی۔ اس مکان میں روپالی بیٹھی تھی۔ کسی سوچ میں گم تھی پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ آنگن میں آئی اور دروازے سے باہر جھانکنے لگی۔ تبھی اس کی نظر ایک چار سالہ بچے پر پڑی۔ وہ بچہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ بلیونیکر اور سفید شرٹ میں بہت پیارا لگ رہا تھا۔ روپالی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''بابو! ادھر آؤ۔''

وہ بچہ مسکراتا ہوا اس کے نزدیک آ گیا۔ روپالی نے گلی کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بچے کو اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا پھر بچے کو ساتھ لے کر کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے بچے سے کہا۔ ''بابو! حلوہ کھاؤ گے؟''

''ہاں خالہ!'' وہ سر ہلا کر بڑے معصوم انداز میں بولا۔

روپالی نے نعمت خانے سے حلوے کی پلیٹ نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔

بچے نے بڑی رغبت سے کھانا شروع کیا۔ ابھی اس نے دو چار لقمے ہی کھائے ہوں گے کہ روپالی نے اسے پیچھے سے پکڑا اور زمین پہ پٹک کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر جو منظر میں نے دیکھا تو میرے پسینے چھوٹ گئے اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں کھولیں تو وہ کمرے کا کچا فرش کھود کر بچے کو دفن کر رہی تھی۔ وہیں ایک کنارے میں المونیم کا تسلہ رکھا ہوا تھا جس میں لبالب خون بھرا تھا۔

بچے کو دفن کر کے اس نے دو خالی بوتلوں میں خون بھرا اور انہیں لے کر نکل پڑی۔ بوتلوں کو اس نے کپڑے کے تھیلے میں رکھا تھا۔ بس سٹاپ پر آ کر سبحانی بس سروس کی بس میں سوار ہو گئی۔ ہم اس بس کے ساتھ ساتھ اُڑ رہے تھے۔

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ میں پری تو ہوں نہیں، پھر ہوا میں کیسے اُڑ رہی تھی؟ اس کا راز آخری صفحات میں بتاؤں گی۔ فی الحال تو میری رُوداد سنیے۔

میں دیکھ رہی تھی کہ وہ بس میں بیٹھی ہے۔ بس نے اسے گلستان کے سٹاپ پر اُتارا پھر وہ سائیکل رکشہ پر سوار ہو کر سکھاری بازار پہنچی۔

سادھک کے ہاں بالکل سناٹا تھا۔ روپالی کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا پھر بولا۔ ''روپے کا انتظام ہو گیا؟''

''نہیں...... میں خون لے آئی ہوں۔''

سادھک کا چہرہ اُتر گیا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، وہاں بیٹھ جاؤ۔'' پھر وہ مورتی کی طرف گھوم گیا۔ اب اس کی پیٹھ روپالی کی طرف تھی۔

وہ کچھ دیر تک منتر پڑھتا رہا پھر اس نے رُک کر کہا۔ ''روپالی! غور سے دیکھو اب میرا چہرہ کالی مائی کی طرف ہے اور پیٹھ تمہاری طرف یہ بات ذہن میں رہے کہ دائی سے پیٹ چھپانا، ڈاکٹر سے مرض چھپانا یا شرم کرنا بیوقوفی ہے۔ یہاں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ڈرو نہیں، اپنے تمام کپڑے اتار کر جسم کے ان حصوں پر خون کے ہلکے ہلکے چھینٹے مارو جہاں جہاں تمہارا شوہر ہاتھ لگاتا ہے اور پھر کپڑے پہن کر میری طرف دیکھے بغیر اسی حالت میں

گھر چلی جانا اور جس طرح بھی ممکن ہو، آج رات شوہر کو ضرور ''راضی'' کر لینا۔ پھر ایک ہفتے کے اندر تم خود نتیجہ دیکھ لوگی۔''

روپالی نے اسی طرح سب کچھ کیا اور گھر جانے کے لیے نکل پڑی۔

☆=======☆=======☆

''اب تم خود بتاؤ، کیا ایسی عورت کو سزا نہیں ملنی چاہیے؟'' فرحت نے مجھ سے پوچھا۔

غم و غصے سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے کہا۔ ''ایسی عورت کو تو زندہ گاڑ دینا چاہیے۔ یہ عورت نہیں، ڈائن ہے۔''

''لوگ مکافاتِ عمل کو بھول جاتے ہیں۔ دیکھو...... اللہ تعالیٰ کی لاٹھی کیسی بے آواز ہے۔ بعد میں روپالی کے ساتھ کیا ہوا، یہ بھی دیکھ لو۔'' کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے سامنے پھر سے روپالی کا گھر آ گیا۔ روپالی ایک دوسری عورت سے کہہ رہی تھی۔ ''آپا! آپ نے کہا تھا کہ سادھک بہت بڑا تانترک ہے۔ اس کا ایک منتر کافی ہے مگر ابھی تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''ارے پگلی! عمل کرنے کے بعد اثر ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔ اب کب بلایا ہے؟''

''ایک ہفتے کا ٹائم دیا تھا۔ ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ آج میں جاؤں گی۔''

''تو پھر انتظار کس کا ہے۔ چلی جاؤ کیونکہ آج اتوار ہے۔ آدھے دن کی نشست ہوتی ہے۔ شام میں وہ کسی سے نہیں ملتے۔''

''میں تو ہمیشہ شام سے پہلے جاتی ہوں ورنہ تو میرے میاں کو معلوم ہو جائے گا۔''

''تو پھر نکل لو۔''

روپالی نے برقع پہنا اور گھر سے نکل پڑی۔ بس کے ذریعے گلستان اور پھر سائیکل رکشے سے سکھاری بازار پہنچی۔ وہ رکشے سے اُتری بھی نہ تھی کہ اس کی نظر سادھک پر پڑی اور وہ حیران رہ گئی۔ وہ پولیس کے گھیرے میں اپنے گھر سے نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔

روپالی نے ایک آدمی سے پوچھا کہ ''بھائی! کیا بات ہے؟ اتنی بھیڑ کیوں ہے؟'' تو اس نے جواب دیا۔ ''بہت بڑا جعلساز تھا یہ! اس نے پتا نہیں کتنی عورتوں کو برباد کیا ہے۔ ایک عورت نے اس کے خلاف رپورٹ درج کرا دی اور یہ پکڑ میں آ گیا۔ اس نے قبول کر لیا ہے کہ یہ سو سے زیادہ عورتوں کو بلیک میل کر چکا ہے۔''

روپالی نے فوراً ہی رکشے والے کو واپس چلنے کے لیے کہا اور بس سے اپنے گھر لوٹ آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کے شوہر نے طلاق نامہ تھما کر اسے باہر نکال دیا ہے۔ وہ اپنی ماں کے گھر آ گئی ہے۔

''کچھ دیر دم لینے کے لیے آنکھیں کھول دو۔'' فرحت نے کہا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں پھر سے ہوٹل کے کمرے میں تھی۔

''تم نے ابھی اس کا صرف ایک رُخ دیکھا۔ روپالی کا دوسرا رُخ بھی میں دکھاؤں گی مگر ابھی نہیں۔ ایک بار کا سفر میری قوت کو ختم کر دیتا ہے۔''

''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب اسے طلاق ہو گئی تو پھر روپالی کی گود میں بچہ کس کا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی دکھاؤں گی مگر خدا کے لیے، تم اس کی مدد کرنے کے لیے مجھ سے نہ کہنا۔''

’’اچھا چلو بتادو کہ یہ بچہ کس کا ہے؟‘‘

’’پہلے شوہر سے طلاق کے بعد یہ گھر والوں کے درمیان آ گئی۔ گھر میں دو بھائی تھے۔ ماں اور باپ تھے۔ یہ سب کی خدمت میں لگی رہتی۔ اتنا تو تم جانتی ہوگی کہ گھر والوں کے لیے کنواری بیٹی سے زیادہ بھاری طلاق یافتہ بیٹی ہوتی ہے۔ گھر والے بھی اس سے پریشان ہو گئے تھے۔ خاص کر اس کی دونوں بھابیاں! ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے اُٹھا کر پھینک آتیں۔ وہ دونوں اپنے اپنے ذرائع سے اپنے گھر والوں کی مدد سے کسی رنڈوے کی تلاش میں تھیں۔ بالآخران کی تلاش کامیاب ٹھہری اور ایک ایسا شخص مل گیا جس کی بیوی مرچکی تھی۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں اور دونوں ہی شادی کے قابل تھیں۔ دونوں بھابیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ انہی کی وجہ سے وہ شخص راضی ہو گیا اور اس کی شادی ہو گئی۔ قسمت کی خوبی کہ ادھر وہ اس کے گھر پہنچی اور اُدھر لڑکیوں کے ننھیال والوں نے لڑکیوں کے ماموں پر زور ڈالا اور وہ اپنے دو بیٹوں سے نکاح کر کے انہیں اپنے گھر لے کر چلے گئے۔ اب اس گھر کی یہ بلا شرکت غیرے مالک بن گئی۔ اسے وہاں اتنی خوشیاں ملیں کہ یہ اپنا ماضی بھلا بیٹھی۔ پہلے شوہر نے بھی دوسری شادی کر لی تھی مگر اس سے بھی اسے کوئی خوشی نہ ملی بلکہ اس کی زندگی جہنم بن گئی۔ یہ ساری اطلاعات اسے مل رہی تھیں۔ وہ خوش تھی کہ اسے طلاق دینے والا بھی خوش نہیں ہے۔ ادھر اسے ایک اور خوشی مل گئی۔ اسے اس وجہ سے طلاق ملی تھی کہ بانجھ ہے مگر اب اسے اپنے اندر ایک اور وجود کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر اس کی گود میں ایک ننھا سا پھول آ گیا۔ وہ بچہ اپنے باپ کی کاپی تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کے دن عید اور راتیں شب برأت کی طرح گزر رہی تھیں کہ ایک دن اس نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بچہ اس کے دروازے پر کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے اپنا بچہ مجھے دے دے۔ یہ خواب اب اسے تواتر سے نظر آ رہے ہیں۔ اسی کے لیے وہ پریشان ہے۔‘‘ فرحت نے اسے پوری روداد سنا دی۔

’’خواب دراصل نفسیاتی دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر اسے کچو کے لگا رہا ہوگا کہ اس نے ایک معصوم بچے کا خون کیا تھا۔ یہی بات اسے خواب کے ذریعے ستا رہی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’لیکن اب یہ بات خواب تک محدود نہیں ہے۔ تقریباً ایک ماہ پہلے جب اس کا شوہر بزنس ٹرپ پر جیسور گیا ہوا تھا کہ اسے وہی خواب پھر نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بچہ جس کے پاؤں کیچڑ سے سنے ہوئے تھے، وہ دروازے پر آ کر کھڑا ہے اور پالنے کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا ہے کہ ’’میں بالکل اکیلا ہوں۔ اپنا بچہ مجھے دے دے۔‘‘

’’تو کیا ہوا، ایسا خواب تو اسے پہلے بھی آیا تھا۔ یہی تو تم بتا رہی تھیں۔‘‘

’’مگر جب وہ بیدار ہوئی تو اسے دروازے پر کیچڑ سے سنے پیروں والے بچے کے پیروں کی چھاپ دروازے پر نظر آ گئی تھی۔‘‘

’’کیا واقعی؟‘‘

’’بالکل...... اس بچے کے پیروں کی چھاپ وہاں صاف نظر آ رہی تھی۔‘‘

’’تو کیا واقعی وہاں کوئی بچہ آیا تھا؟‘‘

’’ہاں...... اسی معصوم بچے کی روح آ رہی ہے۔ وہ اپنا انتقام لینا چاہتی ہے۔‘‘

''اس کا کوئی علاج؟''

''میں خود بھی روح ہوں اس لیے مجھے بچے سے انسیت ہوگئی ہے۔ میں اسے انتقام لینے سے روک نہیں سکتی۔''

میں مخمصے میں پڑ گئی کہ اسے کیسے بچاؤں؟ رضیہ بضد تھی کہ اسے بچایا جائے اور فرحت مدد دینے سے انکاری تھی۔ میں کیا کروں؟

''اچھا...... میں جا رہی ہوں۔'' کہہ کر فرحت چلی گئی۔ اب مجھے خود ہی کوئی راستہ تلاش کرنا تھا۔ کافی تلاش کے بعد میں نے خود روپالی سے بات کرنے کی ٹھانی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ابھی ہلکی سی جھپکی آئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر کہا۔ ''دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اندر آ جاؤ۔''

اندر آنے والی رضیہ تھی۔ اس نے کہا۔ ''روپالی آ گئی ہے۔''

''اسے اکیلے بھیج دو۔ کمرے میں کوئی نہ آئے۔''

''جی اچھا......'' کہہ کر وہ چلی گئی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ایک قبول صورت عورت داخل ہوئی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہی روپالی ہے کیونکہ اس کا عکس میں دیکھ چکی تھی۔ اس کی تمام حرکتوں سے واقف تھی۔ میں نے اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہا پھر بولی۔ ''میں دروازہ بند کر رہی ہوں۔''

میں نے دروازہ بند کیا اور بستر کے قریب آئی پھر بولی۔ ''اب میں تم سے جو کچھ پوچھوں، بالکل سچ بتانا اگر تم نے غلط بتایا تو سوچ لو کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گی۔''

''پوچھیں کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔'' روپالی نے سر جھکا کر کہا۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی لیکن مجھ سے ایسے مخاطب تھی جیسے میں اس سے بہت بڑی ہوں۔

''تم نے پہلے شوہر سے طلاق کیوں لی؟''

''میں نے لی نہیں اس نے خود ہی دی۔''

''کیا اس لیے کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ تم بانجھ ہو؟''

''ہاں...... اسی بات پر اس نے طلاق دی تھی۔ مجھے طلاق دے کر اس نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن اس سے بھی اولاد نہیں ہوئی جبکہ میں ایک بچے کی ماں بن گئی۔'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جلدی دروازہ کھولو۔'' باہر سے رضیہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ ''اماں...... اماں کی حالت بہت خراب ہے۔ جلدی سے جا کر دیکھیں۔''

میں کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ روپالی کی ماں صوفے پر سر ڈھلکائے پڑی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار بہت تیز تھی۔ روپالی بھی ماں کی حالت دیکھ کر گھبرا اُٹھی تھی۔ اس نے فون کا ریسیور اُٹھا کر کاؤنٹر سے رابطہ کیا اور ڈاکٹر بھیجنے کی استدعا کی۔

میں نے روپالی کی ماں کے پیر چھو کر دیکھے تھے۔ پیر بالکل ٹھنڈے تھے جبکہ پیشانی گرم ہو رہی تھی۔ پتا نہیں، کس خیال کے تحت میں نے ابو والی کتاب میں مرقوم حفظ و امان والی دعا کو پڑھا اور ان کی پیشانی پر پھونک ماری۔ ساتھ ہی ساتھ میں درود بھی پڑھتی جا رہی تھی۔ فقیر بابا نے بتایا تھا کہ درود کے بے شمار فوائد ہیں۔ حکمِ رب تعالیٰ ہے۔ ”اے مسلمانو! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھو کہ فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ دُکھ درد، بلا مصیبت سے چھٹکارا پانے کی سب سے اچھی دعا یہی ہے۔“

ابھی میں درود پڑھ ہی رہی تھی کہ بڑی بی کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر کی دوا سے پہلے ہی میری دعا نے کام کر دکھایا تھا اس لیے میں خوش تھی۔ ایک نئی دعا کا تجربہ ہو گیا تھا۔

بڑی بی سے میں نے پوچھا۔ ”آپ کو ہوا کیا تھا؟“

”میں یہاں بیٹھی رضیہ سے باتیں کر رہی تھی کہ کھڑکی پر مجھے کسی آدمی کا سایہ دکھائی دیا۔ میں حیران تھی کہ تیسری منزل کی کھڑکی پر کسی کا سایہ کیسے آ گیا؟ اگر کوئی ہے تو وہ یہاں تک پہنچا کیسے؟ ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ کھڑکی پر ایک بھیانک آدمی کی شکل نظر آئی۔ وہ مجھے اشارے کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی میرے حواس جواب دے گئے۔“

بڑی بی کو کسی بھیانک شکل کا نظر آنا اور میرے دعا پڑھتے ہی ہوش میں آ جانا، بتا رہا تھا کہ وہ کوئی بدروح تھی جو مجھے میرے عمل سے روکنا چاہتی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں روپالی کی مدد کروں یا پھر پرکاش کے گرد نے کوئی چال چلی ہے۔ جنگ کے وقت ہر پارٹی دوسری پارٹی کے بارے میں پورا کھوج رکھتی ہے۔ پجاری بھی میری تاک میں ہوگا۔ اسے پل پل کی خبر مل رہی ہوگی۔ میرے پاس تو فقط دو مددگار قوتیں تھیں۔ ایک فقیر بابا اور دوسری فرحت! جبکہ پجاری نے نہ جانے کتنی پُراسرار قوتیں مدد کے لیے جمع کر رکھی ہوں گی۔ ان حالات میں، مَیں کیا کروں، یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے رضیہ سے کہا کہ وہ روپالی اور اس کی ماں کو واپس ڈھاکا بھیج دے۔ میں خود ڈھاکا آ کر روپالی کو نجات دلا دوں گی۔

روپالی کی ماں فوراً مان گئی۔ اس نے اسی وقت فون پر پی آئی اے کی سیٹ بک کرا لی اور واپسی کی تیاری کرنے لگی۔

میں رضیہ کو ساتھ لے کر واپسی کے ارادے سے سائیکل رکشہ پر بیٹھ گئی۔ رکشہ چل پڑا۔

رکشہ چلانے والا مقامی لباس میں تھا۔ اس نے لنگی (تہ بند) باندھ رکھی تھی اور جسم کے اوپری حصے میں پھٹی ہوئی بنیان تھی۔ جب جب وہ پیڈل پر زور ڈالتا، اس کی پنڈلیوں کی رگیں تن جاتیں۔ ایک گولا سا اُبھر آتا۔ میں بے خیالی میں رکشے والے کے پیروں پر نظریں جمائے ہوئے تھی کہ یکایک مجھے ایسا لگا جیسے رکشہ بادلوں پر چل رہا ہو۔ تارکول کی کالی سڑک نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے چونک کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ بات صحیح تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا اور رکشہ گویا آسمان پر اُڑ رہا تھا۔ میں نے رضیہ کی طرف دیکھا۔ اس کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ گویا وہ ہر فکر سے بے گانہ تھی۔ بے

ہوش تھی، نیند میں ڈوبی ہوئی تھی یا پھر وہ مر چکی تھی۔ اسے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں نے فرحت کو مدد کے لیے پکارنا چاہا مگر مجھے ایسا لگا جیسے میرا ذہن کورے کاغذ کی مانند ہو چکا ہے اور مجھے کچھ بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔ یہاں تک کہ میں مالک ارض وسما کا نام ادا کرنا بھی بھول چکی تھی۔ گویا میرا ذہن پوری طرح سے مقفل ہو چکا تھا۔ اتنی دیر میں وہ رکشہ مندر کے احاطے میں اُتر چکا تھا۔ اس سے پہلے میں روحانی طور پر یہاں آئی تھی لیکن اس بار جسمانی طور پر آ گئی تھی۔ رکشہ جیسے ہی نیچے اُترا، میں سکتے کے عالم میں آ گئی۔ میرے سامنے کالی مائی کھڑی تھی۔ اس کا بھیانک روپ زندہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے آٹھ ہاتھ تھے اور وہ بالکل برہنہ کھڑی تھی۔ ستر پوشی کے لیے کلائی تک کٹے انسانی ہاتھوں کی جھالر تھی۔ ہاتھوں میں پکڑے گنڈاسے سے خون ٹپک رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں انسانی سر تھا جسے اس نے بازوؤں کی مدد سے پکڑ رکھا تھا۔ تقریباً ہر مندر میں کالی کا یہی روپ دیکھا تھا۔ اسی روپ کی پوجا ہوتی تھی مگر اس وقت کا روپ کچھ اور بھی دکھا رہا تھا۔ مجھے سینے میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا پھر میں نے بڑی مشکل سے خود کو سمیٹ کر ورد کرنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہ دیا کیونکہ کالی مائی بڑے بھیانک روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تازہ خون کے دھبے تھے۔ اس کے ہاتھوں کے اوپر کندھوں پر سانپ رینگتے نظر آ رہے تھے جن کی پھنکار کی آواز بے حد دہشت ناک تھی۔ اس کے جسم کی رنگت اُلٹے توے سے بھی زیادہ سیاہ تھی گویا دنیا جہان کی سیاہی اُلٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے لپک رہے تھے۔ وہ سرتاپا قہر ہی قہر دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس کی بھیانک آواز میری قوتِ سماعت سے ٹکرائی۔ ”میں اپنے دشمنوں کو آکاش سے پاتال تک کھوج لیتی ہوں۔“ تم نے میرے مہاسیوک (سب سے بڑے غلام) کا اپمان (بے عزتی) کی ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے ساتھ کچھ شکتیاں (قوتیں) ہیں مگر آج میں تمام دیوی دیوتاؤں کی شکتیاں ایک تریک (جمع) کر کے آئی ہوں۔ آج تمہیں دھرتی کی کوئی بھی شکتی میرے پرکوپ (عذاب) سے بچا نہیں سکتی۔“

مجھے یکلخت ابو کی کتاب میں درج ایک خصوصی دعا کا خیال آیا مگر اس کا متن یاد نہیں آ رہا تھا۔ مایوسی میرا مقدر بن چکی تھی۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے کالی مائی کے بھیانک روپ کو دیکھ رہی تھی۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ”تمہاری آنکھوں میں نراشا کیسی ہے؟ تم تو بہت بلوان ہوا کرتی تھیں۔ اپنی شکتیوں کو آواز دو۔ اس بڈھے کو آواز دو۔ جس نے تمہیں وشواس (یقین) دلایا ہے کہ وہ میری شکتی کو بھی پراجیت (شکست) کر سکتا ہے۔ تمہارے سندر مکھڑے پر گھور نراشا کے لچھن اچھے نہیں لگتے۔ چہکنے کی کوشش کرو میری بلبل۔“

وہ میری بے بسی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ میری مجبوریوں پر طنز کر رہی تھی۔ میری حسرتوں پر تیرونشتر چلا رہی تھی اور میں خاموش تھی۔ اس کے کندھوں پر رینگتے سانپوں کی پھنکاریں بڑھ گئی تھیں۔

”تم اپنی انتم اِچھا (آخری خواہش) بیان کرو۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کی یہ مسکراہٹ بھی خوف ناک لگی۔ ”کیونکہ میں تمہیں اتنا تڑپاؤں گی کہ تم خود موت کی تمنا کرنے لگو گی۔ پہلے میں تمہاری سہیلی کو اس طرح بے عزت کراؤں گی کہ تم تڑپ تڑپ اُٹھو گی۔ سب کے سامنے اس کی عزت دھجیوں میں بکھرے گی اسی سڑک پر۔“ اس کے لہجے میں سفاکی کے ساتھ اعتماد بھی تھا۔ ”آج دھرتی آکاش کی کوئی بھی شکتی خواہ

کتنی ہی مہان کیوں نہ ہو، میرے سامنے نہیں آ سکے گی۔''

پھر وہ تیزی سے رضیہ کی طرف بڑھی۔ کندھے پر رینگتے سانپوں کی زبانیں لہلہانے لگیں۔ اس کے تیور ہر لحہ غضب ناک ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے تازہ خون کے قطرے اُبل اُبل کر اس سیاہ جسم پر پھیل رہے تھے۔

''نہیں...... تم رضیہ کو کچھ نہیں کہو گی۔''

''مجھے کون روکے گا؟ تم یا تمہارا مددگار بڈھا؟ آج تم سب کو بلا لو مگر مجھے کوئی نہیں روک پائے گا۔''

''میں جانتی ہوں، جب جب تمہارا یہ وکرال روپ دنیا کے سامنے آتا ہے تو تباہی پھیلتی ہے۔ جب تم مہشا شور سے لڑنے کے لیے اس روپ میں آئی تھی تو تمہارا شوہر شنکر بھگوان اس دنیا کو بچانے کے لیے تمہارے راستے میں لیٹ گیا تھا اور تم اس پر چڑھ گئی تھیں۔ اپنے قدموں تلے روندے وجود پر تمہاری نظر پڑی تو تمہاری زبان نکل کر باہر آ گئی اور تم اسی حالت میں مر گئیں یعنی تمہارے روکنے کے لیے تمہیں مارنا ہوگا۔''

''اگر تم یہ سمجھتی ہو تو یہی کر دکھاؤ'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''شاید تم بھول رہی ہو کہ تم نے ایک بار اور اسی روپ میں نکلنے کی کوشش کی تھی کلکتہ میں۔ یاد ہے ناں؟ لیکن ایک مسواک کی مار سہہ نہ سکیں۔ یاد دلاؤں کہ وہ مسواک پھینک کر کس نے ماری تھا؟ وہی جن کا مزار کلکتے کے خضر پور میں ہے۔ کہو تو انہیں آواز دے کر بلاؤں؟''

میرا ذہن ہر معاملے میں کام کر رہا تھا۔ صرف دعائیں یاد نہیں آ رہی تھیں۔ شاید اس نے ذہن کو باندھ دیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی سے زیادہ رضیہ کی زندگی عزیز تھی کہ وہ بے قصور اس جھگڑے میں گھسیٹی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم مہان شکتی ہو تو کچھ دیر کے لیے میرے ذہن کو آزاد کر دو پھر دیکھو، میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''مجھ سے پنجہ لڑاؤ گی کیوں؟'' وہ بڑی حقارت سے مسکرائی پھر اس نے ہاتھ اُٹھا کر لہرایا تو مجھے ایسا لگا، جیسے میرے ذہن پر چھایا جمود ٹوٹ گیا لیکن جیسے ہی میں نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھنی چاہی کہ میرا ذہن پھر ماؤف ہو گیا۔ گویا وہ میرے ساتھ چوہے بلی والا کھیل کھیل رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر نیچے گرایا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ رضیہ کے جسم پر لپٹی ساڑھی غائب ہو گئی۔ وہ صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ (Petti Coat) میں بیٹھی تھی۔ میں اس پر اپنی چادر پھینکنا چاہتی تھی کہ وہ رکشے سے نیچے اُتر آئی۔ اب وہ سڑک کے درمیان کھڑی تھی۔ کچھ لوگ اسے اس حالت میں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ تبھی مندر سے ایک لحیم شحیم شخص نکلا۔ اس کی طرف دیکھ کر کالی مائی بولی۔ ''اب یہ باقی کا کام پورا کرے گا اور تماشائی لطف لیں گے۔''

میں نے خود سے کہا۔ ''کاش وہی بابا ایک بار پھر مل جاتے تو وہ مجھے ایسے حالات سے نمٹنے کا طریقہ بھی بتا دیتے۔'' تبھی مجھے ایسا لگا جیسے میرے کان میں کسی نے سرگوشی کی ہو۔ ''تُو اللہ تعالیٰ پر یقین رکھ کر بھی کسی کی مدد کی طالب ہے۔''

اس خیال کے آتے ہی میں نے رب العالمین کو پکارنا شروع کر دیا تب ہی میرے اندر سے آواز اُٹھی۔ ''تیرا سب سے بڑا ہتھیار بزرگوں کی تعلیم کردہ دعائیں ہیں اور اسمِ باری تعالیٰ ہے۔ تُو اسمِ اعظم والی دعا کو کیوں نہیں پڑھتی؟''

بس میں نے اُسی دعا کو پڑھتے ہوئے خداوند قدوس سے فریاد کی۔ ''بس میرے مولیٰ! اب مجھ میں اتنی قوت نہیں ہے کہ میں کالی کا مقابلہ

کرسکوں۔ طاغوتی طاقت سے تُو ہی چھڑا سکتا ہے۔ اب اور کس سے فریاد کروں کہ تُو میری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، میرا مددگار ہے۔"

میرا اتنا کہنا ہی کافی ثابت ہوا اور رضیہ کے جسم سے اُترتے کپڑے جھٹکے سے رُک گئے۔ کالی مائی کی ہنسی کو بریک لگ گئے اور اب وہ خالی خالی آنکھوں سے اِدھر دیکھ رہی تھی۔

میں اُچھل کر رکشے پر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ میری سانس اب تک پھولی ہوئی تھی۔ میں نے اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لڑکھڑاتی آواز میں پکارا۔ "رضیہ! رضیہ! ہوش میں آؤ...... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں کہ مجھے ہوا کیا تھا؟" رضیہ نے کہا۔

"میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ خود کو سنبھالو اور اللہ کا نام لو۔"

رضیہ نے خود کو سنبھال لیا۔ اب ہم اکبر نگر سے نکل کر ناتھ نگر کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اکبر نگر کی خوبصورت مسجد جسے مغلوں کی تعمیر کردہ بتائی گئی تھی، کافی پیچھے چھوٹ چکی تھی اور ناتھ نگر کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

رضیہ جسے میں اس علاقے کے لیے گائیڈ کا خطاب دے چکی تھی، اس کی حالت سنبھل چکی تھی اس لیے وہ چہک رہی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ یہ علاقہ اس وقت بھی آباد تھا جب مہا بھارت کی جنگ ہوئی تھی۔ جانتی ہو، یہ مہا بھارت کیا ہے؟ یہ ایک تاریخی جنگ تھی۔ دہلی جسے اس وقت ہستنا پور کہتے تھے، وہاں ایک راجا ہوا کرتا تھا۔ اس کی ایک بیوی سے پانچ بیٹے تھے جو پانڈو کہلاتے تھے اور دوسری بیوی سے سو بیٹے تھے جسے کورو کہا جاتا تھا۔ سو بیٹوں کی ماں نے اپنے نابینا شوہر کو ورغلا کر پانڈو اور اس کی ماں کو ہستنا پور سے جلاوطن کرا دیا اور راج سنگھاسن (تخت و تاج) کا حقدار اپنے بیٹوں کو قرار دلوا دیا۔ پانڈو جنگل جنگل پھرنے لگے۔ ایک جگہ ان پانچوں بھائیوں کو ایک بے سہارا لڑکی ملی جس نے اپنا نام دروپدی بتایا۔ وہ اسے لے کر اپنی ماں کے پاس پہنچے۔ ماں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ پانڈوؤں نے کہا۔ "اماں! آج جنگل میں ہمیں یہ ملی ہے۔"

ماں نے سمجھا، کوئی پھل وغیرہ ملا ہے اس لیے وہ بغیر دیکھے بولی۔ "پانچوں مل کر کھاؤ۔"

ماں کا حکم تھا اس لیے انہوں نے اسے پانچوں کی بیوی بنا لیا۔

"کیا...... ایک عورت کے پانچ شوہر؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں...... یہ سچ ہے اور مزیدار بات یہ ہے کہ اترانچل میں دروپدی کے ماننے والے بے شمار قبائل ہیں جن میں یہی رسم اب تک چل رہی ہے کہ ایک ہی بھائی شادی کرتا ہے اور وہ باقی تمام بھائیوں کی بیوی ہوتی ہے۔"

"ارے واقعی...... کیا یہ سچ ہے؟"

"اگر موقع ملے تو خود جا کر دیکھ لینا۔"

"اور اگر دوسرا بھائی کسی کو پسند کرنے لگے تو؟"

"وہ اسے بھی بیاہ کر گھر لا سکتا ہے لیکن وہ بھی سب کی بیوی ہوگی۔"

''عجیب رسم ہے۔''

''ہاں بھئی یہ دنیا عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔ خیر، میں مہابھارت کی کہانی سنا رہی تھی کہ دروپدی کو انہوں نے اپنی بیوی بنالیا اور جب بن واس (ملک بدر) کا وقت پورا ہوا تو وہ واپس ہستنا پور آئے اور تخت و تاج کی مانگ کی۔ اس وقت کوروں کا ماموں شگونی ساتھ تھا۔ اس نے چال چلی اور جوا شروع کرا دیا۔ اس جوئے میں دروپدی کو بھی پانڈو ہار گئے۔ کوروں نے سب کے سامنے اسے برہنہ کرنا چاہا۔ نتیجتاً جنگ ناگزیر ہوگئی۔ اس جنگ میں بھارت ورش کے تمام راجاؤں نے شرکت کی۔ اس علاقے یعنی بھگلدت پور، چمپا پوری کے راجا کرن نے بھی شرکت کی تھی۔ اسی جنگ میں شری کرشن نے جو بھگوان ہیں، انہوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس جنگ میں انہوں نے جو مشورے دیئے، جو باتیں بتائیں، وہ 'بھاگوت گیتا'' کہلائی، ہندوؤں کی مقدس کتاب۔''

میں رضیہ سے کہانی سن تو رہی تھی مگر ذہن کہیں اور تھا میں جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ابھی ہم ناتھ نگر سے پہلے چمپا نگر میں داخل ہی ہوئے تھے کہ یکا یک ٹائر زوردار آواز کے ساتھ پھٹ گیا۔ رکشے والے نے فوراً بریک دبا دیا۔

سنسان سڑک، کافی دور آبادی، کہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا جس سے مدد طلب کی جاتی۔

''اسٹپنی تو ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''بس اسی کا رونا ہے کہ رکشے میں اسٹپنی نہیں ہوتی ہے۔'' رکشے والا بولا۔ ''تم نے سنا نہیں، بارہ بجے میں نے گاڑی نکالی تھی اور اس وقت بھی بارہ بج رہے ہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''بارہ بج چکے ہیں۔ میں وہیل نکال کر لڑھکاتا ہوا چمپا نگر تک جاتا ہوں۔ ویسے تو یہ بستی مسلمان جولاہوں کی ہے۔ سب کے سب کپڑا بنتے ہیں۔ شاید کوئی ٹائر والا بھی مل جائے۔'' کہہ کر اس نے نٹ بولٹ کھولنا شروع کر دیا۔ رضیہ کی حالت پھر بگڑ گئی۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پتھر کی بن چکی ہو۔ کوئی حرکت نہ تھی۔ اگر پلکیں جھپک نہ رہی ہوتیں تو اس پر مُردے کا گمان ہوتا۔ میں اسے افسوس بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دو قدم ہی چلی تھی کہ ایسا لگا جیسے سیاہ آندھی نے ہمیں گھیر لیا۔ اتنی تیز آندھی تھی کہ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کچھ اُڑا لے جائے گی۔ رکشہ بھی نہیں بچے گا۔ میں نے پھرتی سے خود کو زمین پر گرا لیا تھا تاکہ ہوا میں اُڑتی ہوئی چیزیں مجھ سے ٹکرا نہ جائیں۔ میں بھی ہوا کے تھپیڑے کی وجہ سے منہ کے بل گر سکتی تھی۔ پھر سامنے ہی ندی بہہ رہی تھی۔ اس میں بھی اُڑ کر گرنے کا چانس تھا۔

میں زمین پر لیٹے لیٹے طوفان کے تھمنے کا انتظار کر رہی تھی کہ میری روح فنا ہوگئی۔ رضیہ نے بتایا تھا کہ اس علاقے میں سانپوں کی بہتات ہے۔ اس کا ایک نظارہ سامنے آ گیا تھا۔ سینکڑوں کی تعداد میں سانپ پھنکارتے ہوئے سڑک پر بڑھتے آ رہے تھے۔ شاید نزدیک میں سانپوں کی کوئی ''بانبی'' تھی جہاں یہ سب رہتے ہوں گے۔ طوفان کی وجہ سے ندی کا پانی اس بانبی میں داخل ہو گیا ہوگا جس کی وجہ سے تمام سوراخ پانی سے بھر گئے ہوں گے۔

اگر یہ سانپ یہاں تک پہنچ جاتے تو یقیناً طوفان سے بچنے کے لیے سب کے سب رکشے میں گھس جاتے۔ اندر رضیہ تھی۔ اس کا زندہ بچ

جانا معجزہ ہوتا۔ میں کیا کروں، یہی سوچ رہی تھی کہ زبان خود بخود حرکت میں آ گئی اور میں نے دعا پڑھنا شروع کر دی۔

ابھی بہ مشکل دو بار دعا پڑھی تھی کہ یکا یک ایک جوانِ رعنا بھیگتا ہوا میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے یہی سمجھا کہ شاید وہ نزدیکی بستی کا ہے۔ میں نے اسے بھی لیٹ جانے کا مشورہ دیا مگر اس نے اَن سنی کر دی۔ اس کی نظریں سانپوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس دوران میں، مَیں نے ایک عجیب بات محسوس کی تھی کہ سانپوں کا جھاڑک گیا تھا۔

''اے بھائی!'' میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔ ''طوفان میں اُڑتی ہوئی کوئی بھی چیز تمہیں لگ سکتی ہے۔''

''بے فکر رہو، مجھے کچھ نہیں ہونے کا۔'' اس نوجوان نے مسکرا کر کہا اور پھر سانپوں کی طرف دیکھنے لگا۔

مجھے اس کے انداز پر غصہ آ گیا تھا۔ میں تو اس کی بھلائی کے لیے مشورہ دے رہی تھی اور اس نے مجھے اس انداز میں جواب دیا تھا جیسے میں کوئی بیوقوف سی لڑکی ہوں اسی لیے میں ذرا تیز آواز میں بولی۔ ''کیوں؟ کیا تم جھکڑ پروف ہو کہ تمہیں یہ اُڑتی ہوئی ٹین کی چادریں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں؟ ارے، یہ چادریں جب تک جھونپڑیوں کی چھت پر ہوں تو انسان کو دھوپ اور بارش سے بچاتی ہیں لیکن جب یہ اُڑتی ہوئی، کسی انسان سے ٹکرا جائیں تو اس کا سر بھی قلم کر دیتی ہیں۔''

''غصہ نہیں...... غصہ حرام ہے۔ تم اس وقت پیر دادن شاہ کی جاگیر میں ہو، اس لیے ہی انہوں نے تمہاری حفاظت کے لیے مجھے بھیجا ہے۔ تم مدد کے لیے اللہ تعالیٰ کو پکار رہی تھیں ناں! اس لیے شاہ جی وسیلہ بن گئے۔''

''آں...... یہ پیر دادن شاہ کون ہیں؟ کیا یہ کسی ریاست کے نواب ہیں؟''

''جب تم شہر کے قلب میں پہنچو گی تو بازار کے سامنے ایک پُل نظر آئے گا۔ اس پُل کے نیچے تمہیں ایک مزار ملے گا۔ وہی پیر دادن شاہؒ کا مزار ہے۔''

''یعنی...... یعنی تم میری مدد کے لیے آئے ہو؟''

''ہاں...... یہ اولیاؤںؒ کی سرزمین ہے۔ اس شہر میں تمہیں شاہ حسن باباؒ کا مزار ملے گا۔ پیر شاہؒ کا مزار ملے گا۔ دو دو خانقاہیں ملیں گی۔''

''اچھا...... مگر آپ میری مدد کیسے کریں گے؟''

''مجھے صرف یہ ہدایت ملی ہے کہ میں آپ پر ہونے والے حملوں کا دفاع کروں۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کروں گا کیونکہ ہماری سرشت میں صرف حکم بجالانا ہے۔''

''یعنی آپ......''

''ہاں...... میں انسان نہیں ہوں اور نہ میری تخلیق میں مٹی کا عنصر ہے۔''

''یعنی آپ صرف دفاع کریں گے...... مگر اس طوفان میں کیوں آ گئے؟ یہ تو خدائی حکم سے چلتی ہے۔''

''یہ طوفان نہیں ہے، نظر کا دھوکا ہے۔ تمہارے دشمن (اس کالی مائی) نے چلائی ہے۔''

''ہاں...... ہاں...... یہ میرا کمال ہے۔ میں نے طوفان بھیجا ہے کیونکہ میں اسے جانے نہیں دوں گی۔ یہاں میرے ایک ہزار دوست ہیں تو سو دشمن بھی ہیں جیسے وہ تمہارا مالک ریلوے لائن کے کنارے ڈیرا جمائے بیٹھا ہے۔ جس دن مجھے غصہ آ گیا، کسی ٹرین کو اُٹھا کر اس کی قبر پر دے ماروں گی۔''

''اپنی حسرت پوری کر لو۔''

''کیسے کر لوں، راستے میں تو مسلوں نے گئو ماتا کے گوشت کی دکانیں سجا رکھی ہیں۔'' اس شب دیجور کی اولاد نے منہ بنا کر کہا۔

''پہلے مجھ سے تو مقابلہ کرو پھر کسی اور سے کرنا۔'' جوانِ رعنا نے فخریہ انداز میں کہا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ ''اپنی ساتھی کو رکشہ سے اُتار لائیں تاکہ میں یکسوئی سے اس کا مقابلہ کروں۔ ابھی تک تو یہ آپ کو ڈرا رہی تھی، اب میں اسے اس کی اوقات بتاؤں گا۔''

میں نے پھرتی سے رضیہ کو نیچے کھینچ کر اُتار گیا۔ رضیہ نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی اور نیچے اُتر آئی۔ اس جوانِ رعنا نے ہمارے گرد زمین پر دائرہ سا بنایا پھر کہا۔ ''نہ آپ اس دائرے سے نکلنا اور نہ اس لڑکی کو نکلنے دینا۔ اگر نکلیں تو نقصان کے ذمے دار خود ہوں گی۔''

''اچھا..... تو بند ہو کر میرا مقابلہ کرو گے۔ ابھی بچے ہو، اپنے گرو کو میرے مقابلے پر آنے کے لیے کہو۔'' اس شب دیجور کی اولاد کالی مائی نے طنز کیا۔

''پہلے مجھ سے تو نمٹ لو پھر اس کی شان میں کچھ کہنا، ویسے تم جیسی حقیر کے لیے میں ہی کافی ہوں۔'' جوانِ رعنا نے کہا۔

''اگر تُو خود کو سورما سمجھتا ہے تو اپنی حسرت پوری کر لے۔ میں نے تجھے موقع دیا۔''

''نہیں...... پہلے تم وار کرو۔''

''تو لے یہ میرا وار روک۔'' کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر جھٹکا دیا جیسے کوئی چیز پھینکی ہو۔ اس نوجوان کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ نظر آئی اور اس نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں کو اُٹھا کر کہا۔ ''خبردار رُک جا...... ذرا بھی آگے نہ بڑھنا۔''

میں حیرت سے اس کارروائی کو دیکھ رہی تھی کہ وہ بولا۔ ''اوہ...... میں سمجھ گیا، تم اس نظارے کو دیکھ نہیں پا رہی ہو گی۔'' پھر اس نے میری آنکھوں پر اپنے ہاتھوں کو پھیر کر کہا۔ ''اب دیکھو۔''

اب جو میں نے دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ خوف کا شیش ناگ گویا ریڑھ کی ہڈی میں کلبلانے لگا۔ ڈر سے روح فنا ہوتی محسوس ہوئی کیونکہ موت ہم سے صرف چند ہاتھ کی دوری پر ٹھہر گئی تھی۔ وہ ایک بڑی سی چٹان تھی۔ سیاہ پتھر کی چٹان جو ہوا میں معلق تھی۔ اسی کو اس شب دیجور کی اولاد نے پھینک کر ہمیں مارنا چاہا تھا۔ اگر وہ جوان اسے راستے ہی میں نہ روک لیتا تو ہم تینوں کچل کر ہلاک ہو جاتے۔ ہمارا قیمہ بن چکا ہوتا۔

''بھائی! یہ چٹان آئی کہاں سے؟'' میں نے نوجوان سے پوچھا۔

''سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ میرا نام بھائی نہیں، ارتباش ہے اور میرا تعلق قومِ اجنہ سے ہے۔ میں مسلمان جنوں کے قبیلے سے ہوں۔ اب رہا سوال کہ یہ چٹان آئی کہاں سے، تو تم بھی سن لو۔ یہ چٹان یہاں سے تقریباً سو میل کی دوری پر واقع مندار ہل سے پھینکی گئی ہے۔''

''اچھا......اتنی دور سے پھینکی گئی ہے یہ چٹان؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں......مزیدار بات یہ ہے کہ ہندوؤں کے عقیدے میں اس پہاڑ کی بہت اہمیت ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک بار دیوتاؤں اور راکھشسوں نے مل کر سمندر سے امرت (آبِ حیات) نکالنے کی کوشش کی۔ سمندر کو متھنے کے لیے اس پہاڑ کو اُٹھایا اور رسّی کی جگہ اجگر سانپ کو جو جانوروں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ جب امرت نکل آئے گا تو سب تھوڑا تھوڑا چکھ کر امر ہو جائیں گے۔ اب سمندر کی ایک طرف راکھشس اور دوسری طرف دیوتا کھڑے تھے۔ دیوتاؤں نے سانپ کا سر پکڑا اور راکھشسوں نے دُم اور دہی متھنے کی طرح سمندر کو متھنا شروع کر دیا۔ بالآخر امرت نکل آیا۔ جیسے ہی امرت کو شنکر بھگوان نے کمنڈل میں جمع کیا، بے صبر ہو کر سانپ نے اس میں منہ ڈال دیا اور سانپ کا سارا زہر امرت میں گر گیا۔ امرت زہریلا بن چکا تھا۔ اس زہریلے امرت کو کوئی اور نہ پی لے، اس ڈر سے شنکر نے سارا زہر پی لیا اور اس دن سے شنکر کا نام ''نیل کنٹھی'' پڑ گیا یعنی زہر پی کر نیلا ہو جانے والا۔'' ارتباش نے ہندو دیومالائی کہانی ختم کر کے میری طرف دیکھا۔ میں بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔

''کہانی ختم کر لی ہے تو کوئی وار کرو۔ میں بھی تو دیکھوں، تیرے اندر کتنا دم ہے۔'' شب دیجور کی اولاد نے چیخ کر کہا۔

''تیرے اس وار سے خود کو بچا لیا، کیا یہ کم ہے۔'' ارتباش بولا۔ ''اگر پھر بھی وار کرنے کا کہہ رہی ہے تو یہ لے۔ تیرا ہی وار میں تجھ پر کر رہا ہوں۔'' پھر اس نے ہاتھ جھٹکا۔ وہ چٹان جو ہوا میں معلق تھی، واپس پلٹ گئی۔ شاید اسے کالی مائی پر گرنا تھا کیونکہ کالی کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آ رہی تھی۔ اس نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔

''اوم ہرنگ کرنگ مہا یگ شکتی شکتی مہا شکتی۔'' اور وہ چٹان جو دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی، یکا یک ہوا میں ہی رُک گئی۔ پھر وہ پاش پاش ہو کر ذروں میں تبدیل ہوئی اور ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

''لو میاں جی! تمہارا منتر تو گیا پانی میں۔ اب کچھ اور ہے؟'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''ابھی تو تم خوف سے پیلی پڑ رہی تھیں۔ پھر یہ میرا منتر نہیں تھا، تمہارے وار کو تم پر ہی اُلٹا تھا۔ اب میں وار کروں گا۔'' کہہ کر اس نے ہوا میں پڑھ کر پھونکا تھا، پتا نہیں، کہاں سے ایک سانپ نمودار ہو گیا تھا۔ وہ اُڑتا ہوا آیا تھا اور ہمارے سروں پر سے گزرتا ہوا اس کالی مائی کی طرف لپکا تھا لیکن ابھی اس نے آدھا ہی راستہ طے کیا تھا کہ کالی مائی چیخی تھی۔ ''اے بے خبر دار آگے مت بڑھنا۔ جس نے تجھے بھیجا ہے، اسی کو ڈس لے۔ ہے ماں کالی! اپنی شکتی دکھا۔ اسے میاں جی پر واپس دے مار۔''

اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ سانپ پلٹ آیا۔ اس بار اس کا رُخ ہماری طرف تھا۔ اسے پلٹتے دیکھ کر کالی طنزیہ انداز میں بولی۔ ''حساب برابر ہوا۔ تم نے میرے منتر کا توڑ کیا اور میں نے تمہارے۔ اب یہ سانپ جلد ہی تمہیں نرک (جہنم) میں بھیجے گا۔''

میں سوچ رہی تھی کہ اگر یہ خود کالی مائی ہے تو اس نے ماں کالی سے شکتی کیوں طلب کی؟ لگتا ہے، کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔

ارتباش اس کے جواب میں مسکرا کر بولا۔ ''تنتر منتر تم کرتی ہو۔ ہم تو کلامِ الٰہی سے کام لیتے ہیں اور کلامِ الٰہی میں کتنی قوت ہے، اس کا ادراک تمہیں بھی ہے۔ تم نے اپنی قوت دکھا دی، اب میری دیکھو۔'' اس نے بات ختم کر کے چہرہ آسمان کی طرف کیا اور کچھ پڑھ کر پھونک ماری۔ بس

اتنا ہی کافی ثابت ہوا اور غوطہ لگا کر پلٹنے والا سانپ پھر مڑ گیا مگر اس بار اس کا انداز جداگانہ تھا۔ وہ رہ رہ کر غوطہ لگا رہا تھا اور ہر غوطے میں تعداد ڈبل ہو جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر سانپوں کا جال سا پھیل گیا۔ ہزار سے زیادہ سانپ ہو چکے تھے۔

یہ سانپ اپنی تعداد بڑھاتے ہوئے اس طرح آگے بڑھتے جا رہے تھے جیسے وہ جال تیار کر رہے ہوں۔

آسمان پر والی بال کے نیٹ جیسا جال بن چکا تھا جس کا احاطہ کئی میل کا تھا۔ مجھے پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ اس جال میں پھنس جائے گی۔

اتنی بڑی تعداد میں سانپوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر کالی مائی کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں رینگ آئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں بدبدانا شروع کر دیا پھر اس نے کچھ پڑھ کر آسمان کی طرف پھونکا۔ پھونک مارتے ہی ایسا لگا جیسے ایک دیوار، ایسی دیوار جو آگ سے بنی ہے، آسمان تک پھیل گئی ہے۔ اس دیوار کا مقصد بھی سامنے آ گیا۔ سانپ اپنی رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے اس دیوار سے ٹکراتے اور کباب بن کر زمین پر گر جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں ہزاروں مُردہ سانپوں سے زمین پٹ گئی۔ سانپ کو جل جل کر گرتے دیکھ کر کالی مائی بولی۔ ”لے تیرا یہ منتر بھی پانی میں گیا۔ اب کچھ اور ہے تو اسے بھی آزما لے۔“

ارتباش نے کہا۔ ”ہاں...... تو کیا سمجھتی ہے، مجھے شکست دے دے گی؟ جا...... جا کر ابھی اور شکتی جمع کر۔“

”اگر تیرے پاس کوئی اور بھی طاقت ہے تو اسے بھی آزما لے۔“ کالی نے کہا۔ ”میں تیرے بس کی نہیں۔ جا اپنے استاد کو بھیج۔ وہی میرا مقابلہ کر سکے گا۔“

”میرے استاد سے مقابلہ بعد میں کرنا۔ پہلے میری چپل سے مقابلہ کر لے۔“ کہہ کر ارتباش نے داہنے پیر کی چپل اُتاری اور کھینچ کر دے ماری۔ وہ چپل ہوا میں اُڑتی ہوئی آگے گئی۔ اس کے سر سے ٹکرائی مگر زمین پر گری نہیں۔ ہوا میں ہی تھمی رہی۔ پھر تو ایسا ہوا کہ وہ چپل کبھی اس کے سر پر پڑتی اور کبھی پیٹھ پر اور کبھی اس کی گردن پر تو کبھی کندھے پر۔ چپل کی برسات ہو رہی تھی کہ وہ یکا یک اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔ ارتباش نے ہنس کر کہا۔ ”لو وہ تو گئی۔ اب میں بھی چلتا ہوں۔ تم بھی رضیہ کو لے کر جاؤ۔“

ارتباش کے جاتے ہی وہ پھر آ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے میرا پیچھا پکڑ لیا ہے۔

اب اسے شکست دینے کے لیے قرآنی آیات کی مدد لینا ضروری تھی۔ نار کو نور ہی شکست دے سکتا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کرنا چاہا۔ اب تک کا تجربہ یہی تھا کہ جادو سحر کا توڑ آیت الکرسی ہے۔ یہ نہ صرف قرآن پاک کی سب سے طویل آیت ہے بلکہ زود اثر بھی ہے۔ پڑھتے ہی اثر دکھانا شروع کر دیتی ہے۔ اسی خیال نے مجھے ورد پر اُکسایا تھا۔ میں نے جیسے ہی آیات قرآنی کا ورد شروع کیا، میرے دل و دماغ سے خوف کا پردہ ہٹتا چلا گیا۔

ابھی میں نے آیت پوری بھی نہ کی تھی کہ اس نے اُچھال بھری۔ وہ ہوا میں اس طرح آگے بڑھ رہی تھی جیسے پانی میں مچھلی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ میرے پیچھے رکشہ تھا۔ میں اس سے ٹکرا کر گر پڑی۔ اس وقت میری حالت کچھ ایسی تھی جیسے میں نے دوڑتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کی ہو۔ پورا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ گرتے ہی میں نے اُلٹی قلابازی کھائی تھی اور رکشے کے دوسری طرف

پہنچ گئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہی میں نے پھر چھلانگ لگادی کیونکہ وہ میرے سر پر اُڑ رہی تھی۔ کسی کا ہوا میں اُڑنا اور وہ بھی بغیر پَر کے، حیرت کی بات ہے لیکن میں جن حالات کی شکار تھی، ان میں کسی بات پر حیرت کا اظہار حیرت کی بات نہ تھی اس لیے میں صرف خود کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اِدھر سے اُچھل کر اُدھر جاتی اور اُدھر سے اِدھر مگر وہ پیرِ تسمہ پا بن چکی تھی۔ پیچھا چھوڑنے پر تیار ہی نہ تھی۔ آپ یقین کریں گے؟ اُڑتے ہوئے بھی اس کا بڑھنا نہیں رُکا تھا۔ جب بھی وہ میرے قریب سے گزرتی، زن کی تیز آواز سماعت کو جھنجھوڑ دیتی۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں کسی بھی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ یہی کچھ سوچ کر میں نے رضیہ کو بھلا کر چھلانگ لگائی۔

اِدھر میں اُچھلی اُدھر وہ اُڑی اس کی رفتار مجھ سے تیز تھی۔ شاید یہ میری چھٹی حس تھی۔ میں نے یکایک سر کو جھکا کر کمر کو دوہرا کر لیا تھا جس کی وجہ سے بال بال بچ گئی تھی۔ اور اس کے پنجے سے بچ کر صاف نکل گئی تھی لیکن رُکی نہیں تھی۔ دوڑتی چلی گئی تھی۔

اتنی تیز میں زندگی میں کبھی نہیں دوڑی تھی۔ اس تیزی میں خوف کے بچھو کا ڈنک تھا جو مجھے مہمیز کر رہا تھا۔ دماغ میں بس ایک ہی بات گردش کر رہی تھی کہ میں اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی رُکی تو وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ دوڑتے ہوئے میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ ہنوز تعاقب میں تھی۔ اس وقت میں بھول گئی تھی کہ وہ میرے دوڑنے سے تیز اُڑ سکتی ہے۔ اس کا ادراک تب ہوا تھا جب یکایک اس نے اپنے اُڑنے کی رفتار بڑھا دی تھی اور میرے سر پر سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دوڑتے ہوئے پتا نہیں، کتنا وقت گزر چکا تھا۔ میں اب تھکنے لگی تھی۔ سانس بُری طرح پھول رہی تھی۔ سینہ دھونکنی کی طرح پھولنے پچکنے لگا تھا۔ میں کسی بھی لمحے لڑکھڑا کر گر سکتی تھی کہ ایک خوفناک منظر نے پھر سے دہلا دیا۔

مجھے اس طرح دوڑتے دیکھ کر پتا نہیں، کہاں سے ایک آوارہ کتا بھونکتا ہوا سامنے آ گیا۔ اس کی آواز پر کئی اور کتے دوڑ آئے۔ اب ان کی تعداد چھ ہو گئی تھی۔ یہ آدھی درجن کتے مجھ پر حملہ کرتے کہ وہ ان پر جھپٹی۔ پہلے ہی حملے میں اس نے دو کتوں کی گردن سے گوشت کے لوتھڑے اتنی صفائی سے نوچے کہ ان کتوں کو احساس بھی نہیں ہوا ہوگا اور وہ بے دم ہو کر گر پڑے تھے۔ انہیں تڑپتا چھوڑ کر اس نے بقیہ کتوں پر حملہ کر دیا۔

باقی بچے وہ چاروں کتے اس پر لپک رہے تھے مگر ہزار کوشش کے بعد بھی اس تک پہنچ نہیں پا رہے تھے۔ اس عجیب و غریب معرکے نے مجھے رُکنے پر مجبور کر دیا تھا اور میں رُک کر دھڑکتے دل کے ساتھ کتوں کا بُرا ہوتا حشر دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام کتے خاک اور خون میں لتھڑ گئے۔ اتنی دیر میں میری سانسیں بھی قابو میں آ چکی تھیں۔ جیسے ہی اس نے چھٹے کتے کے گلے پر پنجہ مارا، میں نے اپنی جگہ سے دوبارہ دوڑ لگا دی۔

میں پھر اسی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ دوڑتے دوڑتے میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ پھر سے میرے تعاقب میں اُڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ ہر پرندہ اپنے پروں سے اُڑتا ہے مگر یہ بغیر پروں کے اُڑ رہی تھی۔ ایسا کیسے ممکن ہوا؟ یہ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں بس اپنی جان بچانے کی فکر میں تھی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، کتوں کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ اپنی جان خود دے دی جائے۔ آخری وقت تک بچنے کی کوشش کی جائے اگر پھر بھی بچنا ممکن نہ ہوا تو خودکشی کر لی جائے۔ یہی کچھ سوچتی ہوئی میں اُڑنے کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ سنسان سڑک پر میری چپل کی چٹ چٹ گونج رہی تھی۔ ابھی تک کسی نے مجھے روکنے یا اس عفریت سے بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دوڑتے ہوئے میں کہاں پہنچ چکی ہوں اس کا احساس تک نہ تھا اور نہ میں نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مجھے تو فقط اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ پھر بھی اتنا احساس تھا کہ میں شہری حدود سے نکل آئی ہوں اور اب چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان دوڑ رہی ہوں۔ یہ پہاڑیاں کس علاقے کی ہیں، اس کا بھی احساس نہ تھا۔ میں تو بس دوڑے چلی جا رہی تھی۔

مجھے دوڑتے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ میری رفتار کم ہوتی کہ کتوں کی نچی ہوئی لاشیں یاد آنے لگتیں اور میں پھر سے رفتار بڑھا دیتی۔ آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دھوپ بھی تیز تھی۔ ہر موئے تن سے پسینے کا گویا ریلا سا بہہ رہا تھا۔ تھکن الگ تھی۔ پیروں کے جوڑ جواب دے رہے تھے مگر میں دوڑے چلی جا رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر پر برستی آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں کسی شجرِ سایہ دار کے نیچے آ گئی ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر دیکھتے ہی میری روح فنا ہو گئی۔ گویا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اب وہ میرے سر پر پہنچ چکی تھی۔ دھوپ اور میرے سر کے درمیان وہ اُڑ رہی تھی۔ اسی وجہ سے سایہ آ گیا تھا۔

میں نے سمجھ لیا تھا کہ بس میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ اب یہ ڈائیو مارے گی اور میری گردن پر دانت گاڑ دے گی۔ میری شہ رگ کتر دے گی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پوری قوت لگا دی اور جی جان سے بھاگنے لگی۔ اتنی تیز بھاگی تھی کہ اگر موٹر گاڑی سے ریس لگاتی تو اسے پیچھے چھوڑ دیتی۔ اندھا دھند دوڑ رہی تھی اور اس دوڑ کا نتیجہ بھی جلد ہی سامنے آ گیا تھا۔ میرا پیر مڑا تھا یا میں نے ٹھوکر کھائی تھی اور گرتی چلی گئی تھی۔

میں سخت زمین پر دوڑ رہی تھی مگر گرتے وقت ایسا لگا تھا کہ میں کسی گہری کھائی میں گرتی چلی گئی تھی۔ کافی گہرائی میں گرنے کے بعد جب سخت زمین آئی تب پتا چلا کہ میں کسی غار میں گر گئی ہوں۔ غار میں اندھیرے کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ اندھیرے کی وجہ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ گویا میں قید ہو چکی تھی۔

اب میرے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا کہ خود کو میں ختم کر لوں۔ ایسی بے عزتی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ مجھے اب تک اپنی شکست کا یقین نہیں آیا تھا۔ اس بے یقینی کی ایک بڑی وجہ حد سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ فقیر بابا ہمہ وقت میری پہرے داری کے لیے مستعد ہوں گے۔ انہیں دھوکا دینا آسان نہیں ہے۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے نقصان پہنچانا ناممکن ہے مگر ناممکن کو کالی نے ممکن کر دکھایا تھا۔ مجھے وہاں سے اغوا کر کے یہاں، اس غار میں لا چھپایا تھا۔ قید تو میں پہلے بھی کئی بار ہو چکی تھی مگر اس طرح مایوسی کو اپنے آپ پر طاری نہیں ہونے دیا تھا۔ پہلی بار خود کو اتنا مجبور پا رہی تھی۔ وہ غار نما قید خانہ میرے لیے جہنم سے کم نہ تھا۔ غار میں جب میری آنکھ کھلی تھی تو چاروں طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ عجیب سی ناگوار بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے مکروہ سی خرخراتی ہوئی تیز سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

یہ کیسی آواز ہے، میں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تبھی عجیب سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کیچڑ میں بہت سے لوگ دوڑنے لگے ہوں۔ برسات میں بارش کے پانی کی وجہ سے مٹی نرم ہو کر کیچڑ میں تبدیل ہو جائے اور اس کیچڑ میں چلنے کی کوشش کی جائے تو عجیب سی پھس پھس کی آواز ہر قدم کے اُٹھتے ہی سنائی دیتی ہے یعنی جب پیر کیچڑ میں دھنستا ہے اور پھر باہر نکلتا ہے تو ایک مکروہ آواز گونجتی ہے۔ بالکل ویسی ہی

آواز سنائی دے رہی تھی۔

کیا کہیں آس پاس کیچڑ پھیلی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ داہنی جانب کی دیوار سے روشنی کی ہلکی سی لکیر نکلی۔ اس لکیر کی وجہ سے کچھ حد تک وہ جگہ نظر آنے لگی۔ اب جو میں نے غور کیا تو خود کو ایک جزیرہ نما جگہ پر بیٹھے پایا۔ وہ ایک اونچا سا مٹی کا تودہ تھا جس کے گرد کیچڑ ہی کیچڑ پھیلی تھی اور اس کیچڑ میں درجن بھر سور ٹہل رہے تھے۔ وہ مکروہ آواز ان کے چلنے پھرنے کی وجہ سے پھیل رہی تھی لیکن وہ کیچڑ عام کیچڑ نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے شہر بھر کی گندگی وہاں جمع ہوگئی ہو۔ اسی وجہ سے تعفن سا پھیلا ہوا تھا۔

میں حیرت سے وہ منظر دیکھ رہی تھی کہ وہ غار کالی کی آواز سے گونج اُٹھا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ ہم نے تمہیں معاف کردیا، یا میں اس جنات کے بچے سے ڈر کر چھپ گئی ہوں''

''قریب سحر شمع کا بھڑکنا ضروری ہے۔ بجھتی ہوئی شمع کی روشنی یکا یک بہت تیز ہوجاتی ہے۔ تمہارا انجام بھی قریب ہے۔ فکر نہ کرو، بہت جلد ٹھکانے لگادی جاؤ گی۔''

''میں تر نوالہ نہیں، ٹیڑھی کھیر ہوں۔ ہڈی بن کر گلے میں اٹک گئی ہوں۔ اس وقت میں ان کی بے بسی سے لطف لے رہی ہوں۔ وہ جنات کا بچہ مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ میں نے اسے خبر دے دی ہے کہ میں تمہاری قید میں ہوں''

''اور یقیناً وہ مجھے آزاد کرانے کے لیے نکل پڑے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''جی نہیں...... ارتباش تمہیں تلاش کرنے کے لیے نکلا تو ہے لیکن خاطر جمع رکھو۔ وہ پرلیے (قیامت) تک یہاں پہنچ نہیں پائے گا کیونکہ پوتر آتما (پاک روح) اپوتر استھان (ناپاک جگہ) پر کبھی نہیں آتی اسی لیے تو میں نے تمہیں یہاں قید کیا ہے۔ اب جیسے ہی وہ جوانی کے جوش میں آگے بڑھے گا، میرے بیر (مؤکل) اسے دبوچ لیں گے کیونکہ اپوترا استھان پر اس کی قوت آدھی ہوجائے گی۔''

''اس سے پہلے بھی تم نے ایسے کئی دعوے کیے مگر نتیجہ کیا نکلا؟ تمہارا یہ کھوکھلا دعویٰ بھی تم سمیت ختم ہوجائے گا۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''پہلے میں خود طرح دے رہی تھی مگر اب نہیں۔ اب میں یہ سانپ نیولے کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم کرنے والی ہوں۔''

''اور اس کھیل میں یقیناً سانپ تم ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''اور سانپ کا سر چبانا نیولے کا محبوب مشغلہ ہے۔''

''کون کس کا سر چبائے گا، یہ آج ہی معلوم ہوجائے گا۔'' اس نے کہا۔

''حق کی فتح لازمی ہے۔'' میں نے کہا۔ جواب میں پھر اس کی آواز نہ آئی۔ شاید وہ کہیں اور مصروف ہوگئی تھی۔ اس کی صرف آواز سنائی دی تھی۔ وہ نظر نہیں آئی تھی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی، اس سے پہلے بھی وہ مجھ سے اسی طرح کئی بار ہم کلام ہوچکی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کہیں دور بیٹھی مجھ سے باتیں کررہی تھی۔

اس غار میں اب خاموشی چھاگئی تھی۔ سوروں کے چلنے کے علاوہ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے وہاں پھیلی ہوئی ہلکی روشنی میں بہ نظر غور اس غار کا معائنہ شروع کیا۔ جس ٹیلے پر میں بیٹھی ہوئی تھی، وہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر آخری سرے کو دیکھنا چاہا۔ ایک

قدم پھر دوسرا قدم۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی مگر ٹیلے کے آخری سرے پر پہنچ نہ سکی کیونکہ جیسے جیسے میں آگے بڑھتی جارہی تھی، زمین پھیلتی جا رہی تھی۔ اب بھی وہ سرا اتنی ہی دور تھا جتنی دور قدم اُٹھانے سے پہلے تھا۔ پھر بھی میں دم بخود یا حیران نہ تھی۔ اس کا مقابلہ اس بار اہم شخصیات سے تھا۔ یقیناً اس بار وہ معمولی سحر کا استعمال تو کرتی نہیں۔ اس نے اپنا پورا علم، پورا زور لگا دیا ہوگا کیونکہ اس معرکے میں میری حیثیت اہم مہرے کی تھی۔ میری ہی وجہ سے بساط قائم تھی۔ جیسے ہی میں شکست کھاتی، وہ فتح یاب ہو جاتا۔

پھر بھی میں نے ہار نہ ماننے کی ٹھان لی تھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی جارہی تھی۔ وہ چھوٹا سا ٹیلہ پھیلتے پھیلتے شبِ فراق کی طرح طویل بن چکا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چھوٹا سا زمین کا خشک ٹکڑا اچھیل کر براعظم بن گیا ہے۔ کسی طور آخری سرا آ ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں کسی طور بھی رُکوں گی نہیں، آخر تک دوڑتی رہوں گی۔ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں ہنوز دوڑے جارہی تھی۔ میری سانس پھول چکی تھی۔ پسینے سے کپڑے چپک رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر موئے تن نے پرنالہ کھول دیا ہے۔ مجھے دوڑتے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے رب کو پکارنا شروع کیا۔ جتنی دعائیں یاد آتی جارہی تھیں، میں انہیں پڑھتی جارہی تھی۔ اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے آخر میں زیرلب 'دعائے یونس' پڑھنا شروع کی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دعا اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔

دعائیں تو سبھی اثر دکھاتی ہیں مگر زبان میں تاثیر ہو تب اور زبان کی تاثیر عمل پیدا کرتی ہے۔ عمل ہی تو جنت اور جہنم کا راستہ دکھاتا ہے۔ عمل ہی زندگی بناتا اور بگاڑتا ہے۔ مجھے یقین تھا میرے اعمال اتنے بُرے نہیں ہیں۔

ابھی میں نے دعائیں پڑھنا بند نہیں کی تھیں۔ زیرلب ورد جاری تھا کہ ایسا لگا جیسے آگ کا ایک گولہ سا آ کر گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے پھیلنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے نشیب میں پیٹرول بھرا ہوا تھا۔ اتنی تیزی سے آگ پھیلی تھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ یہ اتنے اونچے اونچے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ وہاں لمبے لمبے دانتوں والے سوروں کا ریوڑ جو اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا، اب وہ سب بچنے کے لیے چیخ رہے تھے، اُچھل رہے تھے۔ ان کی چیخوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سارے گراموفونز کی سوئیاں ایک ساتھ اٹک گئی ہوں۔ ایسی مکروہ چیخ پکار مچی ہوئی تھی کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ڈال لی تھیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ یہ آگ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی اس لیے آگ سے خوفزدہ نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آگ میری دعاؤں کا ثمر ہے۔ طاغوتی قوتوں کی تباہی ہے۔ کالی مائی کی جادونگری کو یہ تباہ کر دے گی، خاک کر دے گی۔ میں مسکراتی نگاہوں سے یہ قلعہ جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ سارے سور مر چکے تھے۔ آگ بھی اب بجھنے لگی تھی۔ وہ گندا کیچڑ اب خشک ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھائے مگر فوراً رُک گئی کیونکہ ابھی تک میں پوری طرح مطمئن نہ تھی۔ میں نے پھر سے ورد کرنا شروع کر دیا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ نتیجہ حیرت انگیز طور پر اندازے کے مطابق نکلا۔ وہی جزیرہ جو کچھ دیر پہلے وسعت میں براعظم نظر آ رہا تھا، اب سمٹ کر ایک ٹیلہ رہ گیا تھا۔ اتنی دیر سے میں کنارے تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی اور پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے نہایت احتیاط سے قدم نیچے رکھے۔ ایک قدم، دو قدم کرتی ہوئی میں درمیانی کھائی کو پار کر کے دوسری طرف کی چڑھائی پر چڑھنے لگی۔ اس دوران میں بھی آیاتِ قرآنی ورد زباں رہی۔

اللہ تعالیٰ کا کرم تھا۔ قرآن پاک کا صدقہ تھا کہ میں بہ حفاظت اوپر پہنچ گئی۔ اب اس وسیع وعریض غار کا دہانہ بہت نزدیک تھا۔ اس دہانے سے سورج کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ میں اُدھر ہی بڑھتی چلی گئی۔

باہر نکل کر میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ یہ بھی شہر کا کوئی حصہ نہ تھا بلکہ جہاں رکشہ کھڑا تھا، اسی کے آس پاس کا کوئی علاقہ تھا۔ دور دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے یہی بتا رہے تھے۔

میں نے اندازے سے ایک طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یہ ایک چٹیل میدان تھا جس میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں ان جھاڑیوں کو پھلانگتی ہوئی بڑھتی جا رہی تھی۔

کافی دور تک پہنچنے کے بعد بھی مجھے کوئی پگڈنڈی یا کچا راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس علاقے سے کسی کا گزر ہی نہیں ہوتا ورنہ قدموں کے تلے دب کر گھاس پر نشان ضرور بنتے۔ بس اندازے سے میں بڑھتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میدان کو بھی پار کر لیا۔ اب سامنے پہاڑی سلسلہ تھا۔ میں ان پہاڑیوں پر چڑھتی چلی گئی۔ اس پہاڑی کی دوسری طرف ڈھلان تھی۔ ڈھلان کے بعد کچی سڑک۔ اس سڑک کو دیکھ کر میرا دل خوش ہو اُٹھا تھا۔ میں نے اس سڑک کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آگ کا گولہ دن چڑھے نظر آیا تھا اور اب دن ڈھل رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شفق کی سرخی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ شام کا سایہ اُترنے سے پہلے میں کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہتی تھی کہ مجھے رضیہ اور رکشہ نظر آ گیا۔

☆=======☆=======☆

میں غار سے نکل کر سڑک پر پہنچ گئی تھی، اس سڑک پر جہاں رکشہ کھڑا تھا۔ میں ایک بہت بڑا معرکہ سر کر آئی تھی۔ زندگی داؤ پر لگا کر حق کا علم بلند کر آئی تھی۔ طاغوتی طاقتوں کے منہ پر طمانچہ مار آئی تھی۔ ہندوؤں کی ایک بڑی دیوی کالی، جسے وہ وناش یعنی ''تباہی کی دیوی'' کہتے ہیں، اسے شکست دے آئی تھی اور اب میں اس طرح بڑھتی جا رہی تھی جہاں وہ سائیکل رکشہ کھڑا تھا۔ جس پر بیٹھ کر ہم آئے تھے۔

کچھ دور جاتے ہی مجھے وہ رکشہ نظر آ گیا تھا۔ سائیکل رکشے پر بیٹھی رضیہ بھی نظر آ گئی تھی۔ کچھ اور آگے بڑھی تو میرا دل بُری طرح ہول اُٹھا اس لیے کہ رضیہ عجیب انداز میں بیٹھی تھی۔ میں نے قدم تیز کر دیے کیونکہ وہ غیر فطری انداز میں سر جھکائے نیم دراز تھی۔ سائیکل رکشہ کے ہینڈل پر نظر پڑی تو میرا دماغ سن رہ گیا کیونکہ رکشہ والے کا جسم جھول رہا تھا۔ سر ہینڈل کے نیچے تک چلا آیا تھا۔

میں رکشے کے قریب پہنچ کر رُک گئی اور مخمصے میں کھڑی تھی کہ اب میں کیا کروں؟ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی آ نہ جائے۔ ابھی میں اسی سوچ میں گم تھی کہ ایک گھڑ گھڑاہٹ سی ہوئی۔ بعض باتیں عام زندگی میں ناممکن سی نظر آتی ہیں مگر جب رُونما ہوتی ہیں تو عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ بنگال کے 80 فیصد مسلمان حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے معتقد ہیں۔ ہر جمعرات کو گلی گلی میں خواجہ بابا کے نام کی محفل ہوتی ہے۔ یکم رجب سے دس رجب تک ایسی کوئی گلی، کوئی محلہ نہیں جہاں خواجہ بابا کے نام کی دیگ نہ چڑھتی ہو۔ ہر ایک ان کی کرامات پر ایمان رکھتا ہے۔ جے پال جادوگر جب آپ کے مقابلے پر آیا تھا اور آپ پر تارا گڑھ کا پہاڑ پھینکا تھا تو انہوں نے اسے روک لیا تھا۔ وہ پہاڑ آج بھی ہوا میں ایک فٹ اوپر معلق ہے۔ اگر آج کوئی کہہ دے کہ میں نے بھی کسی کو اُڑتا پہاڑ روکتے دیکھا ہے تو شاید ہی کوئی یقین کرے میں نے بھی اس وقت جو کچھ دیکھا تھا، اس پر بھی بہت کم لوگ یقین کریں گے۔ ایسے وقت میں جب ہر طرف سناٹے کا راج تھا، پوری سڑک ویران تھی۔ کہیں کوئی آدم زاد نہ تھا۔ سامنے سائیکل رکشہ کھڑا تھا جس کی سیٹ پر ہڈ سے ٹیک لگائے رضیہ بے ہوش پڑی تھی اور ہینڈل پر رکشے والے کا آدھا جسم جھول رہا تھا۔

یہ منظر تو تھا ہی دل دھڑکا دینے والا، اس پر یہ نیا نظارہ! میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ جہاں رکشہ کھڑا تھا وہ سڑک کا کنارا تھا۔ کچی جگہ تھی جہاں کی مٹی بھر بھری تھی، بنگال کی عام مٹی جیسی۔ وہ مٹی اچانک فوارے کی طرح اوپر اُچھلنے لگی تھی اور پھر اس جگہ سے ایک سر نکلا تھا جو دھیرے دھیرے اوپر آنے لگا تھا۔ جب کچھ اوپر آیا تو میں حیران رہ گئی۔ وہ جسم عورت کا تھا جو برہنہ تھی۔ پھر جب وہ برہنہ جسم اُبھر کر سامنے آیا تو میں چونک گئی۔ خوف سے سینے میں دل دھڑکنے لگا کیونکہ وہ ہندوؤں کی دیوی کالی تھی۔ وہی کالی جس سے کچھ دیر قبل میں دو دو ہاتھ کر چکی تھی مگر جب میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ اُس کالی اور اِس کالی میں فرق ہے۔ اُس کے چہرے پر ملائمت تھی جبکہ اِس کے چہرے پر کرختگی ہے۔

اس کالی دیوی نے پوری طرح خود کو زمین سے آزاد کیا اور میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ میں اسے للکارتی کہ وہ چیخ کر بولی۔

''نہیں...... نہیں...... کوئی آیت، کوئی قرآن پاک کی سطر نہیں پڑھو گی۔''

میں خاموش کھڑی ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی کہ وہ بولی۔ ''خوفزدہ نہ ہو۔ میں تمہاری مدد کے لیے آئی ہوں بلکہ ایک مغالطہ دور کرنے کے لیے۔ تھوڑی دیر قبل تم نے جسے شکست دی ہے، وہ میں نہیں تھی۔ میری نقالی میں اس بدمعاش نے سوانگ بھرا تھا۔ میں تو اَمر ہوں، مجھے کوئی مار نہیں سکتا اور نہ میں پاگل ہوں کہ خواہ مخواہ کسی سے دشمنی مول لے لوں۔ میرے نام پر تمہیں دھوکا دیا گیا تھا اس لیے میں تمہیں راستہ بتا رہی ہوں۔ رضیہ کی مدد نہ

کرو تو اچھا ہے۔ اگر مدد کرنا ہی چاہتی ہو تو اس معصوم آتما کی مدد کرو جو آج بھی بھٹک رہی ہے۔ آج کے لیے اتنی ہی مدد کافی ہے۔'' کہہ کر وہ جس طرح آئی تھی، اسی طرح چلی گئی۔

میں سمجھ نہ پائی کہ یہ کیا ہوا ہے؟ رضیہ ہنوز بے ہوش تھی اور میرا دماغ ماؤف تھا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں یا دم درود کروں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے فقیر بابا کی یاد آتی تھی۔ فرحت کی روح سے یوں راستہ چلتے میں رابطہ کر نہیں سکتی تھی اب میں رضیہ کو گھر کیسے لے جاؤں، یہ ایک الگ مسئلہ تھا۔ میں اسے کندھے پر اُٹھا کر تو لے جا نہیں سکتی تھی اور میں نہ سائیکل رکشہ چلا سکتی تھی کیونکہ سائیکل رکشہ چلانے والا تو مر چکا تھا۔

ابھی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی کہ یکا یک ہی میرے دل میں خیال آیا کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مشکل سے نجات دلا دیتا ہے تو کیا وہ مجھے اس پریشانی سے نجات نہیں دلائے گا۔ بس اتنا سوچنا تھا کہ میری زبان دعا میں مشغول ہوگئی۔

کون کہتا ہے کہ اب معجزے رُونما نہیں ہوتے؟ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کی بساط بھر معجزے دکھاتا ہے۔ ابھی میری دعا ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایمبولینس آتی نظر آئی۔ میں نے اسے روکنے کے لیے اپنا داہنا ہاتھ کھڑا کر دیا۔ ایمبولینس رُک گئی۔ میں نے منہ سے کچھ بولے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ مڑ کر دیکھا۔ رکشہ چلانے والا غائب تھا اور نہ وہاں رکشہ تھا۔ رضیہ زمین پر لیٹی ہوئی تھی۔

ایمبولینس والے اسٹریچر لے کر نیچے اُترے اور رضیہ کو اُٹھا کر ایمبولینس میں سوار کر لیا۔ میں بھی اس کے ساتھ اندر بیٹھ گئی۔ ایمبولینس چل پڑی۔

ہم ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا اور رضیہ کو ہوش آ گیا۔

رضیہ کا پہلا سوال یہی تھا کہ مجھے ہوا کیا تھا؟ میں نے اسے جھوٹی کہانی سنائی کہ تم ڈر کر بے ہوش ہوگئی تھیں اور اسے لے کر اسی ایمبولینس میں گھر آ گئی۔ اُس وقت تک لوگوں میں انسانیت کا فقدان نہیں ہوا تھا۔ کسی کو دو چار پیسے اگر دے دیتے تھے تو لوگ احسان مندی سے جھک جاتے تھے۔ ایمبولینس والے کو بھی میں نے پورے بیس روپے دے دیئے تھے۔ اس دور میں بیس روپے بھی بہت ہوتے تھے اسی احسان کی وجہ سے وہ ہمیں گھر تک پہنچا گیا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے رضیہ کو بتول کے حوالے کیا اور اپنے کمرے میں لوٹ آئی لیکن یہ بھول گئی تھی کہ مجھے سکون ملنا مشکل ہے۔ ابھی لیٹی ہی تھی کہ برابر والے کمرے سے بڑی بی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''اس جادوگرنی کا کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ اس کی شہرت پورے خاندان میں بڑھتی جا رہی ہے۔''

''چاچی! میں تو کہتی ہوں، اسے نہ چھیڑیں تو بہتر ہے۔ کیوں اس سے دشمنی مول لے رہی ہیں؟'' نجمہ بھابی کی آواز آئی۔

''میں نے نورول سے بات کی ہے۔ وہ کسی بہت بڑے تانترک کو جانتا ہے۔ اس کے پاس دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ تیرے پاس اگر پچاس روپے ہیں تو مجھے دے۔ میں فصل کٹنے کے وقت سو روپے دے دوں گی۔'' چاچی بولیں۔

''یہ اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں؟'' نجمہ بھابی کی آواز سنائی دی۔

''خیر تُو فکر نہ کر، یہ انتظام بھی کر لوں گی۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ نورول اس تانترک کو لے کر آتا ہوگا۔ وہ چاند پور کا ہے۔ وہاں اس کا بڑا

نام ہے۔ کومیلا تک اس کی شہرت پھیلی ہوئی ہے۔ وہ اپنے کسی کام سے چٹا گاؤں آیا ہوا ہے۔ نورول نے کہا ہے کہ وہ ہر حالت میں اسے لائے گا۔''

میں اپنے کمرے میں لیٹی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا۔ غصے کی شدت سے میں بار بار مٹھیاں بھینچ رہی تھی کہ یکا یک ہی مجھے خیال آیا کہ میں فرحت کو بلاؤں۔ بس اسی خیال سے میں وہی دعا پڑھنے لگی جو اس سے پہلے بھی کئی بار پڑھ چکی تھی۔ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے میں کامیابی کی دہلیز پر پہنچ گئی ہوں۔ فرحت کے آنے کے آثار نمودار ہو گئے تھے پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب فرحت کی روح میرے سامنے مسلم کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''ہاں بھئی مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''ذرا پتا تو لگاؤ کہ مجھ سے مقابلے کے لیے بڑھیا کس تانترک کو بلا رہی ہے۔ اسے نورول لا رہا ہے۔ یہ بھی پتا کر لینا کہ وہ کتنے پانی میں ہے تا کہ اسی طرح اس کا مقابلہ کر سکوں۔''

فرحت کی روح نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولی۔ ''نورول بس پہنچنے ہی والا ہے۔ اس کے ساتھ جو شخص ہے، وہ بھی کالا علم جانتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے۔''

''فرحت! اب تمہی کچھ کرو۔'' میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''کیا میں بے خوف ہو کر اسے للکار دوں؟ وہ بہت قابل آدمی ہے۔ بدی کا ہرکارہ ہے اسے دیوتاؤں کا آشیرواد ملا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ کئی تانترک کی قوت ہمرکاب ہے۔''

''تم بھلے ہی میری مدد نہ کرو پھر بھی میں ان تمام تانترک سے لڑوں گی۔''

''تو ٹھیک ہے، تم اکیلے مقابلہ کرو، میں تو چلتی ہوں۔'' کہہ کر وہ واقعی چلی گئی۔

اس کی اس حرکت پر مجھے بے تحاشہ غصہ آ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ فقیر بابا سے اس سلسلے میں بات کروں گی۔ روحوں کو سزا دینے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ہوگا۔

ابھی میں خود سے اُلجھ ہی رہی تھی کہ میرے کمرے میں بالکل میرے سامنے ایک کبڑا شخص آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ اتنا زیادہ مسخ تھا کہ اُدھر دیکھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ میرے کمرے میں کیسے آیا جبکہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ میں اس کے راز کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''سندری! کیا سوچ رہی ہے؟ تُو نے بڑی قوت جمع کر لی ہے۔ اب تیری تمام طاقت میری ہوگی۔ تُو میری داسی بن کر رہے گی۔''

میری شعلہ بار نگاہیں اس کبڑے پر جمی ہوئی تھیں لیکن میں نے ابھی تک اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی تھی۔ موت کا بھیانک تصور میرے وجود کو لرزہ براندام کر رہا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ میرے قریب آتا کہ پتا نہیں کیسے میری قوت نے ایک نئی راہ ڈھونڈ لی۔ کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنے ہاتھ کو نادانستگی میں جھٹکا دیا۔ پتا نہیں، میرے ہاتھ میں ایسی کون سی قوت آ گئی تھی کہ اس شخص کے جسم میں آگ بھڑک اُٹھی۔ اس کا پورا جسم شعلوں میں گِھر گیا تھا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں؟ مزہ آ رہا ہے نا۔''

''بس یہی طاقت تھی؟ بچھو کا منتر آتا نہیں اور چلی ہو سانپ کی بانبی میں ہاتھ گھسانے۔ دو چار منتر سیکھ کر کوئی مہا پنڈت نہیں بن جاتا۔ اگر

میں نے تمہیں تمہاری اوقات نہ بتا دی تو میرا نام بدل دینا۔'' اتنا کہہ کر اس نے کچھ پڑھا اور اپنے سینے پر پھونک ماری۔

پھونک مارتے ہی اس کے چہرے پر اُبھر آئے کرب کے نشانات فوراً ختم ہو گئے۔ آگ بھی اس طرح بجھ گئی جیسے بٹن دبا کر بلب بجھایا جاتا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ ''تم اپنے ڈھائی اکھچر (لفظ) پر گربھ (غرور) کرتی ہو نا، میں وہ سلسلہ ہی توڑ دوں گا کہ تم پھر کبھی اس نورانی علم کو بڑھانے کا سوچو۔''

وہ اپنی جگہ سے اُچھل کر آگے آیا تھا اور پھر اس نے وہ کر دکھایا جو سانپ کے قالب میں ڈھل جانے والا اجین کا ساحر بھی کر نہ پایا تھا۔ اس نے میری گردن پکڑی تھی اور کھینچ کر اُچھال دیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی اندھے کنویں میں گرتی چلی گئی ہوں پھر جب ہوش بحال ہوئے تو میں ایک مندر میں کھڑی تھی۔

یہ مندر وہی تھا جس میں داخلے کے لیے میں نے پہلے بھی کئی بار کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔ اس جگہ کو تو صرف خیالوں میں دیکھا تھا۔ اب میں اسی جگہ کھڑی تھی جہاں پرکاش کا گرو دھونی جمائے بیٹھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے طنز کیا۔ ''آؤ بالیکے! مجھ سے ٹکرانے آئی تھی ناں، لو اب سزا بھی بھگتو۔''

''مگر تم نے مجھے زیر کیسے کر لیا؟''

''میں نے کل آٹھ تانترک، او جھا اور گنگ جمع کیے اور اسے اس کے اندر منتقل کر دیا جو تم سے ملنے پہنچا تھا۔ اب تم میری قید میں ہو۔ سب سے پہلے میں تمہارا دھرم بھرشٹ (ایمان خراب) کروں گا پھر تم خود ہی ہمارے اشارے پر چلنے لگو گی۔'' کہہ کر اس نے اپنے پیچھے کھڑے پرکاش سے کہا۔ ''انہیں ماس (گوشت) دو۔''

پرکاش اندر چلا گیا پھر کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں شاید سالن تھا کیونکہ اس سے بھاپ اُڑ رہی تھی۔

''کھاؤ تمہیں بھوک لگی ہے۔'' اس کے کہتے ہی مجھے واقعی شدید بھوک کا احساس ہوا۔

''کھاؤ......کھاؤ۔'' اس نے اشارہ کیا۔ شاید میں فسوں کے زیر اثر تھی۔ اس کا سحر پوری طرح مجھ پر چھایا ہوا تھا اسی لیے میں کھانے پر گویا ٹوٹ پڑی۔ پیٹ بھر کر اُٹھی، ڈکار لی اور مسکرا کر بولی۔ ''دشمن کی ضیافت کا بہت بہت شکریہ۔''

''یہ بھوج (دعوت) نہیں، شتروتا (دشمنی) تھی بالیکے! میں نے وہ چیز کھلا دی ہے جو تمہارے اندر سے ایمان کو ختم کر دے گی۔ اب دیکھو ناں، حرام کی کمائی کھانے والوں کے بچے کبھی بھی ادب احترام والے نہیں ہوتے کیونکہ حرام ان کے خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے ایمان کو چوس لیتا ہے۔ تمہیں بھی میں نے وہ چیز کھلا دی ہے جو تمہارے ایمان کو چوس لے گی۔''

''یعنی......یعنی۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''تم نے ایسی کیا چیز کھلا دی ہے؟''

''تمہارے دھرم نے جنہیں منع کیا، وہ تمام چیزیں میں نے اس سالن میں ڈال دی ہیں۔ اب تم بالکل ویسی ہو گئی ہو جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے لبوں پر تالا لگ چکا ہے۔ تم لاکھ کوشش کر لو تم قرآن کی ایک آیت بھی پڑھ نہ سکو گی۔ تمہیں یاد ہی نہیں آئے گا۔ گویا اب تم میرے لیے تر نوالہ بن چکی ہو۔ میں جیسا چاہوں گا، تمہیں بنا لوں گا۔''

''یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔'' میں نے فخریہ کہا۔

''کوشش کر کے دیکھ لو۔''

میں نے دماغ پر بہت زور دیا مگر ایک بھی آیت یاد نہ آئی۔ یہاں تک کہ لفظ ''اللہ'' بھی ذہن سے محو ہو گیا۔ میں نے بہت کوشش کی پھر تھک کر بیٹھ گئی۔

''سن بالیکے! اب تیرے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ تو تنتر منتر سیکھ کر میری شیشیا (شاگرد) بن جا۔ بول، تُو سیکھے گی؟''

''نہیں...... میں کفر کے مقابلے میں موت کو ترجیح دوں گی۔''

''کیا تُو میری بات کو رد کرے گی؟ ٹھہر، تجھے مزہ چکھاتا ہوں۔'' کہہ کر اس نے اپنے داہنے پاؤں کو اُٹھا کر زمین پر مارا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ لات میرے سر پر پڑی ہو۔ میں اُچھل کر دور جا گری تھی۔ ابھی اُٹھ بھی نہ پائی تھی کہ اس نے پھر زمین پر پیر مارا اور میں کچھ اور دور جا گری پھر تو ایسا لگا جیسے میں فٹ بال بن گئی ہوں۔

اِدھر سے اُدھر لڑھک رہی تھی مگر چیخنا بھول گئی تھی کیونکہ حلق نے آواز نکالنا بند کر دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے میرے حلق میں ڈھکن لگا دیا ہو۔ پھر ایسا ہوا کہ میں ہوش کھو بیٹھی۔

پتا نہیں، کتنی دیر تک میں بے ہوش رہی؟ پھر جب مجھے ہوش آیا تو میرے سامنے ایک پوری جماعت بیٹھی تھی۔ ان سب کی نظریں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے کراہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور اُٹھنے کی کوشش کی۔

''کیا حال ہے سندری؟ مجھے پہچانا؟'' ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی اور میں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ سامنے بیٹھے لوگوں میں میرا پہلا دشمن بھی بیٹھا ہوا تھا جس کی وجہ سے میری پُرسکون زندگی میں رخنہ پڑا تھا۔ وہی اجین کا ساحر جسے میں نے سانپ کے قالب میں دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس کے پیروں پر نظر ڈالی۔ دونوں پیر ابھی تک اسی طرح سوکھے ہوئے بے جان نظر آ رہے تھے۔ اس کے برابر میں پرکاش تھا، شنکر تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی شخص تھے۔ یہ تمام کے تمام میرے دشمن تھے جن سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر میرا ٹاکرا ہوا تھا۔

''سندری! یہ سب میرے حکم کے تابع ہیں۔ میں نے ہی ان سب کو ایک مالا میں پرو دیا ہے۔ سب کی شکتیاں مل گئی ہیں اس لیے تم سے، تمہارے مددگار فقیر بابا سے نمٹنے کے لیے ایک بڑی قوت بن گئی ہے۔''

میں نے چاہا کہ جواب میں کہوں۔ ''باطل، باطل ہے۔'' مگر کہہ نہ سکی کیونکہ میرا ذہن بالکل کورے کاغذ جیسا ہو گیا تھا۔

''سن سندری! اب تُو اسلام سے بہت دور آ چکی ہے۔ تیرے پاس جتنی شکتیاں تھیں، سب چھن گئی ہیں۔ اب تیرے پاس صرف ایک راستہ ہے کہ تُو ماں کالی کی پوجا کر، جاپ کر، پھر دیکھ، تجھے کتنی شکتی ملتی ہے۔''

پتا نہیں کیوں میں سوچ میں پڑ گئی مگر ذہن کسی قسم کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ شاید اس نے میرے ذہن کو باندھ دیا تھا۔ میں کیا کروں، ابھی اسی سوچ میں تھی کہ اس نے دوبارہ تقاضا کیا۔ ''سندری! اس سے ادھیک سندر موقع نہیں ملے گا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر زندگی چاہیے تو ہماری بات مان لو ورنہ موت تمہارا مقدر ٹھہرے گی۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ میری وجہ سے تمہیں نئی زندگی ملے گی۔'' میں نے کہا۔

''کچھ بھی کہہ لو۔'' وہ بولا۔ ''لیکن اگر بات نہیں مانی تو موت یقینی ہے کیونکہ ہم ایسے لوگ ہیں جنہیں پسندیدہ چیز نہیں ملتی ہے تو اسے تباہ کر دیتے ہیں۔''

''اچھا......اور اگر میں نے تمہاری بات مان لی تو؟'' لگتا تھا میرے ذہن سے اس نے گناہ وعذاب کا خیال تک نکال دیا تھا شاید اسی لیے میں اس کی باتوں میں آ رہی تھی۔ میں جو کفر کے مقابلے میں موت کو ترجیح دیتی تھی، اب کفر کے سمندر میں ڈوبنے کو تیار ہوگئی تھی۔

''تو پھر تم دنیا کی سب سے طاقتور عورت کہلاؤ گی۔ تمہارے پاس ایسی ایسی شکتیاں ہوں گی کہ دنیا دیکھتی رہ جائے گی۔''

''چلو......میں نے تمہاری بات مان لی۔ اب بولو۔''

''تمہیں واپس ڈھاکا جانا پڑے گا اور وہاں سے نرائن گنج کے کالا کانتو مندر میں جو نرائن مندر کا ایک حصہ ہے، وہاں بیٹھ کر ایک جاپ کرنا پڑے گا۔ فی الحال میں تمہاری مدد کے لیے اپنا ایک بیر دے رہا ہوں۔''

''میں دیوتاؤں کے لیے جاپ کرنے کو تیار ہوں مہاراج!'' میں نے تیزی سے جواب دیا۔

یوگی خاموشی سے چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے جاپ کے طریقوں سے مجھے آگاہ کیا۔ چند ضروری نصیحتیں کیں پھر بولا۔

''جب تم منڈل سے باہر آؤ گی تو تمہارے شریر میں ایک نئی شکتی ہوگی، اس شکتی کے زور سے تمہارے من کی تمام آشائیں پوری ہوں گی تمہاری ہر اچھا پلک جھپکتے میں پوری ہوگی، منتر کے بیر تمہارے آگے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔''

میں یوگی راج کی ایک ایک بات کو بغور سنتی رہی اور ذہن نشین کرتی رہی یوگی راج نے مجھے نرائن گنج جا کر جاپ کرنے کی تلقین کی، مجھے بھلا کیا اعتراض تھا، میں نے رضیہ کو ساتھ لیا اور ڈھاکا کے لیے روانہ ہوگئی۔

☆=======☆=======☆

نارائین گنج ڈھاکا کا مضافاتی شہر ہے مگر مندروں کی بہتات کی وجہ سے وہ ہندوؤں کا متبرک علاقہ کہلاتا ہے۔ وہیں نارائین مندر بھی ہے جس کی وجہ سے اس ذیلی شہر کا نام موسوم ہوا ہے۔ یہاں پٹ سن کا سب سے بڑا کارخانہ آدم جی جوٹ مل کے علاوہ بھی کئی پٹ سن، ماچس، بنیان اور کپڑوں کے کارخانے ہیں بہت ساری دیگر چھوٹی بڑی صنعتیں ہیں۔ دو روز تک میں رضیہ کے پاس رہی پھر اس سے اجازت لے کر نارائین گنج کے لیے روانہ ہوگئی۔ رضیہ سے میں نے کہا تھا میں جلدی لوٹ آؤں گی، ان دو دنوں میں، مَیں نے رضیہ کو بالکل بدلا ہوا محسوس کیا، وہ پہلی جیسی رضیہ بن گئی تھی۔ روانگی کے وقت رضیہ نے مجھ سے کہا تھا وہ زیادہ دنوں تک میرا انتظار نہیں کر سکے گی کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گھبرا کر کچھ کر بیٹھے چنانچہ میں نے اسے جلد واپسی کا وعدہ کر لیا تھا۔

نرائین گنج پہنچ کر اس پرانے مندر کا انتخاب کیا اور منڈل کھینچ کر میں اس میں بیٹھ گئی اور اس منتر کا جاپ کرنے لگی جو یوگی جی نے مجھے بتایا تھا، مجھے یہ جاپ پورے اکیس روز کرنا تھا۔ گرو جی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے اکیس دن تک برت بھی رکھنا ہوگا، اس نے کہا تھا کہ اگر لگن سچی ہو تو دیوتاؤں کی کرپا سے جاپ کرنے والوں کو بھوک پیاس کا کوئی احساس نہیں رہتا، میں نے اس کے مشوروں کو ذہن نشین کر لیا تھا۔

قارئین کرام میں ان مصروفیات کو طول دے کر اور غیر اہم واقعات کا تذکرہ کر کے آپ کی دلچسپی میں رخنہ اندازی کرنے کی بجائے براہِ راست ضروری اور دلچسپ واقعات کی طرف آتی ہوں، مجھے منڈل میں بیٹھے ہوئے اٹھارہ دن گزر چکے تھے، دنوں کا شمار کنکریوں کے ذریعے کر رہی تھی، شروع شروع میں دو تین روز تک مجھے دشواریوں کا سامنا رہا بھوک پیاس کی شدت مجھے پریشان کرتی رہی، کبھی کبھی میں وہ منتر بھی بھولنے لگتی جو یوگی جی نے مجھے یاد کرایا تھا لیکن یہ سب باتیں عارضی تھیں، چار چھ روز بعد نہ صرف یہ کہ بھوک پیاس کی شدت ختم ہوگئی بلکہ منتر بھی زبان پر رواں ہوگیا اگر میں یہ کہوں کہ میں دیوتاؤں کے جاپ میں ڈوب گئی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ یعنی کہ کفر کے سمندر میں ڈبکیاں لگانے لگی تھی۔ گناہ کی پوٹ بن گئی تھی۔

غرض یہ کہ اٹھارہ دن بہ آسانی بیت گئے لیکن انیسویں دن رات کے وقت مجھے ایک نئے تجربے سے دوچار ہونا پڑا، میں نے جس مندر کا انتخاب کیا تھا وہ آبادی سے خاصا دور تھا، مندر کے دروازے کو ہوا کے گزر کی خاطر کھلا چھوڑ دیا گیا تھا، میرا رُخ دروازے کی سمت تھا، رات بڑی اندھیری اور ویران تھی، میں آنکھیں بند کیے منتر کے جاپ میں مگن تھی کہ اچانک میری نظروں میں تیز روشنی کی چمک اُبھری، میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مندر کے دروازے کے باہر شعلے بھڑک رہے تھے ایک لمحے کو میرا دھیان بٹا لیکن میں نے پھر آنکھ موند لی اور جاپ میں مگن ہوگئی، منتر کا ورد جاری تھا کہ ایک کربناک نسوانی چیخ نے مجھے دوبارہ آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس بار جو منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا وہ میری توجہ بٹانے کے لیے کافی تھا، میں نے اپنی بہن کو جسے مرے ہوئے کافی عرصہ بیت چکا تھا اپنی نظروں کے سامنے دیکھا، وہ سرتاپا برہنہ تھی، دو عجیب الخلقت جانور نما انسانوں نے اسے جکڑ رکھا تھا اور اسے اُٹھا کر دہکتی ہوئی آگ میں جھونکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری بہن خود کو بچانے کی خاطر تڑپ رہی تھی، چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی لیکن اس کی مزاحمت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ دونوں درندہ صفت انسانوں نے اسے اُٹھا لیا اور دہکتے شعلے کی جانب بڑھنے لگے، قریب تھا کہ میں بہک جاتی کہ میرے کانوں میں یوگی جی کی آواز اُبھری۔

''دھیرج سے کام لو، اگر تم نے زبان کھولی تو تمہاری محنت اکارت ہو جائے گی، جو کچھ تم دیکھ رہی ہو وہ دھوکا ہے تمہیں جاپ سے روکنے کی

خاطر شتر و شکتیاں تمہیں ڈرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔''

آواز نے مجھے سہارا دیا، میں نے دھڑکتے دل پر قابو پا کر دوبارہ آنکھ بند کی اور بلند آواز میں منتر کا جاپ شروع کر دیا آگ کے شعلوں کی چمک میری نظروں میں آتی رہی، کربناک نسوانی چیخیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں، لیکن جلد ہی ہر شے پُر سکون ہوگئی۔

میں نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو ہر سمت ویرانی کا راج تھا۔ گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا، انیسویں اور بیسویں دن بھی اسی قسم کے خطرناک کھیل جاری رہے، جب بھی میری توجہ منتر کی طرف سے بھٹکتی یوگی جی کی آواز مجھے چونکا دیتی مجھے تعجب تھا کہ میں گرو جی کی آواز تو سن سکتی تھی لیکن اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔

اکیسویں روز جب میں نے آخری کنکری کو دوسری کنکریوں کے ڈھیر میں ڈالا تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اب میری کامیابی یقینی ہے، دوپہر کا وقت تھا، میں جاپ میں مصروف تھی کہ شیر کے دھاڑنے کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں، مندر کے دروازے پر ایک شیر کھڑا تھا اور مجھے سرخ سرخ نظروں سے گھور رہا تھا، مجھے جھرجھری آگئی، شیر اچانک پیچھے کی طرف ہٹا پھر اگلے پنجوں پر جھک کر اس نے جست بھری، میں چلانے ہی والی تھی کہ گرو جی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''پریشان مت ہو، یہ سب تمہاری نظروں کا دھوکا ہے۔''

میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے لیکن آنکھیں نہ بند کر سکی، شیر ہوا میں اُڑتا ہوا مندر کے دروازے تک آیا پھر یکلخت غائب ہوگیا، میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا، میں نے اونچی آواز میں منتر کا جاپ شروع کر دیا، اس کے بعد ہر سمت سکون طاری ہوگیا، میری کیفیت بھی بتدریج ٹھیک ہونے لگی۔

شام کا وقت تھا، میں منتر کے جاپ میں محو تھی کہ ایک اجنبی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''آنکھیں کھولو مہارانی۔ تمہاری داسی تمہارے پوتر چرنوں کو چھونے کو بیاکل ہے۔''

میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک لڑکی کو کھڑا دیکھا، مندر کے دروازے سے باہر کھڑی وہ مجھے عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ بھی نظروں کا دھوکا نہ ہو۔ ابھی میرے ذہن میں یہ خیال اُبھر رہا تھا کہ اس نے کہا۔

''مہارانی! میرا نام کملا ہے میں تمہاری سیوا کے لیے آئی ہوں اب تمہیں کوئی چنتا کرنے کی ضرورت نہیں، یوگی مہاراج کی مرضی پوری ہوئی، تم اپنے جاپ میں سپھل ہو چکی ہو تمہاری داسی تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی مہارانی۔''

میں آہستہ سے اُٹھی اور مندر سے باہر آگئی۔ جیسے ہی میں نے منڈل سے باہر قدم نکالا، اس نے تیزی سے جھک کر میرے قدم چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

''اب میں تمہارے چرنوں کی دھول ہوں مہارانی تمہاری ہر آگیا کا پالن کرنا اب میرا دھرم ہے۔''

اس کی زبان سے مہارانی کا نام سن کر میرا سینہ خوشی سے پھول اُٹھا، میں نے اپنی حالت پر نظر ڈالی جسم پر گرد اور دھول کی تہیں میل کی

صورت اختیار کر چکی تھیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں اس وقت خود کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہی تھی مجھے اپنی شریانوں میں تازہ اور گرم خون دوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، میں نے کملا کے چہرے پر نظر ڈالی وہ ابھی تک میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھی میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے میری مدد کی، میں تمہاری شکر گزار ہوں۔''

''مہارانی! آپ داسی کو یہ کہہ کر گناہ گار کر رہی ہیں، جو کچھ میں نے کیا وہ میرا دھرم تھا۔'' اس نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔ ''اب آپ مہان شکتی کی مالک ہیں، میں آپ کی سیویکا ہوں مہارانی!''

''اچھا.....'' میں اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''اگر تم میری داسی ہو تو میرے اشنان اور بھوجن کا بندوبست کرو، اس کے بعد میں تم سے دوسری سیوا لوں گی۔''

وہ میری راہنمائی کرتی ہوئی مجھے ایک قریبی کنویں پر لے گئی، میں نے جی بھر کر اشنان کیا، نہانے سے فارغ ہوئی تو وہ میرے لیے نہ جانے کہاں سے تازہ پھل لے آئی، میں نے خوب سیر ہو کر پھل کھائے، کملا میرے سامنے کھڑی تھی، شکم سیری کے بعد میں نے کچھ دیر کملا کے ساتھ شغل کیا پھر اسی وقت سیر کے لیے روانہ ہو گئی، پُراسرار یوگی نے مجھے تاکید کی تھی کہ جاپ مکمل کرنے کے بعد مجھے ڈھاکا جا کر ڈھاکیشوری مندر پر حاضری دینی ہوگی اس کے بغیر میری تپسیا بے کار تھی۔

ایک ہفتے بعد میں ڈھاکا پہنچی اس عرصے میں، مَیں نے سیر کی، کچھ کپڑے اپنے لیے خریدے جو قطعی ہندوانہ تھے، وضع قطع کے اعتبار سے اب میں کوئی پجارن ہی لگتی تھی، نرائن گنج میں بھی مجھے لاتعداد پنڈت اور پجاری نظر آئے تھے لیکن میں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی، سیدھی ڈھاکا کے ڈھاکیشوری مندر پہنچی تھی نرائن گنج اور ڈھاکا میں زیادہ فاصلہ تو ہے نہیں بس کے ذریعہ دو گھنٹے میں پہنچا جا سکتا ہے میں سیدھی مندر پہنچی تھی اور دیوی کی پُرشکوہ مورتی کے سامنے دوزانو ہو کر میں نے ڈنڈوت کیا تھا پھر یوگی کا بتایا ہوا ایک جنتر پڑھا تھا اور مندر سے باہر آ گئی تھی، جس وقت میں مندر کی سیڑھیوں کو طے کر کے نیچے اُتری میری نظر ایک پجاری پر پڑی، وہ پجاری مجھے ایک نوخیز پھول جیسا نظر آیا، میں اس کے حُسن میں گم ہو کر رہ گئی، پجاری مندر کے اندر داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن میں بدستور بت بنی کھڑی رہی، اسے دیکھتی رہی۔ کملا مندر کے باہر میری منتظر تھی، مجھے اس قدر محو دیکھ کر میرے قریب آئی، آہستہ سے بولی۔

''مہارانی! کیا آپ ماں ٹھاکر کے پوتر چرن کو چھو آئیں۔''

''ہاں.....'' میں نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''یہ جو پجاری مندر میں گیا ہے کون ہے۔''

''داسی ابھی معلوم کر کے آتی ہے مہارانی۔''

اس نے بُرا ماننے کی بجائے سر جھکا کر کہا پھر اس سمت چلی گئی جہاں مقامی پجاریوں کی بے شمار چھوٹی چھوٹی کٹیاں بنی ہوئی تھیں، میں پھر مندر کی طرف دیکھنے لگی، پجاری کی سندرتا نے میرا من موہ لیا تھا، میرے اندر شیطان نے سر اُٹھا لیا تھا۔ میں ڈھاکا چھوڑنے سے پہلے ایک بار اس

پجاری سے ملنے کا فیصلہ کر چکی تھی، کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس نے مجھے بتایا۔

''مہارانی اس پجاری کا نام سدھارت ہے، آج ہی یاترا کے ارادے سے یہاں آیا ہے اور اپنے پتا پنڈت دیا شنکر کے ساتھ یہاں ایک کٹیا میں ٹھہرا ہوا ہے۔''

''کملا!'' میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ ''میں اس سے ملنا چاہتی ہوں، اس کے اندر کی شکتی کو حاصل کرنا چاہتی ہوں اس نے میرا من بیاکل کر دیا ہے۔''

میری بات سن کر ایک لمحے کو کملا چونکی پھر زیر لب مسکرا کر دبی زبان میں بولی۔

''مہارانی کی شکتی اپرم پار (غیر محدود) ہے، جو من چاہے کریں پرنتو پنڈت پجاریوں کو چھیڑنا اچھا نہیں، کون جانے وہ کس روپ میں ہوں۔''

میں کملا کی بات سمجھ رہی تھی لیکن میں نے اس پر غور کرنا مناسب نہیں سمجھا، مندر کی سیڑھیوں کے قریب کھڑی پجاری کی واپسی کی راہ تکتی رہی۔

مجھے زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی، کچھ دیر بعد وہی معصوم پجاری مجھے مندر کے بڑے دروازے کے چبوترے پر نظر آیا، نظریں جھکائے وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے اُترا اور پجاریوں کی کٹیاں کی سمت بڑھنے لگا، اس نے کسی کی سمت دیکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شاید وہ ابھی پنڈت پجاریوں کے کرتوتوں سے ناواقف تھا۔

میں اس کے تعاقب میں قدم آگے بڑھانے لگی، دوسری کٹیوں کے درمیان سے گزر کر وہ ایک ایسی کٹیا کے اندر داخل ہوا جو قدرے الگ بنی ہوئی تھی، میں نے کملا کو رُکنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔ مجھے خوب یاد تھا، پُراسرار یوگی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ بلوان اور مہان منش شکتی میں اُلجھ کر اپنا سے برباد نہیں کرتے۔ مہاراج نے یہ بھی کہا تھا کہ انسان ایک کھلونے کے ایسا ہے، جسے کھیلنے کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے، میں اس وقت اس پجاری کے اندر اُبھر رہی شکتی سے کھیلنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ کملا مجھے بتا نہ سکی تھی کہ وہ طاقت جو میں نے حاصل کی تھی کس نوعیت کی تھی یا اس کے استعمال کا طریقہ کیا ہے؟ بس میرے لیے یہی کافی تھا کہ میں طاقتور بن چکی تھی اس لیے میں بے دھڑک کٹیا کے اندر گھستی چلی گئی، پجاری اس سمے کٹیا کے اندر اکیلا تھا۔ مجھے دیکھا تو وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم شاید غلط کٹیا میں آ گئی ہو پجارن! یہاں میرے پتا دیا شنکر رہتے ہیں، تمہیں کس سے ملنا ہے؟''

''میں تم سے ملنے آئی ہوں پجاری۔'' میں نے پجاری کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا جو تمہارے پتا اس سمے کٹیا میں نہیں ہیں ورنہ ہماری ملاقات ادھوری رہ جاتی۔''

''پجارن!'' اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، غصے سے بولا۔ ''تمہیں لاج نہیں آتی کسی پجاری کو چھیڑتے ہوئے۔''

''مورکھ میں معمولی پجارن نہیں بلکہ مہان شکتی کی مالک ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''تُو قسمت کا دھنی ہے جو ہم نے تیری کٹیا میں آ کر تیری عزت بڑھائی، تیرے بھاگ کھل جائیں گے پجاری۔''

''تم مجھے مہان شکتی کی مالک کی بجائے کوئی راکھششنی نظر آتی ہو۔'' پجاری کرخت آواز میں بولا۔ ''پاپی، چلی جا میری کٹیا کے باہر۔''

''پجاری تُو میرا اپمان کر رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں۔'' میں نے بھی سخت لہجے میں کہا، پھر آگے بڑھ کر پجاری کی کلائی کو پکڑ کر بولی۔ ''اگر تُو نے اب زبان کھولی تو میں تجھے اور تیرے پِتا دونوں کو ایسا کشٹ دوں گی کہ دھرتی کانپ اُٹھے گی۔''

پجاری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، یوں جیسے کسی پُراسرار قوت نے اس کا حلق بند کر دیا ہو، البتہ وہ خود کو میرے چنگل سے بچانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن میری طاقت کے سامنے مجبور و بے بس ہو گیا، قبل اس کے کہ میں اپنا مقصد پورا کر سکتی کٹیا کے دروازے پر سے ایک خوفناک آواز سنائی دی، میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک ہٹا کٹا پنڈت دروازے پر کھڑا مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا اس کی خونی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' پنڈت کڑک کر بولا پھر اس نے لپک کر کٹیا کے دروازے کے قریب پڑی ہوئی کلہاڑی اُٹھالی۔

میں بھانپ گئی کہ آنے والا پجاری کا باپ پنڈت دیا شنکر ہے، اس کے تیور بے حد خطرناک تھے، میں نے پجاری کو چھوڑ دیا اور اُچھل کر دیا شنکر کے مقابلے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

پنڈت کلہاڑی ہاتھ میں لیے کھڑا غضبناک نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا، وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے کسی خونخوار وحشی درندے کی مانند گھات لگائے تھا اور میں اپنی جگہ کھڑی اس بات کی منتظر تھی کہ کب وہ مجھ پر حملہ آور ہو اور کب میں خود کو بچانے کی خاطر پینترا بدل کر جوابی حملہ کروں، ہر چند کہ میں نے یوگی جی کے کہنے کے مطابق طاقت حاصل کرنے والا جاپ پورا کر لیا تھا، کالی کے مندر پر حاضری بھی دے چکی تھی، لیکن ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اپنے منتر کے بیروں کو کس طرح کام میں لاؤں، کملا نے بھی مجھے یقین دلایا تھا کہ جاپ مکمل کر کے میں مہان شکتی کی مالک بن چکی ہوں۔

میں اور پنڈت دو خونی درندوں کی مانند ایک دوسرے کو کھا جانے والی خوفناک نظروں سے گھور رہے تھے، کچھ دیر تک کٹیا میں موت کا سناٹا طاری رہا پھر پنڈت نے بگڑے ہوئے تیور سے مجھے مخاطب کیا۔

''پاپی، بول تُو میری کٹیا میں کس لیے آئی تھی؟''

''پنڈت!'' میں طاقت کے نشے میں جھومتے ہوئے بولی۔ ''کیوں اپنا سمے برباد کر رہا ہے، اگر زندگی سے تیرا جی بھر چکا ہے تو میرے اوپر حملہ کرنے میں دیر نہ کر آگے آتا کہ میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں۔''

وہ میرا جملہ کاٹ کر حلق کے بل چلایا۔ ''خبردار...... میں تیری بوٹیاں کر دوں گا۔''

اس کے بعد پنڈت دیا شنکر سچ مچ آپے سے باہر ہو گیا۔ کسی عیار چیتے کی طرح یکلخت اپنی جگہ سے جست لگا کر وہ میرے سر پر آ گیا پھر اس کا کلہاڑی والا ہاتھ بھی اتنی ہی تیزی سے لہرایا، اگر میں نے ایک لمحے کی دیر کی ہوتی اور اُچھل کر دوسری طرف نہ چلی گئی ہوتی تو میرا سر یقیناً تن سے جدا ہو گیا ہوتا۔ اس نے اپنا وار خالی جاتے دیکھا تو اور بپھر کر پلٹا اور کلہاڑی سر سے بلند کر کے دوسرا وار کیا۔ اس بار بھی قدرت نے میرا ساتھ دیا اور میں ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بال بال بچی، اس نے تیسری بار حملہ آور ہونے کے لیے پینترا بدلا تھا ٹھیک اسی وقت یوگی جی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم مہان شکتی کی مالک ہو، یوں اُچھل کود سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اپنے منتر کے بیروں کو من ہی من میں آ گیا دو، وہ تمہاری ہر آشا پوری کریں گے۔''

یوگی جی کی آواز سن کر میرے بدن میں نئی قوت کا احساس جاگ اُٹھا، پنڈت مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار تھا، میں نے اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''پنڈت دیوانے مت بنو، ابھی سمے ہے، مجھے پہچاننے کی کوشش کرو، میں کوئی چھوٹی موٹی پجارن نہیں بلکہ مہان شکتی کی مالک مہارانی ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمہیں کوئی سراپ دینے کے لیے اپنے بیروں کو آواز دینی پڑے۔''

''تو تُو یوگنی ہے؟'' دیاشنکر کڑک کر بولا۔ ''کمینی میں ابھی پل بھر میں تیرے شریر کے ٹکڑے ٹکڑے کیے دیتا ہوں، تُو پنڈت دیاشنکر کو ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

پنڈت نے اپنا جملہ پورا کرتے ہی مجھ پر حملہ کر دیا، میں اس بار بھی جھکائی دے کر خود کو صاف بچا لے گئی لیکن اب مجھے بھی اس نادان پنڈت پر تاؤ آ گیا، میں نے یوگی جی کے مشورے کے مطابق جلدی سے اپنے منتر کے بیروں کو من ہی من میں یاد کیا اور انہیں حکم دیا کہ کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھین کر جلا دیں۔

میرے دل میں یہ خیال کرنا تھا کہ میں نے کلہاڑی پنڈت کے مضبوط ہاتھوں کی آہنی گرفت سے نکل کر زمین پر گرتے دیکھا اور پھر جب کلہاڑی سے آگ کے شعلے بلند ہوئے تو پنڈت کے علاوہ خود میری آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی کی پھٹی کر رہ گئیں۔ پنڈت سکتے کی کیفیت سے دوچار تھا، چند لمحے میں بھی حیرت زدہ رہی پھر اپنی پُراسرار طاقت کے حیرت انگیز مظاہرے سے سرشار ہو کر دیاشنکر کو حقارت سے گھورا پھر نفرت سے بولی۔

''کیوں پنڈت! اب کیا وچار ہے تیرا، کیا اب بھی تُو میرے راستے کی دیوار بننے کی کوشش کرے گا۔''

وہ ابھی تک اس مقام کو حیرت بھری نظروں سے گھور رہا تھا جہاں کلہاڑی اس کے ہاتھ سے گر کر نذر آتش ہوئی تھی، میری آواز سن کر وہ یوں چونکا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے اچانک بیدار ہوا ہو۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن جلد ہی اس کی یہ کیفیت دور ہو گئی، ایک نظر اس نے بیٹے پر ڈالی جو تصویر حیرت بنا کھڑا تھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''میری کنیا سے چلی جاؤ، تمہارے من میں جو پاپ مچل رہا ہے، وہ میری زندگی میں کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔''

''مورکھ تجھے خوش ہونا چاہیے تھا کہ میں تیرے بیٹے کی شکتی مانگ رہی ہوں، پرنتو اگر مرنا چاہتا ہے تو تیری مرضی، میں تجھے وچار کرنے کا ایک آخری موقع دے رہی ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر اب بھی تُو نے میرا کہنا نہ مانا اور اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو مجھے تیرا اپائے کرنا ہی پڑے گا۔''

میں نے للچائی ہوئی نظروں سے پجاری کی طرف دیکھا تو وہ دوڑ کر دیاشنکر سے لپٹ گیا، سہمی آواز میں بولا۔ ''بابا مجھے راکھششی سے بچاؤ، یہ پاپی ہے، اس کے من میں کھوٹ بھرا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں یہ مجھے شکتی ہین (بغیر قوت والا) بنانا چاہتی ہے۔''

جواب میں اونکار نے بیٹے کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا، پھر اسے ایک طرف کر کے میرے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''میں کہتا ہوں دور ہو جا میری نظروں سے نہیں تو میں اپنا اور تیرا جیون ایک کر دوں گا۔''

''پنڈت زبان کو لگام دو، تم ایک مہان شکتی کی مالک کا اپمان کر رہے ہو۔'' میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں نہیں معلوم مورکھ کہ تم اس سمے کس سے بات کر رہے ہو؟''

یکلخت اس نے مجھ پر جست لگا دی، حملہ اچانک اور بھرپور تھا اس لیے میں خود کو بچا نہ سکی، پنڈت کا ایک ہاتھ میرے منہ پر پڑا تو میں چکرا گئی مگر دوسرے ہی لمحے میں آپے سے باہر ہو گئی، میں نے ایک بھرپور لات دیا شنکر کے پیٹ پر ماری، وہ بلبلاتا ہوا فرش پر گر پڑا، اُٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ میں نے اپنے منتر کے بیروں کو من ہی من میں یاد کر کے کہا۔

''اس کمینے کو سر سے بلند کر کے زمین پر دے مارو، اس سمے تک عمل جاری رہے جب تک یہ مر نہیں جاتا۔''

میری خواہش کی دیر تھی کہ میں نے پنڈت کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا، وہ لمحے بڑے پُر اسرار تھے، پنڈت کو میرے بیروں نے سر سے بلند کر کے پوری قوت سے زمین پر دے مارا پھر یہ عمل متواتر ہونے لگا۔ پجاری نے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے وہ اپنے باپ کو فضا میں بلند ہوتے اور زمین پر گرتے دیکھتا رہا، میں بھی بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی، دیا شنکر کی حالت بڑی مضحکہ خیز تھی، وہ خود کو بچانے کی خاطر فضا میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہا لیکن میری قوت کے آگے اس کی ایک نہ چلی، کچھ دیر بعد وہ دم توڑ چکا تھا، میرے دوسرے اشارے پر میرے منتر کے نادیدہ بیر اسے گھسیٹ کر کٹیا سے باہر لے گئے۔

میں نے پجاری پر نظر ڈالی وہ گنگ کھڑا تھا، میں نے اسے پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تیرا من بیاکل ہے پرنتو میری مہان شکتی تیرے من کو بھی شانت کر سکتی ہے، تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میرے قریب آ تجھے شکتی دے دوں۔''

پجاری کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح انتقامی جذبے سے میری طرف جھپٹا، اس وقت اس کے چہرے پر خون کی تمازت نے اس کے بھولپن کو چار چاند لگا دیئے تھے میں نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا، وہ خود کو میرے شکنجے سے چھڑانے کی خاطر مچلتا رہا۔ میرے منہ پر گھونسے مارتا رہا میں چاہتی تو اپنے بیروں کے ذریعے اسے بھی قابو کر سکتی تھی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی اُچھل کود میں لطف آ رہا تھا۔ میرے خون کی حدت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ضبط کرتی رہی لیکن جب میرا حلق خشک ہونے لگا تو میں نے ایک ہی جھٹکے میں اسے نیچے فرش پر گرا دیا، وہ تڑپ کر اُٹھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے مہلت نہ دی، مجھ پر جیسے دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ میں انسان سے جانور بن گئی، اس کی کربناک چیخیں اُبھرتی ڈوبتی رہیں لیکن میں نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا، مجھے کسی بات کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ جاپ کو پورا کر لینے کے بعد میں نے مہان شکتی پراپت کر لی تھی، میں نے اپنے بیروں کو ہدایت کر دی تھی کہ میرے حکم کے بغیر کسی کو کٹیا کے اندر نہ آنے دیا جائے۔ میں نے بلا کھٹکے پجاری کے شریر سے پسندیدہ شکتی حاصل کر کے جب پجاری کو دیکھا تو اسے بے ہوش پایا، اس کے معصوم چہرے پر بڑی کربناک کیفیت طاری تھی۔ ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ میں نے جو سلوک اس بھولے بھالے پجاری کے ساتھ کیا تھا وہ درندگی کی انتہا تھی لیکن دوسرے ہی لمحے یوگی کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجی۔

''سنبھلو ابھی تمہیں جیون میں بہت کچھ کرنا ہے، اگر پہلے پگ پر تم ڈگمگا گئیں، تو آئندہ کیا کرو گی، پاپ اور پن کے چکروں میں مت پڑو، تمہارے شریر میں مہان شکتی آ چکی ہے اور مہان شکتی رکھنے والے چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان نہیں دیتے، کالی ماتا تم پر مہربان ہے، تمہیں کسی بات کی چنتا نہیں کرنی چاہیے۔ یہ دنیا مانگنے سے کچھ نہیں دیتی چھیننا سیکھ لو۔''

یوگی کی آواز سن کر میں فوراً ہی سنبھل گئی، نہ جانے اس آواز میں کیسا جادو تھا کہ میرے اندر انسانیت نے دم توڑ دیا، رحم کا جو جذبہ بیدار ہوا تھا، یکلخت ختم ہو گیا، میں نے پجاری پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور کٹیا کے دروازے کی طرف بڑھی تو کملا تیزی سے اندر آئی اور میرے سامنے ہاتھ باندھ کر بولی۔

''مہارانی! کٹیا کے باہر پنڈت اور پجاریوں کی بھیڑ ہے پجاری کی چیخ و پکار سن کر وہ باہر اکٹھا ہو گئے ہیں، آپ کے بیروں نے ان سب کا راستہ روک رکھا ہے، پرنتو اس سمے آپ کا باہر جانا ٹھیک نہیں، کٹیا کو چاروں اور سے گھیرا جا چکا ہے۔''

''کملا!'' میں نے فخر سے کہا۔ ''تم کوئی چنتا نہ کرو، اگر پنڈت پجاریوں نے میرا راستہ روکنے اور مجھ سے ٹکرانے کی کوشش کی تو میں ان سب کو جلا کر بھسم کر دوں گی۔''

''آپ کی شکتی مہان ہے پرنتو کالی ماتا کے مندر کے سیوکوں کی موت، دیوی کو ناراض کر دے گی۔'' کملا نے بدستور داسیوں والے لہجے میں کہا۔ پجاری کے بے ہوش شریر پر ایک نظر ڈال کر بولی۔ ''اگر دیوی ناراض ہو گئی مہارانی تو آپ کی شکتی بھی چھن جائے گی۔''

میں طاقت کے نشے میں مست تھی کملا نے دیوی کی ناراضگی اور شکتی کے چھن جانے کی بات کی تو جیسے میرا سارا نشہ ہرن ہو گیا، میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''کملا مجھے اب کیا کرنا چاہیے تم نے کہا تھا کہ کٹیا کو چاروں طرف سے پنڈت پجاریوں نے گھیر لیا ہے۔''

''میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی چنتا نہیں کرنی چاہیے مہارانی!'' کملا نے اس بار قدرے بے تکلفی سے کہا پھر میرے قریب آ کر میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''مہارانی! تم کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لو، میں تمہیں یہاں سے اس طرح لے جاؤں گی کہ کسی کو پتا نہ چلے گا۔''

میں نے کملا کو غور سے دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

کملا نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں فضاؤں میں پرواز کر رہی ہوں، کچھ دیر بعد اس کے کہنے پر میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک خوبصورت سجے سجائے کمرے میں پایا، جہاں آسائش کے تمام سامان موجود تھے، میرے ذہن پر ابھی تک اس بھولے پجاری سے اس کی شکتی چھین لینے کا سرور طاری تھا، کملا نے میرے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے کہا۔

''مہارانی بیتی ہوئی باتوں پر دھیان دینا بلوانوں کو شوبھا نہیں دیتا، جو کچھ گزر چکا ہے اسے بھول جاؤ۔''

میں نے اسے سرتاپا بغور دیکھا، وہ اس وقت حقیقتاً اپسرا نظر آ رہی تھی، میں نے دبی زبان میں کہا۔

''کملا! میں نے یوگی مہاراج کے کہنے پر جاپ کر کے مہان شکتی پراپت کر لی ہے، تم نے کہا تھا کہ مہان شکتی حاصل کر لینے کے بعد میں جو

چاہوں گی، وہ اوش پورا ہوگا۔“

”ماں کالی کا آشیرواد جسے حاصل ہو جائے وہ جیون میں کبھی نراش نہیں ہوتا مہارانی تم جو چاہو گی وہ ماں کالی کی کرپا سے اوش پورا ہوگا۔“ کملا نے جلدی سے کہا پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”پرنتو ابھی تمہیں دیوی دیوتاؤں کے من جیتنے کے لیے کٹھن تپسیا کرنی ہوگی کہ تم ہنومان سے بھی ادھک شکتی کی مالک بن جاؤ گی۔“

”تمہارے کارن میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں کملا۔“ میں نے اسے خوش کرنے کو کہا تو وہ چونک کر بولی۔

”مہارانی تم بھول رہی ہو کہ میں تمہاری داسی ہوں، میرا دھرم تمہاری سیوا کرنا ہے، تمہیں جو کچھ پراپت ہوا ہے وہ یوگی جی کی دیا ہے۔“

”میں بھی یوگی جی کی شکر گزار ہوں پرنتو تم نے بھی میری بڑی سہاتا کی ہے۔“ میں نے بھرپور لہجے میں کہا۔ ”کملا میری اِچھا ہے کہ تم سدا میرے ساتھ رہو، تم نے مجھے وشواس دلایا ہے کہ میں جو چاہوں گی وہ دیوی کی کرپا سے اوش پورا ہوگا۔“

”مہارانی!“ کملا سنجیدہ ہوگئی، اس نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اس کی نظروں میں مایوسی کا راج تھا، میں نے کملا کو مضطرب دیکھا تو سمجھ گئی کہ کسی وجہ سے میری بات کا جواب دینے سے گریز کر رہی ہے، میں نے اسے کریدنے کی خاطر دوبارہ کہا۔ ”بولو کملا کیا میرے من کی یہ آشا پوری نہیں ہوگی۔“

جواب میں کملا کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری، مجھے بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دبی زبان میں بولی۔

”مہارانی! میں دیوی دیوتاؤں اور ان کے سیوکوں کی داسی ہوں، پجاری جب مہان شکتی پراپت کر لیتا ہے تو اس کی ہر آگیا کا پالن کرنا اپنا دھرم سمجھتی ہوں اِندر دیوتا کی شکھشا بھی یہی ہے اور یوگی مہاراج کی آگیا بھی یہی ہے۔“

”اب یہ ناممکن ہے کملا۔“ میں کملا کی باتوں کی تہہ تک پہنچ کر قدرے درشت لہجے میں بولی۔ ”کس میں اتنی شکتی ہے کہ جو تمہیں مجھ سے جدا کر سکے، اگر کسی اور نے تمہاری طرف بُری نظر ڈالی تو میں اسے ایسا سراپ دوں گی کہ اس کی آتما بھی تڑپ اُٹھے گی۔“

”مہارانی!“ کملا کی نرگسی آنکھوں میں خوشی کے ہزاروں دیپ جل اُٹھے۔ ”تمہاری کرپا ہے جو تم داسی کو اس قابل سمجھتی ہو۔“

تبھی ایک خوفناک آواز اُبھری۔ ”اچھا تو یہ تم ہو؟“

میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو ایک ہٹا کٹا پجاری جس کے چہرے اور سینے پر بھبھوت ملا ہوا تھا ایک لنگوٹی باندھے میرے سامنے کھڑا مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا، مجھے اس کی مداخلت سخت ناگوار گزری، اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر میں نے درشت آواز میں پوچھا۔ ”تُو کون ہے؟ یہاں کس لیے آیا ہے؟“

”مورکھ! کیا تُو نے ابھی تک مہاراج گوبند نرائن کا نام نہیں سنا۔“ نو وارد نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر کملا کو کرخت نظروں سے گھور کر بولا۔

”کملا تُو اسے بتا کہ میں کون ہوں؟“

میں نے کملا کی سمت دیکھا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے، اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ چکی تھی، مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''مہارانی! اس سمے تمہارے سامنے مہاراج گوبند نرائن کھڑے ہیں، ان کی شکتی تم سے ادھک ہے، دیوی دیوتاؤں نے ان کو مہان شکتی دان کی ہے، تمہیں ان کے سامنے ڈنڈوت کرنی ہوگی، ان کو پرنام کرو مہارانی!''

کملا کی بے بسی اور نو وارد کی تعریف سن کر میں ایک ثانیئے کے لیے پریشان ہوگئی، لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے ایک اٹل فیصلہ کر کے گوبند نرائن سے پوچھا۔

''تمہارا اس سمے یہاں آنے کا کیا کارن ہے؟''

''مورکھ! میں تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ داسیوں اور پجاریوں پر کسی ایک شکتی کا ادھیکار نہیں ہوتا، تُو ابھی بالیکا ہے اس لیے میں تجھے شما کر رہا ہوں پرنتو اگر دوبارہ تُو نے کبھی بُرے شبد زبان سے نکالے تو مجھے مجبوراً تجھے بتانا ہوگا کہ میں کون ہوں۔''

گوبند نرائن کا لہجہ اتنا تضحیک آمیز تھا کہ میں اپنا غصہ ضبط نہ کرسکی، بگڑے تیور سے بولی۔

''مہاراج مانا کہ تم مجھ سے ادھیک شکتی کے مالک ہو، پرنتو تمہیں میرا اپمان کرنے کا ادھیکار نہیں۔''

''اچھا.....'' گوبند نرائن زہر خند لہجے میں بولا ''تیری یہ مجال جو تُو گرو سے بھی منہ زوری کرے گی، کیا بتاؤں تجھے کہ میری آنکھوں کا ایک اشارہ تجھے کیسا کشٹ دے سکتا ہے۔''

''گوبند نرائن!'' میں نے آپے سے باہر ہو کر کہا۔ ''تم پھر میرا اپمان کر رہے ہو، تمہیں اپنی زبان کو لگام دینا چاہیے، یہ مت بھولو کہ کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔''

گوبند نرائن کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا، اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، غصے کی وجہ سے وہ سر تا پا لرز رہا تھا، کملا نے بڑھ کر مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے اشارے سے روک دیا، ایک لمحے کو بھی میں اپنی توجہ گوبند نرائن کی طرف سے ہٹانا نہیں چاہتی تھی۔

گوبند نرائن مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا، اچانک اس نے اپنے چہرے کو زور سے دائیں بائیں جھٹکا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے تمام جسم میں آگ لگ گئی ہو، میں تڑپ اُٹھی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ گوبند نرائن نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر میری طرف نہ جانے کیسا اشارہ کیا کہ میں تیورا کر فرش پر اُلٹ گئی، کسی غیر مرئی قوت نے مجھے شدت سے جکڑ رکھا تھا، میرا دم گھٹنے لگا اور میں بے بسی سے دوچار تھی کہ گوبند نرائن نے مجھے حقارت سے گھورتے ہوئے بڑی نفرت سے کہا۔

''کیوں بالیکے! کس وچار میں گم ہو، اپنے بیروں کو آواز کیوں نہیں دیتیں۔''

میری حالت اس وقت قابلِ رحم تھی، میرے لیے اپنی زبان کو جنبش دینا بھی محال تھا، معاً میرے ذہن میں یوگی جی کا تصور اُبھرا، میں نے دل ہی دل میں یوگی مہاراج کو یاد کیا تو یکلخت جیسے غیر مرئی قوتوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی درد کی شدت غائب ہوگئی، میرے کانوں میں یوگی جی کی آواز گونجی۔

''تم نے سچے من سے مجھے یاد کیا ہے، اب تمہیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں، کالی کا شبھ نام لے کر اُٹھو، دیوتا تمہاری سہائتا کریں گے۔''

مجھے اپنے جسم میں ایک نئی قوت محسوس ہوئی، میں تیزی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ یہ دیکھ کر گوبند نرائن کی آنکھوں میں حیرت عود کر آئی، اسے

اپنی بینائی پر شبہ ہو رہا تھا، اسے غالباً اس بات کی امید نہیں تھی کہ میں اس کے دیئے ہوئے کشٹ سے چھٹکارا پا سکوں گی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''کہاں کھو گئے گوبند نرائن مہاراج، حیرت سے آنکھیں پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو، گرو دیو، چیلے کو کوئی کشٹ دو، بڑی کرپا ہوگی تمہاری۔''

''میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔ لے سنبھل۔'' گوبند نرائن نے بپھر کر کہا، پھر اپنے سینے کا ایک بال توڑ کر میری طرف پھینکا، فضا میں بجلیاں سی کڑکنے لگیں، پورا کمرا لرز اُٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے ماحول پُرسکون ہو گیا، گوبند نرائن کا وار خالی گیا تو اس نے تلملا کر دوسرا حملہ کیا لیکن غالباً یوگی مہاراج کی نادیدہ قوت نے اس کا بھی توڑ کر دیا۔ گوبند نرائن کی جھلاہٹ قابلِ دید تھی۔ اس نے بوکھلا کر ایک حملہ اور کیا، اس بار آگ کے شعلے طوفانی انداز میں زمین سے بلند ہو کر میری طرف لپکے لیکن دوسرے ہی لمحے ہوا کا ایک شدید جھونکا آیا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کا رُخ گوبند نرائن کی سمت پھر گیا اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا، بھڑکتے ہوئے شعلوں نے پلک جھپکتے میں گوبند نرائن کو اس طرح جلا کر بھسم کیا کہ اس کی ہڈیوں تک کا کوئی سراغ نہ رہا، کملا گنگ کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی، آگ کے شعلے غائب ہوئے تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر جھک کر میرے پاؤں پکڑ کر بولی۔

''مہارانی! تمہاری شکتی اپرم پار ہے۔ داسی کے بڑے بھاگ جو تمہاری سیوا کا موقع ملا۔''

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کملا کو کیا جواب دوں کہ یکلخت میری نظریں سامنے کی طرف اُٹھیں جہاں یوگی مہاراج کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

کملا کی نظر یوگی مہاراج پر پڑی تو جلدی سے اُٹھ کر اس نے ڈنڈوت کیا اور ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میں نے عقیدت بھرے انداز میں آگے بڑھ کر پورن لال کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور ڈنڈوت کر کے بولی۔

''مہاراج تم نے اپنی سیویکار (کنیز) کی شکتی کا مان بڑھا کر بڑی کرپا کی، میں...... مَیں شکر گزار ہوں مہاراج!''

''تم نے مجھے سچے من سے یاد کیا تھا، اسی لیے میں نے تمہاری سہائتا کی۔'' یوگی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''گوبند نرائن کے بارے میں تم زیادہ نہیں جانتی، بڑی مہان شکتی کا مالک تھا، اگر میں تمہاری سہائتا نہ کرتا تو اس کے بیر تم کو جلا کر بھسم کر ڈالتے، اسے وشواس تھا کہ تم کو بڑی آسانی سے نیچا دکھانے میں سپھل ہو جائے گا۔''

''یوگی مہاراج!'' میں نے ہمت کی۔ ''کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ میں اور قوت حاصل کرلوں، ایسی قوت جس کے آگے دھرتی کی تمام قوتیں بے کار ہوں۔''

جواب میں یوگی نے مجھے سر تا پا بغور دیکھا پھر گردن ہلا کر بولا۔ ''دیوی دیوتا کا گیان دھیان رکھنے والے ایسی شکتی پراپت کر سکتے ہیں پرنتو اس کے لیے منش کو بڑی کٹھنائیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ سارا جیون دنیا کو تیاگ کر تپسیا کرنی پڑتی ہے تب جا کر منش بلوان ہوتا ہے۔''

''مہاراج تم مجھے آگیا دو، میں دیوی دیوتاؤں کے گیان دھیان کے لیے تیار ہوں۔'' اس وقت میرے ذہن میں کفر وغیرہ کا خیال تک نہ تھا، میں گویا سب کچھ بھول چکی تھی۔

''دھیرج سے کام لو بالیکے!'' یوگی بولا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے من میں گھور شکتی پراپت کرنے کی لگن ہے تم اوش سپھل ہو گی، پرنتو ابھی وہ سمے نہیں آیا۔''

''کیا تم مجھے کوئی ایسا طریقہ نہیں بتا سکتے مہاراج کہ میں دو چار جاپ اور کر کے مہان شکتی کی مالک بن جاؤں۔'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں دھن کی پکی ہوں، مہاراج! تمہارے آشیر واد کی ضرورت ہے۔ پھر میں بلوان بنوں گی تو تمہارا ہی بھلا ہو گا۔''

''جلدی مت کرو بالکے! تم کیا چاہتی ہو، میں جانتا ہوں پرنتو سمے کا انتظار کرو۔'' یوگی جی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا پھر کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''تم نے پنڈت دیا شنکر کو مار کر اچھا نہیں کیا، پجاریوں کو یہ بات شوبھا نہیں دیتی کہ وہ کسی بھولے بھالے منش کا خون کریں۔''

''اگر تم کو دکھ ہوا ہے مہاراج تو میں معافی چاہتی ہوں۔'' میں نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ''پجاری کے اندر ابھرتی شکتی نے میرے من کو بیاکل کر دیا تھا، میں نے اسی کارن پنڈت کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔''

''مہاراج!'' میں سنجیدگی سے بولی۔ ''مجھے ابھی بھی تمہارے دھرم کی پوری باتیں نہیں معلوم، تمہاری کرپا رہی تو آہستہ آہستہ سب سیکھ لوں گی، پرنتو کملا کے سلسلے میں میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں اسے کیول اپنا سمجھتی ہوں، کوئی اور اس کی طرف نظر ڈالے میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔''

پورن لال نے بدلے ہوئے تیور سے کہا۔ ''تم بھول رہی ہو کہ اس سمے تم اپنے گرو سے باتیں کر رہی۔''

''مجھے شما کر دو مہاراج! پرنتو کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ شکتی پراپت کر لینے کے بعد میرے من کی آشائیں ضرور پوری ہوں گی، میں تم سے کملا کی بھکشا مانگتی ہوں گرو دیو، تم اس داسی کو مجھے دان کر دو۔''

میری خواہش کے اظہار پر یوگی ایک لمحے کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا، اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میری بات گراں گزری ہے، یوگی کا جواب سننے کو میں بے چین تھی، کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر یوگی نے ایک نظر کملا کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بالیکے تم نے گرو کے ناطے سے مجھ سے کچھ مانگا ہے، تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں نے کملا کو اندر دیوتا سے مانگا تھا، پرنتو اب میں اسے تمہیں دان کرتا ہوں۔ آج کے بعد سے تمہارے سوا کسی دوسرے پنڈت پجاری کا اس پر کوئی ادھیکار نہیں ہو گا۔ پرنتو اس کے لیے تم کو ایک وچن دینا ہو گا۔''

''میں تیار ہوں مہاراج!'' میں نے خوشی خوشی جواب دیا تو یوگی بدستور سنجیدگی سے بولا۔

''تمہیں سچے من سے وچن دینا ہو گا کہ تم مقدس تابوت تک جاؤ گی اور وہاں کے بھکشو سے وہ راز حاصل کر کے لاؤ گی جس کی وجہ سے میں پھر سے منش کی جون میں لوٹ آؤں گا۔ بولو بالیکے کیا تم یہ پرتگیا کرنے کو تیار ہو؟''

''میں تیار ہوں مہاراج!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تمہاری ہر آگیا کا پالن کرنا میں اپنا دھرم سمجھتی ہوں۔''

کملا نے یوگی مہاراج کی باتیں سنیں تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا، لپک کر اس نے یوگی مہاراج کے چرن چھو لیے۔ ''ایسا ہی ہو گا مہاراج!'' کملا نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ ''میں مقدس تابوت تک مہارانی کو لے جاؤں گی، داسی بن کر مہارانی کی سیوا کرتی رہوں گی۔''

یوگی جی بڑی دیر تک مجھے اور کملا کو نصیحتیں کرتا رہا اس نے مجھے کچھ اور جاپ بھی کرنے کو کہا اور پھر اپنی مٹھی سے ایک چمکدار چیز جو دور سے

شیشے کا کوئی ٹکڑا نظر آتی تھی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو بالیکے اسے نگل جاؤ، آج میں تم کو ایک ایسی چیز دان کر رہا ہوں جو ہر یدھ میں تمہاری سہائتا کرے گی، اسے کھا لینے کے بعد تمہارے شریر میں بلوانوں جیسی شکتی پیدا ہو جائے گی، منتر جاپ سے جو قوت تمہارے اندر آئی ہے وہ کئی سو گنا بڑھ جائے گی۔ اگر تم چاہو گی تو پہاڑوں کا رُخ بھی بدل جائے گا۔ تمہارے بیری تم کو کوئی کشٹ نہیں دے سکیں گے، پرنتو اتنا دھیان میں رکھنا کہ تم اپنی شکتی سے کسی منش کو بلاوجہ کوئی دُکھ نہیں دو گی۔''

میں نے یوگی جی کے ہاتھ سے چمکدار شے لے کر جلدی سے منہ میں ڈال کر نگل لیا پھر اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''مہاراج! میں تم کو وچن دیتی ہوں کہ سارا جیون تم کو اپنا گرو سمجھوں گی، جو تم آگیا دو گے وہی کروں گی۔''

''تو پھر جاؤ اور جا کر بھگوان نرائن کے مندر میں جا کر جاپ کرو تاکہ تمہیں ایک انوکھی شکتی پراپت ہو جائے۔''

میں نے بھگوان نارائن کے مندر میں چالیس روز تک جاپ کیا پھر وہاں بڑے بڑے دھرماتماؤں کے ساتھ بیٹھک کی اور گُر کی باتیں سیکھتی رہی۔ مجھے عظیم سے عظیم تر قوتیں حاصل کرنے کا خبط ہو گیا تھا۔ جب میں پوری طرح جنتر منتر کے اسرار و رموز سے واقف ہو گئی تو دنیا کی رنگینیوں کو دیکھنے کی خاطر ڈھاکا پہنچی۔

ڈھاکا میرا آبائی شہر تھا۔ یہیں میں نے گھٹنوں چلنا سیکھا اور یہیں سے میری زندگی کا عجیب و غریب باب شروع ہوا۔ یہاں میرے جتنے دوست نما ہمدرد تھے اتنے ہی دشمن بھی، پھر یہاں کی پولیس بھی میری تلاش میں تھی۔ مجھے مندر میں ہی پتا چلا تھا کہ ڈھاکا شہر میں ایک دیالو ہندو گھنشیام داس بھی ہے۔

گھنشیام داس کا شمار ڈھاکا کے ان کروڑ پتی تاجروں میں ہوتا تھا جن کے ایک اشارے پر راتوں رات حکومت کی تجارتی پالیسی بدل جایا کرتی تھی لیکن مالدار ہونے کے باوجود وہ پنڈت پجاریوں کے چرن دھو دھو کر پینا اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ اس کی کوٹھی پر ہمیشہ دو چار رنگے سیار جمع رہتے اور اپنا اُلو سیدھا کیا کرتے پھر بھارتی شہر کلکتہ و مغربی بنگال کے لوگ بھی آتے رہتے تھے۔ مجھے احساس تھا کہ یہ لوگ بنگالیوں میں تعصب پھیلاتے ہیں۔ استحکام پاکستان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

جب میں گھنشیام داس کی کوٹھی پر گئی تو اس وقت بھی ملازم کی زبانی یہی معلوم ہوا کہ مہمان خانے والے حصے میں دو مسٹنڈے قسم کے پنڈت گزشتہ بیس بائیس روز سے براجمان ہیں اور سیٹھ گھنشیام داس کی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں، میں نے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ملازم نے مجھے اس حصے میں ٹھہرایا جہاں عورتوں کے لیے آسانیاں تھیں۔ یہ حصہ کوٹھی کے احاطے میں بائیں جانب ذرا ہٹ کر واقع تھا۔ میں دوپہر میں کوٹھی پہنچی تھی اس لیے گھنشیام داس سے ملاقات نہ ہو سکی البتہ جب شام کو اسے میری آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ ملاقات کی غرض سے آیا، میں گھنشیام داس سے پہلی بار مل رہی تھی پھر بھی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ ذہنی طور پر کچھ پریشان ہے، بظاہر وہ ہنس رہا تھا اور میری آؤ بھگت میں لگا تھا لیکن میں اس کی مسکراہٹوں کے پیچھے بے چینی اور اُلجھن کی ایک مکمل داستان پڑھ رہی تھی، کچھ دیر تک میں اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف رہی پھر جب گھنشیام داس جانے کے لیے اُٹھا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''گھنشیام داس! تم مجھے بیاکل دکھائی دے رہے ہو، کیا کوئی بپتا آن پڑی ہے؟''

''مہاراجن!'' گھنشیام داس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''بھگوان کی دیا سے مجھے کوئی دُکھ پریشانی نہیں ہے، اگر کوئی بپتا پڑی تو تم سے ضرور کہوں گا۔''

''سنا ہے تمہارے مہمان خانے میں دو پنڈت آئے ہوئے ہیں۔'' میں نے گھنشیام داس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے دریافت کیا۔

''ہاں مہاراجن!'' گھنشیام داس جلدی سے بولا۔ ''بڑے دیالو پنڈت ہیں، بھگوان کی کرپا سے وہ میرے گھر پدھارے ہیں۔''

گھنشیام داس کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا گیا، مجھے یقین تھا کہ وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے چنانچہ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک منتر کا جاپ کر کے آنکھیں بند کیں تو تمام صورت حال میرے سامنے آ گئی، دونوں پنڈت جو مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دراصل سفلی علوم کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے گندے علم کے ذریعے گھنشیام داس کے بیٹے اوِیناش کو بسترِ مرگ پر ڈال رکھا تھا۔ جب ڈھاکا کے تمام بڑے بڑے ڈاکٹر اور سرجن جواب دے چکے تو وہ دونوں پنڈت کے روپ دھار کر آئے اور دونوں ہاتھوں سے گھنشیام داس کو لوٹنے لگے، کچھ دنوں کے لیے وہ اوِیناش کو ٹھیک کر دیتے پھر اپنے ناپاک علم کے ذریعہ اسے بیمار ڈال دیتے۔ ان پنڈتوں نے گھنشیام داس کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ اوِیناش کی بیماری کا ذکر کسی اور سے نہ کیا جائے اگر ایسا ہوا تو وہ مر جائے گا۔ بے چارہ گھنشیام داس پوری طرح ان کے چنگل میں پھنس کر رہ گیا تھا، میں نے اپنے بیر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے کہا۔

''مہاراجن! تمہاری آگیا ہو تو ان دونوں کو نرکھ میں جھونک دوں۔''

''نہیں...... '' میں نے منع کیا۔ ''میں ان پاجی پنڈتوں کو سسکا سسکا کر ماروں گی، ان کو ایسے حالات سے دوچار کروں گی کہ وہ پھر کسی کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ نہیں بنا سکیں گے۔''

میرا جواب سن کر بیر خاموش ہو گیا، میں نے طے کر لیا تھا کہ ان دونوں پنڈتوں کو ایسا سبق دوں گی کہ وہ تمام عمر یاد رکھیں گے اگر میں چاہتی تو ایک منتر کے ذریعے نہ صرف اوِیناش کو ٹھیک کر سکتی تھی بلکہ ان دونوں کو اذیت ناک حالات سے دوچار کر سکتی تھی لیکن میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا، مجھے کسی مناسب موقع کا انتظار تھا۔ تیسرے روز مجھے قدرت نے ایسا موقع مہیا کر دیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں چہل قدمی کر کے آ رہی تھی، دونوں پنڈت اس وقت اپنے کمرے میں سیٹھ گھنشیام داس کو گھیرے بیٹھے تھے جس کی اطلاع مجھے چوکیدار کے ذریعہ مل گئی چنانچہ میں سیدھی اس حصے کی جانب چلی گئی۔

ان کے درمیان راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں، دونوں پنڈتوں نے مجھے وہاں دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا اور میری دخل اندازی پر یوں ناک بھوں چڑھانے لگے جیسے انہیں میرا وہاں آنا سخت ناگوار گزرا ہو، گھنشیام داس بھی ٹپٹا سا گیا۔

میں محسوس کر رہی تھی کہ گھنشیام داس بھی میری وجہ سے کچھ اُلجھ گیا ہے۔ مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ دونوں پنڈت میری موجودگی میں اوِیناش کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کریں گے۔ گھنشیام داس کو انہوں نے زبان بند رکھنے کی ہدایت اسی غرض سے کی تھی کہ ان کا پول نہ کھلنے پائے۔ مجھے

موقع کی نزاکت دیکھ کر سخت غصہ آیا، میں نے چہرے سے اس کا اظہار نہ کیا، دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی، کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے پستہ قد پنڈت کو جس کا نام پنڈت رام لبھایا تھا، مخاطب کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''پنڈت جی! میں تمہارے چرنوں میں ایک ضروری کام سے آئی ہوں، کیا تم میری سہائتا کرو گے؟''

پنڈت رام لبھایا نے مجھے ضرورت مند محسوس کیا تو اپنی توند پر ہاتھ پھیر کر بڑی رعونت سے بولا۔

''بالیکے! بھگوان نے ہمیں دھرتی پر اسی کارن اُتارا ہے کہ ہم منش کی سہائتا کریں، کہو کیا بپتا آن پڑی ہے تم پر؟''

''تمہاری بڑی کرپا ہوگی پنڈت جی! اگر تم میرے ساتھ چل کر ایک نظر میرے سوامی کو دیکھ لو۔ دو روز سے اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اچانک بال نوچنا شروع کر دیتا ہے اور پاگلوں جیسی باتیں کرنے لگتا ہے۔''

''الکھ نرنجن۔'' دوسرے پنڈت اونکار ناتھ نے آنکھیں بند کر کے ہانک لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے سوامی کے شریر پر آج کل ایک گندی آتما کا قبضہ ہے، کام بڑا جان جوکھوں کا ہے۔ ہمیں اس گندی آتما کے ساتھ یدھ کرنا ہوگا، پرنتو وجے ہماری ہوگی۔''

''تمہاری بڑی کرپا ہوگی پنڈت جی!'' میں نے بدستور اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ہر طرح سے تمہاری سیوا کرنے کو تیار ہوں، اگر تم نے سوامی کو اچھا کر دیا تو میں سارا جیون تمہاری غلام بنی رہوں گی۔''

''چھی چھی کیسی باتیں کر رہی ہو، بالیکے!'' اونکار ناتھ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ''دھرماتماؤں کی ذات دان پان کی لالچ نہیں کرتی پرنتو تمہیں اپنے پتی کے کارن ہماری ہر آگیا کا پالن کرنا ہوگا۔''

''میں تیار ہوں پنڈت جی!'' میں نے جلدی سے کہا تو پنڈت رام لبھایا نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''سنو بالیکے! تمہارے پتی کو آج کی رات ہمارے ساتھ گزارنی ہوگی، ہم اس پر جاپ اور منتر پڑھ کر اس کے شریر میں چھپی گندی آتما کو جلا کر بھسم کر دیں گے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' میں نے ہامی بھرلی۔

دونوں پنڈت مجھے اُلو بناتے رہے، میں ان کی آنکھوں میں لالچ کی ناپاک چمک محسوس کر رہی تھی، کچھ دیر خون کے گھونٹ پیئے بیٹھی رہی پھر اُٹھ کر اپنے حصے کی طرف آگئی، بیر کو میں نے حالات سے باخبر کیا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا لیکن جب میں نے اسے اپنا پروگرام بتایا تو وہ مسکرانے لگا۔

پروگرام کے مطابق جب رات ہوئی تو میں نے بیر کو آخری بار چند ضروری ہدایتیں دیں پھر اسے لے جا کر پنڈتوں کے کمرے میں چھوڑ دیا۔ اس کام سے فراغت پا کر میں گھنشیام کے پاس آئی اور اسے ساتھ لے کر تیسرے کمرے میں پہنچی جو پنڈتوں کے کمرے سے ملحق تھا۔ یہاں میں نے سارا انتظام پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ دروازے کے ساتھ میں نے تلے اوپر دو میزیں رکھ دی تھیں جن پر کھڑے ہو کر روشندان کے ذریعے ہم دوسرے کمرے کا سارا منظر دیکھ سکتے تھے۔ گھنشیام میری اس حرکت پر جھلا رہا تھا لیکن جب میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ دونوں

پنڈت اسے ٹھگ رہے ہیں اور ان کی اصلیت کیا ہے، تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

اسے میری بات پر شبہ تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے۔ چار و نا چار اس نے میری بات مان لی اور میرے ساتھ میزوں پر چڑھ کر روشندان سے دوسرے کمرے میں جھانکنے لگا جہاں میرا بیر ایک کرسی پر بت بنا بیٹھا تھا اور دونوں پنڈت اس کے سامنے بیٹھے اسے گھور رہے تھے۔

''تیری پتنی نے ہمیں بتایا ہے کہ تیرے اوپر کسی گندی آتما کا پھیر ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟''

بیر نے میری ہدایت کے مطابق کوئی جواب نہیں دیا۔ رام لبھایا کو دیکھ کر دیوانوں کے انداز میں ہنسنے لگا۔ اونکار ناتھ نے رام لبھایا کے کان میں کچھ کہا تو وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں شیشے کی ایک صراحی اور ایک گلاس تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے صراحی اور گلاس اونکار ناتھ کے ہاتھ میں دے دیا۔ میرا بیر بدستور مسکرا کر دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اونکار ناتھ نے صراحی کا مشروب گلاس میں ڈالا پھر بیر کے قریب لا کر اسے دیتے ہوئے بولا۔

''لو اسے پی جاؤ یہ سوم رس ہے، بھگوان بھلی کرے گا۔''

بیر نے جھپٹ کر گلاس لیا اور ایک ہی گھونٹ میں اس کا تمام مشروب حلق سے نیچے اُتار لیا۔ دوسرے گلاس کے ساتھ بھی اس نے یہی کیا لیکن تیسرے گلاس کے بعد اس نے باقاعدہ جھومنا شروع کر دیا، میں اس کی اداکاری پر اش اش کر رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ اس کا پورا چہرہ خمار آلود ہو رہا تھا۔ دونوں پنڈت اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب خاصی دیر ہو گئی تو اونکار ناتھ نے اپنے ساتھی کو آنکھ مارتے ہوئے میرے بیر سے کہا۔

''تیرے شریر پر کسی گندی اور بھٹکی ہوئی آتما کا قبضہ ہے۔ ہم اپنی شکتی سے آج اس آتما کو جلا کر بھسم کر دیں گے مگر تجھے میری ایک بات ماننی ہوگی۔''

''مہاراج!'' بیر نے جھومتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بڑی کرپا ہوگی، وہ بات بھی بتا دو۔''

''اصل دوشٹ آتما تیری پتنی پر ہے، اسے پہلے اُتارنا ہوگا۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ بھی بتاؤں گا، مگر ابھی نہیں۔'' رام لبھایا ندیدے کتوں کی طرح اپنی جگہ بیٹھا میرے بیر کو گھور رہا تھا۔

''بولو مہاراج! کب بتاؤ گے؟''

''سنو...... تمہیں آج رات اپنی پتنی کو میرے پاس بھیجنا ہوگا۔''

''مہاراج!'' بیر نے قدرے شرماتے ہوئے بے باکی سے کہا۔ ''ہمیں لاج آئے گی۔ یہ بات پتنی سے کیسے کہوں گا؟''

''مورکھ!'' اونکار ناتھ نے جلدی سے جواب دیا۔ ''دھرماتماؤں سے کیسی شرم۔ ہم جو کچھ کریں گے تیرے بھلے کو کریں گے۔''

میرا خون کھول رہا تھا۔ گھنشیام نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ ''مہارانی جی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''دھیرج سے کام لو سیٹھ!'' میں دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''تم نے جن سانپوں کو آستین میں پال رکھا ہے، ان کا ناٹک خاموش ہو کر دیکھو۔ میں ابھی ان پاپیوں کو بتاؤں گی کہ وہ کتنی شکتی کے مالک ہیں۔''

''مہارانی جی!'' گھنشیام نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ''تم میرے مہمانوں کا اپمان کر رہی ہو۔''

''بکواس بند کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں سیٹھ گھنشیام کو گھور کر کہا۔ ''جو کچھ ہو رہا ہے، اسے چپ چاپ دیکھتے رہو۔ اگر تم نے آواز نکالی تو تمہارا حشر بھی خراب ہوگا۔'' گھنشیام کی سٹی گم ہو گئی۔ ہونٹ چبا کر خاموش ہو گیا۔

میرے بیر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''پتنی کو بھیجنا ضروری ہے؟''

رام لبھایا تیزی سے اُٹھ کر اس کے قریب گیا اور آنکھیں لال پیلی کر کے بولا۔ ''مورکھ! تُو ہم پر شک کر رہا ہے۔ ہم پر جوگنگا جل کی طرح پوتر اور اُجلے من کے مالک ہیں۔''

اونکار ناتھ نے رام لبھایا کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''ہماری آگیا کا پالن کر۔ ہم آج اس گندی آتما کو جلا کر بھسم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں جو تجھے پریشان کرتی ہے۔ بس تُو جا اور اپنی پتنی کو بلا لا تا کہ اس پر منتر پڑھ کر تیرا بدن ہلکا کر دوں۔''

رام لبھایا نے اونکار ناتھ کو کچھ اشارہ کیا۔ اونکار نے اثبات میں سر کو جنبش دی پھر لپک کر میرے بیر کے ہاتھ تھام لیے۔ مجھے اسی موقع کا انتظار تھا۔ قبل اس کے کہ میرے بیر کو وہ باہر بھیجتا، میں نے ایک منتر پڑھ کر پھونکا۔ دوسرے ہی لمحے رام لبھایا تڑپ کر زمین پر گرا اور پاگل کتوں کی طرح لوٹ لگانے لگا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار پھوٹ چکی تھی۔ گھنشیام ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ بیر نے جلدی سے لپک کر وہ دروازہ کھول دیا جس کی دوسری جانب ہم کھڑے تھے۔ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ گھنشیام ہونقوں کی طرح وضاحت طلب نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میرا غصہ پورے شباب پر تھا۔ میں نے گھنشیام کا ہاتھ تھام کر اسے میز سے نیچے اُتارا اور پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ اونکار ناتھ ہم دونوں کو دیکھ کر ایک لمحے کو گھبرایا مگر جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''بالکیے! تمہارے پتی نے ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ ہمارا جاپ منتر سب ناس کر دیا۔ ہمیں اس کارن کوئی اور اپائے کرنا ہوگا۔''

رام لبھایا بدستور پاگلوں جیسی حالت میں فرش پر لوٹ رہا تھا۔ میرے بیر اس کی ہڈی پسلی ایک کرنے میں مصروف تھے۔ گھنشیام نے کچھ کہنا چاہا لیکن اونکار ناتھ جلدی سے بات بنا کر بولا۔

''میرے متر کی یہ حالت تیرے پتی کی وجہ سے ہوئی ہے جو جاپ منتر میں نے گندی آتما کے لیے کیا تھا، وہ اس غریب پر پلٹ گیا۔''

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا پھر بھی میں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ اونکار ناتھ سے کہا۔ ''مہاراج! کیا تم اپنی شکتی کے زور سے اپنے متر کو اس کشٹ سے نجات دلانے کا کوئی اپائے نہیں کر سکتے؟''

''کر سکتا ہوں، پرنتو اس کے لیے سمے لگے گا۔ ماں کالی کا آتم جاپ زہریلے ناگوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس کا توڑ کرنا اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ پرنتو تم کوئی چنتا نہ کرو۔ جا کر آرام کرو، میں اپنے متر کی دیکھ بھال کرنے کو تیار ہوں۔''

''مہاراج!'' میں نے اس بار حقارت سے کہا۔ ''دو چار تنتر منتر میں نے بھی پنڈت پجاریوں کی سیوا کر کے سیکھے ہیں۔ کہو تو تمہارے متر کو اس کشٹ سے نجات دلانے کی خاطر میں کوئی منتر پڑھوں۔''

''تُو...... منتر پڑھے گی؟'' اونکار ناتھ مجھے سنجیدگی سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''مورکھ! جنتر منتر بالکوں کا روگ نہیں۔ جا...... جا کر اپنے پتی کی خبر لے۔''

اونکار ناتھ کا لہجہ اس قدر تحقیر آمیز تھا کہ میں برداشت نہ کر سکی۔ گرج دار آواز میں بولی۔ ''پاپی! اپنی گندی زبان بند رکھ۔ اگر تُو سچ مچ پنڈت ہوتا تو اب تک تجھے جان لینا چاہیے تھا کہ تیرے سامنے اس سمے کون کھڑا ہے اور تیرے متر کو کشٹ کس نے دیا ہے؟''

اونکار ناتھ اور گھنشیام دونوں ہی چونکے۔ میں نے ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بلند آواز میں ایک منتر پڑھ کر رام لبھایا کی طرف پھونکا تو وہ لوٹنا پوٹنا بند کر کے کپڑے جھاڑتا ہوا یوں فرش سے اُٹھا جیسے اسے مطلق کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں نے اسے مخاطب کر کے سرد آواز میں دریافت کیا۔

''رام لبھایا! کیا تُو جانتا ہے کہ اس سمے تُو کس کی آواز سن رہا ہے؟''

''جانتا ہوں مہارانی!'' رام لبھایا نے خوابیدہ آواز میں بدستور میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ''اس سمے میں جگد مبا جی کے سامنے کھڑا ہوں جو مہان شکتی کی مالک ہیں، جسے کالی ماتا، شنکر جی اور گنیش جی کا آشیرواد حاصل ہے۔ تمہارے شریر میں ہنومان سے زیادہ شکتی ہے۔ تمہارا گیان دھیان اپرم پار ہے۔ دھرتی کی کوئی شکتی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

''اپرادھی، اب تُو مجھے یہ بتائے گا کہ تُو نے اور رام لبھایا نے مجھے کس کارن اپنے کمرے میں بلایا تھا۔'' میں نے اونکار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس آواز میں دریافت کیا۔

''مجھے شما کر دو پنڈتائن! ہمارے من میں کھوٹ تھا۔ ہم تمہارے پتی کے دوارا تمہارے کومل شریر سے اپنے من کی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔ اس سمے ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ تم کون ہو۔''

اونکار پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا چہرہ خوف کے مارے زرد پڑ چکا تھا۔ گھنشیام کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ میں نے ان دونوں کو ایک نظر دیکھا پھر رام لبھایا کو گھور کر پوچھا۔

''پاپی! اب تُو مجھے یہ بتائے گا کہ اوناش کا چکر کیا ہے؟''

''مہارانی! مہارانی! میں ہاتھ باندھ کر بنتی کرتا ہوں، مجھے شما کر دو۔'' رام لبھایا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ وہ سرتاپا خوف سے لرز رہا تھا۔ میں نے اس کا نامکمل جواب سنا تو گرج کر بولی۔

"کمینے، کتے، کیا یہ جھوٹ ہے کہ تم دونوں نے گھنشیام داس کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کے کارن اوینا ش کو اپنے گندے علم کا نشانہ بنایا ہے؟"

"شما کر دو مہارانی! شما کر دو۔" رام لبھایا بدستور گڑگڑا کر بولا۔ اونکار ناتھ نے آگے بڑھ کر میرے پیر پکڑ لیے لیکن میرا غصہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

پہلے میں نے رام لبھایا کو نشانہ بنایا۔ ایک منتر پڑھ کر پھونکا تو وہ دوبارہ چکرا کر زمین پر گرا اور لوٹنے لگا۔ اس بار اس کے حلق سے کربناک آوازیں بلند ہو رہی تھیں یوں جیسے کوئی غیر مرئی طاقت اس کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ اصلیت بھی یہی تھی۔ میرے منتر کے بیروں نے رام لبھایا پر تشدد کی انتہا کر رکھی تھی۔ کچھ دیر لوٹنے کے بعد وہ ساکت ہو گیا اور پھر اس کا جسم اکڑ کر رہ گیا۔ اونکار ناتھ نے اپنے ساتھی کا بھیانک انجام دیکھا تو اپنا سر میرے قدموں پر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔

"مہارانی! میں تمہیں ماں کالی کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے شما کر دو مہارانی!"

"پاپی!" میں کڑک کر بولی۔ "اپنی گندی زبان سے دیوی کا شبھ نام نہ لے۔"

"مہارانی! شما کر دو، شما کر دو مہارانی!" اونکار ناتھ بدستور میرے قدموں پر سر رکھے ہوئے گڑگڑایا لیکن میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہو سکا۔ میں نے نفرت سے جواب دیا۔

"اونکار ناتھ! ہیجڑوں کی طرح رونے اور چلانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مرد بنو اور میرے مقابلے پر آؤ۔ میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے علم میں کتنی شکتی ہے۔"

"نہیں مہارانی نہیں تمہاری شکتی مہان ہے، میں تمہارے چرنوں کی دھول بھی نہیں، مجھے شما کر دو مہارانی!" اونکار ناتھ بلک بلک کر رونے لگا۔

گھنشیام گنگ سا کھڑا سب کچھ سن رہا تھا۔ جب اسے حالات کا کچھ اندازہ ہوا تو اس نے مجھے مخاطب کر کے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

"مہارانی! میں تم سے بنتی کرتا ہوں کہ اس پاپی کو ایسا سراپ دو کہ جیون بھر دکھی رہے۔"

"ایسا ہی ہوگا گھنشیام!" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا پھر ایک خطرناک منتر کا جاپ کر کے اُلٹا پاؤں زمین پر مارا تو میرے بیر شکاری کتوں کے روپ میں نمودار ہو کر اونکار ناتھ سے لپٹ گئے اور اپنے زہریلے دانتوں سے اس کے جسم کو بھنبھوڑنے لگے۔

اونکار ناتھ نے اپنے بچاؤ کی بہتیری کوشش کی لیکن شکاری کتوں نے اسے منٹوں میں لہولہان کر دیا۔ اس کے جسم کا گوشت اس طرح نوچ ڈالا کہ بدن کی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ یہ منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ گھنشیام نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ اونکار ناتھ دم توڑتے ہوئے مریض کی طرح فرش پر پڑا اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے بیروں کو اشارہ کیا تو انہوں نے اونکار ناتھ کے گھٹنے اور کہنیوں کی ہڈیاں تک چبا ڈالیں۔ میرا منشا پورا ہوا تو میں نے بیروں کو واپسی کا حکم دیا۔ اشارے کی دیر تھی کہ دونوں بیروں نے زمین پر لوٹ لگائی اور نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں نے اونکار ناتھ سے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''پاپی! اب تُو سارا جیون اسی حالت میں رہے گا۔ دیوی دیوتاؤں کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ تیری یہی سزا تھی اور گھنشیام کی اچھا بھی یہی تھی۔''

اونکار ناتھ نے مجھ سے کہنا چاہا لیکن اس کی حالت ابتر تھی اس لیے اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ میں حقارت سے اس کو ٹھوکر مار کر جانے کے ارادے سے مڑی تو گھنشیام داس نے کہا۔

''مہارانی! ان دونوں پاپیوں کے لیے کیا آ گیا ہے؟''

''اپنے ملازموں سے کہو کہ ان دونوں کو اُٹھا کر یہاں سے کہیں دور پھینک آئیں۔''

میں نے گھنشیام سے تحکمانہ لہجے میں کہا پھر اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب تک میں یہاں ہوں، تمہیں کوئی شکتی پریشان نہیں کر سکتی۔''

گھنشیام مجھ سے بے حد مرعوب ہو چکا تھا، مجھے جاتا دیکھ کر اس نے ہاتھ باندھ لیے، میں قدم بڑھاتی اپنے رہائشی حصے میں آئی تو میری سہا یک کملا میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

''مہارانی! کہو کرپا کرم کر آئیں ان دونوں کا؟''

''ہاں...... پرنتو! گھنشیام کو ابھی سبق دینا باقی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کارن؟'' کملا نے میری سنجیدگی سے قدرے بوکھلا کر دریافت کیا۔ ''اس غریب نے کیا غلطی کی تھی؟''

''اس کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی کہ وہ ان دونوں کے ہاتھوں کھلونا بنا رہا اور مجھے ان کم بختوں سے کمتر سمجھتا رہا۔''

''مہارانی!'' کملا نے میرے قریب آ کر ملائم لہجے میں جواب دیا۔ ''اسے شما کر دو، مہارانی! اس مورکھ کو بھلا کیا خبر کہ تمہاری شکتی اپرم پار ہے، وہ نردوش ہے مہارانی! اویناش کی بیماری نے اسے پہلے ہی بہت بیاکل کر رکھا ہے۔''

کملا کی سفارش کا انداز اتنا حسین اور دلکش تھا کہ میرا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ ''اگر یہ تمہاری اچھا ہے کہ میں گھنشیام کو شما کر دوں تو ایسا ہی ہو گا۔''

''تمہاری بڑی کرپا مہارانی!''

دوسری صبح میں سو کر اُٹھی تو کملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مہاراج گھنشیام بہت دیر سے باہر کھڑے تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔ رات سے اویناش کی حالت کچھ زیادہ خراب ہے۔ بڑا بیاکل نظر آتا ہے۔''

میں نے اُٹھ کر جلدی سے منہ ہاتھ دھویا، ناشتے سے فارغ ہوئی، باہر آئی۔ گھنشیام کو بڑے مضطرب انداز میں اپنا منتظر پایا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور چہرے کی وحشت بتا رہی تھی کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو گھنشیام کی آنکھیں بھر آئیں۔ رقت بھرے لہجے میں بولا۔

''مہارانی! رات سے اویناش کی حالت نازک ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گا۔ میری سہائتا کرو مہارانی! میں بنتی کرتا ہوں، اویناش کو بچا لو۔''

''اتنی جلدی کیا ہے گھنشیام!'' میں سنجیدگی سے بولی۔ ''ڈھاکا میں اب بھی بہت سے پنڈت پجاری موجود ہیں۔ تم دھنوان ہو، دولت میں بڑی شکتی ہوتی ہے، دو چار کو اور آزمالو۔''

''مجھے شما کر دو مہارانی!'' گھنشیام جو کروڑوں میں کھیلتا تھا، کسی بھکاری کی طرح گڑگڑانے لگا۔ ''مجھ سے بھول ہوئی، میری آنکھوں پر پٹی پڑ گئی تھی جو میں کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہ کر سکا مجھ پر کرپا کرو مہارانی! اویناش کی جان بچالو، میں وچن دیتا ہوں کہ سارا جیون تمہاری سیوا کرتا رہوں گا۔''

''اچھا......چلو۔''

گھنشیام مجھے حویلی کے اس کمرے میں لے گیا جہاں اویناش موجود تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر اویناش پر نظر ڈالی اور اس کی کیفیت دیکھی تو ایک لمحے کو میرا دل بھی دھک سے ہو گیا۔ ملازموں کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اویناش انتہائی حسین اور شوخ لڑکا تھا۔ سارا دن شوخ ہرنیوں کی طرح وسیع وعریض احاطے میں درختوں کے درمیان اُچھلتا پھرتا تھا لیکن اس وقت اویناش میرے سامنے ہڈیوں کے پنجر کی صورت میں بستر پر پڑا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، رُخساروں پر پڑی ہوئی جھریاں اور زرد رنگت نے اسے زندہ لاش میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کے جسم میں اتنی طاقت بھی باقی نہیں تھی کہ وہ سانس کی رفتار پر قابو پا سکے، یوں لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے سانس اُکھڑ جائے گی۔ میں ابھی اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ گھنشیام نے جھک کر میرے پیر تھام لیے اور رندھی ہوئی آواز میں بڑی لجاجت سے بولا۔

''مجھے نراش نہ کرنا مہارانی! میری پرارتھنا کی لاج رکھ لینا۔ میں ہاتھ جوڑ کر بنتی کرتا ہوں۔''

''دھیرج سے کام لو گھنشیام!'' میں نے اسے دلاسا دیا اور بہ مشکل اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ''اویناش کے لیے تمہیں چنتا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے وشواس ہے کہ تمہارا گھر سُونا نہیں ہونے پائے گا۔''

میں گھنشیام کو اویناش کی صحت یابی کا یقین دلانے کے بعد دوبارہ بستر کی سمت نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ اویناش اکڑا بیٹھا ہے اور سرخ خونخوار آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شعلوں کا شیطانی ناچ دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یہ سب کچھ سفلی عمل کی علامت ہے۔ ابھی میں اپنے اگلے قدم کے بارے میں غور ہی کر رہی تھی کہ اویناش کی کرخت مگر منمناتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

''تُو کون ہے؟ میرے کمرے میں کیا لینے آئی ہے؟ مورکھ، جا چلی جا یہاں سے۔''

''دوشٹ!'' میں صورتِ حال بھانپ کر گرجدار آواز میں بولی۔ ''میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ اویناش کے شریر کو چھوڑ دے۔ اگر تُو نے میری آگیا کا پالن کیا تو میں تجھے شما کر دوں گی۔ پرنتو! اگر تُو نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو میں تجھے ایسا کشٹ دوں گی کہ نرکھ کی اگنی تجھ سے دور بھاگے گی۔ سنا تُو نے، میں کیا کہہ رہی ہوں۔''

اویناش کی آنکھوں کی سرخی یکلخت غائب ہو گئی۔ ایک ثانیے کے لیے وہ لڑکھڑایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گر جائے گا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے جسم میں جیسے دوبارہ جان آ گئی۔ آنکھوں کی سرخی دوبارہ نمودار ہوئی۔ اس کی مکروہ آواز پھر گونجی۔

''میں تمہاری آگیا کا پالن کرنے کو تیار ہوں۔ پرنتو! اس کے لیے تمہیں میری ایک شرط ماننی پڑے گی۔ گھنشیام کو اپنی بھینٹ دینی ہو گی۔''

''میں تیار ہوں۔'' گھنشیام جذباتی انداز میں چیخا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر اویناش کی نظروں سے نظریں ملا کر سرد آواز میں کہا۔

''بھینٹ کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے؟''

''نہیں......صرف بھینٹ ہی ایک طریقہ ہے جو اویناش کو بچا سکتا ہے۔''

''بھینٹ کس کے نام پر دینی ہوگی؟'' میں نے بڑی مشکلوں سے خون کا گھونٹ پی کر سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

''لونا چمارن کے نام پر۔'' اویناش نے جھومتے ہوئے جواب دیا۔

مجھے علم تھا کہ جب تک اس گندی اور ناپاک آتما کا نام نہ معلوم ہو جو کسی کے سر پر مسلط کر دی گئی ہو، اس کا اُتارنا ناممکن ہے چنانچہ جب مجھے نام معلوم ہو گیا تو میں نے دوبارہ تیور بدلا اور کڑک کر کہا۔

''لونا چمارن! تُو اس سے کس سے بات کر رہی ہے؟ تجھے نہیں معلوم، کلنکنی، میں پھر کہتی ہوں کہ اویناش کے شریر سے دور ہو جا یا در کھ اگر تُو نے انکار کیا تو میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گی۔''

میرے جواب میں کمرے میں ایک بھیانک نسوانی قہقہہ گونجا پھر اس سے پیشتر کہ میں لونا کی گندی آتما کو قابو کرنے کے لیے کوئی جنتر منتر کرتی، اویناش بے ہوش ہو کر بستر پر گر گیا۔ گھنشیام جو ابھی تک پتھر کے بت کی مانند کھڑا پھٹی پھٹی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا، اویناش کو دوبارہ بے ہوش ہوتا دیکھ کر گھبرا گیا۔ دیوانگی کے عالم میں اس نے اویناش کی سمت بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے پکڑ لیا۔ یہاں میں بڑی صاف گوئی سے یہ عرض کر دوں کہ سفلی علوم کے توڑ کے سلسلے میں میرا تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا، چنانچہ میں ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی اور دوسرے ہی لمحے گرو جی کی آواز میرے کانوں میں سرگوشی بن کر اُبھری۔

''پریشان نہ ہو، لونا چمارن کی آتما تمہاری شکتی کے آگے کسی حقیر کیڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اسی کارن وہ ڈر کر بھاگ گئی۔''

''گرو جی! مجھے بتاؤ کہ اس پاپن کو کچلنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے من ہی من میں گرو کو مخاطب کیا۔

''اس کا کیول ایک ہی طریقہ ہے۔'' گرو جی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''اونکار ناتھ نے چمارن کی آتما کو قابو کرنے کے لیے اس کا ایک پتلا بنا کر اس پر عمل کیا تھا۔ جب تک یہ پتلا برباد نہیں ہوگا، لونا کی گندی آتما اویناش کا شریر نہیں چھوڑے گی۔ اونکار ناتھ نے وہ پتلا اپنے کمرے کے غسل خانے میں دفن کیا ہے۔''

میرے لیے اتنا اشارہ ہی بہت تھا۔ گھنشیام کا ہاتھ تھام کر میں اویناش کے کمرے سے باہر نکلی اور تیز تیز قدموں سے اس کمرے میں آئی جہاں اونکار ناتھ مقیم تھا۔ حویلی کے ملازموں کو بلا کر جب میں نے غسل خانے کا فرش اُکھاڑنے کا حکم دیا تو گھنشیام مجھے یوں گھورنے لگا جیسے اسے میری ہوش مندی پر شبہ ہو رہا ہو، لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ملازموں نے فرش اُکھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ گھنشیام خاموش کھڑا اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہا لیکن اس وقت اس کی آنکھیں بھی حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جب فرش کی تہہ سے ایک کپڑے کا پتلا برآمد ہوا۔ میں نے ملازموں کو باہر جانے کا حکم دیا پھر پتلا اُٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ پتلے میں بے شمار سوئیاں پیوست تھیں۔

''مہارانی! یہ سب کیا ہے؟'' گھنشیام نے پوچھا۔

''دھیرج رکھو گھنشیام۔'' میں نے دھیرج آواز میں کہا۔ ''یہی پتلا اویناش کی بیماری کا کارن تھا۔'' اس کے بعد میں نے ایک ملازم کو آواز دے کر تیل اور ماچس لانے کو کہا۔

گھنشیام گنگ سا کھڑا تھا، ملازم نے تیل اور ماچس فراہم کی تو میں نے پتلے پر تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی، پتلے کو آگ لگنی تھی کہ کمرے میں وہی منمناتی ہوئی آواز اُبھری جو میں اویناش کے کمرے میں سن چکی تھی، اب اس آواز میں بلا کا کرب تھا بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی عورت موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار ہو، جوں جوں پتلے سے شعلے بلند ہوتے رہے۔ کربناک آواز کی شدت بڑھتی گئی پھر جب پتلا جل کر راکھ ہوا تو آوازیں بھی بند ہو گئیں، میں نے راکھ کو پیروں سے مسل دیا۔ گھنشیام کے ساتھ دوبارہ اویناش کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو وہ ہوش میں تھا، البتہ ابھی تک اس کی کمزوری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ گھنشیام کو دیکھ کر اویناش نے اپنی آواز میں کہا۔ ''پتا جی!''

''میرے بچے! میرے اویناش!'' گھنشیام نے آگے بڑھ کر اویناش کو چوم لیا۔ باپ بیٹے کا ملاپ دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے گھنشیام کو وہاں تنہا چھوڑا اور کچھ کہے سنے بغیر باہر آ گئی۔ بعد میں کملا کی دیکھ بھال اور میرے جنتر منتر نے اویناش کی صحت بھی بحال کر دی، پندرہ روز کے اندر وہ دوبارہ ہرن کی مانند اپنے باپ کی حویلی میں کلیلیں بھرنے کے قابل ہو گیا۔ گھنشیام نے میری شکتی کا تماشا دیکھنے کے بعد میری آؤ بھگت دوگنی کر دی، اب پوری حویلی میں میرا راج تھا، تمام ملازم اور نوکر چاکر ہر وقت مع گھنشیام کے میرے آگے پیچھے ہاتھ باندھے موجود رہتے۔ اویناش کی صحت یابی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا جس میں، مَیں نے بھی شرکت کی۔ گھنشیام چونکہ کچے عقیدے کا مالک تھا اس لیے بیشتر شہروں سے بڑے بڑے پنڈت پجاریوں کو اس دعوت میں شرکت کی غرض سے بلایا گیا اور ان کے قیام کا معقول بندوبست کیا گیا۔

☆=======☆=======☆

ڈھاکا میں اس بار میری آمد کا مقصد محض تفریح کرنا تھا چنانچہ اوبناش کے ٹھیک ہو جانے کے بعد میں ہوٹل میں منتقل ہو گئی۔ گھنشیام نے مجھے اپنی حویلی میں روکنے پر بے حد اصرار کیا لیکن جب میں کسی طرح تیار نہ ہوئی تو گھنشیام نے بڑے حوصلے سے کہا۔

''مہارانی! میں تمہارے چرنوں کی دھول ہوں تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کر سکتا پرنتو ایک بات تم کو ضرور ماننی پڑے گی۔ جب تک تم ڈھاکا میں رہو گی تمہارا سارا خرچ یہ سیوک برداشت کرے گا۔''

''دھن دولت آنی جانی چیزیں ہیں گھنشیام یوں بھی تم میری شکتی کے چمتکار اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو، مجھے دھن کی کوئی چنتا نہیں۔''

میں نے گھنشیام کو ٹالنا چاہا مگر وہ بضد رہا تو میں نے مجبوراً اسے سیوا کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ جس ہوٹل میں، مَیں نے قیام کیا اس کا تمام خرچ گھنشیام برداشت کر رہا تھا۔

میرے ذہن سے گناہ و ثواب کا احساس مٹ چکا تھا۔ میں پوری طرح یوگی راج کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ اس لیے ظلم کرنا میرا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر میں کسی کی بھی شمع حیات گل کر دیتی تھی۔ پچاسوں افراد کی قاتلہ بن چکی تھی۔

اس دن بھی میں نے ایک بیوہ عورت کا اکلوتا سہارا اس سے چھین لیا تھا۔ مجھے کالی ماتا کے چرنوں میں انسانی خون چڑھانا تھا۔

بچے کے تازہ خون سے کالی ماتا کے پیر دھو کر میں اپنے کمرے میں پہنچی تھی کہ بُری طرح اُچھل پڑی۔ بستر کے سامنے رکھی کرسی پر فقیر بابا بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے غصے سے کہا۔ ''آج تک سنتا آیا تھا کہ ولی اللہ کے گھر میں بھی شیطان پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ تم میرے دوست کی بیٹی ہو۔ میں نے سوچا تھا کہ میں تمہاری مدد کرتا رہوں گا مگر افسوس......''

''آپ سے کس نے کہا کہ آپ میری مدد کریں۔'' میں نے پتا نہیں کس جذبے کے تحت یہ کہہ دیا۔

''یہ تُو بول رہی ہے؟ تُو......لعنت ہے تجھ پر۔''

''میں جو کچھ کر رہی ہوں یہ میرا نجی معاملہ ہے، کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''کفر کے آگے دیوار بن جانا ہر صاحبِ ایمان کا فرض ہے۔ تُو اب نہ صرف کفر کر رہی ہے بلکہ گندگی میں بیٹھی گندگی کھا رہی ہے۔''

''اے بڈھے زبان سنبھال کر، ابھی میری قوت تُو نے دیکھی نہیں ہے۔'' میں ہتھے سے اُکھڑ گئی تھی مگر مجھے احساس تھا کہ میں جو کچھ بول رہی ہوں یہ غلط ہے مگر میں خود پر کنٹرول کھو چکی تھی۔

''اچھا......تو تجھے اپنی ناپاک قوت پر بہت ناز ہے؟ تو یہ لے، سنبھل۔'' کہہ کر فقیر بابا نے ہاتھ کو جھٹکا۔

''ٹھہریں......'' میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

فقیر بابا کے چہرے پر جلال باقی تھا۔ انہوں نے میری آواز پر توقف کیا پھر بولے۔ ''ہاں......بول، کیا کہنا چاہتی ہے؟''

''اب میں پہلے والی بھولی بھالی کمرے کی بو نہیں رہی۔ میرے پاس بھی علم ہے۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتی ہوں۔''

''ہونہہ......علم ہے ارے شیطان کی قوت گندگی میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہے۔ ایمان بیچ کر تم نے قوت خریدی ہے، وہ علم نہیں، جہنم کا پاسپورٹ ہے۔''

''کچھ بھی ہو، میرا قد تو بڑھ گیا۔ اب میں جو چاہوں کر سکتی ہوں۔''

''بنگلہ ہی کی کہاوت ہے کہ ویناش کالے وپیرت بودھی یعنی تباہی آنے سے پہلے عقل کُند ہو جاتی ہے۔'' فقیر بابا نے گہری سانس لی۔

''تمہارے لیے میرا ایک ہی اشارہ کافی ہے مگر کیا کروں، تم میرے پیر بھائی کی بیٹی ہو۔ مرحوم کی وجہ سے میں کچھ کہہ نہیں پا رہا ہوں، پھر بھی ہوشیار کر رہا ہوں۔ توبہ کرلو، ورنہ میں کوئی بھی قدم اُٹھا سکتا ہوں۔''

''مجھ پر احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو دل میں آئے کریں، مگر یاد رکھیں، میں جواب دینا جانتی ہوں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں، یہ جملے تمہارے نہیں، اس بدبخت کے ہیں جس نے تمہارے ذہن پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میں کل تک کا وقت دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو، پھر مجھے بتا دینا۔ تمہاری اجازت کے بغیر میں تمہارا ذہن صاف نہیں کرنا چاہتا۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی خدمت اپنے پاس رکھیں۔'' میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''تم میری بیٹی جیسی ہو، اس لیے تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ گئے۔

فقیر بابا کے جاتے ہی میں بھی کھڑی ہو گئی۔ کچھ بھی ہو، فقیر بابا کی روحانی قوت ہمالیہ ایسی بلند تھی۔ وہ مجھے طرح دے رہے تھے ورنہ میری قوت ان کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی نہ تھی۔ میرا گرو بھی ان کے سامنے کچھ نہ تھا۔ پتا نہیں، میں کس رو میں ان سے زبان لڑا بیٹھی تھی اور اب خوف زدہ تھی کہ کہیں وہ مجھ پر کوئی بندش نہ کر دیں۔ مجھے اب کون سا منتر پڑھنا چاہیے، ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ دماغ میں سرگوشی سی اُبھری کہ مجھے کالی مندر جانا چاہیے۔

جس کا باپ پنج وقتہ نمازی تھا۔ تہجد گزار تھا۔ ساری ساری رات عبادت کیا کرتا تھا۔ اس کی بیٹی مندروں میں جاپ (چلہ) کرنے لگی تھی۔ یہ شرم کی بات تھی کہ میں اپنے ہی ہاتھوں جہنم کی آگ خرید رہی تھی مگر اس وقت تو میرا ذہن میرا نہ تھا اسی لیے میں کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور سیڑھیوں سے اُتر کر لاؤنج میں پہنچی تھی پھر گیٹ پار کر کے میں سڑک پر آ گئی تھی۔

میرا رُخ کالی مندر کی طرف تھا۔ میں وہاں بیٹھ کر جاپ کرنا چاہتی تھی تاکہ میری قوت میں اور بھی اضافہ ہو جائے۔

مندر پہنچ کر میں سادھوؤں کے لیے بنی کٹیا کی طرف چلی آئی۔ کسی خالی کٹیا میں بیٹھ کر میں جاپ کرنا چاہتی تھی۔

ابھی میں ان کوٹھریوں کے درمیان پہنچی ہی تھی کہ ایک چیخ سنائی دی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ لڑکی کی چیخ میں کرب تھا۔ میں نے بائیں جانب والی کٹیا پر نظر ڈالی۔ اس کٹیا پر مندر کے بڑے پجاری کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اسی کٹیا سے چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ میرے تیور بدل گئے تھے۔ میرا رُخ اسی کٹیا کی جانب ہو گیا تھا۔ میں فوراً پجاری کی کٹیا میں داخل ہو گئی تھی۔ اندر پہنچتے ہی میں ٹھٹک گئی۔ وہ منظر ہی ایسا تھا کہ کوئی شریف لڑکی اُدھر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے پل بھر میں حالات کا جائزہ لے لیا اور پھر چیخ کر کہا۔ ''کمینے! اسے چھوڑ دے۔''

پجاری نے مڑ کر میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھا پھر چیخ کر بولا۔ ''او ئے تُو کون ہے رے؟ تیری ہمت کیسے ہوئی میری کٹیا میں آنے کی؟''

''دوشٹ پاکھنڈی! مندر کا مہا پجاری ہو کر بھی پاپ کرتا ہے۔ تجھے لاج نہیں آئی؟'' میں نے کرخت لہجے میں اسے للکارا۔ ''چھوڑ دے اس لڑکی کو۔''

''اس کی جگہ تُو خود لے گی؟ آ جا تُو بھی آ جا۔'' وہ زہریلی ہنسی ہنس کر بولا۔

''میں تیری کیا حالت کروں گی، یہ تجھے ابھی معلوم ہو جائے گا۔ اگر تُو نے اس لڑکی کے پیر پکڑ کر شما نہیں مانگی تو یاد رکھ، میں تجھے ایسا شراپ (بددعا) دوں گی کہ تُو زندگی بھر اپنے زخم چاٹتا رہ جائے گا۔''

''تُو...... تُو مجھے شراپ دے گی؟ مجھے، اس مندر کا میں پردھان پجاری ہوں۔ کالی مائی کا بھگت ہوں۔'' وہ لڑکی کو پرے دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر غضب ناک آواز میں بولا۔ ''تُو نے شاید پنڈت گردھاری لال کا نام نہیں سنا ہے۔ اگر سنا ہوتا تو دبے پاؤں میری کٹیا کے سامنے سے گزر جاتی۔ اب بھی سمے ہے۔ اگر جیون کا موہ ہے تو چلی جا یہاں سے۔''

اس کا اُچھلنا کودنا دیکھ کر مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے معصوم بن کر کہا۔ ''پنڈت جی! میں اس شہر میں نئی نئی آئی ہوں۔ ماں کے درشن کرنے آئی تھی۔ لڑکی کی چیخ سنی تو تمہاری کٹیا میں آ گئی۔ اگر معلوم ہوتا کہ یہاں پردھان پجاری جی براجمان ہیں اور مندر کی کسی کمزور سیویکا سے اپنا من 'بہلا' رہے ہیں، تو کبھی اندر نہ آتی۔''

''تُو نئی ہے، اس لیے تجھے معاف کرتا ہوں۔ چل جا، اپنا کام کر۔''

''جو آ گیا مہاراج!'' کہہ کر میں لڑکی کی طرف بڑھی۔

''اے اُدھر کیوں جاتی ہے؟''

''مہاراج! آپ تو قسمت کے سانڈ ہیں۔ جس داسی پر آپ کی 'نظر' پڑ گئی، وہ آپ کی ہو گئی۔ آپ کو تو بہت سی داسیاں مل جائیں گی۔ آپ ایسا کریں کہ اس داسی کو مجھے دان کر دیں۔''

پنڈت میری بات سن کر بارود کی طرح سلگ اُٹھا۔ گالیاں بکتا ہوا میری طرف بڑھا لیکن میرے بیروں نے اسے راستے ہی میں روک لیا۔ اس کا اُٹھا ہوا ہاتھ اُٹھا ہی رہ گیا۔ پھر وہ ہوا میں بلند ہوا ایسے جیسے کسی نے اسے دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر سر سے بلند کیا ہو۔ حیرت سے پردھان پجاری کی آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ وہ ایسے کانپ رہا تھا جیسے اسے تپ لرزاں ہو۔ میں نے مضحکہ اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''دھنیہ ہو مہاراج! اوش (یقیناً) آپ کو دیوی دیوتاؤں نے بہت شکتی (قوت) دی ہے تبھی تو آپ ہوا میں تیر رہے ہیں۔''

''تم...... تم کون...... کون ہو؟'' اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ اس کی اکڑفوں رخصت ہو چکی تھی۔

''میں کون ہوں؟ سننا چاہتا ہے تو سن میں وہ ہوں جس کے بارے میں تُو نے صرف سنا ہو گا۔ میں سادھیکا (عبادت گزار) ہوں۔ جب اور جس سے چاہوں، تجھے جیون بھر کے لیے ہوا میں ٹانگ دوں۔ میں تیرے پاپ کی کتھائیں سن کر آئی ہوں۔ تیرے کرتوتوں کا بہی کھاتا (کتاب) بھر چکا ہے۔ اب سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جا۔''

''شما کر دیں دیوی جی! جیون بھر آپ کا اُپکار مانوں گا۔''

''نہیں مہاراج! آپ تو پردھان پجاری ہیں۔ آپ کی سزا بھی پردھان ہوگی۔ ایسا کشٹ دوں گی کہ آپ جیون بھر پاپ کا نام یاد نہیں کر پائیں گے۔'' پھر میں نے مڑ کر پجارن سے کہا۔ ''اپنے پیروں سے کھڑاؤں (لکڑی کی چپل) نکال اور گن کر دس کھڑاؤں مار...... نیچ اسی قابل ہے۔''

''دیوی! تم نے مجھ پر بہت بڑا اُپکار کیا ہے۔ اسے میں سارا جیون یاد رکھوں گی۔'' پھر اس نے پجاری پر حقارت کی نگاہ ڈانٹ کر کہا۔ ''مگر یہ کالی مائی کا بھگت ہے۔ پردھان پجاری ہے۔ اسے معاف کر دو۔ دیوی ماں اسے خود شراپ دے گی۔''

پجارن کی ہچکچاہٹ دیکھ کر میں نے کہا۔ ''تو میرا اپمان کر رہی ہے۔ میری آگیا کا پالن (حکم پورا کرنا) تیرا دھرم ہے۔''

پجاری جو ہنوز ہوا میں معلق تھا، گڑگڑا کر بولا۔ ''شما کر دیں دیوی! میں وشواس دلاتا ہوں کہ اب کبھی کسی داسی یا پجارن پر بُری نظر نہیں ڈالوں گا۔''

میں اسے معاف کر دیتی کہ میرے بیر نے سرگوشی کی۔ ''نہیں دیوی! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے من میں پاپ ہی پاپ ہے۔ اسے تو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں ہے۔''

بیر کے اشارے پر میں نے اسے معاف کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس پر ایک قہر آلود نظر ڈال کر میں نے اپنے بیر کو اشارہ کر دیا کہ وہ پجارن کے اندر داخل ہو جائے۔

پجارن اپنی جگہ سہمی ہوئی کھڑی تھی کہ اس کے سر کو دو تین جھٹکے لگے پھر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے۔ وہ پجاری کو کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ میں نے کہا۔ ''بولو کیا تم میرے آدیش کا پالن نہیں کرو گی؟''

''دیوی! تم ماتا سمان ہو۔ تمہارا آدیش میرے لیے دھرم سمان ہے۔''

''تو پھر کھڑاؤں اُتارو اور پل پڑو۔ اتنے جوتے مارو کہ یہ پھر کبھی کسی ناری جاتی کی طرف دیکھنے کا بھی ساہس نہ کرے۔''

''جو آگیا دیوی!'' پجارن نے کہا اور داہنے پیر کا کھڑاؤں اُتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ پجاری کی آنکھوں میں دہشت اُتر آئی تھی۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی حالت نہ صرف قابلِ دید تھی، بلکہ مضحکہ خیز بھی تھی۔ فضا میں معلق وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

پجارن اس کے سر پر پہنچ چکی تھی پھر اس کا ہاتھ بلند ہوا اور تڑاتڑ کی آواز سے فضا گونج اُٹھی۔ ساتھ ہی ساتھ پجاری کی چیخ وپکار بھی جاری تھی۔ جب وہ مارتے مارتے تھک گئی تو ایک جانب بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ لکڑی کی کھڑاؤں کی دو چار ضربات ہی کافی تھیں جبکہ اس پر اتنی ضربیں پڑی تھیں کہ وہ ہوش کھو بیٹھا تھا۔ اسے بے ہوش دیکھ کر میرے بیروں نے اسے چھوڑ دیا۔

وہ تڑ سے زمین پر گرا تھا۔ میں نے اس پر آخری نظر ڈالی اور باہر نکل آئی۔ مجھے ایک مرد کو عورت سے پٹوانے کی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس خوشی میں سرشار اپنے ہوٹل میں پہنچی۔

یہ ہوٹل درمیانے درجے کا تھا۔ اس میں زیادہ تر تجارت پیشہ افراد ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔

شام ہونے تک میں اپنے کمرے میں آرام کرتی رہی تھی۔ پھر جب شام کا سایہ گہرا ہو گیا تو میں باہر نکلی۔ سوچا تھا، کچھ دیر سیر کروں گی، پھر بھجن کرنے کے وقت کالی مندر کا چکر لگاؤں گی۔ ابھی میں راہداری عبور کر کے ہال میں پہنچی تھی کہ مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی۔ کاؤنٹر پر ایک سب انسپکٹر اور دو تین پولیس والے کھڑے تھے۔ وہ لوگ شاید رجسٹر چیک کر رہے تھے۔ میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی اور ہال عبور کر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ پولیس والے نے آواز دی۔ ''سنیے!''

''جی!'' میں نے رُک کر کہا۔

''ذرا اِدھر آئیں گی۔''

''جی کہیے۔'' میں اس کی طرف بڑھتی چلی گئی تھی۔

''آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ منیجر کے کمرے تک چلیں۔''

میرا دل چاہا کہ اُلٹے ہاتھ کا کرارا تھپڑ رسید کر دوں مگر میں نے خود پر قابو کیے رکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی منیجر کے کمرے تک آ گئی ہے۔ اس کمرے میں منیجر، انسپکٹر اور ایک مسلح سپاہی بھی موجود تھا۔ باقی تین سپاہیوں کو بیرونی دروازے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

سب انسپکٹر نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کرتی کیا ہو؟''

''میں سادھیکا ہوں۔ سادھنا کرتی ہوں۔''

''تمہارے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں؟''

''بھگوان دیتا ہے۔''

''بھگوان دیتا ہے؟ ہنہ۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتی کہ......''

''کیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''میرے مخبروں نے خبر دی ہے کہ تم مسلمان ہو؟''

''جی ہاں......'' میں نے جواب دیا۔

''مسلمان ہو کر کفر کرتی ہے۔ مندروں میں جاتی ہے۔ یقیناً تیرا مطلب کچھ اور ہے۔''

''مجھے تپسیا پسند ہے اس لیے پوجا کرتی ہوں۔ تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''سنو...... بیوقوف کسی اور کو بنانا۔ میں تمہارے جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔'' میرے ذہن میں میرے پیر کے الفاظ گونج اُٹھے تھے کہ اس ہوٹل کا منیجر اس پولیس والے سے مل کر مسافروں کو اُلو بناتا ہے۔ جھوٹے سچے الزام لگا کر روپے اینٹھتا ہے۔ میں نے دوبارہ انسپکٹر کی طرف دیکھا پھر سوال کیا۔ ''اور کچھ پوچھنا ہے؟''

اس نے میری طرف افسرانہ شان سے دیکھا پھر کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ تھانے تک چلنا ہوگا۔''

''کیا تمہارے اندر اتنی طاقت ہے کہ مجھے تھانے تک لے جاسکو؟''

''میں تمہیں جہنم تک لے جاسکتا ہوں۔ سمجھیں۔'' انسپکٹر بولا۔

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' میں نے زچ ہو جانے کے انداز میں کہا کیونکہ اب میں نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

انسپکٹر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''مرد دس بار بھی بدنام ہو تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا مگر عورت ایک بار بھی بدنام ہو جائے تو اس کا سارا بھرم غارت ہو جاتا ہے۔ خاک میں مل جاتا ہے۔''

''انسپکٹر! بہت ہو گیا۔ اب اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکلا تو میں ایسی سزا دوں گی کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''اچھا...... تیری یہ ہمت! تجھے ابھی بتاتا ہوں۔'' کہہ کر برابر میں کھڑے سپاہی سے اس نے کہا۔ ''اسے ہتھکڑی لگا دو۔''

سپاہی آگے بڑھا۔ اس نے ہتھکڑی کا جوڑا نکالا اور میرے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ اس کی اس حرکت پر میں نے مسکرا کر کہا۔ ''لے اپنے اس چوڑیوں کے جوڑے کا انجام دیکھ۔'' کہہ کر میں نے اپنے سر کو جھکا کر ہتھکڑی پر پھونک ماری۔ ہتھکڑی کا تالا فوراً کھل گیا۔ ہتھکڑی کھلتے ہی وہاں موجود ہر ایک شخص گویا اُچھل پڑا۔ حیرت نے گویا سب کو گنگ کر دیا تھا۔ سب کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ میں نے کسی طرف توجہ دیئے بغیر ہتھکڑی کو اُتارا اور اسے انسپکٹر کی طرف اُچھال دیا پھر بولی۔ ''لے اب اسے تُو خود پہن لے۔ مگر یاد رکھ، تُو نے گھور پاپ کیا ہے۔ اس کی سزا تجھے ملے گی۔ برابر ملے گی۔''

انسپکٹر جس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا، بولا۔ ''تُو کہنا کیا چاہتی ہے؟''

''ارے واہ! تجھے ابھی تک سمجھ نہیں آیا ہے۔ تُو نے میرے ستر کروڑ دیوی دیوتاؤں کا اپمان کیا ہے کیونکہ میں بھگتنی ہوں۔ کسی بھگتنی کو ستانے کی سزا کیا ہے، یہ تجھے ابھی پتا لگ جائے گا۔ جا میں نے تجھے شراپ (بددعا) دی۔ تو کپڑے پہن کر بھی ننگا رہے گا۔ اپنے ہاتھوں سے کپڑے پھاڑے گا اور ننگا گھومے گا۔''

میں اب معمولی لڑکی تو تھی نہیں۔ میرا اتنا کہنا ہی کافی ثابت ہوا۔ انسپکٹر نے اپنے کپڑے نوچنا شروع کر دیئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہتا جا رہا تھا۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔ دنیا پاگل ہے۔ سب پاگل ہیں۔''

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم پر چیتھڑے جھولنے لگے۔ وردی کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ وہ اسی حالت میں اُچھل کود مچائے ہوئے تھا کہ میں نے کہا۔ ''چل دور ہو جا۔''

میرا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ وہ سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔

اس کارروائی نے ریسپشن پر موجود ہر شخص کو حیران کر دیا تھا۔ سب کے سب مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ میری خوشی دیدنی تھی۔ میں زور زور سے ہنس رہی تھی کہ میری ہنسی پر بریک لگ گئے۔ سامنے سے فقیر بابا چلے آ رہے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آج وہ اکیلے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ دو فقیر اور تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ تینوں غصے میں تمتما رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے میں سمجھ لیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں اور مجھے سزا دینے آئے ہیں۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے، یہ بھی میں نے سوچ لیا تھا۔

میں نے مقابلے کا سوچ لیا تھا اور دل ہی دل میں منتر بھی پڑھنے لگی تھی کہ فقیر بابا غرائے۔ ”نا ہنجار! تُو نے کیا سمجھ لیا ہے، میں ڈر جاؤں گا، بیوقوف لڑکی! شیطانی عمل کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو وہ فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر باطل حق کو دبا لے تو پھر یہ دنیا ختم ہو جائے۔“

فقیر بابا بول رہے تھے کہ میں نے اپنے بیروں کو حکم دے دیا کہ وہ فقیر بابا کو اُٹھا کر پٹخ دیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ میرے دو بیر، فقیر بابا کی طرف لپکے تھے۔

کھلی آنکھوں سے بیر نظر نہیں آتے اس لیے وہ صرف مجھے نظر آ رہے تھے مگر یہ کیا؟ وہ ان تک پہنچنے سے پہلے ہی اُچھل کر دور جا گرے تھے۔ ایسا لگا تھا جیسے انہیں کسی نادیدہ ہاتھ نے راستے ہی میں روک کر سر سے بلند کیا تھا پھر دیوار پر دے مارا تھا۔ اس کے بعد تو گویا جنگ چھڑ گئی تھی۔ میں نے اپنے تمام بیروں کو اس جنگ میں جھونک دیا تھا۔ وہ سب مل کر حملہ کر رہے تھے مگر ایک بھی بیر، فقیر بابا تک پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فقیر بابا نے خود کو کسی نادیدہ حصار میں قید کر لیا ہے۔ ان کے دونوں ساتھی بالکل خاموش تھے۔ انہوں نے اب تک کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔

”لڑکی! تُو نے اپنی پوری قوت آزمالی۔ اب میں تجھے دکھاتا ہوں علم کی قوت کسے کہتے ہیں۔“ فقیر بابا بولے، پھر انہوں نے کچھ پڑھ کر میری طرف پھونک ماری۔ یقین کریں، مجھے ایسا لگا تھا جیسے باریک باریک ریشے مجھ سے لپٹ گئے ہوں۔ میں نادیدہ بندھن میں بندھ گئی تھی جو مجھے جکڑتے چلے جا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے میں بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں، تبھی فقیر بابا کی آواز سنائی دی۔ ”میں نے تجھے اس گھر کے مکینوں کی حفاظت کے لیے رکھا تھا مگر تُو ان لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر نکل پڑی۔ میری بات کو رد کرنے کا مزہ بھی چکھ لے۔“ اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں ہواؤں میں اُڑنے لگی ہوں۔

☆======☆======☆

پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں چنا گانگ کے اسی گھر میں تھی جہاں فقیر بابا نے مجھے ٹھہرایا تھا۔ میں پلنگ پر پڑی تھی اور میرے سامنے فقیر بابا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

"تُو نے بہت کفر کرلیا۔ اب تُو یہاں سے کہیں نہیں جائے گی۔ اگر گئی تو اتنا بڑا نقصان اُٹھائے گی کہ لوگ حیران رہ جائیں گے۔"

میں نے جواب دینا چاہا تھا مگر دے نہیں پائی۔ بس کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی کیونکہ میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دل و دماغ کو افیون کھلا دی گئی ہو۔ بالکل انیچیوں کی طرح میں بستر پر پڑی تھی۔ اب نہ میرے بیر میرے قریب تھے اور نہ وہ دیوی دیوتا جن کی پوجا کر کے میں شکتی حاصل کر رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ اپنی کھوئی ہوئی قوت کیسے حاصل کروں؟ ابھی میں اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ فقیر بابا نے کہا۔ "تُو اسی حالت میں ایک ہفتہ رہے گی پھر میں تجھے اصل سزا دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ چلے گئے۔ وہ دونوں کون تھے کس لیے ہمارے ساتھ آئے تھے، میں جان ہی نہ سکی اور نہ غور کرنے کا وقت تھا کیونکہ فی الحال تو میں اس عجیب و غریب سزا کا مزا چکھ رہی تھی۔ بغیر ہاتھ پیر باندھے قیدی بنی ہوئی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں بس ایک ہی بات آ رہی تھی کہ اب میرا کیا ہوگا؟ میں نے اتنی محنت سے بھوکے پیاسے رہ کر مندروں مندروں جا کر ساری ساری رات جاگ کر زندگی کو داؤ پر لگا کر سفلی علوم میں ملکہ حاصل کیا تھا جسے فقیر بابا نے صرف ایک ٹھوکر میں اُڑا دیا۔ میرے علم کو باندھ دیا۔ اب میں کیسے اپنی دولت، اپنے عملی خزانے کو حاصل کروں؟ کیسے پھر سے اتنی ہی شکتی سالی اتنی ہی طاقتور ہو جاؤں؟ جبکہ فقیر بابا نے تو گویا مجھے بچی بنا دیا تھا۔ اگر کسی طرح اپنے ہمدردوں کو بلا سکتی تو شاید کچھ ہو سکتا تھا۔

ابھی میں یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ باہر سے شور سنائی دیا۔ کوئی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔ "سانپ! سانپ! سانپ!"

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر ناکامی مقدر ٹھہری۔ آنگن میں شاید بہت سارے لوگ جمع تھے۔ وہ سب چیخ رہے تھے۔ چاچی سینہ پیٹتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ اس نے زور زور سے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ "سونالی! ہم لٹ گئے...... برباد ہو گئے! اب تُو ہی کچھ کر!"

میں نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

پرکاش کے گرو نے نجاست والی غذا کھلا کر میرے اندر سے ایمان کی رمق چھین لی تھی۔ میرے ذہن کو کورے کاغذ ایسا بنا دیا تھا۔ اور اب بالکل ویسا ہی فقیر بابا نے میرے ذہن کی حالت بنا دی تھی۔ میں کچھ بھی یاد نہیں کر پا رہی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاچی کو دیکھے جا رہی تھی کہ کچھ لوگ نجمہ کے شوہر انور کو گود میں اٹھائے ہوئے اندر آئے۔ انہوں نے انور کو میرے پلنگ کے نزدیک زمین پر لٹا دیا تھا۔ اس کے منہ سے نیلا نیلا جھاگ نکل رہا تھا۔

"بیٹا! تُو ہی کچھ کر کوئی منتر وغیرہ آزما تاکہ زہر اُتر سکے۔" چاچی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے دشمنی کی انتہا کر دی تھی۔ مجھے تباہ کرنے کے لیے اسی نے تو اس تانترک کو بلایا تھا اور آج جب خود پر افتاد پڑی تو آنسو بہانے، مجھ سے مدد طلب کرنے پہنچ گئی۔ فقیر بابا نے اگر میری قوت سلب نہ کر لی ہوتی تو میں اسے فوراً ٹھیک کر دیتی۔ بس ایک بار منتر پڑھتی اور اس سانپ کو بلا لیتی۔ وہ سانپ آ کر اپنا زہر خود چوس لیتا مگر

اب تو ذہن کورا کاغذ بن چکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ تبھی ایک شخص نے کہا۔ ''بھائی! وقت برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جا کر کسی سپیرے کو بلا لاؤ۔''

''بالی نامی سپیرا بہت قابل ہے۔ برابر والے محلے میں رہتا ہے۔ اسے ہی بلا لاؤ۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

لوگ اسے بلانے کے لیے نکل پڑے۔ انور اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا اور میں بے بسی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ میں کیا کروں؟ لیٹے لیٹے یہی سوچ رہی تھی کہ ایک درمیانی عمر کا شخص اندر آیا۔ اسے میں پہچانتی تھی۔ وہ برابر والے گھر میں رہتا تھا اور کچہری میں کام کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا جو حلیے سے ہی سپیرا لگ رہا تھا۔ اس نے کندھے سے کیسری رنگ کا تھیلا لٹکا رکھا تھا جس میں یقیناً سانپ کی پٹاریاں ہوں گی۔ داہنے ہاتھ میں بین تھی۔ اس نے تھیلے کو زمین پر رکھ کر کہا۔ ''تمام لوگ باہر چلے جائیں۔ میں سانپ کو بلا رہا ہوں۔''

اس کی آواز سنتے ہی وہاں جمع بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی۔ تمام لوگ باہر چلے گئے۔ اب اس کمرے میں انور کے علاوہ سپیرا اور میں رہ گئی تھی۔ سپیرے نے بین کو منہ سے لگایا اور بجانا شروع کر دیا۔ بین کی مسحور کن آواز سے کمرہ گونج اُٹھا تھا کہ انور اُٹھ بیٹھا۔

یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ اصولاً سانپ کو آ کر زہر چوسنا چاہیے تھا مگر بات اُلٹ ہو گئی تھی اور انور خود ہی اُٹھ بیٹھا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا مگر اب چہرے پر کھنڈی زردی غائب ہو چکی تھی۔ سرخی دوڑ رہی تھی۔ کمزوری کی جگہ تازگی نے لے لی تھی۔

سپیرے نے بین اُٹھالی تھی اور اب وہ اس پر راگ چھیڑ چکا تھا۔ اس کی پیٹھ انور کی طرف تھی ورنہ وہ بھی اسے ہوش میں آتے دیکھ کر میری طرح سکتے میں آ جاتا مگر سپیرا ہر جانب سے بے خبر اپنے راگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس راگ میں کوئی ایسی بات تھی، کوئی ایسا سحر تھا کہ میں خود بھی بے خود ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تیزی سے چلتے ہوئے وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ ایک عجیب سا سرمستی کا عالم سارے ماحول پر طاری ہو گیا تھا۔

ابھی میں بین کی لَے کا لطف لے ہی رہی تھی کہ اچانک ہی ایک تیز پھنکار گونجی اور میں نے چونک کر پیچھے کی جانب دیکھا۔

بنگال میں سانپ بہت عام ہیں۔ جس طرح اپنے ہاں ہر جگہ کینچوے نظر آ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح وہاں سانپ دکھائی دیتے ہیں۔ کھیت میں، کھلیان میں، باغیچے میں، تالاب پر ہر جگہ سانپ نظر آ جاتے ہیں۔ میں خود بھی طرح طرح کے سانپ دیکھ چکی ہوں مگر ایسا سانپ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ بنگال کا سب سے خطرناک سانپ ''کال کیوٹا'' ہوتا ہے مگر یہ سانپ کال کیوٹا سے بھی زیادہ خطرناک دِکھ رہا تھا۔ وہ جھومتا ہوا آگے آ کر سپیرے کے سامنے اپنی دُم پر کھڑا ہو گیا تھا۔ سپیرا اسے دیکھتے ہی سجدے میں گر گیا تھا اور زور زور سے گڑگڑانے لگا تھا۔ ''کرپا کرو پربھو! اس منش کا جیون دان کر دو۔ اس کا زہر چوس لو۔''

ایسا لگا تھا جیسے سانپ نے اس کی بات سمجھ لی ہو۔ وہ انور کی طرف مڑ گیا تھا۔ انور دوبارہ لیٹ چکا تھا اس لیے سپیرے کو احساس نہیں تھا کہ وہ ہوش میں آ چکا ہے۔

سانپ انور کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ پھر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے پھرتی سے سانپ کا پھن اپنی مٹھی میں پکڑ لیا تھا۔

سپیرے کی بین خاموش ہو گئی۔ وہ خود ایک لمحے کے لیے حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ سانپ انور کی کلائی پر لپٹ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا

جیسے وہ ابھی اس کی کلائی کے کئی ٹکڑے کردے گا مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بل ڈھیلے ہوگئے۔

انور نے اپنی مٹھی کھولی تو اس کا پھن اس طرح کچل چکا تھا جیسے کسی نے پتھر سے اسے کچل دیا ہو۔ مٹھی کھول کر اس نے مسکراتے ہوئے سانپ کو کلائی سے جھٹک دیا۔ ابھی اس کے بقیہ دھڑ میں زندگی باقی تھی اس لیے وہ وہیں پڑے پڑے اینٹھتا رہا، لرزتا رہا اور بل کھاتا رہا۔

سپیرا دوڑ کر سانپ کے قریب آیا۔ اس نے خونیں آنکھوں سے انور کو دیکھا اور جلدی سے دم توڑتے ہوئے سانپ کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ ''شما کرو مہاراج! دھوکا میں نے نہیں دیا، بلکہ خود مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ شخص زندہ ہے تو تمہیں یہاں آنے کا کشٹ میں ہرگز نہ دیتا۔''

سانپ کے جسم نے کئی بل کھائے پھر وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ سپیرے نے بڑی عقیدت کے ساتھ مرے ہوئے سانپ کو اپنی پٹاری میں رکھا اور انور سے بولا۔ ''تم نے میرے ساتھ فریب کیا ہے۔ چھل کیا ہے۔ میری ساری سادھنا ختم کردی ہے۔ اب جب تک میں ناگ راج کے چرنوں میں سونے کا سانپ اور ایک من دودھ نہیں چڑھاؤں گا، اس وقت تک میری شکتی واپس نہیں ملے گی۔''

انور ہنس دیا پھر بولا۔ ''سونے کا سانپ اور ایک من دودھ کے لیے ڈھیر سارے روپے کی ضرورت ہوگی۔ کہاں سے لاؤ گے اتنی رقم؟''

''روپے تم دو گے، تمہیں دینا ہی پڑے گا۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔ ''ورنہ میں تمہارے گھر کو سانپوں سے بھر دوں گا۔ گھر کے ایک ایک شخص کو میرے بلائے ہوئے سانپ ڈس لیں گے اور اگر باہر سے بچانے کے لیے کوئی آگیا تو وہ بھی مارا جائے گا۔''

''اچھا...... تو تم ایسا کر لیتے ہو؟''

''تو اور کیا۔''

''کیا وہ سانپ سچ مچ کے ہوں گے؟''

''ہاں...... ہاں...... سچ مچ کے ہوں گے۔'' سپیرا بھنا گیا۔ ''اور تم سب کو ڈس لیں گے۔''

''بلاؤ نا یار! اچھا تماشا ہوگا۔ میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔''

''ہنس لو۔ ابھی سر پکڑ کر رو دو گے۔ بھاگنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔''

''ڈراؤ نہیں۔'' انور نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی۔ ایسی اداکاری جس میں مصنوعیت کی جھلک تھی۔ ''ہم دل کے بہت کمزور ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کر ہم تمہارا کھیل دیکھے بغیر ہی مر جائیں۔''

سپیرے نے بھنا کر بین اُٹھائی اور پھونک ماری مگر اس میں سے ایک ذرا بھی آواز نہ نکلی۔ اس نے کئی بار کوشش کی مگر ہر بار اسے ناکامی ملی تب وہ جھلا کر بولا۔ ''تم نے میری بین کو باندھ دیا ہے۔ اگر ہمت ہے تو پہلے بین کھول کر دکھاؤ پھر میرا اچمت کار دیکھو۔''

''بھائی! ہمیں کیا معلوم کہ کس بٹن سے بین کھلتی ہے اور کس بٹن سے یہ بند ہوتی ہے۔ تم خود ہی کھول لو ناں اگر نہ کھول سکو تو کھولنے کے لیے ان دیوی جی سے پوچھ لو۔ یہ بہت بڑی گنگ ہیں۔ تانترک ہیں۔ ان کے پاس بہت بڑی منتر شکتی ہے۔''

''اچھا......تو یہ تم ہو۔تم تو آرمبھ سے ہمارے ساتھ ہو۔یہ سب تمہاری ہی کارستانی ہے۔'' سپیرے نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور غصیلے لہجے میں بولا۔

میرے پاس اس بے تکے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں خاموش ہوگئی۔

''کائر، بزدل، پیچھے سے وار کرتی ہو۔ہمت ہے تو سامنے آ کر وار کرو، پھر مزہ چکھاتا ہوں۔'' سپیرے نے چیخ کر غصے کا اظہار کیا۔

''ارے بھائی! تم اپنی بین میں صحیح انداز سے پھونک مارو۔ضرور بجے گی کیونکہ مجھے تو تمہاری بین کہیں سے بھی بندھی ہوئی نظر نہیں آتی ہے۔''

سپیرے نے جھٹکے سے بین اُٹھائی اور پھونک ماری۔ بین بجنا شروع ہوگئی۔ایسی خطرناک آواز میں نے بین پر کبھی نہیں سنی تھی۔ یہ تو ایک ایسا ساز ہے جس کی آواز دل میں گدگدی پیدا کرتی ہے مگر اس وقت اس کی بین سے ایسی لَے نکل رہی تھی جو سماعت شکن کہی جاسکتی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ دو تین منٹ میں سپیرے کی بات سچ نظر آنے لگی اس لیے کہ دروازے سے، کھڑکی اور روشن دان سے، غرض ہر راستے سے سانپ اندر آنا شروع ہوگئے تھے۔

انور نے سانپوں کو آتے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھِل اُٹھی۔ پھر اس نے اپنے داہنے پیر سے جوتا اُتارا اور سانپوں کی طرح پھینک دیا۔ جتنی تیزی سے سانپ آرہے تھے، اتنی ہی تیزی سے اس کا جوتا سانپوں کا سر کچل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس جوتے میں موٹر فٹ کر دی گئی ہے کیونکہ وہ طوفانی رفتار سے سانپوں پر برس رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پورا کمرا سانپوں سے اٹ گیا تھا۔ سانپ آنا بند ہوگئے۔ غالباً بین کی آواز جہاں تک گئی تھی، وہاں کے تمام سانپ کھنچ آئے تھے۔ سانپوں کا آنا تو بند ہوگیا تھا مگر سپیرے کے منہ سے بین الگ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار جھٹکا مار رہا تھا مگر اس کے منہ میں گویا بین چپک گئی تھی۔ تب اس نے انور کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔

انور نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ہم تمہارے اس چمتکار سے خوش ہوئے۔ بولو کیا چاہتے ہو؟ تمہیں انعام میں کیا دیا جائے؟''

''آپ کا داس ہوں۔ بس اتنی کرپا (مہربانی) کر دیں کہ میری روزی چلتی رہے۔''

''اے سونالی! اسے دو سو روپیہ دے دے۔'' انور نے مجھ سے کہا۔

''مجھے کیا اسٹیٹ بینک سمجھ رکھا ہے۔ میرے پاس اتنے روپے کہاں ہیں؟''

''تم اپنے تکیے کے نیچے تو دیکھو۔ شاید پڑے ہوئے ہوں۔''

انور کے کہنے پر میں نے تکیہ ہٹایا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ تکیے کے نیچے واقعی سو سو کے ہرے ہرے تین نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ میں نے روپیہ سپیرے کی طرف اُچھال دیا۔

انور نے کہا۔''اور ہاں ان سانپوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔''

''مگر میرے پاس تو اتنی بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔''

''پٹاری میں بھرو، سب آجائیں گے۔'' انور نے حکم دیا۔

اس کا کہنا سچ ثابت ہوا کیونکہ تمام کے تمام سانپ ایک چھوٹی سی پٹاری میں آ گئے تھے جبکہ وہ پٹاری انتہائی چھوٹی سی تھی۔

سپیرا انعام لے کر خوشی خوشی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد انور نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھا منتر کی یہ طاقت ہے۔''

''ہاں...... بالکل سچ کہہ رہے ہو مگر تمہیں یہ قوت ملی کیسے؟''

''بیوقوف لڑکی! میں انور نہیں ہوں۔ میں تو تیری مدد کے لیے آیا ہوں۔'' اس بار آواز الگ تھی۔ اس آواز کو سنتے ہی میں اُچھل پڑی کیونکہ یہ آواز سو فیصد اجین والے اس تانترک کی تھی جو مجھے سانپ کی شکل میں میرے اپنے گھر کے طاقچے میں رکھے کٹورے میں نظر آیا کرتا تھا۔

☆=======☆=======☆

اس کی آواز کو تو میں ہزاروں کی بھیڑ میں بھی شناخت کر سکتی ہوں۔ یہ آواز سو فیصد پنڈت شورویر کی تھی۔ اسی شورویر کی جو اجین نگری کا راج تانترک تھا۔ راجا وکرم ادیت کا درباری ساحر۔ بقول اس کے، جب راجا وکرم ادیت مارا گیا اور اجین نگری کے تخت کی خاطر ورثا میں جنگ چھڑ گئی۔ ایک دوسرے کا خون بہایا جانے لگا تو اس کا دل ٹوٹ گیا اور اس نے اپنے سحر کی قوت سے اپنی روح کو ایک سانپ میں منتقل کر دیا اور اس سانپ کو تحت الثریٰ میں اتارتا چلا گیا۔ زمین کی آخری سطح پر پہنچ کر اس نے سانپ پر نیند طاری کر دی۔ یہ نیند کئی سو سال پر محیط ثابت ہوئی۔ زمین چلتی رہتی ہے۔ زمین کے نیچے کا وہ حصہ بھی گردش کرتا ہوا ٹھیک اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں ہم لوگ رہا کرتے تھے۔ میرے والد جو ''اہلِ سلوک'' میں سے تھے اور خانقاہ میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے تھے، وہ ہر روز نمازِ عشاء کے بعد وظائف و اوراد میں وقت گزارتے تھے۔ اُن کے وظائف کے اثر سے سانپ پر چھایا سحر ٹوٹ گیا اور وہ بیدار ہو گیا۔ پنڈت شورویر کا جسم گل سڑ کر برباد ہو چکا تھا۔ اسے نیا جسم چاہیے تھا۔ اس کام میں وہ شخص مدد کر سکتا تھا جس کا برج میزان تھا اور میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جب سورج ساتویں گھر میں تھا اسی لیے اس نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی۔ پہلی بار مجھے اس نے ایک کنورے میں درشن دیئے پھر ایک جوانِ رعنا کے روپ میں ملا اور بولا کہ مجھے تبھی دوبارہ زندگی مل سکتی ہے جب ''مقدس تابوت'' کے رکھوالے اس منتر کو پڑھیں گے جو سینکڑوں سال سے سینہ بہ سینہ چل رہا ہے۔ وہ منتر مجھے سیکھ کر آنا پڑے گا۔ میں مقدس تابوت تک جانے کے سفر پر نکلی تھی کہ گھنے جنگلوں سے فقیر بابا مجھے نکال لائے اور رانگا ماٹی کے ایک گھر میں ٹھہرا دیا۔ اس گھر کی لڑکی سونالی کو ایک ساحر نے قید کر رکھا تھا۔ فقیر بابا نے مجھے اسی کی جگہ ٹھہرایا تھا۔ لوگ مجھے ہی سونالی سمجھ رہے تھے۔ سونالی کی ایک کزن مجھے اپنے ایک مسئلے کو حل کرانے کے لیے ڈھاکا لے کر آئی۔ میں پنڈتوں، اوجھاؤں کا ساتھ کرتے کرتے خود بھی ''جاپ'' کرنے لگی۔ ہندوؤں کے دیوی دیوتا کے سامنے سر جھکانے لگی۔ کئی شیطانی اعمال بھی کیے جس کی وجہ سے میرے اندر ایک عجیب سی کشش آ گئی لیکن فقیر بابا نے پھر مجھے گھیر لیا اور میں اُن کے کہنے پر چٹا گانگ لوٹ آئی تھی۔ ابھی کمرے میں آ کر لیٹی ہی تھی کہ شور اٹھا کہ انور کو سانپ نے کاٹ لیا۔ چاچی مجھے زبردستی کھینچ کر لے گئی کہ تم اگر کوئی علم جانتی ہو تو اس پر آزماؤ۔ اتنے میں ایک سپیرا آ گیا۔ وہ عمل کر ہی رہا تھا کہ انور کو ہوش آ گیا اور اس کے گلے سے جو آواز نکلی، اسے سن کر میں چونک اُٹھی کیونکہ وہ آواز پنڈت شورویر کی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ''تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟''

''تم ہی مجھے جیون دان دے سکتی ہو۔ مجھے مقدس تابوت کے بھکشوؤں سے منتر والا ''جنتر'' لا دو۔''

''یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔''

''میں نے بھی تمہارے لیے جتنے کام کیے ہیں، وہ بھی آسان نہ تھے۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے اس کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ تمہیں احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ تمہاری خاطر میں کس طرح حالات سے لڑ رہا ہوں۔ یاد کرو، تمہاری سہیلی کا دیور جو میمن سنگھ سے آیا تھا اور اُسے مندر کی سیڑھیوں پر ہر رات ایک لڑکی ملتی تھی۔''

''ہاں یاد آ گیا، ہر کوئی پریشان تھا کہ وہ لڑکی کون ہے۔''

''وہ ایک بھٹکی ہوئی روح تھی جسے پچاس سال پہلے مندر کی انہی سیڑھیوں پر قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنے جس محبوب سے ملنے آئی تھی، اس کی

شکل تمہاری سہیلی کے دیور سے ملتی جلتی تھی اسی لیے وہ اسے مارکراس کی روح کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔''

''مگر میری سہیلی کا دیور تو آج بھی زندہ ہے جبکہ وہ لڑکی اس سے جھگڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔''

''کہیں گئی نہیں ہے' اسے میں پدما ندی کے پار چھوڑ آیا ہوں۔ معمولی روحیں ندی پار نہیں کر سکتی ہیں۔ پھر میں نے شنکر وغیرہ کو سزا دی۔ پولیس کے دفتر سے تمہاری فائل غائب کی اور تمام پولیس افسران کا تبادلہ مغربی پاکستان کرا دیا تاکہ تم بے فکری سے یہاں وہاں گھوم سکو۔''

''اگر تم نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے تو واقعی مجھے احسان کے بوجھ تلے دبا دیا ہے۔''

''یہ دنیا ''کچھ دو، کچھ لو'' کے اصول پر چلتی ہے۔ تم نے میرے ہی اکسانے پر غیر دانستگی میں سارے جاپ کیے اور شکتی شالی بن گئی۔ اَب تمہارے اندر اتنی قوت آ چکی ہے کہ تم میرے لیے بہت کچھ کر سکتی ہو۔''

''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''وہی جو پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ مقدس تابوت پر جا کر میری مکتی (آزادی) کے لیے کوشش کرو۔''

''ٹھیک ہے' میں وہاں جاؤں گی۔''

''مگر اس طرح جانا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔''

☆======☆=======☆

میں ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔ مجھے ارکان تک جانا تھا۔ آخری اسٹیشن پر اتر کر خچر کی سواری کرنا تھی کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری سواری نہیں تھی۔ چٹا گانگ ہل ٹریک میں یہی واحد سواری رائج تھی۔ آخری اسٹیشن ابھی دور تھا۔ کتنی دور' خود مجھے پتا نہ تھا۔ میں تو بس پنڈت شوروِیر کی التجا سنتے ہی گھر سے نکل پڑی تھی اور سیدھی جا کر ریل میں سوار ہو گئی تھی۔ زادِ راہ کے طور پر بھی کچھ نہ لیا تھا۔ صرف بدن پر کپڑے تھے اور کچھ بھی ساتھ نہ تھا۔ مجھے شوروِیر کا احسان اتارنا تھا اس لیے کچھ بھی سوچا نہ تھا یا پھر اس کا سحر تھا کہ میں کچھ سوچ نہ سکی تھی۔ اب تو حالتِ سفر میں تھی اس لیے سوچنا فضول تھا۔ میں کھڑکی سے سر ٹیک کر بیٹھی تھی۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزر رہے تھے۔ یقین کریں' اس وقت میں مکمل طور پر اپنے حواس میں نہیں تھی۔ ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ٹکٹ چیکر آ گیا اور اس نے سب کے ٹکٹ دیکھنے شروع کر دیئے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ جس شخص کے پاس جاتا ہے' وہ اپنی جیب سے ٹکٹ نکال کر ٹکٹ چیکر کے سامنے کر دیتا ہے اور ٹکٹ چیکر اس پر نشان لگا کر اسے واپس کر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ چیک کرتا ہوا وہ چیکر میرے پاس آ گیا۔

''ٹکٹ نکالو۔'' اس نے کہا۔

''میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

ٹکٹ چیکر نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''صورت شکل سے تو کسی اچھے گھر کی لگتی ہو' پھر بلا ٹکٹ کیوں سفر کر رہی ہو؟ بولو کہاں تک جانا ہے؟''

''ارکان تک۔''

ٹکٹ چیکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''یہ ٹرین تو واصل پور تک جائے گی۔''

''جانے دیں، مجھے تو بس ارکان تک جانا ہے۔''میں نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اپنے آپ کو پاگل ظاہر کر کے مجھے بیوقوف بنالوگی تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ ہر حال میں جرمانے کے ساتھ واصل پور تک کا ٹکٹ کاٹا جائے گا۔'' پھر ایک کاغذ پر حساب لگاتے ہوئے اس نے کہا۔''سیدھے ہاتھ سے چھ روپے نو آنے نکالو۔''

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''میں کہتا ہوں، خاموشی سے پیسے نکال دو ورنہ تمہیں جیل بھجوادوں گا۔''

''اے سیدھے سیدھے بات کرو۔ اب جیل کا نام لیا تو اُٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔'' میرے انداز پر آس پاس بیٹھے مسافر ہنس پڑے۔

''سیدھی طرح سے پیسے نکالتی ہو یا نہیں؟'' یہ کہہ کر وہ میری طرف جارحانہ انداز میں بڑھا تھا۔

دیکھنے والوں نے بس اتنا دیکھا تھا کہ وہ اپنی چیزیں پکڑ کر جھکا تھا پھر چیخیں مارتا ہوئے وہ دروازے کی طرف بھاگا تھا۔ ریل اپنی پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی کہ اس نے ہر جانب سے بے پروا ہو کر دروازہ کھولا اور نیچے چھلانگ لگا دی۔

کمپارٹمنٹ میں شور مچ گیا۔''پکڑلو، بھاگنے مت دیجیو۔'' کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کئی مسافروں نے مجھے دبوچ لیا۔ دو تین مسافروں نے ڈبے میں لگی ساری زنجیریں کھینچ ڈالیں۔ تقریباً دو منٹ میں ٹرین رُک گئی۔ ٹرین کے تقریباً آدھے مسافر اُتر کر ادھر ہی آ گئے۔ نیچے بھیڑ سی لگ گئی تھی۔ ایک شخص میری طرف اشارہ کر کے بتا رہا تھا۔''یہ لڑکی بلا ٹکٹ سفر کر رہی تھی۔ ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ مانگا تو اس نے اسے دھکا دے کر نیچے پھینک دیا۔''

میرا دل چاہا کہ نیچے اُتر کر اس شخص کا ٹینٹوا دبا دوں۔ تبھی کسی نے چیخ کر کہا۔''راستہ دو، گارڈ صاحب آ رہے ہیں۔''

تبھی مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا ہو۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے وہم سمجھ کر اس بات کو ذہن سے جھٹک دیا تبھی پھر وہی آواز آئی۔''ڈرنا نہیں، یہ لوگ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے۔''

میں نے گھوم کر ادھر اُدھر دیکھا مگر ایسا کوئی بھی نظر نہ آیا جو اس بھیڑ میں میرا ہمدرد ہو۔

''تم مجھے دیکھ نہیں سکتیں مگر آواز تو پہچانتی ہو، اسی لیے میں صرف ہوشیار کر رہا ہوں۔ بالکل ڈرنا نہیں، بس خاموشی سے تماشا دیکھتی جاؤ۔''

گارڈ نے اس شخص کے جھوٹ پر یقین کر لیا اور مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور چیونٹی کی چال سے چلتی ہوئی ٹرین اُلٹی طرف چل پڑی تاکہ ٹکٹ چیکر کی لاش ڈھونڈی جا سکے۔ دور ہی سے جھاڑیوں کے بیچ آڑا ترچھا پڑا اس کا جسم نظر آ گیا۔ اس کا داہنا ہاتھ کٹ کر دور جا گرا تھا۔ بائیں آنکھ باہر نکل آئی تھی اور رُخسار پر لٹک رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ اتنا جی دار تھا کہ ابھی تک زندہ تھا اور زور زور سے کراہ رہا تھا۔

''میں نے خودکشی کی ہے۔'' اس نے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں یہ بات کہی۔''میں بہ ہوش و حواس اقرار کرتا ہوں کہ میں نے جان بوجھ کر چلتی ٹرین سے چھلانگ لگائی تھی۔''

''تمہیں کسی نے دھکا نہیں دیا تھا؟'' گارڈ نے پوچھا۔

''نہیں......میں زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔'' کہہ کر اس نے گردن ڈھلکا دی۔

مسافروں میں ایک ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ میڈیکل سائنس کے لیے ایک عجیب کیس ہے۔ اس بارے میں، مَیں میڈیکل میگزین میں لکھوں گا کہ اس بُری طرح زخمی ہونے کے باوجود آواز میں اتنی پختگی کیسے آگئی تھی؟ وہ اتنے آرام سے کیسے بول رہا تھا؟''

مجھے فوراً رہا کردیا گیا۔ کلائی سے ہتھکڑی اُترتے ہی میں پوری طرح آزاد ہوگئی۔ اب ٹرین میں بیٹھنے کا مطلب تھا کہ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے وقت گزار دوں اس لیے میں نے اپنا رُخ سامنے والی پگڈنڈی کی طرف موڑ دیا۔

میں آہستہ آہستہ جنگل میں آگے بڑھتی جارہی تھی۔ مجھے خود پتا نہیں تھا کہ مجھے جانا کہاں ہے؟ کس جگہ سے مجھے آگے کے لیے سواری ملے گی؟ اتنا تو اندازہ ہو چکا تھا کہ آخری اسٹیشن واصل پور اب زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں اُترتی بھی تو آگے جانے کے لیے مجھے خچر حاصل کرنا تھا۔

ابھی میں بہ مشکل ایک ڈیڑھ کلومیٹر آگے بڑھی تھی کہ سامنے سے اچانک ایک درندہ نمودار ہوا۔ میرے دونوں پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ میں بھاگنا چاہتی تھی مگر بھاگ نہیں پارہی تھی۔ وہ شیر نہیں تھا مگر شیر سے ملتا جلتا کوئی جانور تھا۔ شاید چیتا یا پھر بنگال ٹائیگر جو اس علاقے میں بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھ پر ایسی وحشت طاری ہوگئی تھی کہ ٹھیک سے اس درندے کو دیکھ بھی نہ سکی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا طاری ہوگیا تھا۔ خوف کے مارے گھگھی بندھ گئی تھی۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتا پانی ہوجاتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں کہ ایسا لگا جیسے اس درندے نے مجھے پنجہ مارا ہو۔ میں دور جا گری تھی اور ہوش کھو بیٹھی تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے فقط اتنا سن سکی تھی کہ کوئی میرا نام لے کر کہہ رہا ہے۔ ''گناہوں کی پوٹ، تُو نے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میرے ہوتے ہوئے اس شیطان کو عمر طویل نہیں ملے گی۔'' پھر کیا ہوا، مجھے خود خبر نہیں کیونکہ میں بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆=======☆=======☆

ہوش آیا تو میں نے پھر سے خود کو سونالی کے گھر میں پایا۔ میرے قریب فقیر بابا کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں غیظ سے انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''بدبخت! تجھے منع کیا تھا کہ دنیا کی تباہی کا سامان مت کر مگر تیری عقل میں یہ بات آ کر نہ دی۔ تُو پھر سے اس کو زندگی دلانے کے لیے نکل پڑی تھی۔ ارے، اگر وہ زندہ ہوگیا مجسم بن گیا تو یہ دنیا رہنے کے قابل نہ رہے گی۔ وہ قہر بن جائے گا۔ کوئی بھی انسان سکھ چین سے رہ نہ پائے گا۔ کسی کنواری لڑکی کی عزت محفوظ نہ رہ پائے گی۔ یہ دنیا جہنم کا نمونہ بن جائے گی۔''

''مگر میں کیا کروں، وہ میرے ذہن پر قابض ہوکر اپنے کام کے لیے اُکسانے لگتا ہے۔'' میں نے منمنا کر جواب دیا۔

''پہلے تُو اپنے گناہوں کی تلافی کر۔ آج تک تُو نے جتنے گناہ کیے ہیں، کفر کیے ہیں، اس کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ۔ اگر تیرا کفر معاف کردیا گیا تو سمجھ لے، تیری بخشش ہوگئی۔''

میں نے جواب دینا چاہا تھا مگر یہ سوچ کر چپ ہوگئی کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ اگر میں نے کچھ کہا تو فقیر بابا کوئی ایسی چال چل سکتے ہیں

جو میرے لیے نقصان کا باعث ہوگی۔

''اچھا تو میں چلتا ہوں مگر یاد رکھ اگر تُو نے اس دشمنِ دنیا کو زندگی دینے کی کوشش کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' اور وہ کمرے سے پلک جھپکتے ہی غائب ہوگئے۔

میں بستر میں لیٹی غور کر رہی تھی کہ پیر بابا سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟ یہ تو پیر تسما پا بن گئے ہیں۔ خواہ مخواہ ٹانگ اڑا دیتے ہیں۔

''چلو...... یہاں سے بھاگ چلیں۔''

''مگر جائیں گے کہاں؟'' میں نے خود سے کہا۔

''ڈھاکا چلتے ہیں۔ وہاں میرا کوئی دشمن تو ہے نہیں۔'' یہ سوچ کر میں اسی وقت نکل پڑی۔

میں جلد سے جلد چٹا گانگ چھوڑ دینا چاہتی تھی اسی لیے تیز تیز قدموں سے چلی جا رہی تھی کہ ایک سائیکل رکشہ آ کر میرے نزدیک رُک گیا۔ اسے دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''اسٹیشن چلو گے؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔'' اس کے کہتے ہی میں رکشے پر سوار ہوگئی۔ رکشے والا غضب کا پھرتیلا تھا۔ وہ پوری طاقت سے رکشہ کھینچتا ہوا نہایت کم وقت میں اسٹیشن لے آیا۔

اسٹیشن پر رکشہ روک کر اس نے کہا۔ ''آپا! ٹکٹ گھر پر کافی قطار ہوگی۔ آپ یہیں ٹھہریں، میں ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔''

وہ ٹکٹ لینے چلا گیا۔ بہ مشکل پانچ منٹ میں وہ لوٹ آیا۔ اس نے ٹکٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں۔ راستے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آپ کا ایک ہمدرد آپ کے ڈبے میں موجود ہوگا۔''

ٹرین نے سیٹی بجا دی تھی۔ کچھ پوچھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں سیدھی جا کر ڈبے میں بیٹھ گئی۔ جلد بازی میں رکشے والے کو کرایہ بھی نہیں دیا تھا۔ ٹرین رینگنے لگی تو خیال آیا کہ ٹکٹ بھی اسی نے کٹایا اور پیسے بھی نہیں لیے۔ اس نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ڈبے میں میرا کوئی ہمدرد بھی ہے مگر یہاں تو ایسا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرے سامنے والی برتھ پر اور میری سیٹ پر بھی عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان کی کل تعداد چھ تھی۔ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر ایک چھریرے بدن کی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ کہاں جائیں گی؟''

''ڈھاکا۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''ارے واہ پھر تو ہمارا ساتھ کافی لمبا ہے۔ ہم بھی ڈھاکا جا رہے ہیں۔'' اس کے بولنے کا انداز پڑھے لکھوں جیسا تھا۔ نہایت صاف اور شستہ بنگلا بول رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید کالج گرل ہے۔ بڑی پُر لطف باتیں کر رہی تھی۔ اس کے انداز میں شوخی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ مجھے پیر پھیلانے میں دقت ہو رہی تھی کیونکہ میرے پیر کے پاس ایک بڑا سا ٹرنک رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔ ''یہ ٹرنک تمہارا ہے؟''

''ہاں...... میرا ہے۔''

''اگر کہو تو میں اسے اُٹھا کر اوپر برتھ پر رکھ دوں؟''

لڑکی نے تمسخر بھرے انداز میں میری طرف دیکھا پھر کہا۔ ’’اگر رکھ سکتی ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔‘‘

پتا نہیں، میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے جھک کر ٹرنک کے دونوں ہینڈل پکڑے اور اسے اُٹھا کر اوپر والی برتھ پر رکھ دیا۔ میری اس حرکت پر وہاں بیٹھی تمام عورتوں کے چہروں پر حیرت چھا گئی۔

’’یہ...... یہ تم نے کیسے اُٹھالیا؟ اسے تو دو قلی مل کر لائے تھے؟‘‘ ان میں سے ایک عورت نے کہا۔

اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے کان میں سرگوشی کر کے کہا ہو اور میں نے انہی الفاظ کو بلند آواز میں دہرا دیا۔ ’’یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، یہ جو چار ٹرنک مزید رکھے ہوئے ہیں، انہیں میں ایک ساتھ اُٹھا کر اوپر کی برتھ پر رکھ سکتی ہوں۔ دیکھئے، اس طرح۔‘‘ کہہ کر میں نے ایک ٹرنک کو دوسرے ٹرنک پر رکھا اور ان چاروں ٹرنک کو ہلکے پھلکے کاغذ کی طرح اُٹھالیا۔ سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں تبھی ایک عورت نے کہا۔ ’’تم کرتی کیا ہو؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں۔‘‘

’’والد کیا کرتے ہیں؟‘‘

’’انتقال ہو چکا ہے۔‘‘

’’کس کے ساتھ رہتی ہو؟‘‘

’’کسی کے ساتھ نہیں۔‘‘

’’ہم سب سرکس میں کام کرنے والیاں ہیں۔ یہ سرکس میرے شوہر کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اسے میں سنبھال رہی ہوں۔ تم چاہو تو ہمارے ساتھ شامل ہو سکتی ہو۔ تمہارے جسم میں جو طاقت ہے، اسے استعمال کر سکتی ہو۔ معقول رقم ملے گی۔‘‘

’’مجھے کرنا کیا ہو گا؟‘‘

’’تمہارے لیے بہت معمولی کام ہے۔ تمہیں آئٹم پیش کرنا ہو گا۔ پبلک کو بھاری بھاری چیزیں اُٹھا کر دکھانا ہوں گی۔ ایک دن میں دو بار۔ بولو منظور ہے۔‘‘

’’منظور...... مگر جب تک میرا دل چاہے گا، تم لوگوں کا ساتھ دوں گی۔ پھر دل بھر گیا تو چل دوں گی۔‘‘

اور اس طرح ڈھاکا پہنچتے ہی میں ’’پناما سرکس‘‘ کی ’’آئرن لیڈی‘‘ بن گئی۔ کمپنی نے دل کھول کر میری پبلسٹی کی۔ اس دوران میں مجھے ریہرسل بھی کرائی گئی۔ ریہرسل کے دوران میری دوسری کئی خوبیاں بھی اُجاگر ہو گئیں اور ریہرسل ہی کے دوران میری تنخواہ جو پانچ سو مقرر ہوئی تھی، اس میں دو سو روپے بڑھا کر سات سو روپے کر دی گئی جو اس وقت کے حساب سے بہت بڑی تنخواہ تھی۔ ریہرسل کے دوران ہی میری ملاقات سرکس کی مالکن حسینہ کے اکلوتے بیٹے عمران سے ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی پتا نہیں کیوں مجھے بہت زیادہ پسندیدگی کا احساس ہوا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں اس پر مرمٹی تھی۔

دن بھر کی ریہرسل کی تھکی ماندی جب میں رات کو سونے کے لیے لیٹتی، تو ایک جانی پہچانی آواز میرے قریب گونجتی۔ ’’فکر ذرا بھی نہ کرنا۔

ہم تمہارے بہت قریب ہیں۔'' یہ آواز کس کی تھی، میں پہچاننے سے معذور تھی۔ فقیر بابا تھے یا شورویر، میں پہچان نہیں پائی تھی۔ مسلسل ریہرسل کے باعث مجھے سوچنے سمجھنے کی فرصت بھی کم ملتی تھی۔

خدا خدا کر کے، میرے پہلے شو کا دن آیا۔ ہفتے بھر کے ٹکٹ پہلے ہی بک ہو چکے تھے۔ پورے ڈھاکا میں آئرن لیڈی کی قوت کا شہرہ تھا۔ ایک خلقت تھی کہ میرے کمالات دیکھنے کے لیے کھنچی چلی آرہی تھی۔ میں نے اس شو میں تین کمالات پیش کیے۔ پہلا کمال تو وہی تھا جس کا مظاہرہ میں نے ریلوے کمپارٹمنٹ میں کیا تھا یعنی بڑے بڑے لوہے کے گولوں سے بھرے چار چار ٹرنک اُٹھا کر رنگ میں ایک چکر لگایا، پھر انہیں رکھ کر ہاتھ بلند کیا۔ دوسرا آئٹم بھی زبردست تھا جو ناقابلِ یقین تھا۔ آئٹم کچھ یوں تھا کہ میں نے داہنا ہاتھ لمبا کر دیا۔ ایک لڑکی اُچک کر میرے ہاتھ پر کھڑی ہوئی پھر دوسری اور تیسری پھر چوتھی۔ اسی طرح سے بائیں ہاتھ پر بھی چار لڑکیاں کھڑی ہوگئیں۔ میں ان آٹھ لڑکیوں کو لے کر چلی۔ پورے پنڈال کا ایک چکر لگا کر میں نے رسی پر چلنے کے لیے سیڑھی کا سہارا لیا پھر بغیر کسی مدد کے میں تنی ہوئی رسی تک پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ اس موٹے رسے پر قدم بڑھاتی جارہی تھی۔ تماشائیوں نے گویا سانس روک لی تھی۔ کہیں سے بھی ہلکی ہی سہی، کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سب پلکیں جھپکائے بغیر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جب میں رسے کے درمیان پہنچی تو لڑکیوں نے آئٹم میں جان ڈالنے کے لیے ایک ساتھ چیخ ماری۔ میں نے بھی لڑکھڑا جانے کی اداکاری کی پھر خود کو سنبھال لیا۔ جب میں دوسرے کنارے سے نیچے اُتری تو لوگ پاگلوں کی طرح تالیاں پیٹنے لگے تھے۔ حیرت و خوشی ان کے چہروں سے جھلک رہی تھی۔

اس دن نہ صرف سرکس کی مالکن حسینہ خوش تھی بلکہ اس کا بیٹا عمران بھی بہت خوش تھا۔ میں شو ختم کر کے اپنے کمرے میں آئی تھی کہ چھولداری کے باہر سے آواز آئی۔ ''کیا تم سوگئیں؟''

''نہیں......کون ہے؟''

''میں ہوں عمران۔''

''اندر آجائیں۔'' میں نے جواب دیا۔

عمران اندر آگیا۔ پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر میرے دل میں ہلچل سی مچ جاتی تھی۔ میں ان دنوں صراطِ مستقیم سے بھٹکی ہوئی ضرور تھی مگر میرے کردار میں کھوٹ نہیں آیا تھا۔ پھر بھی میں اسے دیکھتے ہی کمزور پڑنے لگتی تھی۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔ ''اب فرمائیں، کیسے آنا ہوا؟''

''بس...... میں مبارک باد دینے آگیا ہوں۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس کے آنے کا مقصد جان لیا تھا پھر بھی انجان بنی بیٹھی تھی۔ انسان کی زبان کچھ کہے، اس سے پہلے اس کی آنکھیں چغلی کھا لیتی ہیں۔ میں نے بھی اس کی آنکھوں سے بہت کچھ جان لیا تھا۔

ابھی میں اس پر غور ہی کر رہی تھی کہ میرے کانوں میں سرگوشی سنائی دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''گھبرانا نہیں، میں تمہارے قریب ہوں۔ منزل بھی قریب ہے۔ مجھے ایک نیا راستہ سوجھ گیا ہے۔''

میں نے آواز سے پہچان لیا تھا کہ یہ شورویر ہے مگر وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ میرا وہم ہو۔ میرے دماغ کی اُپج ہو۔ اگر

شورویر نزدیک ہوتا تو کسی نہ کسی طرح مجھے نظر ضرور آتا۔ میں سر کو جھٹک کر عمران کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ وہی آواز پھر سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم نے شیو، پاربتی، گنیش، درگا، کالی سب کی پوجا کی۔ تمہارے دھرم نے جسے کفر کہا ہے، وہ بھی تم نے کیا۔ شیطانی عمل بھی پورا کیا۔ اب میرے کہنے پر ایک عمل اور کر دو۔''

میں نے چونک کر عمران کی طرف دیکھا کہ کہیں اس نے یہ جملہ سن تو نہیں لیا ہے مگر وہ لاتعلق سا بیٹھا ایک فلمی میگزین دیکھ رہا تھا جو میں برابر والی چھولداری سے اٹھا کر لائی تھی۔ یقیناً شورویر کی آواز صرف میں سن رہی تھی اس لیے نسبتاً دھیمی آواز میں، میں نے کہا۔ ''مجھ سے کیا کرانا چاہتے ہو؟''

''تم...... تم عمران کے قریب جاؤ۔ اس کے ساتھ مل کر اسے یقین دلاؤ کہ تم اسی کی ہو۔ اتنی قریب چلی جاؤ کہ وہ تمہیں حاصل کر لے۔ تم تمام قیود و بندش کو توڑ دو۔ تمہارا یہ عمل میرے لیے آسانیاں پیدا کر دے گا۔ تمہیں مقدس تابوت تک جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اپنی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔''

''یاد رکھو تاریک کالی قوت حاصل کرنے کے لیے یہ سب ضروری ہے۔ رہا سوال عزت کا تو یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ عزت، عزت کا شور صرف اس لیے پھیلایا گیا ہے کہ عورت بس ایک مرد تک محدود رہے۔ میری بات مانو اور اس کے قریب چلی جاؤ۔ جب ایک مرد کئی عورتوں کو ایک ساتھ اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے تو ایک عورت کئی مردوں کو ساتھ کیوں نہیں رکھ سکتی؟ جاؤ جا کر اس کے سینے سے لگ جاؤ۔''

پتا نہیں میری عقل کہاں گھاس چرنے چلی گئی تھی کہ میں عمران کے بالکل نزدیک آ گئی۔ اتنے نزدیک کہ شیطان کی ایک پھونک میری عزت کو جلا کر راکھ کر دیتی۔ تبھی شورویر کی آواز بالکل قریب سے آئی۔ ''اس کا گلا دبا دو۔ یہ اسی انجام کا مستحق ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں تمہاری مرادیں مل جائیں گی۔''

ایک لمحے کو میرے ذہن نے بغاوت کی لیکن پھر جیسے میرا دل سو گیا، بالکل میرے ضمیر کی طرح۔ میں ایک بار پھر شورویر کی معمول تھی اور میں نے یکایک ہاتھ بڑھا کر عمران کے گلے کو پوری طاقت سے دبا دیا۔

عمران کی آنکھیں باہر نکل پڑی تھیں۔ منہ سے خون آلود رقیق مادہ جاری ہو گیا۔ ہاتھ پیروں نے پوری قوت سے مزاحمت کرنا چاہی۔ پھر چند ہی لمحوں میں اس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس وقت اس کا چہرہ اتنا بھیانک معلوم ہو رہا تھا کہ میں اسے دیکھنے کی تاب نہ لا سکی اور گردن چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

قتل کرنا آسان ہے لیکن قتل کرنے کے بعد جس جان لیوا اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسے برداشت کرنا آسان نہیں۔ خوف و دہشت کے باعث میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔ تیز چلتی ہوئی سانسیں دو دھاری تلواروں سے کم نہیں تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر حلق سے باہر آ جائے گا۔ میرے سامنے عمران کی لاش پڑی تھی۔ میں نے اس کی محبت کا جواب اس کا گلا گھونٹ کر دیا تھا۔ بغیر کسی قصور کے میں نے اس کے ساتھ ایسا بہیمانہ سلوک کیا تھا کہ میرا ضمیر مسلسل لعنت کر رہا تھا۔ میں نے اس کی ماں حسینہ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ میں انسانیت کے درجے سے اس حد تک گر جاؤں گی تو وہ مجھے کبھی ساتھ نہ لاتی۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بے چارہ عمران اب مجھ سے کبھی بول نہ سکے گا۔ اس کا خوبصورت جسم، مردانہ حُسن کا شاہکار منوں مٹی میں دبا دیا جائے گا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے پاس کھسک آئی۔ دوپٹے سے اس کی باچھوں سے بہتے خون کو صاف کیا۔ باہر اُبل آئی آنکھوں کو بند کیا۔ تبھی ایسا لگا جیسے اس کے چہرے میں تبدیلی آ گئی ہو۔ اس وقت وہ یونانی شہزادہ لگنے لگا تھا۔ چہرے پر وہی پہلے ایسی معصومیت تھی اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ پھیلی تھی جیسے وہ میری بے بسی کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ ایک عجیب سے جذبے سے سرشار ہو کر میں نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا اور سسک سسک کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

اچانک اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور مسکراہٹ کھل اُٹھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھ کر دھیرے سے بولا۔

''کیوں......تم ڈر گئیں؟''

خوشی و مسرت کے باعث میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پھر میں سرشار لہجے میں بولی۔ ''تم زندہ ہو؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''مجھے تم سے ابھی بہت کام لینا ہے تو زندہ کیوں نہیں ہوں گا۔''

اس کے لہجے پر میں سہم اُٹھی۔ میرے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ لہجہ وہ آواز سو فیصد شورویر کی تھی۔ اس نے میرے ذہن کو بھانپ لیا تھا۔ ''اب اتنے دنوں بعد مجھے عقل آئی ہے۔ جسم کیا ہے؟ کپڑے کی طرح ہے۔ جب تک دل چاہے، اسے اوڑھے رکھو، پھر اسے اُتار کر پھینک دو۔''

''تم......تم شورویر ہو ناں؟''

''تمہیں کیا نظر آ رہا ہوں۔''

''جسم عمران کا اور روح شورویر کی۔''

''خوب سمجھیں۔'' اس نے ہنس کر شرارت سے میرے بال بکھیر دیئے۔ ''اب کیا ارادہ ہے، اسی سرکس میں کمال دکھاتی رہو گی یا کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے؟''

''دل تو چاہتا ہے، زندگی بھر میں یہی کچھ کرتی رہوں۔ لوگوں کو ہنستے، تالیاں بجاتے دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوتی ہے کیونکہ میں خود بھی دُکھی ہوں۔ اکیلی ہوں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔'' بولتے بولتے میری آواز بھرا گئی تھی۔

''ارے......ارے میں جو ہوں تمہارا غم بانٹنے کے لیے۔ اب تم خود دیکھنا، میں کیسے تمہارے لیے بند راہیں کھولتا ہوں۔''

میرے پاس بولنے کے لیے اب رہ ہی کیا گیا تھا اس لیے چپ رہ گئی۔ اس نے اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں نے زندہ انسانوں جیسی زندگی گزارنے کا طریقہ سیکھ لیا ہے۔ جو بھی جسم روح سے خالی نظر آئے اسے خود پر پہن لو۔ میں نے یہی کیا ہے۔ اب میں اسی طرح جو جسم تازہ نظر آئے گا اس میں وقت گزار لیا کروں گا۔''

''فقیر بابا......ان سے کیسے نمٹو گے؟''

''اس کا بھی حل تلاش کر لوں گا۔ فی الحال حسینہ کا سوچو، اس سے کیسے جان چھڑائی جائے؟''

''حسینہ ہے کہاں؟''

''وہ آج صبح سندر بن کے لیے چل دی ہے اور میری کوشش ہے کہ وہ لوٹ کر نہ آسکے۔''

''سندر بن کیا کرنے گئی ہے؟''

''سندر بن کے علاقے میں دیہاتی شیر کے بچے پکڑ لاتے ہیں جنہیں وہ اچھی قیمت ملنے پر بیچ دیتے ہیں۔حسینہ کے پاس پانچ شیر تھے۔ پچھلے دنوں ایک ساتھ دو شیر مر گئے۔اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ شیر کے بچے خریدنے گئی ہے۔''

''''جب وہ واپس آئے گی تو کیا وہ تمہیں پہچان نہیں لے گی؟''

''اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔''

''کیوں......کیوں؟''

''اسے شیر کھالے گا۔یہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔اگر اسے شیر نے نہیں کھایا تو وہ ہمیں کھالے گی۔''

شورویر کی بات غلط نہیں تھی۔ اگلے ہی دن سرکس کمپنی میں کہرام مچ گیا۔حسینہ کے ساتھ جانے والے لوٹ آئے تھے۔انہوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ حسینہ شیر کے بچوں کو لے کر آرہی تھی۔ایک رات کے لیے وہ بوریسال میں رُکی تھی کہ رات میں شیر کھل گئے۔کیسے کھلے،یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہے۔وہ کھلتے ہی حسینہ پر جھپٹ پڑے۔یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ حسینہ جو خود بھی کبھی ٹریزرہ چکی تھی،ان دو بچوں کو قابو نہ کرسکی۔ دونوں نے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

حسینہ کی موت نے بہت سے مسئلوں کو حل کر دیا تھا۔اس دن کے بعد سے شورویر بھی نظر نہیں آیا تھا۔سرکس بھی بند پڑا تھا۔مالکن کے سوگ میں کوئی بھی کام کرنے پر راضی نہ تھا۔میں خود بھی سارا دن چھولداری میں پڑی رہتی تھی۔عمران کی شکل میں شورویر کو موجود رہنا تھا مگر وہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔تنگ آکر میں نہایت خاموشی سے باہر نکل آئی۔

باہر تاریکی تھی۔سڑک سنسان تھی۔یوں بھی ڈھاکے میں رات کچھ جلد ہی اُتر آتی ہے۔میں اندھیرے سے لڑتے ہوئے لیمپ پوسٹ کی ہلکی روشنی میں بڑھتی چلی جارہی تھی۔ابھی رات کے صرف دس بجے تھے مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے آدھی رات اُتر آئی ہے۔سڑک پر دور دور تک کوئی نہ تھا۔چلتے چلتے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیچھے کوئی اور بھی چل رہا ہے۔وہ دبے پاؤں بڑھتا چلا آرہا تھا۔پہلے میں نے اسے وہم سمجھا اور نظر انداز کردیا۔ساتھ ہی ساتھ میں نے اپنی رفتار بھی بڑھادی تھی۔میں تیز تیز چل رہی تھی۔پیچھا کرنے والے نے بھی اپنی رفتار بڑھادی تھی۔میں واضح طور پر قدموں کی آہٹ سن رہی تھی جو میرے قدموں کی صدا سے بالکل الگ تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا مگر پیچھے کوئی نہ تھا۔اس صورتِ حال نے مجھے خوف زدہ تو نہیں،مگر پریشان ضرور کر دیا تھا اس لیے اب میں دوڑنے لگی تھی۔وہ نادیدہ شخص بھی دوڑنے لگا تھا۔میں سڑک کے موڑ پر پہنچ چکی تھی۔یہاں سے یہ سیدھی سڑک دائیں جانب مڑ جاتی تھی۔میں بھی مڑ گئی اور ایک گیٹ کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔میں نے اطمینان محسوس کرتے ہی گہری سانسیں لیں اور خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میں بلاوجہ خوف زدہ ہوں مگر کیا

کرتی کہ قدموں کی آوازیں اب بھی کانوں میں آ رہی تھیں۔ وہ آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ نپے تلے اور پُرسکون قدموں کی صدا۔

میں اس تاریک گوشے میں کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میرا پیچھا کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ کوئی چور بدمعاش، شرارتی یا جنسی جنونی قاتل۔

تبھی ایک ہیولہ سا قریب سے گزرا اور میں خود پر ہنسنے لگی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ ساڑھی میں ملبوس۔ میں نے پھرتی سے آڑ سے باہر آ کر اس کی گردن پکڑ لی۔

''مجھے ڈرا رہی تھیں؟'' میں نے اس کے کھلے ہوئے بال پکڑ کر کہا۔

''نہیں...... نہیں...... میں تمہیں ڈرا نہیں رہی تھی۔ تم سے ملنا چاہتی تھی۔ میں ہر روز تمہارے سرکس میں آ رہی تھی۔ تم سے ملاقات کرنا چاہتی تھی مگر مجھے کوئی ملنے ہی نہیں دے رہا تھا۔''

''تم...... تم ہو کون؟''

''مجھے پہچانا نہیں؟ میں نور النہار ہوں۔ تمہاری بچپن کی سہیلی، نور النہار کی ہم نام۔ یاد کرو، تمہارے پڑوس میں میرے ماما جی جو سکول ماسٹر تھے، انہی کے ہاں آ کر ٹھہری تھی اور تمہاری سہیلی کی ہم نام ہونے کی وجہ سے تم سے بھی دوستی ہوگئی تھی۔''

میں نے لائٹ پوسٹ کی ملگجی روشنی کی طرف اس کا چہرہ موڑ دیا۔ واقعی وہ نور النہار تھی مگر ایسی کہ اسے نور النہار نہیں، ڈھلتی شام کہا جا سکتا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا بن گئی تھی۔ چہرے کا رنگ بھی دب گیا تھا۔

''یہ...... یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے تو یہاں سے جانے کے بعد مڑ کر خبر بھی نہ لی کہ ہم پر کیا گزری؟''

''ایسی کیا اُفتاد آ پڑی، کھل کر بتاؤ؟''

''لمبی کہانی ہے۔ کھڑے کھڑے کہاں سن سکو گی۔ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''ایسا کرتے ہیں کہ واپس سرکس چلتے ہیں۔ میری چھولداری میں بیٹھ کر آرام سے اپنی کہانی سنا دینا۔''

''ٹھیک ہے چلو۔''

خیمے میں پہنچ کر وہ میری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے فولڈنگ سٹول پر میں بھی بیٹھ گئی۔ مجھے انتظار تھا کہ وہ اپنی داستان سنائے گی مگر وہ تو سسک رہی تھی، روئے جا رہی تھی۔ میں نے اسے روکا نہیں، رونے دیا۔ جب وہ دل کھول کر رو چکی اور سینے کے بوجھ میں کچھ کمی آ گئی تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دل چاہ رہا ہے کہ ایک بار پھر ماضی میں کھو جاؤں۔ میرے زخم زیادہ ہی گہرے ہیں میرے دل کی دنیا میں جس قدر ویرانی ہے کاش کوئی اس میں جھانک کر دیکھ لے۔ میں وہ ہوں جس کی زندگی میں کوئی روشن کرن نہیں ہے۔ میں تو صرف ایک انتقام ہوں جو زندہ ہے کسی بھی وقت موت مجھے اپنی آغوش میں لے لے، یقین کرو مجھے موت سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ مجھے تو زندگی سے گلہ ہے کیوں بار بار مجھے اپنے راستے پر لا ڈالتی ہے۔ میں اپنے راستے پر ایک قدم نہیں بڑھنا چاہتی لیکن زندگی......''

''ہمیں اپنی یہ سانسیں پوری کرنا ہوں گی۔ نورالنہار ان سے فرار ممکن نہیں ہے۔'' میں نے حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کی پیٹھ تھپک کر کہا۔

''آہ یہ کیسی قید ہے بدن کے خول میں پھڑ پھڑاتا ہوا قیدی اپنی مرضی سے آزاد کیوں نہیں ہو سکتا، میں خودکشی کرلوں گی۔ میں خودکشی کرنا چاہتی ہوں۔'' نورالنہار سسکتے ہوئے جواباً بولی۔

''تم اپنی آرزوؤں کی خودکشی کر چکی ہو نورالنہار اور تم نے جن الفاظ میں اپنی داستان کا آغاز کیا ہے وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ تمہارے وجود میں اب زندگی باقی نہیں ہے بے شک میں تمہیں ایک انتقام سمجھتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک کہا تم نے میں واقعی ایک انتقام ہوں۔ گھر تھا میرا بھرا پرا، سب تو تھے۔ ہمارے والد ایک راکھشس کے ہاں کام کرتے تھے۔ اس راکھشس کا نام عرفان علی تھا۔ وہ زمیندار تھا۔ ٹنگائل میں بہت بڑی زمینداری تھی وہیں اس پاپی کا سارا گھرانا رہتا تھا، بڑی سی حویلی تھی اس کی اور علاقے بھر میں اس حویلی کے گیت گائے جاتے تھے۔ کیونکہ اس کے والد ایمان علی بڑے رحم دل تھے۔ اس کے والد والدہ بستی میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہی تھے کیونکہ وہ مذہب پرست تھے۔ دور دور تک پھیلے کھیتوں میں لہلہاتی فصلیں ہوتی تھیں۔ ان کی بہت بڑی آمدنی تھی مگر اس آمدنی کا بہت بڑا حصہ گاؤں والوں کے کام آتا تھا۔ یہ روایت تھی اس حویلی کی ڈیوڑھی کی کہ جو بھی وہاں جا کر ہاتھ پھیلاتا خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔ کنواریوں کی شادیاں کرائی جاتیں، بوڑھوں کی زندگی بنادی جاتی۔ وہ جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا حویلی ان کا سب سے بڑا سہارا ہوتی اور اسی حویلی کے ایک سپوت عرفان بھی تھے۔

عرفان نوجوانی میں ہی تارک الدنیا بن گئے تھے۔ ہر ایک نے سمجھ لیا تھا کہ اللہ نے انہیں عرفان دے دیا ہے۔ وہ والد والدہ کی آنکھوں کے تارے تھے۔ شادی کے لیے کہا گیا تو ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے تھے اور بڑے ہی غم بھرے لہجے میں بولے۔''امی جان! آپ کی یہ خواہش میں کبھی پوری نہیں کر سکوں گا، میری زندگی دنیاوی آلودگی کے بوجھ سے خالی ہے میں تو اس جہان کو سنوارنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں، اس جہان میں رہنے والے ان کم نصیبوں کی زندگی بنانا چاہتا ہوں جو اپنی زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔''

اس صوفی منش کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اس عظیم الشان حویلی کے ایک حصے میں گھاس پھوس سے ایک حجرہ بنوا دیا گیا۔ اکلوتے بیٹے کی خواہش تھی ماں باپ کوششوں کے باوجود نہ ٹال سکے اور مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا گیا۔

وہ بڑے بڑے جلسوں میں بلائے جاتے۔ وہاں وعظ کرتے تو سننے والے پر وجد چھا جاتا ماں باپ نے جو کاروبار شروع کیا ہوا تھا بھلا وہ اسے کیسے پیچھے رہنے دیتے۔ اس لیے وہ اس پر بھی توجہ دے رہے تھے۔ یعنی دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چل رہے تھے فقط شادی سے انکاری تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد عرفان علی کا ڈنکا بجنے لگا۔ لوگ دور دور سے ان کے پاس آنے لگے۔ جس کو جو چاہت ہوتی مجال ہے کہ وہ اسے پوری نہ کرتے۔ لوگ کوسوں میل دور سے پیدل چل کر ان کے پاس پہنچتے تھے۔ یوں بھی اکلوتے بیٹے تھے مگر بہنیں تین تھیں۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی ایک بہن ابھی چھوٹی تھی اور عرفان سے چودہ سال چھوٹی تھی۔

''بہرحال عرفان علی کی نرم طبیعت کے باعث لوگ اب ان کا دم بھرنے لگے۔ بستی اور بستی سے باہر چھوٹے موٹے جھگڑے جو ہوتے

رہتے ہیں بہت سی داستانیں، بہت سی کہانیاں وہاں بکھری ہوئی تھیں اور ان کہانیوں میں ایک کہانی سب سے نمایاں تھی۔

خوبصورت انجلی کا محبوب رحمٰن تھا۔ جس نے قسم کھائی تھی کہ وہ انجلی کے قاتلوں سے بدلہ لے کر رہے گا۔ چنانچہ وہ اپنی تگ ودو میں لگا رہا اور پھر جب ایک دن اس نے دبی زبان میں لوگوں سے یہ کہا کہ یہاں کا راکھشس عرفان اس کے محبوب کی موت کا باعث ہے تو لوگوں نے مار مار کر اسے آدھ مرا کر دیا۔ بھلا عرفان جیسے آدمی کے بارے میں یہ بات کس کو جچتی تھی؟ اس بدنصیب نے خودکشی کر لی اور کہانی ختم ہوگئی۔

لیکن یہ کہانی ختم کہاں ہوئی تھی۔ ایسی بہت سی کہانیاں اس دوران جنم لیتی رہیں لیکن اس دوران کوئی یہ کہہ نہ سکا کہ عرفان ہی کھیل کھیل رہا ہے۔

عرفان اپنے حجرہ میں رہتے تھے اور زیادہ تر لوگ انہیں عبادت میں ہی مصروف دیکھتے تھے۔ جہاں کہیں خدمتِ خلق کا کام ہوتا تو وہ بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیتے۔ یہاں تک کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا پھر ماں جی بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ چھوٹی بہن جوانی کے قریب پہنچ گئی تھی مگر عرفان کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ بہن کی طرف دیکھتے، انہوں نے تو خدا سے لو لگائی ہوئی تھی۔

میرے والد اس خاندان کے نمک خوار تھے۔ ان کے والد یعنی میرے دادا بھی اس ہی گھرانے کے ملازم تھے اس لیے ابو بڑے مالک کی موت کے بعد بھی اپنی جگہ کام کرتے رہے، عہدہ ان کا دیوان جی کا تھا اور زمین داری کی ساری آمدنی کا حساب کتاب ان کے ہاتھ میں تھا اور پچھلے دنوں سے وہ خاصے سوچ بچار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ آپ تو جانتی ہی ہوں گی کہ ٹنگائل پارچہ بانی کی صنعت کا گڑھ ہے۔ ایمان علی نے بھی کئی کارخانے بنا رکھے تھے جسے عرفان کے مشورے وسعت دے رہے تھے۔

زمینوں کی آمدنی، جائیدادوں کی رقم، کارخانوں کا جو سرمایہ یہاں لمبے عرصے سے آرہا تھا اب اس کی تعداد بڑھتی ہی جارہی تھی۔ حساب کتاب اپنی جگہ تھے لیکن کچھ ایسے کھاتے بھی کھولے گئے تھے جو اس سارے حساب کتاب سے الگ تھے اور اس اکاؤنٹ میں کروڑوں روپے جمع کیے جارہے تھے۔ یہ پیسے کہاں سے آرہے تھے دیوان جی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

بہر طور یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی جس پر ابو پریشان ہوتے۔ جب بھی کوئی ضرورت ہوتی تو ابو حجرے میں پہنچ جاتے، وہاں ان سے بات کرتے اور عرفان جی نہایت نرم اور پُر اخلاق لہجے میں انہیں مختلف تفصیلات بتاتے رہتے تھے۔

پھر ایک مرتبہ ڈھاکا سے ٹنگائل ایک نمائندہ پانچ لاکھ روپے کی رقم مانگنے آیا۔ اس نے کہا کہ یہ رقم اس نے صبح بھرنی ہے اور اگر نہ بھری تو خواہ مخواہ بدنامی ہوگی جو عرفان جیسے اعلیٰ انسان کے لیے مناسب نہیں تھی کیونکہ اپنے صوفیانہ کردار کے باوجود انہیں اپنا کاروبار تو سنبھالنا ہی تھا۔ والد صاحب مجبور ہوگئے کہ وہ عرفان کے حجرہ میں چلے جائیں اور والد کی فرض شناسی انہیں وہاں لے گئی۔

حجرہ کے باہر کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ دروازہ پتا نہیں کیسے بند ہونے سے رہ گیا تھا۔ بھلا حجرہ کے باہر پہرے داروں کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ چنانچہ والد صاحب اندر داخل ہوگئے۔

حجرہ ویران اور سنسان پڑا ہوا تھا۔ وعظ کے بعد یہاں کوئی نہیں رہتا تھا سوائے عرفان کے چنانچہ میرے ابو بدنصیبی کا شکار ہو کر ان کے کمرے میں داخل ہوگئے اور یہاں انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جسے دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہاں انہوں نے ایک خوبصورت لڑکی

کو دیکھا جو اپنی زندگی کی آخری سانسیں پوری کر رہی تھی اور عرفان اس کے سینے پر سوار تھا جو آہٹ پا کر الگ ہٹ گیا تھا۔
ابو نے ایک نظر میں تاڑ لیا کہ اسے گردن دبا کر مار دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک بھی کیا گیا ہے جسے دیکھ کر انسانیت کانپ اُٹھے اور یہ سلوک کرنے والے عرفان جی تھے۔
والد کے پاؤں جکڑ کر رہ گئے۔ عرفان نے بھی انہیں دیکھ لیا اور اس کے بعد جیسے ان کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔
''تم......تم یہاں کیسے آ گئے؟'' انہوں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔
''حضور میں ایک کام سے آیا تھا۔''
''کیا کام تھا آپ کو ہم سے۔'' اس نے وحشت زدہ انداز میں پوچھا۔
''وہ لاکھ، پانچ لاکھ۔'' ابو ہکلا کر بولے۔
''سکون سے کہیے اطمینان سے کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔'' عرفان جی نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔ اب ان کا لہجہ اعتدال پر آ گیا تھا۔
''وہ راجہ صاحب پانچ لاکھ...... پانچ لاکھ......'' میرے ابو کی حالت اب بھی غیر تھی۔ وہ تو اس مظلوم لڑکی کو دیکھ رہے تھے جس نے بالآخر دم توڑ دیا تھا اور اس نے آخری ہچکی ان کے سامنے ہی لی تھی۔ دم توڑتی ہوئی لڑکی کو عرفان جی نے بھی دیکھ لیا لیکن وہ پُرسکون ہی رہے تھے پھر وہ بولے۔
''ہاں تو دیوان جی بیس لاکھ کی کیا بات ہے؟''
''یہ کون ہے؟'' ابو سب کچھ بھول کر بولے۔ انسانی ہمدردی ان کے سینے میں اُبھر آئی تھی۔
''ایک لڑکی ہے بے چاری کچھ مانگنے آئی تھی ہم نے اسے دے دیا۔ پر زندگی نہ دے سکے ہم اسے۔ مر گئی بے چاری۔'' عرفان نے مکاری بھرے لہجے میں کہا۔
''مگر......مگر......یہ تو......یہ تو......''
''ہاں......ہاں دیوان جی کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''
''اسے آپ نے مارا ہے عرفان جی اسے آپ نے مارا ہے۔''
''مارنا اور جلانا تو خدا کا کام ہے بس جس کی جب بھی موت آ جائے۔'' عرفان جی ہنس کر بولے۔
''یہ آپ نے گناہ کیا ہے، آپ نے۔ یہ کیا کیا آپ نے۔ آپ تو اللہ والے ہیں۔ آپ تو بڑے اعلیٰ وارفع لوگوں کی اولاد ہیں۔ آپ جیسا صوفی آپ جیسا رحم دل ایسا گناہ کرے گا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''
''ارے چھوڑو دیوان جی کہاں کی بات کرتے ہو۔ دل کی بات بھی تو کرو اور دل کی بات کرو گے تو ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ہمارا دل یہی سب کچھ چاہتا ہے اور دل جس وقت جو کچھ چاہے اس کی مانگ پوری کرنا ضروری ہوتی ہے۔ ہمارا دل یہی سب کچھ چاہتا ہے اور اگر سچ جانو دیوان جی

تو اب تک ہمارے دل کی ہر مانگ پوری ہوتی رہی ہے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ شریک ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ جن آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھ لیا اور جن کانوں نے یہ سب کچھ سن لیا ان کا جینا ضروری تو نہیں مگر تم ہمارے پُرانے دیوان ہو۔ ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کبھی نہ کرنا ہم جو کچھ بھی ہیں اس کا اندازہ بخوبی ہو چکا ہوگا۔ دیوان جی ہم نہیں چاہتے کہ تم جیسے اچھے آدمی کو ہم کوئی نقصان پہنچائیں لیکن اس کی شرط یہی ہے کہ تمہاری زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند رہنی چاہیے۔"

"تو کیا...... تو کیا؟ وہ لاشیں بھی، وہ لاشیں بھی آپ ہی کی درندگی کا شکار ہوئی تھیں۔ جو جنگلوں، کنوؤں اور دوسری جگہوں پر پائی گئی تھیں۔" میرے ابو نے چونک کر پوچھا۔

"زبان سنبھالو دیوان جی! اسے درندگی نہ کہو۔ وہ سب خدا کے حضور پہنچ گئیں، بھلا ہماری آغوش میں آنے کے بعد کسی کو جنت نہ ملے۔ بھلا یہ ممکن ہے۔"

"مگر...... مگر یہ تو قتل ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ عرفان جی آپ ابھی تک اپنے آپ کو چھپا رہے ہیں۔ میں تو خدا سے ڈر رہا ہوں کیسے ارفع واعلیٰ لوگوں کی اولاد ہیں آپ اور کیسے راکھشس، اگر آپ کے والدین کی روحیں یہ سب کچھ دیکھ لیں تو نہ جانے ان کا کیا حال ہو۔ اللہ آپ کو معاف کرے۔ آپ کے گناہوں کو بخش دے۔"

"دیوان جی تم زندہ رہنا نہیں چاہتے کیا؟ اپنے خاندان کی زندگی پسند نہیں کیا؟"

"نہیں عرفان جی یہ نہ کہو۔ اللہ نے چاہا تو میرا خاندان بچے گا۔ میری زندگی بھی بچ جائے گی مگر تم جیسے راکھشس کو میں نہیں چھوڑ سکتا، کس کی بیٹی ہے؟ کس کی اولاد ہے یہ؟"

"ہوں...... تو دیوان جی اس سے پہلے کہ تمہاری دیوانگی عروج کو پہنچے تمہارا علاج کرنا ضروری ہے۔" عرفان نے پھرتی سے ایک طرف رکھا ہوا پستول نکال لیا اور اس کا رُخ میرے ابو کی طرف کر دیا۔ ابو جی خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ عرفان انہیں گھورتا رہا پھر بولا۔

"تمہیں ایک منٹ میں مار دیا جاتا دیوان جی مگر بزرگوں کا خیال آتا ہے اور پھر یہی بات یہ ہے کہ جس طرح تم نے اور تمہارے بزرگوں نے ہماری زمینداری کا کام سنبھال رکھا ہے اس کو بھی ہمیں سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ اب ہمیں نئے آدمی رکھنا پڑیں گے۔"

ابو اس دوران یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ ان کی زندگی یہاں محفوظ نہیں ہے۔ اس لڑکی کی مظلومیت ان کے روئیں روئیں میں رچ گئی تھی لیکن اس وقت عقل نے ساتھ دیا۔ انہوں نے سوچا کہ اس راکھشس کو ایسے نہیں مارا جا سکتا اگر ان کی کہانی یہیں پر ختم ہوگئی تو پھر یہ تو مر جائیں گے اور کوئی نہیں جان سکے گا کہ راجا عرفان جیسا راکھشس کیا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ چنانچہ وہ بے اختیار مسکرا پڑے۔

"دیکھنا چاہتا تھا عرفان جی کہ آپ کے دل میں میرے لیے کتنی گنجائش ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب دیوان جی؟"

"مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ بُرا ہے، اچھا نہیں ہے لیکن کیا کروں آپ کے والد کا نمک کھاتا رہا ہوں۔ اپنی عادت سے مجبور ہوں تمہیں

نصیحت تو کرنا ہی تھی مگر بیٹے کیا ضروری تھا کہ تم اسے قتل بھی کرتے۔"

"اوہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں عقل آ گئی ہے۔"

"میرے ساتھ یہی سب کچھ روا ہے عرفان جی؟"

"نہیں ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ ہم آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ بڑا مان ہے آپ کا ہمارے دل میں، مگر آپ کی بات ہی ایسی تھی۔"

"بہک گیا تھا۔ اب سنبھل گیا ہوں۔" ابو بولے۔

"سنبھل جانے میں جو مزہ ہے دیوان جی بہکنے میں نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ تم کبھی نہیں بہکو گے۔"

"میرے ساتھ ایسی باتیں مت کرو بیٹے میں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ تمہارے ساتھ بتایا ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ اگر یہ سب کچھ ہو بھی گیا تھا تو اس کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ ضروری ہے۔ آپ سمجھتے نہیں ہیں دیوان جی! اس کے لیے ہم اپنی عزت داؤ پر نہیں لگا سکتے۔ چنانچہ ہم یہ بھی کرتے ہیں۔"

"مگر مجھے آپ کی اس حرکت سے اختلاف ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"آپ اگر چاہیں تو کھلے عام بھی یہ سب کچھ کر سکتے ہیں جاگیرداروں اور حویلیوں میں تو یہی کھیل ہوتے رہتے ہیں، آپ کو کون روکے گا۔"

"ہم جیسے صوفی جن کے پاس لوگ اپنی مرادیں لے کر آتے ہیں اپنی عورتوں کو لے کر دعائیں کرانے آتے ہیں بھلا اس سے اچھا موقع اور کہاں مل سکتا ہے۔ نہیں دیوان جی تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ جوانی کے کھیلوں سے ناواقف ہو۔ بھلا ایسی عورتیں بھی کسی قابل ہوتی ہیں جو طوائف ہوں، جگہ جگہ ناچتی پھریں۔ ہمیں تو ان کچی کلیوں سے دلچسپی ہے، ہمیں تو یہی سب کچھ اچھا لگتا ہے کہ دوہری زندگی گزاری جائے۔ بس یوں سمجھو کہ یہی ہمارا کھیل ہے مگر دیوان جی تمہارے لہجے کی اچانک تبدیلی ہمیں شبے کا شکار کر رہی ہے۔"

"بے کار باتیں نہ کریں میں اپنی زبان بند کرلوں گا۔" میرے ابو نے مصلحت کے تحت کہا۔

"اور زبان کھولی تو دیوان جی یہ سمجھ لو کہ ہمارے ہاتھ چھوٹے نہیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹے! مجھے ہی دھمکیاں دے کر تم اپنی بڑائی جتا سکتے ہو۔"

"ارے نہیں دیوان جی ہم نے تو ہمیشہ آپ کی عزت کی ہے چلیں اب یہ لاش بھی آپ ہی ٹھکانے لگائیں۔"

"ک ک...... کیا؟" ابو نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں دیوان جی! اب تو آپ ہمارے کام میں شریک ہو ہی گئے ہیں۔ یہ لاش اپنے کاندھے پر لاد کر لے جائیں اور میٹھی باؤلی میں ڈال دیں۔ میٹھی باؤلی تو آپ نے دیکھی ہی ہوگی۔ جائیں جائیں جلدی کریں۔" میرے ابو کو زندگی بچانے کے لیے یہ سب کچھ کرنا ہی تھا جو کچھ ہوا تھا اس پر ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا لیکن عرفان سے ٹکر لینا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ پورا خاندان چل رہا تھا ان کے دم سے، بھلا میرے ابو کہاں

ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ ہاں لیکن انہوں نے یہ ضرور سوچ لیا تھا کہ کسی نہ کسی موقع پر وہ اس راکھشس کو ضرور بے نقاب کر دیں گے لیکن ایسے وقت جب وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ ویسے تو وہ جانتے تھے کہ اس کے بارے میں اگر ایک لفظ بھی کہا تو لوگ ان کی بوٹیاں اُڑا دیں گے۔ صورتِ حال کی نزاکت کا انہیں پورا پورا خیال تھا۔

انہوں نے لاش کندھے پر ڈالی اور چور دروازے سے نکل کر میٹھی باؤلی کی طرف چل پڑے لیکن ابھی زیادہ دور نہیں چلے تھے کہ بہت سی روشنیاں ان پر پڑیں۔ ایک کے بعد ایک روشنی کا جھماکا ہوا ابو اتنے بھی بیوقوف نہیں تھے کہ یہ نہ سمجھتے کہ ان کی تصویریں لی جا رہی ہیں۔ یہ تصویریں عرفان کے اشارے پر ہی لی گئی تھیں اور اب ابو کی صورتِ حال بہت عجیب ہو گئی تھی۔ ان کا خون خشک ہو گیا تھا۔ لڑکی کی لاش ان کے کندھے پر پڑی ہوئی تھی اور ان کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ وہ کسی سے کچھ بھی کہتے پھرتے لیکن یہ ذمے داری انہی پر عائد ہوتی تھی۔ آخر وہ لاش کو کندھے پر لے کر کیوں جا رہے تھے۔

ان کا دل روتا رہا اور انہوں نے لاش میٹھی باؤلی میں پھینک دی۔ یہ باؤلی بہت گہری تھی اور اس میں گرنے والی کسی چیز کا کبھی پتا نہیں چلتا تھا۔ پھینکنے سے پہلے لاش کے بدن میں پتھر بھی باندھنے پڑتے تھے۔

باؤلی کے بارے میں سنا تھا کہ اس میں مگرمچھ رہتے ہیں جو کسی بھی زندہ یا مُردہ انسان کو آن کی آن میں ہڑپ کر لیتے ہیں۔ ہر طرح سے اطمینان کر لیا تھا اس گناہ کی پوٹ نے، چنانچہ ابو کام کرنے کے بعد واپس گھر آ گئے مگر ہلکان ہو رہے تھے۔ گھر میں امی اور میری ایک بہن تھی۔ کارندے ہونے کی وجہ سے ابو کو بہت اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ تھوڑی سی زمینیں تھیں ہماری۔ یہ زمینیں انعام ہی میں عرفان کے بزرگوں نے ہمیں بخشی تھیں اور اب ہمارا ان پر پورا پورا حق تھا۔

اس طرح سے ہمارے حالات بہت بہتر چل رہے تھے۔ شمسن کو تو اس بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا مگر میں نے وہ سب کچھ سن لیا جسے میں نے انہی کی زبانی بیان کیا۔ جسے سن کر امی بُری طرح سہم گئی تھیں۔ انہوں نے خوفزدہ لہجے میں کہا تھا۔

''ہائے اللہ......اب کیا ہو گا؟''

''یوں سمجھو کہ میں مر چکا ہوں۔ میری زندگی کا اب کچھ بھروسا نہیں۔ پتا نہیں کس کی اولاد تھی وہ۔ میرا من مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا میں کبھی مطمئن نہیں ہوں گا۔''

''خود کو سنبھالو بھلا ہم جیسے معمولی لوگ عرفان سے کیسے ٹکرا سکتے ہیں؟ ہائے اللہ میں نے تو کئی بار اس کی نظر اُتاری ہے۔ بڑے سچے دل سے میں نے اسے اپنی اولاد کی طرح چاہا ہے اور اسے اتنا بڑا پاپی کیسے مان لوں۔''

''نہ مانو......تم نہ مانو گی تو کیا ہو گا مگر میں کیا کروں؟ میرا دل چاہ رہا ہے کہ سو جاؤں اتنی گہری نیند کہ پھر کبھی نہ جاگوں، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر کل صبح میں اپنے کام پر نہ پہنچا تو عرفان کو شک ہو جائے گا اور اس کے بعد نہیں......نہیں......سنو تم دونوں بیٹیوں کو ان سب کی نگاہوں سے چھپا کر رکھو۔ ہماری بستی میں ایک راکھشس گھس آیا ہے اور اب کسی کی بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ لو ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارے یہ

حضرت جن کے بارے میں ہم ہمیشہ یہ سوچتے تھے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں اور اللہ نے اپنے اس خادم کو ایسی جگہ اُتارا ہے جہاں دولت ہی دولت ہے لیکن دولت کے انبار رکھ کر بھی وہ اپنے اس خدا کو نہیں بھول سکا۔ کتنا مان تھا ہمیں اس پر، کتنا بڑا مان تھا مگر سوچو تو سہی...... سوچو تو سہی گاؤں میں جنگلوں میں کنوؤں پر نہروں میں جو لاشیں ملتی رہی ہیں وہ اس پاپی کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھیں۔ آہ...... آج اگر میں بستی کے چوک پر کھڑے ہو کر لوگوں کو یہ بات بتاؤں تو میں جانتا ہوں کہ لوگ مجھے سنگسار کر دیں گے۔ پتھر مار مار کر میرے پورے وجود کو فنا کر دیں گے۔ لیکن کاش کوئی اس کی درندگی اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔"

امی انہیں سمجھاتی رہیں۔ صبح کو ابو تیار ہو کر چل پڑے۔ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ زندگی بچانے کے لیے کام پر جانا بے حد ضروری تھا۔

تب امی نے رات کی باتیں مجھے بتائیں اور مجھے ہدایت کی کہ نہ تو میں خود باہر جاؤں اور نہ کسی اور کو جانے دوں۔ میں نے امی سے پوچھا۔

"امی! گھروں میں قید رہنے سے کیا بہو بیٹیوں کی عزت محفوظ رہتی ہے۔ آج اس کے ہاتھ گھر سے باہر ہیں تو کل گھروں کے اندر بھی پہنچ سکتے ہیں۔ کیا راکھشس کو ختم کرنا ضروری نہیں ہے۔"

تب ماں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ میں بیوقوفی کی باتیں نہ کروں جو کام ہم نہیں کر سکتے اس کی بات ہی کیوں کی جائے۔ پر میرا دل نہیں مانتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ رات کو ابو سے بات کروں گی۔ رات کو جب وہ واپس آئے تو میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل کے خلاف بات کر رہے ہیں۔ میں ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے بٹیا؟" انہوں نے سوال کیا۔

"آپ نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ابو کہ وہ لاش کس لڑکی کی تھی؟"

"کیا؟ تجھے...... تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"ابو مان کرتی تھی میں آپ پر۔ سنسار میں آپ سے بڑا کوئی نظر نہ آتا تھا لیکن یہ کیا ہوا آپ کو...... آپ اتنے چھوٹے کیوں ہو گئے ابو! جان کیوں نہ دے دی آپ نے اپنی۔ زندگی کیوں نہ لے لی آپ نے اس راکھشس کی؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ابو کی گردن جھک گئی۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہے اور پھر انہوں نے کہا۔

"تیرا باپ بے غیرت نہیں ہے نور النہار اتنا بے رحم نہیں ہے وہ۔ مگر عقل کی جنگ ہاتھ پیروں کی جنگ سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے اگر نادانی کا ایک لمحہ بھی اور گزر جاتا تو شاید تجھے اپنے باپ کی لاش دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتی۔ اے پگلی یہ کیسے سوچ لیا تُو نے کہ میں نے اپنی اس بیٹی کو بھلا دیا ہوگا جس کی لاش میں اپنے کندھے پر ڈال کر باؤلی میں پھینک کر آیا تھا۔ میں تو مرتے وقت تک اسے نہیں بھول سکتا۔ میں اپنے گناہ کا اقرار بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں اس راکھشس کو اس دنیا سے مٹانے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ تُو میری بیٹی ہے، اللہ نے مجھے کوئی بیٹا نہیں دیا جو میرے بعد میرے اس خاندان کو سنبھال سکتا لیکن غور سے سن میں اسے چھوڑوں گا نہیں، اللہ کی قسم اپنے خاندان کی قسم۔ تیری قسم، میں اسے نہیں چھوڑوں گا لیکن اس کے لیے مجھے

وقت چاہیے ہوگا۔ جیسا میں کہوں تم ویسا ہی کرنا۔ اگر تم نے ذرا بھی ایسی ویسی بات کر دی تو وقت سے پہلے ہی ہم مارے جائیں گے میں اپنے اس عزم کو بھی نہیں بھولوں گا لیکن اس کے لیے وقت چاہیے مجھے۔ تمہیں یہ واقعات یاد ہوں گے جب کسی نے اس کے خلاف زبان کھولی تھی اور لوگوں نے اسے خود ہی مار مار کر ختم کر دیا تھا۔ بڑا گہرا اثر ڈالا ہوا ہے اس نے، اس کے علاوہ بیٹا تمہیں ایک اور بات بتاؤں اس کمبخت کے بزرگ بہت اچھی زندگی گزار گئے تھے۔ وہ سچے اور نیک لوگ تھے لیکن...... لیکن یہ بات میں جانتا ہوں کہ بے شمار روپیہ آ رہا ہے۔ راتوں کو عجیب عجیب قسم کے لوگ آ آ کر اس سے ملتے ہیں۔ وہ کون ہیں اور کیوں ملتے ہیں اس سے اور یہ کرتا کیا ہے۔ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم میری اس سے کبھی لڑائی نہ ہوئی کیونکہ میں نے اس کے باپ دادا کا نمک کھایا ہے اور اس کا بھی۔ میں تو یونہی سر جھکا کر جیون بتا دیتا لیکن حالات یہ کہہ رہے ہیں کہ بیٹا اب مجھے اس کے سامنے آنا ہی پڑے گا۔ میں زیادہ مضبوط آدمی نہیں ہوں لیکن میرے ساتھ سچائی کی شکتی ہے۔ تم لوگ میرے لیے دعا کرو ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا کہ میں جیتا رہوں مجھے یہ حالات معلوم ہو جائیں اور میں خاموشی اختیار کر لوں۔''

ابو کے الفاظ بہت مضبوط تھے۔ میرے دل کو ڈھارس ہو گئی۔ میں نے ابو سے کہا کہ وہ مجھے کوئی کام سونپیں لیکن ابو نے کہا کہ بیٹی تو خاموشی سے گھر بیٹھ یہ سارے کام تیرے نہیں ہیں۔ مجھے اس بات پر افسوس تھا کہ میں ابو کا بیٹا نہ ہوئی'' نورالنہار اپنی کہانی سناتے سناتے رُک کر گہری سانس لے کر بولی۔

''بہر طور میں نے خاموشی اختیار کی۔ ابو اپنے دل میں ان بُرائیوں کے خلاف عزم لیے اپنے کام میں لگے رہے۔ وہ دن رات عرفان کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ ویسے وہ ان جیسے کسی آدمی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس کے پاؤں بڑے مضبوط تھے چنانچہ اس نے اس واقعے کو بھی نظر انداز کر دیا۔ ابو کے بارے میں اس نے ایک بار بھی نہ سوچا لیکن میرے ابو مسلسل اس کی تاک میں لگے رہے۔ وہ ان لوگوں کو جانچتے رہے جو اس سے ملنے آتے تھے اور اس کے بعد انہیں جو علم ہوا وہ بے حد خوفناک تھا۔ انہیں پتا چلا کہ عرفان صرف عیاش طبع آدمی ہی نہیں بلکہ اس نے شہر میں اپنے جال پھیلا رکھے ہیں۔ وہ شہریوں کو ناجائز شراب اور نشے کی دوسری چیزیں بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بے شمار غنڈے جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ پتا نہیں کیا کیا کارروائیاں انجام دے رہے تھے۔ ان کارروائیوں کے بارے میں بھی تھوڑی تھوڑی معلومات ابو کو ہو گئی تھی کہ ملک ملک سے لڑکیاں لائی جاتی ہیں۔ کئی بار کئی غیر ملکی لڑکیوں کو بھی عرفان کے حجرہ میں دیکھا گیا۔ ابو کو سب سے زیادہ اس بات کا افسوس تھا کہ وہ کمبخت صوفیوں کے بھیس میں یہ تمام گناہ کر رہا تھا جس کی وجہ سے کچے ایمان والوں کا ایمان لڑکھڑا سکتا تھا اور یہ بڑی افسوسناک بات تھی۔ کم از کم اسے اپنی شکل ہی نمایاں کر دینی تھی۔ بستی والوں اور گاؤں والوں کو خوش کرنے کے لیے اس نے وہی تمام کارروائیاں کی تھیں جو اس کے باپ دادا کرتے چلے آئے تھے اور وہ لوگ واقعی اس سے بہت خوش تھے کیونکہ اب دولت کی ریل پیل باہر سے بھی تھی، صرف زمینوں جائیدوں سے کام نہیں چلایا جا رہا تھا۔ حالانکہ اس کی کمی بھی نہیں تھی اور ان کے ذریعے بھی کام چلایا جا سکتا تھا لیکن پوری بستی کو خوشحال بنا دیا گیا تھا۔ بستی کے سارے مکانات بنتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لیے عرفان سے قرضہ ملتا تھا۔ بستی والے ان کے نام پر مر مٹنے کو تیار تھے۔ ایسے پاپی کو زیر کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ابو کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کے خلاف کوئی باقاعدہ محاذ نہیں بنا سکتے۔ چنانچہ وہ تاک میں لگے رہے اور پھر ایک دفعہ انہیں باہر جانے کا موقع مل گیا۔ کسی کام سے عرفان نے

ہی انہیں باہر بھیجا تھا ابو ڈھاکا آئے۔ وہاں عرفان کے کام کے ساتھ ساتھ وہ اپنے طور پر کارروائی بھی کرنے لگے۔ انہوں نے ایک بہت بڑے پولیس آفیسر سے رابطہ قائم کیا اور ان سے ذاتی طور پر ان کے مکان پر ملاقات کی۔ پولیس آفیسر نے ابو کا استقبال عرفان کے دیوان ہی کی حیثیت سے کیا تھا۔ مختلف باتیں کرنے کے بعد ابو نے کہا۔

''صاحب میں آپ کو ایک اہم بات سے باخبر کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ وطن پرستی ہر شخص کے دل میں ہوتی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ صرف اس لیے زندگی نہ گزارے کہ اسے روٹی کپڑا ملتا رہے اس کے دل میں کچھ اور امیدیں بھی ہوتی ہیں۔ اچھائیوں اور برائیوں کی امیدیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مسٹر دیوان جی؟'' بڑے پولیس آفیسر نے پوچھا۔

''میں کچھ ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جنہیں سن کر آپ میرے منہ پر تھوکنا پسند کریں گے مگر میں کیا کروں اپنے دل سے مجبور ہوں۔'' ابو نے شاید یہی الفاظ کہے تھے۔

''نہیں دیوان جی آپ بزرگ آدمی ہیں میں آپ کی عزت کرتا ہوں جو بات کہنا ہو دل کھول کر کہیں۔'' آفیسر کی آنکھوں میں حیرت تھی شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ ابو سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے وہ اسی کا اعتراف کرنے آئے ہیں۔ یہ میرا نہیں ابو کا اندازہ تھا۔

''حضور یہ خاندان جہاں میں آج دیوان کی حیثیت سے نوکر ہوں میرے لیے اَن داتا کا خاندان رہا ہے۔ ان لوگوں کے ہاں میرے پرکھوں نے زندگی بتائی ہے ان کی برائی چاہنا نمک حرامی ہے اور اس طرح انسان خود اپنی ہی نگاہوں میں ذلیل ہوتا ہے۔'' ابو کا لہجہ شرمسار تھا۔

''بے شک اس میں کیا شک ہے؟'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ وہ دھیرے دھیرے پیپرویٹ گھما رہا تھا مگر اس کی سماعت ابو کی طرف مرکوز تھی۔

''لیکن میں اس خاندان کے خلاف ہی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' آفیسر تعجب سے بولے۔

''ہاں جناب جو کچھ میں بتا رہا ہوں اسے سن کر آپ مجھ پر لعنت بھیج سکتے ہیں لیکن اس وقت تک کچھ نہ بولیں جب تک آپ صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہ لگالیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟'' بڑے پولیس آفیسر نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''عرفان صاحب اچھے راستوں کے راہی نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' پولیس آفیسر کے لہجے میں تبدیلی آ گئی۔

''مطلب یہ کہ وہ اپنے خاندان کی ریت سے ہٹ گئے ہیں۔ آپ نے منگائل کے اطراف میں ہونے والی وارداتوں کے بارے میں سنا ہوگا۔ جگہ جگہ لڑکیوں کی لاشیں پائی گئی ہیں۔''

''ہاں سنا ہے۔''

''میں نے ان لاشوں کا راز معلوم کرلیا ہے۔''

''اوہ کیا راز ہے ان کا؟'' آفیسر دلچسپی سے آگے جھک آئے تھے۔

''انہیں آبروریزی کے بعد ماردیا جاتا ہے۔''

''وہ تو میڈیکل رپورٹ سے بھی معلوم کرلیا گیا ہے مگر یہ سب کون کرتا ہے؟''

''عرفان صاحب!''

''کیا؟'' آفیسر صاحب کا لہجہ چونکا ہوا تھا۔

''ہاں صاحب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔صوفی کے بھیس میں عرفان صاحب بہت بُرا کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اچھا نہیں ہے۔ میں نے اس کے لیے جان کی بازی لگائی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ آپ اس کی تحقیقات کریں۔ یہی نہیں بلکہ وہ کچی شراب اور نشے کا بیوپار بھی کرتے ہیں۔ بہت سارے ملکی اور غیر ملکی لوگ یہاں آتے ہیں اور اس کے بعد یہ سب کچھ ہوتا ہے۔'' آفیسر صاحب تعجب کی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسی طرح مجھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

''کیا آپ نے اس سلسلے میں کسی اور پولیس آفیسر سے بات کی؟''

''نہیں جناب بڑا سوچ بچار کرتا رہا ہوں جس کا نمک کھاؤں اس کے خلاف یہ سب کچھ کروں۔ دل یہ تسلیم نہیں کر رہا تھا لیکن ضمیر سے مجبور ہوں وہ لاش جسے میرے کندھے پر لاد کر باؤلی میں گرایا گیا آج تک میری نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکتا۔ جناب وہ میری بیٹیوں کی طرح تھی۔''

''کیا مطلب؟'' آفیسر نے پوچھا اور ابو نے انہیں پوری کہانی سنادی۔ آفیسر صاحب گردن ہلاتے رہے پھر انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

''اس کہانی کا کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''جناب ثبوت تو ہزاروں مل جائیں گے اپنے کچھ آدمیوں کو میرے ساتھ بھیج دیں میں انہیں دکھاؤں گا کہ حویلی میں کیا کیا ہوتا ہے۔''

''ہوں...... دیوان جی آپ نے یہ اطلاع دے کر بڑا اچھا کیا۔ میں اس کی تحقیقات کراؤں گا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ اگر آپ نے یہ باتیں دو چار جگہ اور کہہ دیں تو پھر آپ کی اپنی زندگی کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا اگر آپ کے کہنے کے مطابق عرفان صاحب اتنے خطرناک آدمی ہیں اور صوفی کے بھیس میں آ کر وہ سب کچھ کر رہے ہیں تو پھر ان کے ہاتھ بہت لمبے ہوں گے۔ آپ کی جان جائے گی اس لیے خاموشی سے اپنے گھر جائیے آرام سے بیٹھیے آپ نے مجھے اطلاع دی میں اس سلسلے میں پوری پوری تحقیقات کروں گا اور آپ کی بات سچ نکلی تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔'' آفیسر کا یہی کہنا تھا۔ ابو مطمئن ہو گئے۔ وہ خود بھی دور رہ کر کام کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اپنے اندر بھی بڑی کشمکش تھی۔ انہیں افسوس ہو رہا تھا لیکن فرض کی ایک زندگی الگ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ننگائل واپس آ گئے۔ ابو اپنے من کا بوجھ ہلکا کر آئے تھے لیکن انہیں اطمینان نصیب نہ ہوا۔ وہ ایک ایک بات امی کو بتا چکے تھے جسے میں نے بھی سنا تھا۔ اسی لیے تو ڈھاکا کی ہر بات اتنی تفصیل سے بتائی ہے۔ خیر

دو دن اسی طرح گزر گئے ابو کی کیفیت دیکھ کر میرے اپنے دل میں عجیب سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے جو کچھ سن رکھا تھا اس کے بعد نہ جانے کیوں دل ڈرنے لگا تھا۔

یہ تیسرے دن صبح کی بات ہے۔ صبح ہی صبح ہمارے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی تو میں دروازہ کھولنے چلی گئی۔ عرفان کو میں نے اس سے پہلے کئی بار دیکھا تھا لیکن وہ جتنی بڑی شخصیت تھے، اسے سوچ کر میں کبھی بھول کر بھی خیال نہیں کر سکتی تھی کہ وہ ہمارے گھر کے دروازے پر بھی آ جائیں گے۔ اس وقت وہی ہمارے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔ عرفان صاحب خود بھی مجھے حیرت سے دیکھتے رہے تھے۔ پھر انہوں نے بڑی نرم اور میٹھی آواز میں کہا۔ ''دیوان جی موجود ہیں؟''

''ہاں جناب!''

''سنو تم بیٹی ہو ان کی؟''

''ہاں جناب۔''

''اکیلی بیٹی ہو؟''

''نہیں جناب میری ایک بہن بھی ہے۔''

''ہوں چھوٹی ہے تم سے؟''

''ہاں جناب!''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نورالنہار!''

''اور تمہاری بہن کا؟''

''شمس النہار۔''

''ٹھیک ہے جاؤ اور اپنے ابو کو اطلاع دو کہ ہم آئے ہیں۔'' میں واپس مڑی لیکن مجھے عرفان صاحب کی نگاہیں اپنی پشت پر چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مجھے اندر سے ٹٹول رہا ہے۔ یہ آنکھیں بڑی عجیب تھیں۔ جب تک میں ان کے سامنے سے گزرتی رہی، مجھے یہ احساس رہا۔ ابو کو آ کر میں نے یہ بات بتائی تو وہ حیرت سے اُچھل پڑے اور پھر دوڑتے چلے گئے۔ کچھ بھی تھا بہرطور عرفان صاحب ان کے مالک تھے۔ ابو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ انہیں اندر لے کر آئے۔ عرفان صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''دیوان جی! ہم آپ کے دل سے اپنے بارے میں غصہ دور کرنا چاہتے ہیں اور اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''جناب میرے دل کو کیا ہو گیا؟'' ابو نے خود کو سنبھال کر کہا۔ وہ عرفان سے آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے کیونکہ ان کے دل میں جو کچھ تھا ابھی عرفان کو کچھ نہیں پتا تھا۔

''نہیں دیوان جی دیکھو ہمیں دیکھو۔ ہم بڑے اور چھوٹے میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ تم ہمارے دیوان ہو۔ عام طور سے ہمارے اجداد لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے آئے ہیں لیکن وہ کبھی کسی کے گھر نہیں گئے ہوں گے۔ ہمیں دیکھو ہم صوفی منش ہیں۔ دنیا سے بالکل دلچسپی نہیں رکھتے۔ ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ تمہارے گھر کا دروازہ آیا تو یہاں آ گئے۔ ویسے دیوان جی تم نے ہمیشہ دوری رکھی ہے۔''

''ہم نہیں سمجھے جناب!''

''کبھی اپنے گھر والوں کے ساتھ ہمارے گھر نہیں آئے۔''

''بس حضور ویسے ہی۔'' میرے ابو نے جواب دیا۔

''اور سناؤ تمہارے حالات کیسے ہیں؟''

''بس ٹھیک ہیں جناب کوئی خاص بات نہیں۔ آپ کو ناشتہ پانی؟''

''نہیں...... نہیں دیوان جی! صبح صبح ہم ناشتہ نہیں کرتے۔ بس ایسے ہی آ گئے تھے تمہارے گھر۔'' عرفان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں شیطانیت تھی جسے میں دور ہی سے محسوس کر رہی تھی۔ صوفی کے روپ میں یہ آدمی راکھشس ہی محسوس ہوتا تھا۔ خدوخال بھی بھدے تھے بلکہ خوفناک ہی نظر آتے تھے۔ بہرطور تھوڑی دیر کے بعد وہ چلا گیا لیکن ابو کو بے پناہ فکر و پریشانیوں کا شکار کر گیا۔ وہ پُر خیال انداز میں گردن ہلا رہے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچی تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

''تو...... تُو کیا کر رہی ہے نور النہار! دروازہ کھولنے تُو گئی تھی؟''

''ہاں ابو۔''

''کیوں گئی تھی؟ بیوقوف کہیں کی۔ بھلا تجھے کیا ضرورت تھی جانے کی؟ ہر دستک پر دروازہ کھولنے چلی جاتی ہے۔ جب میں گھر میں موجود تھا تو تُو کیوں گئی تھی؟ نوکر نہیں موجود تھے۔ پتا نہیں کیا کرنے والی ہے تُو کیا کر کے دکھائے گی۔ تجھے سمجھا تو دیا تھا کہ وہی کر جو میں کہتا ہوں۔''

ابو بلاوجہ ہی مجھ پر بگڑنے لگے۔ میں ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ بیوقوف نہیں تھی حالات کا اندازہ ہو گیا تھا اور جو کہانی ابو نے سنائی تھی، اس کے تحت اس کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی ابو میرے لیے ہی پریشان ہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔

''عرفان نے تجھ سے کوئی بات کی تھی؟''

''ہاں......''

''کیا بات تھی؟''

''بس نام پوچھا تھا میرا۔ یہ معلوم کیا تھا کہ کتنی بہنیں ہیں؟''

''بھائی کے بارے میں پوچھا؟''

''نہیں۔''

"اوہ تجھے نہیں جانا چاہیے تھا، تجھے نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"ایسا کیا ہو گیا پتا جی! میں کوئی حلوہ تو نہیں ہوں، مجھے کوئی کھا جائے گا۔"

"تو نہیں سمجھتی پگلی تو نہیں سمجھتی۔"

"سب سمجھتی ہوں ابو! آپ ایک بات کا اطمینان رکھیں میری طرف سے۔"

"کیا؟" ابو چونک کر بولے۔

"بس ابو میں آپ کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی لیکن اس بات کو ذہن میں رکھ لیجیے کہ کوئی مجھ تک بہ آسانی نہیں پہنچ سکتا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو" ابو نے فکر مند لہجے میں کہا۔

روز مرہ کی طرح آج بھی وہ ضروری تیاریاں کرنے کے بعد حویلی روانہ ہو گئے۔ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ وقت پر گھر لوٹ آئے کیونکہ شام ہو گئی تھی۔

رات کے تقریباً دس بجے تھے جب ہمارے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ابو بیٹھے اس وقت حقہ پی رہے تھے۔ دستک کی آواز سن کر حقے کی نے ان کے منہ سے نکل گئی۔ دیر تک سہمی ہوئی نگاہوں سے وہ دروازے کی طرف تکتے رہے۔ پھر لرزتے ہوئے قدموں سے وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ ہمیں چونکہ انہوں نے دروازے پر جانے سے منع کر دیا تھا، اس لیے ہم میں سے کوئی بھی دروازہ کھولنے نہیں گیا۔ ابو نے دروازہ کھولا اور کسی سے باتیں کرنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"آ جاؤ اندر آ جاؤ بھائی۔" میں اسے پہچانتی تھی۔ بستی ہی کا آدمی تھا۔ اللہ دین عرف دھانو نام تھا۔ پہلے ہمارے محلے میں رہتا تھا پھر اپنے بال بچوں کو لے کر شہر چلا گیا تھا۔

"کہو بھائی دھانو کیا حال ہیں؟ کب آئے شہر سے؟"

"ابھی ابھی آیا ہوں اور بری طرح سے بھاگتا ہوا آیا ہوں۔ ابھی واپس بھی چلا جاؤں گا۔"

"کیوں...... کیوں خیریت، ابھی آئے ہو ابھی واپس چلے جاؤ گے؟"

"آپ کے پاس آیا تھا۔ دیوان جی آپ جانتے ہیں، میں پولیس میں حوالدار ہوں۔"

"ہاں جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"دیوان جی مجھے کچھ سوالات کے جوابات چاہئیں۔"

"کیا پولیس کی طرف سے یہ سوال کر رہے ہو؟"

"نہیں دیوان جی! میں اگر پولیس کی طرف سے سوالات کر رہا ہوتا تو سادہ لباس میں نہ آتا پولیس کی وردی پہن کر آتا۔"

"کہو بھئی، کیا بات ہے؟"

''کیا آپ عرفان کے خلاف پولیس میں کوئی رپورٹ درج کرانے گئے تھے؟'' اس نے کہا اور ابو بُری طرح چونک پڑے۔

''میں جو پوچھ رہا ہوں مجھے اس کا جواب چاہیے۔''

''ہاں گیا تھا۔''

''بہت بُرا کیا آپ نے دیوان جی! بہت بُرا کیا۔ آپ کو عرفان صاحب کے تعلقات کا علم نہیں ہے۔''

''تعلقات اپنی جگہ، میں تو پولیس کو ایک جرم کی اطلاع دینے گیا تھا۔''

''جرم...... کیسی باتیں کرتے ہیں دیوان جی! آپ نے اتنی زندگی گزار دی۔ آپ جانتے ہیں کہ بُرائی اگر غریب آدمی کرتا ہے تو جرم بن جاتا ہے اور یہی بُرا کام جب کوئی امیر کرتا ہے تو وہ یا تو پالیسی ہوتی ہے یا اس کے پس پشت کوئی بڑا کام ہوتا ہے۔''

''لیکن جو کام عرفان کر رہا ہے کیا وہ بھی تمہاری نگاہ میں بہت بڑا ہے؟''

''میری نگاہوں میں نہیں، میرے افسروں کی نگاہوں میں۔ آپ کے رپورٹ کرنے کے بعد افسروں نے کیا کیا ہوگا؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے عرفان کے بارے میں تحقیقات شروع کر دی ہوں گی اور یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے کہ ان لاشوں کا راز کیا ہے اور کس نے انہیں قتل کیا ہے؟''

''نہیں جناب یہ تو بھول ہے آپ کی۔''

''کیا مطلب؟''

''پولیس نے سب سے پہلے عرفان کو اس بارے میں اطلاع دی اور انہیں بتایا کہ ان کے خلاف رپورٹ درج ہو چکی ہے۔ پولیس آفیسر نے عرفان سے ملاقات کر کے کہا کہ دیوان نے ان پر قتل کا الزام لگایا ہے اور ان کے خلاف اتنے گھناؤنے الزام لگائے ہیں کہ وہ حیران ہیں۔''

''پھر عرفان نے کیا کہا؟''

''یہ ہمیں کیا معلوم؟ ایک معمولی حوالدار کو افسروں کی باتیں کیسے معلوم ہو سکتی ہیں لیکن آپ کو ایک اطلاع دینے آیا ہوں، صبح صبح آپ کو گرفتار کرنے کے لیے یہاں پولیس فورس پہنچے گی۔''

''مم...... مجھے کیوں؟'' ابو نے خوفزدہ لہجے میں سوال کیا۔

''دیوان جی آپ نے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ میں آپ کو ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ آپ فوراً یہاں سے فرار ہو جائیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بہت نیک آدمی ہیں اور آپ نے عرفان کے خلاف جو کچھ کیا ہے، وہ اپنی نیک دلی سے متاثر ہو کر ہی کیا ہوگا لیکن آپ کو نہیں پتا کہ صورتِ حال کیا ہے۔ عرفان جو کچھ بھی ہیں لیکن پیٹھ بڑی مضبوط رکھتے ہیں۔''

''میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''یہ آپ کی مرضی ہے، آپ جیسے ایماندار بیوقوف اسی طرح مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ میرا فرض تھا کہ میں آپ کو اس بات سے

آگاہ کردوں، حالانکہ پولیس کا آدمی ہونے کی وجہ سے مجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اس بات کا مجھے اندازہ تھا کہ آپ کے خلاف جو کچھ کیا جارہا ہے، وہ عرفان کے کہنے پر کیا جارہا ہے اور آپ بے قصور ہیں۔ میں اپنے ضمیر کو، اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے چلا آیا تھا۔ آگے آپ کی اپنی مرضی ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد حوالدار دھانو چلا گیا۔ ابو کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میں نے اور امی نے بھی یہ ساری باتیں سن لی تھیں۔ شمس النہار بے چاری الھڑ تھی، وہ ان باتوں کو کیا جانتی۔ اپنے کمرے میں مزے سے سو رہی تھی۔

ابو امی کی طرف دیکھ کر پُر خیال انداز میں بولے۔ "سنو میری ایک بات سنو۔"

"ہاں بولو۔"

"تم نے سنا دھانو کیا کہہ رہا تھا؟"

"ہاں سن لیا، اچھی طرح سن لیا۔ واقعی تم نے غلط کیا ہے۔"

"ہاں یہ سچ ہے۔ مگر کیا کروں ضمیر سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں اس گناہ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ میں اس کی نوکری نہیں کرسکتا۔ میں مانتا ہوں کہ برسوں سے ہم اسی کا نمک کھاتے چلے آرہے ہیں لیکن اپنے سامنے ظلم ہوتے دیکھ کر میں خود کو نہیں روک سکتا۔ مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی تھا۔ نورون کی ماں، اب کچھ بھی ہو نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

"تو پھر یہاں سے بھاگ چلو۔"

"کیا کہتی ہو، کہاں بھاگ جاؤں؟ کیسے بھاگ جاؤں؟ ایک جرم کی اطلاع دی ہے میں نے۔ خود تو کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں کیوں بھاگ جاؤں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم عرفان سے کیسے ٹکر لے سکتے ہیں بھلا؟"

"خدا تو ہمارا ساتھی ہے البتہ ایک خیال میرے دل میں آیا ہے۔"

"کیا؟"

"دونوں لڑکیوں کو ڈھاکا پہنچا دیں۔ وہاں تمہارے بھائی ان کی دیکھ بھال کرلیں گے۔ ہم صورتِ حال سے ابھی تک واقف نہیں ہیں کہ کیا ہونا ہے؟ کیا ہوگا اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔"

"مگر راتوں رات بچیوں کو ڈھاکا کیسے پہنچادوں؟" امی نے پوچھا۔

"جیسے بھی ہوسکے، کوئی ترکیب کرو، کوئی ترکیب کرو۔"

"اگر تم کہو تو میں ممدو سے کہوں۔ ممدو اپنی بیل گاڑی جوت لے اور لڑکیوں کو ڈھاکا لے جائے۔"

"ہاں...... ہاں ممدو سے بات کرلو، دس پانچ روپے بھی دے دینا اسے، بچیوں کا یہاں سے جانا ضروری ہے اور ممدو سے یہ بھی کہہ دینا کہ

خبردار اس بارے میں کسی کو علم نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے میں ابھی ممدو کے گھر جا کر بات کرتی ہوں۔''

امی باہر چلی گئیں میں پریشانی سے ابو کی شکل دیکھ رہی تھی۔ پھر میں نے کہا۔''ابو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم سب ہی یہاں سے نکل چلیں؟''

''نہیں بیٹا! تُو خود سوچ ایک بُرائی کے خلاف میں نے قدم اُٹھایا ہے۔ میدان چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا۔ جو کچھ بھی خدا کی مرضی ہے دیکھا جائے گا۔''

''مگر ابو۔''

''نہیں بیٹا اگر مگر نہیں۔ اگر تُو کر سکتی ہے تو میری ایک مدد کر۔ اپنی اور اپنی چھوٹی بہن کی حفاظت کرنا، پہلے بھی تو سال سال بھر تُو وہاں رہتی تھی وہیں کے سکول سے تم نے پڑھا ہے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''مگر اچانک......؟''

''ہاں...... ہاں...... میں عشرت کو خط لکھ دوں گا۔ وہ تیری اچھی طرح سے دیکھ بھال کریں گے۔ اپنا زیور وغیرہ سمیٹ لے۔ جا جلدی کر اپنے کپڑے باندھ لے دیر کرنا اچھا نہیں ہوگا۔''

میں تیار ہوگئی۔ کملا کو سوتے سے اُٹھا کر جب یہ بتایا گیا کہ ہم ڈھاکا چل رہے ہیں تو وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ راستے بھر بیل گاڑی میں وہ مجھ سے فضول باتیں کرتی رہی۔ کہنے لگی کہ ابو کو ہم پر رحم کیسے آ گیا۔ انہوں نے ہمیں ڈھاکا بھیجنے کا فیصلہ کیسے کر لیا۔ اب میں اس بیوقوف کو کیا بتاتی کہ صورتِ حال کیا ہے، بہرحال ہم ڈھاکا پہنچ گئے۔

ابو کے بارے میں ساری تفصیلات جو اب بتانے جا رہی ہوں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔

ابو صبح تک انتظار کرتے رہے اور صبح جبکہ سورج بھی نہیں نکلا تھا، پولیس کی گاڑی ہمارے دروازے کے پاس آ کر رُکی۔ پولیس آفیسر باہر آیا اور اس نے دروازے پر دستک دی۔ ابو نے دروازہ کھولا اور پولیس آفیسر کو دیکھ کر سنبھل گئے۔ وہ بے چارے دھانو پر کوئی الزام نہیں دینا چاہتے تھے۔ پولیس آفیسر نے انہیں دیکھ کر کہا۔

''دیوان جی آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''یہ بات تو تھانے چل کر ہی معلوم ہوگی۔''

''عرفان صاحب کو میری گرفتاری کی اطلاع دے دی جائے۔'' ابو نے کہا تو پولیس افسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں...... ہاں دے دی جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ آیئے۔''

ابو کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور تھانے لے جا کر انہیں بند کر دیا گیا۔ ابھی تک ابو کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ عرفان نے انہیں

کس الزام میں گرفتار کرایا ہے۔ ہاں دھانو نے انہیں جو کچھ بتایا تھا، اس کے تحت وہ اتنا جانتے تھے کہ اس گرفتاری میں عرفان کا ہاتھ ہے۔

دوسرے دن ابو کو لاک اپ سے نکال کر تھانیدار کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور تھانیدار نے انہیں بتایا کہ انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔

"قتل...... کیسا قتل؟"

"ثبوت مل چکے ہیں۔ دیوان جی ثبوت مل چکے ہیں۔"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔ براہ کرم مجھے سمجھایا جائے۔" اور جو کچھ انہیں سمجھایا گیا، اس نے ابو کی آنکھیں کھول دیں۔

یہ کچھ تصویریں تھیں جن میں ابو ایک لاش اپنے کندھے پر ڈال کر لے جا رہے تھے۔ جگہ کا اندازہ بھی ہو رہا تھا۔ ابو نے یہ فوٹو گراف فوراً ہی پہچان لیے۔ وہ لاش تھی جو عرفان نے ان کے حوالے کی تھی اور کہا تھا کہ اسے باؤلی میں پھینک آئیں۔ ابو کو روشنیوں کے جھماکے بھی یاد تھے جو ان پر ہوئے تھے اور جس پر وہ غور نہیں کر سکے تھے لیکن فلیش لائٹ والے کیمرے تھے جن کے ذریعے تصاویر لی گئی تھیں اور اس طرح عرفان نے انہیں مکڑی کے جال میں پھانس لیا تھا۔ ان تصاویر کو دیکھ کر ابو ششدر رہ گئے۔ پولیس آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہیے دیوان جی ان تصویروں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟"

"یہ سب کچھ میں نے عرفان کے کہنے پر کیا تھا۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ گویا تم نے عرفان کے جرم کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ لاش کو لے جا کر باؤلی میں پھینک دیا تھا۔"

"مم...... مجھے...... مجھے مجبور کیا گیا تھا۔"

"کمال کی بات ہے۔ مجبوراً جرم نہیں کیا جاتا ہے۔ آپ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک صوفی منش انسان پر الزام لگا رہے ہیں۔ دیوان جی! آپ بھی بال بچوں والے ہیں، اس کے بعد آپ پر یہ وحشت کیوں سوار ہوئی تھی۔ آپ جیسے مجرموں کو تو کتے کی موت مرنا چاہیے۔" افسر بگڑنے لگے۔ ابو کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ واقعی انہوں نے عرفان کے خلاف رپورٹ درج کروائی تھی۔ یہی پولیس افسر تھا جس نے عرفان کے بارے میں کہا تھا کہ وہ تفتیش کرے گا لیکن اسی پولیس افسر نے انہیں گرفتار کر لیا تھا ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ۔

اور اس ثبوت کی تردید ابو کے لیے ممکن نہیں تھی۔ وہ زبانی سب کچھ کہتے رہے لیکن پولیس افسر کے لیے یہ ثبوت ان کی زبان سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ یہ بات سچ ہی تھی۔ ابو کو یہ سب کچھ کہہ کر اپنی بے عزتی ہی کرانی تھی کیونکہ ثبوت ان کے خلاف تھے۔ ابو کو باقاعدہ جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہماری بستی میں یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ ابو کو خوب بُرا بھلا کہا گیا۔ میری امی کو ان کے گھر سے نکال دیا گیا اور اس سلسلے میں تمام کارروائی عرفان کی طرف سے ہوئی۔ عرفان چشم دید گواہ کو نیست و نابود کر چکا تھا۔ ابو کی زندگی کے بارے میں اب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ماما یہ تمام خبریں سن کر حیران رہ گئے تھے۔ "دینک پاکستان" نامی اخبار میں ابو کی تصویر دیکھ کر وہ ہمارے پاس پہنچے اور انہوں نے کہا۔ "نور النہار بیٹا یہ سب کیا ہے۔"

''میں کیا بتاؤں ماما جی! ابو کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہوئی ہے۔''

''مگر یہ تصویر تو سازش نہیں۔ ان میں تو کوئی کیمرا ٹرک بھی نظر نہیں آتا۔'' ماما جی بولے۔

''میں نہیں جانتی خدا کی قسم میں نہیں جانتی۔'' ماما جی پریشان ہو گئے۔ بستی میں پہنچے اور وہاں سے امی کو ساتھ لے آئے۔ امی کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ جس وقت ہمارے پاس پہنچیں، سخت بخار میں مبتلا تھیں اور ہذیان بک رہی تھیں۔ انہیں سمجھانے بجھانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ یہی کہتی رہیں کہ اب ابو کی زندگی نہیں بخشی جائے گی۔ امی کو کچھ ایسی بیماری لگی کہ ہفتہ بھر کے اندر ہی وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئیں۔ ان پر ہمیشہ غنودگی طاری رہتی تھی اور پھر اس واقعہ کے بیس دن بعد ایک صبح امی کی سانس بند ہو گئی۔ ہمارے اوپر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہمارے بھرے پُرے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ میں اور شمسن بُری طرح رو پیٹ رہے تھے۔ ماما جی سب کو چپ کرا رہے تھے لیکن وہ خود بھی بہت پریشان تھے۔ وقت گزرتا گیا۔

ابو پر مقدمہ چل رہا تھا۔ سب کو منع کر دیا گیا تھا کہ کوئی ان کی پیروی نہ کرے۔ پوری بستی میں سے کوئی بھی ابو کے حق میں گواہی دینے کو تیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک ہرکارہ ماما جی کے پاس بھی پہنچ گیا اور عرفان کی طرف سے انہیں یہ پیغام دیا گیا کہ بُرائی کے خلاف انہیں حق کا ساتھ دینا چاہیے اور رشتہ داری کی بنا پر ایک مجرم کو بچانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بیچارے ماما جی ایک سکول ماسٹر تھے۔ ان کی کیا حیثیت تھی کہ وہ ابو کی طرف سے مقدمہ لڑ سکتے۔ نتیجے میں ابو کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔

ہم دونوں بہنوں نے یہ خبر سنی تو ہمارے دل دہل کر رہ گئے۔ اب اس سنسار میں ہمارا کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا ہمارا۔ ماما جی سخت پریشان تھے۔ ہمارا بوجھ ان پر آ پڑا تھا۔ گھر میں جو سامان تھا، اس پر عرفان کی طرف سے قبضہ کر لیا گیا تھا۔ نہ جانے کتنے دن گزر گئے، پھر ایک دن ممدو ہمارے پاس آیا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے آ کر ماما جی کو بتایا کہ بالآخر عرفان کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ دونوں لڑکیاں آپ کے پاس ہیں۔ انہوں نے کسی طرح یہ معلوم کر لیا ہے کہ میں نے ہی انہیں یہاں پہنچایا ہے۔ مجھے پکڑ کر حویلی بلایا گیا اور خوب مار پیٹ کی گئی تو میں نے ساری صورتِ حال اُگل دی...... مگر دیوان جی بڑے رحم دل آدمی تھے۔ ہم پر ان کے بڑے احسان ہیں۔ میں اپنی زندگی کی قیمت پر آپ لوگوں کو یہ بات بتانے آیا ہوں کہ اب نور النہار اور شمس النہار یہاں محفوظ نہیں ہیں۔''

''مگر عرفان کی دشمنی تو دیوان جی سے تھی۔ وہ بیچارے اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی بیٹیوں نے کیا قصور کیا ہے؟''

''آپ سوچ لیجیے سب کچھ آپ پر ہی منحصر ہے۔ اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' ممدو نے کہا۔

''خیر ممدو جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ جیسی خدا کی مرضی۔'' ماما جی نے کہا۔

میں نے ساری باتیں سنیں، میری ذہنی کیفیت ان دنوں بہت خراب تھی۔ امی ابو چلے گئے تھے۔ گھر اُجڑ گیا تھا۔ ہم لاوارثوں کی طرح ماما جی کے گھر پڑے ہوئے تھے۔ یہ تمام چیزیں میرے سینے میں آگ بھڑکاتی تھیں اور میں سوچتی تھی کہ کسی طرح مجھے عرفان سے انتقام لینے کا موقع مل جائے لیکن کمزور ہستی بھلا اس کے خلاف کیا کر سکتی تھی۔ دل ہی دل میں جھلستی رہی اور سوچتی رہی کہ اب کیسے زندگی بتاؤں گی شمسن کی زندگی میرے سامنے تھی۔ ماما جی بیچارے سخت پریشان تھے اور سوچتے رہتے تھے کہ اب ہمارا کیا بنے گا۔ ان بچیوں کو نکالا بھی نہیں جا سکتا اور وہ اپنی زندگی داؤ پر نہیں

لگا سکتے تھے۔ میں ان کی پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ میرا دل جانتا تھا کہ ماما جی کی کیا کیفیت ہے۔ ایک دن ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی اور میں نے ماما جی سے کہا۔

''ماما ایک بات کہوں آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟''

''کہو۔'' انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ان دنوں ان کا رویہ ہمارے ساتھ خاصا سرد ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً وہ سوچ چکے تھے کہ ہم سے نجات پا کر اپنی جان بچا لینی چاہیے۔ ان کا بھی اپنا چھوٹا سا خاندان تھا جو عرفان کی دشمنی کی وجہ سے ختم ہونے والا تھا۔ ایک تباہ شدہ خاندان کا حال دیکھ چکے تھے اور اپنے خاندان کے ساتھ یہ سلوک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں علم تو ہو گیا تھا کہ عرفان یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ دیوان جی کی بیٹیاں ان کے گھر میں ہیں۔ بہرحال وہ میری شکل دیکھتے رہے۔ میں نے ان سے کہا۔

''ماما جی اگر عرفان کے آدمی لینے آئیں تو آپ اس سلسلے میں کوئی تعرض نہ کریں۔ شمسن تو ابھی چھوٹی ہے۔ اسے تو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس کی طرف توجہ بھی نہیں دی جائے گی لیکن اگر وہ مجھے حاصل کرنے آئیں تو آپ منع نہ کریں۔''

ماما جی یہ سن کر چونک پڑے۔ شاید ان کی غیرت جاگ اُٹھی تھی۔ وہ آہستہ سے بولے۔

''نہیں...... نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نور النہار تُو میری بہن کی نشانی ہے۔ میں کیا کروں۔ آہ میں کیا کروں۔ میں غریب سکول ماسٹر ہوں۔ بھلا اتنے بڑے آدمی سے کیسے ٹکر لے سکتا ہے۔ میں جاؤں بھی تو کہاں جاؤں۔ میرے حالات اتنے خراب ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اب ہماری زندگی کیسے گزرے گی۔''

''ماما جی جو کچھ بھی میں کہہ رہی ہوں اسے ذہن میں رکھیں۔ مجھے اگر کوئی لینے آئے تو مجھے چلا جانے دینا۔''

ماما جی خاموشی سے گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگے پھر بولے۔ ''میرا دل نہیں مانتا۔ دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔''

ماما جی خاموش ہو گئے۔ میں اپنے ذہن میں کچھ منصوبے بنا رہی تھی اور اس کے لیے میں نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ تیار کر لیا۔ میں اپنی زندگی دے کر اپنے ماں باپ کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ ایک لمبی سی چھری حاصل کر کے میں نے اپنے لباس میں چھپا لی تھی نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ زندگی اس عمر میں تھی جو نگاہوں کو پہچانتی تھی اور پھر یہ بات ابو سے معلوم ہو چکی تھی کہ عرفان ایک پاپی آدمی ہے اور نوجوان لڑکیوں کا رسیا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تھا اور اپنے دشمن کی بیٹی کو وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ ممدو سے اس نے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ مجھے ڈھاکا پہنچا دیا گیا ہے اور میرا اندازہ غلط نہیں نکلا کہ اسی دن دوپہر کو چند گھوڑے سوار ماما کے مکان پر آئے۔ ماما جی اس وقت سکول سے فارغ ہو کر آ گئے تھے۔ یہ گھوڑا سوار ٹنگائل سے ڈھاکا پہنچے تھے۔ ماما جی ان سے باتیں کرتے رہے اور اس کے بعد ہانپتے ہانپتے میرے پاس آ گئے۔

''عرفان کے آدمی آئے ہیں نور النہار! کہتے ہیں کہ دیوان جی عرفان کے ملازم تھے۔ وہ مر چکے ہیں، ان کی اولاد کی پرورش کرنا عرفان کا کام ہے۔ چنانچہ انہوں نے دونوں کو بلوایا ہے۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟''

''میں پہلے کہہ رہی تھی ماما جی شمسن کو حفاظت سے آپ اپنے پاس رکھیے۔ میں چلی جاتی ہوں۔''

''مگروہ چاہتے ہیں کہ دونوں......''

''میں ان سے بات کیے لیتی ہوں۔'' میں نے کہا اور شمس النہار کا بازو پکڑ کر باہر نکل آئی۔

میں نے ان میں سے اس شخص کو دریافت کیا جو نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ ان میں سے ایک شخص میرے سامنے آ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''شمسن کو میں نے یہاں کے سکول میں داخل کر دیا ہے، وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ بچی ہے تم دیکھ لو۔ عرفان جی کے حضور میں جاتی ہوں۔ میں ان سے بات کر لوں گی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔'' میری بات ان لوگوں نے مان لی اور پھر انہوں نے ہمیں ایک جیپ میں بٹھا کر واپس ٹنگائل بھیج دیا۔

میں دل ہی دل میں رو رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اب میرے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی بدسلوکی کا شکار ہوں، میں اپنی زندگی کی قربانی دینا چاہتی تھی۔ اس خیال سے میں ایک گراری دار چھری ساتھ لے آئی تھی۔

وہ لوگ مجھے لے کر عرفان کے حجرہ میں پہنچ گئے۔ صوفی منش آدمی ایک بوریے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ مجھے اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے میرے عقب میں دیکھا اور آدمیوں سے پوچھا۔ ''اس کی بہن کو نہیں لائے تم؟''

''حضور وہ آٹھ سال کی بچی ہے اور سنا ہے کہ وہاں کے سکول میں داخل ہو گئی ہے۔''

''اوہ...... اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں، ہم اس سے بات کر لیں گے۔'' پھر وہ آہستہ سے بولے۔

''دیوان جی ہمارے نمک خوار تھے اور بڑے اچھے انسان تھے۔ ہمیں ان کی موت کا بڑا افسوس ہے۔ سنا ہے تمہاری ماں بھی مر گئی ہیں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عرفان تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا، پھر بولا۔ ''بہر طور فکر مت کرو، ہم بڑے رحم دل ہیں۔ کسی بھی انسان کو دکھ نہیں دے سکتے۔ تمہاری بہن اگر ڈھاکا میں پڑھ رہی ہے تو پڑھنے دو، تم یہاں رہو۔ اس کے بعد جب وہ بڑی ہو جائے گی تو ہم اسے بھی یہاں بلوا لیں گے۔''

میں نے دل ہی دل میں اسے کوستے ہوئے کہا پاپی اس وقت تک تیرا نام ہی نہ ہوگا جب میری شمسن کو کوئی نقصان بھی پہنچے گا۔ دوسرے لوگ چلے گئے تو عرفان نے کہا۔

''اب تم یہیں اس حویلی میں رہو گی تمہیں رانیوں کی طرح رکھیں گے۔ دیوان جی نے بُرا کیا تھا ہمارے خلاف رپورٹ درج کرانے گئے تھے وہ اور تم خود سوچو جو ہمارا کھاتے ہیں، وہ ہمارے خلاف کیسے کام کر سکتے ہیں۔'' میں نے اب بھی جواب نہیں دیا تو وہ کسی قدر درشت لہجے میں بولا۔

''سنو...... اگر تم مجھ سے نفرت کرتی ہو تو یہ تمہارے حق میں بُرا ہوگا۔ ہمیں چاہو، ہم سے محبت کرو، ہمارے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ زندگی بنا دے گا اور دوسرا لفظ تمہیں اس دنیا سے مٹا دے گا۔''

''میں حضور کی باندی ہوں۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مکاری سے کام لینا ضروری تھا جانتی تھی کہ میری طاقت اس راکھشس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہوشیاری سے کام لینا تھا۔ قربان ہو جانے کا فیصلہ کر چکی تھی تو اب ان ساری باتوں سے کیا حاصل۔ مجھے مکاری سے کام لینا چاہیے تھا تاکہ میں اپنا کام کر سکوں۔ عرفان نے کہا کہ ابھی مجھے ان کے ساتھ یہاں حجرہ ہی میں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ حویلی میں میرے

لیے کوئی مناسب بندوبست کریں گے اور میرا وظیفہ جاری ہو جائے گا اور میں عیش وعشرت کی زندگی گزاروں گی۔

جس حجرے میں مجھے پہنچایا گیا وہ کسی صوفی کا حجرہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو ایک باقاعدہ عیش گاہ تھی جہاں موٹے موٹے قالین بچھے ہوئے تھے۔ دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ پھل برتنوں میں سجے ہوئے تھے۔ عجیب وغریب مجسمے چاروں طرف رکھے ہوئے تھے جو عجیب بے حیائی اور بے شرمی کا مظہر تھے۔ ایک بڑی سی مسہری ایک طرف پڑی ہوئی تھی جس پر بڑا موٹا سا گدا تھا۔ اوپر فانوس لگے ہوئے تھے۔

میں نے اس عیش کدے کو دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا کہ لوگ پاپی عرفان کو ایک صوفی سمجھتے ہیں۔ اگر یہاں آ کر اس کی رہائش گاہ دیکھ لیں تو صورتِ حال ان پر کھل جائے لیکن اتنے بڑے آدمی پر یہ الزام کون لگا سکتا تھا۔ کون اس کی اس عیش گاہ تک پہنچ سکتا تھا اور پھر ابو کے کچھ اور الفاظ بھی مجھے یاد تھے۔ عرفان اپنی جگہ محدود نہیں تھا۔ اس کی زمینداری ڈنگال تک محدود نہیں تھی بلکہ ابو کے کہنے کے مطابق کچھ روپیہ باہر سے بھی آتا تھا لیکن کہاں سے، اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ چنانچہ اس شخص کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا تھا کہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور اسے مارنا آسان کام نہیں ہوگا۔ مجھے مکاری سے کام لینا ہوگا۔ تاکہ میں اس راکھشس پر قابو پا سکوں۔

میں اس حجرے میں بیٹھی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دو عورتیں آئیں۔ وہ اچھی خاصی قد وقامت کی تھیں۔ چہرے ہی سے فاحشائیں معلوم ہوتی تھیں۔ ان کا اندازِ گفتگو بھی بڑا واہیات تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں اور پھر ان میں ایک نے مجھ سے شرمناک گفتگو شروع کر دی۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں نے زندگی میں کسی لڑکے سے محبت تو نہیں کی؟ کوئی میرے بالکل قریب پہنچا یا نہیں؟

میں نے ان پر لعنت بھیجی اور ان سے کہا کہ وہ عورت ہیں۔ عورتوں کی حیاء اپنے پاس رکھیں جس پر وہ دونوں میرا مذاق اُڑانے لگیں اور پھر بولیں۔

''ہاں......ہم عورت ہیں اور اپنی ساتھی عورتوں میں اضافہ دیکھنا چاہتی ہیں چلو تمہیں دلہن بنا دیں۔''

''کیا بکواس کرتی ہو؟ کیسی دلہن؟''

''آ جاؤ اچھے کپڑے پہن کر اچھی شکل بنا کر تم حسین لگو گی۔ ویسے بھی بڑی حسین ہو اگر دل موہ لیا تو شاید، تو شاید وہ کچھ نہ ہو جو ہوتا آ رہا ہے۔''

میں ان کی باتوں کا مطلب سمجھ رہی تھی لیکن انجان بن رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ وہ یہ کہ میں اس چھری کو کسی طرح چھپا دوں۔ چنانچہ اس وقت بالکل موقع نہیں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ذرا باتھ روم جانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی۔

تھوڑے ہی فاصلے پر باتھ روم تھا۔ اس وقت اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں یہ چھری باتھ روم میں کسی مناسب جگہ چھپا دوں کیونکہ وہ میرا لباس تبدیل کرانے کے لیے تیار تھیں اور لباس تبدیل کرانے کی صورت میں چھری کا دوسروں کی نگاہوں میں آ جانا لازمی تھا۔

باتھ روم میں پہنچ کر میں نے ایک مناسب جگہ تلاش کی، ایک دراڑ سی نظر آ گئی اور چھری کو میں نے اس خلا میں رکھ دیا۔ میں اس چھری کو باآسانی دوبارہ حاصل کر سکتی تھی۔ یہاں پاس میں صرف ایک باتھ روم تھا جس کی وجہ سے مجھے اطمینان تھا کہ میں دوبارہ بھی یہاں آ سکتی ہوں۔

بہر طور چند منٹ کے بعد واپس آ گئی اور انہوں نے ایک حسین لباس پہنا دیا۔ میرے چہرے پر لالی لگائی گئی۔ طرح طرح سے مجھے سنوارا

گیا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور اس کے بعد میں دلہن بن کر بیٹھ گئی۔

میں اپنی تقدیر کو کوس رہی تھی۔ دل میں نہ جانے کیا کیا تھا لیکن تقدیر نے یہاں لا چھوڑا تھا جو ایک بن بیاہی دلہن کی خوابگاہ تھی اور پھر وہ منحوس راکھشس میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ منہ سے شراب کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ آنکھوں میں شیطانیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

''پہلی ہی نگاہ میں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ واہ...... دیوان جی مر گئے لیکن ایک ایسا انعام ہمیں دے گئے کہ انہیں ہم عرصے تک نہیں بھول سکیں گے۔''

میں نفرت بھری نگاہوں سے اس منحوس انسان کو دیکھتی رہی۔ اسے بدترین سبق دینا چاہتی تھی۔ دل میں طوفان اُٹھ رہے تھے لیکن ان طوفانوں کو دبانا ضروری تھا۔ جلد بازی کام بگاڑ دے گی۔ میں نے خود کو سنبھال لیا۔

''تم اتنی حسین کیوں ہو؟''

''میں کیا جانوں؟'' میں نے کہا۔

''دیوان جی عجیب آدمی تھے۔ کیا کمی تھی انہیں ہمارے ہاں؟ آرام سے زندگی گزار رہے تھے۔ معاشرے کی من میں آئی اور ہم سے دشمنی باندھ لی۔ فکر مت کرو وہ نہیں ہیں ہم تو ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے جیتے جی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ یہاں رہ کر تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں۔''

''کسی نے کوئی اُلٹی سیدھی بات تو نہیں کی۔''

''بالکل نہیں۔''

''ہمارا کہا مانتی رہو تم دیکھو گی کہ سب تمہارا حکم مانیں گے۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔''

میں بے سہارا رہ گئی ہوں۔''

''ارے حسینہ! ہم جو تمہارا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ ہم پر پورا پورا اعتماد کر سکتی ہو۔ ہمارے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''والد کے برابر۔ میں آپ کو اپنے ابو کی طرح سمجھتی ہوں۔'' میں نے ایسے حالات میں بھی اپنی بھڑاس نکالنے میں کمی نہ کی۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔

''کیا کہتی ہو ذرا غور سے دیکھو ہمیں۔ اچھی طرح غور کرو ہم پر ہم تمہارے والد تو کہیں سے نہیں لگتے۔ ہم تو تمہارے چاہنے والے ہیں، چاہتے ہیں تمہیں۔''

''آپ جو کچھ بھی کہیں میرے دل میں آپ کے لیے یہی جگہ ہے۔''

''بکواس مت کرو بیوقوف لڑکی! یہ الفاظ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔''

''حقیقت تو کہنا ہی ہوگی آپ جو کچھ بھی سمجھ لیں۔''

''میں کہتا ہوں کہ بکواس مت کرو، کمبخت، ذلیل، تُو نے میرا سارا موڈ چوپٹ کر دیا ہے۔'' عرفان جھلایا ہوا حجرے سے باہر نکل گیا۔ دل ہی دل میں، مَیں نے سوچا کیا اس طرح میری زندگی بچ سکتی ہے؟ امید نہ تھی جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد جن حالات میں اس کمینہ صفت آدمی کے پاس پہنچی تھی کیا یہ اتنی آسانی سے مجھے نکل جانے دے گا۔

رات گزر گئی دوسرا دن بھی خاموشی سے گزر گیا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو میرے لیے تکلیف دہ ہوتی لیکن دوسری شام ایک تقریباً سوکھا سڑا آدمی میرے پاس پہنچا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ آنکھوں میں مکاری چمک رہی تھی۔ میرے نزدیک بیٹھ کر وہ بڑے پیار سے بولا۔ ''بیٹا نور النہار ہے تمہارا نام؟''

''تم کون ہو؟''

''ہمدرد ہیں تمہارے۔ کیا بتائیں بیچارے دیوان جی سے ہماری کیسی دوستی تھی۔ بچپن کے دوست تھے ہم دونوں۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''غنی۔''

''بہر طور کہو غنی مجھے کیا کرنا ہے۔ کیا کہنے آئے ہو؟'' میں نے کہا۔ دل ہی دل میں، مَیں نے اندازہ لگایا تھا کہ غنی دراصل عرفان کا آدمی ہے ورنہ وہ ابو کا کوئی دوست ہوتا تو ابو کی زبانی کم از کم اس کا نام ضرور سنتی اور اس کی شکل سے بھی یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ایک مکار صفت آدمی ہے اور کسی خاص مقصد کے تحت ہی یہاں آیا ہے۔

''بیٹا دیوان جی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ تمہاری امی بھی مر چکی ہیں۔ بہن ہے تمہاری ایک چھوٹی۔ کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ تمہاری بہن آرام سے زندگی گزارے۔ پڑھے لکھے، عیش کرے۔ بولو کیا تمہارا دل نہیں چاہتا؟''

''اپنے مطلب کی بات کرو۔''

''میں نے سنا ہے کہ تم نے حضور جی کو ناراض کر دیا ہے۔ بیوقوف ہو تم بڑے بڑے لوگ یہ خواہش کرتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں حضور جی کی نظر حاصل کر لیں اور تم ہو کہ انہیں پریشان کر رہی ہو۔ میری مانو تو بیٹا انہیں خوش کر دو جیسا وہ کہیں ویسا کرو، انہیں بے کار باتوں سے ناراض مت کرو۔''

''ہوں...... تمہاری کوئی بیٹی ہے۔''

''نہیں ہے۔''

''تو پھر تم سے کچھ کہنا ہی بے کار ہے جاؤ دفع ہو جاؤ میری نگاہوں سے۔''

''مگر بیٹا......''

''میں کہتی ہوں جاؤ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ......''

''سوچ لو بیٹا اچھا نہیں ہوگا تمہارے حق میں اور تمہاری بہن کے حق میں۔''

''جو کچھ ہوگا، وہ میری تقدیر ہوگی۔تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، خبیث بڈھے۔''میں نے پاؤں کی جوتی اُتاری اور بُری طرح اس کے منہ پر دے ماری۔خاصی زوردار ضرب تھی اس کا ہونٹ کٹ گیا اور وہ جلدی سے بھاگ کھڑا ہوا۔دروازے پر رُک کر اس نے مجھے گھورا اور کہنے لگا۔

''تُو یہ سوچ لے کہ تُو اپنی تقدیر پر سیاہی پھیر چکی ہے اور اب جو کچھ ہوگا اسے بھگتنے کے لیے تیار ہو جا۔''

''جاتا ہے یا دوسری جوتی اُتاروں۔''میں نے کہا اور دوسری جوتی اُٹھائی تو وہ ایسا غائب ہوا کہ پھر نظر نہ آیا۔میں خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

رات کو دس سوا دس بجے کے قریب عرفان شراب کے نشے میں دھت میرے کمرے میں پہنچ گیا۔آج وہ اپنے حواس کھو کر آیا تھا۔چنانچہ میرے تمام الفاظ اس کے سامنے بے اثر تھے۔میں نے پھر اسے اپنے والد کے برابر کہا تو وہ ہنس کر بولا۔

''نہیں میں صرف اس کا باپ ہوں جو میری بیوی کی کوکھ سے پیدا ہوگی، باقی اور کسی کا باپ نہیں ہوں میں۔ بیوقوف مت بنا مجھے لڑکی تُو مجھے بیوقوف مت بنا۔''میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ آج اپنے تمام احساسات شراب میں ڈبو کر آیا ہے اور اب میرے لیے زیادہ خطرناک ہوگیا ہے۔اس کی چیرہ دستیاں بڑھتی چلی گئیں تو میں نے کہا۔

''میں ابھی آتی ہوں۔''

''کہاں جارہی ہو؟''

''ذرا باتھ روم تک۔''میں نے کہا۔

''اوہ......اچھا اچھا ضرور جاؤ ہم انتظار کرلیں گے۔''

باتھ روم میں پہنچ کر میں نے وہ چھری نکالی جو اس وقت میری ہمدرد و معاون تھی۔اس چھری کو میں اپنے لباس میں چھپائے اندر آگئی اور عرفان کے سامنے بیٹھ گئی وہ شیطان میرے سامنے سینہ چوڑا کیے بیٹھا تھا۔اس خبیث انسان کی شکل دیکھ کر کراہیت ہورہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا ہمت کی اور اس کے نزدیک پہنچ گئی عرفان کی بے باکیاں بڑھ گئیں تو میں احتیاط سے اس کے پیچھے پہنچی اور چھری اپنے لباس سے نکال لی پھر اس کا دستہ پکڑ کر پوری قوت سے اس کی پشت میں بھونک دیا۔اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔میں چاہتی تھی کہ چھری کھینچ کر اس پر تین چار وار اور کردوں لیکن کسی نے مجھے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔میری ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگی تھی اور مجھے ایک لمحے کے لیے زمین اور آسمان گھومتے دکھائی دیئے اس کے بعد میری نگاہوں میں تاریکی چھا گئی۔میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

ہوش آیا تو میں ایک ایسی جگہ پڑی تھی جہاں زمین پر کچھ نہیں تھا۔سامنے دیوار میں سلاخیں نظر آرہی تھیں اور چاروں طرف ایک مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔چند لمحے حالات کا انتظار کرتی رہی اور دفعتاً مجھے گزرے ہوئے واقعات یاد آئے تو میں اُچھل کر بیٹھ گئی۔موٹی موٹی سلاخوں اور اس میں لگے تالے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ میں کسی قید خانے میں قید ہوں۔میں نے عرفان پر چھری سے حملہ کیا تھا۔آہ

کاش میں اس کے پورے بدن کو اس طرح کاٹ سکتی جس طرح آلو کے ٹکڑے کاٹے جاتے ہیں لیکن میری بانہوں میں اتنی قوت نہیں تھی۔ کمبخت نے اپنے آدمیوں کو پہلے سے مستعد کر رکھا تھا اور وہ عیاش طبع لوگ اس کی خلوتوں میں موجود رہتے تھے۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔ کاش وہ مر گیا ہو میں نے دل ہی دل میں سوچا لیکن یہاں کوئی موجود نہیں تھا جس سے میں عرفان کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی۔

سلاخوں والے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر کی سمت دیکھا ایک چوڑا سا کمرا نظر آیا جس کی دوسری طرف ایک دروازہ تھا میری آواز اس دروازے سے باہر نہیں پہنچ سکتی تھی کیونکہ کمرا خاصا وسیع تھا اور دروازہ مضبوط تھا۔ تھک ہار کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھی اور اپنے حال پر غور کرنے لگی۔ تقدیر نے مجھے بیابان میں لا پھینکا تھا اور اب نہ جانے کون سے راستے مجھے دکھانے والی تھی۔

بھوک پیاس سے تڑپتے آٹھ گھنٹے گزر گئے۔ ان آٹھ گھنٹوں میں، مَیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی تھی زندگی بچانا تو ٹھیک ہے میں بھلا ان حالات کا مقابلہ کر سکوں گی۔ مجھے کیسے کیسے واقعات سے سابقہ پڑے گا۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ موت مجھے اپنا لے۔ خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی ہمت نہیں تھی لیکن مر جانا چاہتی تھی۔ کاش کوئی مجھے قتل کر ڈالے میرے دل میں یہی آرزو تھی۔ عرفان کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہو سکا تھا۔ اس دوران کوئی یہاں آیا ہی نہیں تھا لیکن نویں گھنٹے پر دروازہ کھلا اور کچھ لوگ سلاخوں والے دروازے کے قریب آتے نظر آئے۔ ان میں دو آدمی تھے اور ایک عورت۔ عورت کی عمر تقریباً چالیس یا پینتالیس سال تھی۔ چہرے ہی سے خوفناک لگتی تھی۔ میرے سامنے آ کر رکی اور مجھے خونی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اس عورت نے غراتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”لو یہ کھانا کھا لو۔ جو کچھ تم نے کیا ہے، اس کا تم کو بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

میں نے نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔ ”یہ بتاؤ کہ عرفان بچ گیا یا مر گیا؟“

”چلو۔“ اس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ اس نے میرے سوال کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ کھانے کی ٹرے وہ سلاخوں والے دروازے کے پاس رکھ گئی تھی۔ میں اس میں سے صرف ہاتھ نکال کر کھانا کھا سکتی تھی۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ عورت کی کیفیت دیکھ کر مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور یقیناً عرفان کی قریبی ساتھیوں میں سے ہے۔

کھانے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی لیکن جب مزید وقت گزر گیا تو میں نے سوچا کہ بغیر کھائے پیئے زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ جب تک سانسوں کی تار ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہے، مجھے زندگی کی وہ تمام ضرورتیں پوری کرنی پڑیں گی جو انسان کا مقدر کر دی گئی ہیں لیکن کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جو امید کی کرن دکھاتا۔

میں نے بیچارگی کے عالم میں سلاخوں سے ہاتھ نکال نکال کر کچھ چیزیں معدے میں بھریں اور زمین پر جا کر لیٹ گئی۔ زندگی کے گزرے ہوئے لمحات یاد آنے لگے۔ بڑا تحفظ حاصل تھا ماں باپ کی زندگی میں، لیکن اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کائنات میں دشمنوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ کیا ہوگا، کیا ہونے والا ہے میرا؟ کاش اس کمبخت عرفان کے بارے میں پتا چل جاتا کہ وہ جیتا ہے یا مر گیا۔ چھری تو دستے تک اس کے بائیں شانے کے نیچے پیوست ہو چکی تھی، یقیناً پسلیوں کے جوڑ سے اندر گھس گئی ہوگی۔ کیا اس کے بعد بھی وہ بچ سکے گا؟

بہرحال اس سوال کا جواب مجھے کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ دوسرا دن، تیسرا دن اور پھر بہت سے دن گزر گئے۔ قید خانے میں پڑے پڑے میرے ہاتھ پیر شل ہوگئے تھے۔ کبھی کبھی خون کی گردش رُکنے لگتی تو اسی قید خانے میں اٹھک بیٹھک لگا لیتی۔ کھانے پینے میں بھی میں نے تکلف سے کام لینا چھوڑ دیا تھا۔ لباس میلا چیکٹ ہوگیا تھا۔ بالوں میں میل جمع ہوگئی تھی اور سر بھاری بھاری ہو رہا تھا۔

لیکن کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ میں اپنے وجود کو ان غلاظتوں سے پاک کرتی۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہاں قید کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ کھانا لاتے، وہ میرے کسی سوال کا جواب نہ دیتے تھے۔ وہ بدقماش عورت ہمیشہ ان کے ساتھ آتی تھی اور میری طرف کڑی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی۔ کئی بار میں نے اس سے سوالات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نفرت سے منہ پھیر کر واپس چل پڑتی۔

مجھے اندازہ نہیں رہا کہ مجھے یہاں کتنے دن ہوگئے تھے۔ غالباً مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا۔ اب میری حالت وحشی جانوروں جیسی ہوگئی تھی۔ تب ایک دن میری تقدیر میں کچھ تبدیلی رُونما ہوئی۔ اس وقت اس عورت کے ساتھ دو مردوں کے علاوہ کچھ عورتیں بھی تھیں لیکن آج وہ کھانا نہیں لائے تھے۔ مجھے روزانہ کھانا دینے والی عورت نے کہا۔

''چلو باہر نکلو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے دروازے کا تالا کھول دیا۔ میں وحشت زدہ سی باہر نکل آئی۔ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' اس نے جواب دیا اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے چل پڑی۔ وہ عورتیں جو اس کے ساتھ آئی تھیں، مجھے آگے دھکیل رہی تھیں۔ پتا نہیں یہ فرق کیوں رکھا گیا تھا اگر مرد ہی مجھے گھسیٹ کر لے جاتے تو کوئی ایسی بات نہ ہو جاتی۔ یہاں کون سی میری قدر کی جا رہی تھی۔

وہ لوگ مجھے لیے ہوئے ایک کمرے میں آئے۔ کشادہ اور آرام دہ کمرا تھا۔ یہاں ضروریات کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ تب اس عورت نے اشارہ کیا۔

''جاؤ غسل کرلو۔''

میں غسل کرنے کے لیے بے چین تھی۔ جو حالت ہو رہی تھی، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اندر داخل ہو کر میں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور پھر لباس اُتار کر نل کے نیچے بیٹھ گئی۔

میں نے اپنے بدن سے ایک ڈیڑھ ماہ کی غلاظت اُتاری تو یوں محسوس ہوا جیسے نیا جنم لیا ہو لیکن لباس...... اس میلے اور چیکٹ لباس کو پہننے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور وہی عورت اندر داخل ہوئی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے تو دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اس قسم کا لاک ہے جسے باہر سے بھی کھولا جا سکتا ہے۔

میں اسے دیکھ کر اپنا بدن چرانے لگی تو وہ ایک مکروہ سی ہنسی ہنس دی۔

''لو بی بی کپڑے پہن لو۔ کپڑے لائی ہوں تمہارے لیے۔'' اس نے کہا۔ سلک کا ایک ریشمی لباس تھا۔ مجھے اس وقت دوسرے لباس کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ لباس اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر اپنے آپ کو اس میں چھپا لیا۔ عورت ہنستی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ اس

مہربانی کی وجہ میری سمجھ میں آ رہی تھی لیکن کیا وہ کمبخت ٹھیک ہو گیا؟ عرفان زندہ ہے؟ کاش...... مجھے اس بات کا جواب مل جاتا۔

لیکن اس میں بھی زیادہ دیر لگی۔ کمرے میں واپس آئی تو کمرے کا دروازہ باہر سے بند پایا۔ گویا فی الوقت مجھے یہاں تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھی اپنی تقدیر پر آنسو بہاتی رہی۔ یہ سوچتی رہی کہ اب میرے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ رات ہو گئی۔ اس وقت تقریباً دس بجے تھے۔ وہی عورت اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ریشمی لباس تھا۔ یہ انتہائی باریک کپڑے کا لباس تھا اور اسے جسم ڈھانپنے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''لو یہ لباس پہن لو۔''

''یہ...... یہ......'' میں نے کہا۔

''اٹھو۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔

میں اس باریک کپڑے کے لبادے کو نہیں پہننا چاہتی تھی۔ ''میں اس لباس میں ٹھیک ہوں۔''

''میں کہتی ہوں اُٹھ جاؤ، مجھے تشدد کرنے پر مجبور نہ کرو۔''

''مگر سنو تو سہی۔ سنو تو سہی۔'' میں نے کہنا چاہا لیکن دوسرے لمحے اس نے میرے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے اور مجھے اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔

''اگر وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتی ہو تو جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہی کرو۔''

''لیکن اس لباس میں مجھے غیرت محسوس ہو گی۔''

''جو کچھ بھی ہو، یہ پہننا ہے تمہیں۔'' اس نے کہا۔ میں نے مزید تعرض کیا تو دفعتاً اس نے میرے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور میرا لباس نیچے تک پھاڑ دیا۔ اس لباس کے نیچے کچھ نہ تھا۔ میں غیرت سے زمین میں گڑ گئی۔

لیکن اس وحشی عورت نے رحم کھانے کی بجائے مجھے ایک گھونسا مارا اور میں نیچے گر پڑی۔ تب اس نے زبردستی میرا یہ لباس اُتار دیا اور مجھے وہ لبادہ پہننے کے لیے کہا۔ ریشمی لبادہ پہننا نہ پہننا برابر ہی تھا۔ دھوئیں کی طرح اس کی کیفیت تھی۔ مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں کوئی لباس پہنے ہوئے ہوں۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور ایک بار پھر میں سہم گئی۔

''کک...... کہاں...... کہاں۔''

''آؤ میں کہتی ہوں۔ آؤ...... میرے ساتھ کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس کی وجہ سے مجھے تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنی پڑے۔''

میں سمجھ گئی تھی کہ اب اس کے ساتھ جانا ہی ہے۔ ویسے بھی کمبخت دیو قامت عورت تھی۔ پتا نہیں کون سی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ بہرحال وہ مجھے لیے ہوئے ایک راہداری میں آگے بڑھی۔ یہی شکر تھا کہ اطراف میں کوئی موجود نہ تھا۔ راہداری بائیں سمت گھوم گئی تھی۔ کافی طویل راہداری تھی جس کا اختتام ایک دروازے پر ہوا تھا۔

''جاؤ...... دوسری طرف تمہاری آرام گاہ ہے۔'' اس نے کہا اور میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر جلدی سے دروازہ کھول

کر اندر داخل ہوگئی۔

دوسری طرف مکمل طور پر اندھیرا تھا۔ اس تاریکی میں عجیب سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ آوازیں کسی قدر گہرائی سے آرہی تھی، میں نے متعجبانہ انداز میں دیکھا لیکن کچھ سجھائی تو کیا دیتا البتہ دروازہ باہر سے بند ہوگیا تھا۔ میں دروازہ پیٹنے لگی تھی۔

''دروازہ کھولو۔ یہاں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ کیا جگہ ہے؟'' لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ البتہ دوسرے لمحے کمرے میں اتنی تیز روشنی پھیل گئی کہ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بے پناہ قہقہے فضا میں بکھر گئے۔ ان قہقہوں کو سن کر میرا خون رگوں میں منجمد ہوگیا تھا۔ یہ کون لوگ ہیں، یہ دیکھنے کے لیے میں نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولیں تو اپنے اطراف مخصوص قسم کی نشستیں لگی ہوئی پائیں۔ بہت ساری نشستیں لگی ہوئی تھیں اور لوگ ان پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن یہ کون لوگ تھے؟ دیہاتی، جاہل قسم کے لوگ جن کے چہروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ وہ ان نشستوں پر بیٹھے میری جانب نگراں تھے۔ میں شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ میں بُری طرح بوکھلاگئی اور زمین پر بیٹھ گئی۔ میرے اس طرح بیٹھنے سے وہ لوگ پھر ہنس پڑے تھے۔

دفعتاً ایک کونے سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا۔ سر پر بڑی سی چوٹی جھول رہی تھی۔ ہاتھ میں ہنٹر تھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے ہنٹر زمین پر مارا اور غراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کھڑی ہوجاؤ۔''

''کیا مطلب؟ میں......مم۔''

''چلو۔'' اس نے مجھے گردن سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا آگے لے گیا۔ چند لمحات کے بعد میں ایک دائرے میں پہنچ گئی جس کے گرد یہ تمام لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے قبل میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ دفعتاً میری نگاہ سامنے کی طرف اُٹھ گئی۔ سامنے میں نے جس شخص کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر میری ساری رگوں کا خون منجمد ہوگیا۔ میرے بدن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میرے اعصاب شل ہوگئے۔ یہ عرفان تھا۔ وہ ایک زرنگار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اوپری بدن پر کوئی لباس نہ تھا۔ البتہ نچلے بدن پر اس نے مخصوص لباس پہنا ہوا تھا۔ سینے سے پشت تک ایک پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کمبخت بچ گیا ہے۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے چابک والے شخص سے کہا۔

''دھرما۔ یہ لبادہ اس کے بدن پر کیوں ہے؟''

''معافی چاہتا ہوں مالک۔'' ہنٹر والے نے کہا اور دوسرے لمحے میرا دھواں جیسا لبادہ کسی کاغذ کی طرح پھٹ کر میرے بدن سے اُتر گیا۔ میری ایسی بے عزتی ہوگی، میں نے کبھی خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ قہقہے تیز ہوگئے اور اس کے بعد وہ کچھ ہوا جس کا کوئی شریف زادی تصور بھی نہیں کرسکتی۔

مجھے ایک اونچے چبوترے پر لٹا دیا گیا تھا۔ سر اور پیر کی طرف چار میخیں تھیں۔ داہنا ہاتھ داہنی میخ سے بایاں ہاتھ بائیں میخ سے باندھ دیا گیا۔ اسی طرح پیروں کو بھی باندھ دیا گیا۔ میں بالکل بے بس ہوگئی تھی۔ ہال میں پھر سے اندھیرا کردیا گیا تھا، صرف موم بتیاں جل رہی تھیں۔ خوفناک خاموشی اور سکوت میری روح کو بُری طرح چاٹ رہا تھا۔ اعصاب شکن اور پُراسرار قسم کی خاموشی میرے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر کسی انجانے خوف نے مجھے چیخنے سے بھی باز رکھا ہوا تھا۔

مزید آدھا گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک ہی حالت میں لیٹے لیٹے اعضاء شل ہو گئے تھے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ نہایت ہی پُراسرار انداز میں سردی بڑھ رہی ہے۔ ہر گزرنے والے منٹ کے ساتھ روشنی میں کمی اور تاریکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ موم بتیوں کے شعلوں کی اونچائی بھی غیر محسوس انداز میں کم ہو رہی تھی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کمرے کے جنوبی گوشے کی طرف سے تیز سرد ہوا چلنے لگی پھر تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہر سمت سے سرد ہوا کے جھونکے آ رہے ہوں۔ گویا ہر طرف بے شمار پنکھے لگے ہوئے ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سردی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر کار موم بتیوں کے لرزاں شعلے تیز جھونکوں کی تاب نہ لا کر اچانک بجھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی پورا کمرا ہولناک تاریکی میں ڈوب گیا۔ میرا دل نامعلوم خطرات کے احساس سے بُری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی اور گلا خشک ہو چکا تھا۔ تبھی میری نظر ایک تاریک گوشے پر ٹھہر گئی۔ وہاں تاریکی میں کوئی سایہ حرکت کر رہا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس خطرے کی طرف دیکھنے لگی۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس تاریک سائے کے وجود میں سے سفید نیلگوں روشنی کی ہلکی شعاعیں خارج ہونے لگیں۔ کسی حد تک اس کے خطوط واضح ہو گئے تھے۔ وہ نہ تو کوئی انسانی جسم تھا اور نہ کوئی جانور۔ اس کا عجیب و غریب جسم تھا جس کا نہ چہرہ نظر آ رہا تھا اور نہ آنکھیں۔ اس کے جسم پر سنہری رنگ کے منتشر بال ہلکی دودھیا روشنی میں سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ کمرا وہاں بیٹھے افراد کے ورد کی بھنبھناہٹ سے گونج رہا تھا پھر تھوڑی سی دیر میں وہ کمرا ایک ناقابلِ برداشت بدبو سے بھر گیا۔ اس قدر تعفن تھا جیسے کوئی جانور سڑ رہا ہو۔ سڑاند سے میری ناک پھٹنے لگی۔ زندگی سے تو مایوس ہو ہی چکی تھی۔ اس عذاب سے مزید گھبرا گئی۔ جب انسان ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو پھر اسے صرف ایک سہارا نظر آتا ہے۔ میں کوئی مذہبی لڑکی نہ تھی مگر اس وقت میں صرف اللہ ہی اللہ کر رہی تھی۔ صدق دل سے اپنے پیدا کرنے والے کو پکار رہی تھی۔ مجھے یقین تھا، بندہ کتنا ہی بڑا گنہگار کیوں نہ ہو، اگر توبہ کر لے، صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ کو پکارے تو وہ اس کی ضرور سنتا ہے۔ اسی یقین کے سہارے میں پالنے والے سے مدد طلب کر رہی تھی۔ شاید وہ قبولیت دعا کا وقت تھا یا پھر میری زندگی کے ایام باقی تھے۔ یکا یک ہی دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا اور تیز روشنی اندر در آئی۔

دروازے پر ایک فقیر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی پیڑ کی ڈالی تھی۔ عجیب سی سوکھی ہوئی ڈالی بالکل کسی سانپ کی طرح لہراتی ہوئی ڈالی۔ اُسے دیکھ کر وہاں بیٹھے سب کے سب چونک گئے۔

''وہ خوب گورے، بھرے بھرے بدن کے تھے؟'' میں نے فوراً نورالنہار سے پوچھا۔

''ہاں...... ہاں...... خوب گورے، اچھے تن و توش کے۔ بال اور داڑھی سفید تھی۔'' نورالنہار نے جواباً بتایا۔

''یقیناً وہ فقیر بابا ہوں گے پھر انہوں نے کیا کیا؟''

''انہیں دیکھ کر ہی سب کے سب خوفزدہ ہو گئے تھے۔ کمرے کے کونے میں نظر آنے والا سایہ جس کے وجود سے بدبو اُٹھ رہی تھی، وہ انہیں دیکھتے ہی رفو چکر ہو گیا تھا اور تب عرفان کے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے زور زور سے کچھ پڑھتے ہوئے ان پر کوئی چیز پھینکی تھی جسے ان صاحب نے اپنی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی سے روکا تھا اور گرج کر بولے تھے۔ ''شیطانو! تم کیا سمجھتے ہو میں اندھا ہوں؟ تم نے اس علاقے کے

نگراں کو دھوکا دے دیا؟ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔''

''بھاگ جاؤ ورنہ فنا کردوں گا۔'' عرفان دھاڑا تھا۔

''فنا کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ باطل کو مٹنا ہے، مٹ کر رہے گا اور تمہیں مٹانے کے لیے ہی میں آیا ہوں۔ اگر اس لڑکی کو لے جانے میں مزاحم ہوئے تو میں تم سب کو مٹا دوں گا۔'' ان صاحب کی آواز میں رعب تھا۔ دبدبہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آئے پھر مجھ سے کہا۔

''تونے قرآن نہیں پڑھا ہے کیا؟ چاروں قل پڑھ۔''

بس میں نے چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھی تو مجھے ایسا لگا جیسے میں ہوا میں اُڑ رہی ہوں کچھ دیر بعد مجھے ایسا لگا جیسے میرے ہاتھ پیر آزاد ہوگئے ہوں۔ میں نے چھلانگ لگائی اور اس چبوترے سے اُتر آئی۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں بھاگتی چلی گئی۔ حُسنہ آپا! یقین کریں میں چند گھنٹے کی دوڑ میں اس حویلی سے بہت دور نکل آئی تھی بلکہ بنگال سے کوسوں دور ڈھاکا کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ یہ ناممکن سی بات ہے مگر ایسا میرے ساتھ ہوا ہے۔ تب سے اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ میں کیا کروں۔ آپ کو سرکس میں دیکھا تو خیال آیا آپ سے مدد لوں۔ آپ جب اتنی بڑی بڑی موٹر کار کو اُٹھا لیتی ہیں تو اس بدذات عرفان سے بھی آپ بدلہ لے سکتی ہیں۔ یقیناً وہ سفلی علم کررہا ہے۔ اس کا قلع قمع کرنا ضروری ہے ورنہ وہ بہت بڑا خطرہ بن جائے گا۔'' نورالنہار اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

مجھے کہیں نہ کہیں سر چھپانے کی جگہ تلاش کرنا تھی۔ اس لیے میں فوراً راضی ہوگئی کہ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ مگر تم کہاں رہ رہی ہو؟

''میں ڈھاکا یہ سوچ کر آئی تھی کہ ماما کے ہاں جاؤں گی مگر ہمت نہیں ہورہی ہے۔ ایک کم عقل بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ دشمن کے گھر میں وقت گزارنے والی نوجوان لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ میں ان لوگوں سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کرپائی ہوں۔''

''انسان کا ہر فعل اس کی قسمت کا تابع ہے۔ جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا تھا، وہ ہوگیا۔ آخر اس میں تمہارا قصور کہاں ہے اس لیے چلو میرے ساتھ۔'' کہہ کر میں اسے اس کے ماما کے ہاں میرپور لے آئی۔ سرکس کو عمران کے بھروسے پر چھوڑ آئی تھی۔ کیونکہ عمران کے اندر شوروپری کی روح تھی۔ وہ بخوبی سرکس کو سنبھال سکتی تھی۔

میرپور آکر مجھے خوشی ہورہی تھی۔ یہ میرا محلہ تھا۔ یہیں میرا بچپن گزرا تھا۔ اپنی گلیوں میں آکر آنکھ بھر آئی۔ میں نے نم آنکھوں سے اس مٹی کے ڈھیر کو دیکھا جہاں کبھی میرا گھر تھا پھر آنکھوں پر ہتھیلی پھیر کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے ماما کے گھر میں داخل ہوئی تو شور مچ گیا۔ اس کے ماما کی طبیعت خراب تھی۔ نورالنہار کو دیکھ کر وہ بھی خوش ہو اُٹھے۔ ان کے بیٹے احمد نے مجھے بہن بنالیا تھا۔ نورالنہار کی چھوٹی بہن شمس النہار بھی مجھے بڑی بہن کی طرح چاہنے لگی تھی۔ میں اب اس فکر میں تھی کہ کسی طرح شوروپری سے کیا ہوا وعدہ پورا کردوں تاکہ میں نے اب تک جو قوت حاصل کی ہے، اس میں مزید استحکام پیدا ہوجائے۔ یوں بھی فقیر بابا خواہ مخواہ دخل اندازی کررہے تھے۔ وہ رخنہ اندازی کرسکتے تھے۔ میری قوت چھین سکتے تھے حالانکہ میرے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔ میں تو بس یہی چاہتی تھی کہ اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ قوت میرے پاس محفوظ رہے۔

میں نورالنہار کے ماموں کے گھر میں لیٹی یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ خدائی فوجدار کی طرح فقیر بابا وارد ہو گئے۔ بالکل میری چارپائی کے سامنے ظاہر ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔ ''کفر کے دلدل میں ڈبکی لگانے والی کا کیا حال ہے؟''

میں نے چونک کران کی طرف دیکھا تو وہ پھر بولے۔ ''میرے پیر بھائی کے نام کو بٹہ لگانے والی تم کسی طرح صراط مستقیم پر نہیں آؤ گی نا؟''

''اب میں کون سا کفر کررہی ہوں۔ مندروں میں جانا تو چھوڑ ہی دیا ہے۔''

''مگر شورویر کی مدد کرنا نہیں چھوڑا۔''

''میں نے جلدی سے بات کو بدلا۔ ''یہ عرفان کیا چیز ہے؟''

''عرفان دراصل دائمی زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ سفلی علم کا سہارا لے رہا ہے، شاید تمہیں علم نہ ہو سفلی شیطانی عمل ہے اور شیطان کو خوش کرنے کے لیے گناہوں میں ڈوبنا ضروری ہے۔ عرفان کو بے عمل کرنے کے لیے قرآنی عمل کرو ورنہ یہ بھی شورویر کا ہم پلہ بن جائے گا۔'' فقیر بابا نے کہا۔ ''مگر تم کیونکر ایسا کرو گی تم تو خود گناہوں میں ڈوب چکی ہو۔

فقیر بابا کے طنز نے میرے اندر غصے کا اُبال لا دیا۔ میں کچھ کہتی کہ وہ پھر سے بولے۔ ''اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔ ابھی توبہ کا در بند نہیں ہوا ہے توبہ کرو اور صحیح راستے پر آ جاؤ۔''

''اچھا بابا! اچھا میں ایسا ہی کروں گی مگر آپ کو بھی میری مدد کرنا ہوگی۔'' دراصل میں نورالنہار کی مدد کرنا چاہتی تھی اسی لیے فقیر بابا سے مدد مانگ رہی تھی۔ اکیلے اس سے ٹکرانا بیوقوفی تھی۔

''میں مدد کرنے پر تیار ہوں مگر تمہیں کفر سے توبہ کرنا پڑے گی۔''

''اچھا بابا! کرلوں گی۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر اس طرح کہا گویا ان سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں۔ وہ میری بات کو سمجھ گئے تھے شاید اسی لیے جس پُراسرار انداز میں آئے تھے اسی انداز میں غائب ہو گئے مگر جاتے جاتے وعدہ کر گئے کہ وہ میری مدد کریں گے۔ ان کے جاتے ہی میں نے راحت کی سانس لی۔ مجھے اندازہ تھا یہی میرے سچے ہمدرد ہیں، پھر بھی نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر انسان جانتا ہے کہ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ دائمی حیات بعد الموت ہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ اس کا رزلٹ اگلے جہان میں ملے گا، پھر بھی وہ گناہ کیے جاتا ہے کہ گناہ میں لذت زیادہ ہے۔

ابھی میں انہی باتوں میں اُلجھی ہوئی تھی کہ یکایک شور اُٹھا۔ ایسا لگا تھا جیسے اندر کوئی حادثہ ہوا ہے۔ میں اُٹھ کر ادھر بھاگی۔ سب کے سب نورالنہار کے ماموں کے کمرے میں جمع تھے۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ''کیا ہوا؟''

''بابا سو رہے تھے کہ ان پر چھت کی شہتیر گر پڑی۔'' احمد نے کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ ان کی لاش بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور آگے بڑھ کر شہتیر کو ہاتھ لگا دیا۔ میں بھول گئی تھی کہ سرکس میں کرتب دکھانے میں شورویر کا ہاتھ تھا مگر جیسے ہی شہتیر کو اُٹھانے کی کوشش کی وہ اُٹھتا چلا گیا۔

شہتیر کو الگ ہٹا کر چھت کے پتھروں کو ہٹایا اور یہ دیکھنے کے لیے جھک گئی کہ احمد کے بابا زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ میرے جھکتے ہی انہوں نے آنکھیں کھول دیں پھر ایک آنکھ بند کر کے مسکرائے۔ ''میرا تمہارا جنم جنم کا ساتھ ہے۔''

میں وہیں دھم سے فرش پر بیٹھ گئی۔ شبہ مجھے پہلے بھی تھا لیکن اب یقین ہو گیا کہ احمد کے والد ختم ہو چکے ہیں اور اب ان کے جسم میں شورویر براجمان ہے۔ اسے ایک جسم کی تلاش تھی۔ قسمت نے اس کے لیے جسم کا انتظام یہیں کر دیا۔

مجھے اس طرح بیٹھتے دیکھ کر احمد نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا باجی؟''

میرے جواب سے قبل وہ چلائے۔ ''یہ کیا باجی باجی لگا رکھی ہے۔ خبردار جو تم نے آئندہ اسے باجی کہا۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئی۔ احمد کے والد کے روپ میں شورویر میرے ذہن کو گندہ کرنے کے لیے آموجود ہوا تھا اور اب وہ چاہتا تھا کہ احمد مجھے اپنی بہن نہ کہے۔ خود احمد بھی حیران تھا کہ آخر اس کے والد کا مطلب کیا ہے۔ اس سے قبل تو انہوں نے کبھی اس پاکیزہ رشتے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھر مجھے فقیر بابا کا جملہ یاد آ گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ شیطانی عمل کو کامیاب کرنے کے لیے گناہوں کی دلدل میں ڈوبنا ضروری ہے۔ شورویر بھی اب مجھے گناہوں کے گرداب میں گھسیٹنے کی سعی کر رہا ہے اس لیے میں دھمکی پر اُتر آئی۔

''اگر احمد مجھے باجی نہیں کہے گا تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''نہ احمد تمہیں باجی کہے گا اور نہ تم یہاں سے کہیں جا سکتی ہو۔ اب تک اگر میں خاموش رہا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کبھی کچھ بول ہی نہیں سکتا۔ خوب اچھی طرح سمجھ لو، اس گھر میں عشق و عاشقی کا جو کھیل تم دونوں بھائی بہن کے نام پر کھیل رہے ہو، وہ زیادہ عرصے تک نہیں کھیلا جا سکتا۔''

احمد رو پڑا۔ ''ابو کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

ماں نے کہا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی بیٹے پر تہمت لگاتے ہو اس سے تو اچھا تھا کہ تم مر ہی گئے ہوتے۔''

''میں نے رات ان دونوں کو خود دیکھا تھا۔ احمد لڑکی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور یہ دونوں پیار بھری باتیں کر رہے تھے۔''

میں سمجھ گئی تھی کہ اب خیر نہیں۔ پہلے اس نے میرا ایمان بگاڑا، اب مکمل طور پر گناہوں کی دلدل میں کھینچ رہا ہے۔

☆======☆======☆

میں تو اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پتا نہیں احمد کے والد کے روپ میں شورویر ان لوگوں سے کیا کیا بکواس کرتا رہا۔ پھر وہ میرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''کیوں مجھے گناہوں کی دلدل میں کھینچ رہے ہو؟''

''پہلے سوچ رہا تھا کہ تم مقدس تابوت جا کر میرے لیے 'موکچھ پراپتی' لاؤ مگر اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ زندہ رہنے کا طریقہ ڈھونڈ چکا ہوں۔''

میں سمجھ گئی تھی کہ اب اس نے مجھے گناہوں کے ساگر میں ڈبونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس گھر کو چھوڑ دوں۔ یہ سوچ کر میں اس کمرے سے نکل آئی۔

میرا سامان تیار رکھا ہوا تھا۔ اب اس گھر میں مزید ٹھہرنا فتنہ اور فساد کو ہوا دینے کے مترادف تھا اس لیے میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور باہر

سڑک پر نکل آئی۔ دراصل غصے نے عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ میں بھول گئی تھی کہ مجھے نورالنہار کی مدد کرنا ہے اسی لیے میں یہاں آئی ہوں۔

بنگلہ کی کہاوت ہے۔ ''آپنی باچلے باپ ارنام۔'' (خود بچ جانے سے باپ کا نام قائم رہتا ہے) یہاں شورویر میرے ساتھ کوئی بھی حرکت کر سکتا تھا۔ اس لیے اپنے بچاؤ کی کوشش فرض ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے نورالنہار کو بھلا دیا تھا۔

سڑک پر نکلتے ہی سب سے پہلی ٹیکسی جو مجھے ملی، میں اسی میں بیٹھ گئی اور ڈرائیور سے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ میں جلد از جلد ڈھاکا چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ ٹیکسی شہر میں دوڑتی رہی۔ میں صاف دیکھ رہی تھی کہ ٹیکنیکل، شیمولی، ایوب گیٹ، نیو مارکیٹ، گلستان، ہاٹ کھولا ہوتے ہوئے ٹیکسی کملاپور ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑ رہی ہے۔ کافی دیر کے بعد جب ٹیکسی رُکی تو میں نے اپنے آپ کو احمد کے دروازے پر موجود پایا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' میں نے ٹیکسی والے سے بگڑ کر کہا۔ ''میں نے تم سے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا تھا۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ جہاں سے سوار ہو رہی ہوں، وہیں اُتار دینا۔''

''منہ سنبھال کر بات کرو۔'' اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''تم اسٹیشن سے بیٹھی ہم کو اس جگہ آنے کو بولی۔ اب خالی پیلی بونگ مارتی ہے۔ سیدھے ہاتھ سے ہمارا بھاڑا دو۔ پھر جہاں دل چاہے، جاؤ۔''

''کس بات کا بھاڑا؟ اگر مجھے یہاں سے چل کر یہیں آنا تھا تو پھر تمہیں کیوں تکلیف دیتی؟ مجھے پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا تھا کہ خواہ مخواہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بچوں کی طرح ہوا کھاتی پھروں۔''

ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اس نے ہینڈل نکال لیا۔ ''ہجار بار بولا تم اسٹیشن سے یہاں آیا۔ اب اگر تم ہمارا بھاڑا نہیں دے گی تو ہم تمہارا بھیجہ باہر نکال دے گا۔''

اسی وقت میں نے دروازے پر کسی کے ہنسنے کی آواز سنی۔ سامنے احمد کے والد کھڑے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے والد کے جسم میں ملبوس شورویر کھڑا تھا اور میری بدحواسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے پاس بلایا اور کرایہ پوچھ کر اپنی جیب سے ادائیگی کر دی آٹھ آنے بخشش کے بھی دیئے۔

ٹیکسی ڈرائیور میرا سامان نیچے اُتار کر چلتا بنا۔

''کہاں جا رہی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جہنم میں۔''

''شیطان نے جنت کے مقابلے میں دوزخ کو ترجیح دی تھی۔ اس کے ہر پجاری کو وہیں جانا چاہیے۔ تمہارا فیصلہ بالکل صحیح ہے کہ تم بھی جنت چھوڑ کر جہنم میں جانا چاہو گی۔''

''آخر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے ہو؟''

''کبھی تم نے سائے کو جسم سے جدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ تم کتنا ہی مجھ سے دور بھاگنے کی کوشش کرو، مجھے اپنے آپ سے الگ نہیں کر

سکتیں اور اگر اب بھی تمہارا یہ خیال ہے کہ تم مجھ سے دور جا سکتی ہو تو ایک بار پھر کوشش کر دیکھو۔ گھوم پھر کے دوبارہ یہیں آ جاؤ گی۔" اس نے سامنے سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا۔ "ان کو اسٹیشن لے جاؤ۔"

میں نے سامان اُٹھا کر گھر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "نہیں اب مجھے ٹیکسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تو یہاں سے میری لاش ہی باہر جائے گی۔"

"چچ...... چچ...... بُری بات منہ سے نہیں نکالتے۔ ابھی تو تمہیں دُلہن بن کر احمد جیسا دولہا حاصل کرنا ہے۔ دھوم مچ جائے گی پورے بنگال میں ہر جگہ تعریف ہوگی کہ اتحاد کا قائل اگر کوئی ہو تو کم از کم میرے جیسا ہو۔"

میں اس گھر میں شمس النہار کی وجہ سے آئی تھی۔ یہ تو قسمت کا پھیر تھا کہ شورویر درمیان میں آ کودا، اور حالات نے یکا یک نیا رُخ اختیار کر لیا ورنہ میں نے تو تہیہ کر لیا تھا کہ عرفان کو ایسی سزا دوں گی کہ کالا علم کرنا بھول جائے گا۔ مگر شورویر نے اُلجھا دیا۔ پہلے اس سے نمٹنا ضروری تھا۔ اس لیے میں نے سوچا، ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے، اس خیال کے تحت میں کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنا سامان ایک طرف رکھ دیا۔ "ہم دونوں مصالحت کیوں نہ کر لیں؟"

"کیسی مصالحت؟"

"یہی کہ تم احمد کے بارے میں مجھ سے کوئی ایسی بات نہ کہو جس سے بھائی بہن کے رشتے پر آنچ آئے اور میں تم سے کوئی ایسی بات نہ کروں جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔"

"احمد کے معاملے میں تم اتنی جذباتی کیوں بن رہی ہو؟ ذرا سی زبان دینے سے رشتے قائم نہیں ہو جاتے۔ آخر اس میں کیا بُرائی ہے جو تم اسے اپنا شوہر بنانے پر تیار نہیں ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے بہترین قسم کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سامنے احمد کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے علاوہ میرا دل یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ تمہاری جگہ کوئی اور میرا شوہر بن کر آئے۔"

احمد کے والد کے روپ میں شورویر جس طرح شرمایا، وہ منظر آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو بے ساختہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ آپ خود ہی تصور کیجیے کہ چاندی جیسے سفید بالوں اور جھریوں دار چہرے کا ایک بوڑھا آدمی جوانوں کی طرح اکڑنے لگے تو کیسا بھیانک منظر ہوگا۔

اس روز تو بات آئی گئی ہوگئی۔ شام کو جب میں اسعد کو ریاضی کرانے کے لیے بیٹھی تو اس نے چپکے سے احمد کا ایک پرچہ مجھے دیا۔ احمد نے مجھے حسبِ معمول "بہن" کہہ کر مخاطب کیا تھا اور تشویش ظاہر کی تھی کہ بیٹھے بٹھائے ابو جی کو اللہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ بنگالی، بہاری اتحاد بہت اچھی بات ہے لیکن اس کے لیے انہوں نے جو طریقہ کار منتخب کیا ہے، وہ بالکل غلط ہے۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ میرے خیال میں ابو جی پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ آپ کوئی ایسا طریقہ بتا سکتی ہیں کہ جادو کا اثر زائل ہو جائے۔

میں نے بہت غور و فکر کے بعد اس راز میں احمد کو بھی شریک کر لینا مناسب سمجھا کیونکہ اسے حقیقت بتائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ نہایت مختصر

الفاظ میں جواب تحریر کیا اور لفظ بھیا سے خطاب کرنے کے بعد اسے بتایا کہ تمہارے ابو جی پر جادو کا اثر نہیں ہے۔ انہیں تو مرے ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں ان کے جسم میں شورویر کی روح حلول کر گئی ہے۔ اس سے قبل سرکس والے واقعہ کے سلسلے میں تمہیں شورویر کے متعلق بہت کچھ بتا چکی ہوں۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ شورویر کی روح تمہارا پیچھا چھوڑ دے تو تم پہلی ہی فرصت میں کسی عامل سے جا کر ملو۔

اگلے روز احمد نے اپنے پرچے میں تحریر کیا کہ میں نے کئی عاملوں سے ملاقات کی ہے۔ انہوں نے زائچہ بنا کر دیکھا ہے۔ وہ سب اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے ہمارے گھر میں جو قوت اپنا راج قائم کیے ہوئے ہے، اس سے مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ شورویر سے چھٹکارا پانے کی اب ایک ہی صورت ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔

میں نے فوراً لکھا ایسا ہرگز مت کرنا شورویر یہی چاہتا ہے کہ حلول کرنے کے لیے اسے تمہارا جسم مل جائے۔ خودکشی کر کے تم اسے شکست نہیں دو گے بلکہ شکست کھا جاؤ گے۔

اس کے بعد ہم دونوں میں مزید کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی ہمیں ڈر تھا کہ کہیں اس طرح شورویر بھانپ نہ جائے کہ خط و کتابت کے ذریعے ہم لوگ ابھی تک بھائی بہن کا رشتہ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل براہِ راست توجہ بات یہ تھی کہ بوریت اور پریشانی مجھ پر سوار تھی۔ مجھے روزانہ کئی کئی گھنٹے اس بوڑھے پھونس شخص سے محبت کی باتیں اس طرح کرنی پڑتی تھیں جیسے وہ کوئی جوان ہو۔ وہ خود ہی کہتا۔ ''اگر میرے پاس کسی نوجوان کا جسم ہوتا تو میں تمہیں بتا دیتا کہ پیار کسے کہتے ہیں۔''

میں گھبرا کر کہتی۔ ''جن آنکھوں میں شورویر بسا ہوا ہو، ان کے سامنے جنت کا غلمان بھی آ جائے تو ماند ہے۔''

''اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو سمجھ لو کہ اس دنیا کی مالکہ تم ہو گی۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے، پھر اس بوڑھے جسم کو تم بھی بھول جاؤ گی۔''

''یہ بوڑھا جسم تمہیں پسند ہے؟ تعجب ہے اتنے بڑے ڈھاکا میں تمہیں کوئی ایسا مُردہ جوان لڑکا نہیں ملتا جس میں تم داخل ہو سکو؟''

''کسی مُردہ جسم میں داخل ہونے کی کچھ شرطیں ہیں۔ اول یہ کہ اسے مرے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ کا عرصہ نہ گزرا ہو۔ دوئم اس کے جسم پر کوئی گہرا زخم نہ ہو اور سوئم یہ کہ جس وقت میں کسی جسم میں جاؤں، اس وقت کوئی شخص اس جسم کی طرف متوجہ نہ ہو۔ لوگوں میں اسی لیے یہ بات مشہور ہے کہ مُردے کو اکیلا نہ چھوڑا جائے۔''

دوسری طرف احمد بھی خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ اپنے طور پر وہ شورویر سے چھٹکارا پانے کے لیے برابر کوشاں تھا۔ اس سلسلے میں وہ روزانہ جنتروں منتروں کی کتابیں خرید خرید کر لاتا۔ اسی دوران اسے انگریزی کی ایک کتاب ہاتھ آ گئی جس میں بتایا گیا تھا کہ شیطانی روح پر قابو پانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے چاروں طرف سے گھیر کر نذرِ آتش کر دیا جائے۔

بالا ہی بالا مجھے بتائے بغیر اس نے پہلے اپنے مکان کا بیمہ کرایا پھر چپکے چپکے پٹرول خرید کر لایا اور ایک رات جب سب لوگ بے خبر سو رہے تھے اس نے اپنے ابو کے کمرے کے چاروں طرف پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ ناتجربہ کاری اور بغیر کسی کے مشورے سے کیے ہوئے کام کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے وہی نتیجہ نکلا۔ اس کے ابو جی کا کمرا جل بھن کر خاک ہو گیا۔ کمرے کے ساتھ ساتھ اس کے ابو جی بھی جل گئے لیکن بیمہ کمپنی نے فوراً دعویٰ

ٹھونک دیا کہ کلیم لینے کی غرض سے آگ لگائی گئی ہے۔ پولیس کو پہلے ہی شبہ تھا ذرا سی تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ آگ لگانے کا منصوبہ کئی روز سے تیار کیا جا رہا تھا۔ گواہی پیٹرول پمپ والے نے دی تھی اور ثبوت وہ دیواریں بنی تھیں جن پر پیٹرول چھڑکا گیا تھا۔ چنانچہ اسے اپنے گھر میں آگ لگانے، بیمہ کمپنی کو دھوکا دینے اور اپنے ابو کو زندہ جلا دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

اسی شام کو شوروبر کے ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بڈھے کا جسم مجھے پہلے ہی ناپسند تھا۔ اچھا ہوا کہ جل کر خاک ہو گیا اب اگر یہ چاہتی ہو کہ احمد کو سزا نہ ہو اور وہ باعزت بری ہو جائے تو تمہیں یہ وعدہ کرنا پڑے گا کہ تم بنگالی، بہاری اتحاد قائم کیے بغیر نہیں مانو گی۔''

بنگالی، بہاری اتحاد سے اس کی جو مراد تھی، اس کے متعلق کچھ کہنا بے کار ہے حقیقت میں وہ کوشاں تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے بھائی بہن کے پاکیزہ اور مقدس رشتے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس طرح ختم کر دیا جائے کہ آئندہ کوئی لڑکا کسی کو اپنی بہن کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔

شوروبر نے جس انداز میں میری کمزوری کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی، اس سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ہر جائز ناجائز طریقے سے اپنا کام نکالنا چاہتا ہے مگر میں جانتی تھی کہ اس کا مقصد محض یہی نہیں کہ بھائی بہن کے پاک رشتے کو ختم کیا جائے بلکہ وہ اس وقت تک مطمئن نہیں ہو گا جب تک احمد کی جان لے کر اس کے جسم پر قابض نہ ہو جائے اور مجھے گناہوں کی دلدل میں گلے گلے تک ڈبو نہ دے۔

بڑی عجیب اور بڑی کڑی شرط تھی۔ میں کوئی مذہبی لڑکی نہیں۔ نہ میں نے مذہب کا مطالعہ اپنے ابو کی طرح گہرائی سے کیا اور نہ کبھی زندگی میں اس قسم کا کوئی موقعہ پیش آیا کہ مذہبی تعلیم کسی مدرسے سے حاصل کروں اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ اسلام نفرت کی تعلیم نہیں دیتا۔ کوئی بھی مذہب گناہ کی تعلیم نہیں دیتا۔ دنیا کے سارے مذاہب، محبت، خلوص اور رواداری و پاکیزگی کی تعلیم دیتے ہیں۔ جبکہ شیطان کی تعلیم اس کا الٹ ہے۔ گناہ، نفرت، دشمنی کی پرداخت ہی شیطان کا مقصد عین ہے اسی لیے وہ مجھے گناہوں کی دلدل میں کھینچ رہا تھا کہ جس کو کل تک میں بھائی کہتی تھی اس کو بغیر شادی کیے شوہر کا درجہ دے دوں۔

شوروبر سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ کبھی کبھی اس کے ہنسنے کی ہلکی سی آواز میرے کانوں میں آ جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کامیابی کے نشے نے اسے بالکل بدمست کر دیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ احمد کی زندگی بچانے کے لیے مجھے ہر حال میں اس کی بات ماننا پڑے گی اور تب اچانک میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا۔ ''شوروبر مجھے تمہاری بات منظور ہے۔ اگر تم یہی چاہتے ہو کہ احمد اپنے بھولپن اور اپنی فطری معصومیت کے ساتھ مجھے اپنی بہن سمجھتا رہے اور میں اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناؤں تو اس کی زندگی بچانے کے لیے میں ایسا بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

شوروبر زور سے ہنسا۔ ''پہلے ہی میری بات مان لیتی تو یہ نوبت کیوں آتی؟''

جواب میں، مَیں نے بھی ہنسنے کی کوشش کی مگر میری آواز بھرا گئی۔

یہاں پر میں اپنے قارئین کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ میں فریب کا جواب فریب سے دینا چاہتی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ ایک بار احمد جیل سے باہر آ جائے۔ اس کے بعد شوروبر سے نمٹنا اور چھٹکارا پانا مشکل نہیں۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ

میری کسی بات سے بعد میں لوگوں کو مجھ پر الزام دھرنے کا موقع ملے۔ اب میں فقیر بابا سے بھرپور مدد لینے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ میری محنت مٹی میں مل جائے گی۔ اتنی کٹھن تپسیا کے بعد میں نے جو قوت حاصل کی ہے، وہ بھی چھن جائے گی۔

میرے جواب اور اپنی کامیابی پر وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتی تھی، البتہ اس کے لہجے سے اس کی خوشی کا اندازہ لگا رہی تھی۔ مجھے وہ ایک سفید سائے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''تم آج ہی حسن پور چلی جاؤ احمد ایک ہفتے کے بعد تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ ضروری اخراجات کے لیے تمہیں اپنے تکیہ کے نیچے سے مناسب رقم روزانہ ملتی رہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسعد! شمس النہار اور اماں کا کیا ہوگا؟''

وہ بولا۔ ''احمد کے ماموں صدر گھاٹ میں رہتے ہیں۔ دو ایک دن میں وہ وہیں چلی جائیں گی۔ ان کی جانب سے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم سے جو کہا گیا ہے، اس پر عمل کرو اور جتنی جلدی ہو سکے، ڈھاکا چھوڑ دو۔''

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ احمد کی رہائی سے قبل ڈھاکا کو خیر باد کہوں لیکن اس کی بات مانے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں تھا۔ دبی زبان سے میں نے شورویر سے درخواست کی وہ مجھے ڈھاکا میں رہنے دے اور بہانہ یہ بنایا کہ حسن پور میں مجھے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خصوصاً ہوٹل نہ ہونے کے باعث قیام و طعام کا کوئی بندوبست نہ ہو سکے گا۔

پہلی بات کے جواب میں اس نے کہا کہ تمہارا ڈھاکا چھوڑنا اس لیے ضروری ہے کہ ایک بہاری کے ساتھ کسی بنگالی کے تعلقات کو یہاں کے لوگ پسند نہیں کریں گے۔ خدشہ ہے کہ کہیں فساد نہ ہو جائے جبکہ حسن پور میں کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوگی اور ہر شخص یہی سمجھتا رہے گا کہ میاں بیوی مقیم ہیں اور دوسرے مسئلہ کا حل یہ ہے کہ آبادی سے باہر نواب صاحب کی اراضی پر بنی ہوئی ایک نیم پختہ عمارت میں تمہارے قیام کا پہلے ہی سے انتظام کیا جا چکا ہے۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ جس کاشت کار کو مٹھی بھر روپے دو گی، وہ ہنسی خوشی تمہارے کھانے پینے کا انتظام کر دے گا۔ چند دنوں کے بعد احمد تمہارے پاس پہنچ جائے گا اور تمہارا ہر روز، روز عید اور ہر شب، شب برات ہوگی۔ اس وقت شاید تمہیں یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ یہ ساری عنایات شورویر کی مرہونِ منت ہیں۔''

اپنے طور پر وہ مجھے بُری طرح اپنے جال میں جکڑ رہا تھا جبکہ میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح ایک بار احمد کی رہائی عمل میں آ جائے چنانچہ مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی اور اگلے روز اسعد اور ماں سے رخصت ہو کر میں نے ڈھاکا چھوڑ دیا۔ روانگی سے قبل میں نے اسعد سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ مجھے حسن پور کے پوسٹ ماسٹر کی معرفت اپنی نور النہار اور اماں وغیرہ کی خیریت سے مطلع کرتا رہے۔

تقریباً چھتیس گھنٹے کے طویل ترین سفر کے بعد حسن پور کے اسٹیشن پر اُتری۔ اسٹیشن کو دیکھ کر بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے بھوک سے بے دم ہو کر کئی گھنٹے گزارے تھے۔ آج اور کل میں کتنا فرق تھا۔ آج میرا بیگ روپوں سے بھرا ہوا تھا۔ جسم پر عمدہ قسم کا سوٹ تھا۔ اٹیچی کیس میں تین چار شاندار سوٹ مزید رکھے ہوئے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر کھڑی ہو کر قلی کو آواز دے رہی تھی۔

میں قلی کے سر پر اپنا مختصر سا سامان رکھوا کر اسٹیشن سے باہر نکلی تو دور دور تک کسی تانگے کا پتا نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ آج حسن پور سے صرف دو

تانگے آئے تھے اور وہ آٹھ آٹھ دس دس سواریاں بٹھا کر واپس چلے گئے۔ اب صبح سے پہلے کسی تانگے کا ملنا مشکل تھا۔

اسٹیشن کے باہر کھڑی ہوئی میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ کیا کرنا چاہیے کہ ایک چھوٹی سی لال کار حسن پور کی جانب سے آتی ہوئی نظر آئی۔ اسٹیشن پر آ کر وہ کار رُکی اور اس میں سے ایک دبلا پتلا لمبا نوجوان باہر نکلا اور تیز تیز قدموں سے میری طرف بڑھا۔

''معاف کیجیے۔ مجھے وقت پر یہاں پہنچنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔'' اس نے مجھ سے کہا۔'' آپ حُسنہ ہیں نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔'' آپ کی تعریف؟''

''مجھے نسیم کہتے ہیں۔ انشورنس کمپنی کا آرگنائزیشن آفیسر ہوں۔ آج صبح مجھے جنرل منیجر کا فون موصول ہوا تھا کہ حسن پور پہنچ کر آپ کے لیے دفتر اور رہائش کا انتظام کروں۔ سارے انتظامات سے فارغ ہو کر سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہوں۔''

مجھے شورویر کی بات یاد آ گئی اس نے ڈھاکا میں مجھ سے کہا تھا کہ حسن پور میں میرے قیام کا انتظام کیا جا چکا ہے حیرت انگیز طور پر وہ ایسے پُراسرار کام انجام دے رہا تھا جن کی تہہ تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر سے واقفیت ہونا تو بڑی بات تھی۔ میں نے تو کبھی اس کا نام بھی نہیں سنا تھا لیکن بقول نسیم اس نے براہِ راست اسے فون کر کے میرا نام لیا اور اسے میری رہائش کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ یہ ساری کی ساری کارستانی شورویر کی تھی اور یہ سوچ سوچ کر مجھے بے حد پریشانی ہو رہی تھی کہ آیا میں اس پُراسرار ہستی کا مقابلہ کر بھی سکوں گی یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے ورغلانے اور مجھ سے ایسا کرانے میں کامیاب ہو جائے جس کے باعث میں کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر نسیم نے ٹوکا۔'' کیا سوچنے لگیں؟ جلدی کیجیے۔ آفس آپ کے حوالے کر کے مجھے آج ہی گھر واپس جانا اور رپورٹ پیش کرنا ہے۔''

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، پھر قلی سے کہا کہ وہ سامان کار میں رکھ دے۔ سامان رکھا جا چکا تھا تو میں نے جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر قلی کی طرف بڑھا دیا۔

''میرے پاس کھلا نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔'' پورا نوٹ تم ہی رکھ لو۔''

دو آنے پھیرا لینے والے قلی کی دونوں آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ اتنی مہربان اور دیالو لڑکی اس کی آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کے منہ سے شکریہ کا ایک لفظ تک نہیں نکل سکا۔ خوشی کے باعث اس کے دونوں ہونٹ کپکپانے لگے اور اسی وقت نسیم نے اپنی کار آگے بڑھا دی۔

راستے میں اس نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں۔ مثلاً یہ کہ مجھے حسن پور اور اس کے قرب و جوار میں کمپنی کے کام کو آرگنائز کرنا ہوگا۔ جتنے زیادہ بااثر اور چرب زبان ایجنٹوں کی میں تقرری کروں گی، اتنا ہی میرا کام ترقی کرے گا۔ لائف اور جنرل دونوں قسم کے انشورنس کا کام مجھے سونپا گیا تھا۔ تنخواہ کے بجائے پندرہ فیصد اوور رائڈنگ مقرر کی گئی تھی نسیم کا خیال تھا کہ میں اپنی آرگنائزیشن کے ذریعہ سات آٹھ سو روپے ماہانہ سے لے کر دو ڈھائی ہزار روپے ماہانہ تک حاصل کر سکوں گی۔ آخر میں اس نے مجھ سے درخواست کی کہ چونکہ جنرل منیجر مجھ پر بہت مہربان معلوم ہوتے ہیں اس

لیے میں ان کی سفارش کردوں۔ وہ کئی ماہ سے پُرامید ہے کہ اسے انسپکٹر کے عہدے پر تعینات کردیا جائے گا لیکن بہترین کارکردگی کے باوجود اسے ابھی تک وعدہ فردا پر ٹالا جارہا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے مجھے کمپنی کا ضروری لٹریچر دکھایا۔ پرپوزل اور ایجنسی کے فارم دیئے چند ضروری ہدایات دیں اور آبادی کی طرف جانے والا راستہ بتا کر گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ہلاتا ہوا اگلے روز آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔

گھر کے متعلق شوروبیر پہلے ہی بتا چکا تھا۔ چھ بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ایک بڑا سا نیم پختہ مکان تھا جس کے ایک کمرے میں انشورنس کمپنی کا آفس قائم کیا گیا تھا۔ ابھی میں مکان کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ باہر سے کسی نے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ باہر نکل کر دیکھا تو ایک بوڑھا شخص جو چہرے مہرے سے شریف معلوم ہوتا تھا دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''اس مکان میں آپ ہی تشریف لائی ہیں؟'' میں نے انہیں پہچان لیا تھا یہ میرے ابو کے سوتیلے بھائی تھے جنہوں نے ابو پر ظلم کی حد کردی تھی اسی لیے ابو کلیم میں ملی حسن پور کی زمین جائیداد چھوڑ کر ڈھاکا چلے گئے تھے۔ بڑھاپے کے باعث ان کی آنکھیں کمزور ہوگئی تھیں۔ سر کے بال تو پہلے ہی سفید پڑ چکے تھے اب بھنویں بھی سفید تھیں اور کمر جھک کر دوہری ہوگئی تھی۔

''جی ہاں......'' میں نے ان کے سوال کا جواب دیا۔ ''انشورنس کمپنی نے میرے ہی لیے اس مکان کا انتظام کیا ہے۔''

وہ بولے۔ ''آپ کو اپنے دفتر یا گھر کے لیے کسی ملازم کی ضرورت ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔''

ان کا یہ جملہ سن کر میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ ان کا شمار حسن پور کے گنے چنے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔

میری خاموشی سے وہ سمجھے کہ میں ان کے بڑھاپے کے باعث انہیں ملازم رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انتہائی خوشامدانہ انداز میں کہنے لگے۔ ''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میری عمر کو نہ دیکھئے آج بھی جوانوں سے زیادہ کام کرسکتا ہوں۔''

ان کی بات کا کوئی جواب دینے کی بجائے میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور پیار کے ساتھ انہیں گھر کے اندر لے آئی۔ اندر لا کر میں نے انہیں پلنگ پر بٹھایا اور سوچنے لگی کہ انہیں اپنے متعلق سب کچھ بتا دینا بہتر ہوگا یا خاموشی ہی مناسب رہے گی۔

''وقت بگڑتے دیر نہیں لگتی۔'' انہوں نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔ ''حسن پور کا بچہ بچہ گواہ ہے کہ کل جس کے گھر پر ہاتھی جھولتے تھے آج وہ اپنی بوڑھی بیوی اور بیمار بیٹے کے ساتھ ایک جھونپڑی میں فقیروں جیسی زندگی گزار رہا ہے۔ پڑوسی ترس کھا کر اپنا بچا کھچا کھانے کے لیے دے دیتے ہیں تو پیٹ میں کچھ پڑ جاتا ہے ورنہ فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ سب جگہ گھوم پھر کر دیکھ لیا مگر کہیں کوئی کام نہیں ملتا۔ آج پتا چلا کہ آپ نے کوئی دفتر کھولا ہے تو بھاگا بھاگا یہاں آیا کہ شاید آپ ہی کو کچھ ترس آجائے گا۔ آپ یقین کیجیے۔ کسی قسم کا کام بھی آپ سونپ دیں، اسے انجام دینے میں کوئی عار محسوس نہیں کروں گا۔''

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''حسن پور میرے لیے ایک بالکل نئی جگہ ہے۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی ہے کہ میرے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا اگر آپ دونوں وقت کے کھانے اور صبح کے ناشتے کا انتظام کرسکیں تو میں آپ کو اپنے کھانے کے اخراجات کے علاوہ منہ مانگا

معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ فرمائیے آپ کو ہر مہینے کتنا معاوضہ پیش کیا جائے؟''

ان کی بے نور آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ ''پچیس روپے اپنے کھانے کے اور پچیس روپے مختانہ کل پچاس روپے ہوئے۔ ویسے اگر آپ چالیس روپے ماہوار بھی دیں تب بھی ان شاء اللہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

میں نے دس دس روپے کے پندرہ نوٹ نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ ''یہ ڈیڑھ سو روپے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ میرے لیے پکے، وہی آپ لوگ بھی کھائیں۔ درمیان میں اگر مزید روپوں کی ضرورت ہو تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مجھ سے مانگ لیں اور کبھی نہ سمجھیں کہ میں غیر ہوں۔''

اس وقت بڑے میاں کی حالت قابلِ دید تھی۔ میرے خیال میں کسی کو ڈیڑھ لاکھ روپے پا کر بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی ہوگی جتنی ان کو ڈیڑھ سو روپے وصول کرنے کی ہوئی۔ ''جیتی رہو بیٹی۔'' انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت اور خوش رکھے۔''

میں انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی۔ انہیں تباہ و برباد دیکھ کر مجھے خوشی کی بجائے انتہائی رنج ہوا۔ قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے نہ جانے وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے ان کو اس حد تک پہنچا دیا کہ آج وہ ایک ایک پیسے کو محتاج نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہو گا کہ جن لوگوں کو وہ کمتر اور ذلیل سمجھتے تھے، کل انہی کے دروازے پر پناہ کی تلاش میں جائیں گے۔ جب تقدیر روٹھتی ہے تو بڑے بڑے مغرور لوگوں کے غرور کو آن واحد میں خاک میں ملا دیتی ہے۔

تقریباً گیارہ بجے رات تک پلنگ پر پڑی ہوئی کروٹیں بدلتی رہی۔ جب کسی صورت چین نہیں آیا تو چہل قدمی کے خیال سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چاندنی رات میں ٹہلتی ہوئی دور تک نکل آئی۔ ہوش اس وقت آیا جب میں نے اپنے آپ کو مرگھٹ میں پایا۔ شاید دن میں وہاں کوئی چتا جلائی گئی تھی۔ اس کے بڑے بڑے انگارے ابھی تک سلگ رہے تھے اور گوشت کے جلنے کی بُو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہڈیوں کے فاسفورس سے شعلہ سا بھڑک اُٹھتا تھا۔ ایک سوکھے ہوئے درخت کے نیچے کوئی سادھو دھونی رمائے بیٹھا تھا۔

منظر ہولناک تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے کسی بھی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا۔ قریب جا کر میں نے سادھو کو بھی دیکھا۔ لمبی لمبی جٹاؤں اور بڑی سی داڑھی مونچھوں والا ایک شخص تھا جو ماتھے پر قشقہ لگائے ہاتھ میں ہزار دانوں والی مالا لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہوا اپنے جاپ میں مگن تھا۔ اس نے یا تو سرے سے مجھے دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا بھی تو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ ایک مقام پر کچھ نیم جلی ہوئی ہڈیاں میرے پیروں کے نیچے آ گئیں جھک کر دیکھا تو ایک ایسی لاش پڑی تھی جو پورے طور پر نہ جل سکی تھی۔ غالباً اس کے عزیز غربت و افلاس کے باعث مناسب مقدار میں لکڑیوں کا انتظام نہیں کر سکے تھے۔ لاش کے مختلف اعضا چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ اس روز مجھے کیا ہو گیا تھا۔ واپس آنے کے بجائے میں وہیں پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے صرف اسی لاش کی تلاش میں یہاں تک آئی تھی پھر میں نے ہڈیاں ہٹا کر لاش کا سر تلاش کرنا شروع کر دیا چاند کی روشنی میں سامنے ہی اس کا کاسۂ سر پڑا نظر آ گیا۔ گردن سے لے کر ماتھے تک کا پورا حصہ بالکل صحیح سلامت تھا۔ گوشت اور کھال جل چکی تھی آنکھوں اور ناک کے حلقے موجود تھے اور منہ کے سارے دانت بالکل صاف

نظر آ رہے تھے۔ اس کھوپڑی کو دیکھ کر مجھے اتنی مسرت ہوئی جیسے کوئی نعمتِ غیر مترقبہ ہاتھ آ گئی ہو۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اسے اُٹھا لیا۔ کھوپڑی میں کسی سانپ نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ پھنکار مار کر وہ اس کی ناک کے راستے سے باہر نکلا اور میرے جسم سے گزرتا ہوا زمین پر گرا اور پھن اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پھر بھی کوئی خوف معلوم نہیں ہوا جس طرح لوگ بلی یا چوہے کو ہش کہہ کر بھگا دیتے ہیں، اسی طرح میں بھی ہش کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور کھوپڑی کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے مرگھٹ سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلتے وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مرگھٹ میں موجود روحیں میری اس حرکت پر ناراض ہو کر شور مچا رہی تھیں۔ کئی طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کہیں سے ہنسنے کی۔ بہت سی روحیں دردناک انداز میں چیخ رہی تھیں مگر میں نے کسی آواز کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ کھوپڑی میرے ہاتھ میں تھی اور میرے قدم تیزی کے ساتھ مکان کی سمت اُٹھ رہے تھے۔

گھر پہنچ کر میں نے کھوپڑی کو دیوار میں بنی ہوئی ایک الماری میں رکھ دیا اور پلنگ پر لیٹ کر اس طرح سو گئی جیسے کوئی بہت بڑی مہم سر کر کے آئی ہوں مگر ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ پھر دل بے چین ہوا اُٹھا اور میں پھر گھر سے نکل پڑی۔

مرگھٹ کے برابر میں قبرستان تھا۔ اس بار میرا رُخ قبرستان کی طرف تھا۔ قبرستان میں ہُو کا عالم تھا۔ گوشت خور جانور ایک قبر سے دوسری قبر میں بھاگتے پھر رہے تھے۔ اس وقت میں ایک مقبرے کے سامنے کھڑی تھی۔ مقبرے کی دیواروں کی خستگی بتا رہی تھی کہ وہ کافی پُرانا ہے۔ سرخ لکھوری اینٹوں سے بنی دیواروں کو شور کھا رہا تھا۔ کسی بھی وقت دیواریں گر سکتی تھیں۔ ایک جگہ دیوار میں اتنا بڑا سوراخ تھا کہ ایک انسان بہ آسانی اندر جا سکتا تھا۔ میں نے تجسس کے تحت اندر قدم بڑھا دیئے۔ وہاں ایک نہیں، کئی قبریں موجود تھیں۔ میں ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھی تھی کہ ایک جگہ میرا پیر لڑکھڑایا اور میں قبر میں جا گری۔ میرے بوجھ سے مُردے کی ہڈیاں اس طرح سے چیخ اُٹھیں جیسے سوکھی ٹہنیوں کا گٹھر ہو مگر میں خوف زدہ ہونے کی بجائے لاش کا سر تلاش کرنے لگی اور جب کاسۂ سر مل گیا تو اسے لے کر قبر سے باہر نکل آئی۔ باہر آتے ہی لاش کی دائیں آنکھ سے ایک بڑا سا بچھو ڈنک تانے ہوئے نکلا اور ہلکی سی آواز کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر میں نے پیر کی ٹھوکر سے اسے اُچھال کر دور پھینک دیا اور خود جس طرح جھکی ہوئی مقبرے میں داخل ہوئی تھی، اسی طرح ٹہلتی ہوئی مقبرے اور قبرستان سے باہر چلی آئی۔ قبرستان کی روحیں چیختی چلاتی، روتی پیٹتی اور قہقہے لگاتی رہیں۔

گھر پہنچ کر میں نے پہلے کی طرح کھوپڑی مرگھٹ والی کھوپڑی کے برابر میں رکھ کر الماری میں تالا ڈال دیا اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

میں اس گھر میں، گھر کے وسیع و عریض کمرے میں بچھے جہازی سائز کے پلنگ پر لیٹی تھی۔ یہ پلنگ بھی نسیم لے کر آیا تھا۔ پتا نہیں، اس نے خریدا تھا یا عاریتاً مانگ کر لایا تھا۔ ویسے یہ پلنگ، بستر بلکہ گھر کی ایک ایک چیز تعریف کے قابل تھی۔ میں تعریفی نظروں سے کمرے کی آرائش دیکھ رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے دروازے پر کھٹکا ہوا ہو۔ میں نے پوری توجہ اُدھر لگا دی۔ کسی نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اتنی رات کو کون ہو سکتا ہے، یہ سوچ کر میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ پورے بارہ بج رہے تھے یعنی آدھی رات گزر چکی تھی۔ بڑے شہروں میں رہنے والے آدھی رات کا مزہ کیا جانیں۔ قصباتی شہر میں تو عشاء کے بعد سڑک کیا، گھروں میں بھی کوئی جاگتا ہوا نہیں ملتا اور اس دور میں تو ٹی وی اتنا عام نہ تھا کہ لوگ خواہ مخواہ نیندیں حرام

کرتے۔ وہاں تو نائٹ شو بھی گیارہ بجے ختم ہو جاتا تھا، پھر سڑکوں پر صرف کتوں کا راج ہوتا تھا۔ پھر یہ کون آ گیا؟ اسی خیال نے بے چین کیا تھا اور میں اُٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر فوراً ہی احساس ہو گیا کہ یہ آواز دروازے سے نہیں آ رہی ہے بلکہ اُلٹی طرف سے آ رہی ہے۔ میں نے ادھر دیکھتے ہوئے سوچا کہ ادھر تو نہ دروازہ ہے نہ کھڑکی، پھر یہ آواز کیسی؟ تبھی مجھے آواز کا مخرج سمجھ میں آ گیا۔

یہ آواز دیوار میں بنی الماری سے آ رہی تھی۔ اس الماری سے جس میں، مَیں نے دو کھوپڑیاں رکھی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر الماری کے پٹ کھول دیئے۔

الماری کا پلڑا کھلتے ہی دونوں کھوپڑیاں اُچھل کر باہر آ گئیں مگر زمین پر گری نہیں، ہوا میں تیرتی رہیں۔

ایسی حالت میں مجھے ڈرنا چاہیے تھا۔ خوف سے اُچھل جانا چاہیے تھا مگر مجھے ذرا بھی ڈر نہ لگا۔ بس ایک تجسس تھا جس کے تحت میری نظریں کھوپڑیوں کی گردش پر ٹکی ہوئی تھیں۔

وہ دونوں کھوپڑیاں دو جگہ کی تھیں۔ ایک قبرستان کی تو دوسری شمشان کی۔ ایک ہندو کی تو دوسری مسلمان کی۔ مگر وہ دونوں کھوپڑیاں اس طرح سے کلیلیں کر رہی تھیں جیسے مست پنچھی۔ کبھی اوپر جاتیں تو کبھی غوطہ لگا کر نیچے آ جاتیں۔ کبھی ایک دوسرے کے سیدھ میں آتیں جیسے اب ٹکرائیں کہ تب لیکن پھر ہلکی سی ترچھی ہو کر ایک دوسرے کے برابر سے گزر جاتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہی ہیں مگر اشاروں کی زبان میں۔ کیونکہ ان کے غوطے، گردش، اوپر نیچے آنا جانا، سب کچھ ایک ضابطے میں تھا۔ میں ادھر دیکھ رہی تھی کہ وہ دونوں کھوپڑیاں واپس جا کر اپنی جگہ گویا بیٹھ گئیں جیسے کبھی وہاں سے ہٹی ہی نہ ہوں۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جسے کسی سے کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر میں کہتی بھی تو کسی کو یقین نہ آتا کیونکہ جو اپنی آنکھ نہ دیکھے، وہ کیسے سچ ہووے۔ پھر مافوق الفطرت بات کو کتنے لوگ مانتے ہیں۔ ابھی تک جس قسم کے حالات مجھے پیش آئے تھے، وہ بھی تو ناقابلِ یقین باتیں تھیں مگر مجھ پر گزری تھیں اس لیے مجھے یقین تھا کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کھوپڑی کے اُڑنے میں کیا شورویر کا ہاتھ ہے؟ میں اب اس نہج پر سوچ رہی تھی کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا کیونکہ مجھے لگا تھا کہ آواز اُدھر ہی سے آئی تھی مگر اُدھر کوئی نہ تھا۔ کمرا خالی تھا۔ میرے علاوہ کسی اور ذی روح کا پتا نہ تھا۔ پھر یہ آواز کس نے دی تھی؟ میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ پھر کسی نے مجھے پکارا۔ اب کی بار میں نے پکارنے والے کو دیکھ لیا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو حیرت سے اُچھل پڑتا مگر میرے لیے تو ایسی باتیں تعجب خیز نہ تھیں کیونکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز باتیں میرے سامنے رُونما ہو چکی تھیں اس لیے کھوپڑی کا بولنا حیرت انگیز نہ تھا۔

الماری میں رکھی دو کھوپڑیوں میں سے ایک نے مجھے پکارا تھا مگر یہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی نہ تھی بلکہ سیدھی دماغ میں گونجی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''تم مہان ہو۔ تمہارا پچھتراتی اتم (ستارہ بہت اچھا) ہے۔ تم اس دنیا میں بہت بڑے انقلاب کا باعث ہو۔''

''مگر کیسے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''شورویر کو پراجیت (شکست) کر کے۔''

میرے ذہن میں حیرت کا گجر بج اُٹھا کہ یہ تو شورویر کی مخالف ہے۔ شاید دشمن ہے اسی لیے اس کی شکست کی متمنی ہے پھر بھی میں نے پوچھ

لیا۔ ''تم شوروپر کی شترو (دشمن) ہو؟''

''یاد رکھو...... تمہارے ہی دھرم کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آدم کے دو بیٹوں کی شادی کے لیے دو عورتوں کو قدرت نے بھیجا۔ ایک تو حور تھی اور دوسری جنی۔ انسان کے اندر غصہ، بدلہ، خدا کے احکام سے بغاوت یہ جنی کے خون کا اثر ہے۔ بدی کی طرف فوراً جھک جانا یہ بھی جنی ماں کا اثر ہے، لیکن اچھائی، وفا، عفوو درگزر وغیرہ حور کے خون کی تاثیر ہے۔ انسان اگر بُرا ہے تو بُرا ہی رہے گا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے اندر کی بُرائی زور کرتی رہے گی کیونکہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو گیلی مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ جب کمہار کے آوے میں وہ مٹی پک جاتی ہے تو پھر نئی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ انسان کے اعمال بھی کمہار کا آوا ہیں جس شکل میں اعمال تھے، اسی طرح روح ڈھل گئی۔ مرنے کے بعد بھی وہی رہتا ہے۔ میں زندگی میں اچھا انسان تھا اس لیے مرنے کے بعد بھی بُرائی کو پسند نہیں کر سکا ہوں۔ شوروپر بُرائی کا ہرکارہ ہے اس لیے میرا مخالف ٹھہرا۔'' کھوپڑی نے گویا پوری تقریر کر ڈالی۔

''اچھا...... تو تم اسی وجہ سے شوروپر کی مخالفت کر رہے ہو؟''

''میں اس کا مخالف کیوں ہوں، یہ وقت بتائے گا لیکن یاد رکھو اگر تم نے اس کو پراجیت نہ کیا تو گھاٹے میں رہو گی۔ آگے تمہاری مرضی۔'' ساتھ ہی ساتھ الماری کا پلڑا بند ہو گیا گویا اس نے اپنی بات کہہ دی تھی اور میری کوئی تاویل کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

اب میرے سامنے سوچ کا ایک وسیع سمندر پھیل گیا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کروں؟ شوروپر سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ سانپ کے قالب میں تھا اور میرا ہمدرد بن کر سامنے آیا تھا۔ بالکل اسی طرح کھوپڑی بھی میری ہمدردی پر آمادہ تھی۔ کہیں یہ بھی کوئی بدروح نہ ہو جو شوروپر کی طرح مجھے استعمال کرنے کی خواہش مند ہے۔ میرے ذریعے شوروپر کو ہٹانا چاہ رہی ہو۔

اس خیال نے مجھے دہلا دیا کہ یک شد نہ دو شد۔ اب مجھے دو محاذوں پر اُلجھنا پڑے گا۔ شوروپر کے ساتھ، کھوپڑیوں سے بچنے کا راستہ بھی ڈھونڈنا پڑے گا۔ شوروپر نے مجھ سے کئی قتل کروائے تھے۔ یہ بھی وہی کرے گی۔ کاش، فقیر بابا موجود ہوتے۔

شیطان کا نام لو اور شیطان حاضر۔ مگر یہ کہاوت غلط ثابت ہوئی تھی۔ فقیر بابا، شیطان نہ تھے مگر جیسے ہی انہیں یاد کیا۔ وہ حاضر ہو گئے۔ ان کے چہرے پر تمسخر تھا۔ وہ مسکرا کر بولے۔ ''میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر کیا کروں، پیر بھائی کی محبت مجبور کر دیتی ہے ورنہ تمہارے کرتوت ایسے ہیں کہ تم پر تھوکنا بھی تھوک کی بے عزتی ہے۔''

اس جملے نے میرے اندر غصے کا مدوجذر اُٹھا دیا۔ دل کیا کہ ایسا ہی تلملاتا ہوا جملہ کہوں مگر خاموش رہ گئی کیونکہ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی استاد کہنا پڑتا ہے۔ مجھ پر بھی وقت آ پڑا تھا۔ دو دو موذیوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ خاموش رہتی تو منشا پوری نہ ہوتی۔ فقیر بابا کی زبان ہنوز شعلہ اُگلنے میں مشغول تھی۔ میں بار بار تلملا رہی تھی۔ پھر بابا نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ ''چلے گی میرے ساتھ؟''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''تجھے تیری غلطیاں دکھانا چاہتا ہوں تاکہ تُو دیکھ لے جس شیطان کو تُو نے جگایا ہے۔ اس نے کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں۔''

''مگر اسے میں نے تو نہیں جگایا۔ وہ تو ابو کے کسی عمل کی وجہ سے بیدار ہوا تھا۔''

''یہ بات صحیح ہے مگر اسے تُو نے زندگی دی ہے۔ اگر تُو اس کے مشورے پر عمل نہ کرتی تو وہ کبھی بھی قوت حاصل نہ کر پاتا۔ خیر...... جو کچھ ہوا، سو ہوا، اب ایک کام کر کہ اس کھوپڑی کی حفاظت کرتی رہ جسے تُو نے الماری میں رکھا ہے۔''

''کھوپڑیوں سے کام وہ لوگ لیتے ہیں جو باطل علم کے عامل ہوتے ہیں۔ آپ تو نوری علم والے ہیں، پھر ایسا مشورہ؟''

''وقت آنے پر خود سمجھ جاؤ گی کہ میں نے ایسا مشورہ کیوں دیا ہے؟''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ایسا ہی کروں گی۔''

''پھر کسی مندر میں جا کر کوئی جاپ نہیں کرو گی اور نہ کالے علم کو کبھی آزماؤ گی۔''

''جی اچھا......''

''اب سو جاؤ'' کہہ کر وہ چلے گئے۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی۔ یہ میرا معمول تھا کہ کھڑکیوں کا پردہ کھینچنے سے پہلے میں باغ میں چاندنی کا نظارہ ضرور کرتی تھی۔ کمرے میں اگر تاریکی ہو تو یہ نظارہ صاف اور خوشنما محسوس ہوتا ہے اور آج کی شب تو وہ نظارہ تھا کہ کیا ہی کہنے کیونکہ گزشتہ شب بارہ گھنٹے کی موسلا دھار بارش ہوئی تھی جس نے باغ کے حُسن میں ایک نکھار پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ اب بھی آسمان پر تھکے ہارے ابر موجود تھے لیکن ان کا وہ زور ختم ہو چکا تھا جو گزشتہ شب موجود تھا۔

چاند ان بادلوں کے ساتھ ایک قسم کی آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھا۔ باغ کا نظارہ میرے دل میں کھبا جاتا تھا۔ چنانچہ چند منٹ تک میں قدرت کے اس حُسن میں کھوئی رہی۔

جب میں اس نظارے میں محو تھی تو ایک لمحے کے لیے مجھے کوئی سفید جھلک نظر آئی جیسے باغ میں کوئی موجود ہو۔ باغ کو بارش کے پانی نے ایک نئی رعنائی بخش دی تھی۔ میں نے باغ کے اس کونے کی طرف نگاہ جما دی جہاں سپیدی کی جھلک مجھے دکھائی دی تھی اور چند لمحات کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا، وہاں کوئی سفید لباس میں ملبوس شخص کھڑا تھا۔

اس منظر کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے میں نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور برآمدے کے سائے میں اس طرح کھڑی ہو گئی کہ کسی دوسرے کو میری موجودگی کا احساس نہ ہو۔

باغ میں چار سو ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا اور اب وہاں کسی سفید چیز کا وجود نہ تھا۔ چاندنی میں ایک ایک درخت صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا لیکن بے سود۔ آخر میں کمرے میں واپس آ گئی۔ کھڑکیوں کے پردے چڑھا دیئے اور بستر پر دراز ہو گئی لیکن نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔

وہ کیا شئے تھی۔ میرے دماغ میں بار بار یہی ایک سوال اُٹھ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے نیند غائب تھی حالانکہ عام حالت میں بستر پر گرتے ہی مجھے نیند کی دیوی دبوچ لیتی تھی مگر آج حالت دیگر تھی۔ میں کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی کہ کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک اُٹھی۔ دوسری بار پھر وہی آواز آئی تو میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ باہر کوئی تھا جو ہلکے ہلکے دستک دے رہا تھا۔ میں بستر سے نیچے اُتر آئی اور کمرے میں ایک لوہے کی سلاخ سے لٹکی لالٹین کی لو کو اونچا کیا، پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی۔

دروازہ کھولتے ہی میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میری جگہ جو بھی ہوتا، اس کی حالت یہی ہوتی۔ ذرا سوچ کر دیکھیں، رات کا سناٹا چھایا ہوا ہو، گدلی چاندنی پھیلی ہو، دور سے جھینگروں کی جھائیں جھائیں سنائی دے رہی ہو۔ ایسے وقت میں سایہ بھی عفریت نظر آتا ہے جبکہ میرے سامنے مجسم عفریت تھا۔

سرتاپا کفن میں ملبوس ایک جسم کھڑا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس جسم کے کندھوں پر سر نہ تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ اس نے اشارے سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ میں دروازے سے ہٹ گئی۔ سر نہ ہونے کی وجہ سے میں اسے آدھا وجود کہوں گی۔ وہ آدھا وجود اندر آ کر سیدھا الماری کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جیسے ہی وہ الماری کے نزدیک پہنچا، الماری کا پٹ خود بخود کھل گیا۔ اندر رکھی کھوپڑیوں میں سے ایک کو اس نے اُٹھایا اور اپنے سر پر رکھ لیا۔

وہ کھوپڑی جس پر گوشت تک نہ تھا، سوکھی لکڑی کی طرح چڑا نظر آتا تھا، کندھے پر لگتے ہی گویا سرسبز ہو اُٹھی۔ کسی زندہ انسان کے سر کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

اس کی مسکراہٹ نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے پوچھا۔ ”میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

”مجھے حرارت کی اشد ضرورت ہے۔“ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی شیرینی موجود تھی۔

میں آتشدان کی طرف بڑھی لیکن آگ جلانے کے لیے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ مجھے پریشان دیکھ کر اس نے کہا۔ ”کچھ اور نہ سہی، کمبل تو ہوگا۔ کچھ دیر کے لیے وہی مجھ پر ڈال دیں۔“

میں نے کمبل اوڑھا دیا۔ کمرے میں لالٹین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مدھم مدھم مٹمیلی روشنی میں، مَیں اس کفن پوش کا جائزہ لے رہی تھی۔ کھوپڑی اب اس طرح فٹ ہو چکی تھی کہ وہ جسم کا حصہ لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے خالی حلقوں میں ڈھیلے آ چکے تھے۔ پتلیاں چمکنے لگی تھیں۔ سر پہ بال بھی اُگ آئے تھے۔ وہ مکمل طور پر انسان لگ رہا تھا اور کسی لاغر مریض کی طرح بستر پر سویا ہوا تھا۔

کافی دیر تک سویا رہا پھر وہ خود ہی اُٹھ گیا۔ شاید باہر پیڑوں پر چہچہانے والی چڑیوں نے نیند میں خلل ڈالا تھا جبکہ میری آنکھوں سے نیند اُڑا دی تھی۔ پوری رات گزر جانے کے باوجود میں سوئی نہیں تھی۔

وہ بستر سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ”شکریہ...... کہ تم نے مجھے زندگی دی۔ یہ زندگی تمہاری ہے۔ تمہارے نام ہے اور تمہارے ہی کام آئے گی۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

مجھے یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ میں صرف ایک ناظر بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی مجھے رات کے مختلف پہر میں اس کی کہی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں نے اسے کمبل دینے کے بعد کہا تھا۔ ”تم آرام کرو، میں برابر والے کمرے میں جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”تمہیں آرام کے لیے تنہائی چاہیے ناں۔“

"نہیں......" اس نے کہا تھا۔ "مجھے تنہائی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تنہائی سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ ایک عذاب ہے جو میرے سر پہ مسلط ہے۔ آپ یہیں اسی کمرے میں ٹھہریں۔" پھر اس نے اپنا استخوانی ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں جو ایک دین دار گھرانے کی لڑکی تھی، ایسی لڑکی جس کی روح میں حیاء تھی مگر حالات نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ مندر مندر گھسیٹا تھا۔ الٹے سیدھے عمل کروائے تھے۔ پوجا پاٹ تک کروائے تھے۔ نتیجتاً محرم نامحرم کا احساس دل سے ختم ہو گیا تھا تبھی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ایسے نامحرم شخص کا جو یقیناً زندہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کی کھوپڑی میں خود اُٹھا کر لائی تھی اور جسم چل کر آیا تھا۔ اب دونوں مل کر ایک انسان کا روپ دھار چکے تھے اور میری نظروں کے سامنے اس کا جسم قدم بہ قدم چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

☆=======☆=======☆

اگلے روز چھٹی تھی۔ اتوار کا دن تھا اس لیے مجھے انشورنس کا کوئی کام نہ کرنا تھا۔ بڑے میاں بھی ابھی تک آئے نہیں تھے اس لیے میں کمرے میں لیٹی گزشتہ رات کے واقعات پر غور کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ یہاں مجھے شورویر نے بھیجا ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی مفاد ضرور ہوگا۔ احمد بھی ابھی تک پہنچا نہیں تھا۔ شورویر اسے ہی تو بھیجنا چاہتا تھا تاکہ بھائی بہن کے مقدس رشتے کو پامال کر کے مجھے اپنے چنگل میں پھانس لے۔ گناہ کی دلدل میں ڈبو دے تاکہ واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں اور فقیر بابا بھی میری مدد نہ کر سکیں۔

حقیقت کا ادراک مجھ پر ہو چکا تھا کہ شورویر میرا بہی خواہ نہیں ہے بلکہ فقیر بابا میرے بہی خواہ ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ اس بہانے دوست دشمن کی پہچان ہو گئی۔ کفر و شر سے نجات مل گئی۔

اطمینان جب نصیب ہو تو آنکھیں خود بخود بند ہونے لگتی ہیں۔ سورج طلوع ہونے کے بعد میں ہر جانب سے بے خبر ہو گئی۔

میں بے خبر سو رہی تھی کہ مجھے بڑے میاں نے آواز دے کر اُٹھا دیا۔ وہ کھانا لے کر آئے تھے۔ مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر بولے۔ ''بیٹی! صبح کا ناشتہ پڑے پڑے ٹھنڈا ہو گیا۔ اب میں کھانا لایا ہوں۔ منہ ہاتھ دھو کر کھالو۔''

میں نے تولیہ لیا اور باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ نہا لینے سے کسلمندی اُتر جاتی ہے۔

نہا کر، کھا کر میں پھر لیٹ گئی اور اسی کفن پوش کے بارے میں سوچنے لگی پھر اُٹھ کر سیر کرنے کی نیت سے باہر نکل آئی۔ شہر میں رہنے والوں کے لیے کھیت کھلیانوں میں بہت کشش ہے۔ میں کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈی پر بڑھتی جا رہی تھی کہ مجھے قبرستان کا احاطہ نظر آ گیا۔ پتا نہیں، میں کس خیال کے تحت اُدھر ہی بڑھتی چلی گئی۔ ٹھیک اس جگہ پہنچ کر میرے قدم تھم گئے جہاں سے میں نے کھوپڑی اُٹھائی تھی۔ وہ ایک خانقاہ تھی جس میں ایک بڑی سی دھنسی ہوئی قبر تھی۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ سینے میں چھپا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر تجسس کے تحت میں جھکتی جا رہی تھی۔ اس وقت مجھ پر عجیب قسم کا جوش اور ولولہ میرے سینے میں سلگ اُٹھا تھا اور کسی خطرے کا خیال کیے بغیر مجھ میں یہ دھن سما گئی تھی کہ جیسے بھی ہو، اس قبر کو میں اندر سے بھی دیکھ لوں۔ آس پاس کی قبروں کے تعویذ بڑے بڑے سنگین پتھروں سے تیار کیے گئے تھے اور چند قبروں پر سنگِ سفید چڑھا ہوا تھا اور یہ پتھر اس قدر جسیم تھے کہ مجھے یہ حیرانی ہوئی کہ یہ بھاری پتھر اس گاؤں نما شہر تک لایا کیسے گیا؟ بنگال کے پہاڑوں میں ایسے پتھر دریافت نہیں ہوتے۔ یقیناً انہیں مغرب میں واقع صوبوں سے منگوایا گیا ہوگا مگر مجھے آس پاس کی قبروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو بس اس ٹوٹی ہوئی قبر کے اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ اندر نسبتاً اندھیرا تھا۔ جب میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

قبر کے اندر تابوت بھی تھا اور اس تابوت میں ایک جوانِ رعنا سو رہا تھا۔ اس کے رُخساروں پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ سرتاپا کفن پوش تھا اور یہ وہی کفن پوش تھا جو میرے گھر میں بغیر سر کے آیا تھا اور الماری سے کھوپڑی لے کر اپنے کندھے پر رکھ لی تھی۔

پتا نہیں کیوں میں اس کفن پوش کو دیکھ کر عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی اور بھاگم بھاگ قبرستان سے نکل آئی تھی۔

اسی رات کا ذکر ہے۔ دیوار پر آویزاں گھڑی نے نصف شب کے گزرنے کا اعلان کیا تھا تو میں نے کمرے کی وہ کھڑکی جو پائیں باغ میں کھلتی تھی، اسے کھول لیا تھا۔ کمرے کی روشنی بند کر چکی تھی کیونکہ اندر اندھیرا ہو تو باہر پھیلی چاند کی روشنی زیادہ مزہ دیتی ہے۔ بارش کا موسم گزر چکا تھا

اس لیے چاند کی آب و تاب میں اضافہ محسوس ہو رہا تھا۔

میں نہیں سمجھتی کہ میری نظریں دھوکا کھا گئی تھیں یا کوئی حقیقت تھی کیونکہ میں نے باغ میں ایک سفید سی چیز کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن یہ جھلک صرف ایک لمحے کے لیے تھی۔ میرا دل بے تابی سے دھڑکنے لگا تھا لیکن میں اپنے دل کو قابو کیے باغ پر نظریں جمائے ہوئے کھڑی تھی کہ میں نے دیکھا، وہی کفن پوش چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

میں نے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''کیا آپ اندر ہیں؟'' وہ شستہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے جواب دو۔ تنہائی اور خوف کے سائے مجھے موت کی وادی میں لیے جا رہے ہیں۔''

میں نے فوراً دروازہ کھول دیا اور اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ ''اندر آ جاؤ۔ میں تمہاری ہی منتظر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آ ؤ گے۔''

وہ کمرے میں آ گیا۔ میں نے دروازہ مقفل کر دیا اور پردے تان دیئے۔ اس کے بعد میں نے شمع روشن کی اور آتشدان میں آگ جلا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے خشک لکڑیوں نے آگ پکڑ لی اور کمرے میں اچھی خاصی حرارت قائم ہوگئی۔

میرے دروازہ مقفل کرنے، پردے تاننے اور آگ جلانے پر کفن پوش نے کسی قسم کا اعتراض یا تبصرہ نہ کیا کیونکہ ایسے ماحول کا اب وہ عادی ہو چکا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب وہ آیا تھا تو آتش دان میں آگ سلگتے ہی وہ صوفے پر بیٹھ کر آگ تاپنے لگا تھا لیکن آج شب وہ ایک جدا حالت میں تھا۔ آج نہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اور نہ اس کا کفن لٹک رہا تھا بلکہ ایک شاہانہ سطوت اور وقار اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھتا ایسے جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں......'' وہ بولا۔ ''نہیں...... آج رہنے دو، کل یا پرسوں میں پھر آؤں گا، تب وہ کچھ بتاؤں گا جس کی وجہ سے آ رہا تھا۔''

وہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے کفن کو درست کیا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ گزشتہ شب مجھے کفن پوش کی نسبت ایک نیا تجربہ ہوا جو کہ قطعی غیر متوقع تھا۔ حسبِ معمول کھڑکی کے ذریعے باغ کے نظارے سے فارغ ہو کر اور یہ سوچ کر کہ آج رات کفن پوش کے دیدار سے محروم رہنا پڑے گا، میں بستر پر دراز ہوگئی۔ ابھی میں غنودگی کے عالم میں تھی کہ کسی نے دستک دی۔ میں ایک دم چونک پڑی اور اُٹھ کر کھڑکی کا پردہ کھینچا اور کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر باہر جھانکا۔

باغ میں بدستور سکوت طاری تھا اور کسی کی نقل و حرکت معلوم نہ پڑتی تھی۔ بہر حال اپنا شک رفع کرنے کی خاطر میں نے دروازہ کھولا تو ایک حیرت انگیز دریافت عمل میں آئی۔ دروازے کے باہر ایک سفید کاغذ پڑا تھا جسے متعدد بار تہہ کیا ہوا تھا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اسے اُٹھایا اور اس کی تہہ کھولی اس میں صرف چند حروف بے ڈھنگے سے انداز میں تحریر تھے جیسے ساتویں یا آٹھویں جماعت کا طالب علم شکستہ تحریر میں لکھتا ہے۔

''قبرستان میں مجھ سے ملو۔''

قبرستان چٹان کے اُلٹی طرف تھا اور یہ چٹان دراصل قصبے کا ایک حصہ تھی اور اس چٹان کو اندر سے تراش کر نگہبانوں کی کوٹھڑیاں بنائی گئی تھیں اور اس پر ایک برج قائم تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پیغام میرے لیے تھا۔ چنانچہ میں نے سرعت سے لباس تبدیل کیا ایک شکاری چاقو اور بھرا ہوا پستول اپنے ساتھ لے کر میں اپنے کمرے سے باہر آ گئی اور کمرا مقفل کر دیا۔

درختوں کے سایوں کی آڑ لیتی ہوئی میں اس چٹان کی جانب بڑھی جس کی نشاندہی کی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ مجھے کوئی دیکھ پائے۔ پھر میں چھپتی چھپاتی ہوئی قبرستان میں پہنچی۔

لیکن اس مقام پر پہنچ کر یہ معلوم کر کے میرا دل بجھ گیا کہ وہاں کسی کا نام ونشان تک نہ تھا لیکن میں نے دامن امید ہاتھ سے نہ چھوڑا اور وہیں چاندنی میں کھڑی منتظر رہی لیکن مجھے اس وقت یہ کہنے میں قطعی ندامت محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ اس دوران میں میرا ہاتھ پستول پر مضبوطی سے جما رہا۔

آخر میرا انتظار کامیاب ہوا اور میں نے چٹان کے سائے میں ایک سایہ اپنی جانب آتے ہوئے محسوس کیا۔ میں بے قراری سے اس کی جانب بڑھی۔ جب میں اس کے نزدیک ہوئی تو میں یہ کہنے والی تھی۔ تم نے اپنا مقبرہ کیوں چھوڑا لیکن یہ الفاظ میری نوک زبان پر ہی اٹک گئے۔

''تمہیں دیکھے کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے گویا صدیاں بیت چکی ہیں۔''

''میرا بھی یہی حال ہے۔'' اس نے جواب دیا اور اپنا ہاتھ نہایت آہستگی سے مجھ سے چھڑا لیا۔ ''میرا دل آپ کو دیکھنے کے لیے ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہا تھا۔''

''اب تم کب آؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں یہاں پہلے ہی کافی مصیبت اُٹھا کر پہنچا ہوں۔'' اس نے میرے کان میں سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ''نہ صرف تمہیں دیکھنے کے لیے بلکہ تمہیں ایک وارننگ دینے کے لیے۔''

''مجھے وارننگ دینے کے لیے؟'' میں نے محوِ حیرت ہو کر دریافت کیا۔ ''کیوں؟ آخر مجھے کون سا خطرہ درپیش ہے؟''

''واہ...... میں کیسے بتاؤں کہ کون سے خطرات آپ کو درپیش ہیں۔ میری زبان بند کی جا چکی ہے لیکن آپ اپنی آنکھیں کھول کر رکھیں وہ وار کرے گا۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی خطرہ کی پروا نہیں، موت نے کئی بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی جانب بلانا چاہا لیکن ہر بار میں نے اسے شکست دی۔ اب میں زندہ رہوں گی۔ اپنی خاطر نہیں بلکہ تمہارے لیے۔ لیکن تم مجھے یہ بتا دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''آپ ایک بہادر لڑکی ہیں اور یہ اقدار کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کاش...... خدا مجھے اتنی توفیق دیتا کہ میں آپ کو خطرے کی نوعیت سے آگاہ کر سکتا۔''

''خدا'' کے لفظ نے مجھ میں زندگی کی ایک نئی لہر سی دوڑا دی تھی۔ کیونکہ جن خونِ آشام گروہوں سے اب تک پالا پڑا تھا۔ وہ خدا کی

عظمتوں کے ہرگز قائل نہیں تھے۔ عذاب مسلط ہو جاتا ہے ان کے حق میں لیکن کھوپڑی جواب مکمل بن چکی تھی، اس نے باآسانی ''خدا'' کا لفظ اس انداز میں اپنی زبان سے ادا کیا کہ وہ اس برتر ہستی کے روبرو ایک دعا کی صورت میں تھا۔ میرے دل میں مسرت کا دریا موجزن ہو گیا تھا لیکن میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔

رات اب کافی ڈھل چکی تھی۔ وہ رخصت ہونے کے لیے تیار ہوا۔

ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور آسمان پر محوِ سفر چاند ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔

ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ اس کا خیال نہ مجھے تھا اور نہ اسے تبھی اس نے چونک کر کہا۔ ''بس اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ آپ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں، یہ ایک بے سود امر ہوگا۔ میں ہی آپ سے ملوں گا۔ بس اب الوداع لیکن ایک مرتبہ آپ پھر مجھے یقین دلا دیں کہ کیا آپ کو میری ذات سے اتنی گہری عقیدت ہے، جس کا اظہار آپ نے آج کیا ہے بس آپ کی یہی عقیدت میری تنہائیوں کی ساتھی ہے۔''

اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں بدستور بجلی کوند رہی تھی۔ اس سوال کے جواب میں میرے جذبات اس قدر اُمنڈ آئے تھے کہ زبان کو یارائے کلام نہ تھا۔

''اوہ...... آپ کی عقیدت میرے لیے ایک لازوال تحفہ ہے شاید یہی میری ان تنہائیوں کا ایک قدرتی معاوضہ ہے جو میرے سر پر مسلط کر دی گئی تھی۔'' بولتے بولتے وہ کچھ ہچکچا سا گیا بالآخر اپنے کفن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لباس کے باوجود......''

''یہی نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''بلکہ میں تمہاری وہ بھیانک جائے پناہ بھی دریافت کر چکی ہوں جہاں دن بھر......''

اس ذکر کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں دہشت کی ایک جھلک پیدا ہوئی اور وہ مجھ سے چند قدم پرے ہٹ گیا۔ زرد رنگ کی پیلاہٹ نے اس کے چہرے کی تمام سپیدی و سرخی اس کے چہرے سے زائل کر دی، جو دم بھر قبل موجود تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندوں کی دنیا سے نکل کر وہ مُردوں کی دنیا میں چلا گیا ہے۔

وہ لمحات ختم ہی ہونے میں نہ آتے تھے جبکہ میں اس کے بولنے کی منتظر تھی۔ آخر کار وہ نہایت ہی دھیمی اور مُردہ آواز میں بولا۔ ''آپ نے میرا مقام دریافت کر لیا لیکن کس طرح کب؟''

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ تمام حقیقت سچ سچ بیان کر دیتی۔

''میں قبرستان میں اتفاقاً جا نکلی تھی جہاں میں نے تمہیں تابوت میں مُردہ حالت میں پایا تھا۔''

''اور کیا آپ کو پھر صدمہ نہ ہوا؟''

''صدمہ تو ایک معمولی لفظ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے ایک دہشت سی ہو گئی تھی لیکن میں نے خود پر قابو پالیا اور اب تو یہ حال ہے کہ میں تمہاری اس قدر پرستار ہو چکی ہوں کہ خواہ تم روحوں کی دنیا سے تعلق رکھتے ہو، خواہ کسی خون چوسنے والے گروہ میں سے ہو، میرا دل اب صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔'' اس کے چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہوئے۔ ''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم صرف میرے لیے پیدا ہوئے ہو اور میں

تمہیں حاصل کر کے رہوں گی میں نہیں سمجھتی کہ کون سے مصائب تم پر نازل ہوئے ہیں لیکن اگر یہ مصائب انسان سے دور ہو سکتے ہیں تو دنیا کی کوئی بھی طاقت مجھے تمہاری مدد سے باز نہیں رکھ سکتی۔'' پتا نہیں میں کس قوت کے زیر اثر یہ الفاظ ادا کرتی جا رہی تھی۔

''کوئی بھی طاقت؟'' اس نے ان الفاظ پر زور دے کر کہا۔

''بے شک!'' میں نے اپنے جبڑے بھینچ کر جواب دیا۔ اس وقت مجھ میں جوش کا اس قدر لاوا اُبل رہا تھا کہ اگر وہ نادیدہ طاقت میرے سامنے موجود ہوتی جو اسے اس زندگی تک پہنچانے کی ذمے دار تھی تو میں اپنی جان کی بازی لگا دیتی۔

''لیکن آپ جانتی ہیں کہ لوگ کیا کہتے ہیں؟'' اس نے کہا۔'' کچھ کہتے ہیں کہ میں مر چکا ہوں اور مجھے دفن کر دیا گیا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ میں اس مخلوق سے تعلق رکھتا ہوں جو کبھی نہیں مرتی جسے خون چوسنے والوں کے نام سے لوگ یاد کرتے ہیں اور جن کی زندگی کا دارو مدار دوسروں کے خون پر ہوتا ہے۔ بالآخر وہ اپنے شکار کو بھی اپنے گروہ میں شامل کر لیتے ہیں۔''

''تم کوئی بھی ہو، مجھے قبول ہے۔''

''خدا بزرگ و برتر! مجھ پر اس سے زیادہ مہربانی کیا کر سکتا ہے۔'' اس نے رسان سے کہا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔

اسے جانے کو تیار دیکھ کر میں نے پوچھا۔''ہم دوبارہ پھر کب مل سکیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت جلد.....'' اس نے جواب دیا۔''ہم بہت جلد ایک دوسرے سے ایک اچھے اور بہتر ماحول میں مل سکیں گے۔''

''مجھے کوئی نشانی دو جو مجھے تمہاری یاد دلاتی رہے۔''

ایک لمحے کے لیے وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ آخر چند لمحے بعد اس نے اپنے سفید کفن میں سے ایک ٹکڑا پھاڑا۔ اسے اپنے لبوں سے بوسہ دیا اور میرے حوالے کیا اور کہا۔

''بس اب میرے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔ اب آپ یہاں سے چلی جائیں۔ اس ٹکڑے کو ہمیشہ کے لیے سنبھال کر رکھیں۔ بس یہی میری نشانی ہے۔ مجھے اپنی تنہائیوں میں اس پھٹے ہوئے کونے کو دیکھ کر قرار رہے گا کہ اس لباس کا ایک حصہ آپ کے پاس ہے۔ آخر ایک روز وہ بھی آئے گا جب آپ اس کفن کے ٹکڑے پر فخر کریں گی جو اس وقت میں نے آپ کو دیا ہے۔''

''اور میں زندگی کے آخری لمحے تک اس نشانی کی حفاظت کروں گی۔'' اس کے بعد میں وہاں سے رخصت ہوئی۔ جب چٹان پر سے اُتر کر میں نے مڑ کر دیکھا تو کفن پوش وہاں سے غائب تھا۔ میں کفن کے ٹکڑے کی نشانی لیے اپنے کمرے کی جانب چلی آئی۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا اور یہ عرصہ میں نے کانٹوں کی سیج پر بسر کیا۔ باغ کے نظارے سے لطف اندوز ہو کر میں سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ مجھے دروازے پر اسی طرح دستک سنائی دی جس کا تجربہ میں گزشتہ دو مرتبہ کر چکی تھی۔ میں نے بستر پر سے اُٹھ کر فوراً دروازہ کھولا۔ وہاں کفن پوش کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ البتہ میرے قدموں کے پاس ایک تہہ کیا ہوا سفید کاغذ حسبِ معمول پڑا تھا میں نے کاغذ کو اُٹھایا اور کمرے کی روشنی میں لا کر اسے پڑھا۔ اس میں درج تھا۔

''اگر آپ بدستور پایہ استقلال کے ساتھ میری محبت کی راہ پر گامزن ہیں تو کل رات عبادت گاہ میں نصف شب کے عرصے سے پاؤ گھنٹا قبل مجھ سے ملاقات کریں۔ آپ قطعی خفیہ طور پر اور اکیلی ہی آئیں اور آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ کسی قسم کا خوف آپ کی ثابت قدمی میں لغزش پیدا نہیں کر سکتا تو بس آپ آجائیں میں آپ کا منتظر رہوں گا۔''

یہ خط پا کر مجھے تمام شب نیند نہ آسکی۔ کسی ڈر، خوف یا دہشت کے زیر اثر نہیں بلکہ مجھ پر مسرت آگیں لمحات اپنی مسرتیں نچھاور کر رہے تھے اور وہ وقت اب قریب آرہا تھا جبکہ میں کفن پوش کو مکمل طور پر دیکھ سکوں گی۔ چنانچہ میں شب بھر بستر پر بے قراری کے عالم میں کروٹیں بدلتی رہی۔
جب مقبرے کے دروازے کے سامنے چاندنی میں کھڑے ہو کر میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا مجھے ابھی ایک منٹ مزید انتظار کرنا تھا۔ چنانچہ مقبرہ کے صدر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ماحول کا جائزہ لیا۔ ہر جانب ایک ہیبت ناک سکوت چھایا ہوا تھا۔ سمندر کی جانب سے تیز و تند بحری ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی کان کے پردے میں گھسی جاتی تھیں اور بادلوں کے ہلکے ہلکے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ حدِ نظر تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ صدر دروازے کے عین اوپر چاند تارا جسے میں روزانہ ایک طائرانہ نظر سے دیکھ لیا کرتی تھی آج شب مجھے یہ بڑی سنگین ایک عجیب و غریب نوعیت کی حامل نظر آتی تھی لیکن اس ماحول کے باوجود میرے لبوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں جس امتحان سے دوچار ہونے والی تھی، یہ منظر شاید اس سلسلے کی اولین کڑی تھی۔ مسرت کی منزلوں تک پہنچنے کے لیے لق و دق صحراؤں اور تنگ و تاریک راہوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے اور میں ان مراحل کو طے کرنے کے لیے بالکل تیار تھی۔
ایک لمحہ کے لیے مجھے خیال پیدا ہوا کہ کیا میں جان بوجھ کر خود کو اس گروہ کے حوالے کر رہی ہوں جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کا خون چوسنے پر ہے اور وہ لوگ جو کبھی نہیں مرتے، جو شیطان کے پیرو ہوتے ہیں اور شیطان انہیں اس کی ابدی شیطانی زندگی عطا کر دیتا ہے لیکن دوسرے لمحے ہی یہ خیال مجھے دل سے نکالنا پڑا۔

اس طرح ملے جلے خیالات کا لبادہ پہنے میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ مقبرے کا صدر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔
جب میں نے دروازے کو ایک ہلکی سی آواز پیدا کرتے ہوئے بند کیا تو مجھے اب تاریکی کا احساس ہوا۔ میں چاند کی منور روشنی سے ایک دم تاریکی میں داخل ہو گئی تھی۔ مقبرے کے ہال میں بھی ایک سکوت اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے قدم آہستہ آہستہ اٹھائے مبادا کسی چیز سے ٹکرا نہ جاؤں۔ وہ مثل مشہور ہے کہ تاریکی کے وقت انسان پر ڈراؤنے خیالات آسوار ہوتے ہیں، وہی میرا حال اس وقت تھا عجیب و غریب بھیانک خیالات میرے دماغ کے پردوں پر ابھرتے چلے آرہے تھے۔
آخر میں نے ایک دم اپنے ذہن کو ایسے روح فرسا خیالات سے یکسر پاک کر دیا۔ کیونکہ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے ایسے آزمائشی مراحل طے کرنے تھے جن کا ذکر کفن پوش نے کیا تھا اور اس امر کے لیے مجھے کافی حوصلہ و ثابت قدمی کی ضرورت تھی۔ آوارہ افکار سے مجھے کچھ دیر کے لیے نجات مل گئی لیکن وہ بھیانک تاریکی جو وہاں ہال میں مسلط تھی اس سے نجات پانا ایک ناممکن امر تھا۔ چلتے ہوئے کسی شے سے میرا پاؤں ٹکرایا۔ میں گرنے کو تھی کہ مجھے فوراً ایک سہارا مل گیا۔ میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ہال میں جو بوسیدہ فرنیچر موجود تھا، شاید میں اس سے ٹکرائی تھی۔

روشنی پانے کی ایک زبردست خواہش میرے دل میں اُبھر رہی تھی۔ دیا سلائی کی صرف ایک تیلی میرے لیے کافی تھی۔ اتنی سی روشنی ہی میرے من میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر سکتی تھی لیکن صد حیف کہ ایسا ابھی نہ کر سکتی تھی مبادا یہ روشنی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو جسے ایک طلسم سے رہا کرانے کی خاطر میں یہاں تک پہنچی تھی اور تمام محنت اور کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔ اس وقت جو صعوبت و کوفت میں برداشت کر رہی تھی، یہ سب کچھ اپنی بھلائی یا اپنے محبوب کی خاطر برداشت نہ کر رہی تھی بلکہ ان نادیدہ طاقتوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور انہیں ہمیشہ کے لیے معدوم کرنے کے لیے کر رہی تھی جنھوں نے ایک معصوم زندگی پر اس قدر فتح حاصل کر لی تھی کہ وہ چپ چاپ اس عذاب کو برداشت کیے جا رہی تھی۔ میں اس کی روح کو ان نادیدہ طاقتوں کے چنگل سے رہائی دلانا چاہتی تھی تاکہ اس کے ذریعے شورویر پر فتح حاصل کر سکوں۔

آوارہ خیالات پھر پردۂ سیمیں کی تصویر کی مانند میرے دماغ میں اُجاگر ہو گئے اور مجھے ان ہولناک رسومات کا خیال آ گیا جو دنیا کے مختلف غیر تہذیب یافتہ حصوں میں رائج ہیں۔

لاطینی امریکہ کے جنگلی اپنے شکار کا محض دل نکال کر بقیہ جسم جانوروں کے سامنے ڈال دیتے ہیں لیکن مجھے اس درندگی سے کیا تعلق، ان وحشیانہ رسومات کو یاد کرنے سے کیا فائدہ، آج شب میں تو ایک پاک اور بے لوث عقیدت کے جذبہ کے تحت یہاں تک آئی ہوں۔ راہِ راست سے اب مجھے ڈگمگانا نہیں چاہیے۔

میں انہی خیالات میں غلطاں آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر راستہ ٹٹول ٹٹول کر بڑھ رہی تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ میں اس مقام تک پہنچ چکی ہوں جس کے عقب سے سیڑھیاں نیچے زمین دوز مقبرے کی جانب جاتی ہیں یہاں پہنچ کر میں رُک گئی۔ ایک بھیانک سکوت، خاموشی اور تاریکی کا تسلط بدستور قائم تھا۔

میں اپنا فرض ادا کر چکی تھی اس کے بعد پردہ غیب سے کیا امر ظہور میں آتا ہے اس کا حال مجھے معلوم نہ تھا کفن پوش کی جانب سے جو چٹھی مجھے موصول ہوئی تھی اس کے مطابق میں نے اپنا عمل مکمل کر دیا تھا۔ اب میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اس تاریکی کے عالم میں اگلے واقعات کی منتظر رہتی۔

چنانچہ میں نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا اور چپ چاپ کوئی آواز پیدا کیے بغیر وہاں کھڑی رہی۔ تاریکی میں اب میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی کچھ خوگر ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ صدر دروازے کی درزوں میں سے بھی چاندنی جھانک رہی تھی۔ چنانچہ اب جبکہ میں ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ مقبرے میں جو سکوت طاری تھا، وہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے اور وہاں میرے علاوہ چند دوسرے لوگ بھی موجود ہیں جو دبے پاؤں چل پھر رہے ہیں۔ ان کے سانس لینے کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی۔

ایک مدھم سی شمع ہال میں روشن ہوئی۔ جس کی روشنی اس قدر مدھم تھی کہ دمِ واپسی پر ٹمٹماتا ہوا دیا بھی اس سے بہتر روشنی دیتا ہے۔ چنانچہ اس تاریکی اور روشنی کا امتزاج مقبرے میں جو منظر پیش کر رہا تھا، وہ نظارہ میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ شمع نامعلوم ہاتھوں نے چبوترے کے نزدیک روشن کی تھی۔ میں نے اس مدھم سی روشنی میں دیکھا کہ چبوترے کے نزدیک ایک میز موجود ہے جس پر ایک بڑی مجلد کتاب کھلی پڑی ہے۔ اس

کتاب کے دونوں صفحات پر دو انگوٹھیاں موجود تھیں۔ ایک انگوٹھی نقرئی اور دوسری طلائی کی تھی۔ دو تاج پڑے تھے۔ ایک تاج پر سونے کے تاروں سے کام کیا ہوا تھا اور دوسرے تاج پر چاندی کی تاریں لہرا رہی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ مقبرے میں ان اشیاء کی موجودگی لاحق ہوتی ہے لیکن ان چیزوں کی نوعیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہاں کسی شادی کی رسم کی ادائیگی کے لیے لائی گئی ہیں۔ میرے دل میں خوف کی جو لہر موجود تھی، وہ غائب ہو گئی۔ میں مسرت کے عالم میں آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے ہال میں چاروں طرف نگاہ ڈالی لیکن ان سایوں میں سے جو اس وقت وہاں نقل و حرکت کر رہے تھے، میں اس کفن پوش کو نہ پا سکی۔

اچانک کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے اس مردِ پُر اسرار کو دیکھا جس نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ ایک لمبا چغہ اپنے بدن پر پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چغہ پر ایک طاؤسِ رقصاں بنا ہوا تھا۔ جس پر سنہری تاروں سے کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ سر سے گردن تک اس نے خود کو ایک سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا البتہ اس کی چمک دار آنکھیں نقاب میں سے صاف نظر آ رہی تھیں۔

وہ مردِ نا معلوم مجھے میرا ہاتھ تھامے ہوئے چبوترے کے سامنے لے آیا جہاں وہ کتاب کھلی پڑی تھی اور تاج موجود تھے۔ یہاں ایک نئی دریافت عمل میں آئی۔

بائیں جانب فرش پر ایک تابوت موجود تھا جو کھلا پڑا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں معلوم کر لیا کہ یہ وہی تابوت تھا جس میں اس روز زمین دوز مقبرے میں کفن پوش کو مُردہ حالت میں دیکھ چکی تھی لیکن اس وقت وہ تابوت میں موجود نہیں تھا۔

میرا ہاتھ چھوڑ کر وہ مرد رخصت ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے پھر تنہائی کا احساس ہوا۔ لرزتے ہوئے سائے بھی اب ہال میں سے غائب تھے۔

جو دعائیں مجھے یاد تھیں میں نے صدقِ دل کے ساتھ انہیں زبان پر لانا چاہا لیکن میرے لب خشک تھے اور حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے۔ میں بار بار سوکھی زبان کو اپنے لبوں اور حلق سے مس کرتی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور میں زبان سے دعائیں ادا نہ کر سکی لیکن بسم اللہ کہہ گئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھے ایک دلجمعی اور تسکینِ قلب سی حاصل ہو گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک نور سا مجھ پر ظاہر ہو رہا ہے۔

میں اس غیبی تائید کو پا کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت میں بالکل تنہا مقبرے میں موجود تھی۔ میرے سامنے کتاب بدستور کھلی پڑی تھی۔ اس پر دو انگشتریاں موجود تھیں۔ وہ دونوں تاج اپنی جگہ پر پڑے تھے اور وہ تابوت کھلا پڑا تھا۔

چند لمحے بعد ہال میں پھر نقل و حرکت کے آثار نمودار ہوئے اور دیواروں پر لرزاں سائے پھر متحرک ہو گئے۔ وہ لوگ اس مرتبہ تعداد میں کافی تھے اور چبوترے کے عقب سے نمودار ہوئے تھے۔ شاید زمین دوز مقبرہ میں سے آئے تھے ان میں سب سے آگے وہی مردِ نا معلوم تھا جس نے ایک لمبا عمامہ پہن رکھا تھا اور جو مجھے چبوترے کے سامنے کھڑا کر کے رخصت ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ اس کے ہمراہ ایک اور ہستی بھی تھی۔

یہ کفن پوش تھا جو اس راہب کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیئے خراماں خراماں چلا آ رہا تھا لیکن کس عالم میں، اس کا جسم بدستور کفن میں ملبوس تھا۔ سر کے بالوں میں پھول اس انداز سے گوندھے ہوئے تھے کہ سر کے بال ان میں چھمٹ کر رہ گئے تھے۔ ہاتھوں میں وہ پھولوں کے گچھے سنبھالے

ہوئے تھا جن کی نسبت مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہار تھے۔ اس کفن پوش کی آمد کے ساتھ ہی ہال کی فضا پھولوں کی خوشبو سے مہک اُٹھی۔ اس شخص نے کفن پوش کو میرے بائیں جانب کتاب کے سامنے لا کھڑا کیا اور خود ہمارے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ان نامعلوم سیاہ نقابوں میں ملبوس افراد نے ہم دونوں کے برابر جگہ سنبھال لی۔ کچھ نقاب پوش ہمارے عقب میں قطار در قطار کھڑے ہو گئے تھے۔

اس شخص نے میرے محبوب کو اپنا دایاں ہاتھ کتاب پر رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بلا چوں چرا اپنا دایاں ہاتھ کتاب کے صفحات پر رکھ دیا۔ اس کے بعد راہب نے مجھے اپنا بایاں ہاتھ اس کے ہاتھ کے اوپر رکھنے کو کہا۔ میں نے بلا تامل اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کافی دنوں کے بعد مجھے اس کے جسم کا لمس نصیب ہوا تھا۔ اگرچہ یہ لمس نہایت ہی بھیانک ماحول میں ہوا لیکن میرے دل کو ایک طمانیت سی ہوئی کہ وہ زندہ اور صحیح سلامت میرے پہلو میں موجود تھا۔

اس کے بعد دو موم بتیاں لائی گئیں۔ اس نے انہیں روشن کیا۔ ان کی روشنی بھی نہایت معمولی اور مدھم تھی اور یہ موم بتیاں ہمارے ہاتھوں میں دے دی گئیں۔ تاکہ ایک دوسرے کے چہرے اچھی طرح دیکھ سکیں۔ شمع کی روشنی میں بے تاب نظروں کے ساتھ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ میرے ہاتھ میں تھامی ہوئی شمع کی لَو اس کی آنکھ کی پتلیوں میں لرز رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حسرت کی لہریں رقصاں تھیں۔ چند لمحے ہم دونوں ہاتھوں میں شمع پکڑے ایک دوسرے کے چہروں پر نظریں ڈال کر ایک دوسرے کے دل میں سا جانے کی سعی میں مصروف رہے۔ بالآخر راہب نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا اور بنگلہ زبان میں مجھ سے سوال کیا کہ یہاں جو رسومات عمل میں لائی جائیں گی۔ کیا مجھے وہ منظور ہیں۔ اس کے جواب میں میرے نزدیک کھڑے ہوئے نقاب پوش نے چند خاص الفاظ ادا کیے اور مجھے دہرانے کے لیے ہدایت کی۔ میں نے اس کے الفاظ دہرائے۔

یہی سوال کفن پوش سے کیا گیا۔ اس کا جواب اس نے ایک تمکنت اور شاہی وقار سے دیا لیکن میری ایک تشویش بدستور قائم رہی وہ یہ کہ راہب کی گفتگو اور اس کے سوالات میں مجھے کفن پوش کا نام معلوم نہ ہو سکا جسے جاننے کے لیے میں بے تاب تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس قدر دھیمی آواز کے ساتھ بول رہے تھے کہ مجھے ان کے تلفظ اور لہجہ کی سمجھ ہی نہ آتی تھی۔ اس کے بعد رسومات کا دور شروع ہوا۔ راہب نے کھلی ہوئی کتاب کے اوراق میں سے پڑھنا شروع کیا پھر ایک منظم کورس شروع ہوا۔ تمام نقاب پوش راہب کی آواز کے ساتھ مل کر ایک ہی آواز بلند کرتے لیکن وہ آواز اس قدر دھیمی تھی کہ صدر دروازے کے باہر بمشکل سنائی دیتی ہو گی۔

اس کے بعد طلائی انگشتری میری انگشت میں پہنا دی گئی اس کے بعد پھر وہی کورس شروع ہوا جو شاید خیر و برکت کے لیے ایک نشان تھا اور وہ نقرئی انگشتری کفن پوش کی انگشت میں پہنا دی گئی اس کے بعد پھر وہی دعا شروع ہوئی جس کا مقصد تھا کہ دو روحوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان نقاب پوشوں نے اپنا عمل شروع کیا۔ جو ہم دونوں کے بازوؤں پر کھڑے تھے۔ انہوں نے باری باری ہماری انگشتریاں تبدیل کرنا شروع کیں۔ یہ تبدیلی دو بار عمل میں آئی آخر میں جب یہ عمل ختم ہوا تو وہ نقرئی انگشتری جو میں پہنے ہوئے تھی اس کے حصہ میں آئی اور اس کی طلائی انگشتری میری انگشت میں آئی۔ جو دو شمعیں ہمارے سامنے رکھی گئی تھیں وہ گل کر دی گئی تھیں کیونکہ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد پھر دعاؤں اور خیر و برکت کا منظوم کورس شروع ہوا جس کے خاتمے پر سنہری تاج میرے سر پر رکھ دیا گیا جو اس وقت وہاں موجود تھا اور نقرئی تاروں والا تاج کفن پوش کے سر پر

رکھا گیا۔ پھر اس تاج کے ساتھ بھی وہی عمل دہرایا گیا جو قبل ازیں انگشتریوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ نو مرتبہ ہمارے تاج بدلے گئے۔ آخر میں نقرئی تاج میرے سر پر رکھا گیا اور سنہری تاج کفن پوش کے حصہ میں آیا۔

اس کے بعد نقاب پوش کے اشارے پر میں اور کفن پوش راہب کے سامنے دوزانو ہو گئے۔ جس نے ہم دونوں کو خیر و برکت کی دعا دی۔

جب ہم دونوں راہب کے سامنے کھڑے ہوئے تو اس نے میرا بایاں ہاتھ تھاما اور مجھے اپنے دائیں ہاتھ سے کفن پوش کا ہاتھ تھامنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ میں نے اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ دوسرے نقاب پوش کے ہاتھ میں دیا۔ اس طرح تمام نقاب پوشوں نے ایک دائرہ سا قائم کر دیا تھا اور ہم اس میز کے گرد دائرہ کی شکل میں گھومنے لگے۔ جس پر کتاب کھلی پڑی تھی اس کے ساتھ ان کا ہم آہنگ کورس جاری تھا۔ جو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس عمل کے بعد نقاب پوش اور راہب اس طریق سے دائرہ سے الگ ہوئے کہ آخر میں کفن پوش میرے بازوؤں میں تھا۔ ہمارے سروں سے تاج اُتار لیے گئے تھے اس کا مطلب تھا کہ رسومات پایہ تکمیل تک پہنچ گئیں۔

ایک مرتبہ پھر ہم عبادت گاہ کی گھٹی گھٹی فضا سے نکل کر باہر کھلے مقام پر آ گئے تھے۔ جہاں تازہ ہوا نے وہ تمام تھکان رفع کر دی جو عبادت گاہ کی تاریکی کی وجہ سے طاری ہو گئی تھی۔ چاند بدستور پوری آب و تاب سے سفر کر رہا تھا۔ میں اسے سہارا دیئے دور تک لے آئی جہاں سے قبرستان کا چاندنی میں صاف نظارہ ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر وہ رُک سا گیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بس اس مقام پر سے اب مجھے رخصت ہونا چاہیے۔“

میں وہیں پر کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور وہ شخص جس کی سوکھی ہوئی کھوپڑی میں نے ایک شکستہ قبر کے نزدیک سے لا کر الماری میں رکھی تھی اور وہ کھوپڑی جو خود بخود ڈائر نے بھی لگی تھی، مجھ سے مخاطب بھی ہوئی تھی، پھر اسی سوکھی ہوئی کھوپڑی کو ایک بے سر کے جسم نے پہن لیا تھا اور ایک مکمل انسان بن گیا تھا جس کے ساتھ میں نے آج کی رات گزاری تھی۔ کئی رسوم ادا کرائی تھیں۔ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ ذہن کو جھٹکا سا لگا اور میں چونک گئی کہ میں کیسے سحر میں گرفتار تھی؟ کیوں اسے اپنا سب کچھ مان رہی تھی؟ وہ تو ایک مُردہ شخص ہے، پھر اس کے لیے میں اپنے دل میں اتنی کشش کیوں محسوس کر رہی تھی؟ کیا واقعی میری شادی اس سے ہو گئی ہے؟

اس خیال کے آتے ہی میرے دل و دماغ میں غصے کی لہر سی دوڑ گئی اور میں اس کے پیچھے دوڑی۔

وہ جو ایک سوکھی کھوپڑی کی شکل میں مجھے ملا تھا پھر جیتا جاگتا انسان بن گیا اور میں نے خود کو ایک عجیب کیفیت میں محسوس کیا کہ کچھ پُراسرار سائے سے لوگوں نے میری اس سے شادی کرا دی۔

وہ شخص مُردہ تھا پھر میں کیسے اس کی بیوی بن گئی اور میں اس کے لیے اپنے دل میں جگہ بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ اسی لیے جب وہ جانے لگا تو میں اس کے پیچھے دوڑی تھی۔ یہ دوڑ محبت کے زیر اثر نہ تھی بلکہ غصے میں دوڑی تھی مگر کچھ ہی دور گئی تھی کہ میرے پیروں میں زنجیر سی پڑ گئی۔ میں تھم گئی اور حیرت سے اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

میرے دائیں اور بائیں ایک دو نہیں تقریباً درجن بھر کھوپڑیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔ کہیں وہ میرے جسم سے ٹکرا نہ جائیں اس خیال سے میں ان سے بچنے کی کوشش کرنے لگی پھر بھی ہوا میں تیرتی ایک کھوپڑی مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس وقت مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے جسم میں انگارے سے بھر

گئے ہوں۔ میں آگ میں جل رہی ہوں۔ بے انتہا ضبط کے باوجود میرے ہونٹوں سے کراہ نکل گئی تھی۔ کھوپڑیاں بدستور میرے آگے پیچھے غوطہ لگا لگا کر میرے قریب سے گزر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرے اردگرد رقص میں مصروف ہیں اور میرے لیے ان کے چنگل سے نکلنا ناممکن سی بات ہے۔ تبھی مجھے اپنے سر پر لطیف سا بوجھ محسوس ہوا۔ میں نے بے اختیار نظریں اُٹھا دیں۔ میری پیشانی کے اوپر بالوں کے لچھے کے درمیان ایک کھوپڑی براجمان تھی۔ وہ انتہائی کریہہ الصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کی باچھوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ قہقہے لگا رہی تھی۔

دیگر کھوپڑیوں نے ہنوز حصار سا قائم کر رکھا تھا۔ میرے سر پر براجمان کھوپڑی جیسے میرے دماغ میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنا سر درد سے پھٹتا ہوا محسوس کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ایک دھماکہ ہوگا اور میرے دماغ کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔

''زندگی اور موت بھگوان کے ہاتھ میں ہے مگر اس وقت تیری شکتی میرے ادھیکار میں بھی ہے۔'' شورویر کی آواز گونجی۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں اس کی آواز اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اگر میں چاہوں تو تمہیں ان کھوپڑیوں کے ساتھ زندہ درگور کر دوں مگر میں تمہیں موت کی سزا نہیں دوں گا۔ کیونکہ میں رحم دل ہوں۔ ظالم نہیں پھر تم کو میں پسند بھی کرتا ہوں۔''

شورویر کی باتوں نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میں اس سے کیسے نمٹوں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر زناٹے سے ہاتھ گھمایا ہو۔ وہ کھوپڑی جس نے میرے بالوں میں پناہ لے رکھی تھی وہ اُڑ کر دور جا گری پھر تو ایسا لگا جیسے وہاں بھونچال آ گیا ہو۔

وہ دو کھوپڑیاں تھیں جو ایک دوسرے کا پیچھا کر رہی تھیں کبھی ایک اوپر اُچھل جاتی تو کبھی دوسری۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو رگید رہی ہوں۔

ابھی ان دونوں کی رگیدم رگیدی جاری تھی کہ ایک اور کھوپڑی اُڑتی ہوئی آئی اور اس جنگ میں کود پڑی۔ دو کھوپڑیاں ایک کو دوڑا رہی تھیں۔ وہ تینوں ہوا میں ڈائیو کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کچھ چمکتی ہوئی تھی اور باقی کچھ دو کچھ میلی میلی سی۔ دراصل چمکدار کھوپڑی وہ تھی جو میرے سر پر آ بیٹھی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یہ تو میری دشمن ہے مگر باقی دونوں میری حمایت میں آئی ہیں۔ بعد میں آنے والی دونوں کھوپڑیوں نے بالآخر اسے گھیر ہی لیا۔ ایک نیچے سے اسے ٹکر مار رہی تھی تو دوسری اوپر سے اور پہلے والی کھوپڑی بے حال تھی۔ ٹھک ٹھک کی آواز گونج رہی تھی کہ یکا یک چمکدار کھوپڑی نے غوطہ لگایا اور پھر مغرب کی سمت پرواز کرتی چلی گئی۔ گویا وہ ہوا میں غائب ہوگئی تھی۔ باقی دونوں کھوپڑیاں پرندوں کی طرح اُڑتی ہوئی سامنے کی کارنس پر جا بیٹھیں۔

مجھ پر اب تک سکتے کی سی کیفیت طاری تھی کہ ایک کھوپڑی بولی۔ ''تمہیں ڈر تو نہیں لگا ناں۔''

میں نے چونک کر جھرجھری لی پھر بولی۔ ''ڈر...... کیسا ڈر؟''

''شورویر کے منتر کا ڈر...... یہ کھوپڑی تمہاری دوست کھوپڑیوں میں سے نہیں ہے بلکہ اسے تو اسی نے بھیجا تھا۔''

''مگر تم کون ہو اور کیوں میری مدد کر رہی ہو؟''

''میں تمہاری مدد نہیں تمہاری حفاظت کر رہا ہوں کیونکہ تم میرے لیے بنی ہو۔ یاد کرو ہماری شادی بھی ہو چکی ہے۔ ابھی رات ہی میں تو ہوئی ہے۔''

اس کی بات سن کر میرے دماغ کی چولیں ہل گئیں۔ تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے ترنخ کر جواب دیا۔

’’سنو تم جو کوئی بھی ہو میں کوئی ایسی ویسی نہیں ہوں۔ پھر میرے پاس طاقت بھی ہے۔‘‘

’’دو چار جاپ کرنے سے کوئی بہت بڑا تانترک نہیں بن جاتا۔‘‘ پھر اس نے توقف کرنے کے بعد کہا۔’’تم میری محتاج ہو اور رہو گی۔‘‘

میں عجیب مخمصے میں پڑ گئی تھی کہ ایک شد نہ دو شد، ابھی تک شورویر تو دشمن تھا ہی ایک اور دشمن پیدا ہو گیا۔

’’کیا سوچنے لگیں؟‘‘ اس نے پھر سوال کیا۔

’’یہی کہ تم سے پیچھا کیسے چھڑایا جائے۔‘‘

’’یہ ناممکن سی بات ہے اب تم مجھ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں اس لیے میں تمہیں وقت دے رہا ہوں۔ مجھے عرصے بعد آزادی ملی ہے۔ اس لیے میں اس آزادی کا لطف اُٹھانے جا رہا ہوں۔ اب پندرہ دن بعد آؤں گا۔ اس دوران میں تم اچھی طرح غور کر لو۔‘‘ کہہ کر وہ کھوپڑی ہوا میں پرواز کرتی ہوئی کارنس پر جا کر بیٹھ گئی۔

☆=======☆=======☆

اگلے روز ناشتے کے وقت احمد کا تار موصول ہوا۔

''کل کسی وقت حسن پور آ رہا ہوں۔''

بڑے میاں کو ملازمت دینے کے تیسرے ہی دن میں نے اپنا تعارف کرا دیا تھا۔ انہیں بتا دیا تھا کہ میں غیر نہیں آپ کی بھتیجی ہوں۔ آپ کے سوتیلے بھائی کی بیٹی۔ پھر انہیں ابو امی کی موت کا بتایا تھا۔ انہوں نے یہ خبر جا کر تائی کو سنائی تھی اور تائی اماں جو ازل کی عیار تھیں وہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ میرے ہاں اُٹھ آئی تھیں۔ انہوں نے اپنے آوارہ بدقماش بیٹے سلطان سے میرا رشتہ بھی طے کر دیا تھا۔ وہی اب گھر کا انتظام سنبھال رہی تھیں۔ اسی لیے تار کا نام سن کر گھبرا اُٹھی تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح صرف کسی کی موت یا حادثے کی ہی خبر آتی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے میں نے ایک لڑکے کو بھائی بنایا تھا اب وہ مجھ سے ملنے کے لیے حسن پور آ رہا ہے۔ تائی کے لیے یہ خبر بھی حادثے کی اطلاع سے کم نہیں تھی۔ پوچھا۔ ''اکیلا آئے گا؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں اکیلا ہی آئے گا۔ بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے علاوہ اس دنیا میں اب اس کا کوئی نہیں۔''

''تم تو موجود ہو۔'' انہوں نے طنز سے کہا۔ ''دیکھو بیٹی! میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ایسے بھائی بہن کے رشتے کو میں خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ مجھے دھوکا دینا آسان نہیں۔''

''آپ تو بیٹھے بٹھائے بدگمانی کا شکار ہو رہی ہیں۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ احمد کو سگے بھائی کے برابر سمجھتی ہوں۔ وہ آئے گا تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہ بھی مجھے اپنی بہن سمجھتا ہے۔''

''میں پوچھتی ہوں اسے ضرورت ہی کیا ہے یہاں آنے کی؟ یاد رکھو...... اگر اس گھر میں عشق عاشقی کا کوئی کھیل کھیلا گیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا جب تک سلطان سے تمہارا رشتہ جوڑا نہ تھا مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں تھی لیکن اب میں خاموش نہیں رہ سکوں گی اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ ہمارے خاندان کی عزت خاک میں ملاؤ گی، کسی سے آنکھ لڑاؤ گی تو خاطر جمع رکھو۔ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ ہمارا وقت ضرور بدل گیا ہے لیکن حسن پور میں آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہاں کی لڑکیوں کو اپنی بچیاں سمجھتے ہیں۔ عزت کی خاطر وہ تمہارے جسم کی تکا بوٹی کر دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''پیش از مرگ واویلا کرنے سے کیا فائدہ؟ پہلے احمد کو آ جانے دیجیے پھر اگر آپ کو میری یا اس کی حرکت سے یہ اندازہ ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن نہیں سمجھتے تو جو جی میں آئے کر گزریں میں اُف بھی نہیں کروں گی۔''

''تم اسے یہاں آنے سے منع نہیں کر سکتیں؟ میرا مطلب ہے کہ تار یا ٹیلی فون سے اطلاع دے دو کہ وہ اپنی روانگی ملتوی کر دے۔''

''وہ ڈھاکا سے روانہ ہو چکا ہوگا۔'' میں نے انہیں سمجھایا۔ ''اور کوئی ایسا طریقہ میری نظر میں نہیں ہے کہ اسے ٹرین میں پیغام پہنچایا جا سکے۔''

تائی نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آتا۔ تمہاری ماں بھی اسی طرح باتیں بنایا کرتی تھی۔''

''بس تائی بہت ہو چکا۔ آپ میری امی کے بارے میں آئندہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالیں۔''

''یہ بھی خوب رہی۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کو کہہ رہی ہو بات میں بات نکلتی ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے۔ تمہارا منہ بولا بھائی آتا ہے تو شوق سے

آئے لیکن نہ تم اس سے بات کرو گی اور نہ وہ تم سے۔ تم کو جو کچھ کہنا سننا ہو، میری اور سلطان کی معرفت کہا سنا جا سکتا ہے۔''

''مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔'' میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

سہ پہر کو تفصیلی رپورٹ لینے کے لیے نسیم آیا اب وہ مجھ سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ ''کہو پارٹنر بزنس کا کیا حال ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ اب تک گیارہ ایجنٹ مقرر کر چکی ہوں ایک لاکھ روپے سے زائد کی لائف پالیسیاں فروخت ہو چکی ہیں جن میں سے بیشتر سالانہ یا شش ماہی ادائیگی کی ہیں۔ جنرل کا کام کچھ کمزور ہے لیکن توقع ہے کہ پٹ سن کے موسم میں عروج پر پہنچ جائے گا۔''

نسیم حقیقت میں بڑا تیز طرار اور گھاگ قسم کا نوجوان تھا، اُڑتی چڑیا کے پَر کترتا تھا۔ اسے دھوکا اور فریب دینا آسان نہیں تھا۔ اپنے موٹے موٹے شیشوں والی عینک سے وہ انسان کے سینے تک میں جھانک لیتا تھا۔ وسیع مطالعہ ہونے کے باعث انسان کی بیشتر کمزوریاں اسے معلوم تھیں۔

جب میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو اس نے ہنس کر خود ہی بات کاٹ دی۔ ''پارٹنر تمہارے بھائی کب تک تشریف لا رہے ہیں؟''

''غالباً کل تک۔''

''تم اب بھی انہیں اپنا بھائی سمجھتی ہو۔''

''بے شک۔''

''لیکن پارٹنر وہ تمہیں اپنی بہن نہیں سمجھتا لکھ لو میری بات کو، اس کے آنے کے بعد گھر میں ایسا اودھم مچے گا کہ تمہیں مزہ آ جائے گا۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

میں اگلے روز دفتر میں بیٹھی ہوئی ایک ایجنٹ کو تعلیمی پالیسی کے بارے میں سمجھا رہی تھی کہ دروازے پر تانگہ رُکا۔ گھر کے اندر کوئی گیا پھر سامان جانے کی آواز آئی اور اس کے بعد فوراً احمد کی آواز سنائی دی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے نہیں ہو گیا۔'' تائی کا طیش میں بھرا ہوا جواب سنائی دیا۔ ''وہ ہماری بیٹی ہے ہمارا خون ہے، ہم نے اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی شادی کر دی تم کون ہوتے ہو پریشان ہونے والے؟ تم تو اس کے بھائی ہو۔ اس کی شادی پر خوشیاں منانا چاہئیں۔''

احمد بگڑ کر بولا۔ ''میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسری جگہ شادی کرے۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ایجنٹ سے معذرت کرتے ہوئے سیدھی گھر میں چلی گئی۔ مجھے دیکھتے ہی احمد نے سلام کیا۔

''یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم نے شادی کر لی ہے۔'' اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''کہہ دو کہ یہ سب جھوٹے ہیں میرے علاوہ تم کسی اور سے ہرگز شادی نہیں کر سکتیں۔''

''ہوش کی باتیں کرو احمد!''

''وہ تو ہوش ہی کی باتیں کر رہا ہے۔'' چچی گرجیں۔ ''تم بتاؤ تمہیں ہوش آیا، یا نہیں؟ میں تو پہلے ہی کہتی تھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔''

میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''اس وقت یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے تائی! جب ہوش وحواس درست ہوں گے تو دیکھ لینا، تم اپنی ان باتوں پر کتنی نادم ہوتی ہو اور ہاں ابھی تم نے سلطان سے صرف رشتہ ٹھہرایا ہے یہ شادی والی بات کہاں سے آ ٹپکی ''

احمد نے جلدی سے کہا۔ ''ارے بہن! تو میں تمہیں اس لیے کہتا تھا کہ ہماری ملاقاتوں میں رکاوٹ نہ آئے۔''

میں بھنا کر رہ گئی۔

احمد کے کردار کی عظمت کی جو دیوار میرے دماغ نے تعمیر کی تھی وہ گرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ کیا اس نے حقیقت میں مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ کیا جس لڑکے کو میں نے آج تک بھائی کی حیثیت سے چاہا تھا۔ وہ گندے خیالات کا مالک تھا اور صرف دھوکا دینے کے لیے بھائی بنا ہوا تھا۔

اس وقت سلطان نے بڑا اچھا کردار ادا کیا۔ اس نے کہا۔ ''احمد بھائی میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنی محبت کی خاطر یہاں تک کا سفر کیا ہے میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگرچہ یہ تمہیں اپنا بھائی کہتی ہیں پھر بھی وہ تمہیں بے انتہا چاہتی ہیں۔''

''بکواس مت کرو سلطان۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''میں اسے بھائی کہتی نہیں بلکہ سمجھتی بھی ہوں۔''

''مجھے بات مکمل کر لینے دیجیے۔'' سلطان نے کہا۔ ''ہاں تو بھائی میں یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا میں ایک دو نہیں، ہزاروں مثالیں ملتی ہیں کہ ایک گھر میں سب کے سب آپس میں مل جل کر پیار محبت کی زندگی گزارتے ہیں۔''

احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے تو بے شک شادی کر لیجیے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

چچی بگڑ کر بولیں۔ ''لڑکے تیرا دماغ پھر گیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا میں اسے بھائی سمجھتی ہوں اور ہمیشہ سمجھتی رہوں گی ہو نہ ہو یہ ساری شرارت شوروی کی ہے جس نے احمد کے دماغ کو پلٹ دیا ہے۔''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے۔'' اس نے آنسو بھری نظریں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''وہ دن یاد کرو جب تم پہلے دن ہمارے ہاں آئی تھیں میں نے اسی دن تمہیں اپنی محبوبہ تسلیم کر لیا تھا تم نے کبھی میری نظروں اور میری باتوں سے یہ اندازہ نہیں لگایا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں، خود ہی سوچو اگر مجھے تم سے پیار نہیں ہوتا تو میں سب کو چھوڑ کر تمہارے پاس کیوں آتا؟''

میرا دماغ چکرانے لگا۔ مجھے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ احمد اس حد تک گر سکتا ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تہذیب، اخلاق اور خلوص صرف کھوکھلے الفاظ ہیں۔ درحقیقت دنیا میں ان چیزوں کا کوئی وجود ہی نہیں میں نے بمشکل تمام اپنے چکر کھاتے ہوئے دماغ پر قابو پا کر پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تم بنگالی ہو احمد اور میں بہاری دونوں کے معاشرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

اس نے بگڑ کر کہا۔ ''محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔''

''لیکن جو زبان تمہیں ایک بار بھائی کہہ چکی ہے۔ وہی زبان اب تمہیں محبوب نہیں کہہ سکتی۔'' میں بھنائی ہوئی واپس دفتر میں آ کر بیٹھ گئی۔

نسیم بھی آچکا تھا۔اس نے مجھ سے پوری بات معلوم کی پھر بولا۔

''میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ شورویر تمہارے وہم کی پیداوار ہے۔فرائڈ کے نظریئے کے مطابق بہت سے لوگ اس قسم کے کرداروں کو جنم دیتے ہیں اور پھر خود تراشیدہ کرداروں کے کہنے پر چلنے لگتے ہیں۔یہ ایک قسم کی دوہری شخصیت کا مرض ہے۔میری نظر میں پورے مشرقی پاکستان میں کوئی ایسا ماہرِ نفسیات نہیں جو تمہارے مرض کا علاج کر سکے۔البتہ انگلینڈ یا امریکہ میں ممکن ہے کہ تمہیں اس مرض سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔''

میں نے کہا۔''ممکن ہے تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ درست ہو لیکن بہت سی باتیں ایسی میرے ساتھ ہوئی ہیں جنہیں وہم نہیں کہا جا سکتا۔بہر صورت کبھی فرصت ملی تو میں تمہیں تفصیل کے ساتھ اپنی ساری داستان سناؤں گی۔چلو ذرا زمیندار صاحب کے ہاں ہو آئیں۔وہ ایک لاکھ کی پالیسی لینا چاہتے ہیں لیکن پالیسی لینے سے قبل کچھ شکوک و شبہات بھی رفع کرنا چاہتے ہیں۔''

زمیندار صاحب کے ہاں جاتے ہوئے راستے میں ڈاک خانہ پڑا۔اندر سے چپراسی نے آکر کہا آپ کو پوسٹ ماسٹر صاحب بلا رہے ہیں میں ڈاک خانے میں گئی تو پوسٹ ماسٹر نے میری طرف ایک لفافہ بڑھا دیا۔''آپ کا یہ خط کئی روز کا آیا ہوا پڑا ہے۔صحیح پتا نہ معلوم ہونے کے باعث یہیں پڑا رہا۔''

میں نے ان سے لفافہ لے کر خط کھولا تھا۔ڈاک خانے سے باہر جانے کے بجائے میں وہیں بیٹھ کر خط پڑھنے لگی تھی۔''باجی السلام علیکم آپ کے کہنے کے مطابق آپ کو فوراً خط نہ لکھ سکی۔مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت دُکھ ہو رہا ہے کہ ہمارے پیارے بھائی احمد نے آج جیل خانے کے اندر زہر کھا کر خودکشی کر لی۔جیل میں اس بات کی تفتیش کی جارہی ہے کہ انہیں زہر کب اور کس نے پہنچایا؟اس سے بھی زیادہ دُکھ کی بات یہ ہے کہ ہم لوگ احمد بھائی کے کفن دفن کا انتظام نہ کر سکے۔جیل کے حکام نے ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی تھی لیکن لاش راستے ہی میں غائب ہو گئی۔ پولیس کی ایمبولینس ان کی لاش لے کر گئی تھی۔اس میں موجود اے ایس آئی ڈرائیور اور دو سینئر کانسٹیبلوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

اماں بہت پریشان ہیں۔رات دن اُٹھتے بیٹھتے روتی رہتی ہیں۔آپ ہوتیں تو ان کی کچھ ڈھارس بندھاتیں۔یہ بات ابھی تک یہاں کی پولیس اور ہم لوگوں کے لیے معمہ بنی ہوئی ہے کہ احمد کی لاش کو کس نے چرایا اور کس مقصد کے لیے چرایا۔آپ کی بہن، شمس النہار۔''

خط پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ حقیقت میں جو احمد میرے پاس ڈھاکا سے آیا تھا وہ احمد نہیں شورویر تھا۔جسم احمد کا اور روح شورویر کی۔اس کے بس میں یہی تھا کہ وہ احمد کو خودکشی کے لیے مائل کرے اور جب وہ خودکشی کر لے تو اس کے جسم میں داخل ہو کر میرے پاس چلا آئے۔ اور اب احمد میرے پاس آیا تھا۔وہ دھوکے باز اور فریبی شورویر اسی قابل تھا کہ اسے نسیم کے حوالے کر دیا جائے تا کہ وہ اسے انشورڈ کر سکے۔

ڈاک خانے سے میں اس حال میں باہر نکلی کہ میرا چہرہ اُترا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ایک طرف احمد کی جوان موت کا غم تھا تو دوسری طرف شورویر کی دغابازی اور فریب پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔میں نے اس کے بہت سے روپ دیکھے تھے لیکن یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ مقصد برآری کے لیے وہ اس حد تک گر جائے گا کہ احمد کو ختم کرنے تک سے نہیں چوکے گا۔نسیم نے مجھے باہر آتے ہوئے دیکھا تو لپک کر میرے پاس آگیا۔

''خیر تو ہے پارٹنر، تمہارا چہرہ اُداس کیوں ہے؟''

''میرا بھائی مر گیا نسیم! اس نے خودکشی کر لی۔''

''کس کا خط آیا ہے؟''

جواب دینے کے بجائے میں نے اس کے سامنے خط بڑھا دیا۔ ''خود پڑھ کر دیکھ لو۔''

نسیم نے بہت غور سے پورا خط پڑھا۔ پھر یکلخت قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''واہ میری بدھو بہن، تم تو بالکل ہی پاگل ہو۔ یہ بھی نہیں سمجھی کہ خودکشی کا محض اس لیے بہانہ بنایا گیا تا کہ جیل سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے واہ واہ احمد نام کا جو لڑکا تمہارے پاس آیا ہے وہ احمد نہیں اس کا بھوت ہے۔ کیا خودکشی کرنے والے اسی طرح بھوت بن کر دندناتے پھرتے ہیں؟''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ شورویر ہے۔ جس نے میری ساری چالوں کو صرف ایک چال چل کر غلط ثابت کر دیا۔''

''شورویر؟ وہ کردار جو تمہارے ذہن کی اختراع ہے اور اس وقت سے اب تک بھٹکی ہوئی پریشان روح کی حیثیت سے تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔''

''تم اسے ذہنی اختراع کہہ لو لیکن درحقیقت یہ شورویر ہی ہے۔''

''میں نے تم جیسا ذہنی مریض آج تک نہیں دیکھا پارٹنر۔'' اس نے پیار سے کہا۔ ''اب چلو بھی یہاں سے، زمیندار صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

دل نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے نسیم کے ساتھ جانا پڑا۔ انشورنس کی دنیا میں ایک لاکھ کی لائف پالیسی معمولی نہیں ہوتی۔ ہیڈ آفس تک میں دھوم مچ جاتی ہے۔ زمیندار صاحب کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ڈاک خانے سے بمشکل دس منٹ کا راستہ ہو گا ہم لوگ اس کے ہاں پہنچے تو وہ واقعی چشم براہ تھے۔ تیس اور چالیس سال کے درمیان عمر تھی۔ اچھے بھلے تندرست و توانا انسان تھے۔ ایک بیوی تھی جس سے کوئی اولاد نہیں تھی، دوسری داشتہ تھی جس کے تین بچے تھے اور زمین دار صاحب کے قول کے مطابق ان میں دو بچے یقینی طور پر ان کے تھے۔ خاندان میں نہ کبھی کسی کو دق ہوئی اور نہ دل کا دورہ پڑا۔ باپ دادا، پردادا سب کے سب طبعی موت مرے۔ ماں کا انتقال البتہ جوانی میں ہوا لیکن کسی مہلک بیماری سے نہیں بلکہ ایک بیل نے انہیں سینگ مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ انشورنس کے لحاظ سے زمیندار صاحب کی بہترین خاندانی تاریخ تھی۔ نسیم تو خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

''ہم لوگ آپ کو تھوڑی سی تکلیف دیں گے۔'' اس نے بڑے ادب سے کہا۔ ''ہمیں آپ کی صحت پر کوئی شبہ نہیں لیکن کمپنی بھی اپنا اطمینان کر چاہتی ہے، اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ ڈھاکا جانا پڑے گا جہاں ہم اپنے خرچ پر آپ کا ایکسرے کرائیں گے اور دل کی رپورٹ حاصل کریں گے۔ یقین کیجیے آپ کو رتی بھر بھی تکلیف نہیں ہو گی بلکہ کچھ تفریح ہی ہو جائے گی۔''

انہوں نے ہنستے ہوئے پان کی گلوریاں ہماری طرف بڑھائیں اور بیمہ کے بارے میں جو شبہات تھے، وہ مختلف سوالات کر کے دور کیے۔

نسیم نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ ملا کر ایسے معقول جواب دیئے کہ ان کی اچھی طرح تشفی ہو گئی پھر بولے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد بیمہ کی

رقم میرے کسی وارث کو ملنے کی بجائے شورویر کو ملے کیا ایسا ممکن ہے کہ......''

بات کے درمیان ہی میں نسیم حیرت سے چلایا۔

''جی شورویر کو؟''

''میں یہی پوچھ رہا ہوں کیا ایسا ممکن ہے کہ بیمے کی رقم ایک بے چین ومضطرب روح کو پہنچائی جاسکے۔ میں نہیں جانتا، اس رقم کا وہ کیا کرے گا، تاہم اگر مجھے یہ یقین دلا دیا جائے کہ رقم اسے مل جائے گی تو میں ابھی اسی وقت اپنا بیمہ کرا کر مرنے کے لیے تیار ہوں۔''

نسیم کی زندگی میں پہلی بار کسی نے جیتے جاگتے انسان کی بجائے ایک روح کو اپنا وارث بنانا چاہا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

میں نے پوچھا۔ ''شورویر کی بے چین ومضطرب روح سے آپ کا کیا تعلق؟''

زمیندار صاحب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ''ایک طویل کہانی ہے۔ بہت ہی طویل اس کہانی کے ڈانڈے راجہ وکر مادیت کے عہد سے جا کر ملتے ہیں۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے سر کے بل مجھے اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز سے نیچے دھکا دے دیا ہو اور میں نیچے ہی نیچے گرتی چلی جا رہی ہوں۔ قدرے ہوش آیا تو نسیم ان سے پوچھ رہا تھا۔ ''آپ بھی فضول غیر مرئی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں۔''

زمیندار صاحب نے کہا۔ ''آج سے تین روز قبل تک تمہاری طرح مجھے بھی ان چیزوں پر یقین نہیں تھا، لیکن پرسوں رات جب مجھے قتل کیا گیا تو اچانک......''

''آپ کو قتل کیا گیا؟'' نسیم کی حالت قابلِ دید تھی۔ ''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''جی ہاں پرسوں رات مجھے قتل کر دیا گیا۔ سوتے میں میرے منہ پر کپڑا لپیٹ کر میری سانس روک دی گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ مجھے تو قتل کیا جا چکا ہے اور میری داشتہ اور اس کے تینوں بچے میری موت پر خوشیاں منا رہے ہیں۔ میرا بے حس وحرکت جسم سامنے پڑا تھا۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں تھا، بڑا لڑکا دوسرے دونوں بھائیوں کو سمجھا رہا تھا کہ اپنے اپنے رومالوں پر پسی ہوئی مرچیں چھڑک لیں تا کہ صبح کو جنازے کے ماتمی جلوس میں آسانی کے ساتھ آنسو بہائے جا سکیں۔''

نسیم نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا۔ ''پالیسی بیچنے سے پہلے ہمیں ان کے دماغ کا بھی معائنہ کرانا پڑے گا۔''

زمیندار صاحب اپنے اسی انداز میں کہہ رہے تھے۔ ''یہ جسم تو ایک پنجرہ ہے۔ پنجرے سے نکل کر پتا چلتا ہے کہ کائنات کتنی وسیع ہے۔ موت سے قبل ہم اسی طرح ڈرتے ہیں جس طرح بچہ دنیا میں آنے سے قبل ڈرتا اور روتا ہے لیکن جب ایک بار موت آجاتی ہے تبھی کائنات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ مجھے مرے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے مگر اتنی دیر میں میری ملاقات اپنے ان بے شمار عزیزوں اور دوستوں سے ہوگئی جو مجھ سے پہلے اس دنیا کو خیر باد کہہ چکے تھے۔''

نسیم اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''معاف کیجیے، آپ کی پالیسی کے سلسلے میں مجھے اپنے ہیڈ آفس سے ہدایات لینی ہوں گی۔''

''اور ہاں...... میری ملاقات احمد سے بھی ہوئی۔'' انہوں نے نسیم کی بات پر کوئی دھیان دیئے بغیر کہا۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ حسن پور میں اس کی بہن ہے اگر کبھی دنیا میں جانے کا اتفاق ہو تو میں اس کی بہن سے ضرور ملوں اور اس کا یہ پیغام پہنچادوں کہ شورویر میرے جسم پر قبضہ کر چکا ہے۔''

احمد کا پیغام سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے نسیم جو تھوڑی دیر قبل زمیندار صاحب کو دماغی مریض سمجھ رہا تھا، ان کی زبانی میری بات کی تصدیق ہوتے دیکھ کر کچھ سہم سا گیا، ایڈلر اور فرائڈ کے نظریات اس کی مدد کرنے سے قاصر تھے اور اب تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ زمیندار صاحب کی گفتگو میں کس حد تک سچائی ہے۔ آخر میرے ذہن کے تراشے ہوئے شورویر اور احمد کے ناموں کی ان کے ذہن تک کس طرح رسائی ہوگئی۔

''کچھ اور بھی کہا تھا میرے بھائی نے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں اسے اس روز زہر دیا گیا، جب تم مرگھٹ سے پہلی انسانی کھوپڑی لے کر آئی تھیں۔'' زمیندار صاحب نے کہا۔ ''یہ کام تم نے خود نہیں کیا بلکہ احمد کے ایما پر کیا، اب تمہارے پاس دو انسانی کھوپڑیاں ہیں۔ احمد نے کہلوایا ہے کہ جب تک یہ دونوں کھوپڑیاں ایک جگہ رکھی رہیں گی شورویر تم پر کوئی وار نہیں کر سکے گا اگر اس نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔''

نسیم ایک بار پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ایک بات بتایئے زمیندار صاحب! اگر آپ واقعی مر چکے ہیں اور بقول آپ کے، آپ کو سچ مچ قتل کیا جا چکا ہے تو آپ ہم لوگوں کو زندہ کیوں نظر آ رہے ہیں؟''

''آپ شاید میری بات نہ سمجھ سکیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''یوں سمجھ لیجیے کہ دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلا جسم جو مجھے دستیاب ہوا، وہ حسنِ اتفاق سے میرا اپنا ہی جسم تھا۔ میری بے یارو مددگار لاش ایک تاریک کوٹھری میں پڑی ہوئی تھی اور باہر تینوں لڑکے اپنی ماں کے ساتھ بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے اور یہ طے کر رہے تھے کہ میری دولت سے قحبہ خانہ کھولنا زیادہ مناسب رہے گا یا شراب خانہ۔ مجھے اپنا جسم تنہا نظر آیا تو میری روح دوبارہ اس میں داخل ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد چھوٹا لڑکا، کسی کام سے اندر آیا تو اس نے مجھے گھورتے ہوئے پایا۔ چیخ مار کر وہ باہر بھاگا اور دوسروں تک میرے زندہ بچ جانے کی اطلاع پہنچائی۔ لڑکوں کی ماں تو یہ سن کر ہی بے ہوش ہوگئی اس وقت سے اب تک تھوڑی دیر کے بعد اسے دورے پڑ رہے ہیں۔ بڑا لڑکا ڈھاکا بھاگ گیا۔ دو لڑکے یہیں ہیں لیکن مُردوں سے بدتر۔ اب آگے کی سنیے، میں نے اپنے جسم پر قبضہ کرنے کے بعد معلوم کیا تو پتا چلا کہ آپ یہاں انشورنس کا کاروبار کر رہے ہیں۔ میری زندگی میں کئی بیمہ ایجنٹ میرے پاس آئے تھے۔ انہیں اپنے پاس بلانے اور احمد کا پیغام آپ تک پہنچانے کی ترکیب میں نے یہ سوچی کہ ایک لاکھ کی پالیسی لینے کا بہانہ بناؤں اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ وارث کی حیثیت سے شورویر کا نام میں نے صرف اس لیے لیا تھا تاکہ اصل موضوع کی طرف آسکوں۔''

''گویا آپ نے ہمارا قیمتی وقت برباد کرانے کے لیے بیمہ کا بہانہ بنایا۔'' نسیم نے بگڑ کر کہا۔ ''حالانکہ آپ کو بیمہ ویمہ کچھ نہیں کرانا تھا۔''

''بیمہ کرانے کے لیے تو میں اب بھی تیار ہوں۔'' وہ ہنسے۔ ''لیکن آپ کو اپنے ہیڈ آفس سے پوچھنا پڑے گا کہ مرے ہوئے لوگوں کو پالیسی فروخت کرنے کے بارے میں ان کے کیا اصول ہیں۔''

نسیم پر جھنجھلاہٹ سوار ہوگئی۔ ''کمپنی کے اصول مجھے اچھی طرح ازبر ہیں۔ آپ جیسے مُردہ شخص کے ہاتھ پالیسی فروخت کرنے پر کسی کو

کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔"

"اچھا تو ذرا قریب آ کر میری نبضیں تلاش کرنے کی کوشش کیجیے اور ہوسکے تو دل کی دھڑکن بھی سن کر بتایئے۔"

نسیم پر وہ وقت بہت کڑا تھا جب وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ زمیندار صاحب کی نبض ٹٹول رہا تھا اور اس کے سینے پر کان رکھ کر دل کی دھڑکن کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نہ نبضوں کا کوئی پتا تھا اور نہ دل کی دھڑکن کی کوئی آواز آ رہی تھی سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا جانے کے باوجود اس نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی، اپنی جگہ پر واپس آتا ہوا بولا۔"یہ شعبدے بازی تو ہمارے ہاں کے کئی فقیر اور سادھو بھی دکھا سکتے ہیں۔"

زمیندار صاحب کو نسیم کی حرکتوں پر بہت ہنسی آ رہی تھی۔"تم نہیں مانتے تو چلو، ایک پالیسی مجھے دے ڈالو لیکن وارث کی حیثیت سے تمہیں شمع کا نام لکھنا پڑے گا۔"

اس نے گھور کر زمیندار صاحب کو دیکھا۔

"اسی شمع کا نام۔" انہوں نے اپنی بات جاری رکھی" جسے انڈیا میں دھوکا دے کر تم ڈھاکا بھاگ آئے تھے اور جو تمہاری بے وفائی کے باعث دق کا شکار ہو کر ختم ہوگئی، اس کا بُنا ہوا سویٹر تم آج تک پہنے ہوئے ہو۔"

"جی؟" نسیم کی بوکھلاہٹ دوبارہ لوٹ آئی۔

"میری ملاقات تمہاری شمع کی روح سے بھی ہوئی تھی لیکن وہ جنت میں ہے اور اتنی اچھی جگہ چھوڑ کر دنیا میں آنے کے لیے تیار نہیں اس نے نہ صرف تمہیں معاف کر دیا ہے بلکہ اب بھی تم سے محبت کرتی ہے اور بے چینی کے ساتھ دوسری دنیا میں تمہاری منتظر ہے۔"

چند لمحوں کے لیے نسیم پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ سامنے کی دیوار کو پھٹی پھٹی نظروں سے اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہاں کسی کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کر رہا ہو، پھر اسی انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قدم دروازے کی طرف اُٹھنے لگے۔ زمیندار صاحب نے قہقہہ لگا کر کہا۔"میرا بیمہ تو کرتے جاؤ بھائی۔"

لیکن نسیم تو جیسے ہوش ہی میں نہیں تھا۔ اس پر عجیب سی بے خودی طاری ہو گئی تھی۔ قدم اس طرح لڑکھڑا رہے تھے جیسے اس نے پوری بوتل چڑھالی ہو میں نے دوڑ کر اسے سنبھالا دیا، اس کی دونوں آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہہ رہے تھے۔ میں اسی حال میں اسے لیے ہوئے گھر پہنچی۔ دروازے پر تائی نے گالیوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔" کہاں چلی گئی تھیں مونڈی کاٹی۔" انہوں نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔" کوئی مرے یا جیے تمہاری بلا سے۔"

"عورت۔" نسیم نے عجیب سی آواز میں تائی کو مخاطب کیا۔" چند روزہ زندگی پر مغرور نہ ہو، خوب اچھی طرح سمجھ لے کہ ایک روز تجھے مر کر خدا کے سامنے بھی جانا ہے۔"

"لو اور سنو" تائی نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔" بہتر سوراخ والی چھلنی بھی بولی۔ دیکھو جی میرے منہ نہ لگنا ورنہ ایسی سناؤں گی کہ سات پشتوں تک نہیں چھوڑوں گی لچا بدمعاش کہیں کا، مجھے خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ اسے بگاڑنے میں تیرا ہی ہاتھ ہے۔"

نسیم پر اچانک رقت طاری ہوگئی۔" میرے سر پہ جوتے مارو، میں اسی قابل ہوں میرے منہ پر کالک تھوپ دو۔ میرے ماتھے پر لکھ دو کہ یہ

دنیا کا سب سے بُرا، سب سے ذلیل انسان ہے، اس نے وفا کی پتلی شمع کو دھوکا دیا ہے جو آج بھی جنت میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔"

تائی کو پہلی مرتبہ نسیم کی بہکی ہوئی حالت کا اندازہ ہوا وہ "اے نوج" کہہ کر پیچھے ہٹ گئیں۔ نسیم کہاں تو رو رہا تھا کہاں قہقہے لگانے لگا۔

"آیئے آیئے۔" میں نے سر گھما کر دیکھا تو سامنے احمد چلا آرہا تھا۔ "کیسا اچھا...... کتنا پاک جسم ہے ہزاروں سلام اس جسم کی عظمت و پاکیزگی پر لیکن لعنت، ہزار لعنت اس روح پر جو اس مقدس جسم میں موجود ہے۔"

احمد ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ "شورویر" نسیم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کب تک اپنے آپ کو فریب دیتے رہو گے؟ مور کے پَر لگانے سے کوا مور نہیں بن سکتا۔ تم نے احمد کے جسم پر قبضہ تو کر لیا لیکن اس کے کردار کی عظمت اور تقدس کہاں سے لے کر آؤ گے؟ اپنی حیثیت کو نہ بھولو۔"

احمد کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ نسیم فاروقی کا ایک ایک لفظ اس کے سر پر ہتھوڑے جیسا کام کر رہا ہے۔ "تم کون ہو؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

"میں؟ میں ایک بھٹکا ہوا آوارہ شخص ہوں جس نے اپنی شمع کے ساتھ فریب کیا ہے۔" وہ ایک بار پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "لعنت ہے مجھ پر اور لعنت ہے میری زندگی پر وہ وہاں جنت میں میری منتظر ہے اور میں یہاں دنیاوی ہوا وہوس میں مبتلا ہوں۔"

میں بمشکل تمام اسے ملحقہ دفتر میں لے گئی۔ زمیندار صاحب کی باتوں سے اس پر ایسا اثر ہوا تھا کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا کبھی بلک بلک کر رونے لگتا تھا اور کبھی زور زور سے قہقہے لگانا شروع کر دیتا تھا۔

"پارٹنر۔" اس نے روتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "میں مر جاؤں تو مجھے بھول مت جانا کبھی کبھار اپنی دعاؤں میں یاد کر لیا کرنا۔" پھر یکا یک وہ ہنسنے لگا۔ "اگر میں مر گیا تو تم میرے لیے پہلے ہی ایک اچھے سے جسم کا انتظام کر کے رکھنا۔"

گھر میں تائی کی آواز آئی۔ "ارے دفتر میں جا کر مر گئی۔ گھر بار کی بھی فکر ہے یا نہیں۔"

میں نسیم کو صوفے پر لٹا کر اندر گئی تو تائی منہ پھلائے ہوئے بیٹھی تھی۔ میں نے شورویر کو تلاش کرنا چاہا لیکن نظریں اِدھر اُدھر بھٹک کر واپس آ گئیں۔ وہ شاید کسی کمرے میں تھا۔

"اپنے سگے کو ڈھونڈ رہی ہو یا میرے پاس آئی ہو؟" تائی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "یہاں میرے پاس اس پیڑھی پر بیٹھ جاؤ اور غور سے میری باتیں سنو۔ سچی باتیں کڑوی لگتی ہیں مگر تمہیں سننا پڑیں گی۔ تمہارا باپ خدا اس کی روح کو نہ شرمائے بہت ہی خراب شخص تھا دنیا کی ساری بُرائیاں اس میں تھیں۔ خانقاہی فقیر بن کر دنیا کو دھوکا دیتا تھا۔ تمہاری اماں بھی بڑی جادوگرنی تھی۔ بھرے پُرے گھر کو تمہاری اماں کے جادو اور ابا کی بدمعاشیوں نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ تم اپنے ابا اماں پر نہیں پڑو گی اسی لیے سلطان کے رشتے کے لیے میں نے ہاں کر دی تھی۔ نہیں بیچ مت بولو، مجھے پوری بات کہہ لینے دو اب مجھے پتا چلا کہ اپنے بابا اماں کی ساری خرابیاں اور بُرائیاں تمہارے اندر موجود ہیں۔ تم جادوگرنی ہو، تمہاری الماری میں دو انسانی کھوپڑیاں جادو جگانے کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ تمہارا دوست تو شرابی ہے ہی اور تمہارے ہی ساتھ شراب پی کر روتا ہنستا ہوا یہاں آیا ہے۔"

میں نے کہا۔ ''کہہ چکیں سب کچھ، یا ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے۔''

وہ بولیں۔ ''ہاں سب کچھ کہہ چکی اب صرف یہ کہنا ہے کہ گھر پھونک کر تماشا دیکھنے سے باز آ جاؤ۔ مجھے اپنا بڑا سمجھو اور طے کر لو کہ آئندہ اس گھر میں میرا اور صرف میرا حکم چلے گا۔''

''تم کسی ڈائن سے کم نہیں ہو تائی؟''

وہ اُچھل پڑیں۔ ''تم...... تم...... تمہاری...... تمہاری یہ ہمت۔''

''بیچ میں مت بولو'' میں نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''تم نے ہماری زمینوں پر قبضہ کیا۔ تم نے دادا کے پورے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا تھا تم نے میری ماں بہنوں کو گھر سے نکالا تم نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میرے غریب ماں باپ کس حال میں ہیں۔ میں نے تم پر احسانات کیے لیکن کسی احسان کو ماننا تو کجا تم نے ہمیشہ مجھے طعنے دیئے اب اگر تمہیں اور تایا کو گھر میں رہنا ہے تو جس طرح میں چاہوں گی اسی طرح رہنا پڑے گا۔''

تائی بولیں۔ ''ہمارا وقت ضرور بگڑ گیا ہے لیکن ہم لوگ تمہارے غلام بن کر نہیں رہ سکتے۔ ہم لوگ ابھی یہاں سے چلے جائیں گے اور کبھی تمہارے منہ پر تھوکنے کے لیے بھی نہیں آئیں گے۔ بس میرے سات ہزار روپے دے دو۔''

اس وقت میرے پاس زیادہ سے زیادہ سوڈیڑھ سو روپے تھے جبکہ تائی بلیک میل کر کے پورے سات ہزار روپوں کا فوری تقاضہ کر رہی تھیں۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر فوراً رقم ادا نہ کی تو ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تائی تمام زندگی طعنے دیتی رہیں گی، ساتھ ہی ساتھ میرے اطمینان کے لیے یہ بات کافی تھی کہ اگر ان لوگوں کے پاس سات ہزار روپے نقد موجود ہوئے تو انہیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور وہ لوگ آسانی کے ساتھ کوئی نہ کوئی کاروبار کر سکیں گے۔ یکا یک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری جیب میں بہت سے نوٹ ٹھونس دیئے ہوں میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکال لیے، سو سو کے پورے ستر نوٹ تھے۔ خاموشی کے ساتھ سارے نوٹ میں نے تائی کی طرف اُچھال دیئے اور تائی کے پاس سے اُٹھ کر سیدھی دفتر میں چلی گئی۔ نسیم کا وہاں کوئی پتا نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ دوسرے دروازے سے بازار کی جانب نکل گیا ہوگا تھوڑی دیر میں واپس آ جائے گا۔

اندر گھر میں سے تائی کے زور زور سے رونے اور سامان کے باندھنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن میں جانتی تھی کہ سات ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کا میں ذکر کر رہی ہوں، سات ہزار آج کل کے ستر ہزار سے زیادہ ہی تھے۔ تائی یقیناً دل ہی دل میں خوش ہو رہی ہوں گی کہ ایک دھمکی میں اتنی بڑی رقم حاصل کر لی۔ تایا کی حیثیت مٹی کے مادھو سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ سے تائی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھا تو اس میں بھی ان لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں تو شورویر سے بچنے کے لیے انہیں گھر میں رکھے ہوئے تھی مگر جیسا کہ قارئین نے اندازہ لگایا ہوگا کہ میرا سارا منصوبہ دھرا رہ گیا۔ شورویر نے پہلے ہی احمد کے جسم پر قبضہ کر لیا۔ اب سلطان کی کوئی افادیت نہیں رہی تھی۔ اچھا ہی تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ میرے ہاں سے رخصت ہو جائے۔

تانگوں کے آنے اور ان پر سامان رکھے جانے کی آواز آئی تھوڑے عرصے قبل جب تائی ہمارے ہاں آئی تھیں تو پیدل تھیں سامان بھی

واجبی سا تھا لیکن آج جب وہ میرے ہاں سے جارہی تھیں تو سامان ختم ہونے ہی میں نہیں آرہا تھا یوں لگ رہا تھا گویا وہ میرا اپنا سامان اور فرنیچر بھی اپنے ساتھ لیے جارہی ہیں لیکن اس وقت ان سے کچھ کہنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔

وہ چلی گئیں ان کے ساتھ ساتھ تایا بھی گئے اور سلطان بھی۔ گھر میں سکون ہو گیا نسیم ابھی تک بازار سے واپس نہیں آیا تھا۔ دروازے پر اس کی کار موجود تھی اور دفتر میں کوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ دور مسجد سے ظہر کی اذان کی آواز آرہی تھی میں عام طور پر اذان کی آواز سن کر دوپہر کے کھانے کے لیے دفتر سے اُٹھ جاتی تھی لیکن آج نہ تو بھوک محسوس ہو رہی تھی اور نہ اندر جانے کو دل چاہ رہا تھا وجہ یہ نہیں تھی کہ تائی پورے گھر میں جھاڑو پھیر گئی تھیں بلکہ میں شورویر کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ احمد کے روپ میں وہ گھر میں موجود تھا۔ ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ اپنی کسی قوت کو بروئے کار لا کر مجھے احمد کے جسم کی بے حرمتی کرنے پر مجبور نہ کر دے۔

"کب تک باہر بیٹھی رہو گی۔" اندر سے احمد کی آواز آئی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔ "کھانا تو کھالو بہن۔"

آج کے دن کا آغاز عجیب وغریب باتوں سے ہوا تھا۔ سب سے پہلے پوسٹ ماسٹر کی معرفت آیا ہوا خط موصول ہوا جس میں احمد کی خودکشی کا حال درج تھا۔ پھر مرے ہوئے زمیندار صاحب سے ملاقات ہوئی جو ملک عدم سے احمد کا پیغام لے کر آئے تھے۔ ان کی ملاقات کے بعد نسیم بھی بہکی باتیں کرنے لگا۔ تائی نوٹ لے کر تایا اور سلطان کے ساتھ میرے گھر سے چلی گئیں اور میرا اپنا سامان اور فرنیچر بھی لے گئیں اور اب شورویر، احمد کے پاکیزہ جسم کا لبادہ پہنے ہوئے مجھے بہن کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اندر پہنچی تو پورے گھر کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ گھر اُجاڑ پڑا ہوگا لیکن ہر طرف رونق ہی رونق نظر آرہی آئی۔ کمرے فرش فروش (قالین) سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ دیواروں پر بڑی بڑی چینی تصاویر شیشے کے فریموں میں لگی ہوئی تھیں۔ دروازوں پر بھڑک دار پردے لٹک رہے تھے۔ شیشے کی الماریاں ہر کمرے میں موجود تھیں۔ وسط میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پھولوں والے ایرانی قالینوں اور دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے ریشمی غلافوں کے گاؤ تکیوں کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا جیسے میں غلطی سے کسی بادشاہ کے محل میں چلی آئی ہوں اسی لمحے ایک جانب سے احمد نمودار ہوا تو بلا مبالغہ مجھے ایسا لگا جیسے ہر طرف نور ہی نور پھیل گیا ہو۔

"تم نے ان لوگوں کو گھر سے نکال کر بہت اچھا کیا۔" وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ذرا آئینے میں اپنی صورت تو دیکھو، چاند سا چہرہ کتنا اُتر گیا ہے۔ چلو اب چل کر کھانا کھاؤ۔"

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم ہو کون؟ احمد یا شورویر؟"

"تمہیں کیا نظر آتا ہوں؟"

"مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ احمد نے ڈھاکا جیل میں خودکشی کر لی اور شورویر اس کے جسم پر قبضہ کر کے میرے پاس چلا آیا ہے۔"

"تمہارے علاوہ اس بھری پوری دنیا میں شورویر کا کوئی بھی نہیں ہے۔ تمہارے پاس نہ آتا تو اور کہاں جاتا؟"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم شورویر ہو۔"

"ہاں......لیکن کل کے شورویر اور آج کے شورویر میں بہت فرق ہے۔ پہلے یہ شورویر اپنے نفس کا تابع تھا اور اپنی گندی خواہشات کی تکمیل کے لیے تمہارے پاس آتا تھا مگر احمد کی بے لوث و بے غرض محبت نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں نفسانی محبت کے علاوہ بھی بھائی بہن کی پاک محبت بھی ہے چنانچہ آج جو شورویر تمہارے پاس آیا ہے وہ تم سے بھائی جیسی محبت کرتا ہے اور دل سے تمہیں اپنی بہن سمجھتا ہے۔"

میرے نام لاکھ روپے کی لاٹری نکلتی تب بھی مجھے اتنی خوشی ہرگز نہ ہوتی جتنی خوشی شورویر کی باتوں سے ہوئی۔

"شکر ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ تو بتاؤ یہ اچانک تبدیلی رُونما کیسے ہوگئی؟"

وہ ہنس پڑا۔ "شاید احمد کے جسم کی برکت ہو، اب سوچتا ہوں کہ میں نے نفسانی محبت کی خاطر کتنی تکلیف اُٹھائی ہے۔ کاش میں نے شروع ہی سے تمہیں اپنی بہن سمجھا ہوتا تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ اچھا...... یہ بتاؤ اپنے گھر کی نئی سجاوٹ تمہیں پسند آئی؟"

"بھئی کیا کہنے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کسی محل میں آگئی ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "چلو اب کھانا لگانے کے لیے کہہ دو۔ میری آنتوں نے باقاعدہ قل ھو اللہ پڑھنی شروع کر دی ہے۔"

ایک طرف دسترخوان بچھا کر اس نے انواع واقسام کے کھانے لا کر رکھ دیئے۔ میں نے پوچھا۔ "اتنی سی دیر میں تم نے انتظام کیسے کر لیا؟"

وہ بولا۔ "تائی سے چھٹکارا دلانے کے لیے تمہاری جیب میں سات ہزار کے نوٹ پہنچا سکتا ہوں تو ڈھاکا سے کھانا کیوں نہیں منگوا سکتا۔ یہ سیخ کے کباب بھی چکھ کر دیکھو۔ ٹھٹھری بازار کے پاس والے مسیتا کبابی کے ہاں سے منگوائے ہیں۔ صبح کے ناشتے میں جمن کے ہاں کی نہاری اور مرن چند کا حلوہ کچوری بھی کھلواؤں گا۔"

کھانا واقعی بے حد لذیذ تھا۔ عرصہ دراز کے بعد شیر مال، بریانی اور قورمے جیسی نعمتیں کھانے کو ملی تھیں۔ مسیتا کی چٹ پٹی سیخیں مستزاد تھیں۔ شورویر مجھے اتنے ذوق وشوق سے کھاتے ہوئے دیکھ کر پھول کی طرح کھل رہا تھا کھانے ہی کے دوران مجھے نسیم کا خیال آگیا۔ "عجیب شخص ہے، نہ جانے کہاں چلا گیا۔" میں نے شورویر سے کہا۔ "صبح سے میرے ساتھ تھا۔ زمیندار صاحب نے اس کے سامنے ایک لڑکی کا نام کیا لے دیا کہ وہ قابو ہی میں نہ رہا۔"

"اپنے دوست کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں بھئی...... ابھی تھوڑی دیر قبل تو میرے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس نے تائی سمیت سب کو اُلٹی سیدھی باتیں سنائی تھیں۔"

وہ خوب زور سے ہنسا۔ "اسے تو نروان حاصل ہوگیا۔"

"نروان؟"

"وہ چلا گیا یہاں سے۔ حسن پور میں، مَیں تو ہے نہیں جنگل میں دھونی مارے بیٹھا ہے اور شمع شمع کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔"

شیر مال کا نوالہ میرے حلق میں اٹکنے لگا۔ "اسے بلاؤ شورویر دنیا مجھے یہ الزام دے گی کہ اپنے دوست کا خیال تک نہ رکھ سکی۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں اسے نہیں بلا سکتا۔ اب یا تو وہ جنگل میں کسی جانور کا نوالہ بن جائے گا یا انڈیا پہنچ کر شمع کی قبر سے سر ٹکرا ٹکرا کر ختم

ہو جائے گا۔"

"کیوں؟ تم اسے کیوں نہیں بلا سکتے؟"

"اس گھر میں کچھ اوپری اثر معلوم ہوتا ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "چھوٹے موٹے کاموں کے علاوہ جونہی میں کوئی اہم کام انجام دینا چاہتا ہوں، کوئی نامعلوم طاقت میری ساری قوتوں کو سلب کر لیتی ہے۔"

"اس گھر میں کوئی اثر ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کس قسم کا اثر؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بیک وقت دو انسانی سائے درمیانی کمرے سے نکل کر آتے ہیں اور کچھ اس طرح کا افسوں پڑھتے ہیں کہ میں بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہوں۔"

درمیانی کمرے کے نام پر میری نظریں خود بخود اُٹھ گئیں، یہ وہی کمرا تھا جس کی ایک الماری میں میری لائی ہوئی دونوں انسانی کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے زمیندار صاحب کی بات یاد آ گئی احمد نے کہلوایا ہے جب تک یہ کھوپڑیاں ایک جگہ رکھی رہیں گی شورویر تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

میں نے کہا۔ "اچھا اگر تم میری کچھ مدد نہیں کر سکتے تو کم سے کم اتنا تو کر سکتے ہو کہ مجھے نسیم فاروقی تک پہنچا دو۔"

وہ بولا۔ "ہاں...... یہ ہو سکتا ہے تم کار تو ڈرائیو نہیں کر سکو گی، ڈرائیور کی تلاش میں کافی وقت ضائع ہو جائے گا، اس لیے کسی تیز رفتار تانگے کا انتظام کر لو، ابھی تمہارا دوست زیادہ دور نہیں گیا ہے۔ ہم لوگ آسانی کے ساتھ اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

میں سمجھی تھی کہ شورویر چھل فریب سے کام لے کر یہ چاہ رہا ہے کہ کسی صورت سے دونوں کھوپڑیوں کو علیحدہ کرا دے۔ لیکن جب اس نے نسیم تک مجھے پہنچانے کے لیے ہامی بھری اور کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک ثانیے کے لیے میں نے سوچا کہ کھوپڑیوں کو الگ کر دیا جائے تاکہ گھر بیٹھے شورویر نسیم کو میرے پاس پہنچا دے مگر فوراً ہی میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور تانگے کی تلاش میں باہر نکل گئی۔

سورج غروب ہونے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی تھی کہ ہم لوگوں نے نسیم کو جا لیا۔ وہ ایک بڑے سے درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے بیدار کیا۔ آنکھیں کھول کر اس نے مجھے دیکھا اور زور سے قہقہہ مار کر بولا۔ "پارٹنر تم تو چین سے مجھے مرنے بھی نہیں دیتیں۔"

میں نے کہا۔ "گھر چلو، کوٹ پہنو اور اپنی کار میں بیٹھ کر ڈھاکا روانہ ہو جاؤ راستے میں جہاں کہیں تمہارا دل چاہے کار ٹکرا کر ختم ہو جانا، میں یہ نہیں چاہتی کہ تمہاری اس طرح واہی تباہی گھومنے کا الزام مجھ پر عائد کیا جائے۔"

کہنے لگا۔ "سچ کہتی ہو پارٹنر موت تو اپنی کار میں بیٹھ کر بھی آ سکتی ہے۔ اگر یہی بات تم پہلے بتا دیتی تو میں جنگلوں میں موت کو کیوں تلاش کرتا پھرتا اچانک اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔ "شمع تم جنت میں میرا انتظار نہ کر سکیں اور مضطرب ہو کر یہاں آ پہنچیں۔" دونوں ہاتھوں سے مجھے پیچھے دھکیل کر وہ تانگے کی طرف بڑھا جہاں پچھلی سیٹ پر شورویر بیٹھا تھا۔ "میری جان شمع!" اس نے شورویر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہاں سے لے چلو۔ تمہارے بغیر یہ دنیا مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ اب میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتا۔"

شورویر خوف سے چلایا۔ ''مجھے اس درندے سے بچاؤ۔''

میں نے دوڑ کر پیچھے سے نسیم کو پکڑ لیا۔ ''ہوش میں آؤ نسیم یہ شمع نہیں احمد ہے۔ تمہاری شمع بھلا یہاں کیسے آسکتی ہے؟''

اس نے بل کھاتے ہوئے کہا۔ ''دنیا کی کوئی طاقت مجھے اور شمع کو ایک ہونے سے نہیں روک سکتی۔ وہ دیکھو...... وہ مجھے بلا رہی ہے۔ مجھے آوازیں دے رہی ہے۔ ابھی آیا میری جان!'' میری گرفت سے آزاد ہو کر وہ دوبارہ شورویر کی طرف لپکا۔ قریب تھا کہ نسیم شورویر کو تانگے سے نیچے کھینچ کر اس سے چمٹ جائے کہ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسے پکڑ لیا تانگے والے کے دل میں کیا آئی کہ وہ بھی تانگے سے نیچے کود کر نسیم کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد ہم دونوں نے مل کر اسے بے بس کر دیا۔ تانگے میں پڑی ہوئی رسی کے ایک ٹکڑے سے اسے خوب اچھی طرح جکڑنے کے بعد میں نے تانگے والے کی مدد سے نسیم کو تانگے کے اگلے حصے میں ڈال دیا۔ نسیم راستے بھر اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی کے گیت گاتا رہا۔ بیچ میں شورویر کی شکل میں بیٹھے احمد کو مخاطب کر کے کہتا۔ ''دیکھ رہی ہو میری جان شمع، تمہارے پروانے کی کیا درگت بنائی گئی ہے۔ ظالم سماج یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ پھول سے اس کی خوشبو کو جدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسے بتا دو کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب ہم دونوں ساتھ ساتھ جنت میں جائیں گے۔ آہ اے شمع!

من	تو	شدم	تو	من	شدی
من	تو	شدم	تو	جاں	شدی
تا کس		نہ	گوید	بعد	ازیں
من		دیگرم		تو	دیگری

میں احمد کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے۔ شورویر کیا اسے ہوش نہیں آئے گا۔''

شورویر کے جواب سے پہلے نسیم نے تان چھیڑی۔ ''ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں۔''

شورویر نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''گھر پہنچ کر اسے کسی ڈاکٹر کو دکھا کر خواب آور دوا دے دینا اور کل صبح سویرے ہی کسی شخص کو ڈھاکا بھیج کر ہیڈ آفس میں اطلاع کرا دینا۔''

''تم کچھ مدد نہیں کر سکتے؟''

''یقین کرو میں بالکل مفلوج ہو چکا ہوں اگر مجھ میں قوت ہوتی تو تمہیں اسے باندھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ میرے اندر صرف اتنی سی طاقت ہے کہ کھانے پینے یا دوسری ضروریات کی چیزیں منگا لوں، دو پُر اسرار ہیولے ہر وقت میرے سر پر منڈلا رہے ہیں میرا خیال تو یہاں تک ہے کہ تمہارے دوست کو میرے پیچھے لگانے میں ان تینوں کا بڑا ہاتھ ہے۔''

مجھے شبہ ہوا کہ وہ دونوں کھوپڑیوں کو جدا کرانا چاہتا ہے اور جلد ہی اصل موضوع پر آنے والا ہے مگر خلافِ توقع اس نے کہا۔ ''میں بھی عاجز آ گیا ہوں اپنے آپ سے، چلو اچھا ہے کوئی میری روک ٹوک کرنے والا تو پیدا ہوا اب کم سے کم اُلٹی سیدھی حرکتیں نہیں کر سکوں گا۔''

گھر تک پہنچتے پہنچتے رات کے بارہ بج گئے اس وقت کسی ڈاکٹر کا ملنا مشکل تھا۔ مجبوراً نسیم کو دفتر میں بند کیا دفتر سے وہ چیزیں باہر نکال لیں جن کے ذریعے وہ خودکشی کرنے کی کوشش کر کے اپنے آپ کو زخمی کر سکتا تھا۔ احمد کافی ڈرا اور سہما ہوا نظر آ رہا تھا شور و یر پر مجھے ترس آنے لگا تھا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی میں نسیم کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس سے پوچھا۔ ''تم اتنے مایوس کیوں ہو گئے۔''

''فرائڈ کہتا ہے۔'' نسیم اتنا کہہ کر سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔ ''پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ مجھ پر اچانک ہی ایک لاشعوری کیفیت طاری ہو گئی تھی جس کی وضاحت فرائڈ ہی کر سکتا ہے میں گھر جا کر اس کی تمام کتابوں کو کھنگالوں گا۔''

''شمع تمہاری رشتے دار تھی؟''

''نہیں وہ محلے میں رہتی تھی۔ بچپن سے ہم ساتھ کھیلے کودے، میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا کہ اسی سے شادی کروں گا۔ پھر بی اے کر کے تلاشِ معاش کے سلسلے میں ڈھاکا چلا آیا مگر وہ بے چینی سے میرا انتظار کرتی رہی۔ کئی اچھے رشتے آئے اس نے سب کو انکار کر دیا انڈیا کے بارے میں تو تم جانتی ہی ہو گی وہاں ہونٹوں سے نکلی بات پل بھر میں کوٹھوں چڑھ جاتی ہے ہر جگہ اس کی بدنامی ہو گئی۔ کسی نے اسے یہ اطلاع بھی پہنچا دی کہ میں مشہور طوائف ''تمیزن بائی'' پر مرتا ہوا ہوں پھر یہ خبر بھی اسے پہنچ گئی کہ تمیزن کے ہاں دال نہ گلنے کے بعد میں نے ایک خانہ بدوش عورت کو گھر میں ڈال لیا ہے۔ بہار ن تو تین سال تک میرے ہاں رہی لیکن شمع اس واقعے کے بعد دو سال بھی زندہ نہ رہ سکی۔ ٹی بی نے اسے ایسا دبایا کہ قبر میں پہنچا کر ہی دم لیا۔''

میں نے کہا۔ ''تم تو یار اس قابل ہو کہ چوراہے پر لے جا کر تمہیں سولی پر چڑھا دیا جائے۔ چیل کوؤں سے کہا جائے کہ جب تک جسم میں ایک بوٹی بھی باقی ہے اس شخص کو بھنبھوڑتے رہو۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''کبھی کبھی تو میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ میں نے کچھ اچھا نہیں کیا، مگر پارٹنر میں نے اس سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ میری خاطر اپنے آپ کو ٹی بی میں مبتلا کر لے۔''

میرے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنی کار میں بیٹھ کر دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ جانے سے قبل اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ''اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا۔'' اس نے رخصت ہوتے وقت پہلی مرتبہ یہ بات کہی تھی لیکن میری سمجھ میں اس کی بات کا مطلب اس وقت آیا جب دوپہر کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ نسیم کی کار پوری رفتار سے چلتی ہوئی ٹنگائل کے قریب ایک بڑے درخت سے ٹکرا گئی۔ کار میں فوراً ہی آگ لگ گئی۔ لیکن نسیم کی لاش کو جلنے سے بچا لیا گیا ہے اور اب اسے ڈھاکا بھیجا جا رہا ہے۔

نسیم کی موت کے بعد میرا دل انشورنس کے کام سے بالکل کھٹا ہو گیا اسی دوران میں اطلاع ملی کہ تائی نے ڈپٹی کمشنر کو ایک درخواست بھیجی ہے۔ جس میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ میں نے ان کے بیٹے سے زیورات اور قیمتی کپڑے چھین لیے ہیں جان کا خطرہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک میں ایک عادی قاتل ہوں اور اپنے دشمنوں کا سر کاٹ کر گھر میں رکھ لیتی ہوں۔ اس وقت بھی میرے دو دشمنوں کا کاسہ سر میری الماری میں موجود ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی میں تو سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گئی۔ تائی کے دیگر الزامات کا جواب تو ممکن تھا لیکن آخری الزام کا کوئی جواب میرے

پاس نہیں تھا۔ الماری میں دو انسانی کھوپڑیاں موجود تھیں گویا میرے عادی قاتل ہونے کا پورا پورا ثبوت موجود تھا۔ یہ نہ کہا جا سکتا تھا کہ میں نے دلچسپ مشغلے کے طور پر انسانی کھوپڑیاں اکٹھی کی ہیں اور نہ یہ کہ میں غیر ارادی طور پر ان کھوپڑیوں کو اُٹھا کر لے آئی ہوں۔''

وقت بہت کم تھا۔ اگلے روز صبح کی ڈاک سے تائی کی درخواست ڈپٹی کمشنر کے ہاتھوں میں پہنچتے ہی میری گرفتاری اور گھر کی تلاشی کے احکامات جاری ہو جائیں گے۔ شورویر سے پوچھا کہ وہ میری کوئی مدد کر سکتا ہے یا نہیں؟ لیکن اس نے افسوس کے ساتھ انکار میں سر ہلا دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ میری قوتیں اب ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔''

گھبراہٹ کے باعث میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس وقت کو کوس رہی تھی جب میں یہ انسانی کھوپڑیاں اُٹھا کر لائی۔ اگر کسی وجہ سے لے بھی آئی تھی تو مجھے ان سے فوراً چھٹکارا پا لینا چاہیے تھا۔ آخر میں نے ان کو سینت کر کیوں رکھ چھوڑا تھا۔

اب ایک ہی صورت ممکن تھی کہ میں راتوں رات دونوں کھوپڑیوں کو کسی ایسی جگہ دفن کر آؤں جہاں کسی کو ان کا پتا نہ چل سکے، اماوس کی تاریک رات میں جب میں ان کھوپڑیوں کو تھیلے میں ڈال کر گھر سے باہر نکلی تو بالکل واضح طور پر میں نے احمد کی آواز سنی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

لیکن اس وقت احمد کی آواز سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو گرفتار ہونے سے بچاؤں اگر اس وقت ان کھوپڑیوں کو ضائع نہیں کیا تو پھر کبھی ضائع نہ کیا جا سکے گا۔ میں رات کی تاریکی میں دور تک نکلتی چلی گئی۔ کئی میل جانے کے بعد میں نے گنے کے ایک کھیت میں گھس کر کھوپڑیوں کو علیحدہ علیحدہ دفن کیا اور کپڑے جھاڑتی ہوئی نکل آئی۔ کھوپڑیوں کو دفن کرنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بالکل ہلکی پھلکی ہوگئی ہوں میرے دماغ پر منوں بوجھ رکھا ہوا تھا لیکن اب سارا بوجھ اس طرح اُتر گیا تھا کہ میں اپنے آپ کو ہوا میں اُڑتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ برسوں کے بعد میں نے اپنے آپ کو اتنا ہلکا محسوس کیا تھا۔

بستی میں داخل ہوئی تو نان بائی کی دکان ابھی تک کھلی تھی، مجھے ادھر سے گزرتا دیکھ کر وہ زور سے چلایا۔ ''باجی جی! ذرا یہ خط تو پڑھ دیں۔''

میں نے اس کے پاس پہنچ کر اس کے ہاتھ سے پوسٹ کارڈ لے لیا۔ نان بائی وضاحت کرنے لگا۔ ''صبح کا خط آیا ہوا ہے لیکن کام کاج کی وجہ سے ادھر دھیان ہی نہیں گیا۔ اب فرصت ملی تو ٹاٹ کے نیچے سے یہ خط نکلا۔ کس نے بھیجا ہے۔ للو کی اماں نے یا نشاط ہوٹل والے میاں کفایت نے؟''

پوسٹ کارڈ پر لکھے ہوئے حروف میری نظروں میں ناچ رہے تھے۔ مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ میں ایک لفظ تک پڑھنے سے قاصر تھی بار بار کارڈ کو الٹ پلٹ رہی تھی مگر کچھ پڑھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ مجبوراً میں نے کارڈ واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''بھائی میری آنکھوں میں جلن ہو رہی ہے پھر کبھی پڑھ دوں گی۔''

اگر وہ مجھے پہچان نہ رہا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ میں جاہل مطلق ہوں وہ کارڈ لے کر ٹاٹ کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔ ''باجی آپ نے اچھا کیا کہ ان لوگوں کو گھر سے نکال دیا جانتے ہیں سلطان نے کیا گل کھلایا ہے؟ پڑوس کی ایک لڑکی کو لے کر فرار ہو گیا ہے اور ماں باپ کا ٹرنک توڑ کر سات ہزار روپے بھی لے گیا ہے۔''

اب پوری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ تائی اسی نقصان کو مجھ سے پورا کرانا چاہتی تھیں۔ میں تیز تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوئی۔ احمد کے

روپ میں شوروپر میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھا اس وقت مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہو رہی تھی اور میں نے اپنا چہرہ اس پر جھکا دیا تھا مگر اچانک آگے بڑھتے ہوئے میرے ہونٹ رُک گئے، ایسا معلوم ہوا جیسے دہکتی ہوئی آگ پر کسی نے برف کے پانی کا گھڑا اُنڈیل دیا ہو میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گئی۔ احمد کے جسم میں داخل شوروپر کی حالت اس بلی سے ملتی جلتی تھی جس کے منہ سے اس کا شکار چھین لیا گیا ہو۔ کھسیاہٹ کے ساتھ نفرت اور غصے سے منہ بناتا ہوا وہ مجھے گھورتا رہ گیا۔ عین اسی وقت اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے برف کی طرح پگھلنا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر کے لیے ایسا محسوس ہوا گویا پورے گھر میں طوفان آ گیا ہو۔ رونے، پیٹنے، ہنسنے اور قہقہے لگانے کی پُر اسرار آوازیں آنے لگیں۔ نظر نہ آنے والی روحوں اور آسیبوں نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سی روحیں مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور کچھ روحیں مجھے ان کے حملے سے بچانے کے لیے کوشاں ہوں۔ نظروں کے سامنے احمد کا جسم پڑا ہوا تھا اور نصف سے زیادہ پگھل چکا تھا، چاروں طرف گوشت کی بساندھ اور بدبو پھیلی ہوئی تھی یکا یک احمد کا چہرہ غائب ہو گیا اور اس کے بجائے شوروپر اپنے اصلی روپ میں نظر آنے لگا۔ ہاں یہ شوروپر ہی تھا جسے سب سے پہلے میں نے اس وقت دیکھا تھا جب ہم میر پور والے گھر میں خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے اور ابا اماں زندہ تھے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً وہ نظر آنے لگا تھا۔

روحوں کی چیخوں کی آوازیں مدھم ہوتی چلی گئیں۔ مجھے دور سے نسیم مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اس کا نصف چہرہ کچلا ہوا تھا اس کے باوجود وہ اس طرح ہنس رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اس کے پاس ہی زمیندار صاحب کھڑے تھے اور میری طرف دیکھنے کی بجائے دوسری جانب کھڑے تھے اگلے ہی لمحے ان دونوں کے چہرے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور ان کی جگہ احمد نے لے لی۔ اس کے ہونٹ اس طرح کانپ اور لرزے جیسے وہ مجھے باجی کہہ کر مخاطب کر رہا ہو، ایکا ایکی احمد کا چہرہ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ میری اماں کا چہرہ اُبھر آیا انہوں نے دودھیا لباس پہن رکھا تھا چہرے پر فرشتوں جیسا نور اور تقدس تھا اور دونوں آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

میں ہوش میں تھی، سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہی تھی بے اختیارانہ طور پر اپنے دونوں بازو پھیلا کر ان کی طرف لپکی اسی وقت ان کا چہرہ اوجھل ہو گیا۔ پورا گھر خالی ہو گیا۔ شوروپر پانی بن چکا تھا اور ساری روحیں مجھے چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ ہوا کی سائیں سائیں کے علاوہ دوسری آواز کانوں میں نہیں آ رہی تھی اس وقت میری حالت بڑی ناگفتہ تھی۔ درحقیقت پیارا جھگڑا میرے اپنے وجود کا تھا مجھے اپنی زندگی سے نفرت ہو گئی۔

اور تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ خودکشی کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کرب سے نجات دلا دوں۔

میں عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی اپنے گھر پر میں نے ایک اچٹتی ہوئی آخری نظر ڈالی اور رات کی تاریکی میں باہر نکل گئی۔ ابھی تک میں نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ خودکشی کے لیے کس طریقے کو اپناؤں گی البتہ یہ سوچ لیا تھا کہ اگر راستے میں پہلے دریا پڑا تو اس میں کود کر اپنے آپ کو ختم کر لوں گی اور اگر پہلے ریلوے لائن نظر آ گئی تو اس میں لیٹ جاؤں گی مگر دریا یا ریلوے لائن تک پہنچنے سے قبل راستے ہی میں میری مڈبھیڑ ایک مائی سے ہو گئی۔ یہ ایک مخبوط الحواس عورت تھی اور ہر جمعرات کو حسن پور میں بھیک مانگنے آیا کرتی تھی۔ لوگوں میں اس کے متعلق عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں

کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اسے بیک وقت ڈھاکا اور حسن پور دونوں جگہ دیکھا گیا ہے لیکن میں نے اسے کبھی ایک نیم پاگل عورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی البتہ جب کبھی وہ نظر آئی اور اس نے کچھ مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلایا تو میں نے کچھ نہ کچھ اسے دے ضرور دیا۔

وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی اس کے پاس ہی تین بڑے بڑے کتے نیم دراز تھے میں اپنے خیالات میں گم ادھر سے نکلتی چلی گئی۔

کچھ دور گئی تھی کہ اس نے آواز لگائی۔ ''راہ مولیٰ کچھ ہمیں بھی دیتی جاؤ۔''

میں نے مائی کی بات سنی اَن سنی کر دی اور اپنی دھن میں مست آگے نکلتی چلی گئی اسی وقت ایک کتا اُچھلا اور اس نے لپک کر میرا پائنچا اپنے منہ میں دبالیا۔ مائی نے کہا۔ ''بغیر کچھ دیئے آگے نہیں جاسکتی۔''

میں رُک گئی۔ خیال آیا کہ اب تو اس دنیا سے رخصت ہو ہی رہی ہوں۔ مجھے روپوں پیسوں کی کیا ضرورت، جو کچھ ہے اس پگلی ہی کو دیتی چلوں۔ اس کا بھلا ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے نوٹوں سے بھرا ہوا پرس اس کی طرف اُچھال دیا۔

مائی زور سے ہنسی۔ ''ہمارے پاس نہیں آؤ گی؟''

میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور کتے کے منہ پر ٹھوکر لگا کر چاہا کہ آگے بڑھ جاؤں مگر فوراً ہی وہ چھلانگ لگا کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور اس نے مجھے چاروں خانے چت کر دیا، مائی کے پاس بیٹھے ہوئے دونوں کتے اس طرح بھونک اُٹھے جیسے میری بے چارگی پر قہقہے لگا رہے ہوں۔ مائی نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اسے ہمارے پاس لے آؤ۔''

مائی کی بات سنتے ہی کتوں نے جست لگائی۔ ایک نے میرے گریبان کو منہ میں دبایا دوسرے نے کمر پر بندھی ہوئی پیٹی پر اپنے دانت گاڑے اور تیسرا جو میرے سینے پر سوار تھا، نیچے اُتر کر دوبارہ پائنچے سے لپٹ گیا۔

پلک جھپکتے میں تینوں کتوں نے مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے مائی کے پاس لے جا کر چھوڑ دیا اور خود اس طرح سنبھل کر بیٹھ گئے کہ اگر میں ذرا بھی جنبش کروں تو وہ میرا ٹیٹوا ہی دبالیں۔

مائی نے مجھ سے کہا۔ ''اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔''

میں اپنے کپڑے سمیٹتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ ''لعنت ہے۔''

مائی ہنسی۔ ''کس پر لعنت کر رہی ہو، کتوں پر؟''

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

''خدا کی قسم یہ کتے تم سے افضل ہیں۔ یہ مر کر مٹی میں مل جائیں گے لیکن تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ خودکشی کرنے کے جرم میں تمہیں جہنم میں پھینک دیا جائے۔ بولو کون افضل ہوا؟ یہ کتے یا تم؟''

مائی کی بات میرے دل میں اُترتی چلی گئی وہ کوئی پاگل اور مخبوط الحواس عورت نہیں تھی، اس کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں، وہ درست ہوں یا نہ ہوں تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ صاحب کشف عورت تھی۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں خودکشی کرنے کے ارادے سے نکلی ہوں؟“

رات کی تاریکی میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ ”ہم مسافروں کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں۔ ہماری نگاہوں نے ان مسافروں کو بھی دیکھا ہے جو سفر پر نکلے تو نیکی کے انبار زادِ راہ کے طور پر لے گئے اور ان مسافروں کو بھی دیکھا جن کے پاس ایک نیکی بھی نہیں...... تم بھی ایسی ہی مسافر ہو، ہم جھوٹ تو نہیں کہتے۔“

یہ وہی مائی تھی جسے میں نے کبھی گھاس کے تنکے کے برابر بھی اہمیت نہیں دی تھی، لیکن آج اس کی باتیں سن کر عقیدت واحترام کے ساتھ میرا سر اس کے سامنے خم ہوا جا رہا تھا۔ ”نہیں مائی تم بالکل درست کہہ رہی ہو، میں واقعی ایسی مسافر ہوں جو بغیر زادِ راہ لیے ہوئے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہو۔“

وہ ہنسی۔ ”عقلمند مسافر وہ ہے جو سفر کی کٹھن منزلوں کے لیے کچھ اسباب اکٹھا کر لے۔ جانے کے لیے تو سبھی آتے ہیں لیکن ایسا جانا بھی کس کام کا کہ پاس پلے کچھ بھی نہ ہو۔“

میں نے آہ بھر کر کہا۔ ”میں مجبور ہو گئی ہوں مائی بھلا ایسی زندگی سے کیا فائدہ کہ انسان کو روحوں کا تابع ہو کر رہنا پڑے۔“

”ہش......“ اس نے اتنی زور سے مجھے ڈانٹا کہ میں اُچھل پڑی۔ ”روحیں دو قسم کی ہوتی ہیں اچھی یا بُری۔ اگر تم اچھی ہو تو تمہارے پاس بُری روحیں ہرگز نہیں آسکتیں اور بُری ہو تو اچھی روحوں کو کیا ضرورت ہے کہ گندے لوگوں کے پاس جائیں۔“

میری نگاہوں میں تھوڑی دیر پہلے کا منظر گھوم گیا جب گھر پر روحوں نے اودھم مچا رکھا تھا میں نے آہستہ سے کہا۔ ”مگر مائی میرے پاس تو اچھی اور بُری دونوں کی قسم روحیں آئی تھیں۔“

مائی نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ”اتنی معمولی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔“

مجھے اپنے ذہن کا دریچہ کھلتا ہوا محسوس ہوا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نیکی اور بدی کے دوراہے پر کھڑی ہوں مجھے اختیار ہے کہ جس راہ کو چاہوں پسند کر لوں۔“

”بالکل ٹھیک سمجھی۔“ اس کے لہجے میں شفقت اور محبت تھی۔ ”لیکن میری بچی، راستہ یونہی نہیں طے ہوتا۔ زندگی کے سفر میں بڑی بڑی پُرپیچ گھاٹیاں آتی ہیں قدم قدم پر ٹھگوں اور چوروں اور ڈاکوؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے دانا وہ ہے جو کسی ایسے راستے پر چلے جس راستے کے نشیب وفراز سے وہ خوب اچھی طرح واقف ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”مجھے وہ راستہ کب ملے گا مائی؟“

وہ بولی۔ ”بس اب یہاں سے فوراً چلی جاؤ ہمیں جو کچھ بتانا تھا۔ وہ ہم نے بتا دیا یہ ناممکن ہے کہ روشنی کی تلاش میں نکلو اور تاریکی میں بھٹک جاؤ۔“

میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس نے میری ایک بھی نہ سنی۔ کتوں کو اشارہ کر کے کہا کہ وہ ٹونگی تک چھوڑ آئیں۔

کتے منہ پھاڑ کر میری طرف لپکے مجبوراً مجھے اُٹھنا پڑا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک تینوں کتے میرے پیچھے چلتے رہے جہاں کہیں میرے قدم

سُست پڑتے یا میں ٹھہرنا چاہتی وہ اس طرح غرانے لگتے جیسے مجھے کچا ہی چبا جائیں گے۔

ایک گھنٹے کے بعد مجھے ایک نہر بہتی ہوئی نظر آئی جونہی میں اس نہر کے کنارے پہنچی، کتے نظروں سے غائب ہو گئے مجھ پر کچھ ایسی تھکن غالب تھی کہ میں وہیں نہر کے کنارے لیٹ گئی اور لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی۔

خواب میں شورویر نظر آیا۔ بہت پریشان اور اُداس معلوم ہو رہا تھا۔ ''کب تک مجھ سے دور رہو گی میں جتنا تمہارے پاس آتا ہوں، تم اتنی ہی مجھ سے دور ہو جاتی ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے ہمیشہ دھوکے اور فریب سے کام لیا ہے، اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت ہوتی تو دھوکے اور فریب سے میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔''

وہ بولا۔ ''جس کے دل پر گزرتی ہے، اسی کو معلوم ہوتا ہے کہ محبت کتنی ظالم چیز ہے۔ تم تسلیم کرو یا نہ کرو لیکن سچ تو یہ ہے کہ میرے دل میں صرف تم ہی بسی ہوئی ہو، دل سے چاہتا ہوں کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے دوں، پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہو جاتی ہے کہ اُلٹی تمہاری ناراضگی ملتی ہے خیر کوئی بات نہیں، تم بے وفائی کیے جاؤ اور میں اپنی وفاداری کا ثبوت بہم پہنچاتا رہوں گا، آنکھ کھلنے پر نہر کے کنارے چلی جانا وہاں دھوبی کے پاٹ کے نیچے تمہیں ایک انگوٹھی ملے گی۔ میری طرف سے یہ ناچیز تحفہ ہے جب کبھی تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو اس انگوٹھی سے فرمائش کر دینا، وہ چیز تمہیں مل جایا کرے گی۔''

''شکریہ۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''مجھے تمہاری وہ بات آج تک یاد ہے کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے بتاؤ تمہاری اس طلسماتی انگوٹھی کے بدلے مجھے کیا کیا کھونا پڑے گا؟''

شورویر نے جواب میں کچھ کہا لیکن میں اس کی بات سمجھ نہیں سکی۔ اس وقت کہیں دور کی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ صبح صادق کی سپیدی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور سامنے ہلکی مترنم آواز میں نہر بہہ رہی تھی۔

میں اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اذان کی آواز پر اپنے کان لگا دیے۔ کتنی پیاری اور کتنی مقدس تھی یہ آواز کاش میں اس آواز پر لبیک کہہ سکتی۔ زندگی کا کتنا طویل سفر یونہی گزر گیا اور مجھے آج تک یہی معلوم نہ ہو سکا کہ نماز کی روح کیا ہوتی ہے۔ مائی نے سچ کہا تھا کہ جانے کے لیے تو سبھی آتے ہیں مگر ایسا جانا کس کام کا کہ پاس پلے کچھ بھی نہ ہو۔ میرے لیے کسی بھی وقت موت کا بلاوا آ سکتا تھا لیکن میرے پلے کیا تھا بیہودگیاں، آوارگیاں، گناہوں کے انبار نیکی تو قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ ایک بھی تو ایسا عمل نہیں تھا جو میری بخشش اور نجات کا ذریعہ بن سکتا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے روحوں کے چکر نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا، نہ دنیا ملی نہ آخرت۔ بلاشبہ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر کتے تھے کہنے کو میں اشرف المخلوقات تھی لیکن ارزل المخلوقات بنی ہوئی تھی کیا مجھے اسی لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا کہ سراب کے پیچھے بھاگتی پھروں اور کمینی حرکتوں سے اپنے حق میں کانٹے بوؤں؟

میں نے اپنے ابو کی زندگی میں نماز پڑھی تھی اور وضو کرنا سیکھا تھا۔ آج نہ نماز یاد تھی اور نہ مجھے وضو کرنا آتا تھا۔ یہ البتہ یاد تھا کہ وضو کرتے

وقت ہاتھ منہ دھوئے جاتے ہیں۔ میں خاموشی کے ساتھ دل ہی دل میں اپنی حالت پر افسوس کرتی رہی۔ نہر کے کنارے چلی گئی تا کہ اُلٹا سیدھا وضو کر کے اللہ کے حضور درخواست کر سکوں کہ مجھے نہیں معلوم عبادت کیسے کی جاتی ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف کر دے اور مجھے کسی ایسے رہبر تک پہنچا دے جس کی رہنمائی سے مجھے تیرا قرب اور تیری محبت حاصل ہو جائے۔ کاش آج بابا ہوتے تو وہ ضرور مدد کرتے۔

☆=======☆=======☆

ہاتھ منہ دھوتے ہوئے میری نظر دھوبی کے ایک پاٹ پر پڑی، اس کے نیچے کوئی چیز چمک رہی تھی۔ چمک اتنی تیز تھی کہ پاٹ کا نچلا حصہ اس سے روشن ہو گیا تھا۔ خود بخود میرے قدم اس چیز کی طرف اُٹھ گئے۔ ہاتھ بڑھا کر اُٹھایا تو وہ سونے کی انگوٹھی نکلی جس میں ہیرا جڑا ہوا تھا اور اسی وقت مجھے اپنا خواب یاد آ گیا۔ شوروپر نے کہا تھا۔ ”تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو انگوٹھی سے فرمائش کر دینا تمہاری ضرورت پوری ہو جائے گی۔“

سچی بات تو یہ ہے کہ میں انگوٹھی پا کر یہ بھول گئی کہ تھوڑی دیر قبل عبادت کے خیال سے وضو کرنے کے لیے بیٹھی تھی انگوٹھی اتنی قیمتی تھی کہ میں بار بار اسے حیرت سے تک رہی تھی۔ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ انگوٹھی میں طلسمی خوبیاں نہ بھی ہوں تب بھی اس کی قیمت ہزار روپے سے کم نہیں ہو گی۔

نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ شوروپر کی بات کو آزمایا جائے میں نے انگوٹھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں چاہتی ہوں صبح کا ناشتہ شبنم کے ساتھ کروں۔“

اس زمانے میں شبنم کی فلم نے پورے پاکستان میں اودھم مچا رکھا تھا خود میں نے یہ فلم کئی مرتبہ دیکھی تھی شاید ہی ملک کا کوئی نوجوان ایسا ہو جو یہ فلم دیکھ کر شبنم پر دل و جان سے فدا نہ ہوا ہو۔ میرے ذہن میں بھی انگوٹھی کو پرکھنے اور جانچنے کی یہی ترکیب آئی کہ شبنم سے نہ صرف ملاقات کی جائے بلکہ اس کے ساتھ ناشتہ کرنے کا بھی فخر حاصل کیا جائے۔

انگوٹھی سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ مجھے اپنی حرکت پر ہنسی آ گئی اگر انگوٹھیوں ہی سے انسان کی خواہشات تکمیل تک پہنچنے لگتیں تو دنیا میں سارا کا سارا کاروبار ہی چوپٹ ہو کر رہ جائے۔

سامنے سے ایک دیہاتی سفید دھوتی باندھے ہوئے نہر کی سمت غسل کے لیے آ رہا تھا میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیوں بھئی یہ کون سی جگہ ہے؟“

دیہاتی نے سر سے پاؤں تک مجھے حیرت سے دیکھا۔ ”تم ٹونگی میں ہو۔ ڈھاکا یہاں سے چند ہی میل کے فاصلے پر ہے۔“

حسن پور سے ٹونگی اتنا قریب نہیں تھا کہ ایک گھنٹے میں کوئی شخص پیدل چل کر وہاں پہنچ جائے یقیناً یہ مائی کا کمال تھا مجھے یاد آ گیا کہ اس نے اپنے کتوں سے یہی کہا تھا کہ اسے ٹونگی تک چھوڑ آؤ لیکن یہ وقت مائی کے کمال پر تعجب کے اظہار کا نہیں تھا میرے سامنے جو دیہاتی کھڑا تھا وہ میرا جانا بوجھا ہوا شخص تھا اس کی صورت اور لہجے سے میری آنکھیں آشنا تھیں اچانک میں سمجھ گئی کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟

”آپ؟“ میں نے عجیب سی خوشی محسوس کرتے ہوئے بوکھلاہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ”آپ فلم بنانے والے کیپٹن احتشام تو نہیں ہیں۔“

وہ شخص مسکرانے لگا۔ ”ہاں بھائی! تم نے خوب پہچانا۔“

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''غسل کرنے آیا ہوں۔''اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں جناب! میرا مطلب یہ نہیں۔ یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ آپ غسل کرنے تشریف لائے ہیں میں تو محض یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ڈھاکا کی بجائے آپ یہاں تن تنہا کیسے گھوم رہے ہیں؟''

''میں تنہا تو نہیں، میں اپنی پوری ٹیم کے ساتھ یہاں آیا ہوں، تمہیں سامنے لگے ہوئے خیمے نظر نہیں آتے۔''

اب تک میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ واقعی چند فرلانگ کے فاصلے پر کئی خیمے لگے ہوئے تھے۔

''کس فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں آئے ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے غسل کرلوں۔''

میں نے فلمی رسالوں میں کیپٹن احتشام کی عادات وخصائل کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ وہ اندھیرے منہ اُٹھ کر چہل قدمی کیا کرتا تھا، اس کے بعد نہاتا تھا، پھر ناشتہ کرکے اپنے کام میں مصروف ہوجاتا تھا مشہور تھا کہ صبح کی چہل قدمی اور غسل کیے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرسکتا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ نہا کر نہر سے باہر نکلا اور مجھ سے بڑے بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتا ہوا خیموں کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ فلم کی غیر معمولی کامیابی کے بعد اس کا ایک اور فلم بنانے کا ارادہ ہے۔ فی الحال وہ اپنی پوری ٹیم کو سیر کرانے کے لیے نکلا ہے۔ تقریباً وہ سارے افراد اس کے ساتھ ہیں جنہوں نے آخری فلم کی تکمیل میں کسی نہ کسی صورت میں اس کی مدد کی تھی۔

میں نے پوچھا۔''آپ کے ساتھ شبنم بھی ہیں؟''

''نہیں......''اس نے سر ہلایا۔''وہ ڈھاکا میں مقیم ہیں، نہ وہ ہمارے ساتھ آئی ہیں اور نہ ہمارے ساتھ سیر کو جاسکیں گی آج کل ان کے پاس دو تین فلمیں ہیں۔ ہماری خاطر وہ دوسروں کو نقصان تو نہیں پہنچا سکتیں۔''

خیمے تک پہنچ کر میں نے جانے کی اجازت چاہی تو اس نے مجھے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گئی۔ مجھ جیسے نہ جانے کتنے اجنبی لوگوں سے روزانہ اس کا واسطہ پڑتا ہوگا۔ غالباً اسی وجہ سے اس نے میرا نام پوچھا نہ میرا مشغلہ دریافت کیا نہر سے خیمے تک اس نے اپنے متعلق ہی باتیں کیں اور اپنے آئندہ پروگرام کے متعلق بتاتا رہا، اس کے لہجے میں فخر وانبساط تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کامیاب انسان کو فخر کرنے اور خوش ہونے کا پورا پورا حق پہنچتا تھا۔

دور تک خیمے لگے ہوئے تھے۔ سورج طلوع ہوچکا تھا اور بہت سے افراد بیدار ہوکر اپنے اپنے خیموں سے باہر نکل آئے تھے۔ میں احتشام سے رخصت ہوکر اس کے ساتھیوں پر نظر ڈالتی ہوئی اپنی نامعلوم منزل کی طرف جارہی تھی۔ ان میں سے کئی چہروں کو میں نے سینما کے پردے پر دیکھ رکھا تھا۔ بہت سے ایسے چہرے بھی تھے کہ میں ان سے بالکل شناسا نہیں تھی۔ ایک جانب ایک خوبصورت لڑکی ہری گھاس پر لیٹی ہوئی گہرے گہرے سانس لے کر کسی قسم کی ورزش کررہی تھی۔ وہ اپنی ورزش میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اسے دنیا و مافیہا کا کوئی علم نہیں تھا۔ اچانک میری نظر ایک سیاہ سانپ

پر پڑی۔ وہ اس لڑکی کے قریب ہی پھن پھیلائے کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا تھا اور کسی وقت بھی بے خبری میں اسے ڈس سکتا تھا میں نے لپک کر پتھر کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور پوری قوت سے سانپ پر ٹوٹ پڑی۔

سانپ تو پتھر کی دو چوٹوں میں ہی ختم ہو گیا۔ لڑکی نے سانپ کو دیکھا تو بے تحاشہ چیخنے چلانے لگی۔ چاروں طرف سے خیموں سے لوگ نکل کر ادھر بھاگے چلے آئے۔

چند ہی لمحوں میں، مَیں ہیروئن بنی سینہ پھیلائے ہوئے ان لوگوں کے درمیان کھڑی تھی۔ لڑکی تعریفی انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اپنے ساتھیوں کو بتا رہی تھی کہ اگر میں وہاں نہ ہوتی تو آج اس کی موت لازمی تھی۔ اس کی معلومات کے مطابق یہ کوئی معمولی قسم کا سانپ نہیں تھا بلکہ کوبرا تھا جو انسانوں کے خون کا پیاسا ہوتا ہے اور انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کاٹتا ہے۔

شور وغل کی آوازیں احتشام کو بھی وہاں لے آئیں۔ اسے پورا واقعہ معلوم ہوا تو اس نے مجھے ایسی محبت بھری نظروں سے دیکھا کہ شاید کبھی اپنے فلم کی ہیروئن کو بھی نہیں دیکھا ہوگا، اس نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب تم ناشتہ کیے بغیر نہیں جا سکتیں۔''

میں نے ٹالنے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ نہیں مانا۔ زبردستی مجھے اپنے خیمے میں لے گیا اور ایک شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہم دونوں کا ناشتہ یہیں پہنچا دو۔''

ادھر ناشتہ لگایا گیا اور ادھر ایک کار آ کر رُکی معلوم ہوا کہ شبنم تشریف لائی ہیں، اسے ہاتھوں ہاتھ خیمے میں لے آیا گیا۔ وہ واقعی سانولی سلونی شبنم تھی۔ فلم کے پردے پر اس کی خوبصورتی کا عشرِ عشیر بھی نظر نہیں آتا تھا میں نے اپنی تمام زندگی میں اتنی حسین عورت آج تک نہیں دیکھی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر اس قدر باوقار انداز میں باتیں کر رہی تھی کہ حقیقت میں کسی ملک کی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔

زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتی مختصراً عرض کرتی ہوں کہ اس روز کے ناشتے میں میرے ساتھ ہزاروں دلوں کی ملکہ شبنم شریک تھی۔ طلسمی انگوٹھی کے بارے میں میرے خدشات غلط ثابت ہوئے تھے۔ شورویر نے مجھے اتنی انوکھی چیز عطا کی تھی جو میری ساری خواہشات کو پورا کر سکتی تھی اس ایک واقعے سے میں انگوٹھی پر اس حد تک ایمان لا چکی تھی کہ اگر میں یہ خواہش کرتی کہ احتشام اپنی اگلی فلم میں مجھے ہیروئن کی حیثیت سے پیش کرے تو یقین تھا کہ وہ فوراً مجھ سے معاہدہ کر لیتا لیکن مجھے تو اس سے بھی زیادہ اہم کام انجام دینا تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میرے اندر بے یقینی اور بے اعتمادی کی جو کیفیت تھی وہ دور ہو چکی تھی۔ یہ احساس کس قدر جانفزا تھا کہ میں جو چاہوں، کر سکتی ہوں۔

☆=======☆=======☆

ڈھاکا پہنچ کر میرا ارادہ تھا کہ اپنی کسی عزیز کے ہاں قیام کروں گی مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور شاہ باغ ہوٹل میں ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلی خواہش میں نے یہ کی کہ مجھے تکیے کے نیچے دو ہزار روپے کے نوٹ مل جائیں۔ نوٹوں کے حصول کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں ہی لیٹ گئی اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگی۔ ضمیر نے پگلی مائی کی باتیں یاد دلائیں تو میں نے ان پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اپنی تمام خوبصورتیوں اور رعنائیوں کے ساتھ دنیا بازو پھیلائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں اتنی بیوقوف نہیں تھی کہ

مائی کی باتوں پر عمل کر کے اپنی چندروزہ زندگی کو برباد کر لیتی۔ صحیح معنوں میں زندگی گزارنے اور عیش کرنے کا وقت تو اب آیا تھا۔ کوٹھی، کاریں، اعلیٰ سوسائٹی کی حسین ترین دوشیزائیں، شراب و کباب اور رقص و موسیقی کی محفلیں میری ہی منتظر تھیں۔ دنیا کی ہر شے میری اپنی تھی اور اگر اپنی نہیں تھی تو میں اسے حاصل کر سکتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی جو انگوٹھی کے ہوتے ہوئے مجھے میری خواہشات کو پورا کرنے سے روک سکے۔

سب سے پہلے مجھے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ذہن کی ضرورت تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں عجلت میں کسی ایسے شخص کے ذہن کی خواہش نہ کر لوں جس کے نزدیک عیش و عشرت گالی کے مترادف ہو، مجھے بہت محتاط رہ کر جلد از جلد اپنے لیے ایک اعلیٰ درجے کے ذہن کا انتظام کرنا تھا۔

گھنٹی کا بٹن دبا کر میں نے بیرے کو بلایا اور اس سے پوچھا اس ہوٹل میں جو لوگ آتے رہتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قابل کون ہے؟

ایک منٹ تک اپنا سر کھجانے کے بعد اس نے کہا۔ ''ایک تو پروفیسر ضیاء الرحمٰن ہیں اور دوسرے سلیم ایڈووکیٹ اور تیسرے کھونددکا بر احمد۔''

''بس......بس......'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''ذرا جلدی سے چائے پہنچا دو۔''

چائے پینے کے بعد میں نیچے آگئی اور کاؤنٹر کلرک سے یہی بات پوچھی۔ ''تم بتا سکتے ہو کہ اس ہوٹل میں کون کون قابل لوگ آتے ہیں؟''

''یہاں تو سبھی قابل لوگ آتے ہیں جی؟'' اس نے دانت نکال دیئے۔ ''دیکھئے ناشاہ باغ ہوٹل شہر کا سب سے بڑا اور قیمتی ہوٹل ہے اس لیے یہاں آنے والے ایسے ویسے معمولی لوگ نہیں ہوتے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری نظر میں زیادہ قابل کون کون لوگ ہیں؟''

اس نے چھ سات نام لیے ان میں پروفیسر ضیاء الرحمٰن کا نام بھی شامل تھا۔

کاؤنٹر کلرک سے نمٹ کر میں نے مناسب سمجھا کہ ہوٹل کے منیجر سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔

''کیوں جناب!'' اس کے آفس میں پہنچ کر میں نے سوال کیا۔ ''آپ کے ہوٹل میں یوں تو اچھے اور قابل لوگ ہی آتے ہیں لیکن آپ کی نظر میں سب سے زیادہ قابل کون ہے؟''

منیجر نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''اگر اس میں ایک بُرائی نہ ہو تو پروفیسر ضیاء الرحمٰن سے زیادہ قابل شخص آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔''

''مناسب سمجھیں تو وہ ایک بُرائی بھی بتا دیں۔''

''بُرائی یہ ہے کہ پروفیسر جب بھی ہوٹل میں آتا ہے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی نئی لڑکی ضرور ہوتی ہے۔''

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ''یہ تو کوئی ایسی بُرائی نہیں۔ دنیا کے ہر اچھے اور قابل شخص میں کم از کم یہ بُرائی تو ہونی ہی چاہیے۔''

منیجر کے پاس سے اُٹھ کر میں ہوٹل کے برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی اور بیرے سے کہہ دیا کہ پروفیسر ہوٹل میں آئے تو وہ مجھے مطلع کر دے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بیرے نے آ کر بتایا کہ پروفیسر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کے گیٹ سے ایک ادھیڑ عمر شخص ایک کمسن لڑکی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہوٹل میں داخل ہو رہا ہے۔ لڑکی اتنی خوبصورت تھی کہ میری نظریں پروفیسر کے بجائے اس پر جم کر رہ گئیں، پروفیسر میرے پاس سے گزرتا ہوا کونے کی ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ بیرے نے بغیر کچھ کہے بیئر کی بوتل اس کے پاس لا کر رکھ دی اور لڑکی کے لیے آرڈر لینے لگا۔

میں نے اپنی انگوٹھی پر ہاتھ پھیرا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ پروفیسر کا ذہن میرے پاس منتقل ہو جائے۔''

دوسرے ہی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک میرے جسم پر کسی نے منوں بوجھ لاد دیا ہو اسی وقت پروفیسر کی میز سے چیخ کی آواز سنائی دی وہ بوتل سے گلاس میں بیئر انڈیلتا ہوا چاروں خانے چت فرش پر گر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ زبان باہر نکل آئی تھی اور ناک سے سیاہ خون جاری تھا۔

ڈاکٹر اور پولیس دونوں ہی کو فون کیا گیا ان کی آمد سے قبل ہوٹل میں موجود ایک ملٹری سرجن نے پروفیسر کا معائنہ کر کے اعلان کر دیا کہ پروفیسر اس ناپائیدار دنیا کو چھوڑ چکے ہیں ان کی موت کی خبر سن کر وہ لڑکی بہت پریشان ہوئی جو پروفیسر کے ساتھ ہوٹل آئی تھی معلوم ہوا کہ وہ بی اے سال اول کی طالبہ ہے۔ نام بوبیتا ہے۔ ماں کی اجازت سے پروفیسر کے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ریگنن اسٹریٹ میں اس کا گھر ہے اس کے والد درجہ اول کے سرکاری ملازم ہیں اور آج کل کھلنا کے سرکاری دورے پر گئے ہوئے ہیں۔

پولیس کی آمد تک وہ غمزدہ چہرے کے ساتھ وہیں رہی میری نظریں بھی اس کے حسین چہرے پر جمی رہیں۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ پروفیسر کی موت کے غم نے اسے اور بھی زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ حسنِ مغموم کی تعریفیں تو بہت سی تھیں لیکن آج اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تو پتا چلا کہ الفاظ میں اتنی قوت نہیں کہ صحیح طور پر تعریف کر سکیں۔

لاش ایمبولینس میں رکھ کر لے جائی گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ بوبیتا بھی پولیس افسر کی اجازت سے جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی، انگوٹھی میری انگلی میں تھی۔ اسے مخاطب کر کے میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ گھر جانے کے بجائے وہ لڑکی میرے پاس آجائے۔''

اچانک گیٹ کی طرف اُٹھتے ہوئے اس کے قدم رُک گئے اس نے گھوم کر بیرے کی طرف دیکھا دو تین منٹ تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ بیرا بار بار میری طرف اشارہ کر رہا تھا، اس لیے یہ اندازہ لگانے میں مجھے کوئی دقت ہی نہ ہوئی کہ میرے ہی متعلق گفتگو کی جا رہی تھی۔

وہ مڑی اور اس نے میری میز کی جانب سبک قدم اُٹھانا شروع کر دیئے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آہستہ آہستہ باوقار انداز میں چلتی ہوئی وہ میرے پاس آئی اور برابر میں خالی پڑی ہوئی ایک کرسی کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ ''میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔''

''ضرور۔'' میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''تشریف رکھیے۔''

وہ بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی۔ میری نظریں اس کے گداز پیروں کے پنجوں پر جم گئیں، اچانک اس نے پوچھا۔ ''آپ آج ہی آئی ہیں۔''

''جی ہاں...... آج ہی آئی ہوں۔''

''پروفیسر کو یہی خوف تھا کہ کہیں آپ خود ہی تشریف نہ لے آئیں مگر اسے یہ علم نہیں تھا کہ آپ اس سے اتنی خفا ہو چکی ہیں کہ اس کی جان تک لینے سے گریز نہیں کریں گی۔''

میں نے سنبھل کر پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ پروفیسر کی موت سے میرا کیا تعلق؟''

''آپ کا کوئی تعلق نہیں تو اچانک پروفیسر کیوں مر گیا؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ بات تو آپ ڈاکٹر سے پوچھیں۔''

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ پروفیسر کی رگیں پھٹ جانے سے موت واقع ہوئی ہے۔'' اس نے اس طرح جواب دیا جیسے کوئی ذومعنی بات کر رہی ہو۔ ایسی ہی ایک موت چٹا گانگ میں احمد علی کی بھی ہو چکی ہے۔ تین مہینے پہلے بالکل اسی طرح اس کے دماغ کی رگیں بھی پھٹ گئی تھیں۔''

''آپ کہنا چاہتی ہیں کہ دونوں اموات میں میرا ہاتھ تھا۔''

''میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب آپ چھپنے کی کوشش نہ کریں میں نے آپ کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب بیرے نے یہ بتایا کہ آپ کو پروفیسر کی آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا لیکن پروفیسر ہوٹل میں آیا تو آپ نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ میں پوچھتی ہوں، جس شخص کی آمد کی آپ منتظر تھیں، اسے دیکھ کر اُٹھی کیوں نہیں؟ اس سے ملاقات کیوں نہیں کی؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے قتل کرنے سے پہلے آپ اچھی طرح یہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ آپ کا نشانہ کوئی غیر متعلق شخص نہ بن جائے؟''

غصہ آنے کے بجائے مجھے اس کی باتوں میں لطف آنے لگا تھا۔ ''اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے نگاہوں سے قتل کر دینے کی خوبی آپ جیسی خوبصورت لڑکی میں تو ہو سکتی ہے لیکن معاف کیجیے مجھ میں یہ خوبی نہیں کیونکہ نہ میں اتنی خوبصورت ہوں اور نہ بہت زیادہ پڑھی لکھی۔''

اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ''آپ نے غیر ضروری جلدی سے کام لیا ہے۔ پروفیسر سارا کام پایہ تکمیل تک پہنچا چکا تھا اور میں صبح کی ٹرین سے شاہین کے پاس جانے والی تھی۔''

بوبیتا کی گفتگو سے یہ صاف عیاں تھا کہ پروفیسر کوئی غیر قانونی کام کرتا تھا اور لڑکیاں اس کے کام میں معاونت کرتی تھیں۔ شاہین نامی کوئی شخص خفیہ تنظیم کا سربراہ تھا، بوبیتا کے نزدیک میری حیثیت تنظیم کی جلاد صفت رکن کی تھی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں میں نہیں جانتی شاہین کون ہے اور اس سے آپ کا یا پروفیسر کا کیا تعلق ہے؟''

اسے اب بھی میری بات پر یقین نہیں آیا...... بولی۔ ''نقشہ آپ کو دیا جائے یا شاہین تک پہنچایا جائے؟''

نقشے کا نام سن کر میرے اندر تجسس کا جذبہ بیدار ہو گیا سوچا کہ دیکھوں تو کس قسم کا نقشہ ہے شاید اس سے پروفیسر کی سرگرمیوں کا کچھ پتا چل سکے۔ ''نقشہ تو آپ مجھ کو دے دیجیے۔''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کل صبح آپ کی خدمت میں نقشہ پیش کر دیا جائے گا۔''

میں چاہتی تھی کہ وہ تھوڑی دیر اور ٹھہرے لیکن جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر کے لیے میں بت بنی بیٹھی رہی، رہ رہ کر بوبیتا کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی اور اس کی میٹھی اور مترنم آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

اُٹھ کر اپنے کمرے کی جانب جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ ایک شخص میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اس کی جانب کوئی دھیان نہیں دیا تو وہ خود ہی بولا۔ ''کہو کیا حال ہے؟''

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو خوف سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

وہ نسیم تھا۔ اس کا نصف جسم مع چہرے کے کچلا ہوا اور ایک آنکھ باہر کو لٹکی ہوئی تھی۔

''تم؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''لڑکی ہے زوردار۔'' اس نے داہنی آنکھ دبا کر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ہوٹل کا کوئی شخص ہم لوگوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب کھانے پینے یا باتیں بنانے میں مشغول تھے۔

''تم زندہ ہو؟'' میں نے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم اب تک مٹی میں مل چکے ہو گے۔''

نسیم نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔ ''موت بھی تو ایک قسم کی زندگی کا نام ہے مرنے والے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، مٹا نہیں کرتے، افسوس یہ راز فرائڈ کو اس کی زندگی میں معلوم نہ ہو سکا۔ تم بھی اس کی باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔ مجھے تو اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ یہ کبوتری تم تک کیسے پہنچ گئی؟''

وہ بہت زور زور سے بول رہا تھا لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ ہوٹل بھرا ہونے کے باوجود کوئی بھی شخص ہماری طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔

''کار کے حادثے نے تمہارا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لوگ تو تمہیں دیکھ کر ڈر جاتے ہوں گے۔''

''ارے..... یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ذرا میرے پیٹ کی طرف دیکھو۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا دامن اُٹھایا۔ پیٹ کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چکراتا ہوا سر تھام لیا۔ ''اس خطرناک حالت میں تم یوں گھومتے پھر رہے ہو جیسے کوئی خاص بات ہی نہیں۔''

''موضوع بدلنا تو کوئی تم سے سیکھے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کس خوبی سے لڑکی کی بات گول کر گئیں لیکن میں بھی پوچھے بغیر نہیں مانوں گا۔ کیا اسے بھی تم اپنی سہیلی سمجھتی ہو؟''

میں نے اس کا برف ایسا ٹھنڈا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''پہلے ڈاکٹر کے پاس چلو۔''

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو۔''

اسے کھینچتی ہوئی میں کاؤنٹر تک لے گئی اور کلرک سے کہا۔ ''اگر مجھ سے کوئی ملنے آئے یا فون کرے تو اسے بتا دینا کہ میں اپنے اس دوست کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گئی ہوں اور جلدی واپس آ جاؤں گی۔''

''کس کے ساتھ؟'' کلرک نے پلکیں جھپکائیں۔

''اس بے ہودہ کے ساتھ، جس کا ہاتھ میں نے پکڑ رکھا ہے۔''

''جی؟'' وہ بوکھلا گیا۔ ''آپ نے تو یونہی ہوا میں اپنا ہاتھ اُٹھا رکھا ہے۔''

نسیم اس کی بات سن کر اتنے زور سے ہنسا کہ پورا ہوٹل گونج گیا لیکن کلرک پر اس کی ہنسی کا رتی برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ اس نے خاموشی سے میری بات کو اپنے سامنے پڑے پیڈ پر نوٹ کیا اور سر ہلا کر بولا۔ ''میں کہہ دوں گا کہ آپ کسی ڈاکٹر کے ہاں تشریف لے گئی ہیں۔''

میں نسیم کا ہاتھ پکڑے ہوئے باہر نکل آئی۔ کلرک مجھے حیرت سے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب میں دروازے کے پاس پہنچی تو اس نے رومال

سے اپنی پیشانی کا پسینہ صاف کیا اور بیرے کو آواز دی۔ شاید وہ میری باتوں سے الجھن میں پڑ گیا تھا۔

ڈھا کا میں ڈاکٹروں کی کیا کمی؟ انسانوں کی تلاش میں محنت کرنا پڑتی تھی لیکن ڈاکٹر تو ہر تیسری گلی میں مل جاتا تھا۔ سنیاسی وید اور فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے حاذق حکیموں کو بھی شامل کر لیا جائے تو بمشکل تمام کوئی حصہ ایسا ملتا جہاں کوئی معالج نہ ہو۔ ہوٹل سے آدھا فرلانگ طے کرتے ہی ایک ڈاکٹر کا بورڈ نظر آ گیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر کے پاس کوئی مریض نہیں تھا، اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر میں نے نسیم کی طرف اشارہ کیا۔ ''ذرا ان صاحب کو دیکھ لیجیے۔ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔''

''کس کو دیکھ لوں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

نسیم نے قہقہہ لگایا۔

''کیا بے ہودگی ہے؟'' میں نے اس کو ڈانٹا۔

''آپ نے مجھ سے کچھ ارشاد فرمایا؟'' ڈاکٹر نے مجھ سے سوال کیا۔

''جی نہیں...... میں تو اسے ڈانٹ رہی ہوں۔'' میں نے نسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''خواہ مخواہ ہنسے جا رہا ہے۔''

میرے اور ڈاکٹر کے درمیان بڑی سی میز تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنی کرسی پیچھے کھینچ لی اور عجیب سی آواز میں بولا۔ ''کون ہنسے جا رہا ہے؟''

''یہ......'' میں نے دوبارہ نسیم کی طرف اشارہ کیا۔ ''حیرت ہے آپ کو اتنا بڑا آدمی نظر نہیں آتا۔''

میری بات کا جواب دینے کے بجائے ڈاکٹر نے اپنے کمپاؤنڈر کو آواز دی۔ ''ذرا ادھر آنا۔'' اس کے آتے ہی اس نے کہا۔ ''ان محترمہ کو باہر چھوڑ آؤ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''عجیب لوگوں سے سابقہ پڑا ہے۔'' میں نے بگڑ کر کہا۔ ''میرا دوست حادثے کا شکار ہو گیا ہے اور آپ لوگ اس پر توجہ ہی نہیں دے رہے۔''

کمپاؤنڈر نے پوچھا۔ ''کہاں ہے آپ کا دوست؟''

میں نے کہا۔ ''یہی جس کا میں نے ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔''

کمپاؤنڈر ایک لمحے تک تعجب سے مجھے اور میرے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔ ''کیا شکایت ہے؟''

''بے چارہ حادثے میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اگر اس کے زخموں کی کچھ مرہم پٹی ہو جائے تو آپ لوگوں کا بڑا اکرم ہوگا۔''

''آپ غلط جگہ آ گئی ہیں۔'' کمپاؤنڈر نے مجھ سے کہا۔ ''ہمارے ڈاکٹر صاحب فیور اسپیشلسٹ ہیں۔ صرف بخاروں کا علاج کرتے ہیں۔ مرہم پٹی تو انہیں آتی ہی نہیں۔ آپ کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس چلی جایئے۔''

''یہی بات پہلے بتا دیتے تو میرا قیمتی وقت ضائع نہ ہوتا۔'' میں نے کہا اور نسیم کو لے کر ڈسپنسری کے باہر چل دی۔ چلتے وقت کمپاؤنڈر کی آواز کانوں میں آئی۔ وہ ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! مجھے تو پاگل لگتی ہے۔''

ڈسپنسری سے باہر نکل کر نسیم پر باقاعدہ ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ''واہ رے پارٹنر، رہیں وہی بدھو کی بدھو۔ ابھی تک نہیں سمجھیں کہ تمہارے علاوہ

مجھے کوئی اور نہیں دیکھ سکتا اور نہ میری آواز سن سکتا ہے۔ تمہیں میری موت کی اطلاع صحیح ملی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم......تم......''

''ہاں......اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھوت بن گیا ہوں لیکن تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو آج بھی تمہارا دوست ہوں اور محض یہ بتانے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ ایک بار پھر تم شورویر کے جال میں پھنس چکی ہو۔''

ہم دونوں چلتے ہوئے نسبتاً ایک سنسان جگہ پر آ گئے تھے اور میں اس کی یہ بات حلق سے اُتارنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بھوت بن چکا ہے۔ عین اسی وقت اس کے منہ پر تھپڑ نے لگنے کی آواز گونجی۔ نسیم فاروقی چیخ مار کر زمین پر گر پڑا۔ ایکا ایکی آگ کا ایک تیز شعلہ اس کے جسم سے فضا میں بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے نسیم جل بھن کر کوئلہ بن گیا۔

جگہ سنسان ضرور تھی لیکن اتنی سنسان نہیں تھی کہ لوگوں کی آمد و رفت بالکل ہی نہ ہو لیکن تعجب کی بات ہے کہ ادھر سے گزرنے والوں نے آگ کے شعلے پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ خود مجھ پر بھی اس منظر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دراصل عجیب و غریب قسم کے واقعات میرے لیے انوکھے نہیں رہے تھے۔ کوئی بھی نئی بات مجھے نئی معلوم نہ ہوتی تھی۔ یہ احساس ضرور تھا کہ روحوں نے میرا کھیل بنا رکھا ہے لیکن کیوں؟ اس کیوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ دنیا میں مجھ جیسے کروڑوں لوگ تھے آخر روحوں نے مجھ ہی کو کیوں منتخب کیا؟

اسی قسم کی باتیں سوچتی اور دل ہی دل میں اپنی حالت پر کڑھتی ہوئی میں ہوٹل واپس آ گئی۔ کاؤنٹر کے پاس ایک پولیس آفیسر دو کانسٹیبلوں کی معیت میں موجود تھا۔ غالباً میری بے تکی باتوں سے گھبرا کر اس کاؤنٹر کلرک نے پولیس کو بلا لیا تھا۔

''ادھر آیئے بی بی۔'' پولیس آفیسر نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے پاس ہی نسیم کھڑا ہوا مسکرا رہا ہے۔

''تم پھر آ گئے؟'' میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''گیا ہی کب تھا؟''

''مگر تم تو جل کر کوئلہ ہو گئے تھے۔''

''تمہارے شورویر کی مہربانی تھی لیکن وہ یہ بھول گیا کہ مرے ہوئے کو مارنا آسان نہیں ہوتا۔''

پولیس افسر نے زور سے کہا۔ ''کس سے بات کر رہی ہو؟''

کاؤنٹر کلرک جلدی سے بولا۔ ''اب تو آپ کو یقین آ گیا۔ ان صاحبہ کا دماغ درست نہیں ہے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ اپنے دوست کو ڈاکٹر کے ہاں لیے جا رہی ہوں حالانکہ دوست کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔''

''دماغ بہک گیا ہے؟'' پولیس افسر نے کہا۔ ''میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

مگر میں اس کی بات کا جواب کس طرح دے سکتی تھی جبکہ دیکھ رہی تھی کہ نسیم کی جانب بار بار آگ کے شعلے لپک رہے تھے اور وہ پینترے

بدل بدل کر اپنے آپ کو ان شعلوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دیکھ رہی ہو، یہ شورویر کی حرکت ہے۔'' نسیم منہ بناتا ہوا مجھ سے بولا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ شورویر کی حرکت ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کوئی اور تمہیں تنگ کر رہا ہو۔''

اچانک پھر وہی سڑک والا منظر دوہرایا گیا۔ شعلے نے نسیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ ایک بار پھر جل بھن گیا۔

پولیس افسر نے کانسٹیبلوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔ صبح ہوتے ہی مزاج ٹھکانے آ جائیں گے۔''

اب مجھے احساس ہوا کہ پولیس افسر کی باتوں کا جواب نہ دے کر میں نے کتنی زبردست غلطی کی ہے۔ اس کے نزدیک میں شراب کے نشے میں دھت تھی۔ ڈھاکا میں ان دنوں بڑی آسانی سے شراب مل جاتی تھی۔ بعض عورتیں بھی علی الاعلان شراب پیتی تھیں۔ اس نے مجھے بھی اسی قبیل کا سمجھ لیا تھا کہ میں نشے میں ہوا سے باتیں کر رہی تھی جبکہ کاؤنٹر کلرک اس بات پر مصر تھا کہ میرا دماغ خراب ہے۔

کانسٹیبلوں کی گرفت میں کلبلا کر میں نے پوچھا۔ ''مجھے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟''

پولیس افسر بولا۔ ''لڑکی ہو کر شراب پیتی ہو اور شراب پی کر دوسروں کو ہراساں کرنے کے جرم میں آج تمہیں شاہی مہمان خانے میں رات گزارنا ہوگی۔''

''کون کہتا ہے کہ میں نے شراب پی ہے۔''

''اگر شراب نہیں پی ہے تو ہم دماغی معائنہ کرا کر تمہیں پاگل خانے بھیج دیں گے۔''

میں نے بگڑ کر کہا۔ ''آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی شریف لڑکی کو اس طرح تنگ کریں۔''

''اور تمہیں حق پہنچتا ہے کہ شریف شہریوں کو ہراساں کرتی پھرو۔'' پولیس افسر نے آنکھیں نکال کر کانسٹیبلوں سے کہا۔ ''لے چلو اسے، بڑی قانون دان بنتی ہے۔''

کانسٹیبلوں نے مجھے دروازے کی طرف گھسیٹنا چاہا مگر فوراً ہی دونوں کانسٹیبل چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئے۔ میں ان کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔ دیکھا تو سامنے کھڑا ہوا نسیم قہقہے لگا رہا تھا۔

''کس کی مجال ہے میرے ہوتے ہوئے تمہیں تکلیف پہنچا سکے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''ایک گھنٹے سے قبل تو یہ دونوں ٹھیک ہوتے نہیں۔''

ہوٹل میں دونوں کانسٹیبلوں کی چیخ و پکار سے ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوگیا۔ پولیس افسر بھی مجھے فراموش کر کے ان کی طرف لپکا، معلوم ہوا کہ دونوں کانسٹیبل کسی بچھو کے ڈنک کا شکار ہوگئے ہیں لیکن خدا جانے کیسا بچھو تھا جس کا پتا نشان تک نہیں تھا۔

پولیس افسر ان دونوں کو دلاسہ دیتے دیتے اچانک میری طرف متوجہ ہوا اس کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریوں کی بجائے رحم کی درخواست تھی۔ ''آپ آرام کیجیے۔ اب آپ کو کوئی تنگ نہیں کرے گا۔'' اس نے عجیب سے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور مہربانی کر کے ان دونوں کا قصور معاف کر دیجیے۔''

''کہہ دو ایک گھنٹے تک یہ دونوں یونہی روتے رہیں گے۔'' نسیم نے مجھ سے کہا۔

''معاف کر دیجیے محترمہ۔'' پولیس افسر میرے پاس آ گیا۔

میں نے کہا۔ ''میرے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کیجیے۔ دونوں خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔''

ہوٹل کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کانسٹیبلوں کو چھوڑ کر میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ وہ معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلا رہے تھے۔ پولیس افسر کے خوشامدانہ لہجے نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ میں کوئی معمولی ہستی نہیں ہوں۔

ایک خاتون مجمع کو چیرتی پھاڑتی ہوئی آگے بڑھی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ یہ لوگ آپ کے رتبے کو پہچان نہ سکے اور آپ کی شان میں گستاخی کر بیٹھے مگر اب ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ بس آپ سچے دل سے انہیں معاف کر دیں۔''

''کیسا رُتبہ اور کس کی شان؟'' مجھے عجیب سی پشیمانی محسوس ہونے لگی اور میں نے بے بسی سے نسیم کی طرف دیکھا۔

''چلو معاف کر دو پارٹنر۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''یہ لوگ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی ولیہ سے سابقہ پڑا تھا۔''

میں نے ان خاتون سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آپ کہتی ہیں تو معاف کیے دیتی ہوں ورنہ یہ لوگ اسی قابل تھے کہ یہیں تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔''

کانسٹیبلوں کی چیخیں رُک گئیں۔ دونوں حیران و پریشان آنکھیں جھپکتے اور منہ بناتے ہوئے اُٹھ بیٹھے اور پریشان نظروں سے میرا چہرہ تکنے لگے۔

اور تب سب سے پہلے کاؤنٹر کلرک لپکا۔ اس نے دوڑ کر بڑی عقیدت سے میرے دونوں ہاتھوں کو بوسا دیا۔ اس کے ہٹتے ہی پولیس افسر نے میرے قدم چھوئے پھر خاتون آگے بڑھیں اور پیار سے میرا ہاتھ لے کر اپنے سر پر پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''بی بی دعا کرو کہ میری بیٹی کو اچھا رشتہ مل جائے۔''

نسیم نے مجھ سے کہا۔ ''اس عورت کا نام شاہینہ ہے اور اس کی بیٹی کا یاسمین۔ اس سے کہو کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، تمہاری بیٹی نے خود ہی اپنے لیے رشتہ تلاش کر لیا ہے۔''

''شاہینہ بیگم......'' میں نے لہجہ بدل کر فقیروں جیسے انداز میں کہا۔ ''تم یاسمین کی طرف سے بالکل مطمئن رہو، وہ اپنے لیے ایسا بر تلاش کر چکی ہے جو لاکھوں میں ایک ہے۔''

''شکریہ بی بی......'' وہ میرے قدموں میں جھک گئی۔

نسیم نے قہقہہ لگایا۔ ''کہو پارٹنر! کیا حال ہے؟ پورا ڈھاکا تمہاری پوجا نہ کرنے لگے تو میرا نام بدل دینا۔''

میں اپنے کمرے کی جانب جانے لگی تو کائی کی طرح مجمع چھٹ گیا۔ لوگوں نے بڑی عقیدت اور بڑے احترام کے ساتھ مجھے راستہ دیا۔

میں آہستہ آہستہ زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ نسیم مجھ سے آگے آگے قہقہے لگاتا اور ہوا میں چھلانگیں مارتا ہوا چل رہا تھا۔ دروازے کے پاس جا کر وہ رُک گیا اور سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔ ذرا سنبھل کر اندر جانا، مجھے نذرِ آتش کرتے ہوئے شوروبر کو ہوٹل میں بلی کی لاش نظر آ گئی تھی۔ مجھے چھوڑ کر وہ فوراً اس کے جسم میں سما گیا اور اس وقت ایک خوبصورت ایرانی بلی کے روپ میں وہ تمہارے پلنگ پر لیٹا استراحت فرما رہا ہے۔''

اندر داخل ہوئی تو واقعی میرے پلنگ پر ایک ایرانی بلی لیٹی ہوئی خرخر کر رہی تھی اگر نسیم پہلے سے نہ بتا تا تو مجھے ہرگز یہ اندازہ نہ ہوتا کہ اس مرتبہ شورویر میرے پاس بلی کے روپ میں آیا ہوگا۔ میں نے پلٹ کر دروازہ بند کیا تو نسیم ہاتھ ہلاتا ہوا فضا کی تنہائیوں میں کہیں دور جا رہا تھا۔

یہ ظاہر کیے بغیر کہ مجھے بلی کی حقیقت سے آگاہی ہو چکی ہے میں نے پہلے تو بلی کو ''ہش'' کہہ کر بھگانا چاہا پھر ''کتنی معصوم بلی ہے'' کہتی ہوئی پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ میرے پیروں سے لپٹ کر خرخر کرنے لگی۔

مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لیے تھوڑی ہی دیر میں مجھے نیند آ گئی۔ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی اس لیے نو بجے تک سوتی رہی سو کر اُٹھی تو چاروں طرف دھوپ پھیل چکی تھی۔

نہا دھو کر ناشتہ میں نے اپنے کمرے میں ہی منگالیا۔ بیرا ناشتہ لے کر آیا تو بلی کو میرے پاس دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ نیچے جا کر اس نے میری کرامت کے طور پر فوراً اپنے ساتھیوں اور ہوٹل کے دیگر ملازمین کو اطلاع دی کہ میں نے مری ہوئی بلی کو زندہ کر دیا ہے۔ مختلف بہانوں سے ہوٹل کے ملازمین میرے کمرے کے سامنے سے گزر کر اس بلی کو ایک نظر دیکھنے کی کوشش کرنے لگے جو ان کے خیال کے بموجب میری کرامت سے زندہ ہو گئی تھی اور میرے پاس بیٹھی ہوئی دودھ پی رہی تھی۔

ابھی میں ناشتے سے فارغ بھی نہیں ہوئی تھی کہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بوبیتا آ موجود ہوئی۔

''آپ شاہین کی ایجنٹ نہیں ہیں۔'' بغیر سلام دعا کیے ہوئے اس نے خفگی کے ساتھ کہا۔ ''آخر آپ نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟''

میں نے بلی کے نرم روئیں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو تم سے کچھ بھی نہیں کہا۔ خود ہی تم نے یہ فرض کر لیا کہ میں فلاں ہوں اور میں نے کسی مخصوص طریقے سے پروفیسر کو قتل کر دیا ہے۔''

اس نے طویل سانس کھینچی۔ ''آپ کو علم ہے کہ اسی ہوٹل میں ایک انتریامی لڑکی ٹھہری ہوئی ہے۔''

''یہ انتریامی کیا ہوتا ہے؟''

وہ ہنسی۔ ''غیب کی باتیں جاننے والے کو انتریامی کہتے ہیں آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس کمرے میں مقیم ہے۔''

''کیوں؟''

''رات میں نے ایک عجیب سا خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر پوچھنی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے وہ انتریامی میں بھی تو ہو سکتی ہوں؟ تعبیر مجھ سے پوچھ لو۔''

''آپ اور انتریامی؟'' اس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ انتریامی نہیں ہیں۔''

''کیوں؟''

''اگر آپ انتریامی ہوتیں تو مجھ سے کچھ نہ پوچھتیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ گھر پہنچ کر شاہین کا فون موصول ہوا کہ چوبیس گھنٹے میں نقشہ بھیج دو تب میں سمجھی کہ میں غلطی سے آپ کو کچھ اور سمجھ بیٹھی تھی؟''

میں نے کہا۔" یہ بات بھی میں بعد میں پوچھوں گی پہلے یہ بتاؤ کہ شاہین اور نقشے کا چکر کیا ہے اور تم نے کون سا خواب دیکھا ہے۔"

"مگر میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔" مجھے جو کچھ کہنا ہے انتریامی سے کہوں گی۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ یہاں کوئی انتریامی لڑکی ٹھہری ہوئی ہے۔"

"یاسمین نے، وہ میری سہیلی ہے۔ رات اس کی امی نے ان پاک بی بی کے درشن کیے تھے اور انہوں نے چھوٹتے ہی یاسمین کی امی کا نام لے کر سچی سچی باتیں بتادی تھیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تھوڑی دیر کے لیے تم مجھے ان پاک بی بی کی جگہ سمجھ لو اور جو کچھ انہیں بتانا چاہتی ہو، مجھے بتادو۔"

اس نے بڑی ادا کے ساتھ اپنا حسین سر ہلایا۔"نہیں۔"

اسی وقت بیرا اندر داخل ہوا اور بڑے ادب کے ساتھ بولا۔" منیجر صاحب آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہلوایا ہے کہ اگر کوئی حرج نہ ہو تو چند منٹ کے لیے انہیں اپنے پاس آنے کی اجازت دے دیجیے۔"

میں نے کہا۔" بلا لاؤ۔"

دروازہ کھلا۔ کمرے میں ایک بڑے سے شکاری کتے نے جھانک کر دیکھا۔ میرے پاس بیٹھی ہوئی بلی اُچھل کر کھڑی ہوگئی، اس کی دُم اور پورا جسم غصے سے پھول گیا۔ کتا اسے گھورتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ بلی نے اچانک بستر سے جست لگائی اور کتے کا مقابلہ کرنے کی بجائے کھڑکی سے نیچے کود گئی۔ کتا بھی غراتا ہوا اس کے پیچھے نیچے کی جانب کی کود گیا۔

میرے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ میں نے کتے کو پہچان لیا تھا۔ یہ حسن پور والی مائی کا کتا تھا۔ بلی کے پیچھے اس کے بھاگنے کا مقصد یہ تھا کہ مائی نے ابھی تک مجھے فراموش نہیں کیا تھا، اسے علم تھا کہ میں ایک بار پھر راہ سے بھٹک گئی ہوں۔

اپنے خیالات سے میں اس وقت چونکی جب منیجر نے اندر آکر میرے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔" کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کردینا۔"

میں نے دیکھا بو بیتا حیرت سے منیجر کو میرے قدموں پر جھکا ہوا دیکھ رہی تھی۔

"تشریف رکھیے منیجر صاحب!" میں نے ان کا سر اپنے قدموں سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔" فرمایئے آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں، آپ چاہیں تو مجھے اس سے نجات مل سکتی ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔"

"کیا فرما رہے ہیں؟ میری حیثیت ہی کیا ہے؟"

"آپ جو چاہیں، ہوسکتا ہے۔ آپ انتریامی ہیں، آپ جیسی پہنچی ہوئی ہستی میں نے آج تک نہیں دیکھی، میں ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھ پر ترس کھائیں۔"

مجھے ہوا میں اُڑا ہوا نسیم کا نصف جسم نظر آیا وہ بولا۔" منیجر کا نام الطاف ہے۔ اس سے کہو کہ اس نے ہوٹل کا دس ہزار روپیہ غبن کیا ہے۔ اگلے ہفتے آڈٹ پارٹی آنے والی ہے، اب اسے جیل جانے سے تمہارے علاوہ کوئی نہیں روک سکتا۔"

''الطاف!'' میں نے اپنی آواز کو گمبھیر بناتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ اپنا نام سن کر اُچھل پڑا اور کچھ نہ بن پڑا تو ''سبحان اللہ'' کہہ کر ایک مرتبہ پھر میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

''غبن کوئی اچھی بات تو نہیں ہوتی۔'' میں نے اس کے سر کو اپنے قدموں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''منیجر کو تو بہت دیانت دار اور ایماندار ہونا چاہیے۔ دس ہزار روپیہ اُڑاتے وقت تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تھوڑے ہی دنوں میں آڈٹ پارٹی آئے گی اور جونہی تمہاری بے ایمانی کا بھید کھلے گا تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔''

''مجھے بچا لیجیے، آپ سب کچھ جانتی ہیں۔ آپ سب کچھ کر سکتی ہیں، مجھ پر اور میرے بیوی بچوں پر رحم کیجیے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''کوئی ایسی راہ کہ جب تک سارا روپیہ جمع نہ کر دوں، آڈٹ پارٹی نہ آئے۔''

میں نے کہا۔ ''آڈٹ پارٹی تو ضرور آئے گی اور اپنے وقت پر آئے گی۔''

منیجر اس طرح چیخا جیسے کوئی اسے ذبح کر رہا ہو۔ ''نہیں......

''مگر......'' میں نے شاہانہ انداز میں کہا۔ ''ہوٹل کے سارے رجسٹر ٹھیک ہوں گے غبن کے ایک پیسے کا بھی پارٹی کو علم نہ ہو سکے گا، پارٹی کے جانے کے بعد تمہیں چھ ماہ کی مہلت ملے گی، اگر اس عرصے میں تم نے غبن کی ہوئی رقم ہوٹل کے کھاتے میں جمع کر دی تو کوئی بال بیکا بھی نہ کر سکے گا لیکن رقم جمع نہ ہوئی تو اپنی تباہی کے تم خود ذمے دار ہو گے۔''

اس نے میرے دونوں پیروں کو بوسے دے کر اپنا سر اوپر اُٹھایا۔ ''آپ کا یہ احسان تمام زندگی نہیں بھولوں گا۔''

''بس اب تم جاؤ اور مطمئن ہو کر کام کرو۔''

منیجر کے جانے کے بعد میں بوبیتا کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''ہاں جناب بوبیتا صاحبہ کیا آپ مجھے یہ بتائیں گی کہ آپ نے خواب میں کیا دیکھا اور یہ کہ شاہین والا معاملہ کیا ہے؟''

اس کی بڑی بڑی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ایک دو لمحے تک وہ ضبط کرتی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

''میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ سب کچھ......اسی لیے تو آئی ہوں یہاں۔''

بوبیتا کے رونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی تھی جو اس کے دل کو دُکھ پہنچانے کا باعث بنتی۔ مزاحیہ انداز میں صرف اپنی اہمیت جتانے کے لیے ہی تو پوچھا تھا کہ اس نے خواب میں کیا دیکھا ہے اور شاہین و نقشے کا کیا چکر ہے؟ یہ نہیں جانتی تھی کہ ہنسی کے یہ چند الفاظ اس پر اس حد تک اثر انداز ہوں گے۔ میں نے پیار کے ساتھ اس کے سر کو تھپتھپایا تو اس کی ہچکیاں بندھ گئیں سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''شاہین مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اسے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ اس کے بارے میں کچھ گفتگو کی جائے۔''

''میرے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے جو تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔'' میں نے کہا۔ میری بات سے اس کی کچھ تسلی ہوئی۔ تھوڑی دیر قبل وہ ہوٹل کے منیجر کو میرے قدموں میں جھکے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی سہیلی نے اپنی ماں کے حوالے سے میری طاقت اور قوت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو خشک کر کے اس نے مختصر الفاظ میں جو داستان سنائی، وہ کچھ یوں تھی کہ ایک غیر ملکی گروہ مشرقی پاکستان کے فوجی اڈوں اور چھاؤنیوں کے نقشے اکٹھے کر رہا ہے۔ بوبیتا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس ملک کا گروہ ہے۔ ڈھاکا میں پروفیسر اس کام کے لیے مقرر تھا کہ وہ نوجوان لڑکیوں کے ذریعے اہم نقشے زر کثیر خرچ کر کے حاصل کرے اور کلکتہ بھیج دے۔ کلکتہ اور ڈھاکا میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔ صرف دس گھنٹے، رہ گیا بارڈر تو دونوں طرف کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کلکتے کا سرغنہ شاہین کے نام سے مشہور تھا۔ باغی ہونے کے بعد کوئی شخص شاہین کے انتقام سے نہیں بچ سکتا۔ بیٹھے بیٹھے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جاتی ہیں اور بعد میں گروہ کے دوسرے کارکنوں کو مطلع کر دیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں شخص کیفرِ کردار کو پہنچا دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ شاہین کو اپنے کارکنوں کی ایک ایک بات کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر کے سب سے آخری کمرے میں بند ہو کر کسی سے بات کرے تو شاہین بتا دیتا ہے کہ کس شخص سے کس جگہ اور کس موضوع پر گفتگو کی گئی۔ اس نے داستان ختم کرتے ہوئے بتایا۔ میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ نسیم ہوا میں تیرتا ہوا نظر آیا۔ ''کیوں پارٹنر تم نے تو اس بے چاری کو قتل کرانے کا پورا پورا انتظام کر دیا۔ شاہینہ کی جان بچانا چاہتی ہو تو فوراً اس کے ہاتھ کی گھڑی اُتار لو۔''

''یہ گھڑی مجھے دے دو۔ بوبیتا!'' میں نے اس کی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ دل ہی دل میں حیران تھی کہ نسیم نے بوبیتا کو شاہینہ کیوں کہا ہے گھڑی اُتارتے وقت اس کے پژمردہ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''پروفیسر کی ہدایت تھی کہ میں چوبیس گھنٹے یہ گھڑی پہنے رہوں۔ صرف غسل کے وقت تھوڑی دیر کے لیے اُتارنے کی اجازت تھی۔'' اس نے گھڑی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ ایک بار میں نے سونے سے پہلے اسے اُتار کر تکیے کے نیچے رکھ لیا تو صبح کو پروفیسر نے نہ صرف میرا جواب طلب کیا بلکہ اگلے ماہ کی تنخواہ سے جرمانے کے طور پر سو روپے بھی کاٹ لیے۔ میں نے گھڑی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اچھی قیمتی گھڑی تھی۔ ''تم پروفیسر کی تنخواہ دار ملازم تھیں؟''

''پروفیسر کی نہیں، شاہین کی۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''مجھے پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔''

''کوئی اعتراض نہ ہو تو گھڑی میں اپنے پاس رکھ لوں۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''پروفیسر تو پہلے ہی شاہین کا شکار ہو گیا۔ آپ نے میرا کوئی بندوبست نہیں کیا تو شاید مجھے بھی اگلی صبح دیکھنا نصیب نہ ہو۔''

میں نے سرہانے رکھی ہوئی میز پر اس کی گھڑی ڈال دی۔ ''تمہیں شاہینہ بھی کہتے ہیں؟''

وہ ایک دم اُچھل پڑی۔ اس کے چہرے کا سارا رنگ یکلخت سفید پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کے حواس بحال ہوئے۔ سر جھکا کر کہنے لگی۔

''اب یقین آ گیا کہ آپ مجھے شاہین کا شکار نہ ہونے دیں گی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہاں...... میں شاہینہ ہوں۔ اپنی بوڑھی بیوہ ماں کے ساتھ گ بازار کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بہاری لڑکیوں کا بے پردہ نکلنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے میں اپنی امی کا واحد سہارا ہوں۔ گھر سے برقعہ پہن کر نکلتی ہوں۔ جب تک برقعہ پہنے رہتی ہوں۔ شاہینہ بنی رہتی ہوں جب برقعہ اُتار دیتی ہوں تو بنگالی لڑکی یعنی بوبیتا بن جاتی ہوں۔''

''تمہاری امی کو علم ہے؟''

''وہ بیچاری تو یہ سمجھتی ہیں کہ میں کسی سکول میں بچوں کو پڑھانے جاتی ہوں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بی بی! اب تم اپنا خواب مجھے بھی سنا دو۔''

''گزشتہ رات جب میں سونے کے لیے لیٹی تو میرے ذہن میں آپ ہی کا تصور تھا۔ میں آپ کو شاہین کا گماشتہ سمجھ رہی تھی۔'' اس نے کہا پھر اچانک بات ادھوری چھوڑ کر کھڑکی کی طرف لپکی۔ ''اللہ! کیسی پیاری بلی ہے۔'' میں اچھی طرح جانتی تھی کہ جس بلی کو اس نے دوڑ کر اپنی گود میں اُٹھا لیا ہے اور اب پیار کے ساتھ اس کے ریشمی روئیں پر اپنا ہاتھ پھیر رہی ہے۔ وہ شورویر ہے۔ وہ تھی تو شاہینہ کی گود میں لیکن اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ''ایرانی معلوم ہوتی ہے۔'' شاہینہ نے کہا۔ ''دیکھیے تو آپ ہی کو تکے جا رہی ہے۔''

مجھے شورویر سے نفرت نہیں تھی لیکن جس چھل فریب کے ساتھ اس نے احمد کو خودکشی پر اُکسایا تھا اور میری کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اسے قابلِ تعریف نہیں کہا جا سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر اسے یہ معلوم ہو گیا کہ مجھے شاہینہ پسند آ گئی ہے تو وہ شاہینہ کے جسم پر قبضہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالے گا۔ ''آج کی رات تم پر بہت بھاری ہے۔'' میں نے موضوع بدلتے ہوئے شاہینہ سے کہا۔ ''تم فوراً اپنے گھر واپس چلی جاؤ اور وہاں سے اپنی امی کو لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاؤ۔ ہوٹل کے فون پر مجھے اپنا پتا بتا دینا۔''

''میرا خواب نہیں سنیں گی؟'' اس نے پوچھا۔ میں تو چاہتی تھی کہ اس کا خواب سنوں۔ اس سے کچھ باتیں کروں لیکن شورویر کی موجودگی کے باعث نہ کچھ کہنے کو جی چاہ رہا تھا اور نہ کچھ سننے کو۔ ''نہیں...... اس وقت تمہارا خواب نہیں سن سکوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''زندگی کی تلخ حقیقتوں کے سامنے خوابوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔''

آپ نے کسی بلی کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کی گود میں بیٹھی ہوئی بلی نہ صرف مجھ پر مسکرا رہی تھی بلکہ آنکھ بھی مار رہی تھی۔

شاہینہ بلی کو گود میں لیے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں جا رہی ہوں۔''

نہ جانے کیوں میرا بے اختیار دل چاہا کہ میں اسے روک لوں۔ اس کی زندگی کو شاہین سے خطرہ تھا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اس وقت وہ نہ جاتی۔ کہنے کو تو میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے اسے کسی سے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں لیکن مجھے خوب اچھی طرح سے معلوم تھا کہ خود میرے اپنے اندر کوئی پُراسرار قوت پوشیدہ نہیں۔ میں تو دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ چاہے وہ شورویر ہو اور چاہے نسیم۔ وہ چلی گئی اور

اپنے ساتھ ساتھ بلی کو بھی لے گئی۔ اس کے جاتے ہی نسیم کا ہیولہ کمرے میں تیرتا ہوا نظر آیا۔ ''کہو پارٹنر! سہیلی پسند آئی۔''

''اس کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''شاہین اس کی زندگی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''اس کی زندگی کو جس چیز سے خطرہ ہو سکتا تھا، وہ سامنے میز پر رکھی ہے۔'' گھڑی کی طرف اسے اشارہ کرتے ہوئے دیکھ کر میں نے ایک بار پھر اسے اپنے ہاتھ میں اُٹھا لیا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''رکھ دو اسے ورنہ ڈنک مار دے گی۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''اور دماغ کی رگ پھٹ جانے کے بعد تم بھی ہم لوگوں میں شامل ہو جاؤ گی۔''

میں نے جلدی سے گھڑی کو میز پر پٹخ دیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ گھڑی میں کوئی ایسا میکنزم ہے، جس کے ذریعے کسی انسان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔''

''گولی مارو میکنزم کو، کمرے سے باہر نکلو۔ کھاؤ پیو عیش کرو۔ دنیا اپنی ساری فتنہ سامانیوں کے ساتھ تمہاری راہ میں آنکھیں بچھانے کی منتظر ہے اور تم یہاں دھونی رمائے بیٹھی ہو۔''

نسیم کی مدد کے سامنے شورویر کی طلسمی انگوٹھی ماند پڑ گئی۔ پہلے تو اس کی طاقت کا یہ حال تھا کہ ادھر زبان سے اپنی کسی خواہش کا اظہار کیا اور ادھر وہ خواہش پوری ہو گئی اور اب یہ حالت ہو چکی تھی کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے جُوڑے کے لیے کلپ جیسی معمولی سی چیز کی خواہش کی تو تین دن کے بعد کلپ نصیب ہوئی اور وہ بھی اس وقت جبکہ کلپ خرید چکی تھی۔ دوسری مرتبہ ڈھائی سو روپے منگائے تو کسی نے لوٹ کر بھی خبر نہ لی۔ نسیم کی امداد و اعانت نہ ہوتی تو شاید چند دنوں میں مجھے رسوائی اور بدنامی کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ دوستی کا حق ادا کر رہا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر دور دور تک میری شہرت پھیل چکی تھی۔ تین دن میں درجنوں مرد عورتیں اور لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی حاجتیں میرے پاس لے کر آئے۔ نسیم کی برکت سے سبھی کی مرادیں بر آئیں۔ مجھ پر چڑھاوے چڑھائے گئے۔ ہدیے کے طور پر بڑی بڑی رقومات دی گئیں۔

چوتھے دن دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ میں نے نسیم سے پوچھا۔ ''شاہینہ کی خیر خبر تو سناؤ۔''

''وہ اور اس کی بلی مزے میں ہیں۔''

''وہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئی؟''

''کوئی حاجت ہو تو آئے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''بلی نے اسے ساری فکروں سے نجات دلا دی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس سے ملنا چاہتی ہوں، بولو کب ملوار ہے ہو اس سے؟''

''کبھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ جب تک شورویر اس کے پاس موجود ہے، میں وہاں جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ تم تو دیکھ ہی چکی ہو کہ وہ کتنی بے دردی کے ساتھ مجھے نذرِ آتش کر دیتا ہے۔''

''مجھے پہنچا سکتے ہو وہاں تک؟''

''عجیب لڑکی ہو۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''چند روزہ زندگی کو کیوں دیمک لگاتی ہو جلد یا بدیر اسے یہاں تو آنا ہی ہے۔''

''تمہاری لیلیٰ کا کیا حال ہے؟ بھٹکتی بنی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم رہی ہے یا نہیں۔'' میں نے بات بدلی۔

''نہیں پارٹنر! وہ تو بڑی بے وفا نکلی۔ مرتے ہی جنت میں جا پہنچی۔ کسی غلمان کے پاس بیٹھی ہوئی جنتی میوے اُڑا رہی ہوگی۔ اب تو اسے بھولے سے بھی میرا خیال نہیں آتا ہوگا۔'' یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بیرے نے آ کر بتایا کہ ایک نوجوان جو اپنا نام عنایت بتاتا ہے مجھ سے ملنا چاہتا ہے میں نے انکار کے ارادے سے منہ کھولا ہی تھا کہ نسیم نے سر کے اشارے سے کہا کہ بلا لو۔

عنایت چھ فٹ کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔ آتے ہی کہنے لگا۔ ''محترمہ! میں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ جونہی مجھے کوئی کتا نظر آتا ہے، میرے جسم کے سارے پٹھے اکڑ جاتے ہیں اور میں دوڑ کر اس کی دُم پکڑ لیتا ہوں۔''

نسیم زور سے ہنسا شکر ہے کہ اس کی ہنسی کی آواز میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں سن سکتا تھا۔

''کتے کی دم پکڑ لیتا ہوں اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اسے اپنے سر کے اوپر گھما کر دور پھینک دیتا ہوں اور کتا چیں چیں کرتا ہوا دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔''

نسیم نے مجھ سے کہا۔ ''یہ حضرت کیا چاہتے ہیں کیا ان کے خیال میں کتے کو اپنی اس عزت افزائی پر چیں چیں کرنے کی بجائے قہقہے لگانے چاہئیں؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کے لیے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مصیبت میں گرفتار ہیں۔ مصیبت میں آپ نہیں، کتے گرفتار ہیں۔''

وہ بولا۔ ''محترمہ! آپ یہ کیوں کہتی ہیں کہ میں مصیبت میں گرفتار نہیں ہوں پرسوں اپنے پڑوسی قیوم خان کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے کالے رنگ کا ایک کتا نمودار ہوا۔ حسبِ معمول میرے پٹھے اکڑ گئے۔ میں نے لپک کر اس کی دُم پکڑ لی اور اپنے سر کے اوپر دو چکر دے کر سامنے کی دیوار پر دے مارا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس حرکت پر میری منگیتر رات بھر روتی رہی اور اپنے کتے کی ٹانگ پر ہلدی کا لیپ کرتی رہی۔ یہ مصیبت نہیں تو اور کیا ہے؟ بھلا ایسی عادت بھی کسی کام کی کہ انسان کو اپنے اور پرائے کتے تک کی پہچان نہ ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں بھائی! یہ تو واقعی بڑی مصیبت کی بات ہے اب آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''میں آپ سے کوئی خدمت کرانے نہیں آیا میں تو آپ سے تعویذ لینے آیا ہوں سنا ہے آپ بڑی پہنچی ہوئی خاتون ہیں۔ مُردوں کو زندہ اور زندہ کو مُردہ کر دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ مطمئن رہیں اگر میرا کام بن گیا تو میں آپ کو منہ مانگی فیس دوں گا۔''

''تعویذ کس کام کے لیے چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اگر آپ کتوں کی دُم پکڑنے کی عادت سے چھٹکارا چاہتے ہیں تو میری ایک پھونک سے آپ کی یہ عادت ختم ہو سکتی ہے اور اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ منگیتر سے چھٹکارا مل جائے تو آپ کی یہ مشکل بھی آسان ہو جائے گی ہم تعویذ گنڈے نہیں دیتے سارا کام جھاڑ پھونک سے ہو جاتا ہے۔'' مجھے اور نسیم دونوں ہی کو اس کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا نسیم کا تو حال یہ تھا کہ اس کے قہقہے رو کے نہیں رُک رہے تھے۔ اچانک عنایت اُٹھ کھڑا ہوا اور جیب سے پستول نکال کر میرے اوپر تان لیا۔ ''کتے کی بچی! اپنے باپ سے بھی جعلسازی کر

رہی ہے۔‘‘اس کی اس حرکت پر میں اور نسیم فاروقی دونوں ہکا بکا رہ گئے۔

’’بوبیتا کہاں ہے؟‘‘اس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

نسیم نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔’’مارے گئے پارٹنر! اسے شاہین نے بھیجا ہے۔ تیار ہو جاؤ ہمارے پاس آنے کے لیے۔‘‘

’’میں صرف تین مرتبہ سوال کرتا ہوں پھر بھی جواب نہ ملے تو گولی مار دیتا ہوں۔ بولو بوبیتا کہاں ہے؟‘‘

پستول دیکھ کر میری سٹی گم ہوگئی تھی۔ بمشکل تمام اپنے اوپر قابو پا کر میں نے کہا۔’’مجھے نہیں معلوم۔‘‘

’’ہم سے اُڑنے کی کوشش مت کرو۔ تم نے اسے چکمہ دے کر غائب کر دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے بتا دو تیسری بار پوچھ کر صرف دو منٹ تمہیں دوں گا۔ پھر اس کمرے میں تمہاری لاش پڑی ہوگی۔ رہ گئی بوبیتا تو وہ کب تک ہماری نظروں سے اوجھل رہے گی۔ ایک نہ ایک دن اسے باہر آنا ہی پڑے گا۔‘‘

میری آواز کپکپانے لگی۔’’میں تم سے بالکل سچ کہتی ہوں۔ مجھے کچھ بھی پتا نہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کا گھر کہاں ہے۔‘‘

’’گھر کی بچی۔‘‘اس نے دانت پیس کر کہا۔’’دیکھو تیسری مرتبہ پوچھ رہا ہوں۔ بوبیتا کہاں ہے۔ بس اب دو منٹ ہیں تمہارے پاس۔‘‘

میں نے حسرت بھری نظروں سے نسیم کی طرف دیکھا۔

’’میرا منہ کیا تک رہی ہو؟‘‘نسیم بولا۔’’اس کی گفتگو میں شتر گربہ ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے آج کے دور میں اگر کسی کی گفتگو میں شتر گربہ پایا جائے تو اس کے منہ پر تھپڑ مارنا چاہیے۔‘‘

’’مذاق مت کرو۔‘‘میں نے نسیم سے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

’’ابے مذاق سمجھ رہی ہے ہماری باتوں کو۔‘‘عنایت جھلا کر بولا۔’’یون منٹ باقی ہے پھر تمہیں میرے پستول سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکے گی۔‘‘

میں نے اپنی پریشان نظریں نسیم کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ ہنسا۔

’’ارے...... تم یہ بھی نہیں جانتیں شتر گربہ کسے کہتے ہیں۔ اگر کوئی اہل زبان ہوتا تو وہ تھپڑ مارے بغیر باز نہیں آتا۔ میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ اُٹھ کر اہل زبان ہونے کا ثبوت دو اور بچہ جی کے ایسا تھپڑ رسید کرو کہ تارے نظر آ جائیں۔‘‘

موت میری نظروں کے سامنے تھی پھر بھی نسیم کے اُکسانے پر ایکا ایکی میں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پوری طاقت سے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ اپنا پستول پٹ پٹ کرتا رہ گیا۔ ایک گولی بھی نہ چل سکی۔

’’اب اس سے دھانوں کا بھاؤ پوچھ لو۔‘‘نسیم نے کہا۔

میری ہمت بڑھ چکی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا پستول چھین کر دور پھینک دیا۔’’دیکھی تم نے میری طاقت؟‘‘میں نے اس کے چہرے پر طمانچے رسید کرتے ہوئے کہا۔’’میں ان میں سے نہیں جو ذرا سے پستول سے ڈر جاتے ہیں۔‘‘

''اس کا نام اختر ہے۔'' نسیم نے بتایا۔'' کھلنا کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ ڈاکٹر ہے۔ آج کل ڈھاکا میں رہتا ہے اور شاہین کے اشارے پر اب تک تین قتل کر چکا ہے۔ یہاں کے ایک طالب علم عنایت سے اس کی شکل ملتی جلتی ہے اس لیے اپنا تعارف عنایت کہہ کر کراتا ہے۔''

''کوئی اور ارمان ہو تو وہ بھی نکال لو اختر میاں۔'' میں نے کہا۔

اپنا نام سن کر وہ چونک گیا اور حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔'' مجھے جعلساز کہتے ہو اور خود عنایت بنے پھرتے ہو۔ اس سے پہلے کہ تین قتل کرنے کے جرم میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں، میں تھپڑ مار مار کر تمہاری پوری بتیسی باہر نکال دوں گی تا کہ کھلنا میں بیٹھے ہوئے تمہارے باوا جان اپنے سعادت مند بیٹے کی نئی بتیسی بنا سکیں۔''

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔'' معاف کرنا میں آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔ ڈھاکا کے دوسرے دھوکے بازوں اور ٹھگوں کی طرح میں نے آپ کو بھی جعلساز سمجھ لیا تھا۔ میرا قصور معاف کر دو۔''

ہوٹل کا بیرا غالباً اس وقت کمرے میں آیا تھا جب اختر میرے اوپر اپنا پستول تانے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ دروازے ہی سے واپس لوٹ گیا اور اس نے ہوٹل کے منیجر کو اطلاع دی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

منیجر نے فوراً ہی پولیس کو مطلع کیا جس وقت اختر میرے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے بیٹھا تھا، اس وقت ایک ڈی ایس پی کی سربراہی میں کئی پولیس والے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے آ موجود ہوئے۔

پولیس کو دیکھتے ہی اختر بولا۔'' ہاں...... ہاں مجھے گرفتار کر لیجیے میں ان کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ اللہ نے انہیں ایسی قوت دے رکھی ہے کہ کوئی شخص بھی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے اس سے پہلے بھی تین قتل کیے ہیں۔ میں سب تسلیم کرتا ہوں۔ ایک ایک بات بتا دوں گا آپ لوگوں کو۔ ان لوگوں کے بارے میں بھی بتا دوں گا جو یہاں کے فوجی اڈوں اور دوسرے اہم مقامات کے فوٹو اور نقشے اکٹھا کر رہے ہیں۔ جی ہاں پستول میرا ہی ہے۔ میں اسی سے ان کو قتل کرنے کے لیے آیا تھا۔'' وہ نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔

ڈی ایس پی کے اشارے پر پولیس کانسٹیبل اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈی ایس پی وہیں میرے پاس ٹھہر گیا۔

''میں نے پہلے بھی آپ کی بہت تعریفیں سنی ہیں۔'' اس نے ادب کے ساتھ میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔'' آج اپنی آنکھوں سے آپ کی پُراسرار طاقت دیکھ لی۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔'' یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ڈی ایس صاحب! آپ تو جانتے ہی ہیں میں ٹھہری فقیر منش، نہ کسی کے اچھے میں نہ کسی کے بُرے میں۔ جب ایک شخص مجھ سے اُلجھتا ہے تو وہ میرا نہیں اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔''

ڈی ایس پی نے تائید میں اپنا سر ہلایا۔'' بنگال آئے ہوئے سات سال ہو گئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بنگال سانپوں اور ایسے فقیروں کا ملک ہے جو اپنی آنکھ کے اشارے سے چلتی ہوئی ہوا روک سکتے ہیں۔ یہاں آ کر سانپ تو بہت ملے لیکن کسی فقیر سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ میں تو بالکل ہی مایوس ہو گیا تھا شکر ہے کہ اب آپ سے ملاقات ہو گئی۔'' اسی وقت ہوٹل کے نچلے حصے میں شور بلند ہوا اور فوراً ہی ایک سپاہی دوڑتا

ہوا اوپر پہنچا۔ ''حضور، وہ مر گیا۔''

''کون مر گیا؟''

''اختر! حضور۔'' سپاہی نے بتایا۔ ''ہم لوگ اسے پولیس وین میں بٹھا رہے تھے اور وہ بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ پھر اچانک وہ لڑکھڑا کر گرا اور ختم ہو گیا۔''

ڈی ایس پی نے میری طرف گھوم کر مجھ سے معذرت چاہی۔ ''میں آپ سے کل شام کو ملنے کے لیے آؤں گا۔ مجھے آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں اس وقت تو مجھے اجازت دیجیے۔'' سپاہی کے ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے سلیوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بیرے نے آ کر بتایا۔ ''میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔ آپ کی شان میں گستاخی کرنے والا بچ نہیں سکتا۔ قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا لیکن یہ نہیں سمجھتا تھا کہ خود قتل ہونے جا رہا ہے۔ ڈی ایس پی صاحب کہہ رہے تھے کہ اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی ہے حالانکہ سوکی سیدھی ایک بات یہ ہے کہ اس نے آپ کے اوپر اپنا پستول تانا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''پولیس کو تم نے اطلاع دی تھی؟''

''جی...... میں نے تو منیجر صاحب کو بتا دیا تھا۔ انہوں نے پولیس کو فون کر دیا۔''

''میں تمہاری اس خدمت سے بہت خوش ہوں۔'' میں نے میز پر سے شاہینہ کی گھڑی اُٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''میری طرف سے تمہارا انعام ہے۔''

اس نے خوش ہو کر گھڑی اپنے ہاتھ میں باندھ لی۔ ''بہت بہت شکریہ۔ آپ جیسے ہی سخی لوگوں کے دم قدم سے یہ دنیا آباد ہے۔'' وہ میرے لیے چائے لینے کے لیے چلا گیا اور میں لیٹ کر آرام کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ میں نے بیرے کو موت تو دے دی ہے، کیا یہ اچھا کیا ہے؟''

☆=======☆=======☆

بیرے کو گھڑی دے کر میں سوچ میں پڑ گئی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ وہ بے چارا تو مفت میں جان سے چلا جائے گا۔ مجھے اس پر تجربہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھ تک وہ گھڑی پہنچانے والی شاہینہ بھی غائب تھی۔ وہ تو ایسی غائب ہوئی تھی کہ اس کا کوئی پتا ہی نہیں مل رہا تھا۔ میں نے نسیم سے بھی کہا کہ وہ شاہینہ کو ڈھونڈے۔ اسے تلاش کرے کہ آخر وہ ہے کہاں؟ مگر نسیم نے صاف الفاظ میں منع کر دیا کہ جب تک وہ مُردہ ایرانی بلی اس کے پاس موجود ہے، وہ اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ نسیم کے یوں آنکھیں پھیر لینے سے میں مایوس ہو چکی تھی مگر شاہینہ کا خیال بھلا نہیں پائی تھی۔

اس دن بھی میں کمرے میں بیٹھی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کاؤنٹر سے اطلاع آئی کہ کوئی لڑکی مجھ سے ملنے آئی ہے۔ نئے نئے لوگوں کی آمد میرے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ دن بھر تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ درجنوں لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اپنی حاجت لے کر آ جاتا تھا۔ کوئی روٹھی ہوئی بیوی کو منانے کے لیے آتا تھا تو کوئی سنگ دل محبوبہ کو رام کرانے کے لیے، کسی کو مقدمہ جیتنے کی فکر ہوتی تھی تو کوئی کاروبار میں ہوئے

نقصان کو ختم کرانے کے لیے آتا تھا۔ عجیب عجیب سی خواہش لے کر لوگ آتے تھے۔ ایسی ہی کوئی لڑکی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نے کہہ دیا کہ اسے بھیج دو۔

کچھ ہی دیر میں ایک لڑکی کمرے میں دستک دے کر داخل ہوئی۔ عادت کے مطابق میں نے دروازے کی طرف پیٹھ کر رکھی تھی تاکہ آنے والا یہی سمجھے کہ میں اس کی طرف متوجہ نہ ہو کر وظائف پڑھنے میں مشغول ہوں۔ نسیم کے مشورے پر میں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

اندر آنے والی نے کہا۔ ''میں ایک مسئلہ لے کر آئی ہوں۔''

''ہم مسئلے مسائل کیا جانیں، ہم سے تو اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں پوچھو اور مسئلے مسائل معلوم کرنا چاہتی ہو تو کسی مفتی کو ڈھونڈو۔''

''مگر میرا مسئلہ تو حسن بانو عرف حسنہ ہی حل کر سکتی ہے۔'' نو وارد بولی۔

اس کی بات پر میں نے چونک کر پیچھے دیکھا اور حیرت سے اس کا چہرہ تکنے لگی۔ ''آپ کون ہیں میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''غور سے دیکھو گی تو پہچان لوگی۔''

آواز تو پہلے ہی سنی ہوئی لگ رہی تھی اب جو غور کیا تو میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ احمد کی بہن شمس النہار تھی۔ وہ بہت زیادہ کمزور ہو چکی تھی۔ رنگت بھی جل گئی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ کیسی خوبصورت دوشیزہ تھی جواب مصائب کے باعث ادھیڑ عمر لگ رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر جلدی سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''تم...... تم یہاں...... کیسے؟'' میں نے کہا۔

''کیسی ہو؟ ماں اور نور النہار وغیرہ کا کیا حال ہے؟''

''تم نے تو ہم لوگوں کو بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا۔ مڑ کر خبر ہی نہیں لی۔ ہم لوگ فاقے کر رہے ہیں۔ مجھے خبر ملی تھی کہ اس ہوٹل میں ایک پہنچی ہوئی بی بی آ کر ٹھہری ہوئی ہے جو قسمت بدل دیتی ہے۔ کہنے والے نے کہا تھا کہ اپنی بگڑی بنانا چاہتی ہو تو ان کے پاس چلی جاؤ۔ میں اسی سلسلے میں آئی تھی کہ تم مل گئیں۔''

میں نے وینٹی بیگ سے پرس نکالا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے بڑھا کر کہا۔ ''اسے رکھ لو۔ اپنا پتا دے دو۔ میں کل آ کر سب سے ملوں گی۔''

بیگ لے کر اس نے کہا۔ ''شاہینہ نے تمہیں سلام کہا ہے۔''

''شاہینہ...... شاہینہ تمہیں کہاں ملی؟''

''ہم جہاں رہ رہے ہیں، اسی کے برابر والے گھر میں کرائے پر رہ رہی ہے۔ اسی نے مشورہ دیا تھا کہ ہوٹل والی بی بی سے جا کر ملو۔''

شاہینہ کا نام سنتے ہی میں کھڑی ہو گئی۔ ''تف ہے مجھ پر کہ تم لوگ مصیبتیں جھیل رہی ہو اور میں یہاں عیش کر رہی ہوں۔ چلو میں ابھی چلتی ہوں۔''

اسی وقت نسیم کا ہیولہ نظر آیا۔ وہ بولا۔ ''نہیں تم وہاں نہیں جاؤ گی۔''

''کیوں نہیں جاؤں گی؟ میری بہن مصیبت میں مبتلا ہے۔''

''بہن کا نام کیوں لیتی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ شورویر کے پاس جانا چاہتی ہو؟''

''یوں ہی سمجھ لو۔''

شمس النہار نے میرا کندھا ہلایا۔''یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ہوا سے باتیں کر رہی ہو؟''

نسیم نے گھونسا تانتے ہوئے کہا۔''میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا۔''

''تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے ہزار بار جاؤں گی۔''

''دیکھوں گا کیسے جاتی ہو؟''

شمس النہار نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔''ہوش میں آؤ حسنہ!''

دو غیر مرئی ہاتھوں نے میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی میں جم کر رہ گئی۔ پیروں کو زمین نے اس طرح جکڑ لیا تھا جیسے کسی نے میخیں ٹھونک دی ہیں۔

''جاؤ۔''نسیم نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔''اب جاتی کیوں نہیں؟''

میں نے بے بسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''جو کچھ چاہتا ہوں، اس کا تھوڑی ہی دیر میں تمہیں پتا چل جائے گا۔''

''چھوڑ بھی دو......''میں سمجھ چکی تھی کہ اس سے بیر مول لینا لاحاصل ہے اس لیے ہکلاتے ہوئے کہا۔''ختم کر دو اس مذاق کو۔''

شمس النہار کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہو گیا ہے۔

میں نے نسیم سے کہا۔''اے......اب تو مجھے کرسی سے آزاد کر دو۔''

نسیم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کمرے میں چھت پر اِدھر اُدھر فضاؤں میں منڈلاتا رہا۔ میری خوشامد کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر وہ اچانک اسی طرح تیرتا ہوا ہوٹل کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

میں نے شمس النہار سے مخاطب ہو کر کہا۔''تم چلی جاؤ۔ میں پھر کبھی تمہارے پاس آؤں گی۔''

''میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

''میں ٹھیک ہوں بہن......''

''ٹھیک ہو تو ابھی بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہی تھیں؟''

اسے یہ باور کرانا انتہائی مشکل تھا کہ میں بہکی ہوئی باتیں نہیں کر رہی تھی اگر میں یہ کہتی کہ میں نسیم سے مخاطب تھی تو وہ کہتی کہ نسیم اسے نظر کیوں نہیں آیا؟ میں نے اسے اس وقت یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس وقت بھی کرسی اور زمین دونوں نے مجھے بُری طرح قابو کر رکھا ہے۔ میرے خیال میں نسیم مجھ سے مذاق کر رہا تھا مگر مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ مذاق نہیں ہے۔ مجھے اسی طرح پریشانی کے عالم میں بیٹھے ہوئے بیس پچیس منٹ

ہوئے ہوں گے کہ سامنے سے ڈی ایس پی اور کچھ کانسٹیبل آتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہوٹل کا بیرا بھی تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر ان لوگوں کا پُر تپاک خیر مقدم کیا تب مجھے معلوم ہوا کہ کرسی اور زمین کی گرفت سے مجھے آزادی مل چکی ہے۔ کانسٹیبل میری میز کے گرد کھڑے ہو گئے۔

ڈی ایس پی میرے پاس بیٹھ گیا۔ اپنی جیب سے ایک چیز نکال کر مجھے دکھائی۔ ''یہ آپ کی ہے؟''

ڈی ایس پی کے ہاتھ میں وہ گھڑی جگمگا رہی تھی جو میں نے بیرے کو دی تھی۔ ''جی...... وہ...... وہ......'' میں نے ہکلا کر کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ یہ گھڑی مجھے...... یعنی ایک طرح سے گھڑی میری ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔''

''آپ بتا سکتی ہیں کہ یہ گھڑی آپ کو کہاں سے ملی تھی؟'' اس کے کرخت لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سارے دوستانہ تعلقات کو بالائے طاق رکھ چکا ہے۔

''جی نہیں......'' میں نے جواب دیا۔

''بیرے کو یہ گھڑی آپ نے دی تھی؟''

''جی ہاں......''

''گویا آپ تسلیم کرتی ہیں کہ گھڑی آپ کے پاس تھی اور آپ کے ذریعے بیرے تک پہنچی؟''

''جی ہاں...... میں تسلیم کرتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

ڈی ایس پی نے سر گھما کر ایک کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً ہتھکڑیاں لے کر آگے بڑھ آیا۔ ''آپ کو جاپانی ساخت کا ٹرانسمیٹر رکھنے اور حکومت کے خلاف جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔'' ڈی ایس پی نے بے اعتنائی سے کہا۔

کانسٹیبل نے فوراً ہی میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ ''ان کے کمرے میں تالا لگا کر سر بمہر کر دیا جائے۔'' ڈی ایس پی نے حکم دیا پھر اچانک شمس النہار کی طرف مڑ کر بولا۔ ''یہ کون ہے؟''

''بہن ہے میری۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھ سے ملنے آئی تھی۔''

''اس کی تلاشی لو۔'' اس نے ایک لیڈی کانسٹیبل کو حکم دیا۔ شمس النہار کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے میرا دیا ہوا پرس اس کے بیگ میں پڑا ہوا تھا۔ کانسٹیبل نے وہی پرس نکال کر ڈی ایس پی کی طرف بڑھا دیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میرا پرس ہے۔ میں نے گھر کے خرچ کے لیے کچھ روپے دیئے ہیں۔''

''گھر کے خرچ کے لیے یا جاسوسی کرانے کے لیے؟'' ڈی ایس پی نے دانت پیس کر کہا۔ ''لے چلو اس کو بھی۔''

بے چاری آئی تھی مدد لینے اور اُلٹی مصیبت گلے پڑ گئی۔

اگلے روز حوالات میں نور النہار ملنے آئی۔ اس کا پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ شمس النہار نے اسے دیکھتے ہی بچوں کی طرح بلکنا شروع کر دیا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے تو بس یونہی خواہ مخواہ دھر لیا گیا ہے۔ تم دیکھ لینا، مجھے باعزت طور پر بری کر

دیا جائے گا۔ ہاں......اس کو شاید......بُرا مت ماننا، شاید پھانسی ہو جائے۔"

اپنی بہن کی بات سنی اَن سنی کر کے مجھ سے کہا۔ "شورویر نے تمہیں سلام کہلوایا ہے اور کہا ہے کہ گھبرانا نہیں۔ زندگی میں اس قسم کے اُتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔" پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر میرے کانوں کے پاس اپنا منہ کر کے آہستہ سے بولی۔ "وہ تمہارے حال سے غافل نہیں ہے۔"

"تم جانتی ہو اسے؟"

اس نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا۔ "نہیں......میں کسی کو نہیں جانتی۔ میں نے تو تمہیں شاہینہ کی کہی ہوئی بات بتائی ہے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ شورویر تمہاری ایک ایک بات کو نظر میں رکھے ہوئے ہے۔"

"وہ ہماری مدد کیوں نہیں کرتا؟"

"مجھے کیا معلوم؟" صرف دس منٹ اسے ہم لوگوں سے ملنے کے لیے دیئے گئے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب ختم ہو گئے۔ اس سے جاتے وقت میں نے بھی شورویر کو سلام کہلوا دیا۔

اس روز شام کو نسیم ہوا میں تیرتا ہوا حوالات کے کمرے میں داخل ہوا۔ "کہو پارٹنر! کیا حال ہے؟"

مجھے غصہ آ گیا۔ "میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ تم نے دوستی کے مقدس نام کو بٹا لگا دیا ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے، ابھی غصہ اُترا نہیں جبھی مجھ سے اس طرح منہ بنا بنا کر باتیں کر رہی ہو۔" اس نے کہا۔ "ابھی تو تمہارے پاس سے صرف ٹرانسمیٹر ہی برآمد ہوا ہے، لیکن اگر تمہاری اکڑفوں باقی رہی تو بہت ممکن ہے، تم پر اغوا، دھوکا دہی اور قتل کے الزامات بھی عائد کر دیئے جائیں۔"

"اپنی سی پوری کوشش کر ڈالو۔" میں نے کہا۔ "شکر ہے، مجھ پر تمہاری دوستی کی قلعی جلد ہی کھل گئی۔"

"بار بار دوستی کا طعنہ کیوں دیتی ہو۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو، میں نے تمہارے ساتھ کون سا ایسا احسان ہے جو نہ کیا ہو۔ تمہاری ہر بات مانی۔ دنیا کی ساری نعمتیں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دیں، لیکن اجر کیا ملا؟ احسان فراموشی؟ جو میری ذرا سی بات نہ مانے اور میرے سارے احسانات کو اُٹھا کر بالائے طاق رکھ دے، اس کا یہی حشر ہونا چاہیے بلکہ اس سے بھی بُرا۔"

جس طرح وہ ہوا میں تیرتا ہوا آیا تھا، اسی طرح تیرتا ہوا چلا گیا۔

شمس النہار کہنے لگی۔ "کس سے باتیں کرنے لگی ہو؟ کیا واقعی تمہیں کوئی شخص نظر آتا ہے یا کسی مرض میں مبتلا ہو؟"

"ایک بھوت سے دوستی کی تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن عین وقت پر وہ دغا دے گیا۔ کہو......مزہ آ رہا ہے حوالات میں؟"

"میں تو لعنت بھیجتی ہوں۔ مچھروں اور کھٹملوں نے سانس لینا دوبھر کر دیا ہے۔ اگر ان لوگوں نے مجھے آزاد نہیں کیا تو مجھے ختم کرنے کے لیے مچھر، کھٹمل بہت کافی ہیں۔"

"ابھی کیسے رہا کر دیں گے؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تو ہم سے جرم کا اقرار کرایا جائے گا اور اقرار کراتے ہی ہمیں جیل بھیج دیا جائے گا۔"

''میں تو ہرگز اقرار نہیں کروں گی۔''

''جب تک اقرار نہیں کرو گی، پولیس والے تم پر ظلم کرتے رہیں گے۔ کبھی ناخن کھینچیں گے، کبھی انگلیوں کے درمیان لکڑی رکھ کر تمہاری انگلیاں مروڑیں گے، پھر بھی باز نہیں آئیں تو وہ تمہیں دہکتے ہوئے توے پر بٹھا دیں گے۔''

شمسن یعنی شمس النہار کے منہ سے چیخ نکلی۔ ''نہیں...... یہ تو سراسر بے انصافی ہے۔''

''اب تک تمہارے ساتھ کون سا انصاف ہوا ہے جو اسے بے انصافی کہہ رہی ہو۔''

حوالات کے باہر پہرہ دینے والے کانسٹیبل نے گندی سی گالی دے کر کہا۔ ''کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے تم دونوں نے۔ سوتی کیوں نہیں؟''

شمسن نے سہم کر فوراً اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں حوالات کے چھوٹے سے کمرے میں بغیر کسی مقصد کے اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔

''لیٹ جاؤ۔'' شمسن نے آنکھیں بند کر کے مدھم آواز میں کہا۔ ''سنتری ناراض ہو رہا ہے۔''

اِدھر اُدھر ٹہلتی ہوئی میں دروازے کی سلاخوں سے کھیلنے لگی۔ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سلاخیں بانس کی تیلیوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ذرا سا زور لگایا تو سلاخ میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے ٹوٹی ہوئی سلاخ سے گردن باہر نکال کر دیکھا۔ سنتری اپنی بندوق کا تکیا بنا کر لمبا لیٹا ہوا تھا اور غالباً سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلاخ کو میں نے اس کی جگہ لگا دیا اور ہاتھ ڈال کر باہر لگے ہوئے تالے کو جھٹکا دیا ہلکی سی آواز کے ساتھ تالا ٹوٹ گیا۔ میں تھوڑی دیر تک تالے کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، پھر حوالات کا گیٹ چوپٹ کھول کر اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی۔ تقریباً دو بجے شور وغل کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ پولیس اسٹیشن کا سارا عملہ ہماری کوٹھری کے دروازے پر کھڑا تھا۔ مجھ پر تو کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا کہ یہ حرکت میری ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تالا توڑنے والا یوں چین کی نیند نہیں سوتا البتہ اس بات پر سب حیرت زدہ تھے کہ تالا کس نے توڑا اور کیوں توڑا؟ شمسن ڈر رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا؟

ہم دونوں کو دوسری کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ ایک کی بجائے دو تالے لگائے گئے حالانکہ حوالات پولیس اسٹیشن ہی کے احاطے میں تھی اس لیے عملے کے دیگر دو افراد نے بھی اپنی اپنی چارپائیاں ہماری کوٹھری کے پاس بچھائیں۔ میں زیادہ دیر تک جاگ نہ سکی۔ جلد ہی مجھے نیند نے آ دبوچا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو عجیب ہی طرح کا تماشا دیکھا۔ پورے تھانے میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ڈی ایس پی ہم دونوں کے سرہانے کھڑا تھا۔ ہم لوگ کوٹھری کے فرش کی بجائے باہر چارپائیوں پر دراز تھے۔ سنتری اپنے دوستوں سمیت کوٹھری کے اندر بند فرش پر پڑا تھا۔ باہر سے کوٹھری میں دو موٹے موٹے تالے لگے ہوئے تھے۔ ڈی ایس پی کی بنگلہ اور اردو میں ملی جلی گالیاں سن کر سنتری اور اس کے دونوں ساتھی آنکھیں ملتے ہوئے حیران و پریشان بیدار ہوئے۔ دونوں تالوں کی چابیاں سنتری ہی کے پاس تھیں۔ تالے کھول کر ان دونوں کو باہر نکالا۔

''اللہ قسم۔'' سنتری نے باہر نکلتے ہی کہا۔ ''ایسی نادیدہ قوت والے ہم نے آج تک نہیں دیکھے۔'' پھر جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ جلدی سے ڈی ایس پی کو سلیوٹ کر کے کہنے لگا۔ ''حضور! سوچ لیں۔ کہیں ان دونوں کی وجہ سے آپ کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔''

ڈی ایس پی نے مجھ سے کہا۔ ''میں پہلے بھی سمجھتا تھا اور اب تو مجھے پورا پورا یقین ہو گیا ہے کہ آپ بالکل بے قصور ہیں لیکن قانون بہرحال قانون ہے۔ جب تک آپ کے بارے میں تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، میری دست بستہ گزارش ہے کہ آپ دونوں اندر ہی رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا کی کوئی

طاقت آپ کو بند نہیں رکھ سکتی، پھر بھی مجھے امید ہے کہ آپ میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشیں گی۔''میں نے شمسن کا ہاتھ پکڑا اور اندر جانے لگی۔

''ایک منٹ ٹھہریئے۔''ڈی ایس پی نے کہا پھر کانسٹیبلوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔''ان دونوں کے لیے فرش پر گدے لگا کر چاندنی بچھاؤ۔ ٹیک لگا کر بیٹھنے کے لیے گاؤ تکیے لاؤ...... سر کے نیچے رکھنے والے تکیے نرم ہوں۔ اور ہاں...... ناشتے کا انتظام بھی کرو۔ میری گاڑی پر ہوٹل چلے جاؤ اور وہاں سے دو آدمیوں کا ناشتہ لے آؤ۔ منیجر سے کہہ دینا کہ وہ اپنی نگرانی میں ساری چیزیں تیار کر کے بھیجے۔''

تھوڑی دیر کے بعد نسیم ہوا میں تیرتا ہوا ہماری کوٹھری میں داخل ہوا تو ہم دونوں ناشتہ کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔''قسمت ساتھ دے تو حوالات کی کوٹھری بھی جنت بن جاتی ہے۔''

''معلوم ہوتا ہے اس ڈی ایس پی کے بچے کے بُرے دن آ گئے ہیں۔ فرائض سے کوتاہی برتنے کے جرم میں اسے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ ایسی سزا دوں گا کہ دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔''میں نے بڑا سا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔''آخر تم مجھ سے اتنے ناراض کیوں ہو؟ کہاں تو اتنے خوش تھے کہ دہلی کا تیسواں خواجہ بلکہ خواجائن بنانے پر تلے ہوئے تھے اور کہاں خفا ہوئے تو پھانسی کے تختے سے کم پر راضی ہی نہیں ہوتے۔''

''وجہ یہ ہے کہ تم احسان فراموش ہو۔ تم نے میری ذرا سی بات نہیں مانی۔ شاہینہ کا نام سنتے ہی محبت، خلوص اور دوستی سب ہی کچھ بھول گئیں۔ اس طرح اس سے ملنے کے لیے چل دیں جیسے وہ تمہاری بڑی چہیتی ہو اور میری حیثیت دودھ کی مکھی سے زیادہ نہ ہو۔''

''اتنی غلطی تو بے شک مجھ سے ہوئی ہے کہ شاہینہ کا نام سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے تمہاری توہین اور اہانت منظور تھی۔ شکایت تو مجھے ہونی چاہیے کہ جس شخص کو میں نے ہمیشہ اپنا دوست سمجھا۔ اس نے ذرا سی بات پر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔''

شمسن نے میرا کندھا ہلا کر پوچھا۔''اسی بھوت سے باتیں کر رہی ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔''یہ سنتے ہی نسیم نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایسا طمانچہ رسید کیا کہ منہ کا نوالا نکل کر دور جا پڑا اور دائیں گال پر انگلیوں کے نشانات بن گئے۔

''اب اسے یقین آ گیا ہوگا۔''نسیم نے غصہ کے ساتھ دانت پیستے ہوئے کہا۔''فساد کی گانٹھ تو یہی ہے۔ نہ یہ تمہارے پاس آتی اور نہ تمہیں شاہینہ کا پتا چلتا۔''

میں نے شمسن کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے گال پر رکھا ہوا تھا اور پھٹی پھٹی نظریں سامنے پڑے ہوئے نوالے پر جمی ہوئی تھیں۔

''تم چاہتے ہو کہ میں شاہینہ سے نہ ملوں حالانکہ تم ہی نے اس سے میری ملاقات کرائی تھی۔''

''اس وقت مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ شوروپیر کو ہر وقت گود میں چڑھائے چڑھائے پھرے گی۔ تم تو دیکھ ہی چکی ہو کہ خواہ مخواہ وہ مجھ سے

دشمنی پر کمر بستہ ہے۔ فرائیڈ نے کبھی چڑیلوں کا تجزیہ نہیں کیا ورنہ میری طرح وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچتا کہ وہ جنسی پسماندگی کا شکار ہیں۔"

"جنسی پسماندگی؟"

"یہ میری اصطلاح ہے اور میں نے بھی حال ہی میں اس کا پتا چلایا ہے۔ پروفیسر جیکب کا دماغ لے کر اس سے تم چاہو تو اس پر باآسانی ریسرچ کر سکتی ہو۔"

"شکریہ...... میں پہلے ہی تم سے دوستی کرنے کی سزا بھگت رہی ہوں۔"

"یہ سزا ختم ہو سکتی ہے بشرطیکہ تم شاہینہ کے پاس نہ جانے کا وعدہ کرو۔"

شمسن بڑی دیر سے گال سہلاتی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ "بھوت سے کہو کہ اپنا گال میرے قریب کرے۔ میں بھی اس کے تھپڑ مارنا چاہتی ہوں۔"

"بولو۔" میں نے ہنس کر کہا تو اس نے میری بات کو نظر انداز کر کے مصالحانہ انداز میں مجھ سے کہا۔ "وعدہ کرتی ہو کہ آئندہ پھر کبھی شاہینہ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گی۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں اپنا اچھا بُرا خوب سمجھتی ہوں۔ تمہاری رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ موقع ملے گا تو اس سے ضرور ملوں گی۔"

"یہ تم نہیں بول رہی ہو، شورویر کا جادو بول رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جیل میں تم سے کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں سمجھ لوں گا اسے بھی۔" وہ غصے سے جھاگ اُڑاتا ہوا کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

☆=======☆=======☆

دس بجے ہم دونوں کو پولیس کی طرف سے ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا۔ نورالنہار عدالت کے باہر موجود تھی۔

میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ''شاہینہ کا کوئی پیغام لائی ہو؟''

''نہیں......'' اس نے اُداس لہجے میں اپنا سر ہلایا۔ ''اس کی ایرانی بلی اچانک غائب ہوگئی ہے۔ اس وقت سے بہت پریشان ہے۔ آج صبح میں اس سے ملنے کے لیے گئی تو وہ رو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میرے سینے سے چمٹ گئی اور کہنے لگی اب کیا ہوگا؟ میں نے بہت سمجھایا کہ اس سے اچھی بلی کا انتظام ہو جائے گا لیکن اسے تو صبر ہی نہیں آتا۔''

مجسٹریٹ کے سامنے ابھی ہماری پیشی نہیں ہوئی تھی کہ ڈی ایس پی لمبے لمبے ڈگ اُٹھاتا ہوا میرے پاس آیا۔ ''مجھے فوری طور پر ایس پی جیسور مقرر کر کے بھیجا جا رہا تھا۔ چارج دے کر سیدھا ادھر ہی چلا آ رہا ہوں۔ دوپہر کی ٹرین سے جیسور چلا جاؤں گا۔ میرا سارا کہا سنا معاف کر دینا۔ پولیس اسٹیشن کے عملے کو میں نے ضروری ہدایات کر دی ہیں کہ تمہارا خیال رکھا جائے۔''

عدالت میں پیشی ہوئی تو مجسٹریٹ نے ملک دشمن عناصر میں شامل کرتے ہوئے ہم دونوں کو حوالات میں رکھنے کی بجائے پندرہ دن کے لیے ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا اور اپنے حکم میں تحریر کیا کہ ان لوگوں کا حوالات میں رہنا کسی طرح بھی موزوں اور ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ پولیس اور سی آئی ڈی کے اعلیٰ احکام پوچھ گچھ اور تفتیش جیل میں بھی کر سکتے ہیں۔

جس وقت پولیس کی گاڑی ہم دونوں کو لیے ہوئے جیل کی طرف جا رہی تھی۔ نسیم بھی ساتھ ہی ساتھ ہوا میں تیرتا ہوا چل رہا تھا اور بار بار مجھ سے طنزیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ''شورویر تمہیں مصیبت میں پھنسا کر کہاں غائب ہوگیا؟ اور اب کیوں نہیں آتا؟ ایسی محبت بھی کس کام کی کہ اپنی معشوقہ کو چھوڑ چھاڑ کر بدھنے میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔''

میں بدھنے کے نام پر کچھ چونکی تو اس نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''میں نے شورویر کو بدھنے میں بند کر کے بوڑھی گنگا کی تہہ میں دفن کر دیا ہے۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ صبر کر لو۔''

اب مجھے احساس ہوا کہ حالات کی پے در پے تبدیلی کی اصل وجہ کیا ہے؟ میں نے نسیم کی پیش کش قبول نہ کر کے سخت غلطی کی ہے اور اب اس کے بھرپور انتقام سے بچنا انتہائی مشکل ہے۔

اس صورت حال نے مجھے بہت خوف زدہ کر دیا تھا۔ بار بار سوچتی تھی کہ آخر میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں مجھے مصائب وشدائد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آرام اور سکون کے لمحات میری زندگی میں بادل کے ٹکڑوں کی طرح چند لمحوں کے لیے آتے ہیں۔ ہر مرتبہ یہ سمجھتی ہوں کہ مسرت وشادمانی کا دور پائیدار ثابت ہوگا لیکن کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو جاتی ہے کہ پریشانیوں کی دلدل میں پھنستی چلی جاتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ ابتر حالت شمسن کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی رو پڑے گی۔ وہ بے چاری خواہ مخواہ لپیٹ میں آ گئی تھی۔ ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے پولیس کی بند گاڑی میں بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر تک رہی تھی اور غالباً دل ہی دل میں اس گھڑی کو کوس رہی تھی جب وہ شاہینہ کے اصرار پر مجھ سے ملنے آئی تھی۔

کافی دیر چپ رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''اپنے دوست سے باتیں کر رہی تھیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم نے اس سے یہ کیوں نہیں کہا کہ وہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائے؟''

اب میں اس کو کیا بتاتی کہ وہ مجھ سے ناراض ہے اور اسی کی خفگی کے باعث ہم لوگوں کو اس جان لیوا مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ صرف ڈھارس بندھانے کے لیے کہا۔ ''وہ کہہ رہا تھا تھوڑی سی تکلیف برداشت کرلو۔ اس کے بعد راحت ہی راحت ہے۔''

اسی اثناء میں ہماری گاڑی جیل کے احاطے میں پہنچ گئی اور ہم دونوں کو ضروری اندراج اور ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اندر پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہنچتے ہی امید کی ایک کرن میرے ذہن کی تاریکیوں میں چمکی اور میں نے ایک قیدی عورت سے پوچھا کہ مردوں کے حصے میں ایک بزرگ ہوا کرتے تھے جنہیں عموماً قیدی بابا کہا جاتا تھا۔ کیا وہ اب بھی یہیں ہیں؟

''انہیں مرے ہوئے عرصہ ہو گیا۔'' اس نے کہا۔ ''جیل کے باہر تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر ان کا مزار ہے۔''

پھر وہی اتھاہ اور بھیانک تاریکی قیدی بابا انتقال کر گئے شوہر بوڑھی گنگا کی تہ میں دفن ہو گیا۔ اپنے دوست سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہیں، بغاوت اور جاسوسی کے الزام میں حکومت کی ساری مشینری درپے آزار، کوئی متنفس ایسا نہیں جو اس آڑے وقت میں میرے کام آئے۔ گھوم کر شمسن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے دھیمی آواز میں تلاوت کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تقدس اور نور چھایا ہوا تھا۔

اور تب اچانک میں نے سوچا کہ بے شک ایک ہستی ایسی ہے جو مجھے رنج والم کے اس مہیب بھنور سے نجات دلا سکتی ہے۔ میری محرومی اور بدبختی تھی کہ اب تک اسے بھولی ہوئی تھی۔ میرا کوئی ملازم میری حکم عدولی کرتا تو میں بیک جنبش قلم اسے اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیتی مگر کتنی عظیم تھی وہ ستار اور غفار ہستی جس نے اپنی شانِ رحیمی اور کریمی کے طفیل اپنی ناچیز کنیزہ اور بندی کی صریح حکم عدولی اور سینہ زوری کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیا تھا۔

شمسن تلاوت کر چکی تو میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ''تمہیں نماز آتی ہے۔''

''کیوں؟ کیا میں مسلمان نہیں ہوں؟'' اس نے اس طرح تلخی سے ساتھ کہا جیسے میرے سینے پر پوری قوت سے گھونسا مار دیا ہو۔ مسلمان تو میں بھی تھی لیکن نماز تو بہت دور کی بات ہے، مجھے صحیح طور پر کلمے بھی یاد نہیں تھے۔ شمس النہار کے انداز سے ایسا لگتا تھا کہ جسے نماز نہ آتی ہو، وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں۔ میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار اس سے کیا تو وہ بولی۔ ''نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں ہے۔ کوئی کافر اسلام قبول کر کے انتقال کر جائے اور اسے ایک وقت کی نماز ادا کرنے کا بھی موقعہ نہ ملے تب بھی وہ مسلمان ہے اور ہم جیسے مسلمان سے اچھا مسلمان ہے۔''

''لیکن کوئی شخص مسلمان ہوتے ہوئے بھی نماز نہ پڑھے؟''

''یہ بات کسی مفتی اور مولوی سے پوچھو۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ بے نمازی چوبیس گھنٹوں میں پانچ بار گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور روز بروز اللہ کی رحمت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پچھلے کئی روز سے تم میرے ساتھ ہو لیکن میں نے تمہیں ایک بار بھی نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا؟ کیا اس طرح گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر کے تم اللہ کی رحمت سے دور نہیں ہو رہی ہو؟''

اس کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو تیرنے لگے۔ ''قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ تم سے مل کر ذات

باری تعالیٰ کو بھلا بیٹھی اور شاید اس کی پاداش میں تمہارے ساتھ ساتھ خوار و ذلیل ہوتی پھر رہی ہوں مگر اب میں نے طے کرلیا ہے کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، اپنی طرف سے نماز میں غفلت نہیں برتوں گی۔''

نہ جانے کیوں میری آواز بھرا گئی۔ ''مجھے نماز سکھا دو گی؟ میں نے ابو سے سیکھی تو تھی۔ پڑھتی بھی تھی، لیکن پتا نہیں کیوں وہ سب کچھ میں بھول گئی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیوں نہیں؟ مگر تم بھول کیسے گئیں؟ یقیناً کوئی ایسا گناہ سرزد ہوا ہے جس نے تمہارے ذہن سے اسم باری تعالیٰ تک مٹا دیا۔''

مجھے یاد آ گیا کہ میں ایک عرصے تک مندروں میں جا جا کر کفر کرتی رہی تھی۔ تبھی شمسن کی آواز سنائی دی۔ ''جانتی ہو، تمہیں نماز سکھانے میں کتنا ثواب ملے گا؟''

''کتنا؟''

''جب بھی تم نماز پڑھو گی، مجھے بھی تمہارے برابر ثواب حاصل ہو گا اور تمہارے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔'' اس نے کہا۔

''جب تک تمہیں نماز یاد نہ ہو، پانچوں وقت کی نمازوں میں صرف سبحان اللہ سبحان اللہ پڑھتی رہو۔''

جیل کے اندر قیدیوں نے ایک جگہ کو خوب اچھی طرح لیپ پوت کر مسجد کا نام دے دیا تھا۔ اس روز جب میں شمسن کے ساتھ وہاں نماز پڑھنے کے لیے کھڑی ہوئی تو میرے جسم کا رواں رواں خوشی سے کانپ رہا تھا۔ قادرِ مطلق کے دربار میں پہنچ کر ایک طرف تو قلب کو عجیب سی طمانیت حاصل ہو رہی تھی اور دوسری طرف اس کے جاہ و جلال کے باعث ناقابلِ توجیہہ خوف طاری تھا۔ نماز کے بعد میں نے خوب گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی چاہی۔ جسم پر ایک بوجھ تھا جو اُترتا ہوا محسوس ہوا۔ پہلے دن مجھے صرف تین اوقات کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ عشاء کے بعد سونے کے لیے لیٹی تو آنکھیں بند کرتے ہی ایک نئی دنیا میں پہنچ گئی۔ جیل کی کوٹھی ایک آرام دہ کمرے میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو ایک صوفے پر نیم دراز پایا۔ یہ کمرا اور یہاں کی چیزیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ کمرے کی دیواروں پر لگے ہوئے بڑے بڑے فریم میرے جانے بوجھے ہوئے تھے۔ مجھے علم تھا کہ ابھی سامنے والے دروازے کی جھری میں سے دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے جھانک کر دیکھیں گی۔ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ مجھے جھانک کر دیکھنے والے لڑکے کا نام سلیم ہے اور میری اور اس کی شادی طے ہو چکی ہے۔

اسی عالم میں مجھے خیال آیا کہ میں خواب دیکھ رہی تھی۔ بھلا ایک قیدی جیل کی کوٹھری میں سے نکل کر اس آرام دہ اور پُرسکون کمرے میں کیسے آ سکتا ہے۔ دو تین منٹ تک اس خیال سے چپ سادھے پڑی رہی کہ کہیں ایسا اچھا خواب ٹوٹ نہ جائے۔ پھر ہمت کر کے اپنے بازو میں چٹکی لی۔ کلمہ شہادت کی انگلی کو اپنے دانتوں سے زور سے دبایا۔ ساتھ ہی جھری سے سلیم کے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں اس طرف متوجہ ہو گئی۔ ''بہت زیادہ بھوک لگ رہی ہے؟'' جھری سے سرگوشی کے لہجے میں سنائی دیا۔ ''انگلیاں نہ چبایئے، بس ابھی ناشتہ تیار ہو جاتا ہے۔''

''امی کہاں ہیں؟''

''باورچی خانے میں آپ کے لیے پراٹھے تیار کر رہی ہیں۔''

''اندر آ جائیں۔''

''پہلے یہ بتایئے آپ اپنی انگلی کیوں چبا رہی تھیں؟''

''ڈر تھا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔''

''آپ جاگتے میں بھی خواب دیکھ لیتی ہیں۔''

''ابھی تو یہی فیصلہ نہیں کر سکی کہ جاگ رہی ہوں یا سو رہی ہوں۔ ہاتھ بڑھایئے ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن شرارت نہ کریں۔'' اس نے تھوڑا سا کواڑ کھولا۔ دل چاہا کہ کواڑوں کو دھکا دے کر چوپٹ کھول دوں مگر فوراً ہی خیال آیا کہ اس طرح تو خواب یا بیداری کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ چل سکے گا۔ خاموشی کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سلیم کے ہاتھ کی ٹھنڈک اپنے ہاتھ پر محسوس کی۔ پھر اس نے اپنے ہونٹ میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیئے۔ میرے پورے جسم میں برف جیسی ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دل ہی دل میں آرزو کی کہ یہ خواب ہے تو کچھ دیر اور باقی رہے ٹوٹنے نہ پائے۔ اچانک اسے شرارت سوجھی اور کچاچا کر پوری قوت سے اس نے میرے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ ضبط کے باوجود میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ جھجک کر پیچھے کو ہو گیا۔ میں چند لمحوں تک کھڑی ہوئی بیوقوفوں کی طرح مسکراتی رہی پھر اپنے ہاتھ کو ملتی ہوئی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ شریر نے اتنی زور سے کاٹا تھا کہ ہاتھ پر اس کے دانتوں کے نشان بن گئے تھے اور اتنا سوج کر سرخ ہو گیا تھا۔ دانتوں کے نشانوں کو دیکھتے دیکھتے مجھ پر ایسی بے خودی طاری ہوئی کہ میں نے اپنے ہونٹ اس حصے پر رکھ دیئے۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے ناشتے کا بلاوا آ گیا۔ سلیم کی امی دسترخوان پر انواع و اقسام کی چیزوں کا ڈھیر لگائے ہوئے بیٹھی تھیں۔

''خالو نظر نہیں آ رہے؟'' میں نے بیٹھتے ہوئے اس کی امی سے پوچھا۔

''انہیں نگوڑ مارے مؤکل ہی نہیں چھوڑتے۔ کتنا کہا کہ گھر پر مہمان آئے ہیں۔ کہنے لگے، ضروری مقدمہ ہے ابھی نہیں گیا تو جیسور کی گاڑی نکل جائے گی۔ تم معذرت کر لینا میری طرف سے۔ خاک پڑے ایسے مقدموں پر اپنے کھانا کے مقدمے تو نمٹائے نہیں جاتے۔ جب دیکھو تاریخ بڑھوا رہے ہیں لیکن جیسور پہلی ہی پیشی میں چل دیئے۔ تم کھاؤ بیٹی! اب تو تمہارا ہی گھر ہے۔ میں ابھی آتی ہوں موئی نصیبن ساری ہانڈی جلا دے گی۔ ہانڈی کیا، میں نہ دیکھوں تو کمبخت ماری پورے گھر کو آگ لگا دے۔'' کہتی ہوئی خالہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ دسترخوان کے پاس والی کھڑکی تھوڑی سی کھلی۔ معطر ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اسی کے ساتھ ساتھ سلیم کی آواز آئی۔ ''اکیلے ہی اکیلے مال اُڑائے جا رہے ہیں؟''

''آ جاؤ...... آپ بھی آ جاؤ'' میں نے بڑا سا نوالہ منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پیروں میں مہندی تو نہیں لگی ہے۔''

تبھی خالہ کے قدموں کی آواز سنائی دی اور کھڑکی فوراً بند ہو گئی۔

''اے ہے لڑکی! یہ ناشتہ کر رہی ہے یا چڑیوں کی طرح دانہ چگ رہی ہے؟'' خالہ نے دسترخوان پر نظریں ڈالے بغیر کہا۔ ''دیکھ تو کیا حال بنا رکھا ہے اپنی صحت کا۔ ہڈی چمڑا ایک ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے باورچی خانے کا کیا حال ہے؟ نصیبن نے کتنی چیزیں جلادیں اور ابھی کتنی جلانا باقی ہیں؟''

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ ''باورچی خانے کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں میں گئی تو دیکھا سلیم شاہی ٹکڑا بنوا رہا ہے۔ مجھ سے کہنے لگا آپ ادھر کی کوئی فکر نہ کریں، مہمانوں کے پاس جا کر بیٹھیں۔ لو اور سنو تمہیں مہمان کہتا ہے۔ میرا منہ کیا تکنے لگیں؟ کھاتیں کیوں نہیں؟ سلیم غریب نے اتنی محبت سے ساری چیزیں تیار کروائی ہیں اور تم اس کی محنت پر پانی پھیر دینے پر تلی ہوئی ہو۔''

انہوں نے اس وقت تک وہاں سے اُٹھنے کا نام نہیں لیا جب تک حلق تک میرا پیٹ بھر نہیں گیا۔

میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ صوفے پر عطر میں بسے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے رومال رکھے ہوئے تھے جن کے کونوں پر میرے نام کا مونوگرام بڑی خوبصورتی سے کاڑھا گیا تھا۔ میں نے ان رومالوں کو اُٹھا کر اپنے چہرے سے لگالیا اور آنکھیں بند کر کے سلیم کے حسین تصور میں کھو گئی۔ آنکھیں بند کیے ہوئے پڑی تھی کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا سلیم مجھ سے ملنے کے لیے آ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو بند ہی رکھا اور جونہی وہ قریب آ کر مجھ پر جھکا، میں نے زور سے ہُو کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا معلوم ہوا جیسے طوفان آ گیا ہو۔ کوئی بڑی سی عمارت دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو گئی ہو۔ میں نے سلیم کی بجائے اپنی آغوش میں شمسن کو لے رکھا تھا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں وہ اپنے منہ سے عجیب عجیب سی آوازیں نکال رہی تھی۔

''معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے خواہ مخواہ تمہیں ڈرایا۔ شاید کوئی اچھا سا خواب دیکھ رہی تھی۔'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''فجر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ جلدی سے اُٹھ کر وضو کرو۔''

شاعر نے شاید ایسے ہی کسی موقع سے متاثر ہو کر کہا ہوگا۔ ''ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا۔ اچھی بھلی سلیم کے ہاں پڑی ہوئی تھی۔ خاطر مدارات ہو رہی تھی۔ چھیڑ چھاڑ کے مزے آ رہے تھے کہ شمسن بیچ میں کود پڑی۔'' میں آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی لیکن یہ کیا؟ میرے سینے پر دو معطر رومال پڑے ہوئے تھے۔ اگر میں نے خواب دیکھا تھا تو یہ رومال کہاں سے آئے؟

''پہلے ہی روز نماز قضا کر دو گی؟'' شمسن نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ''ایک ہی دن میں گھبرا گئیں۔''

''نہیں...... یہ بات تو نہیں ہے۔'' میں نے احتیاط کے ساتھ دونوں رومال ایک جانب رکھتے ہوئے کہا۔ وضو کرنے کے لیے بیٹھی تو ہاتھ پر پانی ڈالتے ہی تیز چبھن کا احساس ہوا۔ دائیں ہتھیلی کی پشت پر دانتوں کے نشان بنے ہوئے تھے اور اتنا حصہ سوج کر سرخ ہو گیا تھا میں ایک بار پھر خیالوں میں ڈوب گئی۔ کیا واقعی میں نے اس قدر حقیقی خواب دیکھا تھا؟ کیا ایسا خواب دیکھنا ممکنات میں سے ہے اور اگر وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی تو میری موجودہ حالت کو کیا نام دیا جائے گا؟ عالم خواب کا یا عالم بیداری کا؟ یہ کیسا خواب تھا جس کی نشانیاں عالم بیداری میں نظر آ رہی تھیں اور یہ کیسی بیداری تھی جس میں خواب کی سی کیفیت طاری تھی؟ شمسن نے ایک بار پھر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

''کیا سوچنے لگیں؟''

میں نے جلدی جلدی وضو کیا اور شمسن کے بتائے ہوئے طریقے پر نماز ادا کی۔

اس روز میں نے نہ جیل کا ناشتہ کیا اور نہ دوپہر کا کھانا کھایا۔ خواب میں سلیم کی امی نے جو ناشتہ کرایا تھا، دونوں وقت کے لیے وہی کافی تھا۔ میں آرام سے بیٹھی تھی کہ محکمہ سراغ رسانی کا ایک افسر اپنے ایک نائب کے ساتھ ضروری پوچھ گچھ کے لیے آگیا اور فضول قسم کے سوالات کرنے لگا۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لیے بضد تھا کہ میں ٹرانس میٹر کے ذریعے کن لوگوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھی جبکہ میرا کہنا یہ تھا کہ میں اسے معمولی قسم کی گھڑی سمجھتی تھی۔ اگر اس کے ذریعے میرا کسی سے رابطہ قائم ہوتا تو اتنی فیاضی کے ساتھ اسے ہیرے کی نذر نہ کر دیتی۔

ظہر سے قبل نسیم کا ہیولا نظر آیا۔ وہ کچھ ڈرا سہما ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے کی ساری شگفتگی اور تروتازگی کافور ہو چکی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''آزادی چاہتی ہو یا قید ہی میں زندگی گزارنا پسند کرو گی؟''

میں نے کہا۔ ''ایسی آزادی کس کام کی جس میں تمہارا غلام بن کر رہنا پڑے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو پارٹنر! میں نے کبھی تمہیں اپنا غلام سمجھا ہے۔ ہمیشہ دوست ہی سمجھتا رہا۔ تم البتہ میری نیت پر شبہ کرتی رہی ہو۔''

''چلو یونہی سہی۔ یہ بتاؤ کہ آزادی کی صورت میں مجھے تمہارا کون سا حکم ماننا پڑے گا؟''

اس کی بے نوری آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ ''حکم تو میں مانوں گا۔ تم دنیا کی جس شے کی بھی تمنا کرو گی، تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔''

''آج تو بڑے مہربان نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟''

''تمہاری تکلیف سے تکلیف ہوتی ہے۔''

''یہ سب تمہارا ہی تو عطیہ ہے۔''

''اسی لیے تو میں تمہیں اس سے نجات دلانا چاہتا ہوں بس ایک بات، بہت ہی چھوٹی سی بات مان لو میری۔''

''یعنی تم اب بھی یہی چاہتے ہو کہ میں شاہینہ سے نہ ملوں؟''

''نہیں......'' اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں تم دونوں کے راستے میں نہیں آنا چاہتا بلکہ دل سے چاہتا ہوں کہ تم اس سے ملو۔''

''پھر کیا چاہتے ہو؟''

''وعدہ کرو کہ انکار نہیں کرو گی۔''

''پہلے اصل بات بتاؤ۔''

''بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے وقت پر بھلی لگتی ہیں کوئی بچہ بڑوں کی طرح پکی باتیں کرنے لگے تو اس کی سادگی اور معصومیت کا سارا حسن ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نوجوان، بڈھوں جیسی حرکات پر اتر آئے تو اس کی پُر کشش اور دلچسپ شخصیت میں کچھ تغیر پیدا ہو جاتا ہے جسے نہ تو مقدس و احترام کا نام دیا جا سکا ہے اور نہ شرارت اور شوخی کا۔''

میں نے کہا۔ ”ہاں...... اس حد تک مجھے تم سے پورا اتفاق ہے۔“

اس کی آنکھیں دوبارہ چمکنے لگیں۔ ”یہی بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ اپنے فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمہارے اپنے فائدے کے لیے۔ دیکھو نا ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ بقول شخصے، کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ نماز، روزے اور عبادت و ریاضت کے لیے تمام زندگی پڑی ہے۔ ابھی سے ان باتوں میں مبتلا ہو گئیں تو زندگی کا کچھ بھی لطف نہیں اُٹھا سکو گی۔“

میں نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی پُر امید نظروں سے میری طرف تک رہا تھا۔ ”تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں نماز نہ پڑھا کروں؟“

وہ تائیدی انداز میں مسکرایا۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے قدم متزلزل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کی اس بات میں وزن نظر آیا کہ اس دنیا میں دوبارہ واپسی نہیں ہو سکتی پھر کیوں نہ مختصر سی زندگی کا یہ عرصہ ہنس کھیل کر عیش و عشرت کے ساتھ گزار دیا جائے مگر دوسرے ہی لمحے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ شخص میری ساری دولت ساری کائنات چھین لینا چاہتا ہو۔

”یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اب تو چاہے مجھے پھانسی کے تختے پر ہی کیوں نہ چڑھا دیا جائے، مجھے نماز سے کوئی نہیں روک سکتا۔ سکون و طمانیت کی ایک ہی دولت تو میرے ہاتھ آئی ہے اور اب تم اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہو۔“

اس کی آنکھوں کی چمک اس طرح معدوم ہو گئی جیسے کسی نے دو جلتے چراغوں کو ایک ہی پھونک مار کر بجھا دیا ہو۔ مسکراتا ہوا چہرہ بدصورت اور بھیانک شکل اختیار کر گیا اور سیاہی مائل دھوئیں کی صورت میں اس کا ہیولا فضا میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔

رات کو سونے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہی میں نے اپنے آپ کو اسی دنیا میں پایا۔ دوپہر کا وقت تھا خالہ آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ خالو مقدمات کے سلسلے میں کچہری گئے ہوئے تھے نصیبن اپنا کھانا لے کر گھر جا چکی تھی اور پانچ بجے شام سے قبل اس کی آمد کی کوئی توقع نہ تھی۔ سلیم میرے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ وہ سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہہ رہا تھا۔

”نائی سے پوچھا، نائی، رے نائی، میرے سر پر بال کتنے؟ نائی بولا ججمان جی کاہے گھبراوت ہو۔ مونڈے مانڈا ابھی سب تہار گودی میں پڑی ہوئیے۔ یہی میرا جواب ہے کہ اوجی گھبراوت کاہے کھاتر، ہو بس دو تھو مہینے کی بات ہے تنک صبر کرو۔“

”میں ڈرتی ہوں سلیم...... یہ خواب ٹوٹ جائے گا اور میں تمہیں پھر کبھی......“

اس نے بیچ ہی میں سے بات کاٹ دی۔ ”اچھا تو آپ ابھی تک خواب ہی دیکھے جا رہی ہیں۔ شاید ہاتھ کی تکلیف بھول گئیں۔ پوری بوٹی اُڑ وائے بغیر یقین نہیں آئے گا۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے بے بسی کے ساتھ کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں جیل میں لیٹی ہوئی تھی۔“

”مبارک خواب ہے۔“ وہ بولا۔ ”کسی بھی تعبیر نامے میں دیکھ لینا، جیل کی تعبیر شادی سے کی جاتی ہے۔ دہلی میں ایک مجذوب تھے وہ ہر

شادی میں بن بلائے پہنچ جاتے اور نکاح ہوتے ہی زور سے چلاتے تھے۔ ہوگئی سالے کو عمر قید۔ اب اگر تھوڑی دیر پہلے آپ جیل میں تھیں تو ہاتھ منہ دھو کر عمر قید کے لیے تیار ہو جائیے اور مجھے بھی اب اجازت دیجیے۔ امی اُٹھ گئیں تو جوتے مار مار کر میرا بھیجا پلپلا کر دیں گی۔'' اس نے اپنی جانب کے کواڑوں کی کنڈی کھولی اور اُڑن چھو ہو گیا۔

بجھے بجھے دل کے ساتھ کمرے میں لگی ہوئی مسہری پر آ کر لیٹ گئی اور ''عصمت'' نامی خواتین کے ایک پرچے کی ورق گردانی کرنے لگی جو ہم دونوں کی محبت کا پیامبر تھا۔ سلیم سے جو بات مجھے کہنا ہوتی، کوشش کر کے اس میں سے ایسے ہی جملے تلاش کرتی اور ان کے نیچے اپنے ہاتھ سے لکیر کھینچ دیتی۔ خط کشیدہ جملے اس کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے تھے۔ ہم دونوں کی محبت نے بھی اسی طرح جنم لیا تھا یوں تو وہ مجھے ہمیشہ ہی سے اچھا معلوم ہوتا تھا لیکن دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے مجھے ہمت نہ پڑتی تھی اور نہ اسے جرأت ہوتی تھی۔ رسالہ ''عصمت'' کے خط کشیدہ جملے ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر کرتے چلے گئے۔ آخر میں تو ایسے جملوں تک نوبت پہنچ گئی۔ اگر تم میری نہ ہو سکی تو میں زہر کھا کر خودکشی کرلوں گا۔

لیکن میں تو خواب دیکھ رہی تھی۔ دنیا کا عجیب ترین خواب۔ دو روز قبل تو میں سلیم کو جانتی بھی نہیں تھی۔ نہ میری کوئی خالہ تھی اور نہ ہی کبھی کھلنا گئی تھی پھر بھی کسی قسم کے نئے پن یا اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں تو حقیقت میں جیل کی ایک ایسی قیدی تھی جس پر غیر ملکی دشمنوں کے لیے سراغ رسانی کرنے کا الزام تھوپنے کی کوشش کی جا رہی تھی جبکہ سلیم کے نزدیک میں جیل کا مبارک خواب دیکھ رہی تھی۔ جیل جانے سے پہلے میں نے جو زندگی گزاری تھی، وہ سب خواب تھی پھر حقیقت کیا تھی میری موجودہ حالت کو بھی حقیقت قرار نہیں دیا جا سکتا مگر ہر دو حالتوں میں ہی ایک حالت لازمی طور پر حقیقت ہوگی اور ایک خواب۔ یہ ناممکن ہے کہ دونوں ہی حقیقت ہوں یا دونوں ہی خواب۔

''عصمت'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے محفل خواتین میں اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔ کسی لڑکی نے ''ادب عالیہ'' کے عنوان سے اقتباس تحریر کیا تھا جس کے چاروں طرف سلیم نے ایک گول دائرہ کھینچ کر گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ عبارت کچھ اس قسم کی تھی۔

''میرے محبوب...... آہ...... تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔ خواب اور حقیقت میں کیا فرق ہے آہ ساون کے مہینے میں پی کہاں کہنے والا پپیہا بھی یہی پوچھتا ہے کوئل کی کوکو میں بھی یہی سوال پوشیدہ ہوتا ہے۔ آہ...... جب کسی نئی نویلی دلہن کا ڈولا اپنے پریتم جی کے گھر روانہ ہوتا ہے تو وہ بھی اپنی سکھی سہیلیوں سے پُرنم آنکھوں کے ساتھ یہی سوال کرتی ہے۔ آہ...... کوئی نہیں جانتا کسی کو نہیں معلوم کہ خواب کیا ہے اور حقیقت کیا ہے مگر میں جانتی ہوں میرے محبوب ہاں ہاں تمہاری داسی کو اس سوال کا جواب معلوم ہے۔ ادھر آؤ میرے محبوب اپنے کان میرے منہ کے پاس لاؤ۔ میں تمہیں اصل بات بتاؤں گی۔ دیکھو میرے محبوب جب تم میرے پاس ہوتے ہو تو اسے حقیقت کہتے ہیں۔ لیکن آہ...... جب تم میری نظروں سے دور ہو جاتے ہو تو اسے...... اسے خواب کہا جاتا ہے۔''

آہوں کی تکرار والے اس بے ربط سے ادب عالیہ کے اقتباس کے ذریعے میرے پریشان حال دل کو بڑی ڈھارس پہنچی۔ میں نے رسالے کو اپنے سینے پر رکھ لیا اور دو ماہ بعد اپنی ہونے والی شادی کے تصور میں کھو گئی۔

تصور کے تانے بانے اس وقت ٹوٹے جب شمسن نے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر صبح کی نماز کے لیے آواز دی۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں

کھولیں تو سینے پر رکھا ہوا رسالہ فرش پر گر پڑا تھا۔

''ارے..... یہ رسالہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟'' شمسن نے اسے اُٹھا کر اوپر رکھتے ہوئے پوچھا۔ کوئی جواب دینے کی بجائے میں نے لپک کر دوبارہ وہ رسالہ اُٹھالیا اور جلدی جلدی ورق گردانی کر کے محفل خواتین والا حصہ نکالا۔ اس میں ادب عالیہ کے عنوان سے وہی اقتباس من و عن موجود تھا جسے تھوڑی دیر قبل حالت خواب میں پڑھ چکی تھی۔ ''تم جانتے ہو، رسالہ کون لایا ہے؟'' میں نے شمسن سے پوچھا۔

''جانتی تو تم سے کیوں پوچھتی؟'' اس نے کہا۔

''وقت تنگ ہو رہا ہے۔'' میں نے رسالہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو..... پہلے نماز پڑھ لیں۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔''

نماز کے بعد جب میں نے شمسن کو خواب سنایا تو اسے میری بات پر اعتبار ہی نہیں آیا لیکن میرے پاس ایک چھوڑ، پورے تین ثبوت موجود تھے۔ دو خوبصورت رومال، دائیں ہتھیلی کی پشت پر دانتوں کے نشان اور رسالہ ''عصمت'' بہت سوچ بچار کے بعد شمسن بولی۔ ''ہو نہ ہو، اسی بھوت کی حرکت ہے جس نے میرے منہ پر طمانچہ مارا تھا مگر اب وہ مجھے نہیں مار سکتا۔''

''کیوں نہیں مار سکتا؟''

''اس زمانے میں، مَیں نے نماز چھوڑ رکھی تھی۔'' شمسن نے کہا۔ ''خبیث روحیں اور بھوت پریت نمازیوں کے پاس نہیں آسکتے۔ قریب آئیں تو جل بھن کر راکھ ہو جائیں گے۔''

''کون کہتا ہے؟''

''سب کہتے ہیں جس مسلمان سے چاہو پوچھ لو مسلمانوں کے پاس تو محض نیک روحیں اور پاک اور شہید روحیں ہی آسکتی ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ مسلمان پنج وقتہ نمازی ہو۔''

شمسن کی بات کی تھوڑی دیر بعد ہی تصدیق ہو گئی میں رسالے کو اُلٹ پلٹ کر بار بار اسی ایک اقتباس کا مطالعہ کر رہی تھی کہ کوٹھری کے باہر اسی بھوت کا ہیولا نظر آیا۔ وہ عجیب بجھی بجھی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر بولا۔ ''میری بات مان لو پارٹنر، خسارے میں نہیں رہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے ایک کام کرو، دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے شمسن بیٹھی ہوئی ہے۔ ذرا اس کے منہ پر تھپڑ تو رسید کر دو۔''

''نہیں پارٹنر! اس پر ہاتھ اُٹھانے کی جسارت نہیں کر سکتا کوئی اور ہوتا تو دوسری بات تھی۔''

''جسارت نہیں کر سکتے یا اسے مار ہی نہیں سکتے۔''

''جو چاہو، سمجھ لو۔'' اس نے کہا۔ ''بہر حال وہ لڑکی ہے۔''

''حوالات میں تم نے اس کے تھپڑ کیوں مارا تھا؟ کیا اس وقت یہ لڑکی نہیں تھی۔''

''ایک بار غلطی ہو جانے کا یہ مطلب تھوڑی ہے، بار بار اسی کو دہرایا جائے۔''

''وہ دعویٰ کرتی ہے کہ تم اس کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔''

''اس کا دعویٰ صحیح ہے۔ مردوں کو ہمیشہ عورتوں کا احترام کرنا چاہیے۔''

''اگر اس کا دعویٰ صحیح ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

''تمہیں نقصان کون کمبخت پہنچا رہا ہے پارٹنر؟''

''اور یہ سب شمسن کے کہنے کے مطابق نماز کی برکت ہے۔'' اس کا منہ اُتر گیا بولا کچھ بھی نہیں۔

''تم چاہتے ہو کہ میں نماز چھوڑ دوں تا کہ مجھ پر قابو پا سکو۔ کیوں؟''

کیوں کا جواب نہیں ملا۔ ہیولا دھوئیں میں تبدیل ہو کر غائب ہو چکا تھا۔

تقریباً آٹھ بجے تفتیش کرنے والا سراغ رساں آیا پھر اب کی مرتبہ مجھ سے کچھ پوچھنے کی بجائے اس نے شمسن سے سوال جواب کیے۔ جاتے وقت اس نے شمسن کو سرکاری گواہ بننے کا لالچ بھی دیا اور یہ بھی بتایا کہ اگر وہ گواہ نہیں بنی تو اسے کالے پانی بھیج دیا جائے گا۔

ہم لوگ باقاعدہ قیدی تو تھے نہیں، اس لیے ابھی تک ہمارے ذمے کسی قسم کا کوئی کام سپرد نہیں کیا گیا تھا تفتیش کنندہ کے جانے کے بعد میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگی اب مجھے سونے میں لطف آنے لگا تھا۔ چاہتی تھی کہ ایسی نیند سوؤں کہ سلیم کے پاس سے کبھی واپسی نہ ہو، غنودگی طاری ہوتے ہی دوبارہ اس کے ہاں پہنچ گئی۔ دستر خوان لگا ہوا تھا انواع واقسام کے پھل اور میوے رکھے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے پکوان دیکھ کر منہ میں پانی آ رہا تھا۔ خالو اپنے دو مؤکلوں سے کسی پیچیدہ مقدمے کے بارے میں محو گفتگو تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دستر خوان پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال لیتے تھے۔ میں بہت ہی ادب کے ساتھ اس کمرے کے برابر والے کمرے کے دروازے سے لگی دوزانو بیٹھی تھی اور میرے کان سلیم کی آواز پر لگے ہوئے تھے جو نصیبن سے کسی کام کے لیے کہہ رہا تھا۔ ''نقارے پر چوٹ پڑنے والی ہے۔ شربت باہر نہیں گیا۔ تم ذرا جلدی جلدی برف کا چورا بنا لو۔ فالودہ تیار ہو چکا ہے، بس شربت رہ گیا ہے۔''

اور تب مجھے یاد آیا کہ رمضان کا مہینہ ہے میں روزہ افطار کرنے کے لیے آئی ہوں۔ مغرب کا وقت ہو چکا ہے اور ایک دو منٹ کے اندر اندر نقارے کی چوٹ سے افطار کا اعلان ہونے والا ہے۔''

نقارے پر چوٹ پڑی۔ سب نے دعائیں پڑھتے ہوئے بصرے کی کھجوریں منہ میں ڈال لیں۔ ایسی نفیس اور پُر ذائقہ کھجوریں تھیں کہ منہ میں جاتے ہی شکر کی طرح خود بخود گھلتی چلی گئیں۔ اسی وقت شمسن نے مجھے جگا دیا۔ ''نور النہار ملنے آئی ہے۔''

میں بُرا سا منہ بناتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ کھجور کا ذائقہ ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔ ''کہاں ہے؟''

''تمہاری اس کوٹھری میں تھوڑی آ جائے گی سنتری پیغام لایا ہے۔ کسی دوسری جگہ ملاقات ہوگی۔''

سنتری نے دروازے ہی سے کہا۔'' آ جاؤ...... خواہ مخواہ کیوں دیر لگا رہی ہو۔ بے چاریوں کو بڑی مشکل سے تم لوگوں سے ملنے کی اجازت ملی ہے۔''

''بے چاریوں کو؟'' میں نے شمسن کی طرف سوالیہ نظریں اُٹھائیں۔

''معلوم ہوتا ہے، شاہینہ بھی آئی ہے۔'' اس نے کہا۔

واقعی نورالنہار، شاہینہ کے ساتھ آئی تھی۔ پھول سا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''میں اقبال کرلوں کہ وہ گھڑی میں نے آپ کو دی تھی؟'' اس نے کہا۔

''نہیں......'' میں نے سختی کے ساتھ کہا۔ ''یہ لوگ ہم دونوں پر کبھی جرم ثابت نہیں کر سکیں گے لیکن تم نے اقبال کرلیا تو مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ اب بھول جاؤ اسے۔''

نورالنہار بولی۔ ''جیل سے تو تم آج نہیں تو کل رہا ہو ہی جاؤ گی۔ بُرا مت ماننا، میں نے چپکے ہی چپکے تمہاری شادی طے کردی ہے۔''

''یہ بھی خوب رہی۔ وہ کمبخت، منحوس صورت، ہمیں کالے پانی بھیجنے پر تلا ہوا ہے اور آپ شادیاں طے کرتی پھر رہی ہیں۔ خدا کی قسم، جواب نہیں تمہارا۔''

''کالے پانی جائیں تمہارے دشمن۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔ ''میں نے امی سے کہہ دیا ہے کہ اسی عید کے مہینے میں شادی ہوگی۔''

''عید کے مہینے میں؟'' مجھے خواب کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس مہینے میں تو میری سلیم کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔

میں نے عید کا دن منایا۔ سلیم کے ہاں روائی کی بالائی میں تیار کی ہوئی سویاں بھی کھائیں۔ سسرال کا نیا جوڑا بھی زیب تن کیا اور ہزاروں منتوں اور خوشامدوں کے بعد کھڑکی کی سلاخوں سے سلیم کے ہاتھ کا بوسہ بھی لیا اور عید کے تحفے کے طور پر دو معطر رومال بھی حاصل کیے۔

''گھر چھوڑنے کا رنج تو بہت ہو رہا ہوگا۔'' اس نے کھڑکی کی دوسری جانب سے پوچھا۔

''آپ کو احساس ہے اس بات کا؟'' میں بولی۔

''کیوں نہیں؟''

''پھر دو ایک سال مزید صبر کر لیجیے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ چند عیدیں اور گزار لیجیے میرے بغیر۔''

''تم چاہتی ہو کہ اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ دوں؟''

''ایسی خودغرض خوشیاں بھی کس کام کی جو دوسروں کے دل کو رنج پہنچا کر حاصل کی جائیں۔'' پھر وہی کھنکتی ہوئی ہنسی۔ ''ججمان جی! کا ہے کھا طرشور کرت ہو۔ موںڈے ماںڈے کبھی تمہاری گودی پر پڑل ہوتب۔'' اس نے ہنس کر کہا اور اپنی امی کے آنے کا بہانہ کرتا ہوا کھسک گیا۔

تبھی شمسن نے شانہ ہلا کر مجھے اٹھا دیا۔ میں اُٹھ کر بیٹھی تھی کہ اس نے کہا۔ ''ہم دونوں کی رہائی کا پروانہ آگیا ہے۔ بغیر کسی قسم کی ضمانت کے ہمیں چھوڑ دیا گیا ہے۔''

خلاف توقع ہم لوگ گھر پہنچے تو خوشی اور حیرت کے باعث نورالنہار کے منہ سے دیر تک آواز ہی نہ نکلی۔

نورالنہار سے مل کر میں اپنے ہوٹل واپس آ گئی۔

میں تھوڑی دیر کے بعد شمسن کے ساتھ ہوٹل میں جا کر اپنا سامان بھی لے آئی۔ نسیم کا ہیولا چند لمحوں کے لیے ہوٹل کے دروازے پر نظر آیا تھا لیکن نہ اس نے مخاطب کیا تھا اور نہ میں نے اسے کچھ کہنا مناسب سمجھا۔ اب تو وہ سیاہ دھوئیں کے مرغولے سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔

دن کے ہنگاموں اور نورالنہار کی خاطر مدارات کے باعث سونے کا موقع نہ مل سکا۔ صرف ایک بار دو منٹ کے لیے جھپکی آئی تھی کہ میں نے مہمانوں کے ہجوم میں اپنے آپ کو دلہن بنے ہوئے دیکھا۔ شہنائیاں اور نوبتیں بج رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے چڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر چہچہاتے پھر رہے تھے۔ مہمانوں پر گلاب چھڑکا جا رہا تھا میرا بے تکلف دوست سبط اختر اپنے مخصوص انداز میں سہرا پڑھ رہا تھا۔

اسی وقت نورالنہار نے شام کی چائے کے لیے اُٹھا دیا۔ شاہینہ کی امی کے ہاں سے نیاز کی مٹھائی آئی تھی۔ چائے پلاتے وقت نورالنہار نے بتایا کہ عید کے چاند میں بات بالکل پکی سمجھو۔ میں نے سب کو تمہاری شادی میں شریک ہونے کے لیے آج ہی خط لکھ دیئے ہیں۔

رات ہو گئی، میں سونا چاہتی تھی۔ خواب دیکھنا چاہتی تھی لیکن نورالنہار کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ لگ بھگ دس بجے رات کو اس سے جان چھوٹی تو مجھے آنکھیں بند کرنے کی فرصت ملی۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے خود کو حجلہ عروسی میں دیکھا۔ میں لال کپڑوں کی گٹھری بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ سلیم میرے پاس پہنچ کر میرے جسم سے لگ کر بیٹھ گیا اور گلے میں ایک بازو حائل کر کے اس نے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔

''تم......؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

دولہا کے روپ میں شورویر سامنے تھا۔

میرے منہ سے حیرت بھری تم کی آواز سن کر سلیم نے تعجب کے اثرات کے ساتھ میری طرف غور سے دیکھا۔ سرخ ہونٹوں کے گوشوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہلکی آواز میں بولا۔ ''کچھ شبہ ہو رہا ہے آپ کو؟''

شبہ نہیں، مجھے تو یقین تھا کہ شوروریر ہی ہے۔ اسے میں اس وقت سے جانتی تھی جب میں اپنے گھر میں...... لیکن میں نے سلیم کو یہ بات نہیں بتائی۔ مجھے اچانک یاد آ گیا کہ سلیم تو میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ زندگی کا بیشتر حصہ ہم دونوں نے ایک ساتھ کھیل کود کر گزارا ہے۔ رسالہ ''عصمت'' کے ذریعے محبت کی پینگیں بڑھائی ہیں، پھر فوراً ہی مجھے ہنسی آ گئی۔ میں بھی بیوقوف ہوں کہ خواب کی باتوں کو سچ سمجھ بیٹھی۔ حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ سلیم نہ جانے میری ہنسی کا کیا مطلب سمجھا۔ میں نے اپنا سر کندھے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر کے عجیب سے لہجے میں کہنے لگی۔ ''یقین نہیں آتا۔''

''کیا یقین نہیں آتا؟''

''یہی کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں یا سچ مچ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کو پا لیا ہے؟''

کیا واقعی یہ خواب تھا؟ کیا خواب میں اسی طرح خوابوں کی باتیں کی جاتی ہیں؟ نہیں...... یہ خواب ہرگز نہیں تھا۔ خواب کی زندگی تو وہ تھی جسے میں اپنی بیوقوفی سے عالم بیداری سمجھتی رہی ہوں۔ جیل، دوست کا بھوت، بھٹکتی روح یہ ساری کی ساری باتیں خواب وخیال نہیں تو اور کیا ہیں؟

بھلا آج کل کی پڑھی لکھی متمدن دنیا میں کوئی شخص بھوتوں اور روحوں پر یقین کر سکتا ہے؟ اگر روحیں اتنی آسانی کے ساتھ ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہونے لگیں تو دنیا کا نقشہ ہی بدل جائے شاید میں کسی ایسے نفسیاتی مرض میں گرفتار تھی جس کے باعث بیداری کو خواب اور خواب کو بیداری سمجھنے لگی تھی۔

شمسن نے آ کر بتایا کہ شاہینہ گھر سے غائب ہو گئی ہے اور میں فکرمند ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟

ذہن پر بوجھ ہو تو دو باتیں ہوتی ہیں یا تو نیند غائب ہو جاتی ہے یا پھر گہری ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور میں کچھ دیر پھر بے خبر ہو گئی۔ میں بے خبر سو رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے کسی نے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا ہو میں چیخنا چاہتی تھی میرے حلق سے آواز نہ نکلی۔ مجھے اُٹھانے والا دوڑنے لگا۔ پتا نہیں کتنی دیر دوڑا ہو گا پھر اس نے مجھے ایک جگہ پٹخ دیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ زمین پر گرنے کے باوجود مجھے چوٹ محسوس نہ ہوئی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بے آب و گیاہ میدان تھا۔ دور دور تک سبزے کا نشان نہ تھا۔ چٹیل میدان میں ایک قلعہ نما حویلی ہے۔ میں اس حویلی کی طرف بڑھنے لگی۔

بالآخر میں اس حویلی تک پہنچ گئی۔ ابھی کھڑی حویلی کا جائزہ لے رہی تھی کہ وہ واقعہ رُونما ہو گیا۔ شاید یہ میری چھٹی حس کا کمال تھا کہ میں نے وہ جگہ چھوڑ دی۔ اگر ایک سیکنڈ بھی دیر ہو جاتی تو میرا سر پاش پاش ہو جاتا۔ حویلی کی چھت سے ایک بڑا سا پتھر نیچے گرا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے جان بوجھ کر مجھے ختم کرنے کے لیے اوپر سے وہ پتھر گرایا تھا۔ میں نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں وہ شکستہ برجی کسی آسیب کی طرح سر اُٹھائے کھڑی محسوس ہوئی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں نے دیکھنے کی پوری کوشش کی کہ شاید میرا وہم ہو، حقیقت نہ ہو۔ وہاں اوپر کوئی شخص بیٹھا ہوا ہو اور اسی نے پتھر پھینکا ہو لیکن اس شکستہ برجی پر کوئی نظر نہیں آیا۔ اس پر چڑھنا بھی آسان نہ تھا۔ کیونکہ دیواریں اتنی شکستہ تھیں کہ ان پر دباؤ پڑتے ہی وہ ڈھے جاتیں۔ موت کو اتنے قریب پا کر میں بوکھلا اُٹھی کہ اگر کوئی موجود ہے تو وہ دیوار کو دھکا دے کر میرے اوپر گرا سکتا ہے۔

وہاں ماسوائے سناٹے کے کوئی نہ تھا پھر یہ پتھر کیسے گرا؟ سینے میں دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے یہ سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ حویلی کافی وسیع اور شاندار تھی گو کہ اب اس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی سہاگن جوانی میں بیوہ ہو گئی ہو اور بڑھاپے نے اس کے سراپے کو جھریوں سے بدنما بنا دیا ہو۔ وقت کی دھول نے اسے دھواں دھواں کر دیا ہو۔

مجھے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں دوسرا پتھر مجھ پر ہی نہ آ گرے۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ عجیب سے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ جگہ جگہ شکستہ حویلی کا ملبہ پڑا تھا۔ حویلی کے کھنڈر اس شان کی غمازی کر رہے تھے کہ جب یہ رونق افروز رہی ہو گی تو یقیناً یہ عمارت بڑے دبدبے کی مالک ہو گی گو کہ اب یہاں ویرانی، سناٹے اور ہُو کا عالم تھا لیکن ان باتوں کا جواب کون دیتا؟

ہوائیں تو آسیب کی مانند حویلی کی شکستہ دیواروں سے لپٹ لپٹ کر بین کر رہی تھیں۔ اگر میں آج سے صرف دو سال پہلے کسی ایسی حویلی کے سامنے رات کے وقت پہنچ جاتی تو خوف سے حرکتِ قلب بند ہو جاتی مگر اس تھوڑے سے ہی عرصے میں، مَیں اتنی بار ایسے حالات سے دوچار ہو چکی تھی کہ اب خوف بھی مجھ سے کئی میل دور رہتا۔ اسی لیے اس حویلی کو دیکھ کر ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے حویلی کے برآمدے کی

جانب قدم بڑھا دیئے۔ برآمدہ کافی اونچا بنا ہوا تھا۔ برآمدے پر پہنچنے کے لیے چھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اتنی دور سے بھی ان سیڑھیوں کی چوڑائی صاف نظر آ رہی تھی۔ ہر سیڑھی تقریباً پانچ فٹ چوڑی اور آٹھ فٹ لمبی تھی۔ پہلی سیڑھی کی اونچائی ڈیڑھ دو فٹ سے کم نہ تھی، میں ان سیڑھیوں کے قریب پہنچ گئی۔ قریب پہنچتے ہی حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ جنہیں میں سیڑھیاں سمجھ رہی تھی دراصل وہ اونچی نیچی قبریں تھیں، عیسائیوں کی قبریں کیونکہ قبروں پر صلیب بنے ہوئے تھے۔ صلیب کے سرے پر مُردوں کے نام انگریزی رسم الخط میں لکھے ہوئے تھے۔ پہلی قبر پر فرسکوڈی کوسٹا لکھا تھا۔ میں مزید نزدیک پہنچ گئی۔ میری نظریں ابھی تک ان قبروں پر جمی ہوئی تھیں اور میرا ذہن سوچ کی غلام گردشوں میں آوارہ پھر رہا تھا۔ سنگ مرمر کی سفید قبروں میں کون کب سویا یہ تو اوپر ہی لکھا تھا مگر میں نے پڑھنے کی ضرورت نہ سمجھی اور آگے بڑھی۔ ابھی قدم آگے اُٹھایا ہی تھا کہ ایک جھٹکے سے پہلی قبر کا تعویذ کھل گیا۔ میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اندر سفید کفن میں لپٹا ہوا مُردہ صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اُٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ پوری طرح کمر ٹکا کر بیٹھ گیا کہ دوسری قبر کا تعویذ کھل گیا۔ وہ بھی اُٹھ بیٹھا تھا۔ ایک کے بعد ایک تمام قبروں کے مُردے اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں حیرت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ یقین کریں اس وقت بھی مجھے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں حیرت ضرور ہو رہی تھی کہ قبر کا تعویذ کیسے کھلا اور مُردے کیوں اُٹھ بیٹھے ہیں۔ پھر وہ مُردے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس سنسان بیابان علاقے میں ایسے حالات میں کمزور دل والے کی حرکت قلب بند ہو سکتی تھی مگر میں انہیں آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے دوبارہ آگے کی جانب قدم بڑھایا تھا کہ پہلے والے مُردے نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''رُک جاؤ...... تم اندر داخل نہیں ہو سکتیں۔ اگر کوشش کرو گی تو میں تمہیں نیست و نابود کر دوں گا۔''

''تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟'' میں نے جواب دیا۔

''میرے اندر قوت کا سیلاب سا ہے۔ میں جب چاہوں تمہیں تباہ کر سکتا ہوں۔ فی الحال تم اپنی خیریت چاہتی ہو تو لوٹ جاؤ۔''

''میرا اُٹھا ہوا قدم واپسی کے لیے نہیں ہوتا۔ اب تو میں ہر حال میں اندر جاؤں گی اگر روک سکتے ہو تو روک لو۔''

میرے دوٹوک جواب نے اسے خاموش کر دیا۔ وہ تیز نظروں سے مجھے دیکھتا رہا بالکل اسی طرح میں بھی اسے دیکھے جا رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے آنکھوں سے آنکھیں لڑانے کا مقابلہ ہو رہا ہے وہ اپنی جگہ کھڑا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جبکہ دوسرے مُردے اپنی اپنی قبروں سے باہر نکل آئے تھے اور میری طرف بڑھ رہے تھے کہیں وہ کوئی شرارت نہ کریں۔ اس خیال کے آتے ہی میں پوری طرح ہوشیار ہو گئی تھی۔

''لو...... میں اوپر جا رہی ہوں۔ روک سکتے ہو تو روک لو۔'' کہہ کر میں نے قدم بڑھایا، آگے بڑھنے کو تو بڑھ آئی تھی مگر اوپر جانے کا راستہ نظر نہیں آیا تھا کیونکہ سیڑھیوں پر تو قبریں تھیں۔ ان کھلی ہوئی قبروں کو پھلانگ کر میں کیسے میں اندر جاتی۔

مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر ان زندہ مُردوں نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔ وہ سب اُچھل رہے تھے اور ان کی اُچھل کود میں وحشت نہیں تھی، بڑے منظم انداز میں وہ سب اُچھل کود رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ ان سے بچنے کا صرف ایک راستہ تھا قرآنی آیات۔ میں نے فوراً ہی آیات قرآنی کی تلاوت شروع کر دی۔ آیات میں کتنا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ ان کم عقلوں کو کہاں ہو گا جو اپنے گھروں میں قرآن پاک کو جزدان کی زینت بنائے رکھتے ہیں۔ جوں جوں میں تلاوت کرتی جاتی تھی، ان پر نشہ سا چھا رہا

تھا۔ وہ سب جھومنے لگے تھے۔ چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر میں نے جیسے ہی پھونک ماری، تمام کے تمام مُردے کٹے ہوئے پیڑ کی طرح ڈھے گئے۔ بس ایک لمحے میں راستہ صاف ہو گیا۔ اب نہ مُردے تھے نہ قبروں کا نشان۔ میں سمجھ گئی کہ میں نظر بندی کا شکار ہو گئی تھی۔

راستہ صاف ہوتے ہی میں اوپر چڑھتی چلی گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر میں نے ایک بار اور مڑ کر سیڑھیوں پر نظر ڈالی۔ کسی کو موجود نہ پا کر میں پوری طرح سے مطمئن ہو گئی تھی۔ اب مجھے آگے بڑھنا تھا۔ سامنے ہی مرکزی دروازہ بند تھا۔ میں دھیرے دھیرے اس دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ پہلے مجھے وہ دروازہ بہت قریب نظر آیا تھا لیکن جب آگے بڑھی تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ جگہ جگہ پر نظر بندی ہے جس کی وجہ سے نظروں کا دھوکا ہو رہا ہے اس فسوں گری کا توڑ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہے۔ بس میں نے آیات قرآنی کا ورد شروع کر دیا۔ یہ قرآنی معجزہ ہی تھا کہ نظروں کا دھوکا ختم ہوتا چلا گیا اور میں آگے بڑھتے ہوئے دروازے پر پہنچ گئی۔

دروازے کو کھولنے کے لیے میں نے دھکا دیا مگر وہ نہ کھلا۔ اس دروازے کو کیسے کھولا جائے ابھی میں اسی سوچ میں تھی کہ میری نظر دروازے کے برابر میں لگے کنڈے پر پڑی اور مجھے یاد آگیا کہ پُرانی عمارتوں کے دروازوں کو کھولنے کے لیے اسی قسم کے کنڈے کو کھینچا جاتا ہے۔

میں نے بھی آگے بڑھ کر کنڈے کو جھٹکا دیا نتیجتاً دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے اندر جھانکا نیچے دور تک سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ سفید سنگِ مرمر کو تراش کر بنائی گئی سیڑھیوں کو طے کرتی ہوئی میں آہستہ آہستہ نیچے اُترتی چلی گئی۔ آدھی سیڑھیاں طے کر کے میں رُک گئی۔ اب میں تہ خانے میں پہنچ چکی تھی۔ وہ تہ خانہ کیا تھا ایک پوری دنیا آباد تھی۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بے ہوش ہو چکا ہوتا۔ اسے اپنی قوت بصارت پر کسی طور پر یقین نہ آتا کیونکہ اوپر دو ڈھائی کنال کی حویلی تھی جبکہ نیچے کئی ایکڑ پر پھیلا تہ خانہ تھا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مگر اس وقت مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ اس تہ خانے کی وسعت پر مجھے اس لیے حیرت نہ تھی کہ شورویر کے سحر سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ وہ رائی کو بھی پہاڑ دکھا سکتا تھا۔ میں نے بالآخر اندر داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سیڑھیوں سے نیچے اُترتی چلی گئی۔ آخری سیڑھی پر پہنچتے ہی میں ٹھہر گئی کیونکہ نیچے دور تک کیچڑ سی پھیلی تھی۔ یقیناً یہ کیچڑ جادوئی ہو گی اور اس میں پیر پڑتے ہی پیر گل سڑ جائیں گے۔ کیچڑ کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دو ہاتھ چوڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ان پتھروں پر پیر رکھ کر با آسانی اس ٹیلے پر پہنچا جا سکتا تھا جو بالکل درمیان میں بنا ہوا تھا۔ اس ٹیلے پر ایک عالی شان کوٹھی بھی نظر آ رہی تھی۔ اب پتا نہیں یہ میری نظروں کا دھوکا تھا یا واقعی وہ کوٹھی تھی۔ اگر حقیقت میں وہ کوٹھی تھی تو تہ خانے میں کہاں سے آ گئی؟ مجھے اس کوٹھی تک پہنچنے کے لیے انہی پتھروں پر چل کر جانا تھا۔ میں نے پہلے پتھر پر پیر رکھنے سے پیشتر اس کی مضبوطی کو آزمانا چاہا۔ وہیں ایک طرف موٹی سی ڈالی پڑی تھی شاید جامن کے پیڑ سے توڑی گئی تھی کیونکہ رنگ سیاہی مائل تھا۔ پتا نہیں کون رکھ گیا تھا۔ میں نے ڈالی کو اُٹھایا تو نرم نرم لجلجی سی لگی۔ میں نے گھبرا کر اسے آگے پھینکا جیسے ہی وہ ڈالی کیچڑ میں گری، ایسا لگا جیسے اس پر باریک باریک ریشوں نے یلغار کر دی ہو۔ اس ڈالی نے بھی فوراً ہی اُچھال بھری تھی اور باریک سیٹی جیسی آواز سنائی دی تھی۔ اب جو میں نے غور کیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ اس ڈالی نے پھن کاڑھ لیا تھا۔ وہ شاید اُڑنے والا سانپ تھا کیونکہ ایک بار جو اُچھلا تھا تو پھر نیچے نہیں گرا تھا متواتر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ شاید وہ اذیت میں مبتلا تھا کیونکہ اس کے جسم سے لمبے لمبے ریشے لپٹے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح

اُچھلتا، قلابازیاں کھاتا رہا پھر خود ہی نیچے گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی وہاں لمبی سی موٹی لکیر بن گئی۔ یہ لکیر ریشوں سے بنی تھی۔ ان ریشوں نے سانپ کو پوری طرح ڈھک لیا تھا۔ اب جو میں نے جھک کر کیچڑ میں دیکھا تو میری روح فنا ہو گئی کیونکہ کیچڑ میں صرف جونکیں ہی جونکیں نظر آ رہی تھیں۔ انہی جونکوں نے سانپ کو جکڑ لیا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی جونکیں کس طرح گوشت میں پیوست ہو کر خون پیتی ہیں، اس کا علم ہر ایک کو ہوگا۔ خدانخواستہ اگر ایک بھی جونک مجھے لپٹ جاتی تو میں بے دم ہو کر گر جاتی۔

جونکوں کی کلبلاہٹ دیکھ کر بدن میں تھرتھری سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب میں آگے کیسے بڑھوں؟ پتھروں کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا اور پتھروں کی مضبوطی کو آزمانے کا میرے پاس کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہیں تھا۔ میں کیا کروں، ابھی کھڑی یہی سوچ رہی تھی کہ ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ عام طور سے کچھوے پانی میں چلنا زیادہ پسند کرتے ہیں مگر وہ کچھوا میرے عقب سے آیا اور اس نے اُچھال بھری۔ کچھوا سائز میں عام کچھوے سے کافی بڑا تھا۔ وزن میں کم سے کم دس سیر ضرور ہوگا لیکن ایسے اُچھال بھر رہا تھا جیسے وہ کوئی گیند ہو۔ وہ اُچھلتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک پتھر پر پہنچ کر کچھ دیر دم لیتا پھر اُچھل کر دوسرے پر پہنچ جاتا۔ یہ منظر دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کچھوا، جونکوں کی حشر سامانی سے واقف ہے۔ جب اتنا بڑا کچھوا پتھر سے اتنی آسانی کے ساتھ گزر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں گزر سکتی؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے پہلے پتھر پر قدم رکھا اس کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور پھر آگے بڑھنے لگی۔ ایک کے بعد ایک پتھر پر قدم جماتی ہوئی میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ راستے میں کہیں بھی نظریں نیچی نہ کیں کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ کلبلاتی جونکیں نظر آ گئیں تو میں گھبرا جاؤں گی۔ آخری پتھر پر پیر رکھ کر میں نے اُچھال بھری اور اس ٹیلے پر پہنچ گئی جہاں وہ عمارت تھی۔

ٹیلے پر پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ میرا راہبر کچھوا نظر نہ آیا۔ شاید کسی جھاڑی واڑی میں چھپ گیا تھا۔ میں نے اس کچھوے کو ذہن سے جھٹکا اور عمارت کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

وہ عمارت آہستہ آہستہ نزدیک آتی جا رہی تھی۔ اس کا بڑا سا دروازہ بند تھا۔ اس دروازے کی ساخت بالکل ویسی تھی جیسے قلعے کے دروازے کی ہوتی ہے۔ موٹی موٹی چوبیں، لوہے کی پتریاں اور نوکیلی سلاخیں لگی تھیں۔ میں نے اس دروازے پر پہنچ کر اسے کھولنے کے لیے دھکا دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ شاید اندر سے بند تھا۔ میں برابر میں لٹک رہی زنجیر کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اندر جانے کے لیے دروازہ کھولنا ضروری تھا اور یہ دروازہ کیسے کھلے گا، ابھی میں اسی بات پر غور کر رہی تھی کہ مجھے وہ کچھوا پھر نظر آ گیا۔ اس بار وہ بڑی تیزی کے ساتھ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔ میں اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ سیدھے آ کر میرے داہنے پیر سے ٹکرا گیا۔ اس کی ٹکراتی شدید تھی کہ میں سنبھل نہ سکی اور بُری طرح لڑکھڑا گئی۔ لڑکھڑا جانے سے زنجیر کھنچی، زنجیر کھنچتے ہی گڑگڑاہٹ ہوئی اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں اپنی چوٹ بھول گئی اور متشکر نظروں سے کچھوے کو دیکھنے لگی جو مجھ سے پہلے ہی اس عمارت میں بڑی شان سے داخل ہو رہا تھا۔ میں خود بھی اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال کے بعد ایک اور دروازہ تھا۔ میں نے ہال میں قدم رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے برسوں سے وہاں کوئی آیا نہیں ہے۔ میں نے دیواروں پر نظر ڈالی۔ دیواریں بالکل صاف تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے ہر روز کوئی رگڑ رگڑ کر چمکاتا ہے۔

میں نے در و دیوار کا جائزہ لینے کے بعد قدم آگے بڑھا دیئے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میں آخری سرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دروازہ ابھی دور تھا کہ پتا نہیں کہاں سے ایک سیاہ بلی نے سیدھی مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں نے گھبرا کر خود کو فرش پر گرا دیا ورنہ وہ میری گردن پر گرتی پھر بھی اس کے پنجے میرے بالوں سے ٹکرا گئے تھے۔ یقیناً کچھ بال ٹوٹے بھی ہوں گے کیونکہ مجھے جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ پھر سے غراتی ہوئی جھپٹی تھی کہ میں نے لوٹ لگا دی۔ وہ اپنی ہی رَو میں دور جا گری۔ وہ پھر جھپٹی تھی کہ وہی کچھوا جو شاید دھیرے دھیرے آ رہا تھا، یکا یک جھپٹ پڑا۔ اتنی تیزی سے اُچھلا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ گویا اُڑتا ہوا اس بلی پر جا پڑا تھا۔

اب ایک عجیب وغریب معرکہ شروع ہو گیا تھا۔ کچھوے نے اپنے لمبے سے منہ کو کھول کر اس کی پیٹھ میں دانت گاڑ دیئے تھے اور چاروں ہاتھ پیروں سے بلی کو جکڑ لیا تھا۔ بلی اُچھل رہی تھی چیخ رہی تھی لوٹیں لگا رہی تھی مگر کچھوا پیر تسمہ پا بنا ہوا تھا۔ کسی طور اسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ میں ایک طرف کھڑی اس اُچھل کود کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ کچھوے نے جہاں دانت گاڑے تھے، وہاں سے خون کی دھار نکل نکل کر فرش پر بکھر رہی تھی۔ پورا فرش سرخ ہو رہا تھا۔ اب دھیرے دھیرے اس بلی کی مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ چیخ پکار بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ اس بلی کا سر ڈھلک گیا۔

بلی کی سانس اُکھڑتے ہی کچھوے نے اسے چھوڑ دیا اور الگ ہٹ کر بلی کو دیکھنے لگا۔ بلی مر چکی تھی اس بات کا اطمینان کرتے ہی اس نے آخری سرے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ یہ کچھوا میرا مددگار ہے۔ اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دکھایا، پتھروں پر آگے بڑھنے کا طریقہ بتایا یقیناً اسے نسیم یا بابا جی نے بھیجا ہوگا۔ اب میں اس کے پیچھے پیچھے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ سُست رفتاری سے دروازے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ بالکل دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازے کی بجائے برابر کی دیوار پر ٹکر ماری۔ میں نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا اور دیوار پر نظریں جما دیں۔ اوپر ایک کنڈا سا لگا ہوا نظر آیا۔ میں نے اس کنڈے کو پکڑ کر کھینچ لیا پھر وہی پہلے جیسی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور دروازے کے برابر میں ایک اور در کھل گیا۔ یہ دروازہ ایسا تھا کہ اس پر کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑے سے پتھر کو تراش کر دروازے میں فٹ کیا گیا۔ جو بند ہونے کے باعث دیوار کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ اب جو کچھوے کی مہربانی سے وہ در کھلا تو میں حیران رہ گئی تھی۔ میں سمجھ چکی تھی کہ یہ کچھوا کوئی عام کچھوا نہیں ہے۔ یقیناً اسے بابا جی نے بھیجا ہوگا۔ میں اسی کے بارے میں غور کرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ سنگی چوکھٹ کو پار کر کے میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ اندر اندھیرا ہونا چاہیے تھا مگر وہ کمرا جگمگ کر رہا تھا۔ یہ روشنی باہر کی نہ تھی اور نہ وہاں کوئی مشعل یا چراغ روشن تھا یہ روشنی دیواروں سے پھوٹ رہی تھی۔ سنگ سرخ سے بنی دیواروں میں جگہ جگہ چار چار انگلی چوڑے سرخ پتھر جڑے ہوئے تھے۔ ان پتھروں سے وہ روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کون سے پتھر تھے جن کی روشنی سے کمرا نہایا ہوا تھا۔

کچھوا روشنی سے بے پروا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میں بھی اس کی تقلید میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ کچھ آگے جاتے ہی میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ سامنے ہی ایک بڑا سا چھپر کھٹ بچھا ہوا تھا۔ اس چھپر کھٹ پر شاہینہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ میں نے اسے بیدار کرنے کے لیے جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ ایک بار دو بار کئی بار مگر ہر بار ناکام رہی۔ تبھی میرے ذہن میں ایک نیا خیال کوندا اور میں نے زیر لب دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔ حرز ابو دجانہ، حرز جواد اور پتا نہیں کون کون سی دعائیں پڑھ گئی مگر اسے ہوش نہ آنا تھا نہ آیا۔

اب میں کیا کروں، ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ میری نظر اس کے بالوں پر پڑی۔ اس کے بالوں میں ایک سوئی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی میں بُری طرح چونک سی گئی۔ بچپن کی سنی ہوئی کہانیاں یاد آنے لگیں کہ ایک شہزادی کو دیو اٹھا کر لے جاتا ہے اور اس کے سر میں سوئی چبھو کر سلا دیتا ہے۔ جب سوئی نکالی جاتی ہے تو شہزادی کو ہوش آ جاتا ہے۔

کہانی ہمیشہ واقعات سے بنتی ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ میں نے اس خیال کے آتے ہی اس سوئی کو چٹکی سے پکڑا اور بسم اللہ کہہ کر کھینچ لیا۔ حیرت انگیز طور پر لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اور اس کے چہرے پر حیرت و خوشی کے ملے جلے تاثرات اُبھر آئے۔ اس نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو میں نے جلدی سے اسے سہارا دے دیا۔

''باجی! آپ کہاں تھیں؟ میں کہاں ہوں؟'' اس نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوالات کر دیئے تھے۔

''تمہیں یاد نہیں کہ تم یہاں کیسے آئیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں باجی! میں تو اپنے گھر میں کھانا بنا رہی تھی کہ پتا نہیں کیا ہوا کہ سر بُری طرح چکرایا پھر کچھ یاد نہیں۔''

''تم نے کوئی خواب دیکھا تھا'' میں نے اس کے ذہن سے خوف کا اثر زائل کرنے کے لیے کہانی گھڑی۔

''تمہاری امی بتا رہی تھیں کہ تم چولہے کے پاس بیٹھی بیٹھی شاید گرمی سے بے ہوش ہو گئیں۔ پڑوس والے حکیم صاحب کو بلا کر دکھایا تو انہوں نے بڑے حکیم صاحب کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا اور میں تمہیں یہاں لے آئی۔ اب طبیعت کیسی ہے؟''

''طبیعت تو ٹھیک ہے مگر ہم کہاں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کہ ہم محفوظ ہیں اور ابھی گھر چلتے ہیں۔'' کہہ کر کھڑی ہو گئی۔

اندر جانے میں جس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا، ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ شاید حصار ٹوٹ گیا تھا۔ درمیان میں جونکوں کی دلدل تھی وہ بھی ختم ہو گیا تھا اسی لیے میں بڑی آسانی کے ساتھ ٹیلے کو پار کرتی ہوئی تہ خانے کی سیڑھیوں تک آ گئی۔ پھر سیڑھیوں کو طے کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ وہ بڑا سا ہال اب تک خالی تھا۔ وہاں بھی کسی نے راہ میں آنے کی کوشش نہ کی۔ اب آخری مرحلہ عمارت سے باہر نکلنے کا تھا۔ میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز قدموں سے باہر کی جانب چل پڑی۔

باہر نکل کر کھلی فضا میں آئی تو ایسا لگا جیسے میں نے پل صراط پار کر لیا ہے۔ سر سے بہت بھاری بوجھ اُتر گیا تھا۔ یہ علاقہ ایسا نہیں تھا کہ میں خود کو محفوظ سمجھتی اس لیے خود ہی اندازے سے سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔

مرکزی سڑک جو سیدھی اسٹیشن تک جاتی تھی، وہ پہاڑی کی دوسری طرف تھی اس لیے میں نے لڑکی کو ساتھ لے کر پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں نے تھوڑی سی چڑھائی چڑھی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ وہ منظر بہت عجیب سا تھا۔ انسانی ذہن تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چڑھائی پر بنی پگڈنڈی پر یکا یک کئی سوراخ بنے اور ان سے ننھے ننھے سے پودے اُگے پھر وہ پودے دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن گئے۔ ان درختوں نے پوری طرح پگڈنڈی کو گھیر لیا تھا۔ یعنی آگے بڑھنے کا راستہ رُک چکا تھا۔ یقیناً یہ پیٹر شورویر کے سحر کی کارسازی ہو گی۔ یہ سوچ کر میں نے دوبارہ نیچے کی طرف دوڑ

لگا دی لیکن یہ کیا؟ میں جس طرف جاتی ادھر ہی ننھے ننھے پودے پھوٹ اُٹھتے تھے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ شوروِیر ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اوپر نیچے دائیں بائیں بھاگتے ہوئے بالآخر میدانی علاقے میں اُتر آئی۔ پہاڑی سے اُترتے ہی میں نے لڑکی کو ساتھ لے کر دوڑ لگا دی۔ اس وقت میرے دماغ میں بس ایک ہی بات تھی کہ میں کسی طرح اس علاقے سے باہر نکل جاؤں اس لیے میں نے لڑکی کو تقریباً گھسیٹنا شروع کر دیا تھا۔ میں جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مجھے علم تھا کہ شوروِیر اپنی شکست پر تلملا رہا ہوگا۔ جوابی کارروائی کے لیے راہیں تلاش کر رہا ہوگا۔ وہ کسی بھی لمحے کوئی منتر چلا سکتا ہے اسی لیے میں جلد سے جلد اس پہاڑی علاقے سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔

ابھی میں نے بمشکل ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ مشرقی سمت سے اُڑتی ہوئی ایک ہانڈی نظر آئی۔ ہانڈی کا رُخ ہماری طرف تھا۔ میں کانپ اُٹھی اس لیے کہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ ''ہانڈی'' کا وار بہت کاری ہوتا ہے۔ اس کو ساحری کی زبان میں ''اَگنی کنڈ'' کہتے ہیں۔ دشمن کی موت کے لیے آگ سے بھری مٹی کی ہانڈی اُڑائی جاتی ہے۔ بنگال میں ہانڈی چلانا عام سی بات ہے۔ صوبہ بنگال کے بنگالیوں کے علاوہ اس علم کے جاننے والے کہیں اور نہیں ہیں۔ اس نے بھی یہ علم کسی بنگالی سے سیکھا ہوگا۔ اس ہانڈی کو روکنا ہنسی کھیل نہیں تھا پھر بھی میں نے نسیم کو آواز دینا شروع کر دی لیکن وہ تو کسی ایسی جگہ تھا جہاں میری آواز نہیں جا رہی تھی اور ہانڈی تھی کہ دم بدم نزدیک آتی جا رہی تھی۔ اب میں کیسے بچوں، یہی سوچ رہی تھی کہ تبھی ایک معجزہ سا رُونما ہو گیا۔ ایک ایسی کرامت ظاہر ہوئی جو عقل سے پرے کی بات ہے۔ ہم پر گرتی ہوئی ہانڈی کے نیچے ایک عجیب سی رکاوٹ آ گئی۔ ایسی رکاوٹ جس کے بارے میں اگر کوئی مجھے بتاتا تو میں بولنے والے کو جھوٹا کہتی مگر یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اس لیے اس بات کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ شاید آپ کو بھی یقین نہ آئے مگر یاد رکھیں ماورائی قوت بھی ایک چیز ہوتی ہے جو عقل سے ماوراء باتوں کو سچ کر دکھاتی ہے۔ اس وقت جو میں دیکھ رہی تھی، وہ بھی ایک عجیب و غریب بات تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ہمارے سروں سے تقریباً پندرہ بیس ہاتھ اوپر پانی کی ایک جھیل سی آ ٹھہری تھی اور اوپر سے گرنے والی آگ اس کے پانی میں گر گر کر ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

میں نے سن رکھا تھا کہ ''مٹھ'' یا ''اگنی کنڈ'' جس کے نام پر منتر پڑھ کر اُڑائی جاتی ہے اس کی جان لے کر ہی وہ مٹھ لوٹتی ہے مگر یہاں اُلٹا ہوا تھا۔ مٹھ آئی ضرور تھی مگر خود فنا ہو گئی تھی۔ یقیناً یہ فقیر بابا یا نسیم کی کرامت ہوگی۔ میں اس سمت غور کر رہی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے زوردار قہقہہ لگایا ہو۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا جدھر سے آئی تھی۔ وہ پانی کی معلق جھیل ختم ہو چکی تھی اور اب میرے داہنی جانب زمین سے کوئی بیس فٹ اوپر ہوا میں معلق نسیم کھڑا تھا۔ وہی قہقہہ لگا رہا تھا۔

''کیوں مجھے ڈرا رہے ہو؟'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔

''ڈرا نہیں رہا ہوں۔ تمہاری زندگی پر خوشیاں منا رہا ہوں اگر مجھے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو تمہاری کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔'' نسیم نے کہا۔

''جا کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئی۔ چاہے جگ بیری ہوئے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کبیر کا دوہا پڑھا۔

''اب یہاں سے شاہینہ کو لے کر نکلو۔'' نسیم نے کہا تو میں نے شاہینہ کا ہاتھ پکڑا اور سیدھ میں چل پڑی۔ شہر میں پہنچ کر میں نے شاہینہ کو اس کے گھر بھیجا اور خود شمس النہار کے گھر کی طرف بڑھتی چلی گئی کیونکہ میں اب اسی کے گھر میں رہ رہی تھی۔ مجھے جیل سے وہی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی

اور میں تب سے وہیں رہ رہی تھی۔ یوں بھی اب میرا اس دنیا میں ایسا کون تھا جسے میں اپنا کہتی یا جس کا سہارا لیتی۔ جو لوگ اپنے تھے، وہ تو کب کے منہ موڑ چکے تھے۔ اب میرے پاس یہی ایک گوٹ تھی جسے میں کھیل رہی تھی یعنی صرف اور صرف شمس النہار کا سہارا تھا۔ میں اسی لیے اس کے ہاں آ گئی تھی۔ اس وقت گھر میں سب کے سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ کمرے میں آ کر میں بستر پر لیٹ گئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شمسن کی غریبی کو کیسے دور کروں، کس طرح اس کی مدد کروں؟ پرسوں سے میں اسے ہر صبح سو دو سو روپے خرچ کے لیے دے رہی تھی۔

ابھی اسی سوچ میں تھی کہ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے میرے اوپر فوارہ چلا دیا گیا ہو۔ میں سرتاپا شرابور ہو گئی ہوں۔ میں نے اُچھل کر کھڑی ہونے کی کوشش کی تھی کہ میرے کانوں میں مترنم ہنسی کی آواز آئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں بے خبر سو رہی تھی اور اب تک جو کچھ دیکھا تھا، وہ سب خواب تھا۔ میں عجب گرداب میں پھنس گئی تھی۔ میرے ساتھ کب کیا ہو رہا ہے، اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر پا رہی تھی۔ خواب اور حقیقت گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ کبھی خواب حقیقت لگتے اور کبھی حقیقت خواب۔ میں ایک ایسے گورکھ دھندے میں پھنس گئی تھی کہ جس کا سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ شادی کا خواب مزید اُلجھا رہا تھا۔ اب تو مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میں خود بھی خواب نگر کی رہنے والی ہوں اور میرا ہر پل خواب نگر میں ہی بسر ہوگا۔

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ سلیم کی کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں؟ اگر حقیقت ہے تو کیسی ہے؟ کیا واقعی کوئی سلیم میری زندگی میں آ رہا ہے۔ جس کی آہٹ مجھے خوابوں کی شکل میں نظر آ رہی ہے؟ ابھی میں اسی سوچ میں تھی کہ یکایک ہی خلافِ توقع اسی وقت فقیر بابا آ گئے۔ انہوں نے ایک نظر نسیم پر ڈالی تو وہ اس طرح بھاگا جیسے فقیر بابا اس کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑے ہوں۔ اس نے بھاگتے ہوئے مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔

اس کے جانے کے بعد فقیر بابا نے کہا۔ ”اے بٹیا! اب تو تجھے کچھ کچھ ہوش آ گیا ناں...... توبہ کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ خوب خوب استغفار کرو۔ شاید تجھے گناہوں سے رہائی مل جائے۔“

”بابا! میں تو خود شرمندہ ہوں کہ پتا نہیں کس خیال کے تحت گناہوں کی دلدل میں اُترتی چلی گئی تھی؟ میں توبہ کرتی ہوں۔ دل سے توبہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔“

”تجھے معافی مل سکتی ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ غفور الرحیم ہے مگر تُو نے جتنے ادھورے کام چھوڑے ہیں، انہیں پورا کر دے۔“

”بابا! کون کون سے کام؟“

”ہیرادت شورویر کو تُو نے نئی زندگی دی، اسے موت بھی تُو ہی دے گی مگر اس سے پہلے تجھے عرفان کو ختم کرنا ہوگا کیونکہ وہ بھی ہیرادت کا ہرکارہ ہے۔ نسیم نے خودکشی کی ہے۔ اس کی روح بھٹک رہی ہے۔ اس کی روح کے لیے ایصال ثواب کرو ورنہ وہ اسی طرح بھٹکتا رہے گا اور خلق خدا کے لیے عذاب بنا رہے گا۔“

”بابا! میں آپ کا ہر حکم مانوں گی۔“

”جس دن تُو نے تمام کام کر لیے تو تجھے انعام میں سلیم ملے گا۔“

”سلیم! کہیں بابا اسی سلیم کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے تھے جو میرے خوابوں میں آ رہا ہے؟“ اس خیال کے آتے ہی میں نے پوچھا۔

''یہ سلیم کون ہے؟''

''یہ ابھی نہیں بتا سکتا کہ ہر بات کے بتانے کا ایک وقت معین ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ میں آج ہی نسیم کے لیے کچھ کرتی ہوں۔''

میری باتوں نے فقیر بابا کو مطمئن کر دیا تھا۔ وہ اسی طرح لاٹھی ٹیکتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ مجھے معلوم تھا انہیں جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا کیونکہ وہ نادیدہ بن کر آئے ہیں۔

فقیر بابا کو مطمئن کرنے کے بعد میں نے نسیم کو بلانے کی سعی شروع کر دی۔ اسے جیسے ہی میں یاد کرتی تھی، وہ میرے سامنے آ جاتا تھا مگر اس وقت میں نے اسے کئی بار آوازیں دیں لیکن وہ نہ آیا۔

جب میں اسے آوازیں دے دے کر تھک گئی تو لیٹ کر سوچنے لگی کہ وہ آخر آتا کیوں نہیں ہے؟ تبھی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا۔ بہت پہلے جب میں کفر کی دلدل میں پھنسی تھی اور مندر مندر پھر رہی تھی، انہی دنوں میری نظر ایک کتاب پر پڑی تھی۔ وہ کتاب نہیں، مسودہ تھا۔ کسی نے ہاتھ سے لکھا تھا۔ مسودے پر ''کشف'' لکھا تھا۔ میں نے اسے کہانی کی کتاب سمجھ کر اُٹھا لیا تھا۔ اس کتاب میں ارواح سے باتیں کرنے کا عمل بتایا گیا تھا۔ اسی کتاب کا ایک عمل یاد آ گیا تھا بلکہ مجھے اس عمل کی ایک ایک سطر یاد آتی چلی گئی تھی۔ میں نے اس عمل کو کرنے کی ٹھان لی اور جاء نماز بچھا کر ایک خاص وظیفہ پڑھنے لگی۔ واقعی وہ وظیفہ جلالی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے بند آنکھوں کے سامنے ایک حویلی نظر آنے لگی، پھر اس حویلی میں ایک تہ خانہ دکھائی دیا۔ اس تہ خانے کے اندر ایک دیوار میں طاقچہ بنا نظر آیا۔ اس طاقچے میں ایک مرتبان رکھا تھا اور اس مرتبان میں نسیم نظر آیا۔ وہ وہاں قید تھا۔ اب میں سمجھی تھی کہ وہ کیوں میری آواز پر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے وظیفہ بند کر دیا اور جاء نماز سے اُٹھ گئی۔ اس وظیفے نے کسوٹی کا کام کر دکھایا تھا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری توبہ قبول ہو گئی ہے۔ ورنہ مجھ ایسی گناہ گار لڑکی کی دعا کب قبول ہو سکتی تھی۔

میں جاء نماز سے اُٹھ کر دوبارہ بستر پر آ گئی۔ اب میں اس حویلی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ حویلی کون سی ہے؟ کہاں ہے؟ فقیر بابا کی ہدایت تھی کہ نسیم کے ایصال ثواب کی خاطر کچھ کروں تاکہ اسے بھٹکنے سے نجات مل جائے۔ اگر وہ قید رہتا تو میری تمام کوشش بیکار ثابت ہوتی۔ تبھی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے نورالنہار یاد آ گئی۔ میں نے اسی وقت اسے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ آئی تو میں نے کہا۔ ''اچھا نورالنہار! یہ تو بتا عرفان کی حویلی کیسی تھی؟''

نورالنہار نے جب نقشہ بتانا شروع کیا تو میں حیران رہ گئی کیونکہ وہ حویلی بالکل ویسی ہی تھی جسے میں نے خوابوں میں دیکھا تھا۔ اس کا سیدھا مطلب یہی تھا کہ میں عرفان کی حویلی میں جاؤں۔

اس سے دو دو ہاتھ کرنا ضروری ہو گیا تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ خود اس نے مجھے چیلنج کر دیا ہے۔ نسیم کو قید کر کے اس نے مجھے بلاواسطہ للکارا ہے۔ اب مجھے اس سے مقابلہ کرنا ہی ہوگا۔

☆=======☆=======☆

اگلے دن صبح ہی صبح میں بس پر سوار ہوگئی۔ یہ بس ٹنگائل تک جاتی تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے نورالنہار سے عرفان کی حویلی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ٹنگائل بازار میں اُترنے کے بعد میں نے ایک سائیکل رکشہ والے سے بات کی کہ وہ مجھے عرفان کی حویلی تک پہنچادے۔ وہ بارہ ٹکا (روپے) کرائے پر راضی ہوگیا۔ گھر سے دس بجے نکلی تھی۔ دو گھنٹے بس کے انتظار میں گزرے تھے اور تین گھنٹے سفر میں۔ رکشے والے نے ساڑھے تین بجے چلنا شروع کیا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی مگر راستہ اتنا خراب تھا کہ ہر دو فرلانگ کے بعد رکشے والے کو اُتر کر رکشے کو دھکیل کر آگے بڑھانا پڑتا تھا۔ جگہ جگہ کیچڑ پھیلی تھی۔ بنگال اور کیچڑ لازم وملزوم ہیں۔ بارش کا پانی جہاں جمع ہوتا ہے، وہاں کی مٹی ایسی لیس دار ہو جاتی ہے کہ چھڑائے نہیں چھٹتی ہے۔

خدا خدا کر کے ہم اس گاؤں کے نزدیک پہنچے جس کی آبادی سڑک سے شروع ہو کر کافی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں کے آخری سرے پر ایک عالی شان حویلی نظر آ رہی تھی۔

رکشے والے نے رکشہ گاؤں کے باہر سڑک پر روک دیا تھا اور بولا تھا۔ ”بی بی! اب آپ کو یہاں سے پیدل جانا پڑے گا۔“

میں نے رکشے والے کو کرایہ دے دیا۔ وہ رکشہ موڑ کر واپس جانے لگا۔ میں کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر گاؤں کی طرف بڑھ گئی۔ پانچ بج چکے تھے۔ اندھیرا پھیلا نہیں تھا مگر سورج غروب ہو چکا تھا۔ موسم میں خنکی اُتر آئی تھی۔ سردیوں کے موسم میں یوں بھی اندھیرا جلد پھیل جاتا ہے۔

سڑک سے نیچے اُترتے ہی میں نے رفتار بڑھادی تھی، تبھی مجھے ایسا لگا تھا جیسے ایک ننھی سی کرن چمکی تھی جو دھیرے دھیرے گاؤں کے برابر میں پھیلتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلی گئی تھی۔ شاید اس کرن نے اشارہ کیا تھا کہ میں اسی راستے سے آگے بڑھوں اور میں اس پگڈنڈی پر گامزن ہوگئی تھی۔ ابھی میں چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ عرفان نے کوئی چال چلی ہو اور مجھے غلط راستے پر ڈالنے کے لیے یہ کرن بھیجی ہو؟“ نورالنہار نے اس کے متعلق جو کچھ بتایا تھا، اس کے مطابق وہ تنتر منتر میں بہت آگے تھا اور بہت جلد ”گوسوامی“ بننے لگا تھا یعنی تانتروں کا سردار۔ اس نے کم سے کم سو ”بیروں“ کو قبضے میں لے رکھا ہے جو اس کے حکم پر پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے اُٹھا کر پھینک سکتے ہیں۔

میرے دل میں وسوسہ جاگا کہ اس کا سامنا کرنا مجھ اکیلی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ جادو کے زور سے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ابھی میں اسی خیال میں گم تھی کہ وہی کرن دوبارہ نمودار ہوئی اور مجھے کسی غیر مرئی قوت نے اس کے پیچھے جانے پر مجبور کر دیا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھ سے مجھی کو چھین لیا ہے۔ نہ مجھے اپنے دماغ پر اختیار تھا اور نہ قدموں پر۔ میں آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ آگے اور آگے۔ وہ کرن میری رہنمائی کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی جگنو ہو جو میرے آگے آگے اُڑ رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی کوئی نادیدہ قوت بھی مجھے آگے کی جانب دھکیل رہی تھی۔

میں دھیرے دھیرے اس حویلی تک پہنچ گئی۔ اس حویلی تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔

اس حویلی کے دروازے پر پہنچ کر وہ کرن کچھ دیر تک رقص کرتی رہی۔ پھر وہ میری نظروں کے حصار سے نکل گئی۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس

ہوا جیسے میرے اعضاء تن گئے ہوں اور میرے اندر طاقت کا لاوا اُبلنے لگا ہو۔

میں نہایت تیزی سے مرکزی دروازہ پار کر کے اندر پہنچی۔ اس وقت خود مجھے اپنے آپ پر قابو نہ تھا۔ کسی ارنا بھینسے کی طرح پھنکارتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اندر کے مکینوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دوں گی مگر اندر داخل ہوتے ہی میں ٹھٹک گئی کیونکہ اندر کا ماحول حد درجہ پُراسرار تھا پھر بھی میں نے ٹھان لی تھی کہ نسیم کی رہائی کے لیے میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دوں گی۔ ہر قیمت پر میں اسے رہائی دلاؤں گی۔ اس فیصلے کے بعد میں نے بند دروازے کو مزید کھول دیا اور اندر داخل ہوگئی۔ اندر پہنچتے ہی میں ٹھٹک گئی۔ اس ہال نما کمرے کی ایک دیوار میں طاقچہ بنا ہوا تھا۔ اس طاقچے میں ایک انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔ اس کھوپڑی کے علاوہ اس کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا مگر جیسے ہی میں اندر داخل ہوئی، اندر کا ماحول بدل گیا۔ وہ کھوپڑی کسی پرندے کی طرح اُڑی تھی اور چیختی ہوئی مجھ پر جھپٹی تھی۔ میں نے جھک کر خود کو بچایا تھا۔ کھوپڑی کا یوں ہوا میں پرواز کرنا، میرے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس قسم کا شعبدہ میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی پھر بنگال میں ''باٹی چلانا'' ایک عام سی بات ہے۔ ہر گلی کوچے میں ایسے عامل مل جاتے ہیں جو چوروں کا سراغ لگاتے ہیں۔ جائے وقوع پر ایک چھوٹی سی پیالی کو الٹا کر رکھتے ہیں پھر اس پر انگشتِ شہادت رکھ کر کچھ پڑھتے ہیں اور وہ ''باٹی'' یعنی پیالی ہوا میں کسی پرندے کی طرح اُڑنے لگتی ہے اور سیدھی جا کر چور کی پیٹھ پر بیٹھ جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ چور پیدل گیا ہو۔ وہ اگر کسی سواری پر بھاگا ہو تو پھر باٹی گھوم پھر کر واپس آجاتی ہے۔

جب باٹی اُڑ سکتی ہے تو کھوپڑی کیوں نہیں اُڑ سکتی ہے؟ اس سے پہلے بھی میں کھوپڑی کو اُڑتے ہوئے دیکھ چکی تھی اس لیے میں نے اسے اہمیت نہ دی اور خود کو بچاتے ہوئے آگے بڑھی، تبھی ایک اور حیرت انگیز بات رُونما ہوئی۔ کھوپڑی کی سیٹی جیسی آواز گونجتے ہی دیواروں میں بنے سوراخوں سے پھنکارتے ہوئے سانپ اور بچھو نکلنے لگے۔ جوں جوں کھوپڑی کی آواز تیز ہو رہی تھی، سانپ اور بچھوؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے ضروری تھا کہ میں کسی طرح اس کھوپڑی پر قابو حاصل کرلوں۔ اس خیال کے آتے ہی میرے ذہن میں آیات قرآنی گونجنے لگیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے برابر میں فقیر بابا کھڑے ہیں اور مجھے آیات یاد کرا رہے ہیں۔ میں نے بلند آواز میں ان آیات کو پڑھنا شروع کردیا۔

میرے منہ سے مقدس آیات قرآنی بلند ہونے کی دیر تھی کہ وہ کھوپڑی دھم سے زمین پر گری اور تمام سانپ بچھو واپس بھاگنے لگے۔ انہی سوراخوں میں داخل ہونے لگے تھے جہاں سے باہر آئے تھے۔ ان میں سے کئی سانپ اور بچھوؤں کو میں نے اپنے پیروں تلے روندا بھی تھا۔

ابھی تک عرفان سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی، شاید وہ موجود نہیں تھا۔ میں اس کمرے کی ہر اس جگہ کا جائزہ لیتی جا رہی تھی جہاں پر مجھے شبہ تھا کہ وہ مرتبان ہوگا جس میں نسیم کو بند کر کے رکھا گیا تھا۔

مرتبان کی تلاش میں، مَیں نے اس کمرے کا کونا کونا چھان مارا تھا مگر وہ مرتبان کہیں نظر نہ آیا پھر بھی میں نے حوصلہ نہ ہارا اور میں نے مقدس آیات کی تلاوت کرتے ہوئے اس کمرے کے برابر والے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کمرے میں فرش پر ایک دائرہ بنا ہوا تھا جس میں عجیب وغریب شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف چبوترا سا بنا تھا جس پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ میں اس چبوترے پر چڑھ گئی، تبھی میری مراد پوری ہوگئی۔ مجھے وہ مرتبان نظر آگیا جس میں نسیم بند تھا۔

اسے دیکھتے ہی میں تڑپ اُٹھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ بھی تھا، مگر کئی مشکل مراحل پر اس نے میری امداد کی تھی۔ مجھے طاقت کا خزانہ بنا دیا تھا کہ میں جب اور جس طرح چاہتی تھی، لوگوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیتی تھی۔ کئی بار اسی کی مدد سے میں نے ناممکن کو ممکن بنایا تھا۔

میں نے اس مرتبان کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میرا ہاتھ اس مرتبان تک پہنچ نہ پایا۔ اس لیے کہ اس مرتبان کے گرد انجانی طاقتوں کی غیر مرئی دیوار کھڑی تھی۔

نسیم میرے سامنے تھا۔ بالکل ایک گڈے جیسا جو ایک مرتبان میں بند تھا اور نہایت بے بسی سے آڑا تر چھا پڑا تھا۔ اسے میں کیسے آزاد کراؤں، اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس غیر مرئی دیوار نے مجھے پوری طرح مجبور بنا دیا تھا۔ اس وقت مجھے ایسے کئی پنڈت یاد آ رہے تھے جنہوں نے مجھے جادو سکھانے کے کئی مواقع دیئے تھے مگر میں نے انہیں ضائع کر دیا تھا۔ مجھے پنڈت تو تارام یاد آیا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ مجھے دنیا کی سب سے بڑی جادوگرنی بنا دے گا مگر میں نے اس کی بات ٹھکرا دی تھی اور اب میں سوچ رہی تھی کہ کاش، میں نے وہ سب کچھ سیکھ لیا ہوتا جو اس نے مجھے سکھانا چاہا تھا تو آج میں بے بس نہ ہوتی۔

میں نے اس حصار کو توڑنے کی بہت کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہی۔ اسی ناکامی نے مجھے وحشی بنا دیا تھا اور میں نے اس کمرے کو تہس نہس کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بدمست ہاتھی کی طرح اس کمرے کی ہر چیز کو پیروں سے روندنا شروع کر دیا۔ میرے سامنے جو کچھ بھی آ رہا تھا، اسے ٹھوکروں سے اُڑاتی جا رہی تھی، تبھی چبوترے پر رکھا ہوا بلوریں گولہ میری ٹھوکر سے اُڑ کر دیوار سے ٹکرایا اور چُور چُور ہو گیا۔ اس گولے کے ٹوٹتے ہی میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ مرتبان اپنی جگہ سے خود ہی باہر نکل آیا۔ میں نے دوڑ کر اسے اُٹھا لیا اور باہر کی جانب دوڑی۔

رات کا ملگجا اندھیرا ہر سُو پھیل چکا تھا۔ میں مرتبان کو ہاتھ میں اُٹھائے تیزی سے باہر کی سمت کھیتوں کی طرف دوڑ رہی تھی۔ مرتبان کے گرد غیر مرئی قوت کا حصار اب تک قائم تھا۔ وہ مرتبان میرے ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی اس کی سطح میری انگلیوں سے دور تھی اور میری انگلیاں اس حصار کو محسوس کر رہی تھیں۔ میں جلد سے جلد وہاں سے دور نکل جانا چاہتی تھی تاکہ عرفان کے آنے سے پہلے میں اس کی حدود سے نکل جاؤں کیونکہ پتا نہیں وہ کمبخت کتنا کچھ جانتا ہو۔ سیانے کہتے ہیں ”جو بچھو کا جھاڑ نہ جانتا ہو، اسے سانپ کے بل میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔“ اور یہاں تو بچھو کا منتر بھی معلوم نہ تھا۔ یہ تو میری قسمت تھی کہ بڑے بڑے تنتر منتر جاننے والوں کے جال سے نکل رہی تھی ورنہ میری حقیقت کیا تھی۔ نہ مجھے صحیح طور پر قرآن پاک کا علم تھا اور نہ جادو منتر کا یعنی میں جیک آف آل ٹریڈرز (ہر فن مولا) تھی، لیکن ماسٹر آف نن بھی تھی۔ میری شان تو یہ تھی کہ کبھی شوروبر مجھے سہارا دیتا تھا تو کبھی نسیم اور کبھی فقیر بابا۔ میری اپنی قوت تو صفر تھی۔ میں اس کا مقابلہ کیسے کرتی، اسی لیے فرار ہی مجھے بہتر راستہ نظر آیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور میں نوکیلے پتھروں پر کیچڑ بھری پگڈنڈیوں پر ہری بھری فصلوں کے درمیان دوڑتی جا رہی تھی۔ عرفان سے ابھی تک میرا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ ابھی تک میری طرف سے غافل ہے ورنہ وہ میری تلاش میں ضرور دوڑ آتا۔ میں دوڑتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس مرتبان کے گرد جو حصار ہے، اسے توڑنے کے لیے کسی قابل شخص کی مدد لینی پڑے گی۔

میں اپنے خیالوں میں گم بھاگتی جا رہی تھی کہ ایک اُبھرے ہوئے پتھر سے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گری۔ میرے ہاتھ سے مرتبان

چھوٹ کر دور جا گرا تھا اور گرتے ہی چھنا کے سے ٹوٹ گیا تھا۔ چھناکے کی آواز ہوتے ہی مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ میں بھی کتنی بے عقل تھی۔ اب تک جسے میں حصار سمجھ رہی تھی، وہ انتہائی شفاف شیشے کا جار تھا جس میں نہایت نفاست سے اس مرتبان کو رکھ کر جوڑ دیا گیا تھا۔

جار کے ٹوٹتے ہی مرتبان باہر آ گیا تھا۔ اس مرتبان میں نسیم کی روح بند تھی۔ اب میں اسے آزاد کرا لوں گی، اس احساس نے میرے اندر خوشی بھر دی تھی۔ خوشی کے ان دیکھے جذبے سے میرا دل دھڑک اُٹھا تھا۔ میں نے مرتبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تھا۔ مجھ پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری تھی۔ میں نے کانپتی نظروں سے نسیم کے بے حس وجود کو دیکھا اور لرزتے ہاتھوں سے اس کے ڈھکنے کو پکڑا اور نسیم کو آزاد کرانے سے پہلے خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

اچانک مجھے کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی دھمک نہایت تیزی سے قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ زرد کپڑوں میں ملبوس ایک چھریرے بدن کا نوجوان میرے قریب آتا جا رہا تھا، تبھی میرے کانوں کے نزدیک کسی کی سرگوشی سنائی دی۔ ''مرتبان کا ڈھکن کھول دو، جلدی کرو۔'' مگر میں تو پتھر کی مورت بن چکی تھی۔ ہاتھ پیروں کی قوت سلب ہو کر رہ گئی تھی جبکہ میرے ایک ہاتھ میں مرتبان تھا تو دوسرا ہاتھ ڈھکن پر تھا۔ میں بس ڈھکن کھولنے ہی والی تھی کہ وہ نوجوان میرے سر پر پہنچ گیا۔

''لڑکی...... یہ مرتبان مجھے دے دو۔'' اس نے سرخ انگارہ آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ گو کہ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ شکل دھندلی نظر آ رہی تھی، پھر بھی اس ملگجے اندھیرے میں اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے جیسی نظر آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے غیر مرئی شعاعیں سی نکل رہی تھیں جس نے میرے ذہن کو قابو میں کر لیا تھا۔ میں پتھر کی طرح بے حس بن چکی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں کیا کروں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مرتبان کو پکڑے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ ''لڑکی یہ مرتبان مجھے دے دے۔''

''اور اگر نہ دوں تو؟'' پتا نہیں کیسے یہ الفاظ میری زبان سے پھسل گئے تھے۔

''تو...... تو مجھے چھیننا پڑے گا۔ تمہیں سزا دینی پڑے گی۔''

''کس بات کی سزا؟ کیا اس بات کی کہ میں تمہیں ظلم کرنے سے نہ روکوں؟ کیا اس بات کی سزا کہ میں تمہیں کفر کرنے کی چھوٹ دے دوں؟ نہیں جناب! میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تم مجھے روک سکتے ہو تو روک لو۔''

''لڑکی تُو اپنی حد سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر میں چاہوں تو تجھے جلا کر بھسم کر دوں، خاک کر دوں۔''

''تجھے اگر اپنے شیطانی علم کی طاقت پر ناز ہے تو مجھے رحمٰن کی قوت پر اعتبار ہے۔ نمرود کو اس نے ایک معمولی مچھر سے سزا دلائی تھی۔ یقیناً تیری تباہی کے لیے مجھ جیسی کمزور لڑکی کا انتخاب ہوا ہے۔ تُو مجھے بھسم کیا کرے گا، میں خود تجھے ختم کر دوں گی۔''

''یہ مرتبان میرے حوالے کر دو۔'' اس نے کھرکھراتی آواز میں پھر حکم دیا۔ اس کی آواز میں ایسا کچھ تھا جس نے مجھے چونکا دیا۔ میرے دماغ پہ اس کا قبضہ تھا۔ جسم میرا ساتھ دینے کی بجائے اس کے حکم کو قبول کرنے پر اُتر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ میں آنکھیں چرانے کی کوشش بھی نہ کر سکی۔ گویا ہماری نظریں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔

''تم اس وقت میری غلام ہو۔ میں جو کہوں گا، اسے تم پورا کرو گی۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بار بار اسی جملے کو ادا کر رہا تھا اور میں خود کو مجبور سے مجبور ہوتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ شاید اسی کو ''ہپناٹزم'' کہتے ہیں کیونکہ میں اس کی ''معمول'' بن چکی تھی۔ جب اسے پوری طرح یقین آ گیا کہ میں اس کا معمول بن چکی ہوں تو اس نے مجھ پر سے نگاہیں ہٹالیں اور میں اسی لمحے اس کی نگاہوں کے سحر سے نکل آئی مگر اسے محسوس ہونے نہیں دیا کہ میں اس کے سحر سے نکل آئی ہوں۔ وہ جو جو کہتا جا رہا تھا، میں کرتی جا رہی تھی۔

میں ڈر رہی تھی کہ کہیں راز کھل نہ جائے۔ اس دوران میں سوچ رہی تھی کہ میں کس طرح اس سے چھٹکارہ حاصل کروں؟ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھوں گی۔ مرتبان اب تک میرے ہی قبضے میں تھا۔ مجھے موقع کی تلاش تھی۔ جیسے ہی وہ غافل ہوتا، میں داؤ لگا دیتی۔ بالآخر مجھے موقع مل ہی گیا۔ مجھے فقیر بابا کا عکس نظر آیا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے انہوں نے اسے دھکا دیا ہو۔

یکا یک وہ لڑکھڑایا تھا۔ جیسے ہی اس کا سر جھکا، میں نے پوری قوت سے مرتبان کو اس کے سر پر دے مارا۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح سلوموشن میں گرتا چلا گیا تھا۔ اس کی چیخ کافی بلند تھی۔ اس چیخ پر مجھے دہل جانا چاہیے تھا کہ کہیں حویلی کے نوکر چاکر نہ آ جائیں مگر میں رُکی نہیں تھی اور نہ ڈری تھی۔ پے در پے ٹوٹے ہوئے مرتبان سے اس کے سر پر نقارہ بجاتی رہی تھی اور کھٹ کھٹ کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔

مرتبان چُور چُور ہو چکا تھا۔ شیشے کے کئی ٹکڑے نوکدار خنجر کی طرح اس کے سر میں دھنسے ہوئے تھے۔ جوش میں، مَیں یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس مرتبان میں نسیم قید ہے۔

جب حواس کچھ درست ہوئے، ہوش نے ہاتھ تھاما تو میں رُکی تھی اور نسیم کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائی تھیں۔ میں اسے زمین پر تلاش کر رہی تھی کہ میرے سر پر آواز گونجی۔ ''کیا دیکھ رہی ہو پارٹنر؟ میں یہاں ہوں اور میرا مشورہ ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو، بنگال کی حدود سے نکل چلو۔''

''کیوں بھئی...... کیا میں بزدل ہوں؟''

''نہیں پارٹنر! تم تو ہنٹر والی حسینہ بے لگام ہو مگر اس وقت تمہیں میری بات مان لینی چاہیے۔''

''تو ایسا کرو ناں کہ تم مجھے یہاں سے اُٹھا کر ڈھاکا کی حدود میں رکھ آؤ۔''

''محترمہ قتالہ بنگال، اگر اپنے آپ سے محبت ہے، زندگی بچانا چاہتی ہیں تو پوری قوت سے سڑک کی طرف دوڑیں ورنہ عرفان کے آدمی آپ کی تکہ بوٹی کرنے کے لیے آ جائیں گے۔ عرفان کی آواز حویلی تک پہنچ چکی ہے، پھر وہاں قید اس کے تمام مؤکل اور قیدی آزاد ہو گئے ہیں۔ انہی کی وجہ سے حویلی کے ملازمین ابھی اندر پھنسے ہوئے ہیں۔ یہی موقع ہے، فائدہ اُٹھالیں۔''

''تم میری مدد کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

''اس وقت میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ کئی دن سے قید تھا ناں، وہ کمینہ منتر پڑھ پڑھ کر میری طاقت کم کر رہا تھا۔ مجھے نئی توانائی حاصل کرنے کے لیے اکیلے ہی جانا ہوگا۔ میں اپنا وزن اُٹھا نہیں پا رہا ہوں تو پھر تمہارا وزن کیسے اُٹھاؤں گا۔''

سامنے عرفان کی لاش تھی اور اس کے سر سے بھل بھل اُبلتا خون تھا۔ اتنا خون کوئی اور لڑکی دیکھ لیتی تو تڑ سے گر کر بے ہوش ہو جاتی مگر میں

تو ہر قسم کے حالات سے گزر چکی تھی اس لیے میرے اندر جو خوف کی لہر اُٹھی تھی اس کا گلا گھونٹ کر میں کھیتوں کے درمیان دوڑتی چلی گئی۔

کتنی دیر تک میں دوڑتی رہی تھی، اس کی خبر نہ تھی۔ جان پر بن آتی ہے تو وقت کا اندازہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں بس دوڑے چلی جا رہی تھی۔

☆=======☆=======☆

بھاگتے وقت میں بوتل اُٹھانا نہیں بھولی تھی۔ باہر آتے ہی میں نے اس ٹوٹی ہوئی بوتل پر نظر ڈالی مگر یہ دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کہ وہ ٹوٹی بوتل خالی تھی۔

میں دہشت ناک نظروں سے خالی بوتل کو دیکھ رہی تھی جس میں تھوڑی دیر قبل نسیم کا جسم موجود تھا کہ اچانک مجھے سر کے بالوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا تو نسیم کو موجود پایا۔ وہ میرے سر پر اُڑ رہا تھا مگر ابھی تک اتنا ہی بڑا تھا جتنا بڑا وہ بوتل میں نظر آیا تھا۔ میں نے حیرت بھری آواز سے پوچھا۔ ''ہاں...... یہ کیا تمہاری جسامت منجمد ہو گئی ہے؟''

وہ فوراً ہی سامنے اُتر آیا، پھر بولا۔ ''نہیں...... یہ تو میرے اختیار میں ہے۔ میں تو تم سے دل لگی کر رہا تھا۔ دراصل مجھے اب احساس ہوا ہے کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' پھر وہ واقعی رونے لگا تھا۔ میں نے اسے رونے دیا۔ جب وہ جی بھر کر رو لیا تو کچھ حد تک پُرسکون ہو گیا اور تب اس نے انگڑائی لے کر اپنے جسم کو پھیلانا شروع کر دیا۔ جب وہ مکمل طور پر انسانی قد و قامت میں آ گیا تو میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔

اب جو میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ برسوں کا مریض معلوم ہوا۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر کانپ اُٹھی۔ تڑپ اُٹھی۔

''تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' میں نے مغموم لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری جدائی نے میرا خون نچوڑ لیا ہے۔'' اس نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم ایسے نہیں تھے؟'' میری نظروں نے والہانہ انداز میں اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''تم میری آنکھوں میں کھوئی ہوئی تھیں اس لیے میرے چہرے کی زردی کو محسوس نہ کر سکیں۔''

''یہ رومانوی کہانیوں کے کردار کی طرح ڈائیلاگ مت بولو۔ سیدھے سیدھے جو کہنا ہے کہتے رہو۔''

میری ڈانٹ پر وہ مسکرانے لگا۔ اس کی اٹکھیلیاں بدستور جاری رہیں۔

''تمہاری اگلی منزل کون سی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں تمہیں اس پہاڑ پر لے جانا چاہتا ہوں جہاں تابوتِ مقدس ہے اور اسی میں شورویر کی موت کا سامان ہے۔'' نسیم نے بتایا۔ ''لیکن اس کے لیے تمہیں ایک طویل سفر طے کرنا ہوگا۔''

''لیکن تم تو شورویر کے دشمن نہیں تھے؟''

''دشمنی کی ابتداء اسی نے کی ہے۔ اسی نے عرفان کو اُکسایا تھا۔ اسے بتایا تھا کہ تم سے محفوظ رہنے کا بس ایک طریقہ ہے کہ مجھے قبضے میں کر

لیا جائے۔ اس طرح تم کمزور ہو جاؤ گی۔"

"گویا تمہاری قید کا اشارہ شوردیر نے دیا تھا اسی لیے تم اس کی موت کا سامان کر رہے ہو۔"

"کچھ بھی سمجھ لو۔ میں کسی کا اُدھار نہیں رکھتا۔"

"تو چلو......"

"میں ان راستوں کی نشاندہی کردوں گا جو اس غار تک پہنچتے ہیں۔"

"تو کیا تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں...... بلکہ میں تم سے پہلے وہاں موجود رہوں گا پھر اسی راستے پر تم سے آن ملوں گا۔ اس طرح ہم دونوں کو انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

پہلے تو میں نے رد کیا مگر پھر مان گئی اور اس نے ان راستوں کی نشاندہی کرنا شروع کردی جن پر چل کر مجھے جانا تھا۔ ان راہوں میں پھول بھی تھے اور کانٹے بھی، پتھر بھی تھے اور ریت بھی، جنگل بھی تھے اور دریا بھی۔ مجھے ان سب کو پاٹنا تھا۔ ان راہوں کو عبور کرنا تھا تاکہ جلد سے جلد شوردیر پر فتح پاسکوں۔

اس نے میرے سر کے گرد ایک چکر لگایا۔ آنکھوں میں پیار کا سمندر لیے میری جانب دیکھا اور پھر یکا یک غائب ہوگیا۔ ایسے جیسے کسی نے جلتے ہوئے بلب کا بٹن دبا دیا ہو۔

اس کے جاتے ہی میں نے بھی اپنا سفر شروع کردیا۔ آگے ہی آگے بڑھنے لگی۔ صبح سورج طلوع ہوتا اور سارے دن کا سفر کر کے چاند کے طلوع ہونے سے پہلے ہی ڈوب جاتا۔ رات ڈھل جاتی مگر میں نہ رُکتی۔ مسلسل چلے جارہی تھی۔ اگر رُکتی بھی تھی تو چند گھڑی کے لیے تاکہ کچھ دیر آرام کرلوں۔"

میں اسی راستے پر بڑھتی چلی جارہی تھی جس کی نشاندہی نسیم نے کی تھی۔

کئی میدانوں اور دریاؤں کو پار کرنے کے بعد میں ایک جنگل میں پہنچی۔ جنگل کا سفر انتہائی اذیت ناک اور تکلیف دہ محسوس ہورہا تھا۔ ہر طرف کٹیلی جھاڑیاں تھیں جن سے بچ کر چلنا ناممکن سی بات تھی۔ میرے تمام جسم پر خراشیں آرہی تھیں پھر بھی میں آگے بڑھتی جارہی تھی۔ پاؤں لہولہان ہوگئے تھے۔ چہرے پر بھی جابجا زخم آگئے تھے۔ مگر میں رُکی نہیں تھی۔

میں نے ذہن سے زخموں کی جلن کے احساس کو مٹانے کے لیے تصور میں اس بات کو لانا شروع کردیا کہ میرے مصائب کا اب خاتمہ قریب ہے۔ جس بدبخت نے میری زندگی سے خوشیوں کی رمق تک نچوڑ لی ہے، اس کا خاتمہ ہونے ہی والا ہے۔ اتنی سی دیر میں مجھے چھٹی کا دودھ یاد آگیا تھا۔ تین دن سے متواتر سفر کررہی تھی مگر اتنی کوفت، اتنی دشواری کا احساس نہیں ہوا تھا جو اس جنگل میں ہورہا تھا۔ خدا خدا کر کے آگ برساتا سورج چھپا۔ پتا نہیں، اس جنگل میں ایسی کیا خاصیت تھی کہ پتوں سے چھن کر آنے والی دھوپ برچھی کی انی جیسی جسم میں اُتر جاتی تھی۔ دھوپ کی تمازت ختم ہوئی تو میں نے شکر کی سانس لی۔

رات کے وقت چاند نے اپنی ٹھنڈی کرنوں سے میرے پاؤں کے زخموں پر مرہم رکھا اور خوشگوار ہوا کے جھونکے مجھے لوریاں

سنانے لگے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک پیڑ کے اوپر چڑھ کر ایک متوازن جگہ پر ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی۔ کھردرے تنے کی کٹیلی چھال، نرم بستر جیسی محسوس ہوئی۔ اس عجیب روزگار بستر نے مجھے احساس دلایا کہ میں کئی دنوں سے سفر کررہی ہوں۔ اب مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ اگرچہ نیند بھی میری مرضی کے خلاف نہیں آسکتی تھی، پھر بھی میری پلکیں بوجھل بوجھل سی ہورہی تھیں۔

مجھے رات کو اپنے سفر کا ایک طویل حصہ ختم کرلینا چاہیے تھا کیونکہ صبح یہی جنگل پھر سے جہنم میں تبدیل ہوجاتا۔ دھوپ کی تمازت جلد کو جلانے لگتی۔ لہٰذا میں نے پھر سے خود کو نئے سفر کے لیے تیار کرنا شروع کردیا اور پیڑ سے اُتر کر ایک بار پھر تیزی سے روانہ ہوگئی۔ دو گھنٹے کے آرام نے بدن میں تازگی بھردی تھی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ تارے اسے اپنے جلو میں لیے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہر سُو ٹھنڈی میٹھی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے دور کچھ سائے نظر آئے جو چاند کی روشنی میں متحرک نظر آرہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تعداد میں تین تھے۔ میں نے ان کی زیادہ پروا نہ کی اور اپنا سفر جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ میں ان کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

وہ رقص کرنے کے انداز میں اُچھل رہے تھے۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر گوشت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ہڈیوں کے پنجر ایسے نظر آرہے تھے۔ وہ بے ہنگم آواز میں کوئی جاپ کررہے تھے۔ میں ان کے قریب سے قریب تر ہوتی گئی پھر نزدیک پہنچ کر میں رُک گئی اس لیے کہ ان کی آواز عجیب و غریب اثر دکھا رہی تھی۔ اس کے صوتی اثرات کچھ ایسے تھے کہ مجھے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''خاموش ہوجاؤ......'' میں حلق پھاڑ کر چیخی مگر ان کے انہماک میں کوئی فرق نہ پڑا اور وہ بدستور چیختے ہوئے رقص کرنے میں مشغول رہے۔ ان کی آوازیں میری سماعت پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر چیخ کر انہیں خاموش کرانے کی کوشش کی مگر اس بار بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر میں ان کے قریب پہنچ گئی اور ایک بوڑھے کو پکڑنے کی کوشش میں ہاتھ آگے بڑھایا مگر کسی نادیدہ قوت نے مجھے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ اسی لمحے ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ میری آنکھوں اور نتھنوں میں مٹی کے ذرات بھر گئے اور میں درد کی شدت سے زمین پر لوٹنے لگی۔ بوڑھوں کی آواز یکدم بند ہوگئی۔ شاید انہوں نے رقص بند کردیا تھا پھر مجھے اپنی آنکھوں پر ایک استخوانی ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا اور مٹی کے ذرات تیرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک بوڑھا شفقت آمیز انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

''اُٹھو بہادر لڑکی! تمہاری مدد ہمارے لیے باعثِ مسرت ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھڑا کردیا۔

''تم سب کون ہو اور یہاں کیا کررہے ہو؟'' میں نے ایک انگلی سے ناک کے ایک نتھنے کو بند کرکے چھینکنے کی کوشش کی تاکہ ناک میں پھنسی دھول مٹی نکل جائے۔

''ہم دنیا کو چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ آؤ تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہوجاؤ۔''

''نہیں...... میں نسیم کی تلاش میں جارہی ہوں۔''

''کیا تم نے ''خود'' کو تلاش کرلیا ہے جو ایک معمولی روح کی تلاش میں دیوانی بنی پھر رہی ہو؟''

''معمولی روح...... تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ نسیم بے پناہ قوت کا مالک ہے۔''

''بے پناہ قوت حاصل کرنے کے لیے خود کو مٹانا پڑتا ہے۔ خود کو فنا کردو تو قوتیں تمہاری تلاش میں سرگرداں ہو جائیں گی۔ جدھر نظر اُٹھاؤ گی، مافوق العقل طاقتوں کو اپنا منتظر پاؤ گی۔''

''مجھے تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ مجھے جانے دو تاکہ میں نسیم تک پہنچ سکوں۔''

پھر ایک عجیب تماشا ہوا۔ بوڑھے نے آنکھیں بند کر کے ہوا میں ''چھو'' کیا۔ میں نے دیگر بوڑھوں کو دیکھا، وہ بھی اسی طرح ''چھو'' کر رہے تھے۔ ان کی ہر ''چھو'' کے ساتھ فضا میں ایک نسیم نمودار ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہر سُو نسیم ہی نسیم نظر آنے لگے۔ میں اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بوڑھا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''دیکھ لیا تم نے، ایک نسیم کی تلاش میں ہو اور ہم نے تمہارے سامنے کتنے ہی نسیم لا کھڑے کیے۔ اگر تم بھی ہمارے گروہ میں شامل ہو جاؤ گی تو نسیم کے خالق تک پہنچ جاؤ گی اور جب خالق کو پالو گی تو پھر اس کی ہر تخلیق تمہاری مطیع ہو جائے گی۔''

میں حیرت و خوف کے ملے جلے تاثر سے آسمان کی جانب دیکھ رہی تھی جہاں ہر سُو نسیم کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نظارے نے مجھے ان بوڑھوں کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا اور میں بھی اس رقص میں شامل ہو گئی۔ آہستہ آہستہ نسیم کے تمام ہیولے غائب ہوتے چلے گئے۔

ہم نے تمام رات رقص کیا۔ صبح کی روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ ان بوڑھوں نے رُکنے کا اشارہ کیا اور مٹی پر بیٹھ گئے۔ ان کی تقلید میں رات بھر اس طرح رقص کرنے اور جاپ کو پورا کرنے پر میرے پورے وجود میں ایک عجیب قسم کا سُرور طاری تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رقص کبھی ختم نہ ہو۔ میرے پورے وجود پر ایک عجیب قسم کا سُرور طاری کر دیا تھا۔

سورج نے آگ برسانا شروع کر دی۔ وہ بوڑھے اطمینان سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے جیسے سستا رہے ہوں۔ میں بھی بیٹھ گئی تھی مگر میرے بیٹھنے کا دورانیہ بہت کم تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر آگ سی بھر گئی ہو۔ ایک پارہ سا رگوں میں دوڑنے لگا ہو جو مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر میں مجبور ہو کر اُٹھ گئی اور اکیلے ہی اکیلے دھمال ڈالنے لگی۔ مجھے کچھ بھی ہوش نہ تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں؟ بس مجھے اچھا لگ رہا تھا اسی لیے ''حق! حق!'' کی تال پر اُچھل رہی تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے، کس لیے ہو رہا ہے، میں خود نہیں جانتی تھی۔ میرے دل و دماغ سے نسیم کا بھی خیال محو ہو گیا تھا۔ میں یکسر بھول گئی تھی کہ مجھے مقدس تابوت تک پہنچنا ہے جہاں پہنچنے کی پہلے بھی میں نے کئی بار کوشش کی تھی مگر اس بار کی نوعیت الگ تھی۔ پہلے میں مقدس تابوت تک پہنچ کر شورویر کی زندگی حاصل کرنا چاہتی تھی مگر اب میں اس کی موت کا سامان کرنے جا رہی تھی۔ میرے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر نسیم پہلے ہی جا چکا تھا اور بقول اس کے وہ راہ میں میرا منتظر ہو گا۔

میں حق حق کی تال پر رقص کر رہی تھی۔ ذہن سے سب کچھ محو ہو چکا تھا۔ اگر کچھ یاد تھا تو بس اتنا کہ میں تخلیق کے خالق کو پالینا چاہتی ہوں۔ اب تو نسیم کی یاد بھی ذہن سے مٹ چکی تھی۔ میں یہ بھی بھول چکی تھی کہ مجھے شورویر کو فنا کرنا ہے۔ اس شورویر کو جس نے میری زندگی تباہ کی ہے اور اس کی تباہی مشروط ہے تابوتِ مقدس سے جو ارکان کے جنگل میں کسی پگوڈا میں محفوظ ہے۔ اس کے تباہ ہوتے ہی شورویر خود فنا ہو جائے گا مگر میں تابوت مقدس کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔ مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ ڈھاکا سے نکلی تھی چٹاگانگ کے لیے اور اب ارکان کے جنگل میں بھٹک رہی تھی۔ نسیم کے ہوشیار

کرنے کے باوجود میں ان تارک الدنیا حضرات کے ساتھ شامل ہوگئی تھی اور مسلسل حق حق کی تال پر دھمال کر رہی تھی۔

دل میں بھڑکتی آگ کے بے کراں سمندر میں میری ہڈیاں تڑخ رہی تھیں۔ میرے ایک مشت وجود کا ایک ایک ذرہ گویا راکھ بن کر بکھرتا جا رہا تھا۔ میں نے خود کو تھامے رکھنے کے لیے بہت سعی کی مگر میں بکھرتی گئی حتی کہ میری آنکھیں بھی بھوبھل بن گئیں۔

اس تپش میں لذت تھی، اس کرب میں سرور تھا اس اذیت میں قرار تھا میری تمام بے قراریاں فنا ہو گئیں، بے تابیاں دم توڑ گئیں، ایک عجیب وغریب خمار لیے میں نے ہوش وحواس کی دنیا سے اپنا رشتہ یکسر منقطع کر دیا۔ بس آخری بات جو محسوس ہو رہی تھی وہ میرے جسم کی پرواز تھی جو آوارہ ذروں کی طرح رقص کرتی ہوئی نہ جانے کون سے سفر پر گامزن ہوگئی تھی۔

نسیم کے ہوشیار کرنے کے باوجود میں فنا ہوگئی تھی۔ مٹ گئی تھی پھر بھی اپنے ہونے کو محسوس کر رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ کی ایک عجیب وغریب آواز کا احساس مجھے اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ میں اس بات کا یقین کرلوں کہ میں نے فنا کے بعد بقا کی منزل حاصل کر لی ہے۔ میں احساس کے طوفان میں تنکے کے مانند اس کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ خس وخاشاک کی طرح اُڑتی میں ایک ایسی منزل تک آ گئی تھی جہاں سرخ، نارنجی، سیاہ اور سنہرے لاوے کا ایک سیلاب تھا جو ہر طرف اُمنڈا پڑ رہا تھا۔ جس نے کسی ممتا کی ماری ماں کی طرح مجھے اپنے سینے سے چمٹایا اور تھپکیاں دیتے ہوئے اپنا ہی ایک حصہ بنا لیا۔ اس کی گود میں سر رکھے میں گہری نیند کے سرور میں مدہوش ہوگئی۔

☆======☆======☆

جب آنکھ کھلی تو دھرتی نے میرے جسم کو تھام رکھا تھا۔ میں کسی نومولود بچے کی طرح اس کی چھاتی سے لپٹی ماں کی ممتا کے مزے لوٹ رہی تھی کہ ایک بے ہنگم شور نے خاموشی کے ایوانوں میں گھنٹیاں سی بجادیں۔ یہ ان بڑے بڑے پتھروں کے لڑھکنے کا شور تھا جو میری مخالف سمت گر رہے تھے۔ میرا وجود ایک بار پھر ظہور میں آ گیا تھا۔ محسوسات اور احساسات کی تشنگی مٹ گئی تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میری نظر اپنے جسم پر پڑی تو سرخ و سپید رنگت نے میری ہی آنکھوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ جسم اندر کی آگ میں جل کر آگ ہی کی طرح سرخ ہو گیا تھا اور اس سرخی میں چاندی کی چمک یوں لگتا تھا جیسے سونے اور چاندی کو گوندھ کر میرا پیکر تراش دیا گیا ہو۔

پہاڑوں کی چٹیل سطح پر کئی بار میرے پاؤں پھسلے اور کئی بار میں گہری کھائی میں گرتے گرتے بچی۔ ہر طرف ایک بے کراں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سکوتِ صبح، اَزل کا سا سناٹا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کائنات کی تخلیق کا پہلا مرحلہ میرے وجود کے ساتھ طے ہوا تھا کیونکہ اردگرد کسی بھی ذی روح کا احساس نہیں ہو رہا تھا گو میں نے فی الحال اپنی منزل کا تعین نہیں کیا تھا۔ پھر بھی میرے بے تاب قدم پتھروں کو روندتے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ پہاڑوں سے نیچے دور ایک وادی میں سرسبز درخت لہلہا رہے تھے۔ میں نے اپنا رخ بدلا اور اپنے قدم اس وادی کی جانب موڑ لیے۔

ان درختوں کے میٹھے اور لذیذ پھلوں کو میں نے اپنی شکم سیری کا وسیلہ بنایا اس حسین وادی میں حُسنِ فطرت ہر سُو بکھرا پڑا تھا اور میں تن تنہا وہاں یوں گھوم رہی تھی جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ مجھے وہاں بھی اپنے علاوہ کوئی دوسرا ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھومتے گھومتے میں ایک پہاڑی چشمے کے قریب پہنچی اور اپنے تشنہ لب ہلتے ہوئے پانی پر رکھ دیئے۔ پانی انتہائی سرد اور شیریں تھا۔ میں اپنے تپتے ہوئے انگارہ جسم کی پیاس بجھانے کے بعد اس کے قریب ہی لیٹ گئی۔ چشمے کا پانی نیچے گرتا تو اس میں سے چھینٹے اُٹھتے۔ وہ چھینٹے پھوار کی مانند میرے بدن پر گر رہے تھے۔ پانی کی وہ پھوار مجھے کسی شفیق اور مہربان ماں کی طرح تھپکیاں دیتی رہی۔ حتیٰ کہ نیند کے خمار نے رفتہ رفتہ میرا رابطہ اس دنیا سے توڑ دیا اور خوابوں کی وادی نے مجھے شرف باریابی بخشا۔

میں اس خواب آور وادی میں کتنی ہی دیر تک کھوئی رہی جب آنکھ کھلی تو ہر شے پر چاندنی کا راج تھا اور آسمان پر چاند شہزادہ اپنے غلام ستاروں کے جھرمٹ میں نیل گگن کی رتھ میں سوار بڑی شان اور دبدبے کے ساتھ ایک انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اس چاند کی مانند میری منزل بھی انجان تھی۔ نہ جانے مجھے کہاں جانا تھا؟ کیا کرنا تھا؟ مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ قدرت نے مجھے دوسرا جنم دیا تھا اور ظاہر ہے کسی مقصد کے لیے ہی دیا ہو گا مگر وہ مقصد کیا تھا؟ میں جتنا اس بارے میں سوچتی، میرا ذہن اتنا ہی اُلجھ جاتا۔

ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا نے فضا کو اپنے حصار میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ بھی ٹھنڈی ہوا ہی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ میں نے انگڑائی لی اور چشمے کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ پانی کی پھوار سے میرا کندن جسم بھیگ سا گیا تھا اور یہ بھیگا ہوا جسم لطف و سرور کے پیکر میں ڈھل کر عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ نہ جانے یہ کیسی کیفیت تھی۔ میں دیوانہ وار کھڑی ہو گئی اور ستاروں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں کے سائبان تلے دوڑنے لگی۔ میں دوڑتی رہی حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔

اچانک کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز میری قوت سماعت سے ٹکرائی اس کے ساتھ ہی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی بلند ہوئی، میں ٹھٹک کر

رُک گئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا، بھیڑیا نما ایک کتا بڑی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔ اس کا دھانہ خوفناک انداز میں کھلا ہوا تھا اور وہ دل دہلا دینے والے انداز میں بھونک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دماغ ماؤف ہو گیا اور احساس و ادراک پر ایک چادر سی تن گئی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے گھبراہٹ میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو اپنے قریب ہی ایک تناور درخت کی شاخوں کو جائے پناہ سمجھ کر چشم زدن میں اس پر جا چڑھی۔

جلد ہی کتا اس درخت تک آ پہنچا جس کی شاخوں پر میں پناہ لیے بیٹھی تھی۔ اس نے میری جانب عجیب نظروں سے دیکھا اور دُم ہلا ہلا کر بھونکنے لگا۔ اب اس کی آواز میں ایک بیچارگی تھی۔ ایک تڑپ تھی۔ وہ کبھی میری طرف منہ کر کے بھونکتا اور کبھی اس سمت دوڑ لگا کر واپس آ جاتا جس طرف سے وہ آیا تھا پھر وہ درخت کے قریب آ کر لوٹنے لگتا اور منہ سے رونے کی آواز نکالنے لگتا۔

میں کافی دیر تک درخت پر بیٹھی رہی اور وہ کتا وہیں تنے کے قریب لیٹا رہا۔ اس کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ متواتر مجھ سے نیچے اُترنے کی التجا کر رہا تھا۔ میرے دل میں ایک تجسس انگڑائیاں لینے لگا۔ میں نے نیچے اُترنے کا ارادہ کر لیا اور درخت کی ایک مضبوط شاخ توڑ کر ایک ہاتھ میں پکڑ لی تاکہ اگر وہ کتا مجھ پر حملہ کرے تو میں اپنا بچاؤ کر سکوں۔

کتے نے مجھے نیچے اُترتے دیکھا تو دُم ہلاتا ہوا اسی جانب دوڑ پڑا جس طرف سے وہ آیا تھا جب میرے قدم زمین کو چھونے لگے تو وہ دوبارہ میری سمت بڑھا میں اس کا حملہ روکنے کے لیے تیار ہو گئی مگر وہ میرے قریب آ کر میرے قدموں میں لوٹنے لگا اور اس نے اپنی زبان سے میرے پاؤں چاٹنے شروع کر دیئے۔

میں نے اسے پچکارتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پھر اسی سمت دوڑ پڑا۔ وہ دوڑتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ میری طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ جیسے مجھے اپنے پیچھے آنے کا کہہ رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے تذبذب کے بعد میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ مجھے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر وہ زور زور سے دُم ہلانے لگا جیسے تشکر کا اظہار کر رہا ہو۔

وہ ایک پہاڑی کھوہ تھی جس میں وہ داخل ہو گیا۔ میں نے اندر جانے میں توقف کیا تو وہ پھر باہر آ گیا اور دُم ہلاتا میرے قدموں میں لوٹنے لگا۔ میں نے اسے پچکارا تو وہ اُچھل اُچھل کر میرے منہ سے اپنا منہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اس کھوہ کے اندر جھانکا تو وہاں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہ کتا مجھے بار بار اندر جانے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ آخر میں نے اس کی بے چارگی محسوس کرتے ہوئے اندر قدم رکھ دیئے۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ وہاں میرے اور اس کتے کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے کیونکہ کسی کے سانس لینے کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ پھر میرے پاؤں کسی انسانی جسم سے ٹکرائے میں نے جھک کر اسے ٹٹولا۔ جسم کے نشیب و فراز بتا رہے تھے کہ وہ کسی انسان کا جسم ہے۔ میں نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھر لیا اور کھینچتی ہوئی باہر آ گئی۔

میں اس کتے کی ذہانت پر عش عش کر رہی تھی جس نے مجھے وہاں آنے پر مجبور کیا اور اب وہ کتا میرے قدموں سے تقریباً لپٹا ہوا تھا۔ روشنی میں آتے ہی اس لڑکے کے خدوخال پوری طرح عیاں ہو گئے۔ اس کا پورا جسم زخموں سے چُور تھا اور ان زخموں سے پیپ رِس رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی

زخمی تھا اور سر کے بال خاک اور خون سے اٹے ہوئے تھے۔ کراہت کی ایک شدید لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی اور میں نے اس کے تار تار جسم کو زمین پر رکھ دیا اور منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ میرے ہاتھوں، بازوؤں اور چھاتی پر گندگی چمٹ گئی تھی۔ مجھے اُبکائیاں سی آ رہی تھیں۔ میں نے زمین سے ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھایا اور اس کی مدد سے غلاظت صاف کرنے لگی۔ وہ کتا دوبارہ کھوہ کے اندر چلا گیا۔

اس لڑکے کے حلق سے کراہ بلند ہوئی مگر مجھ میں اس کے غلیظ سراپا کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ میں خود پر جبر کیے کھڑی رہی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں اور میں نے اپنی اس خواہش پر عمل درآمد بھی کر لیا مگر تھوڑی دور جانے کے بعد میرے ضمیر نے مجھے ایسے کچوکے لگائے کہ بے اختیار میرے قدم رُک گئے۔

ایک کتا انسانی زندگی بچانے کے لیے کس قدر تگ و دو کر رہا تھا اور میں انسان ہوتے ہوئے بھی ایک انسان کی مدد سے کنی کترانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ میرے قدم مجھے لیے واپس ہوگئے۔ وہ کتا کھوہ سے باہر آ گیا تھا اور اس کے منہ میں ایک ٹوکری دبی ہوئی تھی جس میں انواع واقسام کے پھل رکھے تھے۔ وہ ٹوکری اس نے میرے قدموں میں رکھ دی اور قریب کھڑے ہو کر دُم ہلانے لگا جیسے مجھے کھانے کی دعوت دے رہا ہو۔ میں نے ایک پھل اُٹھا کر دانتوں کی مدد سے کاٹا تو میرا دہن انتہائی میٹھے اور لذیذ مشروب کے ذائقے سے لبریز ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد اسی وفادار کتے نے کسی درخت کے پتے لا کر میرے قدموں ڈال دیئے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ دراصل میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں ان پتوں کا کیا کروں، کتا بے ہوش پڑے ہوئے لڑکے کے قریب گیا اور اس کے زخموں کو اپنی زبان سے چاٹ کر مجھے احساس دلایا کہ لڑکے کے زخم صفائی مانگتے ہیں۔

میں نے ان پتوں کی مدد سے لڑکے کے رستے ہوئے زخموں کو صاف کرنا شروع کر دیا گو مجھے اس میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی ایک انسان کی جان بچانے کے لیے مجھے خود پر جبر کرنا تھا۔

وہ کتا کچھ فاصلے پر بیٹھا مجھے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اپنی زبان سے میرے پاؤں بے تحاشا چاٹتا جا رہا تھا۔

اس لڑکے کی تیمارداری میں مجھے شام ہوگئی۔ اسے ہوش میں لانے کی تمام تدبیریں فی الحال ناکام ہو چکی تھیں۔ میں اسے اس حال میں چھوڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ اب اس کی زندگی کا دار و مدار میری توجہ اور تیمارداری پر منحصر تھا اگر میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلی جاتی تو وہ زخموں کی تاب نہ لا کر مر بھی سکتا تھا۔

وہ رات بھی چاندنی سے بھرپور تھی۔ میں اس لڑکے کے قریب ہی بیٹھی تھی اور آسمان پر پھیلے ہوئے تاروں کے خوبصورت جال کو گھور رہی تھی۔ چاند جو گزشتہ رات میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، مجھے وہاں لیٹے دیکھ کر مسکرا دیا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا تم نے اپنی منزل پالی ہے؟ یا تھک کر یہاں سو رہی ہو؟ اسے کیا معلوم تھا کہ میں ایک انسانی زندگی کو جلا بخشنے کے لیے دنیا کی گردشوں کو بھی بھلا بیٹھی ہوں۔ ابھی منزل تو نامعلوم تھی پھر میں اس لذت سے کیوں محروم رہتی جو مجھے ایک انسانی جان کی خدمت کرنے سے حاصل ہو رہی تھی۔ نہ جانے یہ لڑکا کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اور اس کی ننھی سی جان کو روگ کیوں لگا تھا؟

میں نے گردن گھما کر اسے دیکھا اس کے زخموں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کتا بھی اس کی کراہ سے جاگ چکا تھا اور بڑی بے قراری سے اس لڑکے کے قریب کھڑا دُم ہلا رہا تھا میں نے اس لڑکے کے زخم دوبارہ صاف کیے اور وہ رس بھرا پھل اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ میں ستاروں سے اس لڑکے کے بارے میں پوچھوں، میں نے اوپر نظریں اُٹھائیں مگر چونکہ سپیدہ سحر نمودار ہو گیا تھا اس لیے ٹمٹماتے ہوئے ستارے اُجالے کی چادر میں جا چھپے تھے۔ میں تمام رات ستاروں سے باتیں کرتی رہی تھی اور ایک پل کے لیے بھی نہیں سوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سورج نکل آیا اور ہر طرف دھوپ پھیل گئی وہ لڑکا بدستور بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے دھوپ سے بچانے کے لیے اسے اُٹھا کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے ڈال دیا۔ جب بھی اس کے حلق سے سسکی کی آواز نکلتی، میں اس کے منہ میں رس دار پھلوں کا شہد نچوڑ دیتی۔ دوپہر کے بعد آسمان پر بادل چھا گئے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اس بوندا باندی نے موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی۔

بارش کے ٹھنڈے اور شفاف قطرے زخمی لڑکے کے جسم پر پڑے تو اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ وفادار کتا فوراً اس کے قریب آیا اور فرطِ مسرت سے بھونکنے لگا۔ لڑکے نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور کتے کے سر پر رکھ دیا۔ مگر پھر فوراً ہی وہ ہاتھ نیچے گر گیا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کی مگر نقاہت کے مارے اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ وہ دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ ابھی تک اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

بارش کا پانی اس کے زخموں کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے بازوؤں میں اُٹھانے کی ناکام کوشش کی اور اس کھوہ کی جانب بڑھی جہاں سے میں اسے نکال کر لائی تھی۔

انسانی جسم کے لمس کو محسوس کرتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں میرا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا اس نے خوف زدہ نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا اس کے لب کانپے، شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''گھبراؤ نہیں، میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے میں پیار سمیٹتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ شاید وہ میری زبان نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر آواز اس کے کانپتے ہوئے لبوں تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

بارش نے اس کے گہرے سیاہ بالوں کی تمام غلاظت دھو ڈالی تھی اور زخم بھی کسی حد تک صاف ہو گئے تھے۔ اس کا چاندی جیسا دودھ جسم دھل کر انتہائی پُر کشش ہو گیا تھا گو اس پر زخموں کے پھول ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ خوبصورت لگ رہا تھا۔

شام کو بارش رُک گئی مگر بادلوں کی چادر بدستور تنی رہی۔ میں اسے کھینچتی ہوئی اُٹھا کر کھوہ سے باہر آ گئی اور قریب ہی اسے لٹا دیا۔ اب وہ مکمل طور پر ہوش میں تھا مگر نقاہت اور کمزوری اس پر اسی طرح غالب تھی کہ وہ نہ تو بول سکتا تھا نہ ہی حرکت کر سکتا تھا اس کا وفادار کتا اسے ہوش میں دیکھ کر اس کے آس پاس اُچھل کود کر رہا تھا۔ باہر لٹا کر میں نے ایک بار پھر اس کے زخم صاف کیے جو اب کافی حد تک خشک ہو گئے تھے۔ شاید یہ اس شیریں پھل کے رس کا اثر تھا یا بار بار صاف کرنے کی وجہ تھی جو اس کے زخم اتنی جلدی بھر گئے تھے۔ میں نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری کسی بات کا جواب دینے سے قاصر رہا البتہ اس کی آنکھوں سے خوف و ہراس کی پرچھائیاں غائب ہو گئی تھیں اور ان کی جگہ احسان مندی اور

تشکر کی چمک نمایاں ہونے لگی تھی۔

میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے قرار تھی مگر بے چارہ ابھی تک قوت گویائی سے عاری نظر آتا تھا۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش تو ضرور کرتا مگر زبان اور الفاظ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

رات بھی آسمان پر بادل چھائے رہے۔ میں بڑی بے تابی سے ان کے چھٹنے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اپنے فقیر بابا سے اس لڑکے کے بارے میں دریافت کر سکوں۔ اسی انتظار میں میری آنکھوں میں نیند بھرنے لگی اور مجھے اپنا ذہن سرور و کیف میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا اس پر ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا نے قیامت ڈھائی جو اپنے غیر مرئی ہاتھوں سے تھپک کر مجھے نیند کی دیوی کے حضور پیش کر دیا۔ میں دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو بادل چھٹ چکے تھے اور آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں بابا جی کو یاد کیا تبھی مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ فوراً میرے سامنے آ گئے ہوں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیوں جناب! یہ نوجوان کون ہے؟''

''یہ سلیم ہے؟''

''کون سلیم؟''

''وقت آنے پر بتاؤں گا۔''

''ابھی کیوں نہیں؟''

''تو سنو...... اس کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ لڑکا ظلم و ستم کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس پر یہ ظلم یہ ستم اس کے اپنوں نے توڑے ہیں۔ ہم تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتائیں گے مگر وقت بہت تھوڑا ہے۔ صبح ہونے والی ہے تھوڑی دیر بعد ہم تمہیں الوداع کہیں گے اس داستان کا ذکر رات پر اُٹھا رکھو۔'' کہہ کر وہ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

فقیر بابا کی نامکمل بات نے میرے شوق کو بھی ہوا دے دی تھی میں ان سے اسی وقت سب کچھ پوچھنا چاہتی تھی کیونکہ میں تشنگی کے بے کراں سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔

اگلے روز لڑکے کی حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ خود بخود اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کتا اس کی گود میں بُری طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

''کیا تم بالکل ٹھیک ہو؟'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ جواب میں اس کے لب ہلے اور ان سے بے ربط الفاظ پھسل پڑے۔ مجھے یہ جان کر دُکھ ہوا کہ میں اس کی بات نہیں سمجھ رہی تھی۔ وہ کسی اور ہی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے مجھے ایک بار پھر رات کا انتظار کرنا تھا۔ بابا جی مجھے یقیناً اس کے بارے میں بتا سکتے تھے کیونکہ ان سے کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی۔

''کیا تم میری زبان میں گفتگو نہیں کر سکتے؟'' میں نے بے چارگی کے عالم میں پوچھا۔ جواب میں اس نے کیا کہا۔ میں قطعاً نہ سمجھ سکی۔ میں نے اس سے دو چار باتیں اور کیں مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا کہ اس کے پلے بھی کچھ بھی نہیں پڑ رہا۔

کتا اس کی گود میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اسے پیار بھرے غصے سے بار بار پیچھے ہٹا دیتا تھا شیریں مشروب والے پھل ختم ہو چکے

تھے اور قریب کوئی ایسا درخت دکھائی نہیں دے رہا تھا جس پر کوئی پھل لگا ہو اس لڑکے کو یقیناً اس بات کا علم تھا کہ وہ پھل کہاں سے دستیاب ہو سکتے تھے مگر وہ میری زبان نہیں سمجھتا تھا میں سخت بھوک محسوس کر رہی تھی اور پیاس سے میرا حلق بالکل خشک ہو گیا تھا میں نے ہاتھوں سے چلو بنا کر لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ فوراً میرا مطلب سمجھ گیا۔

''ٹائیگر!'' یہ پہلا لفظ تھا جو میری سمجھ میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ وفادار کتا بھاگتا ہوا اس لڑکے کے قدموں سے لپٹ گیا۔ لڑکے نے اپنی زبان میں اسے کچھ کہا اور وہ کتا دُم ہلاتا ہوا ایک طرف دوڑنے لگا۔ لڑکے نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں اس کے پیچھے جاؤں۔ میں ٹوکری اُٹھا کر کتے کے پیچھے لپکی۔

کافی فاصلے پر پھلوں کے بہت سے درخت لگے ہوئے تھے وہاں جا کر کتا رُک گیا۔ میں نے بہت سے پھل اکٹھے کیے اور واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ ایک خوفناک کالے رنگ کے ناگ نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ اپنا بھیانک پھن اُٹھائے بالکل میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں لمحہ بھر کو ٹھٹکی پھر اس نے میرے ہوش وحواس کو اپنی آنکھوں کے شکنجے میں اس طرح جکڑ لیا کہ مجھے اپنے جسم کی حرکات وسکنات پر کوئی اختیار نہ رہا۔ ناگ میرے سامنے جھومنے لگا۔ اس پر خمار و مستی کی عجیب وغریب کیفیت طاری تھی۔ اپنے شکار کو سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی پُراسرار چمک نے مجھے منجمد کر کے رکھ دیا تھا اور وہ اپنے جلو میں موت کی بھیانک خاموشی سمیٹے آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنا زہر میرے جسم میں اُتار دیتا، ٹائیگر نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ اس پر چھلانگ لگا دی۔ آنکھوں کا سحر ٹوٹا تو میرے جسم میں گویا نئی روح عود کر آئی۔ میں جھرجھری لے کر ہوش وحواس کی دنیا میں واپس آ گئی۔

ٹائیگر اور ناگ ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ ناگ اسے ڈسنے کے لیے بار بار اُچھلتا مگر ٹائیگر پھرتی سے خود کو بچا لیتا۔ آخر کار میں نے زمین پر پڑا ہوا پتھر اُٹھایا اور اس ناگ کا سر کچل دیا۔

ٹائیگر تیزی سے میری جانب بڑھا اور میرے پاؤں چاٹنے لگا۔ اس بے زبان مگر عقلمند جانور نے مجھے موت کے منہ سے بچا لیا تھا۔ میں نے اسے اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ وہ منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکالتا ہوا اپنا منہ میرے منہ سے لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

اس سمجھدار اور عقلمند کتے نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے میری خاطر اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اس ناگ پر حملہ کر دیا تھا جو مجھے اپنی آنکھوں سے مسحور کیے موت کی وادی میں دھکیلنے کے لیے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ٹائیگر کو تھپکتی اور پیار کرتی واپس ہو لی۔ جب میں واپس پہنچی تو اس لڑکے کو دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ اس کے خوبصورت چہرے کا رنگ اس حد تک نکھر چکا تھا کہ اس کے سامنے صبح کا نور بھی ماند پڑ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں کسی قسم کے زخم کا داغ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ اپنے آپ میں سنبھل گیا۔ شاید میری نگاہوں کی تاب نہ لا سکا تھا۔ میں نے پھلوں والی ٹوکری اس کی جانب بڑھائی اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ ٹائیگر اس لڑکے کے قدموں میں لیٹ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی اور احسان مندی کی چمک تھی۔ میری توجہ سے اس کے مالک کو نئی زندگی مل گئی تھی اب وہ مکمل طور پر صحت یاب تھا۔ میرا ذہن ایک بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے جسم پر کھلے ہوئے زخم اور ان کے داغ کس طرح مٹ گئے تھے اس لڑکے نے اپنے دانتوں

سے ایک پھل چھیلا اور میری طرف بڑھا دیا وہ پھل بے حد لذیذ اور انتہائی خوش ذائقہ تھا۔ میں ہونٹوں سے پھل کا رس چوس رہی تھی۔

اچانک پاس کے درختوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ ٹائیگر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے اس سمت بھاگا جس طرف سے آواز آئی تھی۔ میں کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر تیار ہوگئی اور کتے کے پیچھے جانے ہی والی تھی کہ لڑکے نے مجھے اشارے سے روک لیا اور بتایا کہ ٹائیگر اپنے کھانے کا انتظام کرنے گیا ہے میں مطمئن ہو کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس لڑکے سے باتیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ میری اور میں اس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ کاش وہ میری بات سمجھتا تو میں اس کی داستان سنتی۔

انہی خیالوں میں گم مجھے نیند نے آلیا اور میں نرم و ملائم گھاس پر دراز ہوگئی۔ ٹائیگر کے بھونکنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ آسمان کی طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا۔ اس کا مالک وہاں نہیں تھا۔ میں سخت پریشان ہوگئی اور کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ٹائیگر دُم ہلاتا ہوا میرے پاس آ گیا اسے مطمئن دیکھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی کیونکہ اگر اس کا مالک کسی مصیبت میں ہوتا تو ٹائیگر کبھی آرام سے نہ بیٹھتا مگر یہ تھوڑی دیر پہلے بھونک کیوں رہا تھا میرے دل میں خیال پیدا ہوا اچانک وہ پھر بھونکنے لگا اور تیزی سے ایک طرف جھپٹا۔ میں یہ دیکھ کر زیر لب مسکرا دی کہ اس نے کسی جانور کا شکار کر کے رکھا ہوا تھا اور کوے اسے اُڑانے کی فکر میں تھے وہ کوؤں کو ڈرانے کے لیے بھونک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خوبصورت لڑکا واپس آ گیا اس نے اپنے ہاتھ میں کوئی چیز پکڑی ہوئی تھی میرے قریب آ کر اس نے وہ چیز مجھے تھما دی اور اشارے سے کہا کہ میں اسے اپنے گلے میں ڈال لوں۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا یہ کوئی خوبصورت پتھر تھا جو مضبوط کپڑے میں سیا ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنے گلے میں پہن رکھا تھا۔ اور اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے شاید وہ کپڑے اس کھوہ سے اُٹھا کر لایا تھا میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی جس کی ایک انگلی میں ہیرے سے مرصع ایک خوبصورت انگوٹھی تھی جسے کاریگر نے بنانے میں کمال کر دیا تھا چھوٹی سی انگوٹھی پر پھول بنا کر اس میں سفید رنگ کا ہیرا جڑا گیا تھا۔

میں نے ہاتھ تھاما تو اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی مگر مجھے اس کی زبان نہیں آتی تھی۔ نہایت لطیف پاکیزہ زبان جسے بولتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرے منہ میں شہد آ گیا ہے۔ وہ زبان اس اجنبی لڑکے کی سمجھ سے باہر اور میرا ذہن اس کی زبان سمجھنے سے قاصر تھا۔

ٹائیگر ہم دونوں کو دلچسپ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ پاس بیٹھ کر اس کے سر پر پیار کرنے لگا۔ ٹائیگر منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر اور اس کے پاؤں میں منہ اور سر رگڑ کر محبت کا اظہار کر رہا تھا اور میں اپنی بے بسی پر کڑھ رہی تھی کیونکہ میں اس لڑکے کی حقیقت تاحال نہ جان سکی تھی۔ میں نے قریب کے ایک درخت سے ٹیک لگا دی اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگی یقیناً بابا میری مشکل حل کر سکتے تھے۔

ٹائیگر ابھی تک اس لڑکے کے قدموں میں لوٹ رہا تھا اور وہ اس کے سر پر پیار کر رہا تھا اچانک وہ اُٹھا اور میرے قریب آ کر مجھے کچھ کہنے لگا مگر اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی پھر اس نے ٹائیگر سے کچھ کہا اور وہ دُم ہلاتا ہوا ایک طرف چلا گیا لڑکے نے اس کی تقلید کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بھی ساتھ لے گیا اس کھوہ کے قریب پہنچ کر اس نے ٹائیگر کو رُکنے کے لیے آواز دی اور خود اندر داخل ہوگیا جب وہ باہر نکلا تو اس نے ہاتھ میں ایک پوٹلی سی پکڑی ہوئی تھی جو اس نے باہر نکلتے ہی مجھے پکڑا دی میں نے جب اس پوٹلی کو کھولا تو اس میں بہت سے ہیرے جواہرات نکل کر گر پڑے۔

لڑکے نے انہیں جلدی جلدی سمیٹا تھا۔اس نے انہیں یکجا کر کے پھر پوٹلی میں باندھ دیا اور دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑا۔

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہی حتیٰ کہ ہم ایک چشمے کے قریب پہنچ گئے پانی کے گرنے کی آواز سے ایک مترنم ساز کے بجنے کا گمان ہو رہا تھا۔وہ چشمے کے قریب بیٹھ گیا اور اس نے چلو میں پانی اُٹھا کر اپنے لبوں سے لگا لیا گو مجھے زیادہ پیاس تو نہیں لگی ہوئی تھی پھر بھی اس پانی کا ذائقہ محسوس کرنے کے لیے میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ بہت میٹھا اور ٹھنڈا پانی تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں اس پانی کے چھینٹے مارے تو ایک عجیب وغریب تراوٹ کا احساس ہوا۔ جیسے میری آنکھوں کی روشنی تیز ہوگئی ہے اور دور کی چیزیں واضح طور پر دکھائی دینے لگی ہیں۔

اس لڑکے نے مجھے اشاروں سے بتایا کہ اس کے زخموں کے نشانات بھی اس چشمے کے پانی میں نہانے سے دور ہو گئے تھے اور وہ اسی پانی کی بدولت مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا تھا۔اس نے اپنے پاؤں اس پانی میں ڈال دیئے اور مجھے دور جانے کا اشارہ کیا وہ اس پانی میں غسل کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں درختوں کی اوٹ میں چلی گئی۔ٹائیگر بھی اٹھکیلیاں کرتا ہوا میرے ساتھ آ گیا اور اُچھل اُچھل کر میری گود میں چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

غسل کرنے کے بعد وہ لڑکا بھی درختوں کی جھنڈ میں چلا آیا۔تبھی مغربی سمت سے یکا یک ہی آندھی اُٹھی۔

سرخ آندھی نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لڑکے نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ٹائیگر خوف زدہ انداز میں بھونکتا ہوا ہمارے قدموں سے لپٹ گیا۔

آندھی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ چشم زدن میں درخت جڑوں سے اُکھڑنے لگے۔ہم بڑی مشکل سے بچتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں سے نکل آئے۔ ہمارے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ہوا کے تند وتیز تھپیڑے ہمیں زمین سے اُٹھاتے اور دور جا کر پٹخ دیتے۔ میں نے اس لڑکے کا بازو بڑی مضبوطی سے تھاما ہوا تھا مگر ٹائیگر اُڑ کر نہ جانے کہاں جا گرا تھا۔ ہیروں اور جواہرات کی پوٹلی بھی کہیں گر گئی تھی۔

آندھی اور طوفان کی وجہ سے ہر سُو اندھیرا پھیل گیا اور بار بار زمین پر گرنے سے ہمارے جسموں سے خون رسنے لگا تھا۔اچانک ہم دونوں تیز ہوا میں لڑکھڑاتے ہوئے ایک کھوہ میں جا گرے۔کھوہ میں گرتے ہی ہم اس کی دیوار سے لگ گئے اور دبک کر بیٹھ گئے۔ میرے پورے جسم سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور شاید یہی حال اس کا بھی تھا۔

اگرچہ طوفان کی شدت میں کمی آ گئی تھی مگر کھوہ میں گرنے کی وجہ سے ہم آندھی کے تھپیڑوں سے بچ گئے تھے۔ درختوں کے ٹوٹنے اور گرنے کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں مگر ہم محفوظ تھے۔ٹائیگر بے چارہ نہ جانے اس طوفان میں کہاں بھٹک گیا تھا۔ وہ انتہائی وفادار اور عقل مند جانور تھا آخری وقت تک اس نے اپنے مالک کا ساتھ دیا تھا اور مجھے اپنے مالک تک پہنچانے اور اس کی تیمارداری کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔اب وہ آندھی میں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اس وقت اس کو ڈھونڈنا ناممکن تھا تاہم میں نے فیصلہ کیا کہ طوفان تھمتے ہی اس کو تلاش کروں گی۔

کافی دیر کے بعد طوفان تھم گیا مگر اندھیرا بدستور پھیلا ہوا تھا شاید رات ہو گئی تھی۔ وہ لڑکا میرے قریب بے حس وحرکت پڑا تھا۔شاید سو گیا تھا میں نے آہستہ سے اس کا سر اپنے کندھے سے ہٹایا اور نیچے زمین پر رکھ کر باہر کی جانب بڑھی میں جلد از جلد فقیر بابا سے گفتگو کر کے اس کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں بابا سے کہوں گی کہ وہ مجھے اس لڑکے کی زبان سے آشنا کر دیں تاکہ میں اس سے براہ راست باتیں کر

سکوں مگر اس وقت بے اختیار اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہا جب میں نے دیکھا کہ اس کھوہ کا راستہ بند ہو چکا ہے ایک دیو ہیکل درخت جڑوں سمیت اُکھڑ کر وہاں آ پڑا تھا اور اس نے باہر نکلنے کا راستہ بالکل بند کر دیا۔

میں دوبارہ لڑکے کے قریب آ کر بیٹھ گئی اس وقت میں نے درخت کو ہٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ میں اپنی طاقت سے آگاہ نہیں تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کتنی طاقت کی مالک ہوں اگر میں کوشش کرتی تو ایک ہاتھ سے وہ درخت ہٹا سکتی تھی جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ میں انتہائی طاقتور لڑکی ہوں۔

بہرحال میں کڑھتی رہی اور فقیر بابا سے گفتگو کرنے کی تدبیریں سوچتی رہی آخر صبح ہو گئی اور سورج کی شعاعیں اندر آنے لگیں لڑکا بھی جاگ گیا تھا اور حیرت سے کھوہ کے دروازے میں گرے ہوئے درخت کو دیکھ رہا تھا شاید وہ سوچ کر پریشانیوں میں گھر گیا تھا کہ ہم باہر کیسے نکلیں گے۔

تاریکی کافی حد تک دور ہو گئی تھی اور ہم ایک دوسرے کی صورتیں واضح طور پر دیکھ سکتے تھے اس کے جسم پر کافی خراشیں آئی تھیں اکا دکا زخم بھی دکھائی دے رہے تھے جن میں سے خون رس رہا تھا یہی حال میرا تھا مگر ہم دونوں کو ان زخموں کی کوئی پروا نہیں تھی بلکہ فکر تھی تو صرف اتنی کہ ہم باہر کیسے نکلیں گے؟ اب میں اس صورت حال کے بارے میں سوچتی ہوں تو بہت ہنستی ہوں کہ ہم باہر نکلنے کی کوشش تو کر ہی نہیں رہے تھے اور وقت کو کوس رہے تھے اگر ہم ہاتھ پاؤں ہلاتے تو یقیناً باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتے۔

ہم نے تمام دن بھوکا پیاسا رہتے ہوئے گزار دیا ٹائیگر کا بھی فی الحال پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے اور درخت کے ہٹنے کی بھی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی۔ رات ایک بار پھر آ گئی تھی۔ ہم کھوہ سے باہر نکلنے سے قاصر تھے کیونکہ اس بھاری بھرکم درخت کو ہٹانا ہمارے بس میں نہیں تھا۔

وہ لڑکا سو گیا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی کہ اچانک ٹائیگر کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ لڑکے نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور ہسٹریائی انداز میں چلایا۔ ''ٹائیگر...... سائیگر۔''

ٹائیگر کھوہ کے عین سامنے کھڑا ہو کر بھونک رہا تھا۔'' اسے اپنی قوتِ شامہ سے ہماری وہاں موجودگی کا احساس ہو گیا تھا اور اب وہ اندر آنے کے لیے بے قرار تھا مگر وہ درخت اس کی راہ میں بھی رکاوٹ تھا۔

لڑکے نے اپنی زبان میں کچھ کہا تو ٹائیگر کی آواز بند ہو گئی پھر مجھے درخت کی شاخیں ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ شاید ٹائیگر ان شاخوں کو بھنبھوڑ رہا تھا اور درخت کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکا بار بار بلند آواز میں کچھ کہتا جا رہا تھا شاید وہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

اسی لمحے میں نے سوچا کہ اگر ایک جانور درخت کو ہٹانے کے لیے جدوجہد کر سکتا ہے تو میں انسان ہوتے ہوئے اس کا ساتھ کیوں نہیں دے سکتی چنانچہ میں ایک نئے ولولے کے ساتھ اُٹھی اور پھر ہم نے مل کر لمحوں میں درخت کو پیچھے ہٹا دیا۔ ٹائیگر جلدی سے اندر گھس آیا اور بار بار ہمارے پاؤں چاٹنے لگا۔

درخت کے پیچھے ہٹتے ہی نیلے آسمان کی وسعتوں میں چمکتے ہوئے ستارے واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ میں بابا سے گفتگو کرنے کے لیے بے تاب تھی لہٰذا جلدی سے کھلی فضا میں آ گئی۔

چاند اور ستاروں کی روشنی سے چاروں طرف کی زمین منور تھی اور روشنی میں ہمیں کئی بھاری بھر کم درخت زمین پر گرے ہوئے نظر آ رہے تھے جنہیں آندھی اور طوفان نے جڑوں سے اُکھاڑ پھینکا تھا۔

ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا نے ماحول کو سرد بنا دیا تھا جلد ہی میری آنکھوں میں نیند بھرنے لگی۔ لڑکے کا بھی یہی حال تھا وہ جماہیوں پر جماہیاں لے رہا تھا آخر وہ ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر سر ٹیک کر نیند میں کھو گیا تھا مگر میں بابا سے باتیں کرنے کے لیے جاگتی رہی جب ٹائیگر بھی اپنی اگلی دونوں ٹانگوں میں سر دے کر سو گیا تو میں اس سے کچھ فاصلے پر جا کر بابا کو آواز دینے لگی۔ تبھی مغربی سمت سے وہ آتے ہوئے نظر آئے۔ میں انہیں دیکھ کر لپکی۔

نزدیک آ کر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر کہا۔ ''بیٹی! جب تُو اس قابل ہوئی کہ شورویر سے مقابلہ کر سکے تو قسمت نے تیرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ جتنی جلد ہو سکے، تُو لوٹ جا۔ کچھ دنوں کے لیے تابوتِ مقدس کا خیال چھوڑ دے اس لیے کہ نسیم کی روح پر شورویر نے قبضہ کر لیا ہے۔ اسے آزاد کرانا تجھ پر لازم ہے۔''

''مگر بابا! میں اتنی جلدی ڈھاکا کیسے لوٹوں گی؟''

''اپنے ساتھ سلیم کو لے لے۔ وہ تیرے بہت کام آئے گا۔ جا، اسے ساتھ لے کر باہر آ۔ میں تجھے اپنی قوت سے وہاں پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں گو کہ ایسا کرتے ہی میری بے انتہا قوت کم ہو جائے گی مگر تیری خاطر کروں گا۔''

میں بھاگ کر کھوہ میں گئی اور سلیم کو کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ علم کی قوت ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔ اس کا ہلکا سا مظاہرہ میں نے اس وقت دیکھا جب بابا نے سلیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ وہی سلیم جو جنگلی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتا تھا، وہ فر فر اردو، بنگلہ بولنے لگا۔

☆======☆======☆

میری زندگی بھی شطرنج کی بساط بن گئی تھی۔ ایک اُلجھن سے نکلتی تھی کہ دوسری اُلجھن گھیر لیتی تھی۔ ابھی میں لوٹی ہی تھی کہ ایک نئی خبر ملی۔ یہ خبر دہلا دینے والی تھی۔ عرفان کو ختم کر کے میں نے سمجھا تھا کہ شمس النہار کو میں نے بچا لیا ہے مگر وہ پھر اغوا ہوگئی تھی۔ اسے کس نے اغوا کیا ہے، یہ بات جاننا ضروری تھی اور فقیر بابا میرے قریب نہیں تھے۔ پھر اسے کس نے اغوا کیا ہے، یہ جاننے کے لیے میں نے بابا سے رابطہ کرنا چاہا۔ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی اور بابا آگئے لیکن میرے پوچھنے سے پہلے ہی انہوں نے بتادیا کہ شمس النہار کو شورویر نے اغوا کیا ہے۔ وہ بہت غصے میں ہے۔ اس نے انتقاماً یہ حرکت کی ہے۔

میں نے بابا سے پوچھا۔ ''اس بار اسے کس طرح آزاد کراؤں؟''

''تمہاری دعاؤں نے اس کی زندگی گھٹا دی ہے۔ اب وہ کبھی بھی دوسرا جسم اوڑھ نہیں سکے گا اس لیے نئی زندگی پانے کے لیے اس نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس نے شیطان کو خوش کرنے کے لیے ایک گروہ تیار کر لیا ہے اور بہت جلد وہ اپنے مقصد کو حاصل کر لے گا اگر اس کے چنگل سے شمس النہار کو بچایا نہ گیا۔

''شمس النہار ہے کہاں؟''

''وہ تیج گاؤں میں ہے، تم آج رات اسے نکال کر لے آؤ ورنہ اس کی بلی چڑھا دی جائے گی۔''

''جانا کہاں ہے؟''

''بتایا تو ہے تیج گاؤں چلی جاؤ ایئر پورٹ سے مشرقی سمت۔ اپنے ساتھ سلیم کو بھی لے جاؤ وہ بہت کچھ جانتا ہے۔''

باہر نکل کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ قسمت اچھی تھی۔ فوراً ٹیکسی مل گئی اور میں تیج گاؤں جانے کے لیے نکل پڑی مگر مجھے راستے میں رُکنا بھی تھا کیونکہ سلیم کو ساتھ لینا ضروری تھا۔ سلیم کے ہوٹل پہنچی اور اسے تمام بات بتائی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا پھر بولا۔ ''اتنے روز سے جو تیاری کر رہا تھا، شاید اس کا وقت آگیا ہے۔'' پھر وہ ایک سوٹ کیس لے کر نکل کھڑا ہوا۔

نسیم کے مطابق وہ جگہ جہاں شمس النہار کو قید کیا گیا تھا، وہ ایئر پورٹ سے مشرقی سمت تھی۔ مشرقی سمت میں کھیت تھے پھر کچھ کھیت کا علاقہ جہاں گنتی کے گھر تھے گویا پورا علاقہ ویران تھا۔

گاؤں میں پہنچتے ہی ڈرائیور نے رفتار کم کر دی۔ سارا گاؤں اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہیں کہیں روشنی نظر آ رہی تھی یا پھر مکانوں کی کھڑکیوں پر پڑے پردوں میں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی گاؤں میں زندگی کا ثبوت بہم پہنچا رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ اپنے مکانوں میں اگر سو نہیں گئے تھے تو سونے کی تیاریاں ضرور کر رہے تھے۔ کچھ آگے بڑھتے ہی گھنے درختوں کی ایک پٹی نظر آگئی۔

درختوں کی یہ دیوار تقریباً نصف میل لمبی تھی۔ ذرا سا مزید آگے جانے اور غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ درختوں کی وہ دیوار چار دیواری سے گھری ہوئی تھی۔ بظاہر ناممکن نظر آتا تھا کہ گھنے درختوں کے دوسری طرف کوئی مکان یا عمارت ہوگی مگر نسیم کی فراہم کردہ معلومات غلط نہیں ہو سکتی تھیں چنانچہ سلیم کو پورا یقین تھا کہ خفیہ جائے اجتماع لازماً وہیں کہیں ہوگی۔

قوس کی شکل میں بنی کچی سڑک پر چلتے ہوئے ہم چار دیواری کے کچھ اور قریب چلے گئے پھر ٹیکسی کو جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ کے پیچھے لے جا کر کھڑا کر دیا تا کہ بوقتِ ضرورت فوری فرار میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

گاڑی سے نکلتے ہوئے سلیم نے ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اُٹھایا اور کھولتے ہوئے بولا۔ ''اس سوٹ کیس میں جو چیزیں تم دیکھ رہی ہو، وہ میری تمام دن کی ریسرچ کا نتیجہ ہیں۔''

میں نے جھک کر غور سے سوٹ کیس میں دیکھا تو مجھے مختلف قسم کی عجیب وغریب چیزیں نظر آئیں مثلاً سفید پھولوں کا ایک گلدستہ، لمبی گھاس کا ایک بنڈل، ہاتھی دانت سے بنی دو عدد بڑی چھریاں، کئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں جن میں شاید پانی تھا اور ان کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں تھیں جو میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ایک جھلک دیکھنے کے ساتھ ہی میں پیچھے ہٹ گئی۔ میں سوالیہ انداز میں سلیم کو دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں شاید اس گھاس اور لہسن کے پھولوں کی بُو پسند نہیں آئی۔'' سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ چیزیں کالے علم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ماورائی آفتوں سے زبردست دفاع کرتی ہیں۔ لو یہ چُھری پکڑو۔'' سلیم نے ہاتھی دانت کی ایک چھری میری طرف بڑھا دی۔

''میں اس کا کیا کروں گی؟'' چھری لیتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''دیوار پر چڑھتے ہوئے اسے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے رہنا اور اگر شیطان کے کسی پجاری سے آمنا سامنا ہو جائے تو اپنے چہرے کے سامنے کر لینا اور لو یہ تعویذ گلے میں ڈال لو۔'' یہ کہتے ہوئے سلیم نے سونے سے بنی ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند تعویذ جس میں ریشمی دھاگا پرو دیا ہوا تھا، خود ہی میرے گلے میں اس طرح ڈال دیا کہ تعویذ عین چھاتی پر جھول رہا تھا۔ ''یہ ایسی صورت میں کہ ہاتھی دانت کی چھری اگر ہاتھ سے گر جائے تو یہ تمہارے لیے ریزروڈیفنس کا کام کرے گی اس کے علاوہ اگر کوئی نازک وقت آ پڑے تو اپنی پیشانی کے سامنے ایک انچ کے فاصلے پر گھوڑے کی نال اور اس کے درمیان تعویذ کا تصور کرنا اور پختہ یقین کے ساتھ یہ خیال کرنا کہ وہ دونوں چیزیں برقی بلب کی مانند روشن ہیں۔''

''پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' میں نے اُلجھن کا اظہار کیا۔

''خیر...... میں ہوں ناں پھر اس کے لیے سخت قوتِ ارادی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سلیم نے ایک دوسرا سنہری تعویذ اپنے گلے میں بھی ڈال لیا۔ پھر دو چھوٹی شیشیاں میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لو...... یہ ایک شیشی میں پارہ اور دوسری میں نمک ہے۔ وقت پر بہت کام آئے گا۔''

اس کے بعد سلیم نے ایک بوتل اُٹھائی۔ ''یہ مقدس پانی ہے اس سے میں تمہارے جسم کے نو کے نو دَر سربمہر کر دوں گا تا کہ کوئی بدروح اندر داخل نہ ہو سکے اس کے بعد ہو بہو یہی عمل تم مجھ پر دہراؤ گی۔'' اتنا کہہ کر سلیم نے آبِ مقدس میں انگلی ڈبوئی اور میری آنکھوں، لبوں، کانوں اور نتھنوں وغیرہ پر نشان بنا دیئے پھر میں نے سلیم کے ساتھ بھی یہی عمل کیا۔

''اب ہم ہر طرح تیار ہیں۔'' سلیم ہاتھی دانت کا دوسرا تعویذ اُٹھا کر سوٹ کیس کو بند کرتے ہوئے بولا۔ ''چلو چلیں۔''

سنگی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آخر کار ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جس کی ہمیں تلاش تھی۔ اس جگہ پرانی اور بوسیدہ دیوار کا کچھ حصہ گرا

ہوا تھا۔ چنانچہ اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ کر ہم آہستگی سے دوسری طرف اُتر گئے۔ دوسری طرف گھنے اور بلند و بالا درختوں کی وجہ سے اس قدر خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بہر حال ہم دونوں تعویذ کو چہروں کے سامنے پکڑے ہوئے اندازے سے آگے بڑھنے لگے۔ خشک پتے اور ٹہنیاں قدموں تلے آ کر ٹوٹ کر پُر ہول سناٹے میں دور دور تک کھڑ کھڑاہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ آخر کار تھوڑی ہی دیر کے بعد تاریکی کم ہو گئی اور ہم گھنے درختوں سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے آ گئے۔ اس سے آگے وسیع و عریض لان تھا اور اس کے بائیں طرف تقریباً دو سو گز آگے دھندلے آسمان کے پس منظر میں ایک عمارت کا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ زیریں منزل کی چند کھڑکیوں سے چھن کر نکلنے والی بہت ہی مدھم روشنی بھی نظر آ رہی تھی اور غور سے سننے پر بات چیت کی بھنبھناہٹ بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

ہم دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے عمارت کے بہت قریب پہنچ گئے۔ آگے ڈم ڈم کے پودوں کی گھنی باڑھ تھی۔ چنانچہ باڑھ پار کرنے سے پہلے ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مکان کے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا جائے لہٰذا دبے قدموں چلتے ہوئے جب ہم مکان کے دوسری جانب پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک بڑے گھاس دار میدان میں مختلف قسم کی سواریاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں نے گنیں تو کل ستاون سائیکل اور گھوڑا گاڑیاں تھیں اور اہم بات یہ تھی کہ ماسوائے چند ایک کے، سب کی سب بیش قیمت گاڑیاں تھیں۔ میں نے حیرانی ظاہر کی تو سلیم نے بتایا کہ شیطان کے پیروکار اور کالے جادو کے عامل عموماً غیر معمولی دولت مند ہوتے ہیں۔

اس طرف بھی بھاری پردوں کے باوجود زیریں منزل کی ایک کھڑکی سے مدھم روشنی نکل رہی تھی۔ ہم دونوں چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئے۔ کھڑکی کے راستے بہت سے لوگوں کے بات چیت کرنے کی بھنبھناہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں پنجوں کے بل چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ سلیم بھی میرے پیچھے تھا۔ پھر سلیم نے کھڑکی کی سل سے ذرا سا سر اُبھار کر دیکھا تو دبیز پردے کے ایک چھوٹے سے سوراخ سے کمرے کا ماحول کچھ نہ کچھ نظر آ گیا۔

وہ ایک بڑا ہال تھا۔ درمیان میں دو میزیں اور دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت سی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑی میزوں پر سفید میز پوش بچھے ہوئے تھے اور میزوں پر بے شمار پلیٹیں اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں بڑی قابیں تھیں جن میں کھانا چنا ہوا تھا اور تیس چالیس کے قریب اپنی بے داغ وردیوں میں ملبوس کوچوان کھانے پینے میں مصروف تھے۔ خوش فعلیوں کے ساتھ ساتھ وہ بات بات پر قہقہے بھی لگا رہے تھے۔ کمرے کی فضا سگریٹ کے دھویں سے معمور تھی۔ ان کے آقاؤں نے اپنی منزل پر پہنچ کر ان کی تفریح طبع کا سامان بھی مہیا کر دیا تھا کہ وہ بھی مصروف رہیں۔

سلیم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اشارہ کر کے کھڑکی سے ہٹ کر پیچھے مڑ گیا اور میں بھی ساتھ ہو لی۔ عمارت سے کافی پیچھے آ کر سلیم نے مکان کے گرد چکر مکمل کیا اور ہم واپس عقبی حصے کی طرف جا نکلے جہاں زیریں منزل کی کئی کھڑکیوں سے روشنی چھن کر نکل رہی تھی ان کھڑکیوں پر بھی بھاری پردے پڑے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود ایک کھڑکی کا بغور جائزہ لینے پر ہمیں ایک باریک سا سوراخ نظر آ گیا جس سے ہم اندر جھانک سکتے تھے۔ سوراخ اتنا چھوٹا تھا کہ اندر کمرے کا صرف تھوڑا سا ہی حصہ نظر آ سکتا تھا۔ بہر حال جو کچھ نظر آیا، اس کے بموجب یہ ایک بڑا استقبالیہ کمرا تھا۔ دیواریں ہلکی نیلی، فرش سرخ و سفید چپس سے بنا ہوا اور فرنیچر اطالوی طرز کا تھا۔

ایک شخص کرسی پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی اور اس کا سر کمرے کے خاصے حصے کو دیکھنے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ تاہم سلیم اور میں نے دیکھا کہ کمرے میں جتنے بھی آدمی تھے سب کے چہرے سیاہ نقابوں میں پوشیدہ تھے۔ ان کے لباس بھی ڈھیلے ڈھالے سیاہ لبادوں میں مستور تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سب کے سب کسی کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے جونہی ذرا سا پہلو بدلا تو میں نے دیکھا کہ اس کے سر کے بال کھچڑی اور گھنگریالے ہیں اور دائیں کان کا تھوڑا سا بالائی حصہ کٹا ہوا ہے۔ کٹے ہوئے حصے کا پورا کنارہ سرخ اور غیر معمولی موٹا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ کان میں نے کہیں پہلے بھی دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ پھر کہاں دیکھا ہے اسے؟ بہت سوچا مگر کچھ یاد نہ آیا۔

کمرے کے اندر موجود لوگوں کی حرکات و سکنات سے سلیم نے اندازہ لگایا کہ ان میں نصف کے قریب خواتین ہیں۔ اندر چلنے پھرنے کی وجہ سے مختلف لوگ سوراخ کی زد میں آ رہے تھے مگر میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں پہچان سکی لیکن دوسرے ہی منٹ جو شخص نظر کی زد میں آیا، اس کی موٹی گردن، سانولے رنگ اور گردن پر موجود بالوں کو دیکھ کر میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ عرفان تھا۔ وہی عرفان جسے اپنے تئیں میں جان سے مار آئی تھی۔ ننگائل کا وہ زمیندار جو کالے علم کا ماہر تھا، نظر آیا تو اسے دیکھ کر میں سوچ میں ڈوب گئی کہ یہ بچ کیسے گیا؟ مجھے فکر میں ڈوبا دیکھ کر سلیم نے ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود میری جگہ پر آ گیا۔ کافی دیر دیکھنے کے بعد سلیم ہٹ گیا اور میں نے سوراخ پر پھر سے نظریں جما دیں۔ سلیم کی جگہ لیتے ہی مجھے جو شخص نظر آیا، وہ فربہ بدن، کوتاہ قد اور گنجے سر کا مالک تھا۔ وہ بلاشبہ شورویر تھا۔ ابھی بہ مشکل ایک منٹ گزرا ہوگا کہ مجھے گویا برقی جھٹکا لگا اب جو شخص نگاہ کی زد میں آیا تھا، وہ پتلی نوکیلی ٹھوڑی، چھوٹے سر اور کمزور دبلے شانوں کی وجہ سے فوراً پہچان لیا گیا۔ وہ یقیناً اس کا دوست شنکر، میری ایک پرانی سہیلی کا بھائی تھا جسے میں نے ختم کر دیا تھا مگر اس وقت وہ زندہ نظر آ رہا تھا۔

''شنکر بھی اندر ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''اچھا؟ مگر سوال یہ ہے کہ اتنے زیادہ لوگوں کی موجودگی میں ہم شمس النہار تک کیسے پہنچیں گے؟'' سلیم نے آواز دبا کر کہا۔ اس صورت میں تو شمس النہار کو نکال لے جانا بہت زیادہ مشکل ہوگا لیکن موجودہ صورت میں تقریب کے آغاز کی بھی کوئی علامات نظر نہیں آ رہیں؟''

''نہیں...... ابھی تو وہ سب گپ شپ لگا رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ابھی گیارہ بجے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بارہ بجے سے پہلے تقریب کی کارروائی شروع نہیں ہوگی۔ اس طرح ابھی ہمارے پاس پورا ایک گھنٹہ باقی ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم کسی مناسب موقع کے منتظر رہیں اور کوئی بڑا خطرہ مول نہ لیں۔'' اتنا کہہ کر سلیم نے ایک مرتبہ پھر مجھے ہٹا کر سوراخ پر آنکھ جما دی۔ مزید پانچ منٹ گزرنے پر یوں لگا جیسے کمرا خالی ہوتا جا رہا ہے کن کٹا بھی کھڑکی کے قریب سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اسی وقت مکان کے دوسری طرف سے کسی کار کے انجن سٹارٹ ہونے کی گھر گھر سنائی دی۔

''وہ لوگ شاید جا رہے ہیں۔'' سلیم بولا۔ ''میرا خیال ہے تقریب یہاں نہیں بلکہ کہیں اور منعقد ہوگی۔ چلو جلدی کرو۔ ممکن ہے اس وقت ہمیں کوئی اچھا موقع مل جائے۔''

اندھیرے میں ہم دبے پاؤں احتیاط سے چل کر ڈم ڈم کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس طرف جا پہنچے جدھر بڑے میدان میں گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کار جس میں کئی انسانوں کے دھندلے سائے نظر آ رہے تھے، کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی اور ایک پک اَپ میں فولڈنگ میز کرسیاں اور بستر بند ٹوکریاں لادی جا رہی تھیں دو منٹ بعد فرنٹ سیٹ پر دو آدمی بیٹھے اور وہ بھی روانہ ہو گئی۔

تانگے رکشے اور بگھیاں وقفے وقفے کے بعد جاتی رہیں اور اس طرح نصف گھنٹہ گزر گیا۔ تانگوں کے درمیان چلتے پھرتے سادہ لبادوں میں مستور سایوں میں سے کسی کو شناخت کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر دوسری طرف وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔

کوئی بھی گاڑی بان نہیں گیا تھا اور بگھیاں آدھی سے زیادہ وہیں رہ گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ بگھی میں ایک ایک، دو دو یا پھر تین تین افراد آئے ہوں گے مگر بگھی میں پانچ پانچ چھ چھ آدمی گئے تھے۔

اب صرف دس بارہ آدمی باقی رہ گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ عرفان بھی جا چکا ہے۔ ''چلو جلدی کرو ہم اپنی بگھی میں ان کا تعاقب کریں گے ورنہ ان لوگوں کا سراغ پانا ناممکن ہو جائے گا۔''

تیزی سے مگر احتیاط سے چلتے ہوئے ہم دونوں شکستہ دیوار تک پہنچ گئے۔ دوسرے ہی منٹ ایک بگھی جس میں کئی لوگ بیٹھے تھے، ہمارے قریب سے گزر گئی۔

''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ بگھیاں دو دو منٹ کے وقفہ سے نکل رہی ہیں۔'' سلیم نے کہا۔ ''یہ اس لیے کہ ایک ساتھ روانہ ہونے سے سڑکوں پر جلوس کی شکل اختیار کر لیتیں اور شبہ ہو جانا یقینی تھا۔ اب اگر ابھی بگھی نکلی ہے۔ یہ آخری ہے تو اس میں موجود لوگوں کو ہماری بگھی کا لیمپ دیکھ کر ضرور شبہ ہو جائے گا اور اگر وہ آخری نہیں ہے تو وہ ضرور ہمیں اپنا ہی ساتھی سمجھیں گے اور ہمارے پیچھے آنے والے ہماری بگھی کو اپنی خیال کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی سلیم نے گھوڑے کو چابک رسید کیا۔ گاؤں سے آگے نکل کر ہمیں بگھی کا ہیولہ نظر آ گیا اور ہموار رفتار سے تعاقب شروع کر دیا۔

چوراہے سے آگے نکل کر بگھی تقریباً ڈیڑھ میل کے بعد دوسرے چوراہے پر بائیں طرف مڑ گئی۔ پھر کئی میل سنسان سڑک پر دوڑتی رہی۔ ہم یکساں فاصلہ برقرار رکھ کر بدستور اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف دور دور تک کسی عمارت یا آبادی کا وجود نہیں تھا۔ سیدھی اور سپاٹ سڑک پر تقریباً نصف میل پیچھے ایک بگھی تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ اس کے لیمپ کی تیز روشنی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

دس منٹ مزید گزر گئے۔ اب سڑک ہموار نہیں تھی۔ بلکہ چڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ دور دائیں طرف بلند و بالا پہاڑیاں دھندلے آسمان کے پس منظر میں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اگلی بگھی ایک اور چوراہے پر پہنچ کر دائیں طرف مڑ گئی۔ پھر سڑک سے ذرا سا ہٹ کر گاؤں بھی پیچھے رہ گیا۔ اس کے بعد پہاڑی کے گرد گھوم کر سخت چڑھائی شروع ہو گئی۔ دو تین میل سخت چڑھائی کے بعد بل کھاتی ہوئی سڑک نیچے وادی میں اُترتی تھی وادی سے گزر کر دوبارہ چڑھائی شروع ہو گئی۔ اب سڑک کی وہ حالت نہیں تھی بلکہ کافی مرمت طلب تھی۔ پہاڑ کے گرد لہراتی ہوئی سڑک پر چند میل مزید آگے جا کر ایک اور چوراہا تھا جہاں سے مختلف وادیوں کے لیے سڑکیں نکل رہی تھیں۔

آگے جانے والی بگھی اس مرتبہ بائیں طرف مڑ گئی لہٰذا سلیم نے بھی بگھی کو ادھر ہی موڑ کر تعاقب جاری رکھا ابھی نصف میل بھی آگے نہیں

گئے تھے کہ آگے والی بگھی نے نیم پختہ سڑک چھوڑ دی اور پتلی سی غیر ہموار سی کچی سڑک پر مڑ گئی۔ دھچکے اور ہچکولے کھاتے ہوئے اگلی بگھی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ میل ڈیڑھ میل تک اس نام نہاد کچی سڑک پر چلنے کے بعد اچانک ڈھلوان شروع ہوگئی اور ہم دونوں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بگھی ڈھلوان کے آخر میں اس کچی سڑک کو چھوڑ کر دائیں طرف طویل وعریض میدان کی طرف مڑ گئی جس میں ہاتھ ہاتھ بھر لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ یہ میدان تقریباً ڈیڑھ میل چوڑا تھا۔ چنانچہ میدان سے گزر کر بگھی ایک پہاڑی کے دامن میں جا کھڑی ہوئی۔ پہلے آنے والی تمام بگھیاں بھی وہیں قطاروں میں کھڑی ہوئی تھیں چندر کشے بھی تھے سلیم نے لگام کھینچ کر رفتار بھی کافی کم کر لی تاکہ وہاں بیٹھے شیطان کے پجاریوں کو آگے نکل جانے کے لیے کافی وقت مل جائے چنانچہ جب وہ بگھیوں سے اُتر کر ایک جانب چلے گئے تو سلیم نے بھی اپنی بگھی باقی بگھیوں سے ہٹ کر کھڑی کر دی اور تمام آنے والی بگھیوں کا انتظار کرنے لگے۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد پیچھے آنے والی گھوڑا گاڑی بھی ان سے دس بارہ گز کے فاصلے پر آ کر رک گئی اور اس میں سوار پانچ آدمی بھی ادھر ہی چلے گئے جدھر دیگر سواریاں گئی تھیں۔

ہم دونوں میں چند سیکنڈ تک سرگوشیاں ہوتی رہیں اور پھر طے پایا کہ میں احتیاط سے اسی طرف جا کر دیکھوں کہ وہ لوگ کدھر اور کہاں جمع ہو رہے ہیں۔

دس منٹ کے بعد میں نے آکر بتایا کہ وہ سب لوگ پہاڑی ڈھلوان پر واقع وسیع چبوترے نما جگہ پر جمع ہیں اور اپنا تمام ساز و سامان اور ٹوکریاں وغیرہ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔"

"چلو......اب چلیں۔" سلیم نے کہا اور ہم پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔

سلیم نے چاروں طرف نگاہیں ڈالیں تو تھوڑے ہی فاصلے پر ہمیں تاروں کی مدھم روشنی میں ایک چھوٹی سی قدرتی جھیل نظر آئی اور اسے دیکھتے ہی سلیم نے سب کچھ سمجھ جانے کے انداز میں سر ہلایا۔

"بلاشبہ تقریب یہیں ہوگی۔" سلیم آہستہ سے بولا۔ "کیونکہ کھلا پانی اس تقریب کا ایک اہم جز ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں گھاس پہ بیٹھ گئے اور سر اُٹھا کر جھیل کے کنارے کنارے چلنے پھرنے والوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔

پہاڑی کے دامن میں بھی دس بارہ آدمی فولڈنگ میزوں کو سیٹ کرنے اور ٹوکریاں کھول کھول کر کھانے پینے کی چیزوں کو میزوں پر لگانے میں مصروف تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلہ پر بائیں طرف ایک درجن کے قریب دوسرے لوگ تھے جو غیر ہموار اور ناتراشیدہ پتھروں سے بنے چبوترے کے گرد ہاتھ ہلا ہلا کر ایک ہی سُر میں خدا جانے کیا بڑبڑا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے جھیل کے کنارے جمع لوگ بھی چل کر وہیں پہنچ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چبوترے کے گرد جمع لوگ ان کے لیڈر تھے۔

پھر تین چار منٹ کے بعد اچانک اس پُر اسرار ماحول میں ایک عجیب ناقابلِ یقین اور ہیجان انگیز تغیر رُونما ہوا۔ پتھروں کے لمبے چوڑے اور خالی چبوترے پر یوں محسوس ہوا جیسے تاریک دھندلی فضا میں کوئی تاریک تر سایہ سا حرکت کر رہا ہے۔ پھر چند لمحوں کے اندر ہی اس ہیولے نے ایک واضح شکل اختیار کر لی۔ نہ جانے حقیقت تھی یا فریبِ نظر، بہرحال میری فہم و ادراک سے باہر تھا۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس خوفناک

شیطانی بلا کے جسم سے روشنی کی شعاعیں نکلنے لگیں۔ اس روشنی میں کافی فاصلے کے باوجود سلیم اور میں نے دیکھا کہ پتھروں سے بنے تخت پر ایک عفریت جلوہ افروز تھا۔

جہاں تک سلیم کا اندازہ تھا، یہ جگہ جو ہر طرف سے پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی اور کئی میل تک کسی آبادی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

تاروں کی مدھم روشنی میں ہم دونوں نے دیکھا کہ میزوں پر کھانے اور شراب کی بوتلیں چنی رکھی تھیں اور شیطان کے پجاریوں کا ہجوم سنگی چبوترے کے گرد دائرے کی شکل میں پھیل گیا تھا۔ اس طرح کہ نزدیک ترین آدمی ہم سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔

''یہ شیطانی کھیل کب تک جاری رہے گا؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''صبح مرغ بولنے تک۔'' سلیم نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''زمانہ قدیم سے یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ مرغ کے بولنے کے ساتھ ہی ہر قسم کی سحر طرازیوں کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔''

''مگر ابھی تو صبح ہونے میں چار گھنٹے باقی ہیں۔ اس دوران یہ کیا کریں گے؟''

''سب سے پہلے اپنے آقا یعنی شیطان کو خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ پھر اناپ شناپ کھائیں گے اور شراب پئیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر کام مذہب کے خلاف کریں گے۔ مذہب عبادت سے پہلے روزے کا حکم دیتا ہے جبکہ یہ خلافِ معمول بہت زیادہ کھائیں گے اور بہت زیادہ شراب پئیں گے۔ وہ دیکھو...... تمام لیڈر اب قربان گاہ کے سامنے پہنچ گئے ہیں۔''

سلیم کی نگاہوں کے تعاقب میں، میں نے نظریں گھمائیں تو دیکھا کہ نصف درجن کے قریب لیڈر سنگی چبوترے کے سامنے غیر معمولی لانبی موم بتیاں زمین پر لگا رہے ہیں۔ پانچ موم بتیاں ایک دائرے کی شکل میں اور چھٹی ان کے درمیان لگائی گئی تھی۔ جب وہ موم بتیاں روشن کی گئیں تو ان کے سرے پر طویل نیلگوں شعلوں نے اردگرد کے پچاس ساٹھ فٹ ماحول کو روشن کر دیا۔ ان میزوں پر روشنی پھیل گئی جن پر کھانے پینے کی چیزیں رکھی تھیں۔ روشن دائرے سے باہر وادی کا ماحول پہلے کی نسبت اب زیادہ تاریک محسوس ہو رہا تھا اور دائرے کے اندر سیاہ لبادوں میں ملبوس سائے بہت ہی خوفناک منظر پیش کر رہے تھے۔

''یہ سیاہ موم بتیاں رال اور گندھک سے بنی ہوئی ہیں۔'' سلیم نے سرگوشی کی۔ ''ان کی بُو ابھی تھوڑی دیر میں تم بھی محسوس کر لو گی۔ ان کے پیشوا کو دیکھو مجھے یقین ہے کہ ابھی کچھ دیر کے بعد ہم ایسی رسومات پوری ہوتے دیکھیں گے جو صرف افریقی جنگلوں میں موجود وحشی قبائل میں ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔''

اس دوران جبکہ باقی تمام لوگ میزوں پر کھانے پینے کی چیزیں لگانے میں مصروف تھے، ان کے لیڈر عجیب وغریب لباس پہن کر تیار ہو رہے تھے۔ ایک نے چہرے پر خوفناک مصنوعی سر چڑھا لیا تھا اور پروں سے بنا ہوا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن لیا تھا۔ جس کے پیچھے بھی دُم تھی جو زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ دوسرے نے اپنے چہرے پر خوفناک مینڈک کا سر چڑھا لیا تھا۔ جبکہ تیسرے نے بھیڑیئے کا چہرہ چڑھا رکھا تھا اور عرفان نے جو اپنی جسامت کی وجہ سے اب بھی صاف پہچانا جا سکتا تھا۔ ایسا لباس پہن لیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس وقت ایک خوفناک قسم کا بڑا چمگادڑ دکھائی دے رہا تھا۔

''اُف خدایا!'' میں نے زیرلب کہا۔ ''سلیم! کیا تم محسوس نہیں کر رہے ایک پُراسرار ٹھنڈک برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ دیکھو سنگی تخت پر براجمان عفریت غیر محسوس طور پر اپنی ہیئت تبدیل کر رہا ہے۔''

موم بتیاں روشن ہونے تک تو وہ عفریت کوئی انسانی ہیولا دکھائی دیتا رہا تھا لیکن اب اس کی ہیئت متغیر ہو کر نامعلوم قسم کے خاکستری جسم میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس کا سر بھی تیزی سے تبدیل ہو کر عجیب و غریب شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

''رحم خدا!'' سلیم بڑبڑایا۔ ''یہ تو وہ خوفناک مینڈھا ہے جس کے متعلق میں نے سالہا سال پہلے کبھی کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ یہ بذات خود مجسم شیطان ہے۔''

سلیم کے کہتے کہتے سنگی چبوترے پر بیٹھا عفریت ایک دیوقامت مینڈھے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جو دعا کے انداز میں بلند تھے، چشم زدن میں نیچے کی طرف جھک گئے اور فوراً ہی غیر معمولی بڑے کھروں میں تبدیل ہو گئے۔ بہت ہی بڑے سر پر بال نہ ہونے کے برابر تھے مگر داڑھی کافی لمبی تھی۔ اُبلی ہوئی آنکھوں کی ساکت پتلیاں میرا پتا پانی کیے دے رہی تھیں۔ بڑے اور نوک دار کان سر کے دونوں طرف سیدھے کھڑے ہوئے تھے اور سر پر چار لمبے سینگ تھے جن میں سے دو سیدھے آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور باقی دو اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔

مینڈھے کی واضح شکل اختیار کرتے ہی عجیب اور انوکھے لباسوں میں ملبوس لیڈروں نے ہاتھوں میں پکڑے بڑے بڑے اگردان نیم دائرے کی شکل میں اوپر نیچے لہرانے شروع کر دیئے۔ اگردانوں سے ملگجا کثیف دھواں نکل کر ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیطانی پروہت ہم آہنگ سُروں میں خدا جانے کیا بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

''یہ ان اگردانوں میں کیا چیز جلا رہے ہیں؟'' میں نے تیز بُو کی وجہ سے ناک سکیڑ کر اپنا گلا سہلاتے ہوئے کہا۔

''کیکر کے کانٹے، سیب کے پتے، رال، تارکول اور ایسی ہی دوسری چیزیں۔'' سلیم نے بدبو سے ناک مسلتے ہوئے کہا۔ ''کچھ چیزیں تو قطعی بے ضرر ہیں جبکہ کئی دوسری چیزیں بڑی تیزی سے حیوانی جذبات کو اُبھارتی ہیں جیسا کہ تم ابھی دیکھ لوگی۔''

اسی وقت مینڈھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا طویل دایاں کُھر ہوا میں لہراتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو آشیرواد دینے لگا۔ اس موقع پر اس کے پیشواؤں کی ناقابلِ فہم بڑبڑاہٹ میں بھی کافی تیزی آ گئی اور اگردان بھی تیزی سے لہرائے جانے لگے۔ پھر فوراً ہی بڑا پیشوا آگے بڑھا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ مینڈھے کے سر کے سامنے کر دیا۔ جونہی مینڈھے نے پیشوا کی انگلی میں پہنی انگوٹھی کو بوسہ دیا۔ باقی تمام پروہت سلامی دینے کے انداز میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے رکوع کی صورت میں جھک گئے۔

''اب موقع ہے ورنہ پھر کبھی ایسا موقع نہیں ملے گا۔'' میں نے سلیم کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... ابھی نہیں۔ شیطان کی رسم دعوت سے پہلے ہرگز نہیں ہو گی اور ان شاء اللہ ہمیں کوئی اچھا موقع ضرور ملے گا۔'' سلیم نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ تقریباً سو سیاہ پوشوں کی موجودگی میں شمس النہار کو نکال لے جانا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گا۔ ذرا سوچو تو سہی کہ کیا اس انبوہ میں شمسن کو لے جانا اتنا ہی آسان ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ وہ کسی قیمت پر اسے نہیں لے جانے دیں گے ہمارے منظرِ عام پر آتے ہی وہ ہمیں گھیر

لیں گے اور ہم نے اب تک اتنا کچھ دیکھ لیا ہے کہ وہ ہمیں ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے بلکہ اس عظیم تقریب کے موقع پر اس عفریت کے آگے ہماری قربانی پیش کر کے فخر محسوس کریں گے۔''

''نہیں...... میں نہیں مان سکتی کہ وہ قتل جیسا بھیانک جرم بھی کر سکتے ہیں۔''

''کس خیال میں ہو؟ قربانی کا دستور تو زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ یہ شیطان کے پجاری اگر موقع مل جائے تو ہماری قربانی دے کر انتہائی مسرت محسوس کریں گے۔ اس کے علاوہ خون کی قربانی تو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔''

''یہ سب زمانہ قدیم کی وحشیانہ باتیں ہیں۔''

''نہیں......'' سلیم سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ''اس بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو کہ خون زندگی ہے خواہ انسانی ہو یا حیوانی اور اسے جب بھی بہایا جاتا ہے تو اس سے ایک غیر مرئی توانائی خارج ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہے۔ اب اگر مخصوص تیاریوں کے ساتھ کسی محدود حلقے میں یہ توانائی خارج ہو تو اسے گرفت میں لے کر مطلوبہ سمت میں موڑا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ برقی قوت کو حسبِ خواہش استعمال کیا جا سکتا ہے۔''

''تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ انسانی جانوں کی قربانی نہیں دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ لوگ دنیا پر کس قسم کی آفت لانا چاہتے ہیں۔ مثلاً اگر وہ دنیا کو کسی خوفناک جنگ کی بھٹی میں جھونکنا چاہتے ہیں تو انہیں مریخ کو منانے کے لیے کنوارے مینڈھے کی قربانی دینی ہوگی اور اگر وہ دنیا میں شہوانی و نفسانی جذبات کو بھڑکانا چاہتے ہیں تو بکرا قربان کرنا ہوگا مگر انسانی قربانی ہر مقصد پورا کرتی ہے اور بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

سلیم کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ سنگی چبوترے پر براجمان دیو قامت مینڈھے نے قریب ہی رکھی لکڑی کی بہت بڑی پلیٹ دونوں کھروں میں پکڑ کر اٹھائی اور پھر زور سے پتھر پر دے ماری۔ پلیٹ ٹوٹ کر نیچے گر گئی۔ بلی کے سر والے پیشوا نے وہ ٹوٹی پلیٹ اٹھائی اور ہجوم کی طرف پھینک دی۔ بے شمار لوگ اس پلیٹ پر ٹوٹ پڑے اور اسے پیروں تلے کچل کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ ان کی تقریب کا گویا آغاز تھا۔ اس کے بعد سارے کے سارے وحشیانہ انداز میں کھانے کی میز پر ٹوٹ پڑے۔ تہذیب و آداب کو خیر باد کہہ کر وہ جانوروں کی طرح کھا رہے تھے۔ مٹھیاں بھر بھر کر وہ حلق میں ٹھونس رہے تھے اور منہ آسمان کی طرف اٹھا کر شراب کی بوتلیں حلق میں اس طرح انڈیل رہے تھے کہ زیادہ شراب ان کے کپڑوں اور جسم پر گر رہی تھی البتہ یہ سب کچھ نہایت خاموشی سے ہو رہا تھا۔

''چلو...... اب ذرا آگے چلیں۔'' سلیم نے سرگوشی کی۔ ''ممکن ہے، اس وقت کوئی موقع ہاتھ آ جائے۔''

وہ وحشیانہ ضیافت آدھا گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس دوران چھینا جھپٹی بھی ہوتی رہی اور شیطانی گروہ شراب پی پی کر جھومتا رہا۔ اس کے بعد انہوں نے میزیں الٹ دیں اور بچا کھچا کھانا، ہڈیاں اور خالی بوتلیں چاروں طرف زمین پر بکھر گئیں۔

شراب کے نشے میں مدہوش ہجوم میں شمسن دکھائی دے گئی۔ وہ چبوترے پر لیٹی تھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

''اس وقت اچھا موقع ہے۔ جلدی کرو۔'' سلیم نے مجھ سے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ سیاہ لبادے میں

ملبوس کن کٹا اس سے پہلے ہی شمسن کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دوسرے ہی منٹ میں تین اور پیشوا بھی شمسن کے پاس پہنچ گئے چنانچہ سلیم اور میں اب انتظار کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

لیڈر صاحبان جن میں عرفان بھی شامل تھا، ایک خاص میز پر جو عفریت کے عین سامنے لگائی گئی تھی، کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے کھانے کا انداز بھی کچھ کم وحشیانہ نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دو سیاہ پوش دیگ نما ایک بڑا برتن اُٹھائے ہوئے چبوترے کے سامنے آئے۔

''اس برتن میں کیا ہے؟'' میں نے پُر تجسس لہجے میں پوچھا۔

''انسانی گوشت۔'' سلیم نے جواب دیا۔ ''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس برتن میں کسی مردہ نومولود بچے کا گوشت پکایا گیا ہے یا پھر کوئی بدنصیب زندہ بچہ چرا کر پکایا گیا ہے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بڑے پتھروں سے چولہا بنایا گیا اور پھر اس میں لکڑیاں رکھ کر آگ لگا دی گئی۔ جب آگ اچھی طرح جل گئی تو وہ دیگ نما برتن چولہے پر چڑھا دیا گیا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اسے گرم کر رہے ہیں۔'' سلیم نے خیال ظاہر کیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈھکنا اُٹھایا تو برتن میں سے تیزی سے بھاپ نکلی۔ ڈھکنا ایک طرف رکھ دیا گیا اور اس کے بعد چھ کے چھ لیڈر برتن کے گرد جمع ہو گئے۔ عرفان بھی انہی میں تھا۔ پھر ایک بڑے چمچے سے گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں نکال کر وہ مزے مزے سے کھانے لگے۔

''اُف خدایا! سلیم، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' میری آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ''وہ دیکھو وہ جو اس کے ہاتھوں میں گول سی چیز ہے، وہ یقیناً بچے کی کھوپڑی ہے۔ ناقابلِ یقین۔ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔''

گوشت کو نوچ نوچ کر کھانے کے بعد ہڈیاں اسی برتن میں ڈال دی گئیں اور آگ مزید تیز جلا دی گئی۔

''اب یہ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اب یہ بچی کھچی ہڈیوں اور کھوپڑی کو دوبارہ پکا رہے ہیں۔ اس میں اور بھی چیزیں ڈالیں گے جب شوربہ اچھی طرح پک جائے گا تو تھوڑا تھوڑا شوربہ اور اس برتن کے نیچے جلنے والی آگ کی تھوڑی تھوڑی راکھ باقی ہے، سب لوگوں میں بطور تبرک تقسیم کر دی جائے گی۔ وہ اسے بوقتِ ضرورت تمام سال آئندہ یوم سبت تک استعمال کرتے رہیں گے۔''

''کس طرح استعمال کرتے رہیں گے؟''

''چونکہ یہ محلول مخصوص دن اور مخصوص تیاریوں کے بعد تیار کیا گیا ہے، اس لیے اس میں ایسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے سحر طرازی وفسوں کاری بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔''

بڑے پروہت نے، جس نے بلی کا چہرہ لگایا ہوا تھا، پتا نہیں کیا اشارہ کیا کہ تمام شیطانی گروہ ہر طرف سے آ کر چبوترے کے سامنے جمع ہو گئے تھے اور گروہ کے ہر شخص نے زور زور سے اُچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ یہ اُچھل کود اس قدر بھونڈے اور بے ڈھنگے انداز میں کی جا رہی تھی کہ اس

میں ذرا سی بھی ہم آہنگی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی رفتار میں تیزی آتی گئی۔ مجھے اپنی بصارت پر شبہ ہو رہا تھا۔ ابھی میں اپنی حیرت استعجاب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک نئے منظر کو دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔

شیطانی گروہ میں موجود دس بارہ لڑکیوں نے جو کہ مردوں کے ساتھ بے ڈھنگی اُچھل کود میں شریک تھیں چشم زدن میں اپنے لباس اُتار کر پھینک دیئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے مردوں نے بھی کپڑے اُتار پھینکے اور اس کے ساتھ ہی ابلیسی رقص میں ایک نئی جان پڑ گئی کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ یہ سلسلہ کئی منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد مادر زاد برہنہ لڑکیاں جن کے بال کھل کر بے ڈھنگے طریقے سے بکھر گئے تھے، ایک نئے انداز میں رقص کرتی ہوئی چولہے کے قریب پہنچیں جس کے اوپر دیگ نما برتن رکھا تھا اور نیچے آگ جل رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان لڑکیوں نے آگ کے گرد بڑا دائرہ بنالیا اور ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر ایک نیا رقص شروع کر دیا۔ ان سب کی پشتیں آگ کی طرف اور منہ دوسرے لوگوں کی طرف تھے۔ اب وہ ہم آہنگی کے ساتھ پہلے تو اس طرح آگے کو جھک جاتیں کہ دونوں ہاتھ ٹخنوں تک پہنچ جاتے اور ساتھ ہی بال زمین پر لہرانے لگتے پھر سیدھی کھڑی ہو کر کڑی کمان کی طرح تن جاتیں پھر تمام مرد بھی ان کے ساتھ اُچھل کود میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے بھی اپنا باقی لباس اُتار کر پھینک دیا اور بالکل ننگ دھڑنگ ہو گئے۔ صرف مصنوعی چہرے باقی رہ گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں کیا مرد اور کیا عورتیں، سب بُری طرح ہانپنے لگے۔ پانچ چھ مرد جو چند گز دور بیٹھے اور ہاتھوں میں عجیب وغریب بلکہ انوکھے ساز پکڑے وحشیانہ انداز میں پتا نہیں کون سی دھن بجا رہے تھے، مزید جوش میں آ گئے اور جھوم جھوم کر زور شور سے ساز بجانے شروع کر دیئے۔ رقص (اگر اسے رقص کہا جا سکے) کرنے والے مرد عورتیں بھی برق رفتاری سے سازوں کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ چند منٹ کے بعد اکا دکا مرد اور لڑکیاں بے دم ہو کر گرنے لگیں لیکن دوسرے ہی منٹ وہ پھر اُٹھ کھڑے ہوتے اور ایک تازہ ولولے کے ساتھ ہڑبونگ میں شریک ہو جاتے۔ شراب کے نشے میں تو وہ سب کے سب پہلے ہی بدمست ہو رہے تھے۔ چنانچہ اب انہیں دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ سب ہی ہوش وحواس گنوا کر پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے۔

اچانک سنگی چبوترے پر براجمان عفریت نے اپنے غیر معمولی بڑے کھر آگے پھیلا دیئے اور بڑی مکروہ آواز نکال کر دانت نکال دیئے۔ اس کے ساتھ ہی تمام شیطان کے پجاری اس کے آگے سجدے میں جھک گئے۔ وہ مکروہ آواز گویا شیطان کی آشیر باد تھی۔

''خدا ہم پر رحم کرے۔'' سلیم بولا۔ ''ہمیں اگر کچھ کرنا ہے تو جلد کر ڈالنا چاہیے کیونکہ وہ سب اس وقت بُری طرح تھک کر بے دم ہو چکے ہیں۔ اب اس کے بعد بپتسمہ سے ملتی جلتی ایک رسم ادا کی جائے گی اور اس رسم کی ادائیگی کے بعد ہم شمس النہار کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ اس کی روح ابد تک کے لیے جہنمی بن کر رہ جائے گی۔''

''کیا ہماری کامیابی کے کچھ امکانات ہیں؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایک مرتبہ اس جگہ سے ملے اور نیلگوں روشنی کے اس حصے میں داخل ہوئے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ان وحشیوں سے نہیں بچا سکے گی۔''

''میں ان لوگوں سے اتنا خوف زدہ نہیں ہوں جتنا کہ چٹان پر بیٹھے اس عفریت سے۔'' سلیم نے عفریت کی طرف نگاہیں پھیرتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے ڈر ہے کہ ہمارے دفاعی اقدامات اس کے جسم سے مرتعش ہونے والی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ لعنت ہے سردی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔''

اسی وقت شیطانی گروہ سے تین آدمی الگ ہو کر چبوترے کے عین سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ایک تو بڑا پروہت تھا اور دوسرا عرفان ان دونوں نے شمسن کو اپنے درمیان بازوؤں سے پکڑا ہوا تھا۔

''یا تو فوراً ورنہ پھر کبھی نہیں۔'' میں نے انہیں دیکھ کر جلدی سے کہا۔

''نہیں......نہیں......'' سلیم دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپتے ہوئے بولا۔ ''میں سخت خوف زدہ ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے مجھ میں ذرا بھی ہمت نہیں رہی۔''

☆=======☆=======☆

ہم نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں ایک دائرے کی شکل میں بڑی بڑی موم بتیاں روشن ہیں اور ان سے غیر فطری قسم کی سبز روشنی نکل رہی ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور ان کے سامنے چبوترے پر ایک عجیب وغریب دیو قامت جانور بیٹھا ہے جس کے گرد پجاریوں کا گھیرا ہے۔ سیاہ لبادوں میں ملبوس ان پجاریوں کو دیکھ کر میں اپنے دل میں سخت خوف کی لہر محسوس کر رہی تھی اور وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر میں اپنی پوری کوشش کے باوجود چبوترے پر بیٹھے عفریت سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔ یہی حال سلیم کا تھا وہ اپنی آنکھیں ڈھانپے مسلسل نہیں نہیں کی تکرار کیے جا رہا تھا، بار بار کہہ رہا تھا۔ ''میں سخت خوف زدہ ہوں۔'' اور نیچے کھلے میدان میں جمع تمام پجاری عجیب وحشیانہ انداز میں کھانے پینے اور ناقابلِ یقین ہلڑ بازی میں مصروف تھے اور کوئی غیر مرئی قوت مجھ کو اس منظر پر نظریں جمائے رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں زمین میں گڑ کر رہ گئی تھی اور پلک جھپکے بغیر متواتر سوگز نیچے چبوترے پر موجود عفریت کو دیکھے جا رہی تھی۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟''

''یہ..... یہ عفریت شیطان کا سب سے خطرناک روپ ہے۔ شورویر نے ہی اسے جگایا ہے۔ اگر اس کی پوجا مکمل ہو گئی تو پھر اسے روکنا ممکن نہ رہے گا۔ اسے کیسے روکوں؟''

پھر یوں لگا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ نیچے وادی سے سردی کی تیز لہریں اُٹھنے لگیں۔ میرے پیر سردی سے سُن ہو گئے۔ پھر سردی رفتہ رفتہ میرے تمام بدن میں سرایت کر گئی لیکن اس کے باوجود میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور کچھ پینے کی خواہش دم بدم شدت اختیار کرتی جا رہی تھی اس کے ساتھ ہی نیچے جا کر تقریب میں شمولیت کی خواہش نے بھی سر اُبھارا اور یہ خواہش بھی ہر لحظہ شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ دماغ میں زبردست کشمکش جاری تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے تمام اعضا شل ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی اور نظریں بدستور نیچے شیطانی منظر پر جمی رہیں۔ سینے پر ہاتھ باندھنے کی کوشش کی تو سردی سے اکڑے ہاتھوں نے دماغ کا حکم بجالانے سے انکار کر دیا۔ پھر میں نے خدا سے دعا مانگنے کی کوشش کی لیکن سوچی اور پھولی ہوئی زبان نے اپنی جگہ سے ذرا سی جنبش نہ کی اور دماغ نے بھی کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت کوئی بھی آیت مجھے یاد نہیں آ رہی تھی، میں نے انتہائی کوشش کی کہ اس طرف سے منہ ہی پھیر لوں مگر وہ بھی نہ کر سکی کیونکہ تمام جسم یوں لگتا تھا جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کھانے کی میز سے ہٹ کر تمام پجاریوں نے اپنے لباس اُتار پھینکے۔ پھر ساز بجنا شروع ہو گیا اور سب کے سب اس کی بے ربط دھن پر اوٹ پٹانگ اور اندھا دھند قسم کی اُچھل کود کرنے لگے۔

''یہ سب پاگل ہو گئے ہیں، پاگل ہو گئے ہیں۔'' میں نے اپنے آپ کو بار بار یہ جملے دہراتے ہوئے پایا۔ پھر میں سسکیاں لے کر رونے لگی اور کافی دیر تک روتی رہی۔

اوٹ پٹانگ رقص ختم ہو گیا اور تمام پجاری چبوترے پر موجود اس عجیب الخلقت جانور کے آگے جھک گئے۔ میں حیران تھی کہ اب کیا ہو گا تھوڑی ہی دیر کے بعد شمسن کو چبوترے کے سامنے لے جایا گیا اور میں فوراً سمجھ گئی کہ قربانی کا وقت آ چکا ہے اس کے ساتھ ہی مجھ پر دیوانگی طاری ہو

گئی پھر پتا نہیں وہ کون سی قوت تھی جس کے زیر اثر خود بخود ہی میرے قدم نیچے وادی کی طرف اُٹھنے لگے۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی مگر آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ پھر میں نے واپس ہو جانے کا بھی ارادہ کیا مگر کوئی مقناطیسی قوت برابر مجھے نیچے کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔

اب میں نزدیک ترین پجاری سے صرف دس گز کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی گو میں اب بھی تاریکی میں تھی لیکن اچانک چبوترے پر بیٹھے عفریت نے سر گھمایا اور اپنی شعلہ بار نظریں مجھ پر جما دیں۔ اب فرار ناممکن تھا۔ ساری کوششیں خاک میں مل گئیں۔ وہ غیر مرئی قوتیں جن کو حاصل کرنا چاہتی تھی اب میں خود ہی ان قوتوں کی مضبوط گرفت میں آ گئی تھی اور کشاں کشاں آگے چلی جا رہی تھی۔ دراصل سلیم کو حوصلہ ہارتے دیکھ کر ہی میں نے دل چھوڑ دیا تھا۔ خوف و دہشت سے میرے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا لیکن دوسرے ہی منٹ میں، مَیں سنبھل گئی۔

''تم یہیں ٹھہرو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' سلیم نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب میرے برابر میں آ کھڑا ہوا تھا۔

''نہیں...... نہیں خدا کے لیے مت جاؤ۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' اسے آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے روکا۔ سلیم کی مداخلت نے مجھ پر طاری کیفیت کو ختم کر دیا تھا۔

''اب چاہے کچھ بھی ہو، میں شمسن کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں آخری کوشش کرنا چاہتا ہوں۔''

''جیسے تمہاری مرضی، اب صرف روشنی ہی ہمیں بچا سکتی ہے کاش جلدی سے صبح ہو جاتی۔''

''ٹھہرو...... ٹھہرو شاید کچھ بات بن جائے۔'' اتنا کہہ کر سلیم واپس اوپر پہاڑی کی طرف بھاگنے لگا۔

''کچھ مجھے بھی تو بتا دو۔'' میں اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی بولی۔

''ہم ان پر گاڑی سے حملہ کریں گے گو اس میں بہت زبردست خطرہ ہے لیکن اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ وہاں ایک نہ ایک گاڑی ایسی ضرور ہو گی جس کے اگنیشن میں چابی لگی ہو۔''

سامنے ہی ایک جیپ مل گئی جس کی اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی میں پہنچتے ہی سلیم نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی ڈھلوان پر تیزی سے لڑھکتی چلی گئی۔

''جس وقت میں اشارہ کروں۔'' برابر بیٹھے ہوئے سلیم نے کہا۔ ''فوراً ہیڈ لائٹس روشن کر دینا۔ پھر چند گز دور سے ہی یہ ہاتھ میں پکڑی چھڑی تاک کر زور سے اس عفریت کے سر پر دے مارنا اور ساتھ ہی شمسن کو گردن سے پکڑ کر گاڑی میں کھینچ لینا۔''

''ویری گڈ...... مزہ آ گیا۔ یہ ہوئی نہ بات۔'' میں نے خوش ہو کر کہا کیونکہ اب میں تذبذب کی کیفیت سے نکل کر عمل کے لیے بالکل تیار تھی۔

''میں اب انجن بند کر رہا ہوں۔'' سلیم انجن بند کرتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی ڈھلوان پر اب خود ہی پھسلتی جا رہی تھی۔ ''قریب پہنچ کر میں دوبارہ انجن چلا دوں گا اور ساتھ ہی رفتار بھی بڑھا دوں گا۔ تم ہیڈ لائٹس روشن کر دینا۔''

خاموشی سے رات کی تاریکی میں پھسلتی ہوئی جیپ دوسرے ہی منٹ قریب ترین پجاری کے سر پر جا پہنچی۔ سلیم نے انجن سٹارٹ کر دیا اور دوسرے ہی سیکنڈ طاقتور ہیڈ لائٹس روشن ہو گئیں۔

انجن کے شور اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے اچانک تاریک وخاموش وادی میں جیسے زلزلہ آگیا۔ ساتھ ہی نیم تاریک منظر خیرہ کن روشنی میں نہا گیا۔ اُف خدایا کس قدر بھیانک منظر تھا جیپ مردوں اور عورتوں کے ہجوم کی طرف پوری رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ پہلے تو تمام پجاریوں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں ایک نظر جیپ کی طرف دیکھا مگر پھر فوراً ہی جان بچانے کے لیے کائی کی طرح اِدھر اُدھر چھٹ گئے۔ سلیم نے پیر کے دباؤ سے ایکسیلیٹر کو فٹ بورڈ پر جام کر دیا۔ اس کا رُخ عین چبوترے کی جانب تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ منہ ہی منہ میں پتا نہیں، کون کون سی دعائیں پڑھ رہا تھا۔

چبوترے کے قریب پہنچ کر ہیڈ لائٹس کی روشنی مدھم پڑ گئی لیکن سلیم نے ذرا بھی پروا نہ کی اور چبوترے کے بالکل قریب پہنچ کر ایک دم بریک لگاتے ہوئے گاڑی دائیں طرف موڑ کر روک لی۔ میں برق تیزی سے باہر نکلی اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ہاتھ میں پکڑی چھڑی عفریت کے منہ پر دے ماری۔ تعویذ منڈھی چھڑی کی چوٹ کا ردِعمل حیران کن تھا۔ عفریت نے ایسی چنگھاڑ ماری کہ دل دہل گئے۔ قربان گاہ پر روشن سیاہ موم بتیوں کے نیلگوں سبز شعلے یوں اچانک بجھ گئے جیسے برقی بلب سوئچ بند کرنے سے بجھ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ہیڈ لائٹس جو مدھم ہوگئی تھیں ایک دم پوری طرح روشن ہوگئیں اور تمام فضا بڑی ہی ناگوار بُو سے بھر گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے شمشان بھومی میں کوئی چتا جلائی جا رہی ہو۔

سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے جب دیکھا کہ چبوترے پر براجمان عفریت جیسے ہوا میں تحلیل ہوگیا ہے تو بلا تاخیر قریب ہی حیران و پریشان کھڑی شمسن کو گردن سے پکڑا اور جیپ کے اندر دھکیل دیا۔ پھر خود بھی پلک جھپکتے میں جیپ کے اندر ہوگئی سلیم تو پہلے ہی تیار تھا چنانچہ اس نے گیئر لگایا اور جیپ ایک جھٹکے کے ساتھ جدھر سے آئی تھی ادھر ہی روانہ ہوگئی۔ سلیم پوری کوشش کر رہا تھا کہ رفتار بڑھائے مگر یوں لگتا تھا جیسے کوئی طاقت گاڑی کو واپس کھینچ رہی ہے۔

جوں جوں گاڑی اور تقریب گاہ میں فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا، گاڑی کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر سلیم پھر بھی انجن کی پوری طاقت کو استعمال نہیں کر رہا تھا کہ مبادا کسی موڑ پر کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ پھر خوش قسمتی سے اسے دائیں طرف ایک تنگ سا راستہ نظر آگیا اور اس نے جیپ کا رُخ ادھر ہی موڑ دیا۔ کچے راستے پر مڑتے ہی سلیم نے گاڑی ہوا کر دی۔ راستہ غیر ہموار اور چھوٹے بڑے گڑھوں سے پُر تھا اس لیے گاڑی اُچھلتی کودتی دھچکے کھاتی تیزی سے برابر آگے بڑھی چلی جا رہی تھی اور آخر کار تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے ہم روڈ پر پہنچ گئے۔

سلیم بخوبی جانتا تھا کہ ہنوز خطرہ پوری طرح نہیں ٹلا اس لیے اس نے سڑک پر پہنچتے ہی گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی۔ ہم جلد از جلد شہر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم شہر کے قریب پہنچ گئے۔

''کیسی حالت ہے اس کی؟'' ایک جگہ گاڑی روک کر سلیم نے پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی ہے اور جب سے جیپ میں ڈالا ہے، اس نے ایک مرتبہ بھی پلک نہیں جھپکی۔ اُف خدایا! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔''

سلیم اس وقت کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا اور پژمردہ معلوم ہو رہا تھا۔ ''لو یہ پکڑو اور کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ اسے پلا دو۔'' سلیم نے کوٹ کی جیب سے ایک شیشی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے شمس النہار کا منہ کھول کر شیشی میں بھرے پانی کی تھوڑی سی مقدار اس کے حلق کے نیچے اُتار دی دوسرے ہی منٹ شمس النہار کے جسم میں معمولی سی حرکت ہوئی پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں میں مجھے اور سلیم کو پہچان لینے کی کوئی بھی علامت موجود نہیں تھی۔ چند سیکنڈ میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ زندہ ہے۔ ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ ختم ہو چکی ہے۔''

''میں اب بھی مطمئن نہیں ہوں۔'' سلیم نے کہا۔ ''ہمارے وہاں سے نکلنے کے بعد یقیناً جلد ہی وہ لوگ حیرتوں کے گرداب سے نکل کر اور حالات کی نزاکت کو سمجھ کر کچھ نہ کچھ کریں گے اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ کچھ نہیں کریں گے اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں گے۔''

''تمہارا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ شمس النہار کو دوبارہ لے جانے کی کوشش کریں گے۔''

''میرے خیال میں تو وہ ہمیں گھر تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے۔'' سلیم نے مایوسی سے کہا۔

''کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ وہ بھلا ہمیں کیونکر روک سکتے ہیں؟''

''وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں مثلاً وہ ہر قسم کے غلیظ جانور کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ چمگادڑیں، سانپ، بچھو، چوہے، لومڑیاں اور اُلو وغیرہ اس کے علاوہ بلیاں اور مخصوص نسل کے کتے جیسے ولف ہاؤنڈ اور السیشن وغیرہ بھی سیاہ قوتوں سے کام لے کر کنٹرول کیے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کا کوئی بھی جانور ہماری دوڑتی ہوئی جیپ کے پہیوں تلے آکر جیپ کو اُلٹ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ مقامی طور پر ہمارے چاروں طرف دھند چھا جائے اور ہم ڈھاکا تک پہنچنے سے پہلے ہی دھند کی وجہ سے کسی حادثے سے دوچار ہو جائیں۔ ڈھاکا ابھی کافی فاصلہ پر ہے اور صبح ہونے میں بھی ابھی کافی وقت ہے اس لیے جب تک صبح نہیں ہو جاتی ہم سخت خطرات میں گھرے رہیں گے۔''

''لیکن ہم صبح تک یہاں تو نہیں ٹھہر سکتے۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''ہرگز نہیں۔ اسی لیے میں کسی ایسی جائے پناہ کی تلاش میں ہوں جہاں ہم صبح ہونے تک شمس النہار کو محفوظ رکھ سکیں۔''

''کسی مسجد کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''بالکل ٹھیک رہے گا لیکن اس وقت تو تمام مسجدیں بند ہوں گی مگر ٹھہرو۔'' سلیم کو جیسے اچانک ہی کچھ یاد آ گیا ہو۔ ''ٹھیک ہے ہم شمس النہار کو ڈھاکا کی سب سے قدیم مسجد میں لیے چلتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر سلیم نے گاڑی کو پیچھے کی طرف موڑنا شروع کر دیا۔

''تو کیا ہمیں واپس جانا پڑے گا؟''

''صرف تین میل کے قریب پیچھے جا کر مسجد کا راستہ ہے۔ مسجد میں پہنچ جائیں گے تو ان شاء اللہ ہر طرح محفوظ و مامون رہیں گے۔''

جیپ سنسان و تاریک سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ ہر طرف گمبھیر سناٹا طاری تھا علاقے کے لوگ اپنے مکانوں میں چین کی نیند سو رہے تھے اور اس بھیانک جنگ سے قطعی بے خبر تھے جو اس علاقے میں تاریک و نوری قوتوں کے درمیان ہو رہی تھی۔

بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد آخر کار ہم ستارا مسجد تک پہنچ گئے۔

گاؤں کی بیرونی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ایک میل آگے خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ سلیم نے باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُجاڑ صحن میں پہنچ کر گاڑی روک لی۔ میں نے شمسن کو سہارا دے کر اُٹھالیا۔ پھر ہم دونوں ٹوٹی پھوٹی باڑھ سے اس قدیم مسجد کی طرف ہو لیے جس کی عمارت دھندلے آسمان کے پس منظر میں ایک سائے کی طرح نظر آرہی تھی اور جس کی تمام چھتیں امتدادِ زمانہ کی نذر ہو چکی تھیں۔

''جہاں تک میں سمجھتی ہوں، شورویر زبردست قوتوں کا مالک ہے اور وہ ہر قیمت پر شمسن کو لے جانے کی کوشش کرے گا اس لیے شمسن کو شورویر وعرفان کے دائرہ اثر اور ان کے سفلی علم سے بچانے کے لیے ہمیں لازماً کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر سلیم نے خدا جانے کیا کیا پڑھا اور مقدس پانی لے کر ہتھیلیوں اور تلوؤں پر ملا اور پھر کئی منٹ تک کچھ دعائیں پڑھتا رہا۔

دس منٹ کے بعد جب سلیم نے شمسن کے جسم کو ٹٹول کر دیکھا تو اطمینان بخش لہجے میں بولا ''خدا کا شکر ہے کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی اب اس کا بدن گرم ہو چلا ہے۔ چہرے سے خوف و دہشت کی علامت بھی معدوم ہوگئی ہے اور سانس لینے کی رفتار بھی ہموار ہوگئی ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ اسے اس وقت تک سونے دیا جائے جب تک خود ہی نہ جاگے۔'' اتنا کہہ کر سلیم آرام سے بیٹھ گیا۔

''یہ کتنی عجیب وغریب مسجد ہے تمہارے خیال میں کتنی پُرانی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً دو سو برس پُرانی۔'' سلیم نے جواب دیا۔

''کیا واقعی؟''

''ہاں......''

''دو سو برس پہلے کے لوگوں نے یہ اس قدر وزنی پتھر کس طرح اوپر تک پہنچائے ہوں گے۔'' میں نے گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس میں سو سو ڈیڑھ سو ٹن وزنی پتھر کی سلیں لگی ہوئی تھیں۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' ایک طویل سانس لینے کے بعد سلیم بولا ''اگر دلوں میں جذبہ، پختہ عقیدہ اور اپنے مقصد سے جنون کی حد تک لگن موجود ہو تو کوئی بھی کام ناممکن نہیں رہتا۔ تم شاید یقین نہیں کرو گی کہ یہ بھاری سلیں غیر ملکی ہیں اور تقریباً دو سو میل دور سے لائی گئی تھیں۔''

''غیر ملکی ہیں؟ کیا مطلب؟'' میں نے سخت حیران ہو کر کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اندرونی دائرے میں جو پتھر نصب ہیں، وہ دو سو میل دور سے لائے گئے تھے۔ ایسے پتھر پورے بنگال میں کہیں اور نہیں ملیں گے۔''

مشرق کی طرف دور اُفق پر سپیدہ، سحر نمودار ہو چلا تھا اور اس کی دھندلی سی روشنی محراب کے راستے اندر پڑ رہی تھی چنانچہ عمارت کے خطوط اب کسی حد تک واضح نظر آنے لگے تھے۔

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اچانک شمسن کے جسم کو حرکت ہوئی تو ہم دونوں غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ پھر اپنے دوستوں کو پہچانتے ہوئے بولی۔ ''میں کہاں ہوں؟''

سلیم جواب دینے کی بجائے اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھ کو بھی اشارہ کیا۔ پھر دونوں نے شمسن کو اُٹھا کر رکوع کی حالت میں کھڑا کر دیا۔ ''اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور خدا کا شکر بجالاؤ۔'' سلیم بھی گھٹنوں پر جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں دعا پڑھنے لگا ہوں۔ تم دونوں حرف بحرف دہراتے جانا۔''

اس کے بعد کئی منٹ تک سلیم پڑھتا رہا۔

''تم خوش نصیب ہو کہ واپس آ گئیں۔'' سلیم نے مشرق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شمسن نے مُردہ آواز میں کہا۔ ''لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ عرفان اتنی آسانی سے میرا پیچھا چھوڑ دے گا۔''

''اب تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ ہیں۔'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے عرفان کے متعلق سب کچھ بتا دو کیونکہ اس سے ہمیں کافی مدد مل سکتی ہے اور یاد رکھو کہ اصل مقابلہ تو ابھی اس سے ہونا باقی ہے۔ تمہیں جو اس سے نجات مل گئی ہے، قطعی عارضی ہے۔ وہ تمہیں دوبارہ لے جانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گا۔ پھر بھی خوف زدہ نہ ہو۔ ہم آخری لمحے تک مقابلہ کریں گے۔ اچھا...... پہلے عرفان کی خاص خاص باتیں تو بتاؤ۔ شاید ان میں اس کی کمزوری مل جائے۔''

''ایک اہم بات جو میں نے اس دوران دیکھی ہے۔'' شمس النہار بولی۔ ''وہ یہ ہے کہ عرفان انتہائی خلیق اور مہذب قسم کا انسان ہے۔ بچوں کی طرح مٹھائی پر جان دیتا ہے اور عمل تنویم کا زبردست ماہر ہے۔ کئی عورتیں اس کی معمول ہیں اور وہ انہیں ہپناٹائز کر کے گھر بیٹھے تمام حالات معلوم کر لیتا ہے۔ ایک لڑکی جس کا نام رضو ہے، اس کی بہترین معمول ہے۔''

''تمہیں بھی کبھی اس نے ہپناٹائز کیا ہے؟''

''ہاں...... ایک مرتبہ کیا تھا۔''

''اور اس کے بعد وہ تمہارے دل و دماغ پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ تم اپنا بھلا بُرا نہ سوچ سکیں اور اس کی مرضی کے تابع ہو گئیں۔''

''وہ دراصل مجھے اسی تقریب کے لیے تیار کر رہا تھا اور......'' شمس النہار کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ عین اسی وقت میں نے کہا کہ اب چلنا چاہیے۔

''چلو اب چلیں۔'' سلیم اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ہوٹل میں چائے انڈوں اور بھنے ہوئے گوشت کا آرڈر دے آیا ہوں۔''

''چائے، انڈے اور پھل وغیرہ تو ٹھیک ہیں لیکن ہمیں گوشت سے سخت پرہیز کرنا ہو گا اور بہتر ہو گا کہ کم سے کم کھائیں تاکہ ہماری روحانی قوت زیادہ سے زیادہ برقرار رہے۔ ہاں یاد آیا شمسن! بھئی کیا بتا سکتی ہو کہ یہ طلسم عظیم کیا بلا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں...... طلسم عظیم، طلسم اعظم کے متعلق جو کچھ میرے سننے میں آیا ہے، وہ یہ ہے کہ بائیں راستے کے راہی یعنی شیطان کے پجاری صدیوں سے اس کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ کوئی ایسی چیز ہے جو لامحدود قوتوں کی حامل ہے اور وہ جس کے قبضے میں ہو گی، وہ شخص ناقابلِ تصور مافوق العقل قوتوں کا مالک بن جائے گا۔ عرفان بھی اس کی تلاش میں ہے اس نے یہ بات معلوم کر لی ہے کہ اگر وہ ایک مخصوص ساعت میں خاص قسم کی رسومات ادا کرنے کا اہتمام کر لے تو طلسم اعظم کا اتا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ مخصوص ساعت زحل اور مریخ کا ہم برج ہونے کا وقت ہے اس کے ساتھ ہی اسے کسی ایسے شخص کی بھی اشد ضرورت ہے جس کی پیدائش ان دونوں سیاروں کے ہم برج ہونے کے دوران ہوئی ہو اور وہ شخصیت میں

ہوں۔" شمسن نے کہا۔ "اور بھی بہت لوگ ہوں گے لیکن کچھ نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ عرفان کے لیے اتنے مفید ثابت نہیں ہو سکتے جتنا کہ میں ہو سکتی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" سلیم بولا۔ "لیکن ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ طلسم اعظم ہے کیا چیز؟"

"ایک مرتبہ عرفان نے طلسم اعظم کو طلسمان آف سیٹ کے نام سے بھی پکارا تھا بہر حال اس سے زیادہ میں خود بھی نہیں جانتی۔"

"کیا...... کیا کہا تم نے؟" سلیم شدت حیرت سے اس طرح اُچھل پڑا جیسے پیر انگاروں پر پڑ گیا تھا۔

"طلسمان آف سیٹ۔" شمسن نے سلیم کو حیرت سے دیکھتے ہوئے دہرایا پھر بولی۔ "شاید اس سلسلے میں عرفان نے چار گھڑ سواروں کا بھی تذکرہ کیا تھا۔"

سلیم کے چہرے پر موت کی سی زردی چھا چکی تھی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورے جا رہا تھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد جیسے چونکتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ وہ چار گھڑ سوار جنگ، پلیگ، قحط اور موت کے نمائندے ہیں۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ جب پچھلی مرتبہ ان چاروں گھڑ سواروں کو آزاد کر دیا گیا تھا تو دنیا میں کس قدر خوفناک تباہی آئی تھی۔ بڑے بڑے ممالک اور بڑی طاقتوں کے سربراہوں کے ذہن دھندلا گئے تھے اور نتیجہ کے طور پر جنگِ عظیم چھڑ گئی تھی پھر اس جنگ کے نتیجے میں ایسی ایسی خوفناک بیماریاں پھیلیں اور ایسے بھیانک قحط پڑے کہ لاکھوں بندگانِ خدا لقمۂ اجل بن گئے تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے دوسری عالمگیر جنگ؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں سفلیات کے ماہر جانتے ہیں کہ کالے علم کے ایک خوفناک ماہر نے کسی نہ کسی طرح کوئی خفیہ طریقہ کار معلوم کر کے چاروں گھڑ سواروں کو آزاد کر دیا تھا۔"

"یقیناً وہ کوئی جرمن ہوگا؟" میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

"نہیں...... جرمنی نے جنگ شروع نہیں کی تھی بلکہ جنگ کا آغاز روس نے کیا تھا یہ روس ہی تھا جس نے سربیا کی پیٹھ ٹھونکی تھی اور آسٹریا کے مطالبات تسلیم نہیں کرنے دیئے تھے پھر جرمنی پر حملہ کر دیا تھا اور ان ساری فتنہ انگیزیوں کے پیچھے راسپوٹین کا گھناؤنا اور انتشار پسند دماغ کام کر رہا تھا اگر گزشتہ چند صدیوں پر نگاہ ڈالی جائے تو دنیا میں راسپوٹین سے بڑا اور بھیانک ساحر آج تک پیدا نہیں ہوا اس نے کوئی مخفی طریقہ معلوم کر کے چاروں گھڑ سواروں کو آزاد کر دیا تھا اور دنیا کو جہنم میں جھونک دیا تھا۔ طلسمان آف سیٹ ایک دوسرا طریقہ ہے اگر خدانخواستہ عرفان اس کے حصول میں کامیاب ہو گیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تخم حرام دنیا پر کون سی تباہی لائے گا۔ اس لیے قبل اس کے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اسے ختم کر دینا اشد ضروری ہے۔"

"مگر یہ سب باتیں بعد کی ہیں پہلے یہ بتاؤ شمسن کو کہاں رکھا جائے تاکہ عرفان یا شورویرا سے تلاش نہ کر سکے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ناممکن سی بات ہے۔ عرفان اور شورویرا سے ہر حال میں ڈھونڈ لیں گے۔ یہ سوچو کہ اسے محفوظ کیسے رکھا جائے۔"

''ایک ہی بات ہے۔''میں نے جواب دیا۔

''اسے اس کے ماموں ہی کے گھر میں پہنچا دیا جائے اور ہم لوگ نزدیک رہ کر اس کی حفاظت کریں گے۔''

''تو ٹھیک ہے۔وہیں چلو۔''

☆=======☆=======☆

''جب تک شمسن خطرے سے قطعی باہر نہ ہو جائے،آپ لوگ بڑی خوشی سے یہاں رہ سکتے ہیں۔ظاہر کہ مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔'' اس کے ماموں نے کہا لیکن اس کی نگاہوں میں اب بھی شکوک وشبہات کی پرچھائیاں موجود تھیں۔''اب یہ بتاؤ کہ ہم اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

''شکریہ......''شمسن بولی۔''لیکن اگر آپ کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا تو شاید میں اپنے آپ کو ساری زندگی معاف نہ کر سکوں۔''

''اب سب کچھ از سرنو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''میں نے پہلو بدلتے ہوئے شمسن سے کہا۔''اس بارے میں ہم پہلے ہی سفر کے دوران کافی بحث کر چکے ہیں۔سلیم کا خیال ہے کہ اگر مناسب پیش بندیاں اور حفاظتی تدابیر کر لی جائیں تو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا قطعی کوئی احتمال نہیں ہے۔''

''ہاں......میرا یہی خیال ہے۔''سلیم بولا۔''مگر آپ لوگوں کی مدد ہمارے حق میں فیصلہ کن ثابت ہوگی۔شمسن کی مزاحمت نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ وہ کافی عرصے سے عرفان کے زیر اثر چلی آرہی ہے۔ہم بھی گزشتہ شب کے واقعات کے بعد ذہنی وجسمانی طور پر کافی توانائی ضائع کر چکے ہیں چنانچہ آپ لوگوں کا اس جنگ میں شامل ہو جانا بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی محاذ پر تھکی ہاری فوج کو تازہ دم کمک پہنچ جائے۔آپ کی شمولیت سے طاقت کا توازن یقیناً ہمارے حق میں ہو گیا ہے اگر آپ اس وقت ہمیں یہاں رکھنے پر آمادہ نہ ہوتے تو میں نہیں سمجھتا کہ ہم کہاں جاتے۔بہرحال بہت بہت شکریہ۔''

''اچھا......اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''نورالنہار نے بہن سے کہا۔

''فی الحال تو میں ذرا شہر تک جا رہا ہوں کوشش کروں گا کہ ایک عامل سے کچھ مقدس لوبان حاصل کر لوں کیونکہ حفاظتی تدابیر میں مقدس لوبان کافی مؤثر ثابت ہوگا مگر میری واپسی تک آپ لوگ شمسن کو نظروں سے اوجھل مت ہونے دینا۔''شمس النہار کی بجائے سلیم نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے،تم جاؤ،میں بھی آرام کرنا چاہتی ہوں کافی تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں۔''شمس النہار نے جمائیاں لیتے ہوئے کہا۔

سلیم باہر نکل گیا اور ماموں شمسن کو ساتھ لیے زینے کی طرف بڑھ گئے تاکہ اوپر اسے خواب گاہ تک پہنچا دیں۔اتنے میں نوکر اندر داخل ہوا اور مؤدب لہجے میں بولا۔

''میڈم!کوئی شخص عرفان آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

عرفان کا نام ہی سن کر نورالنہار بوکھلا گئی۔مجھ سے اور سلیم سے اس خوفناک شخص کے متعلق وہ اتنا کچھ سن چکی تھی کہ اچانک اس کی آمد پر چکرا کر رہ گئی۔گو فہم وفراست میں اپنی بہن کے ہم پلہ تو نہیں تھی مگر کافی سمجھدار تھی۔

''اسے بلا لو،مگر ڈرنا نہیں۔میں برابر والے کمرے میں پردے کی آڑ سے تم پر نظریں رکھے رہوں گی۔اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں

فوراً مدد کے لیے آجاؤں گی۔'' میں نے کہا اور دوسرے کمرے میں جا کر پردے کی آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ وہاں سے اس کمرے کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔

''اسے اندر بھیج دو۔'' اس نے نوکر سے کہا۔ ''مگر ہوشیار رہنا میں جیسے ہی گھنٹی بجاؤں فوراً آجانا سمجھ گئے؟''

دوسرے ہی منٹ عرفان اندر داخل ہوا تو نورالنہار نے سر سے پیروں تک بغور اس کا جائزہ لیا وہ گرے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا غیر معمولی سرانڈے کی مانند چمک دار تھا۔

''میں اس طرح بن بلائے آنے پر معذرت خواہ ہوں۔'' عرفان کی آواز پاٹ دار اور لہجہ متاثر کن تھا۔ ''امید ہے کہ آپ میرا نام سن چکی ہوں گی۔'' اس کے ساتھ ہی عرفان نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا لیکن وہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ کالا جادو کرنے والوں کو نہ تو چھونا چاہیے اور نہ ہی اپنے گھر کی کوئی چیز انہیں کھانے کے لیے پیش کرنی چاہیے لہٰذا ہاتھ ملانے کی بجائے نورالنہار نے آتش دان کے دوسری طرف رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود آتش دان کے ادھر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

پہلے پہر کے سورج کی شعاعیں کھڑکی کے راستے عرفان کے شانے پر پڑ رہی تھیں پہلے تو اس نے طائرانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر بولا پتہ نہیں میرے متعلق آپ کو کیا کچھ بتایا گیا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ شمسن مجھے انتہائی عزیز ہے اور میں اس کی علالت کے دوران اس کی پوری طرح نگہداشت کرتا رہا ہوں۔''

''کیا میں تمہاری آمد کا مقصد پوچھ سکتی ہوں؟'' نورالنہار کا لہجہ قطعی روکھا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ شمس النہار اس وقت یہیں ہے؟''

''ہاں...... تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔'' نورالنہار نے مختصر جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ یہاں کی تازہ ہوا اس کے لیے بہت مفید ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ کچھ اہم معاملات کی وجہ سے شمسن کو آج رات کے لیے لے جانا بہت ضروری ہے۔''

''لیکن یہ ناممکن ہے۔'' نورالنہار نے متحکم لہجے میں کہا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ اسی قسم کے رویہ کا اظہار کریں گی کیونکہ میرے دوست سلیم نے پتا نہیں کیسی کیسی نامعقول باتیں آپ سے میرے متعلق کہی ہوں گی۔ بہرحال اس وقت میں تفصیل میں نہیں جاؤں گی مگر اتنا عرض ضرور کروں گا کہ اگر شمسن آج رات نہ گئی تو وہ مہلک قسم کے خطرات سے دوچار ہو جائے گی۔''

''جب تک وہ اس مکان میں ہے، اسے کوئی خطرہ درپیش نہیں ہو سکتا۔'' نورالنہار نے مؤثر لہجے میں جواب دیا۔

''یہ محض آپ کا خیال ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ دنوں سے شمسن ذہنی ابتری کا شکار ہے اور اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کا علاج صرف میں کر سکتا ہوں۔ اوہ مٹھائی۔'' عرفان مسرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دائیں طرف میز پر رکھے مٹھائی کے بڑے ڈبے کی طرف حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ کی اجازت سے مٹھائی چکھ سکتا ہوں، یہ میری کمزوری ہے۔''

''نہیں...... وہ ڈبہ خالی ہے۔'' نورالنہار نے لاپروائی سے جواب دیا۔

عرفان شاید جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے لیکن اخلاقی تقاضوں کے پیش نظر اس کی بات کو چیلنج نہیں کرسکتا تھا تاہم بولا۔ ''بہت خوب تو میں اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ پھرتی سے اُٹھا اور قبل اس کے کہ نورالنہار اسے روکتی اس نے ڈبا اُٹھا لیا اور وزن سے اندازہ لگا لیا کہ ڈبہ بھرا ہوا ہے۔

''نہیں...... نہیں۔'' نورالنہار یہ کہتے ہوئے تیزی سے اُٹھی اور ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنے قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس میں میری چھوٹی بہن کھلونے رکھتی ہے۔''

عرفان سمجھ گیا کہ اس کے سامنے کوئی ناسمجھ قسم کی عورت نہیں ہے۔ چنانچہ فوراً بولا۔ ''آپ کے رویے نے مجھے بہت مایوس کیا ہے مگر دوسری طرف یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی ہے کہ آپ واقعی ایک عقل مند خاتون ہیں۔ اس لیے میں اِدھر اُدھر کی ہانکنے کی بجائے اصل بات آپ کو بتانے لگا ہوں۔'' عرفان نے کہا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی مقناطیسی آنکھوں سے کام لینا ہوگا۔

''تم جو کچھ بھی کہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' نورالنہار نے بے نیازی سے کہا لیکن عرفان نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''میں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کہ کالا علم کیا ہے اور اس کے عامل اچھے لوگ ہیں یا بُرے، اس وقت میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ایک اہم تجربہ کررہا ہوں اور چونکہ شمسن میری بہترین معمول ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس کے بغیر میں اپنے تجربے پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا کالا جادو ایک قدیم اصطلاح ہے ورنہ یہ کالا ہوتا ہے اور نہ سفید بلکہ یہ ایک سائنس ہے اسے بُرا محض اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ یہ خفیہ طریقے سے کیا جاتا ہے کیونکہ اس پر لوگوں کی طرف سے سخت پابندیاں ہیں اسی لیے اس کے متعلق بہت کم لوگ جانتے ہیں یہ ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے ان نادیدہ قوتوں پر قابو پایا جاسکتا ہے جس کے متعلق عام لوگ کچھ نہیں جانتے اور غیر مرئی قوتیں اگر عامل کے مکمل کنٹرول میں رہیں تو قطعی بے ضرر ثابت ہوتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ایک ماہر الیکٹریشن بلاخوف وخطر بجلی کا کام کرتا ہے اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا جبکہ کوئی اناڑی اگر وہی کام کرے تو ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔'' عرفان اتنا کہہ کر رُکا۔ نورالنہار کے چہرے کا بغور جائزہ لیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے اور شمسن نے مل کر کچھ ماورائی قوتوں پر قابو پالیا ہے اور ہم دونوں مل کر ہی انہیں اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں اگر شمسن مجھ سے جدا ہوگئی تو وہ قوتیں بے قابو ہوجائیں گی اور پھر شمسن بچے گی نہ میں...... کیا آپ میری بات سمجھ گئی ہیں؟''

''ہاں......'' نورالنہار نے جواب دیا۔ عرفان اپنی تمام تر طویل گفتگو کے دوران بدستور اپنی مقناطیسی آنکھوں سے نورالنہار کی آنکھوں میں گھورتا رہا تھا چنانچہ خاطر خواہ اثر ہوا وہ بولی۔ ''آپ خاصے شریف آدمی ہیں۔ بھلا آپ کسی کے لیے کیونکر خطرناک ہوسکتے ہیں۔''

''شکریہ نورالنہار۔'' عرفان پھر شروع ہوگیا۔ ''مجھے امید تھی کہ میری وضاحت سن کر آپ مطمئن ہوجائیں گی اگر موقع ملتا تو میں سلیم اور اس کی دوست کو بھی مطمئن کردیتا لیکن افسوس کہ ان سے تفصیلی بات چیت کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ بائی دی وے، میں عطریات کا بھی ماہر ہوں۔ بہت

سی خواتین کے لیے میں مخصوص قسم کے عطر تیار کرتا ہوں جس سے ان کی انفرادیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اگر آپ حکم دیں تو آپ جیسی حسین خاتون کے لیے وہ چیز تیار کروں گا کہ آپ ساری زندگی یاد رکھیں گی۔''

''شکریہ مسٹر عرفان! آپ واقعی قابلِ قدر ہیں۔'' نورالنہار نے کہا۔ اس کی آواز کسی حد تک بدل چکی تھی۔

''سلیم کب آئے گا؟''

''کچھ پتا نہیں، شاید شام چھ بجے سے پہلے نہ آسکے۔''

''تو غالباً تمہارے ماموں شمس النہار کے پاس ہیں۔ میں تمہارے ماموں سے چند منٹ بات کر کے اسے بھی مطمئن کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آج رات شمسن کا میرے ساتھ جانا قطعی ناگزیر ہے اور مجھے سخت پیاس لگ رہی ہے ایک گلاس پانی مل جائے گا۔''

''ضرور، کیوں نہیں۔'' نورالنہار نے ہاتھ بڑھا کر گھنٹی کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ ''پانی کی بجائے، کچھ بسکٹ بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔'' شاید اب وہ مکمل طور پر عرفان کے دائرے کے اثر میں تھی۔ چنانچہ گھنٹی کا بٹن دبایا۔

''نہیں...... زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک گلاس پانی اور چند بسکٹ بالکل ٹھیک رہیں گے میں آپ کی مہربانی کا مشکور ہوں۔''

اسی وقت نوکر دروازے پر آیا اور سوالیہ انداز میں نورالنہار کی طرف دیکھا۔ اس نے اسے پانی اور بسکٹ لانے کا آرڈر دیا اور مسکرا کر عرفان کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ نوکر پانی کا گلاس اور بسکٹ لے آیا۔ مگر عرفان نے ادھر ذرا بھی توجہ نہ دی بلکہ نورالنہار کی آنکھوں میں بدستور جھانکتے ہوئے بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے آپ پچھلے دنوں کچھ علیل رہی ہیں اسی لیے بہت زیادہ درماندہ اور تھکی تھکی نظر آ رہی ہیں۔''

''نہیں...... میں بیمار تو نہیں رہی البتہ اس وقت پتا نہیں کیوں سخت تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں۔'' شاید اسے اچانک ہی بے حد تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور نیند کی وجہ سے آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو کر خود بخود ہی آنکھوں پر گرے پڑ رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے گہری نیند سو گئی۔

عرفان اپنی کامیابی پر مسکرانے لگا شاید یہ کام اس کے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ''سو جاؤ اور غور سے سن لو کہ تم سہ پہر چار بجے تک سوتی رہو گی۔''

نورالنہار کی بوجھل پلکیں دوبارہ گر گئیں لیکن چند سیکنڈ کے بعد ہی ایک جھٹکے سے اس نے آنکھیں کھول دیں اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی کیونکہ اسی لمحہ دروازہ زور سے کھلا تھا اور اس کی چھ سالہ ماموں زاد بہن چیختی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کی آواز نے نورالنہار کے ذہن پر عمل پذیر ہپناٹزم کے عمل کو روک دیا تھا۔

''کتنی پیاری بچی ہے۔'' عرفان بچی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ گڑیا میرے پاس آؤ۔''

نورالنہار کا ذہن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور وہ سر پر منڈلاتے ہوئے شدید خطرے کو پوری طرح محسوس کر چکی تھی چنانچہ بچی کو پکڑ

کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے چیخی۔ ''خبردار جو تم نے بچی کو ہاتھ بھی لگایا میں اب تمہیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں تم نے مجھے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کی تھی۔ تم بھیڑیئے ہو۔'' اتنا کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

''نہیں محترمہ! یہ سراسر بہتان ہے۔ ممکن ہے کہ میری غیر دلچسپ باتوں سے بور ہو کر آپ کو اونگھ آ گئی ہو۔''

''بکومت۔'' نورالنہار نے آتش بار نظروں سے عرفان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت دروازہ کھلا نوکر اندر داخل ہوا۔ ''اسے لے جاؤ۔'' نورالنہار، بچی کو ملازم کی طرف بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔ ''اور ماموں کو فوراً یہاں بھیج دو۔'' ملازم برق سرعت سے بچی کو ساتھ لے کر نکل گیا۔

''نورالنہار......'' عرفان حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ ''اس سے پہلے کہ میں اس مکان سے جاؤں شمسن سے میرا ملنا قطعی ناگزیر ہے۔''

''نکل جاؤ'' نورالنہار دھاڑی۔ ''میں کہتی ہوں میرے ماموں کے آنے سے پہلے ہی نکل جاؤ ورنہ.....'' اور ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر اس کی نظریں عرفان کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں لیکن اس نے فوراً ہی نظریں پھیر لیں اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

عرفان تیزی سے میز کی طرف بڑھا اور پانی سے بھرا گلاس اُٹھانا چاہا مگر نورالنہار اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ پانی کا گلاس اور بسکٹ منگانے میں بھی اس پر ہپناٹائز کا اثر کارفرما تھا اور وہ جانتی تھی کہ سامنے کھڑے شخص کو اپنے گھر کی کوئی چیز کھانے پینے دینا سخت خطرناک ہے چنانچہ ابھی عرفان کا ہاتھ گلاس تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ اس نے زور سے ٹھوکر مار کر میز اُلٹ دی بسکٹ اور گلاس نیچے گر کر چُور چُور ہو گئے اور پانی قالین پر دور تک پھیل گیا عرفان اسے غصے سے دیکھنے لگا اس نے شعلہ بار نظروں سے نورالنہار کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں پتا نہیں کیا بڑبڑانے لگا اس کی خود اعتمادی کو زبردست دھچکا لگا تھا کیونکہ دبلی پتلی اور پانچ فٹ قد کی ایک چھوٹی سی لڑکی نے اس کے سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیا تھا۔

عین اسی وقت جھٹکے سے دروازہ کھلا اور ماموں آندھی کی طرح اندر داخل ہوئے۔ ''کیا بات ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

نورالنہار کا خوفزدہ چہرہ دیکھ کر ماموں آگ بگولا ہو گئے چہرے کے عضلات کھنچ گئے اور آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ ''اس سے پہلے کہ میں تمہاری کھوپڑی توڑ دوں بہتر ہے نکل جاؤ۔'' ماموں کی مارے غصے کے بُری حالت تھی۔ ''نکل جاؤ ورنہ تمہاری عمر کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔''

عرفان دھمکی کی پروا کیے بغیر ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل صرف اتنی سی ہے کہ نورالنہار غالباً بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے میری خشک باتوں سے بور ہو کر شاید اونگھ گئی تھی اور سمجھنے لگی کہ میں اسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''مجھے تمہاری بات کا ذرا بھی یقین نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ فوراً نکل جاؤ۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تو یہاں صرف شمسن کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

''شمسن ہرگز نہیں جائے گی۔'' ماموں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اگر تم ذرا ٹھنڈے دل سے میری بات سنو تو سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔ دراصل میرے متعلق سلیم نے پہلے ہی تمہارے ذہن کو مسموم کر دیا ہے اس لیے تم قطعی یکطرفہ طور پر سوچ رہے ہو اور......''

''ماموں!'' نورالنہار چیخی۔ ''خدا کے لیے، اس کی آنکھوں کی طرف مت دیکھیں اور اسے فوراً یہاں سے نکال دیں۔''

''سن لیا تم نے۔'' ماموں پھنکارے۔ ''اب بہتر ہے کہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں چلا جاتا ہوں لیکن شمسن کو روک کر نہ صرف تم اس پر بلکہ خود اپنے آپ پر بھی ظلم کر رہے ہو بہرحال تم جانو البتہ اتنی گزارش ہے کہ اس سے صرف پانچ منٹ کے لیے مل لینے دو۔''

''ہرگز نہیں......اب جاتے ہو یا......'' کہہ کر ماموں اس کی طرف بڑھے۔

''چلا جاتا ہوں۔'' عرفان نے سرسراتی ہوئی آواز سے کہا۔

اب میرا دوسرے کمرے میں ٹھہرنا بے کار تھا اس لیے میں بھی کمرے سے نکل آئی۔

عرفان کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے چہرے پر غم و غصے کی جھلک پھیل گئی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو میں تم سے شکست کھا جاؤں گا۔ میں تم سے اپنے زخمی ہونے کا بدلہ بھی لوں گا تم نے کیا سمجھا تھا مجھے یا شورویر کو نقصان پہنچا دو گی۔ ہم امر ہیں ہمیں موت نہیں آ سکتی۔''

''تم دونوں نے میری زندگی جہنم بنائی ہے میں بھی ایسے نہیں چھوڑوں گی تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔''

''دیکھ لوں گا۔ تمہیں بھی اور سلیم کو بھی، تم دونوں کتنے پانی میں ہو میں دیکھ لوں گا۔'' کہتا ہوا وہ مڑا مجھے ایسا لگا جیسے وہ باہر جانا چاہتا ہو مگر نہیں اس نے پلٹ کر میری طرف کچھ اُچھالا تھا شاید وہ دھاگا تھا جو ہوا میں اُڑتا ہوا میری طرف آیا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ کوڑیالہ سانپ ہو جو پھن پھیلائے میری طرف بڑھ رہا ہو۔ میں نے بغیر کچھ سوچے بلا تامل اس دھاگے کی جانب منہ کر کے پھونک ماری۔ جلد بازی میں مجھے کوئی دعا یاد نہیں آئی تھی صرف اللہ کا نام یاد رہا تھا میں نے وہی دہراتے ہوئے اس جانب پھونک ماری تھی اللہ کے نام میں کتنا اثر ہے یہ اُس روز مجھے معلوم ہوا تھا۔ میں جو گلے گلے تک کفر کی دلدل میں دھنس گئی تھی۔ مندر مندر چکرا رہی تھی اور حقیقی قوت کو بھلا کر مصنوعی قوت کا سہارا لے رہی تھی اس چمتکار سے دنگ رہ گئی تھی۔ وہ اُڑتا ہوا دھاگہ ہوا میں ہی جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

''اچھا تو تم نے اس کا توڑ کر لیا لو اب اس کا توڑ کرو۔'' کہتے ہوئے اس نے جیب سے کچھ نکال کر میری طرف اُچھالا۔ میں ہوشیار ہو چکی تھی فوراً ہی اُچھل کر ایک طرف ہو گئی اور آیتِ قرآنی زور زور سے پڑھنے لگی ساتھ ہی ساتھ اپنی مدد کے لیے فقیر بابا کو آواز دیئے جا رہی تھی۔ عرفان کا پھینکا ہوا میرے جسم سے ٹکرانے کی بجائے زمین پر گرا تھا میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کالے دانے تھے جو زمین پر گرتے ہی انگارے بن گئے تھے۔ اگر وہ میرے جسم سے ٹکراتے تو یقیناً میرا جسم جل جاتا۔

میں نے اُچھل کر خود کو بچایا تھا، پھر عرفان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سینہ تانے کھڑا تھا اور مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ مجھے اس کی جسارت پر غصہ آ گیا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنے راستے سے ہٹانے کا ارادہ کر لیا۔ سلیم نے مجھے اس خبیث سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آدمی کو اگر ناگ ڈس لے تو وہ بچ سکتا ہے، لیکن عرفان کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں ہے۔

سلیم کی بات غلط نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سلیم کوئی معمولی شخص تو تھا نہیں۔ وہ جن پُراسرار حالات میں مجھے جنگل میں ملا تھا، وہ ہی اس کی قوت کا ادراک کرانے کے لیے کافی تھے۔ وہ آدی واسی (جنگلی) تھا۔ اس کے پاس مخفی علم کا خزانہ تھا مگر وہ مرتد نہیں تھا۔ اس پر ایک بزرگ کی عنایت تھی

جس کی وجہ سے وہ کفر کی دلدل سے خود ہی نکل آیا تھا۔ اس کے روشن دل کو دیکھ کر ہی فقیر بابا نے اسے مجھ سے ملوایا تھا یعنی ایسے حالات پیدا کردیئے تھے کہ میں اس غار تک پہنچ جاؤں جہاں وہ چھپا ہوا تھا حالانکہ اس کے دشمنوں نے، اس کے قبیلے کے جادوگروں نے اس کی جان لینے کی پوری کوشش کی تھی مگر وہ بچ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے میری مدد کرنا تھی اور وہ میری مدد کر رہا تھا۔ ہر گام پر وہ میرے لیے سینہ سپر بنا ہوا تھا۔ اگر وہ ابھی یہاں ہوتا تو عرفان کی ہمت نہ ہوتی کہ میرے سامنے آسکے۔ اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر ہی عرفان آیا تھا اور اب میرے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے حقارت تھی۔ اس نے ابھی تک پلکیں نہیں جھپکائی تھیں۔ اس نے نورالنہار اور ماموں کو قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔

میں بھی اسے غصیلی نظروں سے گھور رہی تھی۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے تول رہی تھی پھر قبل اس کے کہ میں اسے کچھ کہوں کہ اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''میرا اصول ہے کہ سانپ جب پھن اٹھائے تو اسے فوراً پیروں تلے کچل دو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''زیادہ دور کی سوچنے والے اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتے۔'' میں نے کہا۔ ''اونچی اُڑان کرنے والے اکثر منہ کے بل گرتے ہیں۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ انسان کو ہمیشہ اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔''

''اور جو لوگ اپنی حیثیت بھول جاتے ہیں، وہ کتے سے بدتر موت مرتے ہیں۔''

''تم شاید بھول رہی ہو کہ میں کون ہوں؟''

''زبان کو لگام دو عرفان! کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے تمہیں سمجھانا پڑے۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''تم بھی کچھ زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی ہمیشہ یاد رکھیں گی۔''

''جاگتے میں خواب دیکھ رہے ہو عرفان! اگر میں چاہوں تو ابھی تمہارے گھمنڈ کو چُور چُور کر دوں۔'' کہہ کر میں نے سلیم کے بتائے ہوئے عمل کو کیا۔ مخصوص الفاظ کا ورد کر کے اس پر پھونک ماری لیکن میرا یہ ورد بیکار گیا۔ فضا میں کچھ چنگاریاں ایک لمحے کو نمودار ہوئیں اور غائب ہو گئیں۔ عرفان کے گندے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اُبھری تو میں آپے سے باہر ہو گئی۔ میں نے سنبھل کر دوسرا حملہ کیا، لیکن اس بار بھی میرا عمل اس کے پیر نہ اُکھاڑ سکا۔ وہ بدستور اپنی جگہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عرفان نے غالباً اپنے گرد حصار باندھ رکھا تھا جسے میں توڑ نہیں پا رہی تھی۔ چنانچہ میں نے ایک آزمودہ اور زیادہ مؤثر عمل کو کرنے کی ٹھانی جو فقیر بابا نے ایک مرحلے پر تعلیم کیا تھا۔ میں نے وہی دعا پڑھ کر پھونک ماری۔ اس بار مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ عرفان کے اطراف شعلے اُبھرے تو وہ اُچھل کر دو قدم پیچھے ہو گیا۔ حصار ٹوٹ جانے کے سبب اس کے ہونٹوں کی ہنسی سنجیدگی میں تبدیل ہوئی تو میں نے حقارت سے کہا۔ ''اب بھی وقت ہے۔ میرے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لو ورنہ انجام خطرناک ہوگا۔''

عرفان نے جواب دینے کی بجائے پلٹ کر وار کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل رہی ہو۔ میں نے نہایت سرعت سے قلابازی کھائی اور جواباً زیادہ تیزی سے وار کیا۔ عرفان کو شاید میری جانب سے اتنی تیزی کی توقع نہیں تھی۔ میرے وار نے اسے پلک جھپکتے ہی زمین سے اُکھاڑ دیا۔ فضا میں اُچھل کر وہ دوبارہ زمین پر گرا تو اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

میں نے فوری طور پر دوسرا حملہ کیا، لیکن اب عرفان کو میری قوت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے زمین پر گرتے ہی تیزی سے کروٹ بدلی اور میرے حملے سے خود کو بچاتے ہوئے جوابی وار کیا۔ میں نے اس کے جوابی حملے کا توڑ کرنے میں ذرا بھی غفلت کی ہوتی تو وہ پوری طرح مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ ہمارے درمیان منتروں اور عملیات کا مقابلہ جاری تھا۔ کبھی میری قوت عرفان پر حاوی ہو جاتی۔ عرفان کے ناپاک وجود کو ملیامیٹ کرنے کی خاطر میں نے پے درپے اپنے تمام جنتر منتر اور عملیات کو آزما ڈالا، لیکن عرفان برابر میرے حملوں کا توڑ کرتا رہا۔ مجھے آہستہ آہستہ اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ عرفان کو زیر کرنا آسان نہیں ہے۔ میرے ترکش کے تیر ایک ایک کرکے ختم ہو رہے تھے کہ عرفان کے حملوں میں یکا یک شدت آ گئی۔

میں نے خود کو بچانے کے لیے تمام جتن کر ڈالے، لیکن ایک بار ذرا سی چوک ہو گئی اور اسی لمحے عرفان کے بیروں (مؤکلوں) نے مجھے اس طرح جکڑ کر بے بس کر دیا کہ میں زبان ہلانے سے بھی قاصر ہو گئی۔ اب میں اپنے موذی دشمن کے رحم وکرم پر تھی۔ میری زبان بند تھی اس لیے میں کوئی منتر، کوئی دعا پڑھنے سے قاصر ہو چکی تھی۔

عرفان کی خون اُگلتی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ اس نے میری بے بسی کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے بی بی! اس طرح زمین پر کیوں لیٹی ہو؟ تم تو مہان شکتیوں کی مالک ہو۔ تمہارے پاس کالا علم بھی ہے اور دعا کی قوت بھی۔ نور و نار دونوں تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا تم مجھے سبق نہیں سکھاؤ گی؟ سمجھا...... شاید اس وقت تم آرام کرنا چاہ رہی ہو۔''

عرفان کی باتیں مجھے کچوکے لگا رہی تھیں۔ میں اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اس نے پھر میرا مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''چپ کیوں ہو گئیں؟ کیا اس غلام سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے؟ معافی دے دو۔ کہو تو تمہارے پیروں پر سر رکھ کر معافی مانگ لوں۔ ایسی بھی کیا ناراضگی ہے؟''

میں تڑپ کر رہ گئی۔ عرفان میرے سامنے کھڑا میرا مضحکہ اُڑاتا رہا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے لیکن میں سوائے اپنی مجبوری پر آنسو بہانے اور کف افسوس ملنے کے اور کچھ کر گزرنے سے قاصر تھی۔ میرے ذہن میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ عرفان ماورائی قوتوں کے معاملے میں مجھ سے برتر ثابت ہوا تھا۔ مجھے سلیم کی نصیحت یاد آنے لگی تھی۔ اس نے چلتے وقت مشورہ دیا تھا کہ میں عرفان سے سیدھے ٹکرانے سے اجتناب کروں، مگر میں اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ان نصیحتوں کو فراموش کر بیٹھی تھی۔

''کیا سو گئیں؟'' عرفان کی چبھتی ہوئی آواز پھر میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے ہونٹوں کو دانتوں تلے سختی سے بھینچ کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجھے حقارت سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟ اس غلام کو خدمت کا موقع نہیں دو گی؟''

عرفان میری بے بسی کا مذاق اُڑاتا رہا اور میں کانٹوں پر لوٹتی رہی، پھر اچانک ہی مجھے فقیر بابا کا خیال آ گیا اور میں نے خاموش زبان سے انہیں پکارنا شروع کر دیا۔ میرے ہر موئے تن سے ایک ہی آواز نکل رہی تھی کہ فقیر بابا آپ کہاں ہیں؟ جلد مدد کو آ جائیں۔

پھر اچانک ہی خوشبو کا وہی مانوس جھونکا میرے وجود کے اطراف میں چھا گیا۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے تائید غیبی حاصل ہو گئی ہے۔ فقیر بابا آ پہنچے ہیں۔ اب میرے لیے ہر ناممکن بات ممکن بن چکی ہے۔ مجھے اس نابکار سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ڈرنے کا وقت گزر چکا ہے، لیکن

عرفان کو شاید اس کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ شاید میرے چہرے کی کیفیت بدل گئی تھی تبھی تو وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تمہاری آنکھوں کی چمک بڑھ رہی ہے۔ تمہارے چہرے سے موت کی بھیانک اور ہولناک سیاہی بھی چھٹتی نظر آ رہی ہے۔ کیا کوئی نیا منتر یا قرآن کی کوئی سورۃ یاد آ رہی ہے؟''

''لڑکی...... فقیر بابا کی مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔'' عرفان سے ٹکرا کر تم نے حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ تمہیں سلیم کی نصیحتوں پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ اس موذی سے محتاط رہنا چاہیے تھا۔ بہر حال اب میں آ گیا ہوں۔ تمہیں عرفان کے سامنے شرمندگی نہیں ہو گی۔''

''لیکن میں اس گدھے کے خلاف کچھ کرنے سے مجبور ہوں۔'' میں نے فقیر بابا سے ذہنی رابطہ قائم کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے میری زبان بند کر دی ہے۔ میں اپنے جسم کو بھی جنبش دینے سے قاصر ہوں۔''

''فکر نہ کرو لڑکی...... میں اس کی بندش کا توڑ کر رہا ہوں، لیکن تم یہی ظاہر کرنا کہ اب تک تم اسے جان بوجھ کر ڈھیل دے رہی تھیں۔'' فقیر بابا نے سرگوشی کی۔ ''میں تمہارے قریب ہوں، لیکن زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو، چھٹکارہ حاصل کر لو۔''

''کیا عرفان آپ کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہے؟'' میں نے ذہن کی زبانی دریافت کیا۔

''نہیں...... سوائے کامل بندوں کے، میری آمد کا پتا کوئی نہیں لگا سکتا۔ شورویر کی بات کچھ اور ہے کہ وہ انسان ہی نہیں ہے۔ ایک شیطانی طاقت ہے۔''

معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کی تمام بندشیں ٹوٹ چکی ہوں۔ میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بابا کے مشورے پر پہلے کی طرح بے بسی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ عرفان جو بدستور میرے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا تھا، مجھے جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے دیکھ کر بولا۔ ''ملکہ عالیہ! کیا آپ پلکوں سے بھی جاپ کر لیتی ہیں؟ دو چار ایسے منتر مجھے بھی سکھا دیں، ساری زندگی دعائیں دوں گا۔ چپ کیوں ہیں؟ کچھ بولیے ناں...... چہچہاتی ہوئی آپ زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ اتنی غصیلی و غضب ناک نظروں سے کیوں گھور رہی ہیں؟ کیا ابھی تک آپ نے اپنے اس غلام کو معاف نہیں کیا ہے؟''

''تم بولتے رہو عرفان! میں ابھی تمہاری گندی زبان سے بہت کچھ سننا چاہتی ہوں۔''

میں نے زبان کھولی تو عرفان اُچھل پڑا۔ اس کی ساری شوخی اور طراری کافور ہو گئی شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اپنی زبان اس کی مرضی کے بغیر ہلا سکوں گی۔ چند لمحوں تک وہ سکتے سے دو چار خاموش کھڑا مجھے حیرت سے گھورتا رہا، پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''تو تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ خیر...... میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں میرے ہاتھوں سے کون بچاتا ہے۔''

عرفان کے غلیظ ہونٹ متحرک ہو گئے۔ وہ مجھے زک پہنچانے کی خاطر پھر کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ میں نہایت لاپروائی سے اپنا لباس جھاڑتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ باباجی کی موجودگی میں وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''سنو عرفان! بہت ہو لیا۔ خیریت چاہتے ہو تو میرے راستے سے دور ہو جاؤ۔ اب تک میں تمہارے ساتھ رعایت کر رہی تھی، لیکن اب اگر تم نے کوئی گستاخی کی تو مجبوراً تمہیں کوئی ایسا سبق دینا پڑے گا جو تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہو گا۔''

جواب میں عرفان نے ایک خطرناک وار کیا لیکن بابا نے میرے اطراف میں حصار قائم کر رکھا تھا اس لیے عرفان کو اپنے مقصد میں

کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی منتر آزمائے، مگر اسے بدستور مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔ اس کی آنکھوں سے اب اُلجھن اور جھلاہٹ کے ملے جلے تاثرات جھلک رہے تھے۔ وہ جھلا کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

''رُکو مت عرفان! میں تمہیں موقع دے رہی ہوں۔ تمہیں جتنے بھی جنتر منتر یاد ہیں ایک ایک کر کے سب آزما ڈالو۔ جب تھک جاؤ تو خاموشی سے میرے راستے سے ہٹ جانا۔'' میں نے عرفان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو پڑھتے ہوئے کہا۔

''لڑکی! اس وقت میں تمہارے سامنے سے ہٹ جاتا ہوں، لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ عرفان نے اپنی ہار تسلیم کر لی ہے۔ میں بہت جلد تمہاری قوتوں کو دوبارہ للکاروں گا۔''

''خسارے میں رہو گے۔'' میں نے حقارت سے جواب دیا۔ ''اگر مجھے تم پر رحم نہ آتا تو میں تمہیں کسی حقیر کیڑے کی طرح مسل ڈالتی۔''

عرفان مجھے حقارت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے میرے راستے سے ہٹ گیا، پھر واپس مڑتے ہوئے بولا۔ ''بہت جلد ایک ٹکراؤ اور ہوگا، پھر دیکھوں گا کہ تمہارے اندر کون کون سی پُراسرار قوت ہے۔ صبر کرو۔ یہ وقفہ طویل نہیں ہوگا۔'' کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اب کمرے میں بظاہر ہم تین آدمی رہ گئے تھے۔ میں، نور النہار کے ماموں اور نور النہار..... عرفان کی شکست نے میرے حوصلے کو سوا کر دیا تھا۔ اب میں سیدھے سیدھے شورویر سے ٹکرانا چاہتی تھی۔ اس سے کس طرح اور کس بہانے سے دو دو ہاتھ کروں؟ میں انہی سوچوں میں تھی کہ نور النہار نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''آپا! اب کیا ہوگا؟ تم نے عرفان کو شکست دے کر بھی چھوڑ دیا۔ وہ اپنے گرو کو لے کر آ گیا تو؟''

''تو کیا ہوگا؟ میں اسے بھی دیکھ لوں گی۔'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔

''اب اور کتنا لڑو گی؟ ہر گزرنے والا پل ایک نئی اُلجھن کے ساتھ آتا ہے۔ میری مانو تو اب اس لڑائی بھڑائی کو بھول جاؤ اور ایک نئی زندگی کی شروعات کرو۔'' ماموں نے کہا۔

''آپ کا کہنا سو فیصد درست ہے مگر بتائیں کہ میں کیا کروں؟ اگر ان موذیوں کو چھوڑ دوں تو یہ مجھے پیس کر رکھ دیں گے۔''

''ابھی تو تم نے عرفان کو شکست دی ہے۔ شکست کے بعد وہ نچلا نہیں بیٹھے گا۔ کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈے گا اور بھرپور قوت سے وار کرے گا۔''

''بس کچھ ہی دن کی بات ہے، پھر دیکھنا کیا کرتی ہوں۔'' میں نے ماموں کو جواب دے کر نور النہار کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کوئی آسان راہ تلاش کرو۔'' ماموں نے اپنی بات نئے الفاظ میں کہی۔

''بس آپ لوگ دیکھتے رہیں اور بے فکر رہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں، آپ لوگوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔'' کہہ کر میں شمس النہار کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ کسی بھی طرح شورویر کو شکست دے دوں مگر یہ آسان بھی نہیں تھا۔ آسان راستہ کون سا ہے، میں اسی بارے میں غور کرتی رہی اور وقت گزرتا رہا۔ بالآخر شام کا سایہ اُتر آیا۔

شام آ گئی، پھر رات کا آنچل بھی گہرا ہو گیا۔ تبھی نور النہار نے آ کر کہا۔ ''سلیم آ گئے ہیں۔''

''انہیں یہیں بھیج دو۔'' میں نے شمس النہار پر نظر ڈال کر کہا۔ وہ اب تک بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی اور سلیم اندر داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر شمس النہار پر ڈالی پھر کہا۔ ''تم فکر نہ کرو، میں نے وہ راہ تلاش کی ہے کہ اس بے چاری کی گلوخلاصی تو ہوگی ہی، تمہیں بھی شورویر سے چھٹکارہ مل جائے گا۔''

''ایسی کون سی راہ ڈھونڈ لی؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''عرفان کچھ بھی نہیں ہے۔ اصل قوت شورویر کی ہے اور اسے شکست دینے کے لیے شمس النہار کو چارا بنانا ضروری ہے، لیکن فکر نہ کرنا کہ اس پر کوئی آنچ آئے گی۔ بس اسے سامنے رکھ کر میں ایک خاص عمل کروں گا۔ اس عمل کے ذریعے اسے بلاؤں گا۔''

''اس عمل کا نتیجہ الٹا نکلا تو؟ وہ کوئی بکری کا بچہ نہیں ہے کہ دوڑے اور پکڑ لیا۔ وہ ایک ایسی روح ہے جو کئی صدیوں سے بھٹک رہی ہے۔''

''اس روح کو اب اور زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔ شورویر اپنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر چکا ہے۔ اسے لگام دینا ہی پڑے گی۔''

''مگر کیسے؟'' میں مجسم سوال بن گئی۔

''بہت آسان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں تیاری کر آیا ہوں۔ روح کو بلانے کا ایک خاص عمل ہوتا ہے اور یہ تم بھی جانتی ہو مگر اس عمل سے شورویر جیسی قوی روحیں نہیں آتیں۔ ان کے لیے خاص عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس عمل سے وقت کا پردہ ہٹ جاتا ہے اور عامل ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود اس روح کے مسکن تک پہنچ گیا ہے۔ وہ عمل کیسے ہوگا، میں جانتا ہوں مگر اس کے لیے اپنے حضرت جی کی مدد ضروری ہوگی اور حضرت جی سے التماس تم کرو گی۔''

''ٹھیک ہے، میں فقیر بابا کو بلاتی ہوں۔''

''پہلے پوری بات تو سنو......'' کہہ کر سلیم نے اپنی پیٹھ کو تکیے کی پشت سے ٹیک دیا۔ پھر کہا۔ ''میں وہ عمل یہیں اسی کمرے میں کروں گا۔ تم دروازہ اندر سے بند کر کے آجاؤ اور گھر کے تمام افراد کو منع کر دینا کہ کوئی بھی دستک نہ دے۔ عمل ختم ہوگا تو میں خود دروازہ کھول دوں گا۔''

''جی اچھا......'' میں نے مرعوب لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شمس النہار کے ماموں باہر والے کمرے میں موجود تھے۔ میں نے ان کو تمام باتیں بتائیں اور التجائیہ انداز میں کہا کہ اس کمرے میں کسی کو آنے نہ دیں، پھر لوٹ کر سلیم کے پاس آگئی۔

بعض باتیں کتنی عجب اور دماغ کو چکرا دینے والی ہوتی ہیں کہ ان کی تہ تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا۔ عقل ماؤف ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں کہ وہی سلیم جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہ جانتا تھا، کس آسانی سے بابا جی کی دعا سے فرفر بنگلہ زبان بولنے لگا تھا۔ اگر وہ میری سمجھ میں آنے والی زبان نہ بولتا تو شاید میں اس کے اندر کتنی خوبیاں چھپی ہوئی ہیں، کتنا علم جانتا ہے، اس بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکتی۔ میرے پاس جو علم تھا، وہ اس کے علم کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے پتا نہیں کن کن بزرگ ہستیوں کی خدمت کی تھی جس کا صلہ ملا تھا کہ وہ اتنا قابل بن گیا تھا۔

''اوئے! نیچے کھڑی کیا سوچ رہی ہو؟ اوپر آجاؤ۔'' سلیم نے آواز دی تو میرے خیالات بکھر گئے اور میں دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے کمرے میں آگئی۔ سلیم نے کمرے میں پورا انتظام کر لیا تھا۔ لوبان کا گاڑھا کثیف دھواں کمرے میں پھیل رہا تھا۔ تیز خوشبو دماغ کو برما

رہی تھی۔ اس نے زمین میں بنے ایک دائرے میں بیٹھنے کا مجھے اشارہ کیا۔ میں اس دائرے میں بیٹھ گئی۔ اس نے سامنے بیٹھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا اور رہ رہ کر مٹھی مٹھی لوبان، لوبان دانی میں ڈالتا گیا۔ آہستہ آہستہ اس کمرے میں دھواں بھرتا جا رہا تھا پھر ایک وقت وہ آیا کہ آنکھیں کچھ دیکھنے سے بھی معذور ہو گئیں لیکن یہ وقفہ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ کمرے سے دھواں یکایک غائب ہو گیا ہے مگر جب غور کیا تو یہ وہ کمرا نہیں تھا بلکہ میں ایک اجنبی جگہ موجود تھی۔ یقیناً یہ ارکان کے جنگل میں واقع پگوڈا کا کمرا تھا اور مقدس تابوت میرے سامنے تھا۔ یہ وہی تابوت تھا جس تک پہنچنے کے لیے میں نے بے انتہا تکلیفیں اُٹھائی تھیں مگر آج میں کس آسانی کے ساتھ یہاں پہنچ گئی تھی۔ مجھے یاد آ رہا تھا وہ وقت جب میں اس تابوت تک پہنچنے کے لیے نکلی تھی اور جنگل میں بھٹک کر موت کی وادی میں پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے نکلی تھی تو ایک ایسے گھر میں پہنچ گئی تھی جو میری ہم شکل کا گھر تھا اور میں اس گھر میں کئی ماہ گزار چکی تھی۔ بے شمار واقعات یاد آتے جا رہے تھے اور میں خاموش کھڑی اس تابوت کو دیکھے جا رہی تھی جس کا ڈھکن بند تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس تابوت کا ڈھکن اُٹھا دیا۔ اندر ایک مرد کی لاش تھی۔ حنوط شدہ لاش...... اس طریقے سے مسالے لگا کر لاش کو محفوظ کرنے کا طریقہ مصریوں میں رائج تھا۔ مصر سے اتنی دوری پر برصغیر کے اس دور افتادہ علاقے میں، چٹاگانگ کے پہاڑی جنگلوں میں برما کی سرحد کے نزدیک ایک پگوڈا کے اندر اس لاش کو دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ لاش سوکھ کر تختہ بن چکی تھی۔

ابھی میں لاش کا معائنہ ہی کر رہی تھی کہ وہ لاش اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ ڈر جاتی۔ خوف زدہ ہو کر چیخیں مارنے لگتی مگر میری ان آنکھوں نے ایسے ایسے حالات دیکھے تھے کہ اب کوئی بھی بات حیرت کا موجب نہیں بنتی تھی کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ جادو سحر کی بھی ایک اٹل حقیقت ہے۔ بھلے ہی اس کا کرنے والا جہنم کا کندہ بنے۔ عقل کو عاجز کر دینے والی بات کو ''معجزہ'' کہتے ہیں اور معجزہ قدرتِ خداوندی کا مظہر ہے جو معصومین کو عطا ہوتا ہے۔ پیغمبرانِ خدا کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے بخشا جاتا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصا عطا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیحائی، حضرت داؤد علیہ السلام کو انگلیوں میں لوہا گلا دینے کا معجزہ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ شق القمر وغیرہ وغیرہ۔ معجزہ سے کچھ کمتر اعجاز ''کرامات'' ہے جو صالح المومنین کو عطا ہوتی ہے مثلاً حضرت خواجہ اجمیر رحمتہ اللہ علیہ کا پہاڑ کو ہوا میں روک دینا۔ اس پہاڑ کو جے پال جادوگر نے اپنے جادو سے اُٹھا کر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری پر پھینکا تھا۔ تارا گڑھ کا وہ پہاڑ آج بھی اجمیر شریف میں مرجع خلائق عالم ہے۔ شیطان نے جنت سے نکالے جانے کے بعد سے ہی انسان کو بھٹکانے کا مکمل انتظام کر لیا تھا۔ سچائی کے مقابل جھوٹ، عبادت کے مقابل کفر اور معجزہ کے مقابل جادو۔ گویا جادو کلی طور پر شیطانی علم ہے۔ جب شیطان کی حقیقت اٹل ہے تو جادو کی بھی اٹل ہے۔ پھر میں تو جادو کے ہزار ہا مظاہرے دیکھ چکی تھی اس لیے لاش کو اُٹھ کر بیٹھے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوئی۔

لاش نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی! تو نے مجھے دوسری بار جگایا ہے۔ یہی میری حقیقی زندگی ہے۔ بس میرے باہر نکلنے کی دیر ہے۔''

''تو یہ لے۔'' کہہ کر میں نے اس پر وہ مقدس پانی چھڑک دیا جو مجھے سلیم نے دیا تھا۔ اس پانی کی عجیب خاصیت نظر آئی۔ میں نے چلو میں بھرا تو مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا مگر جب اسے اس زندہ لاش پر چھڑکا تو یوں لگا جیسے وہ لاش نہ ہو، دلدل ہو۔ آپ نے دلدل میں اُبلتے بلبلے دیکھے ہوں گے۔ بالکل ویسے ہی بلبلے اس کے جسم سے اُبلنے لگے تھے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم پگھلے ہوئے موم کی طرح بہنے لگا۔ عجیب سا تعفن پھیل

گیا تھا۔ سانس لینا دشوار تھا۔

پانی کا چھینٹا پڑتے ہی کفن باکس میں رکھی لاش سے بلبلے اُٹھنے لگے۔ بالکل ویسے ہی جیسے دلدل سے اُٹھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ سڑی ہوئی مچھلی جیسی بُو ہر طرف پھیل گئی تھی۔ تعفن اتنی تیز تھی کہ ناک پھٹی جا رہی تھی۔ سانس لینا دوبھر تھا مگر مجھے ٹھہرنا تھا۔ اسے انجام تک پہنچانا تھا۔ میری ہنستی بستی ہستی کو اسی نے بگاڑا۔ اسی نے میری زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔ میر پور میں شاہ علی بغدادی کے مزار سے متصل وہ جگہ آج بھی نوحہ کناں ہے جہاں کبھی ہمارا گھر ہوا کرتا تھا۔ میرے ابو امی بھائی بہن تھے۔ اسی کے چکر نے وہ سب کچھ ختم کر دیا۔ آج میں نے اس پوری کہانی کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور سلیم کا دیا ہوا پانی چلو میں لے لے کر اس لاش پر چھڑکتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لاش پانی بن کر بہہ گئی۔

لاش کے پانی بنتے ہی ایسا لگا جیسے میں بہت ہلکی ہوگئی ہوں۔ سر پہ جو بھاری پن محسوس کر رہی تھی، وہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ گویا میں ہر طرح سے آزاد ہو چکی تھی۔

اپنا کام ختم کر کے مڑی تھی کہ مجھے سلیم نظر آیا۔ وہ گلیارے کے اختتام پر کھڑا ہوا تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے بلا رہا تھا۔ میں اسی طرح بڑھتی چلی گئی۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے کہا۔ ”مبارک ہو، تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اس پگوڈا کو شیطانی چکر سے آزاد کرا دیا ہے۔ آؤ ذرا گھوم پھر کر اس کا جائزہ لے لیں۔ شاید کوئی کام کی چیز ہاتھ لگ جائے۔“

”چلو......“ کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیئے۔ پوری عمارت خاموشی کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف جھینگروں کی جھائیں جھائیں گونج رہی تھی۔ ایسے وقت میں یہ آوازیں پُراسراریت کو سوا کر رہی تھیں۔ میری جگہ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو یقیناً خوف سے اس کی گھگھی بندھ جاتی مگر مجھ پر ایسا بھیانک ماحول ذرا بھی اثر انداز نہ ہوا۔ دل کے دھڑکنے کی رفتار بھی نہ بڑھی۔ میں نے عام سے انداز میں سلیم سے کہا۔ ”سلیم! غور کیا، کتنی گہری خاموشی طاری ہے۔“

”جس طرح نوری قوتیں صحت و تندرستی، فہم و فراست، خوشحالی و زندگی کی ترجمان ہیں، اسی طرح تاریک قوتیں بیماری، قحط اور موت کی نمائندہ ہیں۔ تاریک قوتیں خاموشی کو پسند کرتی ہیں۔“

ہم سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ اتفاق کی بات ہے اُدھر کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں اندھیرے کا راج تھا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ ہم ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھے۔ دروازے کے آگے ایک اور گلیارا تھا۔ اس گلیارے میں روشنی کا عکس آ رہا تھا۔ وہ روشنی ایک دوسرے کمرے سے منعکس (reflect) ہو رہی تھی۔ ہم اسی کمرے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ وہ ایک وسیع و عریض کمرا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس میں بہ آسانی دربار لگایا جا سکتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کمرے میں اندر کی طرف جھروکے بنے ہوئے تھے۔ جھروکے بنانے کی تُک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

عام طور پر محلوں میں جھروکے اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ بیگمات جھروکے میں بیٹھ کر تازہ ہوا سے لطف لے سکیں مگر یہاں معاملہ اُلٹا تھا۔ جھروکے اندر کی طرف بنے ہوئے تھے۔ ایسے جھروکے میں نے لکھنؤ میں دیکھے تھے بڑے امام باڑے میں اور ان کا مصرف یہ تھا کہ مجلس کے وقت

بیگمات آ کر ان جھروکوں میں بیٹھتی تھیں مگر یہاں کون بیٹھتا ہے، یہی سوچ رہی تھی کہ سلیم کی آواز نے چونکا دیا۔

''بہت خوب!'' سلیم کے تعریفی جملے نے میرے خیالات کو بکھیر دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ مغربی سمت کی دیوار کے نزدیک کھڑا وہاں لٹکتے ہوئے ایک بڑے سے نقشے کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ دیوار پر تین ساڑھے تین ہاتھ لمبا اور آٹھ نو ہاتھ چوڑا کپڑے پر رنگ و روغن سے بنا ایک نقشہ ٹنگا ہوا تھا۔ وہ نقشہ ستاروں اور سیاروں کی گزرگاہ کا تھا۔ کون سا ستارہ کس زاویے سے گھومتا ہے، یہ سب بڑی تفصیل سے دکھایا گیا تھا۔ پھر اس نے متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔'' تلاشی لینا ضروری ہے۔ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے۔ یہاں شیطانی عملیات میں کام آنے والے آلات و کتابیں بھی ہوں گی۔ انہیں ڈھونڈ کر تلف کر دینا ضروری ہے ورنہ کوئی دوسرا اسے حاصل کر کے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرے گا۔''

ہم دونوں تلاشی لینے لگے۔ دیوار میں ایک بڑی سی الماری بنی ہوئی تھی۔ اس الماری میں سے کئی عجیب و غریب چیزیں ملیں۔ پیتل کا بنا ہوا ایک مستطیل نما ٹکڑا جس پر ایک دوسرے کے اندر کئی دائرے بنے ہوئے تھے۔ ان دائروں کے اندر ایک پانچ پہلو ستارہ بھی تھا جس کے اندر سنسکرت میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک ٹیڑھی میڑھی بید کی چھڑی، سونے میں جڑا ایک بڑا سا بلور، پیتل کا ایک انسانی پنجے کی شکل کا چراغ جس کی ہر انگلی میں روئی کی بتی رکھ کر جلائی جا سکے۔ 13 عدد سیاہ موم بتیاں، سیندور کی ایک بڑی سی ڈبیہ اور ایک ''بھوج پتر'' پر سیاہ روشنائی سے لکھی چاندی کی جلد والی نہایت قدیم کتاب۔

ابھی سلیم اس کتاب کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ کمرے میں سرد لہر سی پھیل گئی۔ ایسی سرد لہر جس کا سیدھا اثر ریڑھ کی ہڈی میں محسوس ہونے لگا تھا۔ خوف کے اس احساس کو بڑھا دیا تھا فانوس میں جلتی شمعوں کی لو نے، جو اب دھیرے دھیرے کم ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شمعیں نہ ہوں، چراغ ہوں جن کی بتیاں نیچی کر کے لو کو کم کیا جا رہا ہو۔ کمرے میں دھیرے دھیرے روشنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے روشنی کم ہو رہی تھی، سردی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اب ہلکی ہلکی سرسراہٹ بھی سنائی دینے لگی تھی۔ ایسی سرسراہٹ جیسے سینکڑوں پتنگے اُڑ رہے ہوں۔ چھوٹے چھوٹے پروں کی نہایت ہلکی، بہت ساری آوازیں جب مل جاتی ہیں تو ایسی ہی مکروہ آوازیں بنتی ہیں۔ میں حیرت سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ فانوس کی تمام شمعیں گل ہو گئیں اور گہرا اندھیرا چھا گیا۔

اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تبھی مغربی کونے میں چمکتی ہوئی دو آنکھیں نظر آئیں جن کا حجم لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا اور ان آنکھوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں سلیم کے کچھ اور قریب کھسک آئی تبھی سلیم نے کہا۔'' خبردار...... اس کی آنکھوں میں نہ دیکھنا۔''

لیکن میں تو پہلے ہی بے بس ہو چکی تھی۔ پلکیں جھپکنا بھی بھول گئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری قوت آنکھوں کے رستے ان چمکدار آنکھوں کی طرف کھنچ رہی ہے۔ اب وہ آنکھیں واضح ہو چکی تھیں۔ مکمل انسانی شکل میں وہ ایک دیو پیکر تھا جس کی آنکھیں مجھے پچھاڑے دے رہی تھیں۔ اُلٹے توے کی سی رنگت اور جسم کسی پھولے ہوئے غبارے کی طرح جو ابھی مزید پھول رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم اس پورے کمرے کو گھیر لے گا۔

مجھے سلیم کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر میں جواب دینے سے قاصر تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم اپنے اندر کی قوت کو مجتمع کرو۔ مالکِ کل سے مدد طلب کرو اب اسی کا سہارا ہے۔ جو بھی دعائیں یاد ہوں، انہیں پڑھو۔ اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔ شیطانی قوت صرف ڈرا سکتی ہے، وہ بھی تب جب تم ڈرو گی ورنہ وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی ہے۔“

میں نے ذہن پر زور دینا شروع کیا۔ ایک تو میں پہلے ہی گناہوں کی دلدل میں ڈوبی ہوئی تھی جس کی وجہ سے نماز روزے سے دور تھی۔ اس پر ان آنکھوں کا سحر...... میں بالکل لاچار ہوگئی۔ ایک بھی دعا یاد نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بے چارگی سے دل ہی دل میں کہا۔ ”اے اللہ! میری مدد کر۔“ بس اتنا کہنا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے ذہن پر چھائی دھند چھٹ گئی ہے اور میں نے سورۃ توحید پڑھنی شروع کر دی۔ جیسے جیسے قل پڑھتی جا رہی تھی، اس دیو پیکر عفریت کا قد گھٹتا جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ غائب ہوگیا۔

قرآنی سورتوں میں اتنی قوت ہوتی ہے، یہ میں نے اب جانا تھا اپنی زندگی کو ملیامیٹ کرنے کے بعد۔

”خدا کا شکر ہے کہ ہم بچ گئے۔“ سلیم نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ”یقیناً یہ شیطان تھا کیونکہ خود میری قوت بھی سلب ہو رہی تھی۔ اب یہاں سے نکل کر چلنے میں ہی عافیت ہے۔“

”تو دیر کیسی، چلو، نکل چلتے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے اس اقدام نے میرے جسم میں سرد لہری دوڑا دی اور میں نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ شاید شدت جذبات سے میرا چہرہ سرخ ہوگیا تھا تبھی تو اس نے کہا تھا۔ ”ارے...... تم نے میری غلطی کو اتنی شدت سے محسوس کیا کہ چہرہ گلنار ہوگیا۔ بھئی...... غصہ تو نہ کرو۔ نادانستگی میں تمہارا ہاتھ پکڑا تھا۔“

اب میں اسے کیسے سمجھاتی کہ جذبات کی ڈور خیالات سے بندھی ہوتی ہے۔ اس کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ ہے، اسی لیے میں نے اتنا محسوس کیا مگر زبان سے کچھ نہ کہا اور آگے بڑھتی رہی۔ مجھے پھر پا پیادہ اتنا لمبا سفر طے کرنا تھا۔ اس گھنے اور دشوار گزار جنگل کو پار کرنا ہے۔ جنگل پار کرنے کے بعد ہی رانگاماٹی جانے والی سڑک ملتی۔ شام سے پہلے پہلے ہمیں اس سڑک تک پہنچنا تھا ورنہ بس نکل جاتی اسی لیے میں نے اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔ ہم ساتھ ساتھ اس پہاڑی سلسلے کو پار کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ راستے میں جا بجا گھاٹیاں، کھڈے اور نوکیلی جھاڑیاں آ رہی تھیں جنہیں ہم پار کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ تقریباً چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ جسم پر کئی جگہ کٹیلی جھاڑیوں نے نشانات ڈال دیئے تھے جن کی جلن بے چین کر رہی تھی، پھر پنڈلیاں بھی چیخ رہی تھیں کہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ بالآخر میں نے یہ بات کہہ ہی دی کہ کچھ دیر ٹھہر کر ستا لیا جائے۔

میری استدعا پر سلیم نے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک دوسرے پتھر پر بیٹھ گیا۔ یونہی وقت گزاری کے لیے میں نے کہا۔ ”اصل دشمن تو واصل جہنم ہوا۔ اس کے شر سے آزادی ملی۔ اب صرف ایک دشمن باقی رہ گیا ہے۔“

”کون...... عرفان؟“ سلیم نے پوچھا۔

”ہاں...... اسے توبہ کرا دوں تو چھٹی ہے۔“

”جب اتنے بڑے دشمن کو اس کی اوقات بتا دی تو پھر عرفان کی حیثیت کیا ہے۔ وہ تو ایک پھونک کی مار ہے۔“

''مگر یہ بھی یاد رکھو کہ اس نے بہت سارے مؤکل پال رکھے ہیں۔ کئی جنات بھی اس کے تابع ہیں۔''

''تو کیا ہوا، وہ شوروپر سے زیادہ طاقتور، علم والا نہیں ہے۔''

''اچھا...... یہ بتاؤ کہ جنات کیا کیا کر سکتے ہیں؟''

''حضرت عبدالواحد مفتی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''عجائب القصص'' میں جنات کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک آگ پیدا فرمائی۔ اس آگ میں نور بھی تھا اور ظلمت بھی۔ نور سے فرشتے پیدا کیے۔ دھوئیں سے شیاطین اور آگ سے جنات۔ لہٰذا نور سے پیدا ہونے والے فرشتے، بالطبع اطاعت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ شیاطین چونکہ ظلمت سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے وہ اضطراری طور پر ناشکری، تمرد اور سرکشی میں پڑ گئے۔ جنات کے مادے میں چونکہ نور اور ظلمت دونوں چیزیں ہیں، اس لیے ان میں سے بعض ایمان کے نور سے مشرف ہوئے اور بعض کفر و گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت کعب احبار ''الانس والجلیل'' میں فرماتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ نے آٹھ سو سال میں آٹھ سو نبی قوم اجناء میں بھیجے۔ پہلے نبی کا نام عامر بن الجان تھا۔ ان کے بعد صاعق بن عبوح تمارو بن الجان کو مبعوث فرمایا۔ جنات ایک کے بعد ایک نبی کو قتل کرتے رہے۔''

''جنات کے پُراسرار حالات'' میں مذکور ہے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''جس طرح انسانوں کے مختلف مذاہب ہیں، اسی طرح جنات بھی مختلف مذاہب رکھتے ہیں۔ ''شر'' جن کی سرشت میں ہے مگر شر کا اظہار صرف نچلے طبقے کے جن کرتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے جن خوفِ خدا میں زندگی گزارتے ہیں۔ نہ کسی کو ستاتے ہیں اور نہ عبادت سے جی چراتے ہیں اسی لیے ان پر فتح پانا کسی معمولی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اعلیٰ نسل کے جن جو چاہیں، کر دکھائیں مگر اپنی قوت کا بے جا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں۔''

''تم نے کبھی کسی جن کو تابع کرنے کی کوشش کی؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔'' ابھی سلیم نے اتنا ہی کہا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ بنگال میں بارش ہونا معمول کی بات ہے۔ ابھی سورج چمک رہا ہے کہ ابھی بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے میں نے ایک گھنے پیڑ کی جانب دوڑ لگا دی۔ سلیم بھی اسی پیڑ کے نیچے آ کھڑا ہوا تھا۔ پتوں سے چھن چھن کر بوندیں ہم پر گر رہی تھیں۔ کپڑے گیلے ہوتے جا رہے تھے۔ جسم سے چپکتے ہوئے لباس کی وجہ سے میں پریشان ہو اٹھی تھی۔ سلیم نے اخلاقاً اپنا رُخ تبدیل کر لیا تھا۔ وہ برستی ہوئی بوندوں کو دیکھ رہا تھا۔ ''یا اللہ! یہ برسات کب رُکے گی؟'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ بارش کا زور ٹوٹنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد بارش رُک گئی اور سورج چمکنے لگا۔ میں نے کپڑوں کو درست کرتے ہوئے سلیم سے کہا۔ ''اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ چلو آگے چلتے ہیں۔ شاید کوئی بستی مل جائے۔''

ارکان کے اس جنگل میں تین قومیں بسی ہوئی ہیں۔ ''چکما'' جو بدھ مت کو مانتے ہیں اور اپنی عبادت گاہ کو ''پگوڈا'' کہتے ہیں۔ دوسری آبادی ''بدیہ'' مسلمانوں کی ہے جو حنفی العقیدہ ہیں اور تیسری آبادی ''شوید بنگشو'' جو جعفری مسلک کے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی بستی میں ہمیں پناہ مل سکتی تھی۔ اسی امید پر ہم بڑھتے جا رہے تھے۔ کافی دیر چلنے کے بعد چھوٹی بڑی جھونپڑیوں کے ہیولے نظر آئے۔ ہم نے رفتار مزید تیز کر دی اور کچھ ہی

دیر میں ہم اس بستی میں پہنچ گئے۔ یہ بستی چکمہ قبیلے والوں کی تھی۔ یہ لوگ بدھ مت کے ماننے والے ہیں مگر کچھ رسوم ان کی عام بدھسٹ سے الگ ہیں۔ ایک بار پہلے بھی میں ان کی ایک دوسری بستی میں پھنس چکی تھی۔ کتنے مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسے میں بھول نہیں پائی تھی لیکن اس بار میرے ساتھ سلیم تھا، اس لیے مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ اگر کوئی دشواری پیش آتی تو یہ مجھے بہ آسانی گرداب سے نکال لیتا۔ اسی وجہ سے بے خطر میں سیدھے موژل (چوہدری) کی جھونپڑی پر پہنچ گئی۔ موژل بالکل نوجوان تھا۔ عام طور پر قبیلے کے سردار عمر دراز ہوتے ہیں، اس لیے میں حیران تھی۔ اس نے شاید میرے چہرے سے پڑھ لیا کہ میں حیران ہوں، اس لیے اس نے کہا۔ ''شاید آپ میری عمر دیکھ کر مغالطے میں ہیں۔ دراصل ہمارے ہاں صرف اسی کو سردار بناتے ہیں جو بہادر ہو اور عقلمند بھی کیونکہ آس پاس کے قبائل وقتاً فوقتاً ہم پر حملہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے موژل کا طاقتور ہونا ضروری ہے۔''

موژل کی بات سن کر سلیم نے سر ہلایا پھر بولا۔ ''آپ کبھی اس جنگل سے نکلے ہیں؟ شہر دیکھا ہے؟''

''نہیں.....شہر میں کیا رکھا ہے؟ جھوٹ، مکر و فریب، اس کے علاوہ اور کیا ہے وہاں؟''

موژل نے نفرت بھرے انداز میں کہا اور کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ''آپ لوگ آرام کریں۔ اگر کوئی ضرورت محسوس کریں تو باہر کھڑے پہرے دار سے کہہ دیں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے سلیم سے پوچھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''رات آرام سے گزار لیں، پھر صبح تو جانا ہی ہے۔''

''ایک بات کہوں؟'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''بولو۔''

''یہاں سے جاتے ہی ہمیں عرفان سے دو دو ہاتھ کرنا ہے۔ اسے شکست دینے کے بعد کیا کرو گے؟ کہاں جاؤ گے؟''

''غیب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ میرا خیال ہے، میں تمہارے پُرانے محلے کی سکونت اختیار کر لوں گا۔ شاہ علی بغدادی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر زندگی کے بقیہ ایام گزاروں گا۔''

میں کچھ اور سننا چاہتی تھی مگر حجاب نے لب پر تالے لگا دیئے تھے، اس لیے کچھ اور بولا نہ گیا اور میں کروٹ کے بل خشک گھاس کے نرم بستر پر لیٹ گئی۔ سلیم کے لیے جو بستر بچھایا گیا تھا، وہ دروازے کے برابر میں تھا۔ وہ اس بستر پر پڑ گیا۔ تھکن پوری طرح حاوی تھی مگر آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ دیوار کی طرف چہرہ کیے لیٹی تھی اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ تبھی یکایک ہی شور اُٹھا جس نے مجھے چونکا دیا۔ ایسا لگا تھا جیسے باہر کھلے میدان میں کوئی آفت آ گئی ہو۔ چیخ و پکار کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سلیم بھی جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا تھا۔

''باہر جا کر پتا تو کرو ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ لوگ اس طرح چیخ رہے ہیں؟'' میں نے سلیم سے کہا۔

''میں پتا کرتا ہوں۔'' کہہ کر سلیم باہر نکل گیا۔

باہر سے آنے والے شور وغل کی آوازوں نے ہمیں بے چین کر دیا کہ پتا نہیں کیسی آفت آ پڑی ہے۔ میں نے دروازے سے باہر جھانکا۔ باہر رات کی ہولناک سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ بستی کے آخری سرے سے گونجنے والی بھیانک چیخیں انسانی بربریت کا ماتم کر رہی تھیں۔ اپنی جگہ سے ہٹ کر میں آہستہ آہستہ سردار کی جھونپڑی کی جانب سرکنے لگی۔ احتیاط کے باعث مجھے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنا پڑ رہا تھا۔

چند سو گز کے فاصلے پر لڑی جانے والی جنگ میں اب لحظہ بہ لحظہ شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی لیکن یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ سردار حملہ آوروں کو روکنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جنگ میرے اعصاب پر بُری طرح سوار تھی۔ میں خود کو روک نہیں پا رہی تھی۔ سو میں جھونپڑی سے نکل کر زمین پر کہنیوں کے بل بستی کے آخری سرے کی طرف رینگنے لگی۔

وہاں جنگ عروج پر تھی۔ بستی والے اپنی کمین گاہوں سے بھرپور انداز میں تیر اندازی کر رہے تھے۔ ان کے حملوں کی شدت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں حملہ آوروں کے ہاتھوں زیادہ نقصان نہیں اُٹھانا پڑا ہے۔

اُدھر حملہ آور بھاری نقصان اُٹھانے کے بعد ہوش میں آ چکے تھے۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ حملہ آور بڑی تعداد میں ہیں اور بستی کے گرد پھیل رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال بستی والوں کے لیے خصوصاً میرے لیے بہت تشویش ناک تھی۔ حملہ آوروں کی فتح کے بعد میرا حشر عبرت ناک ہوتا جبکہ بستی والوں کی فتح میں میری نجات پوشیدہ تھی۔ میں زمین پر رینگتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھی اور بستی والوں میں جا پہنچی۔ موژل اپنے چند جاں نثاروں اور قاصدوں کے ذریعے اپنے لشکر کی کمان کر رہا تھا۔

''موژل! اپنے عقب کی خبر لے۔'' میں اس کے قریب پہنچ کر بولی۔ ''دشمن بستی کو گھیر رہا ہے۔''

میری آواز پر موژل ایک دم چونک پڑا، پھر جوشیلی آواز میں بولا۔ ''ساتھیو! پسپا ہوتے ہوئے پچھلی ٹکڑی سے جا ملو۔''

اور یوں جنگ تیزی کے ساتھ گلیوں میں پھیلنے لگی۔ حملہ آور اندر گھستے ہی جھونپڑیوں کو لوٹنے لگے۔ بستی میں بڑھنے سے قبل وہ اپنے عقبی جھونپڑیوں کو نذرِ آتش کرتے جا رہے تھے۔

اندھیری رات میں بستی آہستہ آہستہ بھیانک شعلوں میں گھرتی جا رہی تھی۔ وہاں گھمسان کا رن پڑا تھا اور اجل پر قادر قوتیں ہر طرف سرگرمِ عمل تھیں۔

بستی کے وسط میں سردار کے پہنچنے سے قبل ہی بستی کے چاروں طرف سے حملہ آوروں کی بے شمار ٹکڑیاں اُبل پڑیں۔

''ہتھیار ڈال دو۔ ہم خراج لے کر تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے۔'' حملہ آوروں میں سے کوئی پوری قوت سے چیخا۔ ''ورنہ تمہاری بستی کو خاک کر دیا جائے گا۔ تمہاری عورتوں کو ہل میں جوتا جائے گا اور تمہارے مردوں کی کھوپڑیوں میں شراب پی جائے گی۔''

''کمین گاہوں سے نکل کر ان سب کو معذور کر دو۔ ان کے سردار کا سر نیزے پر بلند کر دو۔'' موژل نے چیخ کر حکم دیا۔

موژل کی آواز میں نہ جانے کیسی تاثیر تھی کہ بستی والے چیونٹیوں کی طرح کمین گاہوں سے نکل پڑے اور دست بہ دست جنگ شروع ہو

گئی۔ تیرانداز بھی تلواریں نکال کر بل پڑے تھے۔

بستی عورتوں کی دلدوز آہ وبکا اور بچوں کی دہشت ناک چیخوں سے لرز رہی تھی۔ بستی میں موت کی چیرہ دستی عروج پر تھی۔ اپنے اور بے گانوں کی تمیز مٹ چکی تھی۔ ہر ایک اپنی راہ میں آنے والے کو موت کے گھاٹ اُتار رہا تھا۔

پھر حملہ آوروں میں کوئی چیخا۔ ''جھونپڑیوں کو آگ لگا دو۔ بربادی اس بستی کا مقدر بن چکی ہے۔''

اس آواز کے ساتھ ہی جلتی ہوئی مشعلوں کو جھونپڑیوں پر پھینکا جانے لگا۔ ہر طرف شعلے ہی شعلے نظر آرہے تھے۔ مکانوں میں چھپی ہوئی عورتیں اپنے بچوں کو چھاتیوں سے لگائے میدانِ جنگ میں آنکلیں اور گاجر مولی کی طرح دونوں طرف سے آنے والے بھٹکے ہوئے تیروں کا نشانہ بننے لگیں۔ آسان شکار سمجھ کر دشمن بھی انہی پر وار کر رہے تھے۔

ہر طرف آگ پھیل جانے کے باعث اب ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ حملہ آور پیدل ہو کر بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ آخری آدمی تک مقابلہ کرنے کا عہد کر کے آئے ہیں۔

اچانک ایک طرف گھوڑے کی پشت سے ایک اچھی خاصی عمر کا شخص نیچے کودتا نظر آیا۔ اس کے گرد حملہ آوروں کی بھاری جماعت نے حصار باندھ رکھا تھا۔ حملہ آوروں کے سردار کو پہچان لینے کے بعد بستی والوں کے حملے کا زور اسی طرف ہو گیا تھا۔

سخت جان دشمنوں کا سردار موت کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا بدن جا بجا زخم کھایا ہوا تھا اور بستی والے لحظہ بہ لحظہ اس کے گرد اپنا دائرہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔ یکا یک میرے برابر میں سلیم کی سرگوشی اُبھری۔ ''یہ کیا بیوقوفی ہے؟ میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں''

''اور میں کیا کرتی۔ اگر جھونپڑی میں رہتی تو آگ کی نذر ہو جاتی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم محفوظ مقام کی طرف بڑھو۔ میں آگے جا رہا ہوں۔'' کہہ کر اس نے ایک بے جان جنگجو کا نیزہ سنبھالا اور خود کو ہر وار سے بچاتا ہوا دشمنوں کے سردار کی طرف بڑھنے لگا۔

جب سلیم وہاں پہنچا تو بستی والوں نے دس پندرہ حملہ آوروں سمیت ان کے سردار کو نرغے میں لیا ہوا تھا۔ وہ سب لوگ زخموں سے چُور تھے۔ ان کے ہتھیار گر چکے تھے لیکن بستی والے وحشیانہ نعرے لگا لگا کر ان کے جسموں کو بے رحمی سے چھلنی کر رہے تھے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

سخت جان اور بے رحم دشمنوں کا سردار اب خود موت کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا استخوانی بدن جا بجا زخم کھایا ہوا تھا اور بستی والے لحظہ بہ لحظہ ان کے گرد اپنا دائرہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔ سلیم بھی ان میں شامل ہو گیا۔

سلیم بار بار اپنی جگہ بدلتا رہا۔ آخر ایک بار سردار اس کی زد میں آ ہی گیا اور اس نے اپنا نیزہ اس کے بائیں شانے میں اُتار دیا۔ وہ اذیت سے چیخ کر پلٹا اور بستی والوں کے حلقے سے الگ ہو کر وسط میں آ گیا۔

بستی والوں نے سلیم کی اس جرأت پر پُر جوش نعرے مارے اور نہتے حملہ آوروں کو نیزوں کی باڑھ پر ہانکتے ہوئے کافی دور لے گئے۔

اس وقت موت کو سامنے پا کر سردار کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سلیم کے بے چین نیزے کی انی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے سرکتا جا رہا تھا۔

کئی منٹ تک اسے دہشت زدہ کرنے کے بعد سلیم نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی پسلیوں کے نیچے سے ایک وار کیا اور وہ چیخ مار کر دوہرا ہو گیا۔ سلیم اس کے سر پر سوار اس کے سیدھا ہونے کا منتظر رہا۔ بستی والے اس مقابلے پر دل کھول کر داد دے رہے تھے۔

دشمن سردار سیدھا ہوا تو اس کے زخموں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں، لیکن اس بدحالی کے باوجود وہ سخت جان بڈھا اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رحم والتجا کی بجائے ان لمحات میں بھی نفرت وقہر کی بجلیاں کوند رہی تھیں اور اس کے منہ سے رحم کی کوئی فریاد نہیں نکلی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی انا شکست کو سامنے پا کر بھی اسے سرکشی پر اکسا رہی ہے۔

سلیم نے اس کی پنڈلی سے نیزہ آر پار گزار دیا اور اس کی چیخ سے فضا لرز اُٹھی۔

اس قدر ہولناک اور خوں ریز ماحول میں بھی بستی والوں کی زندہ دلی باقی رہی اور وہ دشمن سردار کی بے بسی پر دل کھول کر قہقہہ لگانے لگے۔

سلیم بار بار اس کے جسم کو چھید رہا تھا۔ وہ بڈھا بے شمار زخم کھانے کے باوجود ابھی تک اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا۔ آخر سلیم نے اس کی پسلیوں پر وار کر دیا اور وہ مغلظات بکتا ہوا خاک پر ڈھیر ہو گیا۔

سردار کی موت کے ساتھ بستی والوں نے فتح کا نعرہ بلند کیا۔ حملہ آوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب بھاگنے لگے۔

بستی والوں نے چن چن کر حملہ آوروں کی لاشیں ایک طرف ڈھیر کرنا شروع کر دیں۔ انہیں اس کام کے لیے کسی نے ہدایت نہیں دی تھی، لیکن یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ خوب جانتے ہوں کہ جنگ جیتنے کے بعد انہیں کیا کرنا ہے۔ لاشوں کا انبار لگانے کے بعد وہ بپھرے ہوئے درندوں کی طرح نعرے لگانے لگے، چیخنے چلانے لگے پھر یکا یک ہی بستی کے موڑل کی آواز گونجی۔ جلتے ہوئے جھونپڑوں کی زرد روشنی میں وہ گھوڑے پر بیٹھا نیزہ ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہا تھا مگر نعروں کی آواز میں اس کی آواز دب رہی تھی۔ نعرے لگانے والوں کو احساس ہوا کہ ان کا موڑل کچھ کہہ رہا ہے۔ شاید اسی لیے نعروں کی آواز کم ہونے لگی اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ موڑل نے اونچی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''ہم پر جو بپتا آئی تھی، وہ گزر گئی۔ دشمن نابود ہو گیا۔ ہمیں اس بستی کی دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔''

سردار کا حکم پاتے ہی تمام لوگ آگ بجھانے میں لگ گئے۔ موڑل نے آگے بڑھ کر سلیم کو سینے سے لگایا اور بولا۔ ''اے بہادر انسان! تُو ہمارے لیے معتبر ہے۔ تُو نے آج ہمارے بہت بڑے دشمن کو قتل کیا ہے۔ تجھے اس کا بدلہ ملے گا۔ جتنے جانور تجھے چاہئیں، لے جا۔ آج پوری بستی تیرے لیے حاضر ہے۔''

''نہیں...... ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ بس آج کی رات اور اپنی بستی میں رہنے دیں۔ کل ہم خود چلے جائیں گے۔'' سلیم نے جواب دیا۔

''نہیں...... تُو اب کہیں نہیں جائے گا۔'' موڑل نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا جیسے وہ سلیم کو اپنے سینے سے بھینچ لینا چاہتا ہو۔

''آپ کی قدردانی اپنی جگہ، مگر ہمیں ہر حال میں لوٹنا ہے۔ یہی قسمت کا لکھا ہے اور قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔'' سلیم نے کسی واعظ

کی طرح سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''آج کی رات فتح کے جشن میں تُو سرفراز رہے گا۔ دعوت میں تو شریک رہے گا نا؟''

''ہاں...... آج کی رات اس قبیلے میں ٹھہر سکتا ہوں، لیکن صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی ہم چل دیں گے۔''

کہنے کو تو وہ سب جنگلی تھے، لیکن جب میدان میں مشعلوں کی روشنی میں نوجوان لڑکیوں نے رقص کرنا شروع کیا تو میں حیران رہ گئی۔ سب ایک قطار میں ایک دوسرے کی کمر پکڑ کر کھڑی ہوگئیں۔ نوجوانوں نے تاشے کی قسم کا ڈھول گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اسے بجاتے ہوئے وہ آگے بڑھتے، پھر پیچھے ہٹ جاتے۔ ڈھول کی تال پر لڑکیاں بھی ایک قدم آگے بڑھتیں، پھر پیچھے ہٹ جاتیں۔ یہ رقص اس علاقے کا خاص رقص تھا۔ مجھے بھی بہت پسند آ رہا تھا۔ میں اس وقت تک سلیم کے ساتھ بیٹھی رہی جب تک رات آدھی گزر نہ گئی۔ تمام وقت سلیم کو اعزازی حیثیت حاصل رہی۔ موڑل نے اپنے برابر میں اسے بٹھایا اور میں اس کے برابر بیٹھی تھی۔

جب آدھی رات گزر گئی تب یہ جشن ختم ہوا اور ہم موڑل کے جھونپڑے میں آرام کے لیے آ گئے۔ بستر پر گرتے ہی میں بے خبر سو گئی۔

صبح جب آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ ناشتے کے نام پر بنگالیوں کا پسندیدہ ناشتہ چیوڑا اور مرمرے کھا کر ہم لوگ شہر جانے کے لیے نکل پڑے۔ سردار نے سفر کے لیے دو ٹٹو (Pony) دے دیئے تھے۔ رہنمائی کے لیے ایک آدمی بھی ساتھ کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے سورج غروب ہونے سے پہلے ہی ہم سڑک تک پہنچ گئے۔ اتفاق کی بات ہے، فوراً ہی رانگاماٹی سے آنے والی بس مل گئی اور ہم شام سے پہلے چٹاگاؤں پہنچ گئے۔ رات میں ڈھاکے کے لیے پسنجر گاڑی ملتی جبکہ ہم گرین ایرو ایکسپریس سے سفر کرنا چاہتے تھے اس لیے ہوٹل میں کمرا لے کر ٹھہر گئے۔

اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ عرفان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دوں کیونکہ اس نے شمس النہار پر جو ظلم توڑے تھے، اس کا تو بدلہ لینا ہی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی بدلہ لینا تھا کہ اس نے نسیم کی روح کو قید کر لیا تھا۔ وہ بے چارہ مفت میں مارا گیا تھا۔ اسے آزاد کرانا ضروری تھا۔ سلیم بھی اس بات پر متفق تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے کیسے قابو کیا جائے؟ کیونکہ اس کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

''تمہارے پاس اتنا علم ہے، پھر بھی تم ناکام ہو، آخر کیوں؟'' میں نے ہوٹل کے کمرے میں سلیم سے پوچھا۔

''سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس نے اپنے گرد حصار قائم کر رکھا ہے جس کی وجہ سے میرا علم ناکام ہے۔ اسے شورویر نے اپنا علم بھی دے دیا تھا۔ شورویر تو خوش فہمی میں مارا گیا۔ اسے خود پر بہت اعتماد تھا اسی لیے وہ قابو میں آ گیا۔ اس کی غلطی سے عرفان نے سبق حاصل کیا ہے۔ وہ اتنی جلدی قابو میں نہیں آئے گا۔''

''کیوں ناں فقیر بابا سے مشورہ کیا جائے۔ وہ ضرور پتا لگا لیں گے کہ عرفان کہاں چھپا بیٹھا ہے؟''

''ہاں...... اب تم نے عقلمندی کی بات کی ہے۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے فقیر بابا کو آواز دینا شروع کر دی۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ آ گئے۔

یکایک ہی وہ ظاہر ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ان کی مخصوص ٹیڑھی میڑھی لاٹھی تھی جس کا سہارا لیے وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے

تھے۔ میں نے خوش آمدانہ انداز میں کہا۔ ''بابا! اب تو میں نے کفر کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ آپ کے کہنے پر عمل کر رہی ہوں۔ اسی لیے میری رہنمائی آپ پر فرض ہے۔''

''سیدھے سیدھے بولو، کیا بات ہے؟'' بابا نے پوچھا۔

''شوروِیر ختم ہو چکا ہے۔''

''ہاں...... مجھے معلوم ہے۔''

''اب اس کا نائب عرفان باقی رہ جاتا ہے۔ اسے ہم نے ہر طرف ڈھونڈ لیا مگر اس کا پتا ٹھکانہ نہیں مل رہا ہے۔ کیا کیا جائے؟''

''خطرے کے وقت ہر انسان خود کو اپنے گھر میں زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔ وہ بھی اپنی حویلی میں حصار باندھے بیٹھا ہے۔ اسے حویلی میں جا کر للکارو۔''

''شاید یہ میرا آخری معرکہ ہو اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ رہیں۔''

''نہیں...... یہ ناممکن ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا ہوں۔ یہ معرکہ تمہیں اکیلے سر کرنا ہوگا، پھر سلیم تو تمہارے ساتھ ہے۔''

''اگر آپ ساتھ دیں گے تو بہت سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔''

''ضد نہ کرو۔ میری ایک حد ہے۔ میں اس سے آگے نہیں جا سکتا۔''

''گویا مجھے اکیلے ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔'' میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

''ہاں...... کیونکہ عرفان کا شکار تمہیں ہی کرنا ہے۔ تمہارے ہی ہاتھوں اس کی موت لکھی ہے۔'' اتنا کہہ کر فقیر بابا رُکے، پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''یہ بھی سن لو کہ وہ بھی تمہاری تاک میں ہے۔ اسے بھی پتا ہے کہ تم اس کی تلاش میں ہو اس لیے اس نے اپنی حفاظت کا پورا بندوبست کر لیا ہے۔ تم یہاں سے سیدھے ننگائل جاؤ۔ وہاں پہنچ کر اپنا راستہ خود پیدا کرو۔ ویسے میں ضرورت پڑنے پر مدد کر دیا کروں گا۔''

فقیر بابا کی بات نے مجھے نیا حوصلہ دیا اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اب جو کچھ بھی کرنا ہے، خود مجھے کرنا ہے۔ صبح ہوتے ہی میں نے سلیم کو ساتھ لیا اور سیدھی سٹیشن پہنچ گئی۔ گرین ایرو ایکسپریس چھوٹنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ ہم ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گئے۔ گرین ایرو ایکسپریس ڈھاکا کی سمت رواں دواں تھی۔ قسمت ایک بار پھر اسی شہر میں لے جا رہی تھی جسے میں نے تین بار چھوڑا اور تین بار قسمت نے پھر مجھے اسی شہر میں پہنچایا ہے اور یہ چوتھی بار میں پھر اسی شہر کی جانب چلی جا رہی تھی۔ اب وہاں صرف ایک کام رہ گیا تھا کہ میں عرفان کو اس کی اوقات بتا دوں۔ اس سے نجات کے بعد کیا کرنا ہے، اس بارے میں ابھی سوچا نہیں تھا۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھی سوچ میں گم تھی۔ باہر رات کا آنچل پھیلا ہوا تھا اور کمپارٹمنٹ میں نیند کا ڈیرا تھا۔ تقریباً تمام کے تمام مسافر نیند کا مزہ لوٹ رہے تھے کہ گاڑی کومیلا کے اسٹیشن پر رُک گئی۔ خوانچہ فروشوں کی آوازوں نے کئی افراد کی نیند میں خلل ڈالا اور وہ اُٹھ بیٹھے۔ کئی ایک نے گرما گرم چائے کا کپ خریدا۔ میں نے بھی ایک ہاکر سے چائے کی پیالی لی اور اس کی چسکیاں لینے لگی۔ گاڑی نے اب رینگنا شروع کیا تھا کہ ایک عورت

اور ایک مرد ڈبے میں داخل ہوئے۔ عورت برقعے میں تھی جبکہ مرد نے سکتی ٹوپی (بید کی بنی ٹوپی) پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر عام بنگالیوں کی طرح چھوٹی سی داڑھی بھی تھی۔ وہ دونوں آ کر میرے سامنے والی برتھ پر بیٹھ گئے تھے۔ داڑھی والے نے تیز نظروں سے سلیم کی طرف دیکھا جیسے سلیم کوئی چور ڈاکو ہے پھر اس نے عورت پر نظر ڈالی۔ عورت کا چہرہ پوری طرح نقاب میں ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے عورت کو ہلکی آواز میں کوئی ہدایت دی۔ عورت نے جلدی سے اپنا رُخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ اب اس کی پیٹھ سلیم کی طرف تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مرد بہت زیادہ شکی مزاج ہے۔ تبھی سلیم نے کہا۔ ''بھئی...... ان سے پوچھو تو کہاں تک ساتھ رہے گا؟''

سلیم نے مجھے مخاطب کیا مگر جواب اس شخص نے دیا۔ اس کا لہجہ جھلایا ہوا تھا۔ ''ہم ایسے ویسے لوگوں کو منہ نہیں لگاتے۔''

''اچھا...... تو کیسے کیسے لوگوں کو منہ لگاتے ہیں؟'' سلیم نے چڑانے والے لہجے میں پوچھا۔

''اے...... ہمارے منہ نہ لگنا۔ ہم کشتیا کے زمین دار ہیں۔ باون بیگھے زمین کے مالک۔'' وہ پھر جھلا کر بولا۔

''اچھا...... باون بیگھے زمین میں پودینے کی کاشت ہے؟''

وہ شخص ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ''اے...... میرا مذاق اُڑاتے ہو؟ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

''اچھا...... تو آپ کے پاس بندوق ہے؟ یہ بھی جانتے ہیں یا نہیں کہ بندوق لے کر سفر کرنا جرم ہے۔ کہاں ہے بندوق، دکھائیں؟'' سلیم نے اسی لہجے میں کہا۔

''میں...... میں کیوں دکھاؤں؟ تم کون ہو؟''

''میں خدائی فوج دار ہوں۔ اگر آپ نے بندوق نہیں دکھائی تو میں اگلے اسٹیشن پر جی آر پی کو بلا کر سامان چیک کرا لوں گا۔ میں پولیس والا ہوں۔'' سلیم نے صریحاً جھوٹ بولا۔

''ان کی باتوں کا بُرا نہ مانیں۔ یہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔'' عورت نے پہلی بار زبان کھولی۔

''اے...... تم کیوں بولیں؟ خبردار...... اگر اب ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ نامحرم مردوں سے باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟''

اس کے انداز پر میں مسکرا اٹھی۔ تبھی سلیم نے کہا۔ ''ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہوا۔ اس رشتے سے آپ میرے بھائی ہیں اور یہ بھابی ہوئیں۔''

''تم چپ رہو۔ اگر اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو بہت بُرا ہوگا۔''

سلیم کے چہرے پر شرارت ناچ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ میں اس پر نظر جمائے بیٹھی تھی کہ......

''باجی سنیں......'' اس عورت نے سرگوشی میں مجھے مخاطب کیا۔

''کیا؟'' میں اس کے اور قریب کھسک آئی۔

''ان صاحب سے کہیں کہ وہ ادھر ہی منہ موڑے رکھیں۔ میرے میاں غصے کے تیز ہیں۔ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔''

''اچھا...... اچھا...... میں سمجھا دوں گی۔'' تبھی گاڑی کسی چھوٹے سے سٹیشن پر رُکی۔ وہ صاحب لوٹا لے کر نیچے اُتر گئے یہ کہتے ہوئے۔

''میں پینے کا پانی لے آؤں۔''

ابھی وہ صاحب نیچے اُترے تھے کہ گاڑی نے وسل (Whistle) دے دی۔ وہ صاحب ڈبے میں چڑھ نہ پائے اور اس عورت نے رونا شروع کر دیا۔ اس کا رونا دیکھ کر میں نے تسلی دینا چاہی۔ ''فکر نہ کرو۔ وہ پچھلے ڈبے میں چڑھ گئے ہوں گے۔'' مگر اس نے تو گویا رونے کی قسم کھالی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''اپنے میاں کا نام بتا دو۔ میرا ساتھی دوسرے ڈبوں میں جا کر پکار لے گا۔''

''ہائے اللہ...... میں ان کا نام کیسے لوں گی؟ میرا نکاح ٹوٹ جائے گا۔'' عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کی جہالت پر غصہ آ گیا مگر کچھ بولی نہیں کیونکہ یہ بات بنگال میں عام ہے کہ بیوی، شوہر کا نام نہیں لیتی۔ میں اسے تسلی ہی دیتی رہی اور سلیم دھیرے دھیرے مسکراتا رہا۔ شاید اسی کی کوئی شرارت تھی اس لیے میں مطمئن بھی تھی۔ میں نے عورت سے کہا۔ ''میں مردوں کا نام لے رہی ہوں۔ جیسے ہی تمہارے میاں کا نام آئے تم سر ہلا دینا۔''

''رحمٰن!'' میں نے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ایک کے بعد ایک نام لیتی گئی اور وہ سر ہلا ہلا کر انکار کرتی رہی تبھی میں نے اچھے ناموں کی جگہ بگڑے نام لینا شروع کر دیئے۔ ''شبراتی، رمضانی، عیدو......'' اور اس نے جلدی جلدی سر ہلا کر اقرار کر لیا۔

''اچھا...... تو تمہارے میاں کا نام عیدو ہے؟''

''جی ہاں......'' وہ بولی تو میں نے مڑ کر سلیم سے کہا۔ ''اگلے سٹیشن پر اُتر کر دوسرے ڈبوں میں پکار لینا۔''

''وہ پچھلے ڈبے میں ہے۔'' سلیم نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ''اسے مغالطہ ہوا تھا، اس لیے وہ دوڑ کر اس ڈبے میں چڑھ گیا تھا۔ اگلے اسٹیشن پر وہ آ جائے گا۔''

واقعی جب اگلے سٹیشن پر گاڑی رُکی تو وہ آ گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ لوٹا جیسے خالی گیا تھا، ویسے ہی لوٹ آیا تھا۔

''پانی نہیں ملا؟'' سلیم نے پوچھ لیا۔

''پانی ملے نہ ملے، تمہیں اس سے کیا؟'' اس نے منہ بنا کر کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر باتھ روم کی جانب بڑھا۔ وہ جس طرح سے چل رہا تھا، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سخت غصے میں ہے۔ وہ تیز تیز قدموں سے باتھ روم میں پہنچا تھا کہ ہانپتا ہوا واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا بھائی؟'' سلیم نے مسکرا کر پوچھا۔

''وہ...... وہ...... باتھ روم...... باتھ روم میں بڑا سا...... خوب بڑا سا کتا ہے......'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''کتا...... ارے بھائی، چلتی گاڑی میں کتا کہاں سے آ جائے گا؟ ضرور مغالطہ ہوا ہوگا۔'' سلیم بولا۔

''نہیں جناب! میں اندھا نہیں ہوں۔ آپ کو شک ہے تو دیکھ آئیں۔'' وہ جل کر بولا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ بھی سلیم کی کارروائی ہے۔ اسی نے نظر بندی کی ہوگی۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلیے...... میں دیکھتی ہوں۔''

میرے اشارے پر وہ باتھ روم تک آ گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے بھی جھانکا، پھر مطمئن ہو کر اندر داخل ہو گیا اور میں واپس آ گئی۔ سلیم کے پاس پہنچ کر سرگوشی میں بولی۔ ''کیوں ستا رہے ہو؟''

''چلو...... تم کہتی ہو تو اسے بخش دیتا ہوں۔'' سلیم نے جواب دیا۔ عیدو بھی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اندھیری رات کا سینہ چیرتے ہوئے ریل تیز رفتاری سے ڈھاکے کی سمت دوڑتی جا رہی تھی۔ عیدو اور اس کی بیوی چادر تان کر لیٹ گئے تھے۔ میں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ان پر ڈالی اور پھر کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے پیڑ ہیولے جیسے نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی ریلوے پھاٹک پر لٹکتی لالٹین کی روشنی بھی نظر آ جاتی تھی۔ میں پوری محویت کے ساتھ باہر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اوپر کی برتھ پر سلیم بے خبر سویا ہوا تھا۔ کبھی کبھی میں اس پر بھی نظریں ڈال لیتی تھی۔ اکھوڑا کے سٹیشن پر لمحہ بھر کو ٹرین رُکی تھی۔ بس اس قلیل عرصے میں چھ کے چھ مسافر اُتر گئے۔ اب کمپارٹمنٹ میں صرف میں، سلیم اور دونوں نئے مسافر رہ گئے تھے۔

گاڑی نے پھر سے رفتار پکڑ لی تھی۔ میں نے وقت گزاری کے لیے بیگ سے تازہ اخبار ''پاسبان'' نکال لیا تھا۔ اخبار کی خبروں پر نظر دوڑا رہی تھی کہ عجیب سی بُو نے مجھے چونکا دیا۔ ایسا لگا جیسے نزدیک ہی کہیں مُردے کو حنوط کیا جا رہا ہے۔ کافور جیسی خوشبو پھیل رہی تھی۔ میرے لیے یہ بُو بہت اچھا اشارہ نہ تھا۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ نو وارد مسافر خالی سیٹوں پر قابض ہو کر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک سیٹ پر مرد، دوسرے پر عورت تھی۔ انہیں لیٹا ہوا دیکھ کر میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میٹر گیج کے ڈبے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ صرف دو پورشنز میں ڈبے بنے ہوتے ہیں۔ ہمارے پورشن میں تو ایسا کچھ نہ تھا، پھر بُو بھی برابر والے پورشن سے آ رہی تھی۔ میں اُدھر بڑھتی چلی گئی۔

اُدھر پہنچتے ہی میں چونک گئی۔ سیٹ پر ایک سادھو جیسا شخص لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک چندی سی لپٹی تھی۔ پورا بدن ننگا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ نہ تو گورا تھا اور نہ کالا، بالکل گلابی تھا۔ اس کے جسم پر کھال نہ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بکرے کی کھال اُتارنے کے بعد مسلم بکرا سامنے ہو۔ یہ بُو اسی کے جسم سے پھوٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اُٹھ بیٹھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کی آنکھوں سے شعاعیں سی نکلتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتی تو ڈر جاتی۔ مگر میں ایسی عجوبہ باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اس لیے نسبتاً بلند آواز سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''تمہاری موت......'' اس نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

''تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''تم نے شوروپر کی روح کو مقید کرا کر سمجھ لیا ہے، تم بہت بڑی تانترک ہو۔ ارے، تمہارے ایسے لوگ میرے آگے ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں۔''

''کون کس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، ابھی پتا چل جائے گا۔''

''اپنی قوت آزما لو، مگر یاد رکھنا، تمہاری وہ شکتی جسے تم نے مندر مندر پھر کر حاصل کی تھی، وہ سلب ہو چکی ہے۔ جیسے ہی تم نے فقیر بابا کے کہنے پر عمل شروع کیا، تمام ناری قوت سلب ہو گئی۔ اب تم ایک عام سی عورت رہ گئی ہو جس کے قبضے میں کوئی قوت نہیں ہے۔''

''اطلاع دینے کا شکریہ......'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں ان حالات میں بھی بھاری پڑوں گی۔''

''کون کتنے پانی میں ہے، ابھی پتا لگ جاتا ہے۔'' کہہ کر اس نے سیٹ سے نیچے قدم رکھا اور پھر ایک انہونی ہوگئی۔ اس کا سر کندھے پر ڈگمگایا جیسے گھڑونچی پر گھڑا رکھتے وقت ڈگمگاتا ہے، پھر نیچے گر پڑا حالانکہ میں نے کوئی بات نہیں کی تھی، نہ کچھ پڑھا جو یہ سمجھتی کہ میرے عمل سے ایسا ہوا ہے اس لیے میں حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ یکایک اس کی کمر کمان بنی۔ وہ نیچے جھکا اور ٹٹول کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑا پھر اسے اُٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ اب اس کا سر اپنی جگہ فٹ ہو چکا تھا۔ اس نے سر کو ہلا کر مضبوطی کا اندازہ کیا، پھر بولا۔ ''تمہاری ہر کوشش میری ٹھوکر میں۔''

میں جواب دینے کی بجائے مسکرا دی۔

''تم نے پہل تو کر دی، اب میری باری ہے۔'' کہہ کر اس نے میری جانب قدم بڑھایا۔ ذرا سوچیں، رات کا گہرا اندھیرا، کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز سے دوڑتی ریل گاڑی اور اس گاڑی کے ویران ڈبے میں، مَیں نے ویران اس لیے کہا کہ گنتی کے جو دو مسافر تھے، وہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ یہاں تک کہ سلیم بھی بے خبر سو رہا تھا اور وہ بدبخت میری جانب بڑھا چلا آرہا تھا۔ اس کی ہیئت ایسی تھی کہ اس پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ آپ خود سوچیں، ایک ایسا شخص جس کے جسم پر کھال نہ ہو، وہ کیسا خوفناک لگ رہا ہوگا۔

ابھی اس نے دوسرا قدم اُٹھایا تھا کہ ایسا لگا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اس کے سینے پر کھڑی لات ماری ہو۔ وہ لہراتا ہوا جا کر سیدھی رُو کی سیٹ سے ٹکرایا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس کے سینے پر لات کا نشان بن گیا تھا۔ پیر کے نشان کے برابر سینے کا گوشت اندر کو دھنس گیا تھا۔ وہ گرنے کے بعد جھٹکے سے اُٹھا تھا، پھر غصیلی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''بہت زیادہ اُڑ رہی ہو۔ ابھی چھٹی کا دودھ نہ یاد دلا دیا تو پھر کہنا۔'' اتنا کہہ کر اس نے میری طرف کوئی چیز پھینکی۔ پتا نہیں کس طرح میں اپنی جگہ سے اُچھلی تھی اور کافی دور جا کھڑی ہوئی، پھر فرش کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں ایک منکے کی مالا پڑی تھی۔ میں نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''بس اسی قوت پر اکڑ رہے تھے؟''

''ابھی تُو نے میری قوت دیکھی کہاں ہے۔ ابھی تو میں تجھ سے کھیل رہا تھا۔ لے اب سنبھل......'' کہہ کر اس نے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ ہوا میں اُڑتا ہوا میری طرف بڑھا تھا کہ ایسا لگا جیسے وہ کسی ٹھوس مگر نادیدہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ آواز کی گونج میں نے صاف سنی تھی اور اب وہ اپنی جگہ کھڑا پلکیں جھپکا رہا تھا، پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ہوا میں اس نادیدہ دیوار کو ٹٹولنے کی کوشش کی مگر شاید اسے کوئی ٹھوس چیز محسوس نہ ہوئی اس لیے وہ پھر آگے بڑھا۔ میں بھی اس کی ایک ایک حرکت کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑے زعم میں آگے بڑھا تھا کہ پھر کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے پھر ہاتھ اُٹھا کر ٹٹولا مگر اسے کوئی دیوار نظر نہ آئی۔ مجھے خود بھی حیرت تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کون میری حفاظت کر رہا ہے؟ کیونکہ سلیم تو لمبے لمبے خراٹے لے رہا تھا۔

''تم ایسے نہیں مانو گی۔'' اس نے نفرت بھری آواز میں کہا۔ پھر کچھ پڑھ کر ہوا میں پھونک ماری۔ پھونک مارتے ہی ہوا میں چنگاری سی پھوٹی اور ہم دونوں کے درمیان ہوا میں آگ کی دیوار سی بن گئی۔ شاید وہ نادیدہ دیوار کو راکھ کر دینا چاہتا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ یکایک وہ آگ اسی کی

جانب لپکی جیسے میری طرف سے تیز ہوا نے آگ کی لپیٹوں کو پیچھے دھکیلا ہو۔ اگر وہ اُچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتا تو یقیناً جل جاتا۔

اس نے پیچھے ہٹ کر پھر کچھ پڑھا اور ہوا میں اُچھال بھری لیکن اس بار بھی ناکامی مقدر ٹھہری۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''بہت اچھے مداری ہو اور ایک بار اُچھل کر کرتب دکھاؤ۔ مزہ آرہا ہے۔''

''ٹھہر...... تیری اوقات میں ابھی بتاتا ہوں۔'' کہہ کر اس نے کچھ پڑھا۔ میں ہوشیار تھی۔ اس کے کچھ پھینک مارنے کی منتظر تھی کہ ایک عجیب منظر نظر آیا۔ وہ تو اپنی جگہ جما کھڑا تھا اور درمیان میں آگ کی دیوار تھی مگر میری طرف خیریت نہ تھی۔ میرے پیچھے کی طرف باتھ روم تھا۔ ادھر سے ایک سرخی مائل چادر فرش پر پھیلتی جا رہی تھی۔ میری نظر اچانک ہی اس پر پڑی تھی اور میں سکتے میں رہ گئی تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں سرخ چیونٹیاں آگے بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ ایسی چیونٹیوں کو ہم ''گوشت خور چیونٹیاں'' کہتے ہیں۔ مُردہ جانوروں کو یہ فوراً چٹ کر جاتی ہیں۔ یقیناً یہ میرے پیروں سے بھی چمٹتیں۔ میں خود پیچھے ہٹ نہیں سکتی تھی کیونکہ اُدھر وہ مُردہ تھا اور درمیان میں آگ کی دیوار بھی تھی۔ میں مخمصے میں تھی کہ اب میں کیا کروں؟ کیونکہ وہ چادر سی دم بہ دم آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ بس کچھ ہی دیر کی بات تھی، تبھی ایک اور اچنبھے کی بات نظر آئی۔ اس سے پہلے کہ چیونٹیاں میرے پیروں تک پہنچیں وہ اس طرح اُچھل اُچھل کر پیچھے گرنے لگیں جیسے کسی نے جھاڑو دینا شروع کر دی ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زور آزمائی ہو رہی ہو۔ چیونٹیاں آگے بڑھتیں اور نادیدہ ہاتھ انہیں سمیٹ کر پیچھے پھینک دیتا۔ یہ رسہ کشی کافی دیر تک چلتی رہی، پھر شاید ان چیونٹیوں کو عقل آ گئی اور انہوں نے مجھ سے دو ہاتھ کی دوری بنا کر چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ سلیم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ ان حالات سے بے خبر سامنے والی سیٹ پر چادر اوڑھے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ میں اسے آواز دینا چاہتی تھی کیونکہ چیونٹیوں کی چادر اب سیٹ پر چڑھنے لگی تھی۔ بس کچھ ہی دیر کی بات تھی۔

''بچاؤ...... بچا سکتی ہو تو بچا لو...... اپنے ہمدرد کی جان بچا لو۔'' اس بغیر چمڑی والے نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ میں خود مخمصے میں تھی۔ پتا نہیں یہ حیرت وخوف کی وجہ تھی یا اس بغیر چمڑی والے کی کارستانی کہ میرے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ میرے ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے کہ اب کیا ہوگا؟ شاید اس سے میرا جذباتی لگاؤ ہو گیا تھا تبھی تو میں اس کے لیے اتنی بے چین ہو گئی تھی ورنہ تو میں اب تک نہ جانے کتنوں کو مرتے دیکھ چکی تھی لیکن کبھی کسی کے بارے میں کچھ ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔ پہلی بار ایسا ہو رہا تھا۔ چیونٹیاں اب تب میں سیٹ کے اوپر پہنچنے والی تھیں کہ یکایک خود بخود سلیم کا جسم ہوا میں اُٹھ گیا۔ وہ سیٹ سے تقریباً ایک فٹ اوپر ہوا میں معلق تھا۔ میں نے مڑ کر بغیر چمڑی والے کی طرف دیکھا، پھر کہا۔ ''تمہارا یہ وار بھی خالی گیا۔ کچھ اور آزمانا چاہتے ہو تو اسے بھی آزما لو۔''

''یہ بے چارہ کیا آزمائے گا...... یہ تو خود مفلوج ہو چکا ہے۔'' سلیم کی آواز گونجی۔

''تم...... تم جاگ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں سویا کب تھا، میں تو اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔'' اس نے معلق حالت میں ہی جواب دیا۔ ''تم کمزور پڑتی تو مجھے مداخلت کرنا ہی پڑتی مگر اس وقت تک تمہارا پلہ بھاری ہے۔''

''مگر یہ ہے کون؟''

''یہ محترم عرفان صاحب کے بیر ہیں اور اب میں انہیں بیر بہوٹی بنانے والا ہوں۔'' کہہ کر اس نے کچھ پڑھ کر چیونٹیوں پر پھونکا۔ اس پھونک کے ساتھ ایسا لگا جیسے چیونٹیوں کی چادر سمٹنے لگی ہے۔ وہ واپسی کے لیے بھاگ رہی تھیں۔ اگر ذرا سی دیر ہوتی تو عیدو اور اس کی بیوی زد میں آ جاتے۔ انہیں بالکل خبر نہ تھی کہ وہ موت کی کگار پہ پہنچ چکے تھے۔

چیونٹیوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر گھٹتی جا رہی تھی۔ وہ بھی اس طرح جیسے زمین پر بچھی سرخی مائل چادر کو کوئی اُٹھا رہا ہو۔

کچھ ہی دیر میں چیونٹیوں کی فوج ظفر موج بالکل غائب ہو گئی۔ تب میں نے مڑ کر اس بے چہرے والے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے غائب تھا۔ شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ہمارے مقابل ٹھہر نہیں سکتا اسی لیے وہ خاموشی سے کھسک گیا تھا۔

''لو بھئی...... وہ تو بھاگ گیا۔ اب میں کس سے پنجہ لڑاؤں؟'' سلیم نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

''بس اللہ اللہ کرو کہ عرفان کسی اور کو نہ بھیج دے۔''

''ہاں...... اس کا خطرہ ہے کیونکہ وہ چپکا نہیں بیٹھے گا۔ اسے احساس ہو چکا ہے کہ ہم سے برابر کی ٹکر ہے۔''

''اچھا میاں پہلوان! اب سو جاؤ۔ میں بھی تھکن محسوس کر رہی ہوں۔'' کہہ کر میں بھی لیٹ گئی۔ پورا کمپارٹمنٹ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہم گنتی کے مسافر تھے اور سب خاموش تھے اس لیے سناٹا زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ کھڑکی سے سر ٹکا کر میں لیٹ گئی تھی۔ کھٹ کھٹا کھٹ کی آواز سے نیند کیا آتی، پھر بھی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش سے بالآخر نیند آ ہی گئی۔

میں بے خبر سو رہی تھی کہ شور کی آواز نے آنکھیں کھلوا دیں۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ اُجالا پھیل چکا تھا اور گاڑی ٹنگی سٹیشن پر کھڑی تھی۔ گویا ہم ڈھاکا پہنچ چکے تھے۔ اگلا اسٹیشن کملا پور تھا۔ وہ خوبصورت سٹیشن جس کی نظیر پورے ایشیاء میں نہ تھی۔ میں نے واش بیسن پر جا کر کلی کی اور لوٹ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی بھی جاگ چکے تھے مگر سلیم ابھی تک سو رہا تھا۔ میں نے ایک چائے والے کو آواز دی اور چائے لے کر حلق تر کرنے لگی۔ رات کا معرکہ ابھی تک ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

میں چائے کا سپ لیتے ہوئے اسی پر غور کر رہی تھی اور نظریں پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے لوگوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ میں ایک ہی بات پر غور کر رہی تھی کہ عرفان سے کیسے نمٹا جائے اس لیے کہ عرفان ہوشیار ہو چکا ہے اور اس نے پہل بھی کر دی ہے۔

''خیر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے ذہن سے تفکرات کو جھٹک دیا۔

''آپا! آپ ڈھاکے میں کہاں رہتی ہیں؟'' عورت نے پوچھا تو میں جھٹکے سے مڑی اور اسے دیکھنے لگی۔ ساری رات کے بعد اس نے پہلی بار خود سے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کسی ہوٹل میں ٹھہروں گی۔''

''اچھا...... تو آپ ڈھاکے کی نہیں ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔ عیدو بالکل خاموش تھا۔ اس نے ایک بار بھی مداخلت نہیں کی تھی ورنہ رات میں تو یہ تیغ براں بنا ہوا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بیوی کو ٹوک رہا تھا۔ میں نے اس پر نظر ڈال کر کہا۔

''ہم لوگ تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔''

''ہوٹل میں تو بہت پیسے لگیں گے۔ اگر آپ چاہیں تو دو ایک دن کے لیے ہمارے ہاں رُک جائیں۔''

''تمہارے میاں کو اعتراض نہیں ہوگا؟''

''ناں جی ناں...... یہ تو مہمان داری کر کے خوش ہوتے ہیں۔'' پھر اس نے عیدو کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیوں جی! میں نے غلط تو نہیں کہا؟''

''نہیں...... نہیں...... تم بے فکر ہو کر آ جاؤ۔ ہم مہمانوں کو قسمت سمجھتے ہیں۔ جتنے دن چاہو، ہمارے گھر میں رہ لینا۔''

''آپ کا گھر ہے کہاں؟''

''مگ بازار میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اصفہانی کالونی کے پاس۔''

شہر کے قلب میں ٹھہرنا زیادہ اچھا تھا اس لیے میں نے اثبات میں جواب دے کر کہا۔ ''ویسے میں سلیم صاحب سے پوچھ لوں، تبھی حتمی جواب دوں گی۔''

گاڑی رینگنے لگی تھی۔ اب اگلا سٹیشن کملا پور تھا اس لیے میں نے سلیم کو جگا دیا۔ اس نے واش روم میں جا کر کلی کی۔ چہرے پر چھینٹے مارے اور واپس آ کر بولا۔ ''رات کی تھکن نے گہری نیند دے دی تھی۔ خوب سویا۔''

میں نے اسے عیدو کی پیشکش بتائی تو وہ بھی راضی ہو گیا اس لیے کہ ہوٹل میں ٹھہرنے سے بہتر تھا کہ کسی گھر میں ٹھہرا جائے کیونکہ ہوٹل میں آمد و رفت زیادہ ہوتی ہے۔

کملا پور سٹیشن پر گاڑی رُکی تو ہم بھی اُتر پڑے۔ عیدو نے آگے بڑھ کر دو سائیکل رکشے لیے اور ہم ان کی رہنمائی میں چل پڑے۔ کملا پور سے مگبا زار کا فاصلہ کچھ زیادہ بھی نہیں ہے۔ سائیکل رکشہ والے نے آدھے گھنٹے میں ہمیں مگبازار پہنچا دیا۔

عیدو کا گھر اچھا خاصا بڑا تھا۔ سامنے لان تھا، پھر دو منزلہ عمارت۔ اس کے پیچھے باغیچہ جس میں آم اور کٹھل کے پیڑ تھے۔ مجھے یہ مکان اسی وجہ سے مناسب لگا۔ عیدو نے ہمارے ٹھہرنے کے لیے اوپر کے دو کمرے دے دیئے تھے۔ اوپر کا پورا پورشن خالی تھا۔ ہمیں ایسی ہی جگہ کی ضرورت تھی تاکہ کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ سلیم بھی مطمئن تھا۔ سفر کی تھکن مٹانے کے لیے میں نے نہا لینا زیادہ مناسب سمجھا اور کپڑے لے کر واش روم میں چلی گئی۔

نہا کر آئی تو سلیم بھی باہر والے ٹیوب ویل سے نہا کر آ چکا تھا اور اب کنگھی کر رہا تھا۔

''یہ بھی اچھا ہوا کہ ہمیں ٹھہرنے کے لیے مناسب جگہ مل گئی۔'' میں نے گیلے بالوں پر تولیہ لپیٹتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ غلط ہوا ہے۔''

''تمہیں تو ہر بات غلط لگتی ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عرفان ہماری خفیہ نگرانی کر رہا ہے، کیونکہ اس نے تو رات ہی میں پہل کر دی ہے۔ یہ تو ہماری قسمت تھی کہ بساط ہمارے ہاتھ رہی ورنہ وہ بے چڑی کا بیر ہمارے لیے موت کا سامان کر ہی چکا تھا۔''

''اس بار اس کا حملہ زیادہ سخت ہوگا، اس لیے پوری طرح مستعد رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی چوک ہو جائے۔''

''اللہ مالک ہے، اب میں کفر میں ڈوبی ہوئی نہیں ہوں، اس لیے باطل سے ڈرنا کیسا؟''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ عیدو کی بیوی کھانا لے کر آ گئی۔ دستر خوان بچھا کر اس نے کھانا لگا دیا حالانکہ ابھی دس ہی بجے تھے مگر ناشتہ نہ کرنے کی وجہ سے بھوک چمک اُٹھی تھی۔ یوں بھی بنگالی صبح کے ناشتے میں ایک مٹھی مُر مُرے اور ایک پیالہ چائے کا ہی لیتے ہیں اور گیارہ بارہ بجے پیٹ بھر چاول کھاتے ہیں اسی لیے عیدو کی بیوی کھانا لے آئی تھی۔ ہم نے پیٹ بھر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہی غنودگی سی محسوس ہوئی اور میں نے بستر پر اپنے جسم کو پھیلا لیا۔ سلیم بھی آرام کی خاطر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں بے خبر سو رہی تھی کہ مجھے جھٹکے سے محسوس ہوئے اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھ کھلتے ہی اندھیرے کا احساس ہوا۔ میں نے آنکھیں پٹپٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور تب احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پیر رسی سے بندھے ہوئے ہیں۔ میں نے بولنے کی کوشش کی تو ہونٹ ہلنے سے معذور رہے۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ بندھا ہوا جسم جس طرح سے ہل رہا تھا، اس سے ثابت ہوا کہ میں کسی گاڑی میں پڑی ہوئی ہوں۔ کچھ دیر بعد آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو پتا چلا کہ سلیم بھی مجھ سے کچھ دوری پر اسی حالت میں پڑا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے ذہنی رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ شاید میرے اندر کی قوت ختم ہوگئی تھی یا کمزور پڑ گئی تھی۔ تبھی میرے ذہن میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی جیسے میرے دماغ میں کچھ کلبلا رہا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ سلیم بھی مجھ سے ذہنی رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے فوراً جواب دیا۔

''کچھ سمجھ میں آیا، ہم کس کی قید میں ہیں؟''

''ہم سوئے تھے عیدو کے گھر میں۔ اس کا مطلب ہے، عیدو ہی کے اشارے پر ایسا ہوا ہے۔''

''عیدو نے ایسا کیوں کیا؟''

''شاید وہ کسی کا مہرہ تھا۔ ہمیں گھیرنے کی اسے ڈیوٹی دی گئی ہوگی۔''

''ایسا کون کر سکتا ہے؟''

''جو بھی ہے، کچھ ہی دیر میں سامنے آ جائے گا۔''

اس کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی۔ گاڑی جب رُکی اور ہمیں ڈنڈا ڈولی کر کے نیچے اُتارا گیا تو ہم ایک ایسی حویلی میں تھے جو میری جانی پہچانی تھی۔ یہ حویلی عرفان کی تھی۔ گویا عرفان ہی کے اشارے پر ہمیں اغوا کیا گیا تھا۔ ہمیں اس حویلی کے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس کی دیواریں منقش تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد اس کمرے میں عرفان آ گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا۔ ''خوش آمدید! خوش آمدید! اُس بار تو تم مجھے زخمی کر کے بھاگ نکلی تھیں۔ اب کیسے بھاگو گی؟'' پھر اس نے ایک قوی ہیکل شخص کو اشارہ کیا کہ میرے منہ میں ٹھنسے کپڑے کو نکال لیا جائے۔

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔'' منہ کھلتے ہی میں بولی۔

''گزشتہ بار میں نے تمہاری قوت کا غلط اندازہ لگایا تھا اسی لیے چوٹ کھا گیا۔ اب کی بار ایسا نہیں ہوگا۔ اب دیکھوں میں نے قابو کرنے

کے لیے ایک ساتھ دو چال چلیں۔ بیر کو بھیجا۔ ساتھ ہی ایک ملازم کو بھی پیچھے لگا دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ تمہیں اس پر ذرا بھی شک نہیں ہوا اور تم اس کی چال میں آ گئیں۔''

''جب کھیل شروع ہوتا ہے تو کسی نہ کسی کو شکست بھی ہوتی ہے۔ اچھا کھیلنے والا پہلی مات کو مات نہیں سمجھتا اور کوئی نئی چال چل دیتا ہے۔''

''ٹھیک...... میں بھی دیکھتا ہوں، تمہاری زنبیل میں کیا کیا چھپا ہے؟ تمہارے علم کی حد کیا ہے؟''

''میری حد کا اندازہ اس سے لگا لو کہ میں نے تمہارے گرو شوروپر کو ختم کر دیا۔''

''وہ میرا گرو نہیں دوست تھا۔ پھر وہ کوئی جیتا جاگتا انسان تو تھا نہیں، بس ایک روح تھی، اور روح کے پاس عقل نہیں ہوتی۔ سوچنے سمجھنے کی قوت صرف انسان کے پاس ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہاری حد کہاں تک ہے، وہ بھی دیکھ لوں گی۔ میری بندش تو کھولو۔''

''دشمن لاچار ہی اچھا لگتا ہے۔ رات میں ''یگ'' ہوگا۔ اس یگ میں، مَیں تمہاری قربانی دوں گا اور تب ایسا قوی بن جاؤں گا کہ اس دنیا میں کوئی میری برابری نہیں کر سکے گا۔ میں عمر جاوداں حاصل کر لوں گا۔'' تبھی میرے ذہن میں پھر سرسراہٹ ہوئی اور میں سمجھ گئی کہ سلیم مجھ سے رابطہ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے دماغی لہروں کے ذریعے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟'' تو اس نے جواب دیا کہ اس سے کہو کہ میرے نوکر کو آزاد کر دو۔ وہ بے چارہ مفت میں بندھا پڑا ہے۔'' میں نے یہی بات عرفان سے کہی تو وہ بولا ''تم تو جانتی ہو، میں سفلی علم کا ماہر ہوں۔ مجھے کسی سے ڈر نہیں ہے۔ اگر ڈر ہے تو اس بڈھے سے جو کبھی کبھی آ کر تمہیں بہت کچھ سکھا جاتا ہے۔ اسے تو آزاد کرنا ہی ہے، مگر ابھی نہیں، رات میں۔ سفلی علم میں قربانی دینا ضروری ہے۔ میں اس کی قربانی دوں گا۔ جیسے جیسے اس کے نرخرے سے خون بہے گا، ویسے ویسے میری قوت بڑھے گی۔''

''یاد رکھنا۔ تم جو سوچ رہے ہو، وہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اب میں پہلے جیسی نہیں رہی کہ جس نے چاہا، بہکا لیا۔ اب میرے پاس ''نوری قوت'' ہے۔ میں تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔''

''اسی لیے اب تک بندھی پڑی ہو۔'' اس نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔

''ہر کام میں خدا کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے۔ میرا یقین کامل ہے کہ میں تمہیں تباہ کر کے رہوں گی۔''

''اس سے پہلے ہی میں تمہیں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔''

''یاد رکھو چیونٹی ہاتھی کو مار دیتی ہے۔''

''وہ ہاتھی بیوقوف ہوتا ہے جو پھونک مارنا نہیں جانتا۔ ہزار ہا چیونٹیوں کے لیے ایک پھونک کافی ہے۔'' اس نے سر ہلا کر ایسے کہا جیسے اس دنیا میں اس سے زیادہ عقلمند کوئی اور نہیں ہے۔ وہ ہی قوت کا خزانہ، باقی لوگ کیڑے مکوڑے ہیں۔ میں نے اس کے بڑبولے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ٹڈے بڑی اونچی چھلانگ لگاتے ہیں، لیکن چٹکی سے مسل دیا جاتا ہے۔'' میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ میں نے اسے

اشتعال دلانے کے لیے مزید کہا۔ ’’اگر تمہارے پاس قوت ہوتی تو یوں مجھے باندھ کر نہ رکھتے۔‘‘

’’تمہارے پاس قوت ہے تو خود کو آزاد کرا لو۔‘‘ اس نے جواباً کہا اور باہر نکل گیا۔

میں نے دل ہی دل میں فقیر بابا کو آواز دینا شروع کر دی۔ اس ابتلا سے وہی مجھے آزاد کرا سکتے تھے۔ ان کے پاس تاریک قوتوں سے مقابلہ کرنے کی کلی قوت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ ہر طرح سے اس کے مقابلے میں زیادہ قوی تھے اس لیے میں بار بار انہیں بلا رہی تھی۔ درمیان درمیان میں سلیم پر نظریں بھی ڈال رہی تھی۔ وہ اب تک بے ہوشی کی حالت میں بے سدھ پڑا تھا، تبھی میرے ذہن میں فقیر بابا کی آواز گونجی۔ ’’ضد نہ کر۔ مجھے آواز مت دے۔ عرفان نے اپنے گرد پلید قوتوں کو جمع کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ اُلٹ ہو جائے اس لیے تھوڑا توقف کر۔ میں حصار میں سینڈھ لگا رہا ہوں۔‘‘

میں نے فقیر بابا کو آواز دینا بند کر دی۔ مجھے یقین تھا، فقیر بابا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالیں گے۔ اب میں موقع کی منتظر تھی کہ کوئی ایسا موقع ملے جو میں اپنا کوئی داؤ آزماؤں کیونکہ اب جو کچھ بھی کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔ اگر میں چاہتی تو تاریک قوتوں کو آواز دے سکتی تھی۔ مندر مندر چکرا کر میں نے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس سے فائدہ اُٹھا سکتی تھی مگر میرا دل منع کر رہا تھا کیونکہ میں دوبارہ کفر کی دلدل میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ نوری قوتوں ہی سے کام لینا چاہ رہی تھی اس لیے جو کچھ یاد آ رہا تھا، پڑھتی جا رہی تھی، لیکن میری شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ عرفان کا حصار زیادہ قوی تھا۔ اس کے مقابلے میں میری طاقت کچھ بھی نہ تھی اس لیے میں ناکام ہو رہی تھی اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس دوران میں میرے دماغ میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور میں سمجھ گئی کہ سلیم ذہنی رابطے کی کوشش کر رہا ہے۔ گو کہ ٹیلی پیتھی محض ایک سائنس ہے۔ ذہنی قوت سے ایسی آواز نکالنا جو پردہ سماعت سے ٹکرائے بنا سیدھی دماغ کے ایک مخصوص حصے تک پہنچے اور یہ صوتی لہریں اپنا مفہوم واضح کر دیں۔ اسی آرٹ کو ’ٹیلی پیتھی‘ کا نام دیا گیا ہے۔ سلیم اس فن کا ماہر تھا۔ اسی سے میں نے سیکھا تھا جسے کبھی کبھی آزما بھی لیتی تھی۔ بہت حد تک اس فن پر دسترس بھی حاصل کر لی تھی۔ سلیم نے سوال کیا تھا۔

’’کیا تمہارے ہاتھ پیر ابھی بھی بندھے ہوئے ہیں؟‘‘

’’ہاں......‘‘ میں نے کروٹ لے کر جواب دیا۔ ’’مگر تم سے بہتر حالت میں ہوں۔‘‘ دراصل سلیم کو نہایت بے دردی سے باندھ کر اوندھا لٹا دیا گیا تھا۔ وہ اس حالت میں تھا کہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔

میں نے اس کی بے چارگی کو مدِنظر رکھ کر اس کی طرف کھسکنا شروع کر دیا کیونکہ اس وقت کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ کھسکتے کھسکتے میں اس تک جا پہنچی، پھر میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اس لیے اس کی طرف پیٹھ کر لی اور گانٹھ تلاش کرنے لگی۔ تھوڑی سی کوشش سے گانٹھ مل گئی اور میں اندازے سے اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ میری حالت مضحکہ خیز تھی۔ ہم دونوں کی پیٹھ ملی ہوئی تھی۔ اپنے طور پر میں کوشش کیے جا رہی تھی کہ گانٹھ کچھ ڈھیلی ہو گئی۔ میرا جوش سوا ہو گیا اور میں جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

کچھ ہی دیر میں سلیم کا ہاتھ آزاد ہو گیا۔ اس نے فوراً اپنے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا باہر نکالا اور پھر اس نے میرے ہاتھ پیر کھولے۔ اب ہم آزاد تھے۔ بے چارگی میں مرنے والے نہیں تھے۔ کچھ نہ کچھ مزاحمت ضرور کر سکتے تھے۔ اب ہمیں عرفان کا انتظار تھا۔ میں نے زبان سے کچھ کہنا

مناسب نہیں سمجھا کیونکہ یہ حویلی دشمن کی تھی۔ اس نے ہم پر نظر رکھنے کے لیے پتا نہیں کیا کیا انتظام کر رکھا ہو، اس لیے میں نے ذہنی رابطے کو ترجیح دی اور سلیم سے پوچھا۔ ''عرفان سے نمٹنے کی کوئی ترکیب سوچی ہے؟''

''ہم اس پر بیک وقت حملہ کریں گے۔ یہ حملہ فری ہینڈ ہوگا۔ یعنی جسمانی اور ذہنی دونوں۔ جو داؤ چلے، اسے ہی چلانا ہوگا۔ یوں بھی ایک بار جسمانی مقابلے میں تم فتح یاب ہو چکی ہو، اس لیے اسی راہ کو ترجیح دینا۔''

''اور اگر اس نے اپنی جگہ اپنے بیر (مؤکل) کو بھیجا تو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، ایسا نہیں ہوگا۔ وہ خود آئے گا۔''

''اگر ایسا ہو گیا تو؟''

''تو پھر مؤکل سے صرف تم نمٹنا۔ میں اپنی توانائی بچا کر رکھوں گا تا کہ اس کے آنے پر کمزور ثابت نہ ہو جاؤں۔''

تبھی مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہو۔ میں اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مجھے ہدایت دے رہا ہو کہ اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ ''جی...... میں نے سب سن لیا۔'' میں نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا تو وہ آواز تھم گئی۔ میں نے وہ بات سلیم کو بتائی تو سلیم نے کہا کہ شاید یہاں ہم کمزور پڑ سکتے ہیں اسی لیے ہمیں باہر نکلنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''دروازے کی بجائے کھڑکی سے باہر نکلنا زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ دروازے پر کوئی ہو سکتا ہے۔'' سلیم نے کہا۔

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی بند تھی اور اس میں سلاخیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی دیکھتے وقت میری نظر دیوار پر پڑی۔ ابھی تک تو میں خود میں اُلجھی ہوئی تھی اس لیے کمرے کا جائزہ نہیں لے پائی تھی۔ پہلی بار جب میں یہاں خود آئی تھی تو اس کمرے سے گزرتی چلی گئی تھی اس لیے باریک بینی سے اس کمرے کو دیکھا نہیں تھا۔ کمرے کی دیواروں پر عجیب و غریب مورتیاں کھدی ہوئی تھیں۔ میں ہندوؤں کے تقریباً تمام بھگوانوں کی تصویر یا مورتیاں دیکھ چکی تھی۔ گنیش سونڈ والا تھا، شنکر کی جٹا تھی اور گلے میں سانپ۔ وشنو بہت بڑے سانپ پر لیٹا ہوا دکھایا جاتا تھا۔ کرشن بانسری بجاتے ہوئے نظر آتا تھا۔ رام تیر کمان والا تھا مگر ان دیواروں پر جو مورتیاں کھدی ہوئی تھیں، وہ ان سے بالکل الگ تھیں انتہائی بھیانک و مکروہ شکل والی۔ چٹانوں کو تراش کر مورتیاں اُبھاری گئی تھیں۔ یقیناً بت تراشنے والا بہت بڑا فنکار تھا کیونکہ تمام کی تمام مورتیاں زندگی سے قریب لگ رہی تھیں جیسے ابھی سانس لینا شروع کر دیں گی مگر انہیں دیکھ کر کراہیت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ عجیب سا خوف ہڈیوں میں سرسرانے لگتا تھا۔ میں ان مورتیوں کا جائزہ لینے کے لیے دیوار کے اور نزدیک پہنچ گئی جبکہ سلیم کھڑکی کی سلاخوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب میں دیوار کے بالکل قریب پہنچی تو مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ ان مورتیوں کی آنکھوں میں زندگی لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی زندہ آدمی کی آنکھیں ہوں۔ میں نے جب بغور دیکھا تو یہ حقیقت لگی کیونکہ آنکھوں کے دیدے یعنی پتلی حرکت کرتی نظر آئی۔ میں نے پلٹ کر سلیم کو دیکھا۔ اسے بتانا چاہتی تھی مگر اتنی دیر میں سلیم نے لوہے کی تین سلاخوں کو کھینچ کر نکال لیا تھا اس لیے یہ بات بتانے کی بجائے میرے منہ سے نکلا۔ ''ارے...... تم تو ہرکیولیس بن گئے۔ (Hercules) اتنی مضبوط کھڑکی کو توڑ دیا......''

''آہستہ بولو۔'' سلیم نے ذہنی رابطہ کر کے کہا۔'' چلو آؤ باہر کود و۔''

سلیم کی بات سنتے ہی میں کھڑکی کے نزدیک آ گئی۔ اب اتنی جگہ نکل آئی تھی کہ میں سلاخوں کے درمیان سے باہر کود سکتی تھی۔ میں نے سلاخوں کو پکڑ کر جسم کو اوپر کیا، پھر داہنا پیر باہر نکالا۔ باہر کی دیوار سے پیر ٹکا کر پورا جسم باہر نکال لیا اور پھر سلیم کو باہر آنے کا اشارہ دیا۔ سلیم نے ابھی سر باہر نکالا تھا کہ میری نظر اندر کی طرف پڑی اور میں گھبرا اٹھی۔ بات ہی ایسی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دیواروں میں بنی مورتیاں زندہ ہو کر نیچے کود رہی تھیں۔ میں نے سلیم سے کہا۔'' جلدی...... جلدی باہر نکلو۔''

میری گھبراہٹ دیکھ کر وہ پھرتی سے باہر کود گیا۔ باہر آ کر اس نے اندر نظر ڈالی تو اس کے چہرے پر بھی گھبراہٹ چھا گئی۔ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کے بونے (Gypsy) کھڑکی پر چڑھتے آ رہے تھے۔ ہم باغیچے میں کھڑے تھے۔ بیرونی دیوار کافی دور تھی۔ ہم اس دیوار کی طرف دوڑنے لگے۔ ہمارے پیچھے پیچھے بونوں کی فوج تھی۔ کم سے کم بیس بونے تو ہوں گے ہی۔ بونوں کو کیسے روکا جائے، میں یہی سوچ رہی تھی کہ مجھے جھٹکا لگا۔ ایک بونے نے میرے کپڑے کو پیچھے سے پکڑ لیا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔'' سلیم! مجھے سنبھالو۔''

سلیم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اتنی دیر میں کئی بونوں نے اس پر بھی چھلانگ لگا دی۔ ہم عجیب صورتِ حال کا شکار تھے۔ یہ ننھے ننھے شیطان ہمارے جسم سے لٹکے ہوئے تھے۔ ان کا وزن اتنا تھا کہ میرا کھڑا رہنا ممکن نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھ پر پہاڑ آ گرا ہو۔ گھبرا کر میں نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی۔ آیت الکرسی کا پڑھنا تھا کہ تمام کے تمام بونے پٹ پٹ گرتے چلے گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چابی بھرے گڈے چابی ختم ہوتے ہی گر پڑے ہوں۔ یہاں سے وہاں تک گڈے بکھرے پڑے تھے۔ سلیم نے جائزہ لے کر کہا۔'' چلو...... ایک وبال سے تو جان چھوٹی۔''

عین اسی وقت بدبو کا ایک بھبکا سا اٹھا اور میں نے گھبرا کر ناک بند کر لی۔ ایسی تیز بدبو تھی کہ ناک پھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جی متلانے لگا۔

''ہوشیار...... ہوشیار......'' سلیم نے کہا۔'' عرفان ہوشیار ہو چکا ہے اور اس نے لونا چمارن کو بھیجا ہے۔''

لونا چمارن کا نام سنا ہوا تھا۔ کالا علم کرنے والے خصوصی طور پر لونا چمارن کی پوجا کرتے ہیں کیونکہ اسے کالے علم کی ماں تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے پاس بے حساب علم ہے اور اسے شکست دینا ناممکن سی بات ہے۔ اس سے مقابلہ کس طرح کیا جائے، میں اس پر غور کرنے لگی۔ سلیم کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے کیونکہ ہم یہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ عرفان کا شکار کیے بغیر یہاں سے پلٹنا ناممکن سی بات تھی۔ ہمیں ہر حال میں عرفان کو شکست دینی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم اس کے مقابلے میں صفر ہیں۔

☆=======☆=======☆

بدبو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم گندگی کے ڈھیر پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ سلیم نے بتا دیا تھا کہ لونا چمارن آ رہی ہے۔ لونا چمارن کے بارے میں، میں نے پہلے بھی سنا تھا کہ یہ کالے علم والوں کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ سفلی عمل کرنے والے اسے ''علم کی ماں'' تصور کرتے ہیں۔ ایک بار پہلے بھی میری اس سے مڈبھیڑ ہو چکی تھی اس لیے میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے اس بار بھی شکست دے دوں گی تبھی سماعت سے ایک نامعلوم آواز ٹکرائی تھی کہ کمرے سے باہر نکلو۔ یہ آواز کس کی تھی، میں سمجھ نہیں پائی تھی مگر

لہجے میں اپنا پن تھا اس لیے میں فوراً کھڑکی سے کود کر باہر نکل آئی تھی۔ میرے ساتھ سلیم بھی باہر آ گیا تھا۔ ہم حویلی کے باغیچے میں کھڑے تھے اور مخالف سمت دیکھ رہے تھے۔ یہ بدبو اُدھر ہی سے آ رہی تھی۔ میں سورۃ الناس کی تلاوت بھی کرتی جا رہی تھی کیونکہ عجیب صورتِ حال درپیش تھی۔ باہر باغیچے میں یہاں سے وہاں تک گھنے پیڑ تھے۔ آم اور کٹھل کے پیڑ۔ ان پیڑوں سے ٹکرا کر آنے والی ہوائیں فرحت بخش تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں کسی ایک پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی ہوتی اور سلیم کی قربت کے نشے میں سرشار ہو کر میں خوبصورت ماحول کا بھرپور لطف لیتی مگر یہاں تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ فرحت بخش جھونکے کے ساتھ رہ رہ کر بدبو کے بھبکے بھی آ رہے تھے جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتے جا رہے تھے۔

میں نسبتاً بلند آواز میں سورۃ الناس کا ورد کیے جا رہی تھی کہ یکا یک ایسا لگا جیسے میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ بالکل کورے کاغذ کی طرح سفید ہو گیا ہے کہ سورۃ الناس بھی بھول گئی۔ میں چاہ کر بھی کچھ پڑھ نہیں پا رہی تھی۔ گویا زبان پر تالے لگ گئے تھے اور پھر ایسا لگا جیسے اسی کھڑکی سے جس سے میں باہر آئی تھی، وہاں سے ایک انتہائی مکروہ شکل کی عورت گویا اُبل پڑی تھی۔ اُبل پڑنے کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ وہ انتہائی موٹی تھی جیسے وہ کوئی افریقی ہو۔ اس پر غضب یہ تھا کہ اس کے سامنے والے اوپر کے چاروں دانت ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ہونٹ اتنے موٹے تھے کہ ان پر اکڑے ہوئے مردہ چوہے کا گمان ہو رہا تھا۔

وہ اب آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے سلیم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی نشانی میں صاف دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ خائف تھا مگر مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ میں کالا کانتو سے ٹکرا چکی تھی۔ وہ بھی تو اسی کی طرح علم سحر کی پیداوار تھا اس لیے میں اس خبیث کو چیلنج کے انداز میں دیکھے جا رہی تھی۔ میری بے خوفی نے اس پر کس قدر اثر ڈالا ہے، اس کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

وہ دانت نکوسے میری طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ میں نے اسے روکنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کس قسم کا حربہ آزمائے گی، لیکن مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے دس قدم کی دوری پر رک کر ایک چنگھاڑ ماری۔ شاید اس نے یہی سمجھا تھا کہ میں اس کی چنگھاڑ سے ڈر جاؤں گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ میں اپنی جگہ جمی رہی تو اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ کراہیت آمیز کالا ہاتھ جو دیکھنے میں کسی سوکھے بانس جیسا تھا، لمبا ہو کر میری گردن تک پہنچ گیا تھا۔

میں جھٹکے سے نیچے بیٹھی اور ایک طرف سرک گئی، پھر اُٹھ کر کچھ اور دور ہو گئی۔

''کہاں تک بھاگو گی؟'' اس کی کھرکھراتی آواز گونجی۔

''بھاگتے ہیں بزدل...... بہادروں کا شیوا نہیں ہے کہ وہ پیچھے ہٹیں۔ میں تو پینترا بدل رہی ہوں تاکہ موقع ملتے ہی تمہارا گلا دبا سکوں۔''

''خواب اچھا دیکھ لیتی ہو۔''

''یہ بڑبولا پن نہیں، حقیقت ہے۔ بس کچھ ہی دیر میں، مَیں تمہارا نام و نشان مٹا دوں گی'' میں نے کڑے تیور کے ساتھ کہا۔

''اچھا...... تو تم اپنی زندگی سے بے زار ہو۔ کوئی بات نہیں، میں تمہیں موت کا مزہ چکھاؤں گی'' یہ کہہ کر اس نے پھر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ سوکھے بانس جیسا کالا ہاتھ پھر سے میری طرف بڑھنے لگا۔ اس بار میں نے اُچھال بھری اور کافی پیچھے سرک آئی پھر میں نے وہیں سے اونچی آواز میں

کہا۔ ’’تم کتنی ہی کوشش کرلو، مگر مجھ تک پہنچ نہیں پاؤ گی۔‘‘

’’آج تک مجھے کوئی بھی شکست نہیں دے سکا ہے۔ چیتا گاؤں میں، مَیں نے تم پر رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا مگر اب نہیں۔‘‘

’’کسے شکست ہوگی، یہ تو وقت بتائے گا۔‘‘

’’میں بہادر ہوں، مجھے کون شکست دے گا۔ یوں بھی بہادروں کی پوجا ہوتی ہے۔ کمزور خود کو بچانے کے لیے ہی تو طاقتور کی پوجا کرتے ہیں اور طاقتور ان کمزوروں کی حفاظت کرتا ہے۔ عرفان بھی میرا پجاری ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے ہی میں تمہارا خون پینے آئی ہوں۔ کتنا مزہ آئے گا جب تمہاری شہ رگ کٹے گی۔ نرخرا اُدھڑے گا اور کٹے ہوئے نرخرے سے گرم گرم خون اُچھل اُچھل کر باہر آئے گا۔‘‘

’’ہر فرعون را موسیٰ است! اپنی سوچو۔ آج تک تم نے بنی نوع انسان کو جتنا ستایا، اس پر میں خط کھینچنے والی ہوں۔ پورا باب بند ہونے والا ہے۔‘‘ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

’’اپنے علم پر تمہیں بڑا گمان ہے تو پھر لو سنبھلو۔‘‘ کہہ کر اس نے پھونک ماری۔

آپ نے سگریٹ نوشوں کو سگریٹ کے کثیف دھوئیں کو چھلے کی شکل میں اُڑاتے دیکھا ہوگا۔ بالکل ویسا ہی چھلا اس نے اپنے منہ سے اُڑایا تھا۔ دھوئیں کے چھلے اور اس چھلے میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ وہ ایک کے پیچھے ایک اُڑتے ہوئے آگ جیسی سرخی لیے بڑھے چلے آرہے تھے اور لمحہ بہ لمحہ ان کا حجم بھی بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک اور اُچھال بھری اور مزید دور ہوگئی۔

اس بار جہاں پر پہنچی تھی، وہاں گھاس کاٹنے کی بڑی سی قینچی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر اس قینچی کو اُٹھالیا۔ اس کے منہ سے نکلتے چھلوں نے بھی اپنا رُخ موڑلیا تھا۔ وہ گویا میرا پیچھا کر رہے تھے۔ یقیناً ان میں ایسی کوئی بات ضرور ہوگی جو مجھے نقصان پہنچا سکتی ہے اسی لیے میں اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میرے ہاتھ میں قینچی دیکھ کر سلیم چیخا۔ ’’قینچی کو پھینکنا نہیں۔ یہ لوہا ہے اور لوہا بدروح سے حفاظت کرتا ہے۔‘‘

مجھے یاد آگیا تھا کہ بچے کی ولادت سے چھٹی نہانے تک عورتیں اپنے ساتھ لوہے کا ایک نہ ایک اوزار ضرور رکھتی ہیں اس لیے میں نے قینچی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ویسے لوہے کا ایک اوزار پہلے سے بھی میرے پاس تھا۔ یہ ایک کٹار تھی جسے فقیر بابا کا عطیہ کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے کٹار دیتے وقت کہا تھا۔ ’’اسے حفاظت سے رکھنا۔ اس میں وہ قوت ہے جو کسی عام ہتھیار میں نہیں۔ اسے خاص ضرورت پر ہی نکالنا۔‘‘ اس لیے اسے میں ہر وقت کمر سے لٹکائے رکھتی تھی۔ اس کٹار کو نکالنے کی بجائے میں قینچی ہی کو کھول کر آگے بڑھی۔

’’نہیں...... تم آگے مت بڑھو۔‘‘ سلیم نے کہا۔ اس کی آواز میں اب تک کپکپاہٹ تھی۔ گویا وہ ابھی تک خوف کے چنگل سے نکل نہیں پایا تھا۔ میں نے رُک کر اسے گھورا۔

’’جب تک اس سے دور رہوگی، وہ خوف زدہ رہے گی۔ جہاں اس کے قریب پہنچیں، اس کا مغالطہ ختم ہوجائے گا اور وہ تم پر حملہ کر دے گی۔‘‘ سلیم نے ذہنی رابطے کے ذریعے مجھے پیغام دیا۔ ’’میں اس پر حملہ کرنے کے لیے موقع کی تاک میں ہوں۔‘‘

ابھی اس نے پیغام دیا ہی تھا کہ میرے ذہن میں پھر سرسراہٹ ہوئی اور میں چونک گئی۔ میرے ذہن کو کوئی اور بھی کھنگال رہا تھا، پڑھ رہا تھا اور یہ انداز سلیم کا نہیں تھا۔ میں نے فوراً ہی ذہن سے اس خیال کو جھٹک کر خود کو محفوظ رکھنا چاہا تھا کہ ایک انجانی آواز گونجی۔ ''یہ علم صرف تمہارے پاس ہے، یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں بھی تمہارے دماغ میں بیٹھا ہوں۔ تم جو کچھ بھی سوچو گی، میں اسے جان لوں گا۔''

''آپ ہیں کون؟''

''وہی جس کا قلع قمع کرنے آئی ہو۔''

''تو کیا تم عرفان ہو؟''

''جی ہاں...... ہر حسینہ کا خادم خاص عرفان......''

''تو گویا تم چوہے کے بل میں گھسے بیٹھے ہو مگر فکر نہ کرو، میں تمہیں وہاں سے بھی کھینچ لوں گی۔''

''شکست یقینی ہو تو لوگ اسی طرح گلا پھاڑتے ہیں۔ چھوٹے موٹے ''بیر'' کو شکست دے کر تم نے سمجھ لیا ہے کہ تم ناقابلِ تسخیر بن گئی ہو۔ اب ذرا لونا سے نمٹو، تب سمجھ آئے گا کہ کتنے پانی میں ہو۔''

''تمہارے بیر کس کھیت کی مولی ہیں؟ لو اپنی آنکھوں سے اس کا انجام دیکھ لو۔'' میں لونا سے بے خبر نہیں تھی۔ اول تا آخر اس پر نظریں جمائے رہی تھی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ عرفان مجھے باتوں میں پھنسا کر پٹوا دے گا، پھر لونا بھی بڑھی چلی آ رہی تھی۔ یہ میرا اس سے دوسرا مقابلہ تھا۔ اس سے پہلے بھی میں اس سے مقابلہ کر چکی تھی۔

لونا اب میرے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ مجھے فرار کا کوئی راستہ نہ سوجھا تو انکل سے میں نے آیت الکرسی کی تلاوت شروع کر دی۔ میں وہ بدنصیب لڑکی تھی جس نے ایک دین دار گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں اور اپنے کرتوتوں کی وجہ سے راندہ درگاہ ہو گئی تھی۔ آیت الکرسی تک اٹک اٹک کر پڑھ رہی تھی۔ ایک بار، دو بار، کئی بار پڑھا۔ آیت الکرسی سے اتنا فائدہ ہوا کہ لونا چمارن نے آگے بڑھنا موقوف کر دیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی مجھے گھورے جا رہی تھی۔

سلیم نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں نے ہی لونا کو روک لیا ہے۔

لونا ابھی مجھے دیکھ ہی رہی تھی کہ سلیم نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونک ماری۔ بس یہی وہ موقع تھا کہ اس نے میری طرف سے نظریں ہٹا کر سلیم کو دیکھا۔ اس کا لمبا ہاتھ جو میری طرف بڑھا ہوا تھا، اس نے اسے گرا لیا۔ اس کے ہاتھوں کی بڑھی ہوئی لمبائی اب اور زیادہ مکروہ لگ رہی تھی۔ دراصل اس کا ہاتھ زمین کو چھو رہا تھا۔ قد کے مقابلے میں ہاتھ لمبے نظر آ رہے تھے اسی لیے بھدے لگ رہے تھے۔

سلیم نے پتا نہیں کیا پڑھ کر پھونکا تھا کہ وہ رہ رہ کر جھٹکے لینے لگی تھی۔ اسی دوران میں سلیم نے ذہنی رابطے کے ذریعے کہا۔ ''تم اپنے گرد ''لاتعلق نور بہائے'' کا حصار کر لو۔ یہ بہت عمدہ اور زود اثر دعا ہے۔''

یہ دعا مجھے بابا جی نے بتائی تھی اور میں نے اسے لکھ لیا تھا۔ وہ کاغذ اب تک میرے آنچل میں بندھا تھا۔ زبانی یاد کرنا میرے لیے اب

ناممکن سی بات ہوگئی تھی۔ جب سے میں نے مندروں کے چکر لگانا شروع کیے تھے، مجھے نسیان نے گھیر لیا تھا۔ کوئی بھی بڑی دعا یاد ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے جلدی جلدی آنچل سے پرزی کھولی اور اس پر لکھی دعا کو پڑھنا شروع کر دیا۔

ابھی میں دعا پڑھ ہی رہی تھی کہ مشرقی سمت سے کالے بادل اُمڈتے نظر آئے جو نہایت تیزی سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے جیسے ہی اُدھر دیکھا تو بُری طرح چونک گئی۔ بات ہی ایسی تھی۔ جسے میں نے بادل سمجھا تھا، وہ بادل نہیں، پرندے تھے جو جھنڈ کے جھنڈ چلے آ رہے تھے۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ آسمان چھپ گیا تھا۔

"تم دونوں نے اپنی قوت آزمالی، اب میرا کمال دیکھو۔" یہ آواز لونا کی تھی۔

قطار در قطار پرندے بالکل سر پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے اگلی قطار میں اُڑ رہے پرندوں نے ہوائی جہاز کی طرح غوطہ لگایا۔ وہ اپنی چونچ سے حملہ کرنا چاہتے تھے مگر یہ کیا جیسے ہی میرے قریب آئے، کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گرتے چلے گئے۔ جانوروں میں خنزیر کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ غول کی شکل میں دوڑتے ہیں تو پھر رُکتے نہیں ہیں۔ اگر سامنے دریا یا کھائی آ جائے تو بھی نہیں رُکتے۔ ایک کے بعد ایک کھائی میں گرتے چلے جائیں گے مگر رُکیں گے نہیں۔ یہی حال ان پرندوں کا تھا۔ وہ نادیدہ دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا غول اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا مگر رُک نہیں رہے تھے۔

یہ دیوار کیسی ہے؟ کس نے بنائی ہے؟ میں ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ سلیم نے کہا۔ "کسی بھی خیال کو دماغ میں آنے نہ دو۔ ہمہ وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ تمہارے ذہن کو کوئی اور بھی پڑھ رہا ہے۔"

میں نے دیوار کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا کہ کب، کیسے، کس نے کھڑی کی ہے اور اپنے اطراف پر نظر رکھنے لگی۔

وہ پرندے اب بھی آ رہے تھے اور نادیدہ دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے تھے۔ باغیچے کا فرش جس پر سبز گھاس تھی، وہ کالے مکروہ، عجیب سی شکل والے پرندوں سے چھپ گیا تھا، تبھی میں نے سلیم کو مخاطب کیا۔ "یہ پرندے کب آنا بند ہوں گے؟"

"شاید یہ عرفان کا آخری حربہ ہے۔ یہ ختم ہو جائے تب پوچھوں گا کہ تُو نے مسلمان ہو کر کفر کا جو راستہ اختیار کیا ہے، اس کی قیمت جانتا ہے؟"

"تو کیا مجھ سے پوچھے گا؟ میں تیرا ابھی کریا کرم کیے دیتا ہوں۔ تُو نے لونا کو ساکت کر کے سمجھ لیا ہے کہ تمہاری جیت ہوگئی ہے؟" یہ آواز عرفان کی تھی اور ہر طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی اس لیے یہ پتا نہیں لگ پایا کہ وہ کس طرف چھپا بیٹھا ہے۔

میں نے خود ہی اسے للکارا۔ "چوہے کے بل میں گھسے بیٹھے ہو۔ ایک لڑکی سے ڈر گئے۔ ہمت ہے تو مرد بنو۔ سامنے آؤ......" میں نے اس پر نفسیاتی وار کیا۔ مرد کتنا ہی بزدل کیوں نہ ہو، مگر وہ عورت سے خود کو برتر ضرور سمجھتا ہے۔ میری بات اس کے لیے طعنہ بن گئی اور وہ تلملا کر میرے سامنے آ گیا۔

اب مجھے پتا چلا کہ وہ باغیچے ہی میں ایک پیڑ کی گھنی شاخوں کے درمیان چھپا بیٹھا تھا۔ جس وقت ہم لونا سے اُلجھ رہے تھے، شاید اسی وقت وہ حویلی سے نکل کر آ گیا تھا۔

"تو لو...... مجھ سے مقابلہ کرو۔ میں بھی تو دیکھوں تمہارے پاس کتنا علم ہے۔ ایمان فروخت کر کے تم نے کیا کیا خریدا ہے؟"

"تم نے اپنے گرد "سورکچھا کوچ" (حفاظتی دیوار) کھڑی کر کے سمجھ لیا ہے کہ تم ناقابلِ تسخیر بن گئی ہو۔ اس کوچ کو تو میں ابھی توڑے دیتا ہوں۔" کہہ کر اس نے ایک بوتل میں بھرا مائع میری طرف اُچھال دیا۔ اس مائع کے پڑتے ہی وہ نادیدہ دیوار ختم ہوگئی کیونکہ اب کی بار جو پرندہ مجھ پر جھپٹا تھا، وہ سیدھے میرے سر پر آیا تھا۔ اگر میں بروقت بیٹھ نہ جاتی تو یقیناً وہ میرے سر میں سوراخ کر دیتا۔ بیٹھتے بیٹھتے بھی میں نے عقل سے کام لیا تھا اور ہاتھ میں پکڑی کٹار کو سر سے اوپر اُٹھا دیا تھا۔ وہ پرندہ غوطہ لگا چکا تھا۔ اس کا نشانہ میرا سر تھا۔ میرا سر تو محفوظ رہا مگر وہ خود کو بچا نہ سکا۔ کٹار اس کے پیٹ میں اُتر گئی۔

اگر اس طرح وہ کٹار کسی عام پرندے کے پیٹ میں اُترتی تو یقیناً اس کے خون سے میں نہا جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک قطرہ خون بھی نظر نہ آیا۔ یہ کٹار فقیر بابا کی دی ہوئی تھی۔ ضرور اس پر کوئی عمل کیا گیا تھا اسی لیے جیسے ہی وہ کٹار پرندے کے پیٹ میں اُتری، اس پرندے کے جسم میں آگ لگ گئی اور وہ گر کر دھواں دینے لگا۔

"لو...... تمہارا یہ وار تو خالی گیا۔ اب اور بھی کوئی منتر تمہارے پاس ہے تو اسے بھی آزما لو۔" کہہ کر میں نے قہقہہ لگایا۔

"وہ لوگ بیوقوف ہوتے ہیں جو صرف منتر پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اب تک تم خود بھی جان گئی ہوگی کہ میں ایک ساتھ دو چال چلتا ہوں۔ ایک منتر شکتی اور دوسرا شریر شکتی یعنی جسمانی طاقت۔ ڈھاکا آتے ہی تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ایک طرف میں نے تمہیں اپنے جال میں پھنسانے کے لیے اپنے "بیر" کو بھیجا تھا تو دوسری طرف ایک نوکر کو۔ دو چال اسی لیے تو چلتا ہوں کہ کسی نہ کسی چال میں تو میرا مقابل پھنسے گا۔"

"تو اب کیا کشتی لڑو گے؟" میں نے طنز کے تیر چلائے۔

"یہ بھی تو کشتی ہے، عقل کی کشتی...... اس کا ایک اور نمونہ دیکھو۔"

اس نے کہا اور ایک مٹھی خاک اُٹھا کر اس نے میری جانب پھینکی۔ میں پوری طرح ہوشیار تھی۔ فوراً اپنی جگہ سے اُچھل کر دور ہٹ گئی اور وہ خاک ٹھیک اسی جگہ گری جہاں پر میں کھڑی تھی۔ خاک کے گرتے ہی زمین سے دھواں اُٹھنے لگا۔ بات حیرت کی تھی کہ یہ وہی خاک ہے جسے اس نے زمین سے اُٹھایا تھا۔ وہ خاک اس کے منتر کی قوت سے تیزاب جیسی قوت والی بن گئی تھی۔

اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر وہ پھر زمین کی طرف جھکا تا کہ دوبارہ مٹی اُٹھا سکے۔ اس کی پوری توجہ میری جانب تھی اسی لیے وہ سلیم کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ سلیم بھی شاید موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ایک ڈال کو بلند کیا اور پوری قوت سے اس کی گردن پر دے ماری۔

جتنی قوت صرف کر کے اس نے ڈال کو ماری تھی، اس سے عرفان کا سر پھٹ جاتا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ہاں...... ایک زوردار ٹن کی آواز اُبھری تھی، جیسے وہ ڈالی لوہے سے ٹکرائی ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ہنسی کی آواز بھی گونجی تھی۔ وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے قہقہہ روک کر کہا۔ "اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ ٹھیکری بھی پہاڑ سے ٹکرانے لگی ہے۔ جنگل کی اولاد...... تجھے میرے علم کی وسعت کا پتا نہیں ہے، اسی لیے تُو نے یہ غلطی کی ہے۔ لے سنبھل، اب میں تجھے دکھاتا ہوں کہ دشمن پر کیسے وار کیا جاتا ہے۔" کہہ کر اس نے زمین سے مٹی اُٹھائی اور نہایت پھرتی سے سلیم پر پھینک دی۔ یہ کام

اس نے اتنی سرعت سے کیا تھا کہ سلیم کچھ بھی کر نہ سکا اور اس کے سینے سے مٹی ٹکرا گئی لیکن اس بار شاید اس نے کوئی دوسرا منتر پڑھا تھا کیونکہ نہ تو اس کا کپڑا جلا اور نہ اس کی چیخ گونجی۔ وہ جس طرح ڈالی تھامے کھڑا تھا، ویسے ہی کھڑا رہ گیا۔

''لو بھئی تمہارا ساتھی تو باغیچے کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے مورتی میں بدل گیا۔ اب لوگ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے۔'' عرفان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

اس کے قہقہے نے میرے جی کو جلا دیا تھا۔ میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اب یہ کتنی دیر بعد پھر سے اصلی حالت میں آئے گا؟''

''جب تک میں نہ چاہوں۔ ویسے فکر نہ کرو۔ جیسے ہی تم میری دلہن بنوگی، میں منہ دکھائی میں یہی مجسمہ تمہیں دوں گا۔''

''یہی خواب شورویر نے دیکھا تھا اور اپنی طویل زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اب تمہاری باری ہے۔'' میں نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

''بی بی! اب تک نہ جانے کتنے لوگ میری موت کا خواب دیکھتے دیکھتے مر گئے۔ میں نے اپنی اتنی بڑی جاگیر کو یونہی لات نہیں ماری ہے۔ اگر تمہاری سہیلی نورالنہار کا باپ بیوقوفی نہ کرتا تو اپنی جاگیر میں اسے دے دیتا کیونکہ میں قوت کا پہاڑ بن چکا ہوں۔ پوری دنیا کو اکیلے فتح کر سکتا ہوں۔''

''ہر فرعون را موسیٰ است! بُرائی کو دوام نہیں ہے۔ بس کچھ دیر کی بات ہے، میں تمہیں مٹی چٹا کر رہوں گی۔''

''ارے..... تم آنکھوں سے اشارہ کردو تو میں خود شہید ہو جاؤں۔''

عین اسی وقت مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کانوں کے پاس سرگوشی کی ہو کہ یہ نقل ہے، اس سے اُلجھنا وقت ضائع کرنا ہے۔ تم ایسا کرو کہ اس کے داہنے پیر پر اپنی کٹار مارو، پھر تماشا دیکھنا۔''

اس آواز نے میرے اندر نئی قوت بھر دی۔ مجھے نیا حوصلہ ملا کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ میری حفاظت کے لیے اور بھی بہت سے لوگ موجود ہیں۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی میں نئے حوصلے کے ساتھ اس پر پل پڑی تھی۔ اُچھل کر اس کے سینے پر لات ماری تھی اور وہ خود کو سنبھال نہ سکا تھا۔ سیدھا زمین پر آ گرا تھا۔ اس کے گرتے ہی میں نے کٹار کا بھرپور وار کیا۔

اس کے داہنے پیر پر جیسے ہی کٹار لگی، وہ کراہ اُٹھا پھر کچھ ہی دیر میں وہ اس طرح تڑپنے لگا جیسے جانکنی میں مبتلا ہو۔ میں نے مرے پر سو درے کے مصداق، جہاں پہلے کٹار ماری تھی، اسی جگہ دوبارہ وار کر دیا۔ اس وار کو وہ بالکل سہہ نہ سکا اور دو تین بار تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

اس کے ساکت ہوتے ہی میں نے سلیم کی طرف دیکھا۔ وہ اب تک اسی طرح پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے پہلے سے کوئی علم نہیں تھا کہ اس قسم کے حالات میں آیت الکرسی پڑھنی چاہیے یا نہیں۔ بس اس خیال سے پڑھ دی تھی کہ یہ سحر کا توڑ ہے۔ لیکن نتیجہ حوصلہ افزا نکلا۔ سلیم کو گویا ہوش آ گیا۔ پہلے اس نے آنکھیں پٹپٹائیں پھر ہاتھ پیروں کو جھٹکا دینے لگا۔

''واہ..... اس کو کہتے ہیں، مارو گھٹنا، پھوٹے آنکھ..... میں نے اٹکل میں آیت الکرسی پڑھی اور نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔''

''قرآن پاک کو تم سمجھتی کیا ہو۔ اس کا ہر نقطہ اتنے فوائد کا حامل ہے کہ اس کی تشریح کے لیے سمندر سے زیادہ روشنائی کی ضرورت ہے۔'' سلیم بولا۔

''واقعی اب مجھے احساس ہوتا جا رہا ہے کہ میں غلط تھی۔ قرآن پاک کی تعلیمات کو بھلا کر ادھر اُدھر بھٹک رہی تھی۔'' کہتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ میرے پیچھے سلیم نہیں تھا۔

میں نے دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر طرف دیکھا، مگر سلیم نظر نہ آیا۔ یہ کم حیرت کی بات نہ تھی۔ ہم ابھی ابھی ساتھ تھے۔ وہ میرے پیچھے تھا اور میں آگے۔ ہم باتیں بھی کر رہے تھے۔ جب اس کا جواب آنا بند ہوا، تبھی میں نے مڑ کر دیکھا تھا، لیکن اب دور دور تک اس کا پتا نہ تھا۔ نا معلوم اسے زمین کھا گئی تھی کہ آسمان؟ وہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میری حیرانی، پریشانی میں بدل گئی تھی۔ میں نے قدرے بلند آواز میں اسے پکارا۔

ایک بار، دو بار، کئی بار پکارا مگر اس کا جواب نہیں آیا حالانکہ عرفان کی حویلی کا باغیچہ اتنا بڑا بھی نہ تھا۔ وہ کسی بھی کونے میں ہوتا، اس کے کانوں تک میری آواز یقیناً پہنچ جاتی۔ وہ گیا کہاں؟ یہ سوچ کر میں نے ڈم ڈم کی گھنی جھاڑیوں سے بنی قدِ آدم آرائشی دیوار در دیوار کی طرف دیکھا اور بُری طرح چونک گئی۔ میں کیا، میری جگہ جو بھی ہوتا، وہ چونک جاتا۔ بات ہی ایسی تھی۔ وہ گھنا پیڑ جس پر دو کلو سے دس کلو تک کے بارہ پندرہ پھل بھی لگے ہوئے تھے، وہ اپنی جگہ سے سرکا تھا۔

یہ ایک ناممکن سی بات تھی کیونکہ ہر پیڑ کی جڑیں زمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اس لیے کسی پیڑ کا سرکنا ناممکن سی بات تھی مگر وہ کچھ آگے سرکا ضرور تھا۔ یہ آنکھوں کا مغالطہ بھی نہیں تھا۔ میں اسی پیڑ پر نظریں ٹکائے اُدھر بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ اپنی جگہ پر تھم کر رہ گئی۔ میں نے صاف دیکھا تھا کہ اس پیڑ کی دو ڈال انسانی ہاتھوں کی طرح آگے بڑھی تھی۔ اس ڈال کی اگلی شاخیں بالکل انگلیوں، ہتھیلی کی طرح کھل بند ہوئی تھیں۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی اندھے آدمی نے ٹٹول کر بڑھنے کی کوشش کی ہو۔ اب میں صاف دیکھ رہی تھی کہ وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ ایسا ہی ایک واقعہ چٹا گاؤں میں رانگامائی روڈ کے کنارے پیش آیا تھا جب میں ٹرک کے ذریعے شہر آ رہی تھی۔ اسی طرح بہت سے پیڑوں نے آگے آ کر میرا راستہ روکنا چاہا تھا۔ اس واقعے کی یاد نے مجھے وہی دعا یاد دلا دی جو اس دن میں نے پڑھی تھی۔ میں نے زور زور سے انہی قرآنی آیتوں کو پڑھنا شروع کر دیا مگر یہ کیا، یہ والے پیڑ تو بہت ڈھیٹ تھے۔ ان پر دعائیں بھی اثر انداز نہیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

میری نگاہیں اس مخصوص پیڑ پر ٹکی ہوئی تھیں اسی لیے میں دائیں بائیں دیکھ نہیں پائی تھی۔ اس مخصوص پیڑ کے علاوہ کئی اور پیڑ بھی اب چلتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے اور انہیں میں نے اتفاقاً دیکھ لیا تھا۔ پھر جو دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا تو روح فنا ہونے لگی۔ ایک دو نہیں، پورے بیس اکیس پیڑ مجھے گھیرے میں لینے کے لیے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

میں اس گھیرے سے کیسے نکلوں، ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ ایک کوا اُڑتا ہوا باغیچے میں داخل ہوا اور اس سرکنے والے پیڑ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی ایک عجیب بات رُونما ہوئی۔ کوے ذرا سی بات پر سماعت شکن شور مچاتے ہیں مگر وہ کوا صرف ایک بار چیخا تھا اور اس کی چیخ میں حد درجہ درد تھا۔ اذیت بھری تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے اس کی گردن دبائی گئی ہو اور ہوا بھی یہی تھا۔

جیسے ہی کوا پیڑ کی ایک ڈال پر بیٹھا، اس پیڑ نے سرکنا بند کر دیا اور اس کی لمبی لمبی ڈالیوں نے پنجوں کی طرح اس پر جھپٹا مارا اور اسے اپنے چنگل میں پکڑ لیا۔ وہی چیخ اس کی آخری تھی ان ڈالیوں نے اسے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکا اور پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ بس ایک ڈیڑھ منٹ

گزرا تھا کہ اس پیڑ کی ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی شاخیں کھل گئیں اور یقین کریں، اب وہ کوا، کوا نہ رہا، نچڑی ہوئی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔

میں نے اس قسم کے درختوں کے بارے میں سنا تھا، دیکھا کبھی نہ تھا کیونکہ گوشت خور پودے افریقہ اور ملایا میں پائے جاتے ہیں۔ برصغیر میں تو ایسا درخت ہوتا ہی نہیں ہے، پھر یہ درخت یہاں آیا کیسے؟ پھر میں نے یہ بھی سنا تھا کہ ایسے درخت دیگر درختوں کی طرح اپنی جگہ پر جمے رہتے ہیں، نا کہ چلتے ہیں؟

اس درخت نے پھر سے چلنا شروع کر دیا تھا اور اب میرے، بہت قریب آ گیا تھا۔ وہ درخت اسی طرح گھیرا تنگ کرتے جا رہے تھے۔

میں ان کے نرغے میں سہمی کھڑی تھی اور سلیم کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ اب میں کیا کروں، کیسے بچوں، ابھی یہی سوچ رہی تھی کیونکہ بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایک بات تو بتانا ہی بھول گئی۔ ان درختوں سے آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ سسکاری لے رہے تھے مگر ہر ایک کی سسکاری میں خفیف سا فرق تھا۔ پتا نہیں، یہ اشارہ تھا یا وہ اسی زبان میں باتیں کر رہے تھے؟ اور ان کا حلقہ بھی تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

اب کچھ ہی دیر تھی کہ وہ میرے سر پر پہنچ جاتے کہ ان کے عقب سے ایک اُڑتی ہوئی بکری آ کر ایک درخت پر گری۔ ”میں.....“ کی آواز اُبھری اور اس پیڑ نے چلنا موقوف کر دیا۔ باقی سب اسی طرح بڑھ رہے تھے کہ ایک اور بکری ایک دوسرے پیڑ پر آ کر گری اور وہ پیڑ بھی رک گیا۔

اس کے بعد تو ایسا لگا جیسے بکروں کی بارش ہونے لگی ہے۔ پیڑ خوب گھنے اور ان کے تنے ایک دوسرے سے سٹے ہوئے تھے اس لیے عقبی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جب کسی پیڑ پر بکرا گرتا تو وہ پیڑ گویا سکڑ جاتا تھا۔ تقریباً تمام کے تمام پیڑ بکروں کی ضیافت میں مشغول تھے کہ پیڑ کے عقبی طرف سے سلیم کی آواز آئی۔ ”تم ٹھیک تو ہو ناں؟“

”ہاں......تم کہاں ہو؟“

”پیڑوں کے عقب میں بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ کھڑا ہوں۔“

”میرے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟“

”پیڑوں کے درمیان سے نکلنے کی کوشش کرو مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ جسم کا کوئی حصہ پیڑ سے مس نہ ہو۔“

میں نے اس کے کہنے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ باریک بینی سے زمین کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ پیڑوں کی جڑیں زمین کے اوپر اُبھر آئی تھیں اور موٹے موٹے بھینسیا جونک جیسی نظر آ رہی تھیں کیونکہ وہ جونک ہی کی طرح ہل رہی تھیں۔ ان سے بچتی بچاتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

ابھی میں تنوں کے درمیان پہنچی تھی کہ جلد بازی میں ایک جڑ پر پیر پڑ گیا۔ پیر پڑتے ہی جڑ نے اُچھل کر کسی بوکھلائے سانپ کی طرح میرے پیر کے پنجے کو جکڑ لیا۔ جس طرح دھمنا سانپ گائے کے گرد لپیٹ کر اس کے تھنوں سے دودھ پیتا ہے، اس جڑ کی بھی یہی حالت تھی۔ اس نے میرے پنجے کو جکڑ لیا تھا۔ میں جو بڑے بڑے سادھو سنتوں تانترک اوجھا کی نظر بندی سے نہ ڈری، خوف ناک سے خوف ناک حالات میں خوف زدہ نہ ہوئی مگر اس عجیب وغریب پیڑ کی جڑ سے ڈر گئی اور اپنی چیخ کو روک نہ سکی۔

میں ہذیانی انداز میں چیخے جا رہی تھی۔ میری چیخ نے سلیم کے جسم میں پھرتی بھر دی۔ وہ اُچھل کر نزدیک پہنچا۔ اس نے پہلے میرے ہاتھ کو

پکڑ کر کھینچا، پھر ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور پھر جب دوبارہ سامنے آیا تو اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اس نے کلہاڑی کا وار کیا تھا۔ وار کاری ثابت ہوا اور جڑ کٹ گئی تھی۔ جڑ کٹتے ہی خون جیسا رقیق مادہ اُچھل اُچھل کر کٹی ہوئی جڑ سے نکلنے لگا۔ میرا پیر آزاد ہو گیا تھا مگر پمپ شو جسے میں نے پہن رکھا تھا، وہ کٹنے والی جڑ کی جکڑ سے نکل نہ سکا۔

پیڑوں کے گھیرے سے نکل کر میں بے دم سی ہو گئی تھی۔ اگر سلیم آگے بڑھ کر مجھے سہارا نہ دیتا تو میں زمین پر گر جاتی۔ وہ مجھ سہارا دے کر باغیچے کے درمیان میں آ گیا کیونکہ ابھی اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ یہاں سے وہاں تک پھیلے پیڑوں میں سے کتنے پیڑ گوشت خور ہیں؟

میں سلیم کا سہارا لیے بیٹھی تھی کہ ایسا لگا جیسے زمین ہل رہی ہو۔ معمولی قوت کا زلزلہ آ گیا ہو۔ میں نے چونک کر سلیم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کچھ پریشان ہو اُٹھا تھا۔ بابا جی نے اس کا ساتھ میرے لیے مبارک قرار دیا تھا مگر یہ تو خود میرے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ علم میں مجھ سے بہت زیادہ تھا، پھر وہ جنگل کا رہنے والا تھا جہاں تاریک قوتوں ہی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہ تو بابا جی کی آشیرواد تھی کہ اب وہ فراٹے سے اردو بولنے لگا ہے ورنہ تو وہ مثل گونگا تھا کہ نہ میں اس کی بات سمجھ رہی تھی اور نہ وہ میری۔

''سلیم......'' میں نے اسے پکارا۔

''آں......'' وہ چونک کر بولا۔

''کچھ سمجھ میں آیا کہ زمین کانپ کیوں رہی ہے؟''

''اسی کا کھوج لگا رہا ہوں۔'' ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ہمارے سامنے کی زمین پھٹی۔ ایک لمبی چوڑی دراڑ پیدا ہوئی اور اس سے بھاپ نکلنے لگی۔ گرم تھپیڑے ہمیں پیچھے دھکیلنے لگے۔

''ارے......ایسا تو آتش فشاں کے قریب ہوتا ہے۔ بھاگو......کہیں آتش فشاں کا لاوا باہر نہ نکلنے لگے۔'' اس نے مجھے کھینچ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔

''یہ آتش فشاں نہیں ہے۔ عرفان کی کوئی چال ہے۔'' میں نے جھڑک دیا۔

''کچھ بھی ہو، ہمیں محفوظ پناہ گاہ میں رہنا چاہیے۔''

''چال کو سمجھو، ہراساں ہونے سے کام بگڑتا ہے۔''

میری جھڑکی نے اسے سنبھالا دیا اور وہ بہت حد تک نارمل ہو گیا۔

اب ہم دونوں بغور اس دراڑ کو دیکھ رہے تھے جہاں سے گرم بھاپ نکل نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی۔ اس دراڑ کی تہہ میں کیا ہے، یہ دیکھنے سے ہم قاصر تھے۔

''کیوں نہ ہم آگے جا کر دیکھیں۔'' میں نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ مجھے بڑھتا دیکھ کر چارو ناچار وہ بھی آگے بڑھا۔ میں اس دراڑ کے قریب پہنچ بھی نہ پائی تھی کہ یکا یک اس دراڑ سے ایک ہاتھ برآمد ہوا۔

وہ ہاتھ یکا یک ہی بلند ہوا تھا اس لیے میں نفسیاتی دباؤ میں آ کر پیچھے ہٹ گئی۔ پیچھے ہٹتے ہوئے میں سلیم سے ٹکرائی اور سلیم زمین پر گر پڑا۔ نیچے وہ، اوپر میں اس لیے میں جلدی سے کھڑی ہو گئی اور پھر سے دراڑ پر نظریں جما دیں۔ اب ایک اور ہاتھ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں ہاتھ لگار پر جمے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اپنے ہاتھوں پر وزن ڈال کر جسم کو اوپر اُٹھا رہا تھا۔ یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا اور ایک شخص اُچھل کر باہر نکلا تھا۔ دیکھنے میں وہ آدمی جیسا ہی تھا مگر رنگت عجیب سی تھی۔ نہ وہ کالا تھا اور نہ گورا۔ اس کی رنگت تپے ہوئے سونے جیسی تھی۔ روشنی میں اس کا بدن ایسے چمک رہا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ میں حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کی نظریں میرا احصار کیے ہوئے تھیں۔

اس کے دیکھنے کے انداز سے دشمنی ہویدا تھی۔ وہ اب قدم بہ قدم چل کر میری طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے سلیم سے کہا۔ ”اپنے گرد حصار باندھو...... یہ کچھ زیادہ ہی خطرناک لگ رہا ہے۔“

سلیم نے زور زور سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ سلیم کو بدبداتے دیکھ کر اس نے چنگھاڑ ماری۔ وہ اتنی زور سے چیخا تھا کہ باہر کے پیڑوں اور بجلی کے تاروں پر بیٹھے پرندے تک ڈر کر اُڑ گئے تھے۔ وہ کسی گوریلا کی طرح دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ تبھی سلیم نے ایک کنکری اُٹھائی۔ اس پر کچھ پڑھا اور پھر اسے اس سنہرے آدمی کی جانب اُچھال دیا۔

ہوا میں اُڑتی ہوئی وہ کنکری سیدھی جا کر اس شخص کے سینے سے ٹکرائی اور جسم کے پار نکل گئی جیسے اس کا جسم ٹھوس نہ ہو، مائع سے بنا ہوا ہو۔

میں اس عجوبے کو دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ بالکل میرے سر پر پہنچ گیا۔ میں پیچھے ہٹی تھی کہ اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے دبوچنے کی کوشش کی تھی کہ سلیم نے پھرتی سے کچھ دوری پر پڑی کلہاڑی کو پھر سے اُٹھا لیا اور برق کی سی رفتار سے آ کر اس شخص کے بڑھے ہوئے ہاتھوں پر وار کر دیا۔

اسے وار کرتے دیکھ کر میں نے انجام کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ کلہاڑی ہاتھوں کو کاٹنے کی بجائے ہاتھوں سے اس طرح گزر گئی جیسے مکھن سے بال۔ میں نے اس کی پکڑ سے خود کو بچانے کے لیے لوٹ لگا دی تھی اور کافی دور آ گئی تھی مگر جب اُٹھنے لگی تو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا کیونکہ اس شخص کے ہاتھ مجھ سے اتنی ہی دور تھے جتنے لوٹ لگانے سے پہلے تھے یعنی ابھی بھی میں اس کی دسترس میں تھی۔ میں نے پھر سے لوٹ لگا دی۔ اب کی بار میں ڈم ڈم کی باڑھ تک آ گئی تھی مگر جب غور کیا تو اس کا ہاتھ ہنوز اتنی ہی دوری بنائے ہوئے تھا۔

اب میں کیا کروں، یہی سوچ رہی تھی کہ ایک نئی افتاد نے گھیر لیا۔ چوہے آپ نے دیکھے ہوں گے۔ ننھے ننھے سے مٹیلے۔ گاڑھے بھورے رنگ کے یا پھر سفید رنگ کے اور گھوس بھی دیکھے ہوں گے، بھورے اور کالے۔ ان کی جسامت بلی کے نوجوان بچوں (Kittens) جتنی ہوتی ہے مگر میں نے جو گھوس دیکھے، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھے۔ ان کی جسامت کسی طور بھی اصیل مرغ سے کم نہ تھی۔ وہ کئی تھے اور جھاڑیوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اتفاقاً میری نظر ان پر پڑی تھی۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

ان کی سرخ آنکھوں میں خون کی پیاس تھی، گویا میں دو طرف سے پھنس گئی تھی۔ ایک طرف وہ عجیب و غریب سنہرا شخص تھا تو دوسری طرف یہ بڑے بڑے گرانڈیل چوہے۔ میں نے یکا یک قلابازی کھائی اور سیدھے ہاتھ پر لڑھکتی ہوئی کافی دور نکل آئی اور پھرتی سے اُٹھ کر سلیم کے قریب چلی آئی۔ سلیم اب تک حیرت سے منہ کھولے اس سنہری آدمی کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ عرفان کا باغیچہ ہے کہ جادونگری؟ ہر چیز عجیب وغریب ہے۔''میں نے سلیم کوٹہوکا دے کر کہا۔

''ہم اکیلے اس سے نمٹ نہیں سکتے۔ تم فقیر بابا کو آواز دو شاید وہ کوئی ایسا راستہ بتادیں جو کامیابی کی منزل تک ہمیں پہنچادے۔''

سلیم کا مشورہ غلط نہیں تھا۔ میں خود اس عجوبہ روزگار باغیچے میں خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ فقیر بابا یہاں آنے سے انکاری ہیں۔ ہمیں خود ہی راستہ تلاش کرنا ہوگا اور یہ بات اگر سلیم کو بتاتی تو وہ حوصلہ کھودیتا اس لیے میں نے صرف اتنا کہا۔ ''فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فی الحال تم جو کچھ جانتے ہو، جتنا علم تمہارے پاس ہے، اس کا بھرپور استعمال کرو۔''

''تمہیں ''حرزِ ابودجانہؓ'' یاد ہے۔''اس نے پوچھا۔

مجھے یاد آگیا کہ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہر رات میرے آنگن میں ایک عجیب و غریب مخلوق آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے منہ سے شعلے نکل رہے ہوتے ہیں۔ وہ مجھے بہت زیادہ تنگ کرتی ہے تو آپ نے حضرت ابودجانہ نامی صحابی کو یہ دعا تعلیم فرمائی تھی۔ انہی کے نام سے موسوم اس دعا کے فوائد بے شمار ہیں مگر اس وقت مجھے یہ دعا یاد ہی نہیں آ رہی تھی اور نہ لکھی ہوئی میرے پاس تھی کہ میں دیکھ کر ہی پڑھ لیتی۔ صرف سلیم کی تسلی کے لیے میں نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی کیونکہ قرآن پاک کی یہ سب سے بڑی آیت اپنے اندر قوت کا خزانہ رکھتی ہے۔ میں نے جونہی آیت الکرسی کا ورد شروع کیا اور اس سنہرے آدمی کی طرف پھونک ماری، وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا۔

ابھی میں نے ایک ہی بار آیت الکرسی کی تلاوت کی تھی کہ مجھ پر پیچھے سے ایک چوہے نے حملہ کر دیا۔ اس کے تیز نوکیلے پنجے میری گردن سے ذرا نیچے پیٹھ پر گڑ گئے تھے اور دانت سر کے نچلے حصے میں۔ تکلیف سے میں دہری ہوگئی اور آیت الکرسی پڑھنا بھول گئی۔

میری حالت دیکھ کر سلیم لپکا اور اس نے چوہے کو اُچھالنے کے لیے اس کے پیٹ کے نیچے کلہاڑی کا دستہ گھسایا اور ایسا جھٹکا مارا کہ وہ اُچھل کر دور جا گرا۔ پھر بھی وہ میری کھوپڑی کی نچلی کھال نوچ لے گیا تھا۔ خون متواتر گر رہا تھا۔ سلیم نے جلدی سے اپنی قمیص پھاڑی اور پٹی باندھ دی۔ اتنی دیر میں کئی اور چوہے بھی آ گئے تھے۔ وہ سب ٹرینڈ گوریلا فوجیوں کی طرح گھیرا بنا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے منہ سے لگاتار چیں چیں کی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔ سلیم نے کلہاڑی سنبھال لی تھی اور میں نے کمر میں بندھی اس کٹار کو نکال لیا تھا جو مجھے فقیر بابا نے یہ کہہ کر دی تھی کہ اسی سے عرفان کا خاتمہ ہوگا۔ یقیناً وہ کوئی کراماتی کٹار ہوگی اسی لیے میں نے اسے نکال کر حملے کی منتظر تھی۔ وہ سنہرا آدمی اب تک سر پکڑے بیٹھا تھا۔ ضرور یہ کرامت آیت الکرسی کی تھی اس لیے میں نے اسے پھر سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

وہ چوہے بھی آیت الکرسی پڑھتے ہی اپنی جگہ تھم گئے تھے۔ انہیں رُکتا دیکھ کر سلیم نے آگے بڑھ کر کلہاڑی چلادی۔ جس چوہے پر وار ہوا تھا، وہ بیچ سے دو ٹکڑے ہوگیا۔ وہی چوہے جو مجھ پر حملہ کرنے آ رہے تھے، اپنے مردہ ساتھی پر پل پڑے۔ وہ لڑ رہے تھے، جھگڑ رہے تھے اور اپنے مُردہ ساتھی کو نوچ رہے تھے۔ سلیم نے پھر سے کلہاڑی اُٹھائی اور دوسرے پھر تیسرے، پھر چوتھے پر وار کرتا چلا گیا۔ جو بھی چوہا مرتا، اس پر دوسرے چوہے پل پڑتے۔

اِدھر اُدھر پچاسوں چوہوں کی آدھ کھائی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور زندہ چوہوں کی تعداد اتنی ہی نظر آ رہی تھی۔ پہلے میں نے یہی سمجھا تھا کہ چالیس، پچاس چوہے ہوں گے مگر ان کی تعداد کسی طور سو سے کم نہ تھی۔ سلیم کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی، پھر بھی وہ کلہاڑی چلائے جا رہا تھا۔ اس

کی مدد کے لیے میں بھی بڑھ آئی تھی اور ان چوہوں پر کٹار چلائے جا رہی تھی۔ سلیم کی کلہاڑی جس چوہے پر پڑتی، وہ دو ٹکڑے ہو جاتا، لیکن جس چوہے پر میری کٹار زخم لگاتی، وہ زخمی حالت میں ہی جھاڑیوں کی طرف بھاگ جاتا۔

میں نے اچھی خاصی تعداد میں چوہوں کو بھگایا تھا۔ زخمی چوہے زخم کھا کر ایک ہی سمت میں بھاگ رہے تھے۔ ان کے زخموں سے بہتے خون نے جھاڑیوں تک خون کی موٹی لکیر سی بنادی تھی۔

بہت بڑی تعداد میں چوہے مر چکے تھے یا بھاگ چکے تھے، پھر بھی اچھی خاصی تعداد میں مجھے اور سلیم کو گھیرے کھڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا، یہ سب جنگجو ہیں اور انہیں دائیں بائیں سے مطلب نہیں ہے کیونکہ باقی رہ جانے والوں میں سے کسی کے منہ پر خون نہیں لگا ہوا تھا۔ گویا انہوں نے مردہ چوہوں پر منہ نہیں مارا تھا۔ میں نے سلیم کو ہوشیار کیا۔ ”یہ زیادہ خطرناک ہیں۔“

”ابھی ان کی اوقات بتاتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے پھر کلہاڑی چلادی لیکن اس کی کلہاڑی چوہوں پر پڑنے سے پہلے ہی ہوا میں رُک گئی۔ کلہاڑی کو اسی سنہرے آدمی نے روکا تھا۔ میں تو اسے بھول ہی گئی تھی۔ نہ جانے وہ کب اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دوسری حیرت کی بات یہ تھی کہ سلیم نے جب اس پر کلہاڑی چلائی تھی تو اس کی کلائی سے کلہاڑی گزر گئی تھی مگر اس وقت وہی ہاتھ ٹھوس نظر آیا ورنہ کلہاڑی رُکتی کیسے؟

عین اسی وقت ایک چوہے نے اُچھل کر سلیم کی پنڈلی پر منہ مارا اور سلیم کے منہ سے چیخ نکل پڑی۔ گویا ہم پر دوطرفہ حملہ ہو رہا تھا۔ میں نے کٹار کو ہاتھ میں پکڑ لیا اور اُچھل کر اس سنہرے آدمی کی گردن پر وار کر دیا۔ حیرت انگیز طور پر میری کٹار اس کی گردن میں دھنس گئی لیکن تعجب خیز بات یہ تھی کہ اس کی گردن سے خون کا ایک قطرہ تک نہ ٹپکا۔ بجائے خون کے، گردن والے زخم سے دھواں سا نکلنے لگا جیسے اس کے جسم میں کوئی بھٹی لگی ہوئی ہو، پھر وہ دھیرے دھیرے پچکنے لگا بالکل اسی طرح جیسے غبارے سے ہوا نکلنے لگے تو وہ پچکتا چلا جاتا ہے۔

سلیم کی کلہاڑی اس شخص کی مٹھی سے آزاد ہو چکی تھی۔ پھر بھی اسے ہوش نہ تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے ادھر ہی دیکھے جا رہا تھا اور وہ آدمی پچکتے پچکتے بالکل زمین سے لگ چکا تھا۔ اس کے اندر سے نکلتے دھوئیں نے چوہوں پر بھی اثر کیا تھا کیونکہ چوہے بھی اسی طرف متوجہ تھے اور ان کا دائرہ اسی کے گرد بنا ہوا تھا۔ شاید انہوں نے ہمیں نظرانداز کر دیا تھا۔

چوہوں کو اُدھر متوجہ دیکھ کر سلیم نے کلہاڑی بلند کی اور ان پر ٹوٹ پڑا۔ ایک کے بعد ایک چوہے ٹکڑوں میں بٹنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں ان خونخوار چوہوں کا خاتمہ ہو گیا اور ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن یہ ہماری بھول تھی۔ چوہوں اور سنہرے آدمی میں پھنس کر ہم نے گوشت خور پیڑوں کو بھلا دیا تھا۔ ان کی موجودگی کا احساس تب ہوا جب ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ پیڑ پھر سے ہمارے قریب آتے جا رہے تھے۔ ان کے چلنے کا اس لیے کہا کہ ان کی جڑیں آگے بڑھتی آ رہی تھیں جبکہ وہ سب اس وقت اپنی ہی جگہ اطمینان سے کھڑے تھے۔ سانپ کی طرف رینگتی ہوئی جڑیں جس طرح ہمارے گرد حلقہ تنگ کر رہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ اس بار وہ ہمیں فرار کا موقع دینا نہیں چاہتے ہیں۔ میں نے کٹار اور سلیم نے کلہاڑی سنبھال لی تھی۔ بس کچھ ہی دیر کی بات تھی، جب ایک انوکھا معرکہ شروع ہو جاتا۔

”بھئی سلیم! مجھے یہ سمجھ نہیں آئی ہے کہ یہ پیڑ یہاں کی مٹی میں کیسے پنپ اُٹھے ہیں؟ یہ تو افریقہ کے جنگل میں پائے جاتے ہیں؟“

''ملایا کے جنگل میں بھی گوشت خور پیڑ ہوتے ہیں۔ بنگال اور ملایا کی مٹی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اس لیے یہ پنپ گئے۔''

''انہیں وہاں سے لایا کیسے گیا ہوگا؟''

''کیسے...... کس طرح اور کون لایا ہے، اسے چھوڑو اور یہ سوچو کہ ان سے بچا کیسے جائے؟'' سلیم نے بڑھتی ہوئی جڑوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ ہم آگے بڑھ کر انہیں قطع نہیں کریں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ انفرادی جنگ بہتر ہے، جنگ مغلوبہ سے۔ پیچھے والے جتنی دیر میں ہم تک پہنچیں گے، اتنی دیر میں ہم سامنے والوں کا صفایا کر دیں گے۔ سامنے سے راستہ بن گیا تو گھیرے سے باہر بھی نکل سکتے ہیں۔''

ہم دونوں ایک ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب پیڑوں کی لپلپاتی جڑیں ہم سے صرف دو ہاتھ کی دوری پر تھیں کہ سلیم نے کلہاڑی چلا دی۔ جڑ کٹتے ہی اندر سے رقیق مادہ نکل کر بہنے لگا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا، وہ مشینی انداز میں کلہاڑی چلاتا جا رہا تھا۔ کٹ جانے والی جڑوں کا تڑپنا بالکل جانداروں جیسا تھا۔ وہ بن پانی کی مچھلی یا چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح اُچھلنے لگتے تھے۔ سلیم کی تقلید میں، مَیں نے بھی کٹار چلانا شروع کر دی تھی۔ ہم دونوں ہی بہت تیزی سے ہاتھ چلا رہے تھے مگر جڑوں کی تعداد ہنوز پہلے اتنی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک جڑ کے کٹتے ہی دوسری جڑ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر ذرا سی بھی رفتار سُست ہوئی تو جڑیں ہمیں جکڑ لیں گی اسی لیے میں پوری قوت صرف کر رہی تھی جبکہ ہاتھ شل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ سلیم نے کلہاڑی چلاتے چلاتے کہا۔ ''یہ اصل کی بجائے نقل تو نہیں ہے؟ میں رفتار کم کر کے کوئی راستہ ڈھونڈتا ہوں۔''

میں نے کٹار چلانے کی رفتار اتنی ہی رکھی۔ صرف ایک بار سر گھما کر سلیم کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدا رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اپنے شک کو رفع کرنے کے لیے ردِ سحر کی کوئی دعا پڑھ رہا ہے۔

ابھی اس نے پھونک ماری تھی کہ حیرت انگیز طور پر جڑ سکڑنے لگی اور کچھ ہی دیر میں وہ عام سے انداز کا پیڑ رہ گیا اور تب میں نے کٹار کو اس کے کور میں اُڑستے ہوئے کہا۔ ''چلو...... اچھا ہوا کہ تمہیں بروقت سوجھ گئی ورنہ میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ افریقن پیڑ ہے۔''

''یہ مسئلہ تو حل ہوا، اب یہ سوچو کہ عرفان کو باہر کیسے لایا جائے؟''

''دماغ پر زور ڈالو، شاید کوئی ترکیب سمجھ میں آ جائے۔''

''بہت آسان ترکیب ہے۔ اسے چیلنج دیتے ہیں۔ اگر وہ اس کے جواب میں باہر آ جاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہمیں پھر سے اندر جانا ہوگا۔''

''ہم پہلے ہی اندر گئے تھے۔ اندر ہمیں خطرہ تھا اس لیے تو باہر آئے تھے۔'' میں نے کہا۔ اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں، مَیں نہیں ہوں، کوئی اور ہے کیونکہ پیڑ کا سحر ختم ہوتے ہی مجھے اپنا آپ بہت بھاری لگنے لگا تھا جیسے میرے کندھوں پر کسی نے بوجھ لاد دیا ہو۔ ایسا بوجھ جو کھلی آنکھوں سے بھی نظر نہ آئے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے، یہ سوال میں نے خود سے کیا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پیڑوں کا سحر مجھ پر طاری ہو گیا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میں سہم گئی کیونکہ اگر میں خود ہی سحر زدہ ہو جاتی تو پھر عرفان کی قید میں جانے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

''اے...... کس خیال میں ڈوبی ہو؟'' سلیم کی آواز پر میں چونک اُٹھی اور ایک نیا حوصلہ بھی ملا کہ کچھ بھی ہو، سلیم مجھے بے یار و مددگار چھوڑ

ہی نہیں سکتا، پھر فقیر بابا کی ذات بھی ہے۔ وہ یقیناً ہماری مدد کریں گے۔ انہی کے طفیل تو میں اس قابل ہوئی ہوں کہ تاریک قوتوں کا مقابلہ کرسکوں۔ اس خیال نے ڈوبتے دل کو سہارا دیا اور میں نے ذہن سے بُرے خیالات کو جھٹک دیا، پھر سلیم کی طرف دیکھ کر بولی۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پھر کوئی فسوں پھونکے، اس لیے تم خود بھی اپنے اور میرے گرد حصار کھینچو۔''

دراصل میں دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ میرا مغالطہ ہے یا واقعی میں سحر کے زیر اثر ہوں۔ اگر سحر کا ذرا سا بھی اثر ہوگا تو حصار قائم نہیں ہوگا۔

سلیم نے میری بات پر عمل شروع کر دیا۔ ابھی اس نے آنکھیں بند کر کے دو تین الفاظ ہی کہے تھے کہ چونک اُٹھا۔ اس نے میری طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم...... تم...... ٹھیک تو ہو نا؟''

''کیوں...... مجھے کیا ہوا ہے؟''

''تو پھر تم ایسا کرو کہ ''دعائے ردِ سحر'' پڑھو تا کہ میں جو کچھ پڑھ رہا ہوں، اسے تقویت ملے۔''

''یہ لو......'' کہہ کر میں نے ''دعائے ردِ سحر'' پڑھنا شروع کر دی۔ مگر یہ کیا، جیسے ہی میں نے الفاظ کی تکرار شروع کی، مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں ننھے ننھے کانٹے سے چبھنے لگے ہوں۔ مجھے سخت بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے کانٹوں بھری جھاڑیوں پر کوئی گھسیٹ رہا ہو۔

میں نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر اس کرب کو جھیلا اور پھر نئے سرے سے اسی دعا کو پڑھنا شروع کر دیا اور اذیت دھیرے دھیرے کم ہوتی چلی گئی۔ پھر ایک وہ وقت آیا جب مجھے اپنا بدن بالکل ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ تب میں نے دعا پڑھنا موقوف کر دیا اور ہنس کر سلیم سے بولی۔ ''مجھے جو شک تھا، وہ صحیح ثابت ہوا۔ اگر میں یہ کہتی کہ مجھ پر سحر اثر انداز ہو رہا ہے تو تم بھی خوف زدہ ہو جاتے، اسی لیے میں نے حصار کا تجربہ کرایا تھا۔''

''تمہارے سارے تجربے بے کار ثابت ہو گئے۔ خود کو بہت بڑی عاملہ سمجھتی رہی ہو ناں۔ اب دیکھنا تمہارا کیا حشر ہوتا ہے۔'' یہ آواز ان جھاڑیوں کے پیچھے سے آئی تھی جہاں سے چوہوں نے یلغار کی تھی۔

''کون ہو تم؟ جو کہنا ہے سامنے آ کر کہو۔'' سلیم نے پکار کر کہا۔

''آ رہا ہوں، آ رہا ہوں، تمہاری خبر لینے کے لیے آ رہا ہوں۔'' آواز کے ساتھ ایک ننھا سا بونا اُچھل کر سامنے آ گیا۔ اب پتا نہیں، یہ انہی بونوں میں سے تھا جو کمرے کی دیواروں میں نصب مورتیوں سے برآمد ہوئے تھے یا کوئی نئی چال تھی عرفان کی۔ یوں بھی یہ باغیچہ گورکھ دھندے سے کم نہ تھا۔ ہر جگہ ایک نیا جال تھا۔ یوں لگتا تھا کہ عرفان نے بھرپور انداز میں پیش بندی کر رکھی تھی۔ اس باغیچے کو اس نے مایا جال بنا رکھا تھا۔ ہر ایک درخت سحر زدہ، ہر جانور سحر کی زد میں۔ گویا پورا باغیچہ سحر افروز تھا۔ جس کے سحر کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ لونا چمارن جیسی جادوگرنی کو بھی اپنی جگہ ساکت کر کے میں نے بت میں تبدیل کر دیا تھا۔

''ہاں...... اب بولو کیا بات ہے؟'' بونے نے سینہ تان کر کہا۔

اس دو فٹے بونے کا انداز دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔

''اے..... ہنستی کیوں ہے؟ میرا قد نہیں، میرا کمال دیکھ۔'' کہہ کر اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور کسی پنکھے کی طرح اپنے جسم کو ہوا میں ہی گردش دینے لگا۔ واقعی وہ لاجواب نٹ مداری تھا۔ اگر کسی سرکس میں ہوتا تو خوب کماتا۔ ابھی میں اس کی طرف دیکھ ہی رہی تھی کہ اس نے ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے مجھے پوری قوت سے لات ماری اور میں اُچھل کر دور جا گری پھر وہ بولا۔''میں اسی طرح لاتیں مار مار کر تم دونوں کا خاتمہ کروں گا۔''

''پہلے مجھے مارنا.....'' سلیم نے آواز لگائی۔ وہ بونا ہوا میں چھلانگ لگا چکا تھا اور اس کا رُخ میری طرف تھا مگر جیسے ہی سلیم نے للکارا، اس نے کمال پھرتی سے اپنا رُخ ہوا میں ہی بدل لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے اپنے جسم کے ہر حصے پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اسے وہ جدھر چاہے، جب چاہے، موڑ سکتا ہے۔

اس نے اپنے جسم کو سلیم کی طرف موڑ لیا تھا اور ہوا میں تیرنے کا انداز اختیار کیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے سر پر پہنچا، سلیم نے بھی اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔ دونوں کا ٹکراؤ ہوا میں ہوا مگر اس بار سلیم کا پلہ بھاری تھا کیونکہ اس نے اُچھلتے وقت اپنے دونوں پیروں کو سیدھا کر لیا تھا اور وہ پیر اس بونے کے سر سے ٹکرائے تھے۔ بونا اُدھر سے بڑھ رہا تھا اور سلیم اِدھر سے۔ دونوں کی قوت ایک ساتھ ٹکرائی تھی۔ نتیجتاً دونوں ایک ساتھ نیچے گرے تھے۔ بونے کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ شاید اس کے سر میں زیادہ چوٹ آئی تھی۔ ابھی بونے نے کھڑے ہونے کی کوشش ہی کی تھی کہ سلیم نے لات چلا دی۔ اس کی لات بونے کے سر ہی سے ٹکرائی تھی اور وہ اُچھل کر دور جا گرا تھا۔ سلیم نے اسے مہلت نہ دینے کی گویا قسم کھالی تھی۔ اس نے فوراً ہی اُچھال بھری تھی اور بونے کے سر پر جا پہنچا تھا۔ اس بار اس نے بونے کے قریب کھڑے ہو کر بائیں پیر پر پورا وزن ڈال کر داہنے پیر کو سیدھا کر کے نصف دائرے میں گھوم گیا تھا۔ نتیجتاً اس کی لات پوری قوت سے بونے کے سر سے ٹکرائی تھی اور بونا اس ضرب سے اُچھل کر دور جا گرا تھا۔ سلیم نے بھی ساتھ ساتھ چھلانگ لگائی تھی اور اس کے سر پر کودا تھا۔ گویا اس نے ہر ضرب کے لیے اس کے سر کو منتخب کر لیا تھا۔ وہ اس طرح سے اس کے سر پر اُچھل اُچھل کر ضرب لگا رہا تھا جیسے بچے گدوں پر اُچھل اُچھل کر لطف لیتے ہیں۔ بونے کی چیخ سے پورا باغیچہ گونج رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سلیم اسے ختم کر کے رہے گا۔ مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا مگر مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ موذی کو ایذا دینے سے قبل ہلاک کر دینا چاہیے۔

سلیم اسے ہلاک کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ بونے کو موقع مل گیا بلکہ اسے یہ موقع فراہم کیا گیا۔ وہ دونوں لڑتے لڑتے انہی پیڑوں کے پاس پہنچ گئے تھے جو کچھ دیر پہلے گوشت خور بنے ہوئے تھے۔ اس بار جیسے ہی سلیم نے اُچھال بھری اس پیڑ کی ایک شاخ نے آگے بڑھ کر اسے جکڑ لیا۔

وہ اس پیڑ سے لٹکا ہوا، ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا کہ بونے نے اُچھال بھری اور پوری قوت سے اس کی ناک پر گھونسا مارا۔ شاید ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی کیونکہ ناک سے خون کا فوارہ سا جاری ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے جکڑنے کے لیے اس پیڑ کی ایک دوسری شاخ بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

سلیم نے خون تھوکتے ہوئے چیخ کر کہا۔''اس پیڑ پر پھر فسوں پھونکا گیا ہے۔ خدا کے لیے جلدی 'دعائے ردِ سحر' پڑھو ورنہ میری موت یقینی ہے۔''

اس کے کہتے ہی میں نے اسی دعا کو پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ اِدھر میں نے دعا ختم کی، اُدھر سلیم دھپ سے نیچے گرا۔ پیڑ اپنی اصلی حالت پر آ گیا تھا۔ گویا اس پر طاری سحر کا اثر ختم ہو گیا تھا مگر بونا اب بھی موجود تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ بونا سحر کا فرستادہ نہیں ہے بلکہ اصلی ہے۔ انسان ہے۔ اس نے اُچھل کر پھر ایک لات سلیم کی ناک پر جما دی تھی۔ سلیم بھی کم نہ تھا۔ گرتے ہی اس نے قلابازی کھائی تھی اور کچھ دور تک لڑھکنے کے بعد

جھٹکے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

کھڑے ہوتے ہی اس نے مٹھی باندھ کر ہاتھ کو سیدھا کر دیا تھا۔ بونا اُچھال بھر کراس کی طرف ہوا میں اُڑتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے سلیم کو ہاتھ سیدھا کرتے دیکھ لیا تھا اور اپنے جسم کو موڑنے کی کوشش کی تھی۔ سلیم بھی ہوشیار تھا۔ اس نے بھی اسی حالت میں اُچھال بھری تھی۔ نتیجتاً اس کا گھونسہ بونے کے سر سے ٹکرایا تھا اور بونا نیچے گرتا چلا گیا تھا۔

اس کے گرتے ہی سلیم نے دونوں پیروں کو جوڑ کر اس کے سینے پر ضرب لگائی تھی۔ کہاں سلیم جیسا قد آور جوان اور کہاں وہ ڈھائی فٹ کا بونا! کیں کی آواز نکال کر وہ ڈھے گیا۔ اس کی گردن ڈھلک چکی تھی اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ سلیم نے آخری ٹھوکر ماری اور میرے پاس آ گیا۔

بونے سے نمٹ کر بھی ہم مطمئن نہ تھے۔ ہمیں خدشہ تھا کہ عرفان کی زنبیل میں ابھی اور بھی ٹوٹکے ہوں گے اس لیے ہم سب اپنے اطراف پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے۔ کسی بھی جھاڑی، کسی بھی پیڑ سے نکل کر کوئی مقابلے کے لیے آ سکتا تھا۔ ویسے ہماری یہی خواہش تھی کہ اب عرفان بھی آ جائے۔ یہ دو ڈھائی گھنٹے سے جو معرکہ ہو رہا ہے، اس کا خاتمہ تبھی ممکن تھا۔

عرفان اگر آ جاتا تو دو باتیں ہوتیں۔ یا تو وہ ہمیں شکست دے دیتا یا ہم اسے شکست دے دیتے۔

''اس بونے سے تو چھٹکارا مل گیا، اب عرفان کو کیسے باہر نکالا جائے؟'' میں نے سلیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں خود حاضر ہو رہا ہوں، فکر نہ کرو۔'' یہ آواز چاروں طرف سے آتی محسوس ہوئی۔

''ڈر کر تو تم چھپے ہوئے ہو۔ لعنت ہے کہ ایک لڑکی سے ڈر رہے ہو۔'' میں نے حمیت پر چوٹ کی۔

''اگر ڈر رہا ہوتا تو کب کا فرار ہو چکا ہوتا۔ ابھی تو میں تم سے ''کھیل'' رہا تھا۔ لو داہنی جانب دیکھو۔ میرے آنے کی خبر دینے کے لیے میرے ہرکارے پہنچنے ہی والے ہیں۔''

میں نے داہنی جانب مڑ کر دیکھا۔ اُدھر سے سینکڑوں کی تعداد میں ننھی ننھی باریک باریک مکڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ ان کی رنگت سنہری مائل تھی۔ میں نے سلیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ایسی مکڑیاں اس علاقے میں تو ہوتی نہیں ہیں۔ یقیناً خطرناک ہوں گی۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ ٹھہرو، انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' کہہ کر اس نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ مکڑیاں اب بہت قریب آ چکی تھیں۔ سلیم نے مٹھی بھر مٹی اُٹھائی اور اس پر پھونک مار کر مکڑیوں پر اُچھال دیا۔ جیسے ہی وہ مٹی ان پر گری، مکڑیاں آگے بڑھتے بڑھتے رُک گئیں۔ تبھی پیچھے سے آنے والی مکڑیوں نے رُکی ہوئی مکڑیوں پر سے پھلانگ کر ہماری طرف بڑھنا چاہا تھا کہ سلیم نے دوبارہ مٹی ان کی طرف اُچھالی۔ اس کا نتیجہ انوکھا نکلا۔ سلیم نے مٹی پھینکی تھی مگر وہ زمین پر گرتے ہی آگ میں بدل گئی اور ان مکڑیوں کے سامنے آگ کا تالاب سا بن گیا۔ پیچھے سے آنے والی مکڑیاں اس آگ میں گر رہی تھیں، مر رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے راستہ صاف ہو گیا۔

''ارے بھئی عرفان! تم کہاں ہو؟ تمہاری ہرکارہ مکڑیاں تو جہنم میں پہنچ گئیں۔ اب کوئی نیا حربہ ہے تو اسے بھی آزما لو۔''

''لو میں خود آ گیا۔'' اس آواز کے ساتھ حویلی کا ذیلی دروازہ کھلا اور عرفان باغیچے میں پہنچ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم نے

اپنی قوت کی نمائش تو کرلی، اب میری اصل قوت دیکھو۔''

''چلو دکھاؤ۔ آج ہم بھی دیکھ لیں کہ تم نے کیا کچھ سیکھ رکھا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

عرفان نے سامنے آتے ہی کچھ پڑھ کر پتھر کی مورت بنی لونا چمارن پر پھونک ماری اور وہ جھٹکے سے گویا بیدار ہوگئی۔ اس نے ہماری طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس طرح دوڑی جیسے ہمارا گلا دبانا چاہتی ہو۔

میں نے سلیم کی طرف دیکھا۔ وہ پھر خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ سورج نصف النہار پر آ چکا تھا۔ ہم صبح سے اس سحر کدے میں مسلسل مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک عرفان کے ٹوٹکوں کو شکست دے رہے تھے اور ہماری فتح پھر بھی کوسوں دور نظر آ رہی تھی۔ ویسے مجھے امید قوی تھی کہ میں عرفان کو ہر حال میں شکست دے دوں گی کیونکہ میرے ساتھ نوری قوت تھی اور وہ تاریک قوتوں کا حامل۔ باطل کی استقامت دیرپا نہیں ہوتی۔ اسے ہر حال میں شکست ہوتی ہے۔ یہ میرا عملی تجربہ بھی تھا۔ عرفان، لونا چمارن پر بھروسہ کیے ہوئے تھا جبکہ لونا کو خود میں پہلے بھی شکست دے چکی تھی اسی لیے اسے آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے ''معوذتین'' کی تلاوت شروع کر دی۔ یہ چار چھوٹی چھوٹی سورتیں اپنے اندر کس قدر قوت رکھتی ہیں، کیسے سحر کو باطل کرتی ہیں، اس کا پہلے بھی تجربہ کر چکی تھی۔

لونا چمارن جسے ساحر ''سحر کی ماں'' کہتے ہیں، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے کوئی شکست دے ہی نہیں سکتا، وہ ''معوذتین'' کے خوف سے یکا یک رُک گئی تھی۔ اس نے خوف زدہ انداز میں مجھے دیکھا اور پھر عرفان کی طرف مڑ کر بولی۔ ''میرے بھگت...... یہ تُو مجھے کس کے مقابل لے آیا ہے؟ یہ ایک نہیں، کئی ہیں۔ اُف...... میں جلی رے...... جلی......'' وہ اُچھلنے لگی تھی۔

اس کی اُچھل کود پر عرفان بوکھلا گیا تھا۔ اس نے ہندوؤں کی طرح ڈنڈوت کرتے ہوئے کہا۔ ''ماں! مجھے شکتی دے۔ میرے دشمن کا وناش کر......''

''لعنت ہے عرفان تم پر، خدا کی پھٹکار...... ایمان والوں کے گھر میں پیدا ہونے کے بعد بھی تم نے اپنے لیے جہنم کو پسند کرلیا۔ اب تو تمہاری شکست یقینی ہے۔ پہلے میں لونا سے نمٹ لوں۔'' کہہ کر میں نے پھر سے سورۃ الناس کی تلاوت کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھگھیائی۔

''اے لڑکی! میری تیری کوئی دشمنی نہیں۔ تُو بند کر دے، یہ پڑھنا بند کر دے۔''

''تُو وعدہ کر کہ فوراً چلی جائے گی؟''

''ہاں...... ہاں...... اُس بار کی طرح اس بار بھی میں تجھے تیرے حال پر چھوڑ دوں گی۔ اب تُو جانے اور عرفان......''

''جا...... جلدی بھاگ جا۔'' میں نے کہا اور سلیم کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ عرفان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تبھی عرفان زمین پر گرا۔ سلیم نے اسے لنگڑی مار کر گرا لیا تھا اور اس کے سینے پر سوار ہو گیا تھا۔ باغیچے کے دروازے پر، حویلی کی چھت پر اور کھڑکیوں پر عرفان کے اہالی موالی کھڑے تھے۔ میں نے فقیر بابا کے سکھائے ہوئے طریقے پر ان سب کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ اگر وہ آگے بڑھنا بھی چاہتے تو بڑھ نہیں سکتے تھے۔ کچھ پھینک کر مارنا چاہتے تو بھی ناکام رہتے۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ''عرفان! بس تمہارا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اگر تم کالے علم سے توبہ کرلو اور ہمیں یہ بتا دو کہ نسیم کی روح کو کہاں پر قید کیا ہے؟ ہم تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے۔''

''اس بڈھے نے، اس حرام زادے نے اور تم نے مل کر حملہ کیا ہے۔ تم دونوں تو بہادروں کی طرح سامنے آئے مگر وہ کم ذات بڈھا، پردے میں بیٹھا تاک تاک کر میری پیٹھ میں خنجر گھونپتا رہا۔ میرے مؤکلوں کو قید کر کے مجھے بے دست و پا کرتا رہا۔ کاش...... مجھے ایک آخری موقع مل جاتا تب میں اسے ضرور مزہ چکھاتا۔'' عرفان گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

پھر شاید اس نے کچھ پڑھ کر پھونک ماری تھی کیونکہ اس کے سینے پر سوار سلیم عجیب وغریب انداز میں اُچھل کر دور جا گرا تھا اور اس کے ہاتھ پیر اس طرح سے اکڑ رہے تھے جیسے اس پر مرگی کے دورے پڑ رہے ہوں۔ میں نے انگل میں ''دعائے ردسحر'' پڑھ کر پھونک ماری۔ سلیم کی حالت فوراً سنبھل گئی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے پھر اُچھال بھری تھی اور دوبارہ سے عرفان کے سینے پر سوار ہو گیا تھا۔ تب میں نے کہا۔

''میں جو پوچھ رہی ہوں، اس کا جواب دو ورنہ سلیم تمہارا گلا دبا دے گا۔''

''ہم کالے علم والے ہیں، مر کر بھی میری روح انتقام لے گی۔ تم لوگوں کو چین لینے نہیں دوں گا اور نہ یہ بتاؤں گا کہ نسیم کی روح کہاں قید ہے؟''

''ٹھیک ہے، سلیم! گلا دبا دو......'' میں نے چیخ کر کہا۔

''ٹھہرو......'' فقیر بابا کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ''میں آ رہا ہوں۔ اس کی روح کو قید کر کے سمندر میں پھینکنا ضروری ہے۔''

میں نے سلیم کو منع کیا اور بابا کا انتظار کرنے لگی۔ بس ایک لمحے کی چوک تھی کہ عرفان نے سلیم کو اُٹھا کر دور پھینک دیا اور حویلی کی جانب دوڑا۔ پتا نہیں، وہ میری عقل کا کمال تھا یا یہ بھی باباجی کا کارنامہ کہ میں نے وہی ڈنڈا جس سے اس نے سحر طاری کرنے کی کوشش کی تھی مگر ''دعائے ردسحر'' کی وجہ سے وہ اپنی خاصیت کھو بیٹھا تھا اور تب اس نے اس جادوئی ڈنڈے کو معمولی ڈنڈے کی طرح استعمال کر کے میرے سر پر ضرب لگانے کی کوشش کی تھی، اسی ڈنڈے کو میں نے تاک کر اس کی ٹانگوں پر پھینک مارا تھا۔ وہ ڈنڈا اس کے پیروں میں آڑا پھنسا تھا اور وہ منہ کے بل گرا تھا۔ سلیم نے اُچک کر پھر سے اس پر سواری کر لی۔ وہ اس کی پیٹھ پر بیٹھا اس کے سر کو بار بار زمین پر رگڑ رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ ''سانپ کو مارنے کا یہ طریقہ سب سے محفوظ ہے۔ بندر اسی طرح سانپ کا منہ پتھر پر گھس گھس کر مارتا ہے۔ میں بھی تمہیں اسی طرح ماروں گا۔''

ابھی یہ رسہ کشی جاری تھی کہ فقیر بابا آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی اپنی جھولی سے دو لمبی لمبی میخ نکالیں اور مجھ سے بولے۔ ''تم اس کے ہاتھ کو سیدھا کرو۔'' ساتھ ہی ساتھ وہ کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔ شاید اس طرح وہ اس کی قوت کو سلب کر رہے تھے۔

میں نے زور لگا کر اس کی ہتھیلی کو زمین پر رکھ کر سیدھا کر دیا۔ باباجی نے چیخ کر مجھے ہدایت دی۔ ''دعائے ردسحر'' پڑھتی رہو تاکہ اس کا سحر باطل ہوتا رہے۔'' پھر انہوں نے اس میخ کو ہتھیلی پر رکھ کر ٹھونکنا شروع کر دیا۔ داہنے کے بعد بائیں اور بائیں ہاتھ کے بعد سینے میں بھی میخ ٹھونک دی۔ پھر وہ بولے۔ ''خس کم جہاں پاک......''

سینے میں میخ ٹھونکتے ہی ایسا لگا جیسے ایک طوفان آ گیا ہو۔ زمین ہلنے لگی، پیڑ کانپنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے حویلی زمین بوس ہو گئی۔ باغیچے کے زیادہ تر پیڑ جڑ سے اُکھڑ گئے۔ ہم نے جس معرکے کو بہت مشکل سمجھا تھا، وہ باباجی کی وجہ سے نہایت آسانی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا اور اب ہر طرف زلزلہ سا محسوس ہو رہا تھا۔ حویلی پوری طرح ڈھے چکی تھی۔

حویلی کے گرتے ہی ایسا لگا کہ دھوئیں کے مرغولے سے اس کے اندر سے اُٹھے تھے اور آسمان پر چھا گئے تھے۔ یہ الگ الگ مرغولے سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سب وہ ارواح ہیں جنہیں اس بدبخت نے قید کر رکھا تھا۔ وہ تمام مرغولے آسمان پر چکرا رہے تھے اور نیچے عرفان جاں کنی کے عالم میں بار بار سینے کو اُچھال رہا تھا۔ ہاتھوں کو اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر میخیں اس کی تمام کوششوں پر پانی پھیرے دے رہی تھیں۔

اس کی یہ حالت، حویلی کی تباہی کے بعد آزاد ہونے والی ارواح کی تعداد اور آسمان پر چکراتے عجیب سے کالے چمک دار بادل کو دیکھ کر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ عرفان نے بہت زیادہ قوت اکٹھی کر لی تھی۔ واقعی یہ پوری دنیا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن رہا تھا۔ یہ تو شوروپر سے بھی زیادہ بڑا تانترک بن چکا تھا۔ مسلمان کے گھر پیدا ہو کر بھی اس نے صراطِ مستقیم کی بجائے گندگی بھرا راستہ اختیار کر لیا تھا۔

میں ابھی اسی سوچ میں گم تھی کہ ایک جانی پہچانی، چہچہاتی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو پارٹنر! کیسی ہو؟“

”نسیم! تم آزاد ہو گئے؟“

”ہاں......اور اس آزادی کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اب چلو بھاگ چلو۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”چلو کہیں دور یہ سماج چھوڑ دیں۔ دنیا کے رسم و رواج چھوڑ دیں۔ لیکن کیسے؟ تم زندہ، میں مردہ۔ بیچ میں موصل بنا یہ سلیم۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ ویسے اچھا یہی ہے کہ اب یہاں سے نکل چلو کیونکہ عرفان کا ”چکرویو“ ٹوٹنے کے بعد آزاد ہونے والی ارواح میں بعض بدمعاش بدروحیں بھی ہیں جن کا شکار تمہارے فقیر بابا کر رہے ہیں۔ کہیں اس ٹکراؤ کا اثر تم دونوں پر بھی نہ پڑے۔ ویسے بھی ابھی تمہارا نکاح بھی پڑھوانا ہے۔ جب برأت آئے گی تو اس میں ٹوئسٹ اور بھنگڑا بھی کرنا ہے۔ کہو گی تو کتھک بھی کر لوں گا۔“

”بکواس بند کرو۔ اتنے دن کی قید کے بعد بھی تمہاری عادتِ بد نہ بدلی۔“ میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

”عادت شخصیت کا حصہ ہے، یہ بھی کبھی بدلتی ہے۔ مزاح میری زندگی میں بھی داخل تھا اس لیے مرنے کے بعد بھی روح میں سمایا رہا۔ تو چلو چل کر کسی بال روم میں ٹوئسٹ کرتے ہیں ورنہ اس خوشی میں یہ جو اوپر اڑ رہے ہیں، ان کو شامل کر کے یہیں بھنگڑا شروع کر دوں گا اور تب یہاں کیا گل کھلے گا، تمہیں نہیں پتا۔“

وہ ہنسی ہنسی میں بہت کچھ کہہ جاتا تھا اس لیے میں نے اس کی بات کو ہلکا نہ لیا اور سلیم کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل آئی۔ سڑک پر پہنچی تو بہت سارے لوگ جمع تھے۔ وہ سب حیرت سے حویلی کے ملبے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ خوشی کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ ہم دونوں سڑک پر بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے ہماری طرف دیکھا بھی مگر کسی نے توجہ نہ دی۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے ایک خالی آٹو رکشہ دیکھا اور سلیم کو اُدھر جانے کا اشارہ کر دیا۔ سلیم رکشہ لے آیا مگر بولا کہ رکشہ نگی تک جائے گا۔

ٹنگی انڈسٹریل ایریا تھا۔ وہاں سے ڈھاکے کے لیے ہزار ہا سواریاں مل سکتی تھیں۔ میں نے رکشے پر اکتفا کیا اور وہاں سے ٹنگی، پھر ٹنگی سے ٹیکسی کے ذریعے ڈھاکا آ گئی۔ نسیم کی روح راستے بھر کلیلیں کرتی ہوئی ساتھ رہی۔

ڈھاکا پہنچنے پر سلیم نے کہا۔ "ہم اپنے دھرم باپ کے گھر میں اُتریں گے۔"

بنگال میں یہ ایک عام سی بات ہے۔ ایک باپ جو حقیقی ہوتا ہے، دوسرا دھرم باپ یعنی منہ بولا باپ، تیسرا وکیل باپ یعنی وہ جو نکاح کے وقت بطور وکیل نکاح نامے پر دستخط کرتا ہے۔ تینوں کو ایک جیسی عزت دی جاتی ہے۔

میں نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ میرا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ لے دے کر نورالنہار کا گھر تھا۔ اس کے لیے جو کچھ کرنا تھا، میں نے کر دیا تھا یعنی عرفان کو تباہ و برباد کر چکی تھی اس لیے اب میں ان پر بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی تھی سو سلیم کے کہنے پر اس کے دھرم باپ کے گھر جانے پر تیار ہو گئی۔

اس گھر میں داخل ہوتے ہی میں چونک گئی۔ یہ تو وہی گھر تھا جسے میں اکثر خواب میں دیکھتی تھی اور جب اس کی دھرم ماں سامنے آئی تو رہی سہی کسر بھی دور ہو گئی کیونکہ اس عورت کو بھی میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

☆=======☆=======☆

اس گھر میں آتے ہی مجھے پردے میں بٹھا دیا گیا۔ سلیم سے خاص طور پر پردہ کرایا جا رہا تھا۔ کیونکہ سلیم کی دھرم ماں کا کہنا تھا کہ اس طرح کشش بڑھتی ہے۔ شادی دو ہفتے بعد ہونا تھی۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ چلو، زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ جائے گا۔ میں اپنے چھوٹے سے گھر کو ہی اپنی دنیا سمجھ لوں گی۔ اس دوران میں فقیر بابا دو تین بار آ چکے تھے۔ انہوں نے ہی بتایا تھا کہ اب بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ تاریک قوتیں اب بھی تمہاری دشمن ہیں۔ تم نے ان کے دو اہم مہروں کو زندگی کی بساط سے اُلٹ دیا ہے۔ اس لیے کبھی بھی نماز اور تلاوت کو نہ چھوڑنا۔ نماز کی پابندی کرو گی تو ہر طرح کی بلا و مصیبت سے خود بچتی رہو گی، اس لیے میں نے عبادات میں خصوصی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ نسیم کے لیے بھی دعا کر رہی تھی۔ اس کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کا بھی شب جمعہ کو انتظام کیا تھا تاکہ اس بھٹکتی ہوئی روح کو قرار آ جائے۔

جوں جوں شادی کے دن نزدیک آتے جا رہے تھے، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے، اس لیے میں کچھ زیادہ ہی عبادت میں وقت گزارنے لگی تھی۔ سلیم کی شوخیاں بھی کچھ بڑھ گئی تھیں۔ وہ تاک جھانک سے باز نہیں آتا تھا۔ اس کی دھرم ماں اکثر پیار سے جھڑک کر کہتی تھی کہ تم وہی ہو ناں جو صحیح طور پر بنگلہ بھی سمجھ نہ پاتے تھے؟ رانگا ماٹی میں جب بھی ہمارے ہاں آتے تھے تو تمہارے لیے ٹرانسلیٹر کی ضرورت پڑتی تھی اور اب حالت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی کہہ سکے گا کہ تم بنگالی نہیں ہو اسی لیے تمہارے اندر شہریوں کی تمام خصلتیں بھی آ گئی ہیں۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور شادی کے دن نزدیک آتے جا رہے تھے۔ بالآخر میرے مایوں کے دن آ گئے۔ مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ہر روز ہلدی اور اُبٹن لگانے کی رسم ادا کی جانے لگی۔ محلے بھر کی لڑکیاں شام کے وقت جمع ہو جاتیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے جانے لگے۔

مایوں کے چھٹے دن برأت آنی تھی۔ ایک دروازے سے برأت نکلتی اور محلے بھر کا چکر لگا کر دوسرے دروازے پر پہنچ جاتی جہاں شامیانے لگا کر کرسیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ شہر کی مشہور بینڈ پارٹیوں میں سے ایک ''اے ون بینڈ'' کو بلایا گیا تھا۔

وقت مقررہ پر بینڈ پارٹی کی آواز گونج اٹھی۔ سلیم میاں سہرا باندھ کر سائیکل رکشہ پر بیٹھ گئے۔ آگے آگے بینڈ پارٹی، پیچھے پیچھے محلے کے نوجوان ناچتے ہوئے چلے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ یکا یک ایک خستہ حال عمارت کا ستون ٹوٹا اور سیدھا آ کر رکشے پر گرا۔ بینڈ والے دھن بھول گئے۔ ناچنے والوں پر سکتہ چھا گیا۔ وہ ستون اس طرح گرا تھا کہ رکشہ چُور چُور ہو گیا تھا مگر رکشے والے کو خراش نہ آئی تھی۔ ہاں...... سلیم زندہ نہ بچ سکا تھا۔ رکشے کا پچھلا پائپ ٹوٹ کر اس کے سینے میں گھس گیا تھا۔

اس کی موت نے پورے ماحول کو سوگوار کر دیا تھا۔ سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ اس لڑکی کا کیا قصور جسے مایوں بٹھا دیا گیا ہے؟

وہ وقت اتحاد و یگانگت کا تھا۔ سب ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک رہتے تھے اسی لیے سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ایک فیصلے پر سب متفق ہو گئے۔ رات ڈھائی بجے تک لوگ سلیم کے کفن دفن سے فارغ ہو گئے اور صبح کی نماز کے وقت میرا نکاح ایک میری ہی طرح اکیلے نوجوان کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔ وہ بھی اردو اسپیکنگ تھا حالانکہ اس نکاح کے وقت مجھے خود اپنا ہوش نہ تھا اور نہ مجھے کوئی خوشی تھی۔ کچھ بھی ہو، سلیم کے ساتھ اچھا

خاصا وقت گزار چکی تھی۔ کئی مرحلے پر اس نے میری جان بھی بچائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نکاح کے وقت بھی میں پوری طرح ہوش میں نہ تھی۔ مولوی صاحب نے ہاں کہنے کو کہاں تو میں نے ہاں کہہ دی۔

خیر...... میں صبح تک وداع ہو کر اسی محلے کے ایک چھوٹے سے گھر میں چلی گئی۔ ارشاد مزاج کا بہت اچھا شخص تھا۔ اس نے میری ہر طرح سے دلجوئی کی کیونکہ اسے میرے بارے میں پوری معلومات نہ تھیں کہ میں کیا کچھ نہیں جانتی ہوں کیونکہ میں خود بھی اپنے آپ کو ایک عام سی عورت بنا کر پیش کر رہی تھی۔ فقیر بابا کو بھی میں نے منع کر دیا تھا کہ وہ اب نہ آیا کریں تو انہوں نے کہا تھا۔ ''بیٹی! میں یہی چاہتا ہوں کہ میرے پیر بھائی کی بیٹی شریعت کی پابند رہے۔ تم اسی طرح نماز روزے کی پابند رہو۔ اس طرح تم تاریک قوتوں سے بھی بچی رہو گی۔ جن قوتوں کو تم نے شکست دی ہے، وہ اب بھی تمہاری تاک میں ہیں۔ اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ تم ڈھاکا سے کہیں دور چلی جاؤ۔ اس طرح بدروحوں سے بچی رہو گی۔'' اور میں ڈھاکا سے ارشاد کے ساتھ کراچی آ گئی۔ یہیں آ کر میری گود میں ارشد آیا۔ یہیں زندگی کا بڑا حصہ گزرا۔ لاہور، ملتان، کوئٹہ، پشاور، حیدر آباد میں اچھا خاصا وقت گزرا۔ ارشاد کی قبر حیات آباد میں بنی اور کوئٹہ میں آ کر ارشد کی شادی کرائی۔ وہیں صبا پیدا ہوئی۔ وہی صبا جو آج میرے سامنے کھڑی کہہ رہی ہے۔

''اُف دادی اماں! اب بس بھی کریں۔ لگتا ہے، پوری جنت خرید کر دم لیں گی۔ نماز، نماز کے انداز میں پڑھیں۔ یہ کیا کہ عصر کی نماز شروع کی تو عشاء پڑھ کر مصلہ لپیٹا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

اب کوئی اسے کیا سمجھائے کہ میں اگر اتنی زیادہ عبادت نہ کروں تو یہ گھر تباہ ہو جائے۔ تاریک قوتیں اپنا انتقام لے لیں۔ اسی لیے تو میں اتنی زیادہ عبادت کرتی ہوں کہ میرا یہ چھوٹا سا خاندان، میرا بیٹا ارشد، میری پوتی صبا ہر بلا و مصیبت سے بچی رہے۔ اسی لیے تو میں نے صبا کی بے چینی جان لی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ دراصل وہ راحیل کو چاہنے لگی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے لیے سفارش کر دوں۔ محبت کتنی ظالم ہوتی ہے، اس کا احساس مجھے بھی ہے۔ سلیم سے بچھڑنے کے بعد میں کتنا تڑپی ہوں، یہ میں ہی جانتی ہوں اسی لیے میں نے سوچا ہے، صبا کی ارشد سے سفارش ضرور کروں گی۔ کیوں...... ٹھیک سوچا ہے ناں؟ نسیم جواب صرف خواب میں آتا ہے کیونکہ اس کی روح برزخ میں پہنچ چکی ہے۔ وہ بھی خواب میں آ کر یہی مشورہ دے چکا ہے کہ صبا کی شادی راحیل سے کرا دی جائے۔ اب میں ارشد کا انتظار کر رہی ہوں کہ وہ جیسے ہی مسقط سے لوٹا، میں اس پر شادی کرا دینے کا حکم مسلط کر دوں گی۔ ٹھیک سوچا ہے ناں؟

☆======= ختم شد =======☆